ترمیم شدہ ایڈیشن
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی!
احوال و آثار
حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ
جلد دوم
تالیف
محمد طفیل کوہاٹی
مدیر ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ
دار التحقیق جامعہ یوسفیہ ہنگو

فہرست (جلد دوم)

باب سوم

تذکارِ امین

اکابر علما، تلامذہ اور متعلقین کے نگارشات

سماجی رھنماؤں کے تاثرات

باب چہارم

مکاتیب امین

باب پنجم

یاد امین

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے عرفانی واحسانی مقام پر سحر انگیز کتاب

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ

عالم باعمل، صوفی باصفا

تصنیف

ظفر اقبال

تقدیم

ڈاکٹر مولانا عبدالحلیم چشتی دامت برکاتہم

ناشر

مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی کراچی

اکابر علماء، تلامذہ اور متعلقین کے نگارشات

مولانا اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ

اخلاص وللٰہیت اور روحانی تعلق کی منفرد مثال

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کا ذکر خیر بچپن سے سنتا رہا ہوں، یہ تو یاد نہیں رکھ سکا کہ آپ سے پہلی ملاقات کب ہوئی، لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ سن شعور کے بعد متعدد بار جامعہ میں آپ کی زیارت وملاقات سے شرف یابی حاصل رہی اور ہر ملاقات میں شفقت ومرحمت کا برتاؤ محسوس کیا، ہمہ وقت کا مہربان دیکھا اور جامعہ کے دیگر کبار مشائخ کی طرح میری تعلیم وتربیت کے لئے فکر مند پایا، شفقتوں کا یہ سلسلہ ان کی اخیر حیات تک قائم رہا اور اس تعلق کی لطافتیں اب بھی محسوس کرتا ہوں، جب بھی آپ کا ذکر خیر آتا ہے تو اپنے درمیان آپ کے روحانی وجود کا احساس پاتا ہوں، یہ سب کچھ آپ کے جامعہ کے ساتھ روحانی، علمی وقلبی تعلق اور حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ گہری عقیدت ومحبت کا نتیجہ ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی کس کس خوبی کو یہاں ذکر کیا جائے، بفضل الٰہی وہ بے شمار خوبیوں اور اوصاف کے مالک تھے، ان کا ایک بنیادی اور نمایاں وصف نام ونمود اور شہرت کے ذرائع سے دور گمنامی میں رہ کر اخلاص وللٰہیت کے ساتھ دین متین کی خدمت تھی، یہ وہ صفت ہے جو آج کل کے زمانے میں عنقا ہوتی جارہی ہے، فی زمانہ صرف وہی ''کام'' کام سمجھا جاتا ہے جس کا خوب پروپیگنڈہ وتشہیر کی جائے، کام سے زیادہ ہر طرف نام کے پھیلانے کی وبا بڑھتی جارہی ہے، چاہے اس پروپیگنڈہ وتشہیر کے لیے باطل اور غلط ذرائع کا ہی سہارا کیوں نہ لینا پڑے، اخلاص وللٰہیت وہی مطلوب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور اصول دین کے مطابق ہو نہ کہ باطل کے دام فریب میں آکر، حضرت مولانا امین اورکزئی صاحبؒ اخلاص وللٰہیت کے معاملے میں اپنے شیخ استاذ حضرت بنوری رحمہ اللہ اور دیگر اکابر واسلاف کی طرح عزیمت پر قائم رہے اور اس معاملے میں بھی انہوں نے سابقین سے

حظ وافر حاصل کیا، حضرت والد ماجدؒ کے سانحہ وفات پر مولانا امین صاحبؒ نے جو عشق ومحبت میں ڈوبا ہوا تاثراتی مضمون تحریر فرمایا، وہ ہر مسلمان اور بطور خاص داعیان دین وعلمائے امت کے لیے "اخلاص وللّٰہیت" کے باب میں صرف قابل مطالعہ ہی نہیں بلکہ ایک نصب العین ودستور العمل ہے، چنانچہ وہ حضرت بنوریؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک مرد کامل کے صفات میں سب سے اعلیٰ اور اہم وصف "اخلاص وللّٰہیت" سمجھا جاتا ہے کہ وہی مدار کار ہے "{الا للّٰہ الدین الخالص}اور "انما الاعمال بالنیات" وغیرہ بکثرت نصوص اس سلسلہ میں وارد ہیں، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرتوں میں یہ وصف سرفہرست ہے اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کی زندگی کا طرہ امتیاز بھی {یبتغون فضلا من اللّٰہ ورضوانا} ہی رہا۔ "فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا مابلغ مد احدھم ولا نصیفہ" کا راز بھی اسی میں مضمر ہے"۔

اپنے مکرم ومعظم شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صحیفہ زندگی کا جلی عنوان ہمیں یہی وصف "اخلاص" نظر آتا ہے، یہ جوہر آپ کے رگ وپے میں جاری وساری تھا اور آپ کا ہر اقدام اور ہر فیصلہ اس جذبہ اخلاص کا نتیجہ ہوا کرتا تھا، اپنے تو اپنے، غیر بھی آپ کی للّٰہیت کے قائل رہے، اور فقیر کا تو اپنے گیارہ سالہ مشاہدات کی روشنی میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ پورے عالم اسلام میں اس وصف میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا ،الا ماشاء اللہ۔

دنیا کا معمول ہے کہ ہر کام کا- چاہے دینی ہو یا دنیوی-"پروپیگنڈہ" کیا جاتا ہے، حکومتیں ہوں یا ادارے یا اشخاص وافراد سب کے ہاں تکمیل مقاصد کے لیے "پروپیگنڈہ" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، "تشہیر" کے بغیر کسی کام کا تصور بھی اس دور میں نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کمال اخلاص کا نتیجہ تھا کہ آپ کو سب سے زیادہ نفرت "نمود ونمائش" سے تھی، مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی حیثیت اور خدمات سے کون ناواقف ہے، جس کا فیض صرف ملک ہی میں نہیں، دنیا کے کونے کونے میں جاری ہے، لیکن اس کے لیے آپ نے پروپیگنڈہ کے معروف ذرائع کبھی استعمال نہیں کیے، اور تو اور مدرسہ کی چاردیواری سے باہر آپ کو اس کا بورڈ تک بھی نظر نہیں آئے گا۔

ادارے کی ضروریات کے لیے اپیل یا بیان جاری کرنے کے بجائے ہمیشہ یہ فرمایا کہ: "یہ کام اسی کا ہے، تمام خزائن کے مالک وہی ہیں، عباد کے قلوب بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں، پھر ہم کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کیوں ذلت اٹھائیں؟!"، ایسے مواقع پر جب بعض احباب کی طرف سے اصرار ہوتا تو یہ پیارا جملہ زبان مبارک پر آتا: "اسمعت من ناجیت"، بس جس کو سنانا تھا سنا دیا، اور جس کو بتانا تھا بتا دیا،

اور اس اخلاص کا اثر تھا کہ آپ ہمیشہ اپنے رفقاء کار کو یہ تلقین فرماتے رہتے تھے کہ ہماری نگاہیں بجائے ''کم'' کے ''کیف'' پر مرکوز رہنی چاہئیں، آج کل معاش کا مسئلہ پورے بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑا درد سر بنا ہوا ہے، ہر شخص کو اس کی فکر ہے، حتیٰ کہ بدقسمتی سے خالص دینی مناصب بھی اسی مقصد کے لیے استعمال ہونے لگے ہیں، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صرف ''حیوانی مسئلہ'' سمجھا، ان کے نزدیک انسانیت کا مقام اس سے بہت بلند وبالا تھا کہ صرف خورد ونوش کو اس کا نصب العین بنایا جائے۔

حضرت کا یہ جملہ آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے جو کسی مہمان کے سامنے مدرسہ کا تعارف کراتے ہوئے آنجناب نے ارشاد فرمایا: ''نرید ان تکون مدرستنا ھذہ دار دین قبل ان تکون دار علم''، اس مختصر سے جملہ کے آئینہ میں حضرت کے قلبی احساسات اور ایمانی شعور کا عکس جمیل پورے آب وتاب کے ساتھ جھلک رہا ہے اور یہی وجہ تھی کہ اپنے ادارہ میں آپ سب سے زیادہ اہمیت واولیت صلاح وتقویٰ کو دیتے تھے، آپ کا یہ مقولہ تو تقریباً تمام متعلقین کے حافظہ میں محفوظ ہوگا کہ: ''ہمیں صالح غبی چاہیے، غیر صالح ذکی نہیں''، اور کیوں نہ ہو جب کہ مدرسہ کی تاسیس آپ نے اسی مقصد کے لیے کی تھی...... الغرض آپ کا ہر قول وفعل اخلاص سے بھرپور ہوتا تھا اور دوسروں کو بھی بتاکید اس کی تلقین فرماتے رہے''۔ [بینات، اشاعت خاص بیاد حضرت بنوریؒ ص ۷۷۳، ۷۷۵]

مولانا امین صاحبؒ نے حضرت والد ماجدؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا جس انداز سے صرف ذکر ہی نہیں کیا بلکہ خود اس پر عمل بھی کرکے دکھایا اور گویا اسے اپنے لیے حرز جان بنالیا، ساری زندگی گمنامی وشہرت سے دور رہ کر اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ دینی خدمات انجام دیتے رہے۔

اسی اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ تھا کہ جامعہ سے عملی تعلق موقوف ہونے کے باوجود آپ نے جامعہ سے اپنا قلبی، روحانی اور علمی رشتہ ہمیشہ تروتازہ رکھا، جامعہ کے اندرونی معاملات اور بیرونی مسائل سے آپ ہمیشہ باخبر رہتے تھے، وقتاً فوقتاً عمومی یا خصوصی طور پر خبر گیری کا سلسلہ قائم رہا اور موقع بموقع تعلیمی معاملات سے متعلق اپنے قیمتی مشوروں اور گراں قدر آراء سے بھی نوازا کرتے تھے، مولانا امین اورکزئی صاحبؒ اپنے شیخ اور استاذ کے مزاج کے موافق جامعہ کے تعلیمی نصاب کے بارے میں ہمیشہ متوجہ رہتے اور مختلف مواقع پر اپنی وقیع رائے کا اظہار بھی کرتے تھے، والد صاحب حضرت بنوریؒ درس نظامی کے نصاب میں طلبہ کی ضرورت اور سہولت کے مطابق مناسب تبدیلی کے خواہاں اور فکرمند رہتے تھے، چنانچہ انہوں نے جامعہ کے تعلیمی نصاب کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے مفید اور مثبت تبدیلیاں بھی کیں اور آج بھی جامعہ کے نصاب میں انہی روایات کے پیش نظر ضروری تقاضوں کو مدنظر رکھتے

ہوئے تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، مجھے یاد ہے کہ کچھ برس قبل درجہ رابعہ میں پڑھائی جانے والی کتاب ''شرح الوقایۃ'' کی تبدیلی سے متعلق تجویز زیرِ غور تھی، ''شرح وقایہ'' فقہ حنفی کے متون اربعہ میں مشہور متن ''الوقایۃ (وقایۃ الروایۃ فی مسائل الھدایۃ)'' کی شرح ہے جو تاج الشریعہ محمود بن عبید اللہ بن ابراہیم محبوبی حنفی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۳ھ) کی تصنیف ہے، متن الوقایہ کی کئی شروحات لکھی گئیں، جن میں سے ایک ماتن کے پوتے صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود محبوبی رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۷ھ) کی بھی ہے جو درس نظامی میں اس وقت بھی داخل نصاب ہے، پھر انہی عبید اللہ بن مسعودؒ نے اپنے دادا کے تحریر کردہ متن ''الوقایۃ'' کا اختصار ''النُقایۃ'' کے نام سے کیا، جس کی ایک شرح امام ملا علی قاریؒ (متوفی ۱۰۱۴ھ) نے ''فتح باب العنایۃ بشرح النُقایۃ'' کے نام سے تحریر فرمائی، جو کہ اہل علم کے ہاں ''شرح نقایہ'' کے نام سے معروف ہے، مولانا امین اورکزئی صاحب رحمہ اللہ کی رائے تھی کہ شرح وقایہ کی جگہ نصاب میں شرح نقایہ کو شامل کرنا چاہیے جو بہت سے اعتبارات سے فوقیت اور ترجیح رکھتی ہے، اس مجلس میں جامعہ کے ناظم تعلیمات استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ بھی موجود تھے، یہ فقط ایک چھوٹا سا واقعہ بطور مثال تحریر کیا گیا، چونکہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، علوم نقلیہ وعقلیہ میں کافی رسوخ رکھتے تھے، اس وجہ سے نصاب سے متعلق ان کی آرا ہمیشہ ٹھوس دلائل پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔

جامعہ سے آپ کا علمی رشتہ یوں بھی قائم رہا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی فراغت کے بعد اپنے تصنیفی وتحقیقی کاموں میں دست وبازو کے طور پر جامعہ میں آپ کو متعین فرمایا تھا، اور حضرت والد صاحب کا یہ جملہ آپ پر اعتماد کا مظہر اتم ہے کہ ''ہر پرندے کے دو پر ہوتے ہیں، دار التصنیف میں میرے دو پر حبیب اللہ مختار اور محمد امین اورکزئی ہیں'' یہ جملہ خود حضرت اورکزئی کے علاوہ دیگر اساتذۂ کرام سے بھی بارہا سنا، آپ نے اس جملہ کا بھرپور پاس رکھتے ہوئے اپنے شیخ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے مفوضہ کام ''نثر الأزھار علی شرح معانی الآثار للطحاوی'' کو پوری محنت ولگن سے مرتب فرمایا اور اپنی بھرپور علمی توانائی خرچ کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، ''نثر الأزھار'' کا کچھ کام تو انہوں نے جامعہ سے عملی وابستگی کے دوران یہیں کر لیا تھا جبکہ بقیہ کام اپنے علاقے ہنگو (کوہاٹ) منتقل ہونے کے بعد مکمل فرمایا، اس کی طباعت جامعہ سے اجازت لے کر حضرتؒ نے خود اپنی زندگی میں شروع کروادی تھی، لیکن افسوس کہ ان کی زندگی میں ابتدائی چند جلدیں تو طبع ہوئیں، مکمل طبع نہ ہوسکی، اور اب ان کے پس ماندگان کے تعاون سے ''نثر الازہار'' کی جدید مکمل طباعت بہت جلد ان شاء اللہ جامعہ کی طرف سے ہوگی، جبکہ اس سے قبل آپ کے تخصص کا مقالہ ''مسانید الامام ابی حنیفہ'' کے عنوان سے جامعہ کی ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی'' کی جانب سے پہلے طبع ہو چکا ہے، اور اس کی نئی طباعت کا کام بھی جاری ہے، جو جامعہ کے ساتھ ان

کے روحانی وعلمی تعلق کو تا قیامت برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ اور حضرت مولانا امین اورکزئی صاحبؒ کے لیے صدقہ جاریہ بھی ہوگا، ان شاء اللہ!

جامعہ سے حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کے روحانی تعلق کا ایک اور پہلو بھی بڑا ہی مضبوط اور ممتاز ہے، جو شاید کسی کسی کو نصیب ہو، وہ یہ کہ حضرت شہید رحمہ اللہ کو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ سے روحانی سلسلہ کی وابستگی بھی نصیب تھی، دیگر روحانی مراحل ومدارج کے علاوہ آپ کو حضرت والد صاحب سے 'دلائل الخیرات' کی خصوصی اجازت حاصل تھی، جو درود شریف کا بہترین منفرد اور جامع ذخیرہ ہے اور درود شریف روحانیت کا وہ زینہ ہے جو قیامت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا ذریعہ ہوگا اور جو جتنا زیادہ درود شریف پڑھنے والا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا، دلائل الخیرات میں درود شریف کے ایسے جامع صیغے جمع فرمائے گئے ہیں جنہیں پڑھنے والے ''مکثرین'' کی صف میں شمار ہو سکتے ہیں، جن بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے ان کی حرص یہی تھی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچے عشق کا ثمر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمانی وروحانی تعلق کی مضبوطی کا وسیلہ ہے، اسی ایمانی وروحانی جذبہ کے تحت حضرت والد صاحب سے حضرت اورکزئی شہیدؒ کو یہ روحانی وسیلہ ملا اور مولانا شہیدؒ اسے آگے منتقل فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی بھر اس روحانی سلسلے سے وابستہ رکھے، اس کی لاج رکھنے کی توفیق بخشے، اسی روحانی وایمانی نسبت کو آخرت میں وسیلہ ظفر ونجات بنائے اس روحانی سلسلہ کو زندہ رکھنے اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ بنانے کے لئے جو احباب حضرت شہیدؒ کی یادگار کے لئے اشاعت خاص کا اہتمام فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی اجر عظیم نصیب فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

لعل بدخشاں

مفتی رضاء الحق، جنوبی افریقہ

کچھ سال پہلے عظیم المرتبت بزرگ، علم حدیث کے فنون کے نبض شناس، استغنا کا ہمالیہ، علمی، عملی، روحانی، ادبی، قلمی، سماجی؛ بلکہ ہمہ پہلو شخصیت حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالی ایک فرقے کے اشارے پر ظالمانہ کارروائی میں شہید کیے گئے۔ غیر مسلموں میں ایسی نادر روزگار ہستیوں کی حفاظت کے لیے حصار اور قلعے بنائے جاتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں خصوصاً پاکستانیوں پر اللہ تعالی رحم فرمائے اور ان کو صراط مستقیم پر لگائے کہ ان کے نزدیک لعل بدخشاں اور بازار کے خرمہرے برابر ہیں، یہاں شریعت کے پروانوں اور علم وعمل کے دیوانوں کو ٹھکانے لگادیا جاتا ہے۔ مولانا محمد امین صاحب جیسی نادر روزگار ہستیاں صدیوں میں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں، افسوس کہ اہل وطن اس گنج گراں مایہ کی قیمت واہمیت کا اندازہ نہ لگا سکے۔

مجھے ''المظاہر'' کوہاٹ کے ارباب بست وکشاد نے حکم دیا کہ حضرت مولانا امین صاحب کے ساتھ جامعہ بنوری ٹاون میں بیتے ہوئے ایام کی چند یادیں قلمبند کردوں۔ میں چونکہ بے حد مصروف ہوں اور ان حضرات کا جلدی کچھ لکھنے کا تقاضا ہے؛ اس لیے جلدی میں جو نقوش کہنہ یاد آجائیں ان کو تحریر کرلوں گا؛ تاکہ شمع کے پروانوں میں میرا نام بھی لکھا جائے۔

پہلی ملاقات:

بندہ عاجز ۱۹۷۲ء میں بنوری ٹاون (سابقہ نیوٹاون) تخصص کے لیے گیا تھا۔ اس وقت بندہ عاجز ٹی بی کی بیماری اور دیگر امراض کی وجہ سے انتہائی نحیف وکمزور تھا۔ حضرت مولانا اس سے پہلے تخصص فی الحدیث سے فارغ ہوچکے تھے اور ایک دو کتابوں کی تدریس کے ساتھ دارالتصنیف میں تصنیفی کام میں مصروف رہتے تھے، اور اس کے ساتھ دارالاقامہ کی نظامت کی ذمہ داری کا کچھ حصہ بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تخصص کی درسگاہوں کی نگرانی کے لیے چکر لگاتے تھے اور اکثر اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حال احوال پوچھتے تھے۔

مولانا کی شفقت:

حضرت مولانا ذہین اور محنتی طلبہ پر بہت شفیق تھے۔ سخاوت چونکہ مولانا کی طبیعت ثانیہ تھی؛ اس لیے محنتی اور ذہین طلبہ پر بہت پیسے خرچ کرتے تھے۔ نادان اور سستی کرنے والے طلبہ کی تالیف قلب فرماتے تھے اور ان کو مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے قریب کرتے تھے کہ کسی طرح وہ راہِ راست پر آجائیں اور پڑھائی میں لگ جائیں اور جو طلبہ تالیف قلب کے محاوروں کو بھی نہیں سمجھتے تھے تو ان کے خلاف مولانا سخت کارروائی کے قائل تھے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے حین حیات میں پیش آیا کہ کچھ طلبہ نے جامعہ میں مولانا امین صاحب مرحوم کے خلاف محاذ بنایا اور ان کو نظامت سے علیحدہ کرنے کی بات چلائی۔ حضرت مولانا بنوری نے دارالحدیث میں طلبہ کو بلایا، بیان فرمایا، اُن کو سمجھایا اور یہ بھی فرمایا کہ آپ حضرت مولانا امین صاحب سے معافی مانگ لیں۔ ان طلبہ میں جو سرغنہ تھا وہ کہنے لگا: ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں، لیکن مولانا امین صاحب سے معافی نہیں مانگتے؛ چنانچہ معافی نہ مانگنے والے طلبہ کے اخراج کا فیصلہ ہوا؛ حالانکہ اس وقت مدارس میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے جس سال میں جامعہ بنوری ٹاون گیا تھا، یعنی ۱۹۷۲ء میں دورہ کے طلبہ کی تعداد اٹھارہ تھی، جس میں ہمارے دوست مولانا منصور الحق اور مولانا ممتاز الحق بھی شامل تھے جو وفاق المدارس میں بالترتیب اول و دوم آئے تھے۔ اس زمانے میں بعض دوسرے مدارس کا حال یہ تھا کہ جب بنوری ٹاون میں داخلہ بند ہوجاتا تھا یا بعض طلبہ داخلہ امتحان میں رہ جاتے تھے تو دوسرے مدارس کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے تھے۔ طلبہ کی اتنی قلت تھی کہ ایک مولانا صاحب نے مدرسہ کی بنیاد رکھی تو حضرت مولانا بنوری رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا: بھائی فلاں فلاں مدرسے کی موجودگی میں نئے مدرسہ کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بھی یاد رہے کہ بعد میں ان طلبہ کا سرغنہ مولانا امین صاحب کا اتنا معتقد بن گیا تھا کہ میں تقریباً ہر ہفتہ ان کو جامعہ آتا ہوا دیکھتا تھا اور مولانا از راہِ مروت و شرافت ان کا اکرام فرماتے تھے۔

طلبہ کے نکلنے پر مولانا بنوریؒ کو افسوس تھا؛ لیکن قانون بہرحال قانون ہے۔ اس سال مولانا محمد ولی درویش مرحوم دورۂ حدیث میں پڑھتے تھے۔ مولانا بعد میں جامعہ بنوری ٹاون میں استاذ اور مفتی بنے۔ تو مولانا محمد ولی درویش نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا کی طبیعت پر اس واقعے کا بہت اثر ہے، آپ درسِ بخاری میں شرکت کریں؛ چنانچہ میں اس واقعہ کے دوسرے دن درسِ بخاری میں شریک ہوا۔ مجھے یاد ہے مضمضہ اور استنشاق کی بحث چل رہی تھی، مولانا نے فرمایا: حنفیہ مضمضہ اور استنشاق میں فصل اور شافعیہ وصل کو بہتر سمجھتے ہیں، اور پھر فرمایا: وصل اور فصل کی تین اصطلاحات

ہیں: ایک شعرا کے ہاں، وہ وصل وصال محبوب اور فصل فراق محبوب کو کہتے ہیں۔ مولانائے روم فرماتے ہیں:

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

اور ایک اہل معانی کے ہاں، وہ وصل عطف اور فصل ترک عطف کو کہتے ہیں۔ اور ایک محدثین اور فقہا کے ہاں، وہ وصل مضمضہ اور استنشاق ایک کف سے کرنے کو کہتے ہیں اور فصل مضمضہ اور استنشاق الگ چلو سے کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر شافعیہ کے ہاں وصل کے مختلف طریقے ذکر کیے۔

مولانا شہید کی سخاوت:

شہید مرحوم میں بھرپور سخاوت موجود تھی، غالباً جو تنخواہ ان کو جامعہ سے ملتی تھی وہ ایک دو ہفتے کے لیے بمشکل کافی ہوتی تھی، پھر شہید مرحوم کے ایک بھائی جو پشاور سے کراچی ٹرک کے ساتھ آتے جاتے تھے، بقیہ مہینہ کے اخراجات کا انتظام کرتے تھے۔ شہید مرحوم کے خرچ واخراجات کے مختلف مدات تھے: مسکین طلبہ، کتابوں کی خریداری، بکثرت ضیافت اور مہمانوں کے لیے انواع الطعام تیار کرانا جس کی ذمہ داری مولانا مفتی محمد ولی درویشؒ کے سپرد تھی، ان طلبہ کی ضیافت جو مولفۃ القلوب کی مانند تھے اور مولانا ان کو راہِ راست پر لگانے کے لیے متفکر رہتے تھے، بعض مخصوص احباب کی ضیافت، جن میں مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ تعالیٰ سرفہرست تھے۔ وہ مولانا کے ہم پیالہ، ہم نوالہ وہمدرس بھی تھے اور دار التصنیف میں دونوں ساتھ بیٹھتے تھے۔ مرحوم شہید کو نایاب کتابوں کی خریداری اور جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں جو نایاب کتابیں ان کے کتب خانہ میں جمع تھیں عام کتب خانوں میں وہ کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ جامعہ کے دروازے پر حاجی عبدالغنی افغانی صاحب مولانا امین صاحب کے لیے دنیا کے کونے کونے سے نایاب کتابیں لاتے تھے اور مولانا ان کو خریدتے تھے۔ سنا ہے کہ مولانا پر بمباری میں ان کے کتب خانہ کو بھی نقصان پہنچا۔

شہید کا ذوق تحقیق:

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو اعلیٰ درجے کے ذوق تحقیق سے نوازا تھا: چونکہ ہمارے علاقے کے عرف کے مطابق انھوں نے منطق فلسفہ کی کتابیں گہرائی سے پڑھی تھیں اور پھر پڑھائی تھیں؛ اس لیے بات کی تہہ تک پہنچتے تھے۔ ایک مرتبہ صندل بابا جی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک مجلس میں کسی نے سوال کیا کہ ان کے متعلق بعض باتیں اور واقعات مشہور ہیں خصوصاً ان کی عمر کی تحدید کے بارے میں، یہ باتیں بعض حضرات کے نزدیک محل کلام ہیں۔ اس پر حضرت شہید

نے فرمایا کہ میں نے جو تخصص فی الحدیث کیا ہے اور رجال اور اسانید کی تحقیق کا کام کیا ہے اس کا کچھ اور فائدہ مجھے پہنچا ہو یا نہیں یہ فائدہ ضرور پہنچا ہے کہ الحمد للہ میں واقعات کی تہہ تک پہنچتا ہوں، میں اس حقیقت تک پہنچ گیا ہوں کہ حضرت صندل باباجی حضرت سنڈا کے باباجی کے خلیفہ اور ماذون ہیں، ہاں یہ بات معقول ہے کہ صندل باباجی کی عمر کی تحدید کہ ڈیڑھ سو سال ہے یا کم وبیش ہے اس میں کلام ہوسکتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت صندل باباجی حضرت مولانا ولی احمد المعروف بہ سنڈا کے باباجی کے خلیفہ تھے اور وہ حضرت مولانا نجم الدین ہڈے باباجی کے خلیفہ اور وہ حضرت شیخ عبد الغفور سواتی کے سلسلہ قادریہ میں خلیفہ تھے۔ یہ تینوں جہاد آزادی کے مجاہد تھے اور علمائے دیوبند سے ان کے گہرے روابط تھے۔ ایک مرتبہ درس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے سرحدی طلبہ سے پوچھا: تم سنڈا کے باباجی کو جانتے ہو؟ طلبہ نے کہا: جی۔ حضرت نے پوچھا: ان کا نام کیا تھا؟ طلبہ خاموش ہوئے، حضرت نے کہا: مولانا ولی احمد۔ پھر پوچھا: تم ہڈے باباجی کو جانتے ہو؟ طلبہ نے کہا: جی۔ حضرت مدنی نے فرمایا: ان کا کیا نام تھا؟ طلبہ خاموش ہوگئے۔ حضرت مدنی نے فرمایا: مولانا نجم الدین۔ حضرت مولانا امین اورکزئی کی بیعت کا تعلق صندل باباجی سے تھا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا تقوی وطہارت، فقر ودرویشی اپنی جگہ مسلم ہے؛ لیکن ان کا اصل کام نورانی فتوحات کو چارسو پھیلانا تھا، یہ کام انھوں نے نہیں کیا؛ بلکہ ان کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ موقوف رہا؛ ہاں انھوں نے علم حدیث کی نشر واشاعت کا خوب اہتمام فرمایا۔ فجزاہ اللہ تعالی خیرا۔ اس لیے مجدد کہلائے۔

یہ بھی حضرت مولانا کے ذوقِ تحقیق کا نتیجہ تھا کہ وہ رفض کو سب فتنوں کا منبع، سب فرقوں کی اصل اور اُم الفتن سمجھتے تھے؛ چنانچہ ان کی شہادت بھی ایک خاص فرقے کی سازش کا نتیجہ تھی۔

مولانا کا درجہ علوم نقلیہ میں تو مسلم تھا، لیکن علوم عقلیہ فلسفیہ بھی ان کو ازبر تھے اور جامعہ بنوری ٹاؤن میں سلم العلوم جیسی دقیق کتاب مولانا کے زیر تدریس رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے علاقے میں کسی فرقے سے مناظرہ ہوا تھا اور مخالف مناظر عقلیات سے اپنے مدمقابل کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا اور مولانا معاون مناظر تھے تو مولانا امین صاحب فریق مخالف کی عقلیات کے رعب کے تار وپود کو سبوتاژ کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی قابلیت اور صلاح وتقوی:

مولانا شہید کی قابلیت اور تقوی وطہارت مسلم تھی؛ اس لیے حضرت مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالی ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور میں نے سنا ہے کہ حضرت مولانا بنوری اپنی ایک صاحبزادی کو ان کے حبالہ عقد میں دینے

کا ارادہ فرمایا تھا؛ لیکن چونکہ حضرت مولانا امین صاحب کے نکاح کی بات اپنے علاقہ میں طے ہو چکی تھی؛ اس لیے یہ ارادہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ واللہ اعلم۔

مولانا امین قابلیت کے ساتھ فصاحت و بلاغت میں بھی یکتائے دوراں تھے۔ ہمارے ایک شاگرد اور دوست مولانا شمس العارفین بنوری ٹاون میں پڑھتے تھے، آج کل امریکہ میں دینی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ میرے ساتھ بہت بے تکلف تھے ایک دن بے تکلفی میں مزاحاً میں نے اُن سے کہا کہ آپ مہاجر بھی ہیں اور لکھنوی بھی آپ بتلادیں کہ جب ہم اردو بولتے ہیں تو لب ولہجہ اور طرز ادا سے پتہ چلتا ہے کہ ہم غیر اہل زبان ہیں یا نہیں؟ انھوں نے کہا: سب اساتذہ کا پتا چلتا ہے، غیر اہل زبان ہونا پہلے جملے سے معلوم ہو جاتا ہے: ہاں مولانا امین صاحب اور مولانا بدیع الزمان صاحب کے لہجے سے غیر اہل زبان ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ حضرت مولانا امین صاحب جب ہمارے ساتھ پشتو بولتے تھے تو ہمارے لہجے میں بولتے تھے جیسے وہ پشاور یا مردان کے رہنے والے ہوں۔

حضرت مولانا کی تواضع:

مولانا امین صاحب کی علمی رفعت شان کے باوجود ان پر تواضع غالب تھی۔ میں نے بہت مدت پہلے مولانا سے عرض کیا تھا کہ ہمارے صوبہ میں تخصص فی الحدیث کسی مدرسہ میں نہیں اور ایسے علما بھی نہیں جو تخصص فی الحدیث کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہوں: اس لیے آپ دینی رسالوں میں اعلان فرمادیں اور تخصص فی الحدیث شروع کرادیں؛ لیکن مولانا نے از راہِ تواضع ایسا نہیں کیا۔ ہم نے اپنے طور پر جنوبی افریقہ سے تین چار تلامذہ کو ان کی خدمت میں علم حدیث کی مصطلحات سے واقفیت کے لیے بھیجا، انھوں نے دار العلوم زکریا سے فراغت کے بعد مولانا مرحوم سے خوب استفادہ کیا، ان میں ایک مولانا ابراہیم گمبیا کے رہنے والے تھے۔ ہمارے دار العلوم زکریا میں چھ ماہ میں حفظ کیا تھا، انتہائی قابل اور ذہین تھے، فراغت کے بعد ان کو ہم نے مولانا امین مرحوم کے پاس بھیجا، ان کے شوق مطالعہ اور ذہانت سے مولانا امین صاحب بہت متاثر تھے۔ مولانا ابراہیم نے مولانا امین کے علوم سے خوب خوشہ چینی کی تھی، پھر اپنے علاقے میں مدرسہ کھولا۔ مولانا اسماعیل بھام جی اور ان کے بھائی نے بھی مولانا شہید سے خوب علمی فائدہ حاصل کیا۔ ان میں سے بعض طلبہ نے بتلایا کہ اس ایک سال میں مولانا امین صاحب نے ہمیں اتنے امرود کھلائے کہ پوری زندگی ہم نے اتنے امرود نہیں کھائے۔

یاد رہے کہ مولانا امین صاحب کے علاقے کے امرود شیرینی اور لذت میں ضرب المثل ہیں۔ حضرت مولانا امین کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ پوری اہلیت رکھنے کے باوجود اپنے مدرسہ میں دورہ حدیث شروع نہیں کرایا؛ حالانکہ علم

حدیث مولانا کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ غالباً صف سادس تک کی کتابیں مولانا کے مدرسہ میں ہوتی تھیں۔ مولانا شہید مرحوم فصیح وبلیغ عربی لکھنے میں بھی ماہر تھے جس پر ان کی عربی تصانیف شاہد عدل ہیں۔ مرحوم کا عربی اور اردو کا خط اتنا اچھا اور خوبصورت لگتا تھا جیسے خوبصورت دلہن کے سینے کے ہار میں موتیاں اچھی لگتی ہیں۔ آدمی ان کے خط کی عبارت بعد میں پڑھتا اور خط کی خوبصورتی کا مشاہدہ پہلے کرتا تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مرحوم کے دیگر اوصاف:

شہید مرحوم میں مستغنی ہونے کا وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ خود دوسروں پر خرچ کرتے تھے اور کسی سے طمع ولالچ ان کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ علما وصلحا کی قدر کرتے تھے اور شریروں اور مفسدین سے نفرت کرتے تھے۔ نظام چلانے کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔ عاقبت اندیش تھے۔ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچتے تھے۔ عوام سے رابطہ رکھتے تھے اور ان کے مسائل کو حل کرتے تھے اور ان کی بات کو غور سے سنتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے قریبی کالج میں ہنگو کے علاقے کی ایک پروفیسر کی تقرری ہوئی تھی، الیکشن کا زمانہ قریب تھا کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کے علاقے میں کونسی پارٹی کا پلہ بھاری معلوم ہوتا ہے؟ وہ کہنے لگے: ہمارے علاقے میں محمد امین استاذ کا جھکاؤ جس نمائندے کی طرف ہوتا ہے اس کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شہید عوام وخواص میں مقبول تھے اور دین کے دشمنوں کی آنکھوں کا کانٹا تھے۔

اساتذۂ کرام کا احترام:

شہید رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے اساتذۂ کرام کا بے حد احترام اور عزت کرتے تھے، خصوصاً حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا ادریس میرٹھی، مولانا فضل محمد صاحب سواتی اور مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ مرحوم ان کے علوم سے خوب مستفید ہوئے تھے اور ان کی تحقیقات کو حرز جان بنائے ہوئے تھے۔ اساتذۂ کرام بھی اس مطیع وقابل شاگرد کے خوب قدر شناس تھے۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی جب تک بقید حیات تھے شہید مرحوم ان کے ہاں ضرور حاضری دیتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے۔ مرحوم مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ کے تفقہ اور علمی تحقیق وتدقیق کے خوب قائل تھے، اور مولانا فضل محمد صاحب کے علم ادب اور علم کی گہرائی وگیرائی کے دلدادہ تھے اور ان کے مشوروں کی قدر کرتے تھے۔

مرحوم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علمی جانشینوں اور تلامذہ کے وجود کو علمی عملی ترقی کا زینہ سمجھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے انتقال کے بعد جامعہ علامہ بنوری ٹاون میں حضرت شاہ صاحب کے صرف ایک تلمیذ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ رہ گئے تھے، حضرت شہید چاہتے تھے کہ شاہ صاحب کے ایک اور تلمیذ حضرت مولانا عبدالحنان صاحب کامل پوری جامعہ میں علمی سرپرستی کے لیے تشریف لائیں، لیکن مولانا عبدالحنان صاحب ضعیف بھی ہو چکے تھے اور مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ بھی کر چکے تھے اور کچھ مدت کے بعد ہجرت بھی فرمائی؛ اس لیے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

شہید مرحوم اور نصاب مدارس:

شہید مرحوم نصاب کے بارے میں بھی صاحب رائے تھے۔ مرحوم کی رائے یہ تھی کہ فقہ میں شرح نقایہ پوری پڑھانا چاہیے اور غالباً انھوں نے مدرسہ میں اس کو داخل نصاب کر دیا تھا اور یہ فرماتے تھے کہ اس کی برکت سے طالب علم ترک تقلید کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے؛ ورنہ مروجہ حدیث کی کتابوں میں دوسرے مذاہب کے اکثر دلائل مکتوب اور مذکور ہوتے ہیں اور احناف کے دلائل استاذ زبانی سناتا ہے اور ہوائی دلائل، کتابی دلائل کے مقابلے میں ذہن نشین نہیں ہوتے۔ شرح نقایہ میں ہمارے دلائل کتاب میں مذکور ہیں۔

بندہ عاجز کہتا ہے کہ تاج الشریعہ علامہ محمود نے اپنے پوتے عبیداللہ بن مسعود بن محمود کے لیے مسائل ہدایہ میں ایک متن مرتب کیا، جس نام "وقاية الرواية في مسائل الهداية" رکھا، پھر ان کے پوتے عبیداللہ صدر الشریعہ الاصغر نے اپنے دادا کی کتاب کی دو خدمتیں کیں: ایک اس کی شرح جو "شرح الوقایہ" کے نام سے مشہور ہے لکھی، جس پر مولانا عبدالحی لکھنوی نے بہترین حاشیہ لکھا، اور دوسرا کام یہ کیا کہ "وقایہ" کی تلخیص اور انتخاب اور چیدہ چیدہ مسائل تحریر کر کے اس کا نام "نقایہ" رکھا۔ "نقایہ" بضم النون منتخب کے معنی میں ہے۔ "نقایہ" انتہائی مختصر متن ہے کیونکہ متن کو ملخص کیا گیا جیسے چیونٹی یا مچھر کا آپریشن کیا جائے؛ لیکن اللہ تعالی ملا علی قاری رحمہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے اس کی بہترین اور آسان قرآن وحدیث اور آثار سے مزین شرح "فتح باب العناية في شرح النقاية" لکھی ۔ پہلے اس کا نسخہ بغیر تعلیقات کے استنبول اور کراچی سے چھپا تھا، اب اس پر تعلیقات بھی آئی ہیں۔ میرے سامنے شرح نقایہ کے دو نسخے ہیں: ایک نسخہ چار جلدوں میں ہے اور ایک تین جلدوں میں، دونوں پر تعلیقات ہیں، دونوں تعلیقات شرح نقایہ کی شایانِ شان نہیں؛ لیکن نہ ہونے سے بہتر ہیں۔ ہمارے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے بھی اس کے تھوڑے سے حصہ پر تعلیقات لکھی تھیں، غالباً کام مکمل نہیں ہو سکا۔

شرح وقایہ کے مقابلے میں اس زمانے کے طلبہ کے لیے شرح نقایہ زیادہ مفید ہے۔ شرح وقایہ مناظرانہ کتاب

ہے، آج کل کے طلبہ اس سے کم استفادہ کر سکتے ہیں۔ایک مہتمم صاحب نے لڑکیوں کے مدرسہ میں شرح وقایہ رکھی، میں نے ان سے کہا کہ لڑکیوں کے لیے آسان کتاب مفید ہوگی، انھوں نے کہا: ہندوستان میں اس کتاب کے کل نمبر ۵۰ تھے، میں نے اس کتاب میں ۵۱ نمبر لئے۔ یہ میری محبوب کتاب ہے۔

مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری فرماتے ہیں کہ تخصص کے طلبہ کے لیے فقہ کی ایک پوری کتاب جو سہل ہو اور اس میں شرح اور فتاوی کے مسائل بھی ہوں درکار ہے، اُن کے خیال میں ''ملتقی الابحر'' اس سلسلے کی بہترین کتاب ہے۔ ''ملتقی الابحر'' ابراہیم حلبی (م:۹۵۶) کی کتاب ہے جس میں مصنف نے قدوری، مختار، کنز، وقایہ اور ہدایہ کے بعض مسائل کو آسان عبارت کے ساتھ جمع کیا اور راجح قول کو مقدم کیا۔ شیخ زادہ عبدالرحمن بن محمد بن سلیمان نے اس کی شرح ''مجمع الانہر'' کے نام سے لکھی۔ صاحب الدر نے بھی اس کی شرح لکھی۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا محمد یوسف بنوری کو فقہ میں ''الاختیار لتعلیل المختار'' پسند تھی۔ بہر حال مولانا امین رحمہ اللہ کو شرح نقایہ پسند تھی، شرح نقایہ میں ہدایہ کے دلائل کو ملا علی نے ملخص کیا اور جو دلائل پیچیدہ اور مشکل تھے ان کو حذف کیا۔

مولانا مرحوم کی ذہانت اور فراست:

شرح معانی الآثار کی تعلیقات اور نظر طحاوی کی تلخیص مولانا کی ذہانت کی شاہد عدل ہے۔مرحوم کی فراست کا ایک واقعہ مجھے یاد آیا: جب مولانا علامہ بنوری ٹاون میں ناظم دارالاقامہ تھے، اس زمانے میں بیرونی طلبہ میں ایک طالب علم ہمارا شاگرد تھا، اس کے بارے میں مولانا کی رائے اچھی نہیں تھی، اس کو مضر اور موذی سمجھتے تھے۔ ہم اس بات پر حیران تھے کہ مولانا کیوں اس کو مضر سمجھتے ہیں! بعد میں اس کا اخراج ہوا اور وہ کراچی میں کسی مشنری اسکول میں ماسٹر بن گیا اور پاکستان چھوڑنے کے بعد مستشرقین کا مکمل آلہ کار بن گیا، اہل دین سے تعلق ختم ہوا اور اب ان کے منہ میں مستشرقین کی زبان آگئی اور دین بیزار لوگوں میں محسوب ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا امین صاحب سے میری ملاقات ہوئی، حضرت نے اس طالب علم کے بارے میں پوچھا، میں نے جو حالات ان کے بارے میں سنے تھے وہ مولانا کو سنائے، مولانا خاموش ہوگئے۔اس طالب علم کی حالت دیکھ کر ''اتقوا فراسة المؤمن، فانه ینظر بنور اللّٰه'' یاد آتا ہے۔{رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ}۔ حکیم نور الدین اپنی تمام تر صلاحیتوں اور ذہانت کے باوجود غلام احمد قادیانی کے جال میں پھنس گیا اور مرزا کا خلیفہ بن کر جہنم کا ایندھن بن گیا۔

زندگی کے آخری سالوں میں شہید مرحوم کا چہرا اتنا منور بن چکا تھا کہ آدمی سوچتا کہ یہ وہی شخصیت ہے، یا کوئی نیا

چہرہ ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نور وجمال، چہرے کی چمک دمک شہادت کا مقدمہ اور [نورُهم يسعىٰ بين أيديهم] کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالی شہید مرحوم کے درجات بلند فرمائیں اور ان کے صاحبزادے کو ان کے علمی عملی مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

مولانا سے میری آخری ملاقات:

مولانا امین سے میری آخری ملاقات بابوزئی ضلع مردان میں مولانا امداد اللہ صاحب کے مدرسہ کی مسجد کی افتتاح کے موقع پر ہوئی تھی۔ مولانا امداد اللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ مولانا امین صاحب اور ان کے استاذ مولانا عبد اللہ صاحب اور صندل بابا جی افتتاح کے موقع پر آنے والے ہیں تم بھی آجاؤ؛ چنانچہ میں حاضر ہوا۔ مولانا محمد امین صاحب اور مولانا عبد اللہ صاحب آئے تھے، مولانا عبد اللہ صاحب نے مجھ سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے بجائے شاہ منصور کے صوابی بتلایا۔ انھوں نے فرمایا: صوابی میں کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے شاہ منصور کہا، انھوں نے فرمایا: مولانا عبد الرزاق صاحب لالا مولوی صاحب کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: وہ میرے نانا اور استاذ ہیں، انھوں نے ضیاء الحق ماما جی اور مطیع الحق ماما جی کے بارے میں پوچھا، میں نے کہا: آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: دراصل مولانا عبد الرزاق صاحب (میرے نانا) کو ہم گرمی کے موسم میں اپنے ہاں تیراہ بلاتے تھے اور وہ ہمارے ہاں دو تین مہینے گزارتے تھے، اصل داعی مولانا عبد اللہ مرحوم کے چچا ہوتے تھے جو اپنی قوم کے ملک تھے۔ میں اپنی کاشتکاری، زراعت اور مویشیوں کی دیکھ بھال میں مشغول ہوتا تھا۔ مولانا نے مجھے ترغیب دی کہ تم علم دین پڑھو، میں نے ان کے پاس اسباق شروع کئے اور اللہ تعالی نے مجھے مولوی بنایا؛ اس لیے ہمارے ان کے ساتھ گھر جیسے تعلقات تھے، میں نے کہا: میں نے اپنی والدہ سے سنا کہ والد صاحب جب تیراہ سے آتے تھے تو اخروٹ کی بوری اپنے ساتھ لاتے تھے، انھوں نے فرمایا: آپ آجائیں اخروٹ کی کمی نہیں۔ یہی مولانا امین سے آخری ملاقات تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ مولانا کی شہادت کا وقت قریب ہے؛ ورنہ بار بار ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے۔

نمبر نکالنے والوں کو چاہیے کہ مولانا کے غیر مطبوعہ مکتوبات اور خطوط، نیز مولانا کی تردید میں مولانا امین اکاڑوی کے مضمون کا جواب جو مولانا عبد الغفور اسلام آبادی نے تحریر فرمایا ہے اس کو بھی شامل اشاعت کرلیں؛ تاکہ ان کی علمی عملی زندگی کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے۔ ان چند سطور سے مولانا مرحوم کی قیمتی زندگی کے لمحات پر پوری روشنی نہیں پڑتی ؛لیکن "مالا يدرك كله لا يترك كله" کے بموجب اتنا لکھنا بھی کافی ہے۔ اللہ تعالی مولانا شہیدؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان کے فیوض وبرکات کو زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

بنوری المسلک، کوثری المشرب

مفتی زرولی خان، کراچی

میں جب ایشیاء کے مقتدر ادارہ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخل ہوا تو سلف صالحین کی طرح شرعی اور سنت لباس میں محدث العالم شارح البخاری والترمذی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ جلوہ گر تھے۔ اس طرح ایک مدرس سادہ اور متواضع خلیق اور شکیل الوجہ سنت عمامہ زیب تن کئے ہوئے درجہ خامسہ میں سلم العلوم پڑھاتے تھے اور غالباً حضرت اقدس بنوری مرحوم کی طرف سے ان کو امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض ناپید شروح اور مسانید امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ پر ایک جامع اور معقول کام سپرد کیا گیا تھا جو وہ بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے تھے۔ آپ جمیع العلوم والفنون کے ماہر اور خاص کر منطق کے فن میں اور تخریج مآخذ حدیث میں اپنی مثال آپ تھے۔

اگلے سال یعنی درجہ خامسہ میں سلم پڑھانا آپ کے بجائے ایک اور استاذ کے سپرد ہوا جنہوں نے سلم کم اور سلم کے مصنف محب اللہ بہاری کو روزانہ تول ترازو فرماتے تھے، بعد میں پتہ چلا کہ اس شیخ کا ایک کمال علم یہ بھی ہے کہ جو کتاب پڑھانے اس کتاب اور اس کے مصنف سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ کاش! کہ ہمیں حضرت مولانا محمد امین صاحب جیسے صاحب فن اور غیر معمولی دور رس نگاہ کے مدرس سے کتاب پڑھنا نصیب ہوجاتا مولانا نے مجھ سے کئی مرتبہ وعدہ فرمایا کہ میں آپ کو علیحدگی پڑھاؤں گا مگر میری نالائقی نے اس کی اجازت نہ دی اور ان کے ہجوم مشاغل بھی اس پر مستزاد بہرحال بہت سارے واقعات ایسے ہیں جو آنکھوں دیکھا حال ہیں لیکن ضبط تحریر میں لانا سودمند نہیں ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

بہرحال ایک عجیب ماحول تھا۔ سوات کے مولانا فضل محمد صاحب جیسے شیخ الکل فی الکل اور حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی رحمہما اللہ تعالیٰ کی آپس میں زبردست سنگ تھی۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب غیر معمولی

صاحب جلال اور ضابطہ اور قاعدہ کے بے حد پابند تھے اور حضرت مولانا محمد امین صاحب ان کے خصوصی وفادار اور مددگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے نالہ نیم شب کمال اخلاص اور استاذان کبیران حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب مفتی اعظم پاکستان اور فقیہ النفس استاذ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب کے حسن تدبر اور حکیمانہ تدبیر نے جامعہ کو جس طرح کے تکالیف پُر آشوب احوال سے محفوظ فرمایا:

لے آیا ہے وہ سفینے کو کنارے بخیر

گو حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ بہت محسوس بنوری المسلک اور کوثری المشرب تھے وہ بھی حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور جامعہ کے قدر دان حد درجہ وفادار اور مخلص تھے اور حضرت مولانا فضل محمد صاحب جیسے محدث کبیر شاعر شہیر ادیب کے تقویٰ وورع کا کیا کہنا۔ اللہ تعالیٰ ان سے پر رحمتیں اور ان کے حسنات مستزاد فرمائے۔

عمر آخر میں جہادی تنظیموں سے خالص غیرت دین اور حمیت اسلام اور نصر حق کے رشتے سے وابستہ تھے، اپنے شیخ کی یاد میں آپ نے جامعہ یوسفیہ ہی اپنے ہاں شاہووام میں قائم فرمایا۔ اس دوران مولانا سے کئی خط وکتابت بھی ہوئی جن کو انہوں نے حسین نگاہ سے قبول فرمایا۔ کراچی تشریف آوری کے موقع پر غالباً شعبان اور رمضان میں تشریف فرما ہوتے تھے، ترجمہ وتفسیر کی نشست دیکھ کر غیر معمولی فرحت اور دعاؤں سے مالا مال فرمایا۔ اس عاجز وفقیر نے امام طحاوی کی مشہور کتاب شرح مشکل الآثار سولہ ضخیم جلدوں میں ان کے عظیم علوم اور منبع النظر اعلیٰ تحقیق کے بطور ضیافت ھدیہ خدمت کیا تھا جس کو وہ ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ طحاوی کے متعلقات اور ان کی مقتدر شرح جب چھپ گئی اور مولانا نے کرم بالائے کرم کرتے ہوئے کراچی کے جن علماء اور مخلصین کی خدمت میں خود بنفس نفیس لے کر آئے اس میں اس عاجز اور فقیر کا بھی نام تھا۔

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدن

بہر حال حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی سے متعلق مزید تفصیلات اور واقعات بھی نظر قاصر اور اطلاع ناقص میں موجود ہیں، مگر میں انہی سطور پر اکتفاء کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ ان کے پسماندگان اور لائق فائق صاحبزادوں کو یہ پسند آئے۔

ان کی شفقت کے الٰہی پائے یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لئے

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی متنوع خدمات

مولانا زاہد الراشدی، گوجرانوالہ

سہ ماہی ''المظاہر'' کوہاٹ کے احباب کی طرف سے فرمائش کی گئی ہے کہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی خدمات پر اس علمی مجلہ کی جس خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے اس کے لیے میں بھی کچھ لکھوں۔ ابتدا میں اس حوالہ سے تر ذو رہا کہ حضرت شہیدؒ سے براہ راست تعارف یا ملاقات کا کوئی منظر یاد نہیں ہے اس لیے زیادہ معلومات نہیں رکھتا اور معلومات کے بغیر کچھ لکھنا میرا معمول نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کے دور میں بنوری ٹاؤن میں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا، اگر حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ اس دور میں وہاں تھے تو یقیناً ملاقات و گفتگو ہوئی ہوگی لیکن ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ لیکن جب اس فرمائش کی تعمیل کے لیے معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو بہت سے ایسے پہلو سامنے آئے کہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں شامل ہونا میرے لیے واجب کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ مولانا شہیدؒ کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ وہ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز کے صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ علمی وتحقیقی کاموں میں ان کے معاون اور خدمت گار بھی تھے۔ بالخصوص ''مسانید الامام الاعظمؒ'' پر ان کا تخصص کا مقالہ اور امام طحاویؒ کی ''شرح معانی الآثار'' کے حوالہ سے ان کا تحقیقی کام حضرت السید بنوریؒ کے علمی ذوق ومشن کے ساتھ ان کی مناسبت تامہ کا اظہار ہے۔

طحاوی شریف کے ساتھ تھوڑی بہت آشنائی مجھے بھی حاصل ہے کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ایک عرصہ سے دورۂ حدیث کے اسباق میں طحاوی شریف کے چند ابواب کی تدریس کا مسلسل شرف رکھتا ہوں اور طلبہ سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ میری طالب علمانہ رائے میں امام طحاویؒ کو فقہی مجادلہ اور حنفیت کے دفاع کے ذوق واسلوب میں باقی پر بوجوہ تفوق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کے چند امتیازات کا حوالہ دے کر طلبہ کو تلقین کیا کرتا ہوں کہ فقہی مجادلہ اور استدلال واستنباط کے ذوق واسلوب کے ساتھ ساتھ فقہی اختلافات کی حدود اور مسائل کی درجہ بندی بھی امام طحاویؒ سے سیکھیں اور افراط وتفریط سے بچنے کے لیے اسے راہنما بنائیں۔

گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں جہاں میں گزشتہ نصف صدی سے خطابت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ایک نامور شاگرد محدث گوجرانوالہ حضرت مولانا عبدالعزیز سہالویؒ گزشتہ صدی عیسوی کے تیسرے اور چوتھے عشرہ میں خطیب رہے ہیں اور گوجرانوالہ کی سب سے قدیمی درسگاہ "مدرسہ انوار العلوم" انہوں نے ہی ۱۹۲۶ء میں قائم کی تھی۔ ان کا علمی ذوق حدیث وفقہ میں بہت بلند تھا۔ ان کے دو وقیع علمی کاموں میں بخاری شریف کے اطراف پر ان کی تصنیف "النبراس الساری" شائع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے جبکہ طحاوی شریف کی تخریج پر بھی انہوں نے اس دور میں کام کیا تھا جس کا مسودہ میں نے دیکھا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ فاضل ڈابھیل ان کے جانشین بنے جبکہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مجھے اپنی خدمت ونیابت کے لیے شریک کار بنالیا تھا اور بحمد اللہ تعالیٰ ان کے بعد بھی اسی خدمت پر مامور ہوں۔ امام طحاویؒ کی "شرح المعانی الآثار" پر حضرت مولانا عبدالعزیز سہالویؒ کے اس وقیع تحقیقی کام کی علمی حلقوں میں خاصی شہرت تھی۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ میری معلومات کے مطابق حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے بھی مولانا مفتی عبدالواحدؒ سے تقاضہ کیا تھا کہ اس کام کا مسودہ اشاعت کے لیے ان کے حوالہ کر دیں لیکن مفتی صاحب مرحوم کی تمنا تھی کہ وہ اشاعت کی خدمت خود سرانجام دیں۔ انہوں نے اس کی کتابت مکمل کرائی تھی جس کی پروف ریڈنگ حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خانؒ نے کی تھی جو اس زمانہ میں مدرسہ انوار العلوم کے صدر مدرس تھے۔ میں نے وہ مسودہ دیکھا تھا اور اس کی تھوڑی بہت ورق گردانی بھی کی تھی لیکن اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی علالت و وفات کے بعد تو وہ قصۂ پارینہ ہی بن گیا۔ اب حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی علمی خدمات میں طحاوی شریف کا تذکرہ پڑھ کر یہ سارا قصہ مجھے یاد آگیا اور میں نے ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے اس کا مختصر حوالہ دے دیا ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی "نثر الازھار علی شرح معانی الآثار" میں نے دیکھی نہیں ہے مگر مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے قلم سے اس کا تذکرہ اور خصوصیات پڑھ کر اس کی زیارت واستفادہ کا شوق کئی گنا بڑھ گیا ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے بارے میں یہ معلوم کر کے بھی ان کے ساتھ طبعی مناسبت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے شیخ مکرم حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی طرح درس نظامی کے مروجہ نصاب کو مزید بہتر بنانے کے خواہاں تھے اور نصابی کتابوں کے انتخاب میں "خوب سے خوب تر کی تلاش" کا ذوق رکھتے تھے۔ حضرت بنوریؒ نے اس حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر میرا ذوق بھی یہی چلا آرہا ہے کہ نصابی کتب کے انتخاب میں کسی ایک فہرست پر جمے رہنے کی بجائے "خوب سے خوب تر کی تلاش" کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ

نصابی علوم کی مروجہ کتابوں کے مصنفین کے بعد ان علوم میں جو ارتقا ہوا ہے اس سے اپنے طلبہ کو وابستہ رکھنے کے لیے ہر علم وفن میں کوئی نہ کوئی جدید کتاب بھی شامل نصاب ہونی چاہیے اور ہمارے فضلا اور مدرسین کو علوم وفنون میں مسلسل ارتقا سے بے خبر اور لاتعلق نہیں رہنا چاہیے۔

مولانا محمد امین شہیدؒ کا یہ ذوق واسلوب بھی یقیناً قابل توجہ بلکہ لائق تقلید ہے کہ اہل سنت کے عقائد وحقوق کے تحفظ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے ناموس کے دفاع کی جدوجہد کو علمی وفکری بنیادوں پر منظم ہونا چاہیے اور اس سارے کام کو محض تحریکی اور جذباتی ماحول کی نذر نہیں کر دینا چاہیے۔ اس حوالہ سے میری گزارش یہی ہوتی ہے کہ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کے ذوق وطرز کے احیا کی ضرورت ہے اور نہ صرف پاکستان بلکہ مشرق وسطیٰ کی مجموعی صورتحال اور مستقبل کے خدشات وخطرات کو سامنے رکھتے ہوئے ترجیحات کا ازسرنو تعین وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے بارے میں یہ معلوم کر کے مجھے ”میں نے یوں جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ کی کیفیت اپنے دل میں محسوس ہونے لگی کہ انہوں نے افغان طالبان اور کمانڈر احمد شاہ مسعود کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ خواہش ایک دور میں مجھے بھی ستاتی رہی ہے اور میں نے اس کا بعض مواقع پر اظہار بھی کیا ہے بلکہ ایک موقع پر قندھار میں مولانا محمد نبی محمدیؒ کے ساتھ ملاقات کے دوران ان سے عرض کیا تھا کہ روسی جارحیت کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کے تمام گروپوں کو افغانستان کے مستقبل کے بارے میں مل کر فیصلہ کرنا چاہیے اور اب بھی میری رائے یہ ہے کہ اس کے بغیر شاید افغانستان کو موجودہ دلدل سے نہ نکالا جا سکے۔

کمانڈر احمد شاہ مسعود کے بارے میں یہ بات میں ایک عرصہ قبل لکھ چکا ہوں کہ علماء کرام کے ایک وفد کے ہمراہ پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کے دور صدارت میں مجھے کابل جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت احمد شاہ مسعود وزیر دفاع تھے۔ انہوں نے مولانا فداء الرحمن درخواستی اور راقم الحروف کو یہ کہہ کر اپنا مہمان بنا لیا تھا کہ میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ کا شاگرد ہوں اور ان کے دورہ تفسیر میں خانپور میں شریک ہو چکا ہوں۔ میری اس بات سے بہت سے دوستوں کو شاید اتفاق نہ ہو مگر پورے شرح صدر کے ساتھ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ جن جہادی گروپوں نے روسی جارحیت کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا اور آپس میں متحدہ محاذ بھی بنا لیا تھا ان کو دوبارہ اکٹھے ہونا چاہیے اور مل جل کر جہاد افغانستان کے منطقی نتائج کے حصول اور افغانستان کی آزادی وخود مختاری کے لیے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

بہرحال حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی زندگی اور خدمات پر سہ ماہی ’المظاہر‘ کی خصوصی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرما کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نافع بنائیں اور حضرت شہیدؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

میرے عزیز از جان بھائی

مولانا محمد صالح، دیر

نگہ بلند، جان پرسوز، سخن دلنواز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

برادر مکرم، حبیب محترم حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی شہید رحمہ اللہ اسلاف کے قافلہ کے راہ رو تھے، لیکن وہ قافلہ چلتے چلتے آگے نکل گیا اور یہ پیچھے رہ گئے۔ آپ کی ذہنی سطح، بلند فکر، عبقری نگاہ کسی ایک حوالے سے بھی اس زمانے کی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ کی عبادت کو دیکھتے تو صحابہؓ کے تذکرے زندہ دکھائی دیتے۔ آپ کا تقوی دیکھتے تو گزشتہ زمانے کے اولیاء اللہ یاد آجاتے۔ آپ کا معاملہ دیکھتے تو اسلاف کی یاد تازہ ہوجاتی۔ میں حضرت کی رفاقت کو اپنے لئے سرمایہ سعادت سمجھتا ہوں۔ میری گراں مایہ متاع زیست آپ کی رفاقت کے ایام تھے۔ وہ ہر حیثیت سے ہم سے آگے تھے لیکن اُنہوں نے اپنی تواضع وانکساری کے باعث ہمیشہ ہمیں اپنے بڑوں کی جگہ بٹھایا، میں تیس سالہ رفاقت پر نظر دوڑاتا ہوں، تو سینکڑوں واقعات اور ہزاروں یادیں ہیں، جو ایک ایک کرکے آپ کی یاد دلاتی ہیں۔ آپ کے کس پہلو کو لوں؟ کس کو چھوڑوں؟ زندگی کے چند اوصاف ہوتے تو گنوا دیتا۔ لیکن آپ تو سراپا کمال تھے، کس چیز کو لیا جائے اور کیسے بیان کیا جائے؟ میرے دامن میں الفاظ کا ایسا ذخیرہ نہیں جو حضرت مولانا کی صفات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ الفاظ وتعبیرات آپ کے خصائص وصفات کے سامنے درماندہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور اپنی عاجزی کا اظہار کر رہے ہیں۔ لہذا میں پیشگی معذرت خواہ ہوں کہ میرے قلم میں آپ کے اوصاف وفضائل کو بیان کرنے کی سکت ہرگز نہیں۔ بس جو یادیں برجستہ زبان قلم پر آگئیں، اُنہیں قارئین میرے جذبات کا ناقص ترجمان سمجھ کر قبول کرلیں۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کی فراغت سے دو سال قبل ۱۹۶۵ء میں مجھے بنوری ٹاؤن سے دورہ حدیث شریف کی سعادت حاصل ہوئی، اس لئے جامعہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں تو کوئی تعارف وملاقات نہ ہوسکی۔

جب حضرت الاستاذ مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ بنوری ٹاؤن سے اپنے علاقہ مینگورہ واپس تشریف لائے اور یہاں مظہر العلوم میں تدریس شروع فرمائی تو اولاً یہیں مولانا محمد امین صاحبؒ کی زیارت وملاقات کا شرف ملا۔ مخدومی مکرم مولانا فضل محمد صاحبؒ کا آپ سے والہانہ مراسم، حد درجہ محبت، پیار اور چاہت کا تعلق ہمارے لئے قابلِ رشک تھا۔ حضرت نے اپنے صاحبزادوں مولوی بشیر احمد اور قاری نذیر احمد کو مولانا امین صاحبؒ کے پاس ہنگو تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ ایک دفعہ حضرت نے بندہ کو صاحبزادگان کے حال واحوال معلوم کرنے کی غرض سے ہنگو بھیجا۔ یہ مولانا محمد امینؒ سے دوسری ملاقات تھی۔ بس ملاقات کیا تھی؟ دل کا سودا تھا!!! ہم تو بک ہی گئے۔ پھر ایسے کھُلے کہ ہنگو ہمارا دوسرا گھر بن گیا۔ کبھی دیر، کبھی سوات اور کبھی ہنگو، مولانا امین صاحبؒ ہمارے ہاں اور ہم اُن کے ہاں۔ ہفتوں ایک دوسرے کے ہاں قیام ہوتا۔ محبتوں کا زمانہ کتنا خوبصورت تھا، کتنا حسین تھا، کتنا اُس دور میں خلوص تھا، کیسی باہم محبت واُلفت ہوتی۔ اسے میں بیان کروں تو کیسے کروں؟ بھائی کیا ہوتے ہیں اور بھائیوں کی محبت کیا ہوتی ہے؟ ہم تو یک جان دو قالب تھے۔ ہماری محبت کا رشتہ ان سب رشتوں سے بڑھ کر تھا۔ یقیناً محبت وخلوص کا مزہ جنہوں نے چکھا ہو، وہی میری ان باتوں کی تہہ تک رسائی پا سکتا ہے، ورنہ ظاہر بین تو انہیں مبالغہ کہے گا۔

یہ ہمارے تعلق کے ابتدائی ایام کی بات ہے، حضرت مولانا محمد امین صاحب دیر میں مدفون ایک بزرگ کے مزار پر تشریف لائے تھے۔ یہ بزرگ ''پیارے باباجی'' کے نام سے معروف تھے۔ کربوغہ شریف میں مفتی مختار الدین صاحب کے دادا کے خلیفہ تھے۔ ۱۲ سال اُن کے ہاں قیام کر کے سلوک کی منزل طے کی تھی اور ۱۹۴۶ء میں وفات پائی تھی۔ مولانا محمد امین صاحبؒ پر مسجد میں نماز کے بعد اچانک میری نظر پڑ گئی۔ بندہ نے نماز کے بعد روکنا چاہا کہ چائے وغیرہ پی کر جائیں لیکن مولانا کو جلدی تھی، میں سیدھا سادہ دیہاتی آدمی ہوں، اہلِ علم کے آداب سے ناواقف ہوں، مجھے اصرار کر کے خدمت کا طریقہ نہیں آیا، مولانا نے ایک بار معذرت کی تو میں نے بھی الوداعی مصافحہ کر کے جانے دیا کہ جب نہیں رُک رہے تو لازماً کوئی ضرورت ہوگی، اس لئے میں کیوں اصرار کر کے روکوں۔ انہی دنوں حضرت مولانا فضل محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں میری حاضری ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! مولانا محمد امین صاحب تشریف لائے تھے، لیکن رُکے بغیر چلے گئے۔ حضرت نے انتہائی تعجب کے لہجے میں فرمایا کہ کیا ویسے ہی چلے گئے؟ آپ نے کوئی ضیافت نہیں کی؟ روکا نہیں؟ میں نے عرض کیا: حضرت انہیں جلدی تھی، اس لئے جانے کا فرما رہے تھے تو میں نے اصرار نہیں کیا۔ اس پر حضرت غصہ ہوئے اور مجمع میں مجھے ڈانٹتے ہوئے فرمانے لگے: اسے دیکھو! یہ جانور کہہ رہا ہے کہ رُک نہیں رہے تھے۔ بھئی! تم روکتے، اکرام کرتے، کھانے، چائے کا پوچھتے، یہ کیا طریقہ ہے کہ مہمان کو ویسے ہی رخصت کر دیا۔ غرض بڑی سخت ڈانٹ پلائی۔ اس سے مولانا فضل محمد

صاحبؒ کے ہاں مولانا محمد امین صاحب کے مقام و منصب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی سخت عبرت ہوئی اور آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ اتنے معزز مہمان کی خدمت تو ضروری ہے۔

اتفاق سے چند دنوں بعد حضرت مولانا محمد امین صاحب پھر کسی کام سے تشریف لے آئے۔ اس بار بھی جلدی تھی لیکن میں نے زبردستی روک لیا، پھر میں نے ان کو ایک بزرگ کا واقعہ سنایا، جن کے مرید نے اُن کے مہمان کا اکرام نہ کیا تھا، تو اُنہیں خواب میں بزرگ کی طرف سے سخت ڈانٹ پڑی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی وجہ سے پچھلی بار اتنی سخت ڈانٹ پڑ چکی ہے۔ اگر اس بار نہیں رکیں گے تو خواب میں مولانا فضل محمد صاحب کی ڈانٹ پڑے گی پھر حضرت کی ڈانٹ کا سارا واقعہ عرض کر دیا۔

اس پر فرمایا کہ اُس دن آپ نے مجھے رخصت کر کے اتنا احسان کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اگر میں دس منٹ بھی آپ کے ہاں رُکتا تو آگے راستے میں میرا بڑا حرج ہو جاتا۔ حضرت استاذ صاحب جو کچھ فرمائیں وہ فرماتے رہیں گے لیکن ہم نے ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے اور بے تکلف رہنا ہے۔ الغرض مولانا فضل محمد صاحبؒ کے ہاں ہم نے سب سے زیادہ تذکرہ مولانا محمد امین صاحبؒ ہی کا سنا اور محسوس ہوتا تھا کہ حضرت کو اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ سے محبت اور تعلق ہے۔

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ کا معمول تھا کہ جب تک حضرت مولانا سراج الیوم صاحب ''گڑھی باباجیؒ'' زندہ تھے، آپ رمضان کا مہینہ حضرت کے ہاں آ کر گزارتے تھے، میں بھی رمضان میں حاضر ہو جاتا۔ سردیوں کی راتوں میں تراویح کے بعد ہم لیٹ جاتے لیکن جب میری آنکھ کھلتی تو دیکھتا کہ مولانا محمد امین صاحبؒ ایک کونے میں نفلوں کی نیت باندھ کر کھڑے ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں، آپ کی نماز سے تواضع کی ایک عجیب شان ٹپکتی تھی، میں لیٹے لیٹے یہ مناظر دیکھتا رہتا۔ گھنٹوں آنکھ کھلی رہتی، آپ لمبی لمبی رکعتوں میں مشغول رہتے۔ رکوع اور سجدے کی شان قیام سے عجیب ہوتی، مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری آنکھ لگتے ہی یہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے ہیں اور پھر سحری تک یہ معمول رہتا۔ یہاں تک کہ حضرت باباجیؒ کے گھر سے ہمارے لئے سحری آ جاتی۔ ساری رات کھڑے ہو کر عبادت کے باوجود آپ کا تیقظ اور نشاط دیکھنے کا ہوتا، دن بھر بھی معمولات کی ویسی ہی شان رہتی، کہیں مختصر قیلولہ کر لیتے تو ٹھیک، ورنہ عبادت و تلاوت اور ذکر و شغل میں مشغول رہتے۔ رمضان بھر آپ کا یہی معمول رہتا۔ حضرت باباجیؒ کی وفات کے بعد اپنی مسجد میں پہلے دس دن اور پھر بعد میں پورے مہینے کا اعتکاف شروع فرمایا اور عمر کے آخری حصے میں بھی عبادت و ریاضت کی وہی شان تھی جو ہم نے جوانی میں ملاحظہ کی۔

میں نے آغاز میں عرض کیا کہ آپ کی نگاہ کی سطح ہماری سوچوں سے بہت بلند تھی، ہماری نظر میں ایک بات قابل

تعریف ہوتی لیکن حضرت کی گہری بصیرت اسے لایعنی قرار دیتی۔ ایک بار بندہ ہنگو میں حضرت کے ہاں مقیم تھا۔عزیزم مولوی یوسف صاحب اُس وقت بچے تھے،اُس وقت نیا نیا ٹیلیفون لگا تھا۔حضرت کا نمبر''۶۲۲۲۲۴'' مجھے اب بھی یاد ہے۔مولوی یوسف نے اس نمبر کی کوئی ایسی خصوصیت بتائی کہ مجھے بڑی بھلی لگی کہ اس بچپنے میں اس کا ذہن ماشاءاللہ اس باریکی تک پہنچ گیا۔غالباً وہ یہ تھی کہ کل چھے ہندسے ہیں،لہٰذا شروع میں چھ ہے۔اور چار دفعہ اس میں دو دو ہے اور جتنی دفعہ دو ہے،وہی ہندسہ آخر میں ہے یعنی چار۔اس طرح نمبر یاد رکھنا آسان رہ جاتا ہے۔میں نے بطور تعریف مولانا محمد امین صاحب کے سامنے یہ بات کہہ دی کہ ماشاءاللہ یوسف بچہ ہے لیکن اس کا ذہن دیکھو،کہاں تک پہنچا ہوا ہے۔اس پر مولانا پریشان سے ہوگئے اور مجھ سے فرمانے لگے،مولانا! یہ بات قابل تعریف نہیں پریشان کن ہے کہ ابھی سے اس کی توجہ لایعنی اُمور کی طرف ہے اور ان میں دلچسپی لے رہا ہے یہ تو اس بات کی علامت ہے کہ اس کا رجحان اپنی ذہنی صلاحیتوں کو یونہی بے مصرف خرچ کرنے کی طرف ہے۔میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا کہ دیکھو حضرت کی نظر کہاں تک گئی۔ان حضرات کے ہاں تربیت میں ان معمولی باتوں کی بھی فکر رکھی جاتی اور اس قسم کی عام قابل تعریف باتیں ان کے معیار سے فروتر ہوتیں۔

یہ عالم عیش وعشرت کا یہ حالت کیف ومستی کی
بلند اپنا تخیل کر یہ سب باتیں ہیں پستی کی

یہ تو نگاہ بلند کی بات تھی،اب جان پرسوز کی سنیں۔ملت وقوم کے لئے جب بھی قربانی اور کچھ کر گزرنے کا مرحلہ آیا تو آپ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان عمل میں آئے۔اس خصوصی اشاعت میں اُمید ہے کہ ساتھی وہ سارے حالات وواقعات بیان کریں گے جو حضرت کی زندگی کے اس پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔میرے پیش نظر ایک واقعہ ہے، کوہاٹ میں ایک دفعہ ناموس صحابہؓ کے سلسلے میں احتجاجی تحریک جاری تھی،حضرت بھی اس تحریک میں شریک بلکہ پیش پیش تھے،اس تحریک کو کچلنے کے لئے جابر بیوروکریسی اپنے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے پرامن جلوسوں پر تشدد کے پروانے جاری کررہی تھی۔اس سلسلے میں اس جلوس پر پولیس کا بدترین لاٹھی چارج اور شیلنگ ہوئی۔حضرت فرماتے تھے کہ ہم لاٹھی چارج اور شیلنگ سے بچنے کے لئے ایک مسجد میں داخل ہوئے تو پولیس بوٹوں سمیت اندر داخل ہوئی اور ہم پر تشدد کیا،اس میں حضرت کا سر مبارک اور ہاتھ سخت زخمی ہوئے۔مولانا فضل محمد صاحبؒ کو پتہ چلا تو سخت بے چین ہوئے، مجھے ساتھ لے کر مینگورہ سے چل دیئے۔ہم دونوں جب عیادت کے لئے ہنگو حاضر ہوئے تو حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ نے آگے بڑھ کر مولانا محمد امین صاحبؒ سے پوچھا کہ کس جگہ زخم آئے ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ مولانا محمد امین صاحبؒ نے سر سے پگڑی اُتار کر سر جھکایا کہ حضرت! سر پر اس جگہ زخم لگے

ہیں تو مولانا فضل محمد صاحبؒ نے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ کر اسے بوسہ دیا اور فرمایا کہ اسے چومنا میری سعادت ہے کیونکہ یہ زخم امی عائشہؓ کے ناموس کی خاطر لگا ہے۔

سخن دلنواز پر تو زمانہ گواہ ہے۔اس کی کیا سناؤں؟ آپ کی ایک ایک ادا نرالی تھی۔تواضع للبیت،خلوص،مہمان نوازی،دوستوں کے آرام وراحت کا خیال،حب فی اللہ،بغض فی اللہ،غیرت وحمیت اور مروت یہ صفات تو جھلکتی نظر آتیں۔آپ کا ایک اور اہم وصف نمود ونمائش کے مظاہر سے بچنا تھا۔پوری زندگی سادگی اور بے تکلفی سے بسر کی،تصنع وبناوٹ سے نفرت تھی،سیدھے سادے آدمی تھے،بے تکلف رہتے اور بے تکلفی پسند کرتے تھے۔

ایک دفعہ مدرسہ یوسفیہ میں جلسہ تھا،عزیزم مولانا عدنان کاکاخیل نے مجھے بتایا کہ میں نے حضرت کو مشورہ دیا کہ فلاں صاحب کو بلائیں،فلاں کو دعوت دے دیں۔تو حضرت نے اس پر اپنے مخصوص انداز میں فرمایا:ناں ناں بھئی!میں نے مقررین نہیں بلانے،نہ میں خطیب جمع کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ہمارے جلسوں میں تو بس ایک گونگا میں خود ہوتا ہوں اور ایک گونگا محمد صالح ہوتا ہے۔اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ نہ تو مجھے روایتی تقریریں آتی ہیں اور نہ حضرت نے کبھی تقریریں اور بیانات کی تھیں،بس سیدھی سادی گفتگو کی جو توفیق ہو جاتی وہ کر دیتے۔اس سے حضرت کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل مدارس میں جلسوں میں نمود ونمائش اور چندے اکٹھے کرنے کی غرض سے مخصوص خطبا کے بیانات کا رواج چل پڑا ہے،اسے کس نظر سے دیکھتے تھے؟

حضرت میں بندہ نے غایت درجہ کا ادب دیکھا۔مولانا فضل محمد صاحبؒ کی اولاد میں مولوی بشیر احمد اور مولوی نذیر احمد آپ کے شاگرد تھے۔لیکن استاذ زادے ہونے کی بنا پر ان کا بھی لحاظ اور احترام رکھتے۔حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ کی وفات کے بعد مدرسہ کے اہتمام وانتظام میں اولاد نے پہلے کچھ سستی دکھائی،بعد میں انہیں کچھ فکر ہوئی تو ہم سب کو بلا کر مشاورت کرنی چاہی۔اب حضرت ضرورت سمجھتے تھے کہ ان کو ذرا تنبیہ کر دی جائے لیکن غایت ادب ومروت سے خود کچھ نہیں فرمایا،اس لئے کہ استاذ زادے تھے۔کوہستان کے مولانا رحیم اللہ صاحب بھی شریک مجلس تھے انہوں نے صاحبزادگان کی ذرا خبر لی اور خوب تنبیہ فرمائی۔بعد میں حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ ہم تو کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے لیکن مولانا رحیم اللہ صاحب نے دل ٹھنڈا کر دیا۔مقصد یہ ہے کہ آپ پر حد درجہ مروت غالب تھی اور آپ کا مقصد جب دوسرے ذریعے سے پورا ہوا تو اس پر خوشی کا اظہار فرمایا۔

چونکہ بندہ کا تعلق مولانا فضل محمد صاحبؒ سے بہت زیادہ گہرا تھا اور سب سے زیادہ وقت بھی حضرت کے ساتھ میرا ہی گزرا،اس لئے مولانا محمد امین صاحب کا مجھ سے پرزور مطالبہ رہا کہ حضرت کے احوال اور افادات کا ایک مجموعہ تیار کرلوں،دوسری طرف میری تحریر سے عدم مناسبت اور ذاتی سستی اس میں آڑے رہی۔کئی بار ارادہ کیا،لیکن

جرأت نہ کرسکا۔ جب آپ کا اصرار بڑھا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! کچھ لکھنے کے لئے اخذ کرنے والی نگاہ بھی تو ہونی چاہیے، میں کیا لکھوں گا؟ مجھے تو کوئی اہم بات یاد نہیں، آپ نے فرمایا کہ جس بات کو غیر اہم سمجھتے ہو بس اسی کو لکھ دو۔ غرض مختلف طریقوں سے مجھے مائل کرتے رہے لیکن میں ہمت نہ کرسکا۔ ایک بار کسی نے مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کے افادات کا سیٹ سامنے لاکر رکھا تو فرمایا کہ عن قریب میرے استاذ اور شیخ مولانا فضل محمد صاحبؒ کے افادات بھی اسی طرح منظر عام پر آجائیں گے اور میں نے یہ خدمت مولانا محمد صالح کو سونپی ہے لیکن افسوس کہ میں آپ کی تمنا پوری نہ کرسکا شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی موقع فراہم کردے۔

بندہ نے ایک بار حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی بزرگوں کے حالات محفوظ ہیں لیکن ہمارے خطے کے بڑے بڑے باکمال اولیا کے حالات ان سے کئی حوالوں سے بڑھ کر ہیں لیکن ان کو محفوظ کر کے جمع نہ کیا جاسکا حالانکہ متعلقین میں ضرور لکھنے والے لوگ تو ہوں گے۔ فرمایا کہ دراصل اس خطے کے بزرگوں پر اخفا کا غلبہ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں سے ان کے مزاج کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں، اس لئے ان کے حالات وافادات بھی مخفی رہے اور منظر عام پر آنے کی سبیل پیدا نہ ہوسکی۔

حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ فرماتے تھے کہ تین جگہیں میری تسلی کی ہیں، وہاں جاکر ہر طرح کا سکون ملتا ہے، ایک ہنگو مولانا محمد امین صاحب کے پاس، ایک ریحان پور دیر مولوی محمد صالح کے پاس اور ایک میرہ ضلع بشام قاری محمد اقبال صاحب کے والد مولانا نذیر صاحب کے پاس۔ یہ حضرت کا کرم تھا کہ ہم بے حیثیت لوگوں کو اتنی حیثیت بخشی، ان شاء اللہ تعالیٰ ان کا یہ حسن ظن قیامت میں بھی ہمارے کام آئے گا۔

مولانا محمد امین صاحبؒ کے ساتھ گزرے ایام کی یادیں تو بہت ہیں بس انہی پر اکتفا کرتا ہوں، آپ کی ناگہانی شہادت کی اطلاع فون پر حافظ خالد محمود نے دی، ہمارے دیر سے آگے مالاکنڈ میں انہی ایام میں آپریشن جاری تھا۔ راستے بند تھے۔ باجوڑ سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ جنازے پر نہ جانے سکنے کا قلق ہمیشہ رہے گا۔ عزیز از جان دوست کی جدائی کوئی معمولی زخم نہ تھا، یہ ایک کاری وار تھا جس نے قلب وجگر مجروح کردیئے اور زندگی کی راحت وسکون کا ایک بہترین ٹھکانہ اور سایہ ہم سے چھن گیا۔ آپ کی یاد میں اب رونے اور آنسو بہانے کے سوا کچھ باقی نہیں۔ آپ کی یادیں ہیں جب دل میں امڈتی ہیں تو دیر تک رلاتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں بروز قیامت سعادتوں میں ان کے ساتھ جمع کردے۔ آمین ثم آمین

مولانا محمد امین شہیدؒ کے دونمایاں اوصاف

شیخ الحدیث مولانا عبدالمنان، کوہاٹ

بندہ ضعف و کمزوری کا شکار ہے اور عمر کے اس حصے میں ہے جس میں لکھنا پڑھنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن سہ ماہی المظاہر کے احباب بندہ کے پاس اس غرض سے آئے کہ محدث جلیل مولانا محمد امین اورکزئی صاحب رحمہ اللہ کا چونکہ تلمذ کا تعلق رہا ہے اس کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کردیں۔ مولانا جس دور میں ہمارے ہاں طالب علم تھے، اسے ایک طویل زمانہ گزر گیا ہے، اس دور کے واقعات وحالات اب حافظے میں محفوظ رہنا ممکن نہیں، تاہم ان کی خواہش پر چند دھندلی یادیں پیش کر دیتا ہوں۔

مولانا محمد امین صاحب غالباً ۱۹۶۲ء میں ہمارے ہاں مدرسہ انجمن تعلیم القرآن محلہ پراچگان کوہاٹ میں پڑھنے کے لئے تشریف لائے۔ بہت ہی خاموش اور معصوم طالبعلم تھے۔ تین سال تک ہمارے ہاں زیر تعلیم رہے، بندہ سے انہوں نے مختصر المعانی اور سلم العلوم، کافیہ اور فصول اکبری وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

زمانہ طالب علمی میں وہ تمام طلبہ کرام سے ممتاز اوصاف کے حامل تھے، اور ان کے چہرے پر سعادت کے آثار بتلاتے تھے کہ یہ بچہ مستقبل میں امت کی علمی و عملی مقتدا کی حیثیت سے سامنے آئے گا، میں بطور خاص ان کے دو اوصاف کا ذکر کروں گا۔ یہ دو اوصاف اسباب کی دنیا میں آپ کی مقبولیت کا سبب تھے۔

ایک تو حد درجہ ذہین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی حذاقت وذہانت سے نوازا تھا کہ ہم نے اپنی زندگی میں کم ہی ایسے طلبہ کو دیکھا ہے۔ استاد کی تقریر کو پوری طرح ازبر کر لیتے تھے، کتاب کے مغلق مقامات میں مفہوم اور مطالب تک کامل رسائی پالیتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ یہ علی وجہ البصیرۃ کتاب کو سمجھ رہے ہیں۔ درسگاہ میں بظاہر بڑے خاموش رہتے تھے۔ لیکن ذہانت چھلکتی نظر آتی تھی۔ عادت یہ تھی کہ استاذ کے سبق میں حاضری سے قبل ہی ذاتی مطالعہ سے سبق حل کر لیتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد جنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کے میبذی کا سبق تھا ایک دفعہ حضرت نے فرمایا تھا کہ میبذی میں ''قوس قزح'' کے حوالے سے ایک انتہائی مغلق اور مشکل مقام تھا جو کسی

سے حل نہ ہو سکا تھا لیکن مولانا محمد امینؒ نے اس کو ایسے بسط وتفصیل سے کھول کھول کر واضح کیا کہ میں رشک کرتا رہ گیا۔ واقعتاً وہ اسی استعداد کے حامل تھے کہ معقولات ومنقولات کی کوئی کتاب ان کے دسترس سے باہر نہ تھی۔

دوسرا وصف ان کا غایت ادب تھا، اساتذہ کا بہت ہی ادب واحترام کرتے تھے، تواضع کے وصف سے مالا مال تھے۔ عاجزی وانکساری سے ملتے تھے، بندہ سے جب بھی ملاقات ہوئی تو علم وعمل کے اونچے مقامات پر فائز ہونے کے باوجود انہیں ہمیشہ نیازمندانہ ادب کا مجسمہ پایا۔

ہمارے ہاں سے موقوف علیہ کر کے وہ کراچی تشریف لے گئے، حضرت مولانا بنوریؒ کی صحبت نے انہیں علمی اور عملی اعتبار سے مزید کندن بنایا۔ کچھ عرصہ وہاں تدریس کی خدمت انجام دے کر اپنے علاقہ میں ایک معیاری درسگاہ قائم کی، اپنی خداداد قابلیت اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل رسوخ کی وجہ سے طلبہ کا خاص مرجع بنے۔ آپ نے اپنے مدرسہ جامعہ یوسفیہ میں مجھے بھی دعوت دی، طلبہ کے سامنے بیان بھی ہوا۔ ان کا کتب خانہ بھی اس خطے میں نایاب کتب خانوں میں سے تھا۔

درحقیقت علم سے عشق حد تک شغف اور اساتذہ کا غایت درجہ ادب ہی طالبعلم کے دو ایسے کمال ہیں جو اس کے علم وعمل کے اونچے مقامات تک پہنچادیتے ہیں۔ مولانا کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان دو اوصاف کی برکت سے اپنے خاص عنایات سے نوازا۔ ان کی شہادت سے علمی حلقوں میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے فیض کو جو تلامذہ، مدرسہ اور تصانیف کی شکل میں موجود ہے، زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سہ ماہی المظاہر کے احباب کو بھی جزائے خیر دے کہ وہ مولانا کے علمی وعملی کمالات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

بندہ دل سے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ پر شائع ہونے والے اس خصوصی شمارے کو قبولیت عطا فرمائے اور اسے زیادہ سے زیادہ پھیلائے اور اس کی اشاعت کو منتظمین کے لئے آسان فرمائے۔ آمین

میرے قابل فخر روحانی فرزند

مولانا نادر خان، ہنگو

فقیر عمر کے اب اس حصے میں ہے کہ لکھنا پڑھنا ایک خواب ہے، کچھ قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق ہوجاتی ہے اور بخاری شریف کی روزانہ کچھ تلاوت کر لیتا ہوں، ہمت ہو تو چند تفاسیر دیکھ لیتا ہوں، صاحب فراش ہوں اور اس انتظار میں ہوں کہ کب بلاوا آتا ہے۔ مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد طفیل سلمہما اپنے احباب کے ساتھ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کچھ یادیں سننے تشریف لائے۔ بندہ کا حافظہ ضعف اور بیماری کے باعث کافی کمزور ہو چکا ہے، لیکن جو باتیں یاد آگئی ان شاء اللہ وہ عرض کروں گا۔

بندہ نے ۱۹۵۳ء میں حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتوی رحمہ اللہ کے ہاں دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، تو انجمن تعلیم القرآن پراچہ محلہ کوہاٹ میں ۱۰ روپے ماہوار پر مدرس ہو گیا، ہمارے زمانے میں درجہ بندی نہ تھی، طلبہ اپنے اساتذہ کے مشورے سے حسب استعداد متفرق کتابیں پڑھتے تھے، بندہ نے خود سولہ سال طالب علمی کی تعلیم القرآن میں بندہ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھایا کرتا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں مولانا محمد امین صاحبؒ ہمارے ہاں طالبعلم کی حیثیت سے آنے۔ بڑے ہی معصوم، خوبصورت، خاموش اور شرمیلے سے بچے تھے۔ اہل علاقہ ہونے کے ناطے میری ان پر نظر بھی رہتی تھی اور خاص تعلق بھی تھا۔ ذہین اتنے تھے کہ چند ہی دنوں میں تمام اساتذہ کے منظور نظر بن گئے۔ بالخصوص مولانا عبد الغفار صاحب صدر مدرس کے چہیتے شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ ہم نے اپنے زمانہ طالبعلمی و تدریس میں اس پایے کا ذہین طالب علم نہیں دیکھا تھا، اس لئے فطری طور پر ہر استاذ کی ان سے محبت تھی۔ شرافت، پارسائی، ادب واحترام، تقویٰ اور خاموشی میں کوئی ثانی نہ تھا۔

بندہ سے آپ نے باقاعدہ "قال أقول" پڑھی اور خارجی اوقات میں بھی مختلف کتب کے سماع میں شریک ہوتے رہے۔ میں نے درسگاہ میں انہیں مثالی ادب کرنے والا پایا۔ کبھی یاد نہیں کہ استاذ سے اونچی نگاہ کر کے بات کی ہو، ہمیشہ نیچی نگاہ رکھ کر استاذ سے بات کرتے تھے اور بڑے ہی مؤدب بیٹھتے تھے، مجال تھا کہ استاذ کے سامنے پہلو

بدل لیں، ایک ہی طرز میں دوزانوں بیٹھے رہتے جو کتاب پڑھتے وہ پوری طرح مستحضر ہوتی۔

ایک دفعہ ایک افغانی طالبعلم مجھ سے شرح تہذیب کے کسی مقام سے متعلق استفسار کرنے آئے۔ مولانا محمد امین صاحبؒ بھی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اس وقت شرح جامی وغیرہ کتابیں پڑھ رہے تھے۔ وہ افغانی طالبعلم بڑے زوردار انداز میں اونچی آواز سے اپنا اعتراض بار بار پلٹ کر دہرا رہے تھے۔ میں نے کچھ کہا تو وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا کہ اسی اثنا میں مولانا محمد امین صاحب نے ان طالبعلم کو اعتراض کا بھرپور، مسکت اور باحوالہ جواب دے دیا۔ وہ طالبعلم ان سے عمر میں بھی بڑے تھے، انہوں نے غالباً اس میں اپنی سبکی محسوس کی، فوراً بول پڑے کہ شرم کرو! استاذ کے سامنے بولتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ مولوی صاحب! غصہ نہ ہوں، یہ میرا بھانجا ہے اور جو کچھ ہم منطق سے متعلق کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ سارا انہیں زبانی ازبر ہے، اس پر وہ خاموشی سے کتاب اٹھا کر چل دیا۔ واقعی بندہ نے معقولات پر آپ جیسی دسترس اپنے دور میں بھی نہیں دیکھی اور اب تو معقولات کا دوران ہی نہ رہا۔

جب مولانا کراچی تشریف لے گئے، تو بندہ سے مسلسل رابطہ رکھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک مستند قابل، ماہر علم وفن، بہترین محقق، وسیع النظر محدث اور عارف باللہ بن کر سامنے آئے، ہمارے لئے ان کا تلمذ باعث فخر ہو گیا، بلکہ میں تو انہیں اپنے لئے آخرت کا ذخیرہ اور نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا، اپنے سے علم وعمل ہر حوالے سے برتر سمجھتا بھی تھا اور پاتا بھی تھا۔

بندہ نے کئی سال نحو میر کا درس دیا اور بڑے شوق سے دیا، ہمارے مدرسہ کے ممتاز مدرس مولانا احمد گل صاحبؒ بندہ کے بارے میں اپنے حسن ظن کے یہ کلمات ارشاد فرماتے تھے کہ مولوی نادر خان سے نحو میر پڑھنے والے کو شرح جامی پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو شرحوں کا اتنا رواج نہ تھا، ایک دن مجھے کراچی سے ایک پارسل موصول ہوا، دیکھا تو مولانا محمد امین صاحب نے نحو میر کی شرح ''بدر منیر'' ارسال فرمائی تھی۔ بڑا ہی دل خوش ہوا اور دعائیں دیں۔ بندہ حج کے لئے گیا تو واپسی کراچی سے ہوئی، آپ اس وقت بنوری ٹاؤن کے مدرسہ میں مدرس تھے، آپ نے بندہ کو اپنے ہاں ٹھہرایا، کھانے کی دعوت کی اور بڑی ہی خدمت فرمائی۔

فراغت کے بعد بھی مجھے نہیں بھولے بلکہ موقع بہ موقع کوئی نہ کوئی ایسی خدمت کرتے رہتے کہ مدتوں یاد رہتے، بندہ کو چند کتابوں کی جلد بنوانے کی ضرورت تھی، آپ انہیں ساتھ لے گئے اور بڑی مضبوط اور عمدہ جلد بنوا کر دی۔ بیان القرآن اور ہدایہ کی جلدیں آپ ہی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں بنوائی تھیں اور اب بھی ویسی ہی مضبوط اور قائم ہیں۔

جب آپ علاقہ تشریف لائے تو بندہ اہم علمی مسائل میں آپ ہی سے استفادہ کے لئے رجوع کرتا۔ ایک دفعہ

ہمارے علاقے میں طلاق سے متعلق ایک مشکل صورت درپیش ہوئی، بندہ نے استفتا مرتب کیا اور آپ کی خدمت میں جامعہ یوسفیہ حاضر ہوا، آپ نے بڑی خدمت فرمائی۔ مہمان نوازی میں تو آپ کا کوئی مثل نہ تھا۔ جب بندہ نے آنے کا مقصد بیان کیا تو کہنے لگے کہ استاذ جی! کیا اب میری اتنی جرأت ہوگی کہ میں آپ کو مسائل بتایا کروں گا۔ میں نے حقیقت حال عرض کی کہ مولانا استادی شاگردی اپنی جگہ، لیکن علم میں تو ہماری نسبت آپ سے ایسی ہے جیسے ایک گہرے عالم کے سامنے طفل مکتب کی ہوتی ہے۔ اس پر توبہ توبہ کہتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا دیئے اور سر جھکا لیا۔ الغرض جو ادب و تواضع طالبعلمی میں تھی وہ تحصیل علم کے بعد بھی قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔

ان کی مظلومانہ شہادت سے ہمارے علمی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا اس کا پر ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے بس میں تو بس صرف اب دعا کی طاقت ہے جب بھی آپ کی قبر کے پاس سے گزرتا ہوں بغیر دعا اور زیارت کے قدم آگے نہیں بڑھتے۔ آج ان برخورداران کی آمد نے غم تازہ کر دیا، اب برداشت نہیں ہے۔ مولانا امین کا تذکرہ ہو تو اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پاتا، یہی آنسو ہی ان کی یاد کے واسطے پاس رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ آسائشیں نصیب فرمائے اور ان کے فیوض و برکات سے ہمیں پوری طرح بہرہ ور فرمائے۔ آمین

الشيخ محمد الامين كما عرفته

الشيخ ابراهيم من زامبيا الافريقا الغربية

هو العلامة المحدث الفقيه صاحب التصانيف المنيفة و المحاضرات القيمة الشيخ محمد الامين الاوركزئى۔

كان معرفتى به عن طريق العالم العلامة و الحبر الفهامة فضيلة الشيخ مفتى رضاء الحق شيخ الحديث بجامعة دار العلوم زكريا بجنوب افريقيا۔ بعد تخريجى فى جامعة دار العلوم زكريا بجنوب افريقيا و الحصول على درجة العالمية، دفع بى التعطش الشديد و النهم اللامتناهى للتحصيل بالسفر الى دولة باكستان لما كنا نسمع عن هذا البلد الاسلامى من السمعة الطيبة فى مجال التعليم الاسلامى و العربى و لما كنا نقرأ لعلمائه المرموقين و المثقفين فى جميع فنون المعرفة۔

قمت بزيارة الاستاذ مفتى رضاء الحق [اطال الله بقاءه ذخرا للاسلام و المسلمين] فى مسقط رأسه برفقة الاخ السيد/الفضل--------من جمهورية زامبيا و بنفقته الشخصية، و كان الهدف وراء هذه الزيارة اولا و قبل كل شيء هو التزود بآرائه السديدة حول المكان المناسب و العالم الربانى المتعمق فى الحديث و علومه، فوقع اختياره دون تردد على العلامة المذكور اعلاه۔

أدبه و علمه:

وجدته على جانب كبير من الاخلاق الطيبة جم الفضل كثير التواضع مؤتلف الخلق ثم هو الى ذالك رقيق القلب عفيف الضمير سليم الصدر صحيح العقيدة نفاح اليد موزع الفضل۔

كان عليما بأسرار اللغة العربية عارفا بمفرداتها و فرائدها حافظا لنوادرها و شواردها واقفا على صحيحها و سقيمها و كان كثيرا ما يتعقب الكتاب أثناء قرائته الكتب مع الانصاف و عدم الاستعلاء۔

كان مجلسه دائما مجلسا علميا يحرص أن يعطى كل ذى حق حقه دائم الابتسامة خفيف الظل

يجلس مع جلسائه على مائدة مستديرة ليس لمجلسه صدر۔

كان خطيبا موهوبا ذلق اللسان فصيح العبارة حاضر البديهة ندى الصوت لايتلكأ و لايلحن و لايتلعثم۔

و كان كاتبا حلو اللفظ سلس الاسلوب قوى العبارة قوى الروح صادق الفكر نبيل الغرض و بهذه المزايا الموهوبة و المكسوبة استطاع ان يحى الموات و يجمع الشتات۔

علمه في الحديث:

كان ضليعا في الحديث و علومه متبحرا في اسماء الرجال و في علم الجرح و التعديل حتى كلفه استاذه المبجل المحدث الشهير فريد العصر و فارس المضمار مولانا محمد يوسف البنورى بوضع شرح على كتاب الطحاوى فشرع فيه حتى كمل الجزء الاول و كان في مجلد ضخم و حافل فكان اسلوبه فيه اسلوب محدث اديب ناقد يرتاد الحق في مضانه لايتعصب لمذهب على حساب مذهب اختار الوسطية فيه ليس بالطويل الممل و لا بالقصير المخل۔

رزق شيخنا سرعة الحفظ و اكثر من المسموع فسمع العالي و النازل، و تصدى لنشر الحديث و قصر نفسه عليه مطالعة و قراءة و اقراء و تصنيفا و افتاء حتى شهد اعيان الشهود بالحفظ، هذا مع طلبه و تبحره في بقية العلوم و المعارف كالتفسير و الفقه و علوم الوسائل و الادب و غير ذالک۔

و لاغرابة في رغبة الشيخ في العلم و تصديه للمعارف و تفوقه على اقرانه فهو من اسرة علمية۔

مكتباته و مطالعته:

كان للشيخ مكتبتان كبيرتان فيما علمت و كلتاهما تعج بآلاف المجلدات في جميع فنون العلم، من التفسير و الحديث و علومهما و الفقه و اصوله و العقيدة و الفلسفة و الموسوعات و معاجم اللغات و الثقافة العامة و غير ذالک۔

و ليس غريبا على مثله ان يقتني مثل هذا الكم الهائل من المراجع و المصادر، و لكن الغريب انک قلما تجد كتابا من الامهات الا و تعثر له فيه على اثر اما لضبط و تقييد او ايضاح و تعليق او تصحيح او تفنيد او انتصار لحق او تدحيض لباطل۔

و لكن الاغرب من ذالک كله انک تجده دون على مجلد ضخم يحتوى على مئات الصفحات

يقول: طالعته في يوم او في ساعات او في مجلس و كل ذالك مع الضبط و التقييد و الايضاح۔

علاقتي به:

كانت علاقتي به علاقة نوعية و من طراز خاص و بناء على ذالك كان يعاملني معاملة منقطعة النظير، و كطالب من افريقيا و على الاخص من غامبيا غرب افريقيا كان يضع نصب عينيه بعد الديار و وحشة الغربة و فوارق اللغة و لون البشرة و قلة ذات اليد و الامكانيات المادية الاخرى و لذا كان دائما يمد الي يد العون و يغدق على للعطايا و التحف۔

و اذا رآني ابتسم ابتسامة عريضة و يرحب بي اذا وفدت مجلسه و يجلسه الى جنبه و يرافقني اينما حل و ارتحل، و جعلني امينا على مكتباته حيث سلم الى جميع المفاتيح، و هذا مع ان الكتب مرتبة ترتيبا دقيقا الا ان بعض رواد المكتبة يضعون الكتب علما و بغير علم في غير مواضعها مما يجعل الوصول الى بعضها صعبا للغاية و بما اني كنت حمامة المكتبة فبناء عليه كان اذا احتاج الى اى كتاب يكلفني باحضاره۔

علم وعمل کے امین

مولانا محمد جمیل قریشی، ڈی، آئی خان

یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے، بندہ اپنے بھائی مولانا نور سید شاہ صاحبؒ کے مشورہ سے "مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن" میں

داخلہ لینے کی غرض سے کراچی پہنچا۔ وہاں تعداد پوری ہو چکی تھی لہٰذا میں نے دارالعلوم کراچی میں قسمت آزمائی کی کوشش کی، لیکن وہاں بھی بات نہ بن سکی۔ انسانی سعی و جوش کے آگے کوئی شئے ناممکن نہیں، مگر اجنبی شہر میں دو بڑے اور معیاری اداروں میں ناکامی کے بعد میرے جذبات ماند پڑ گئے اور دل برداشتہ ہو کر "گوجرانوالہ" کی طرف جانے کے ارادے سے ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ میرے بڑے بھائی مولانا نور سید شاہ صاحبؒ کا مولانا محمد امین شہیدؒ کے ساتھ بہت قریبی اور برادرانہ تعلق تھا۔ بھائی صاحب نے میرے کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش سے حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ کو آگاہ کر دیا تھا۔ جس دن میں داخلہ لینے 'بنوری ٹاؤن' گیا تھا اس وقت تک حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ اپنے آبائی علاقے واپس نہیں پہنچے تھے۔ آپ جب واپس پہنچے تو میری معلومات شروع کر دیں، انہیں کچھ طلبہ سے پتہ چلا کہ میں واپسی کا رخت سفر باندھ کر سٹیشن پہنچ چکا ہوں۔ آپ نے فوراً ہی ایک طالب علم کے ذریعے سٹیشن پیغام بھیجا کہ تم ٹکٹ واپس کر دو اور آجاؤ۔ میں نے واپس جانے سے عذر کیا، مگر استاد صاحب نے دوبارہ طالب علم بھیجا لہٰذا بادل نخواستہ مجھے حاضر خدمت ہونا پڑا۔ حضرت استاد محترم نے اتنی محبت سے استقبال کیا اور ایسا پر جوش مصافحہ کیا کہ یکدم میرے دل میں طمانیت کا ایک کیف پیدا ہوا اور ایسی اپنائیت محسوس ہوئی کہ واپس جانے کا جذبہ ختم ہو گیا۔

حضرت نے کہا کہ آپ کا داخلہ تو میں نے پہلے ہی کر دیا ہے، آپ واپس کیوں جا رہے ہیں، آپ ٹکٹ واپس کر کے آئیں۔ بہرکیف آپ کی غیر معمولی محبت اور شفقت نے مجھے "مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن" واپسی پر مجبور کر دیا۔ یہ حضرت کی محبت اور حسن سلوک کی برکت تھی کہ بندہ کو مدرسہ میں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع ملا۔

بندے نے حضرت الاستاد صاحب کی خدمت میں دس سال گزارے۔ حضرت کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ مدرسہ نیوٹاؤن میں بندے کو حضرت استاد صاحب کے "خادم خاص" کی حیثیت حاصل تھی، یہ نعمت کسی شرف سے کم نہ تھی، حضرت استاد صاحب کی خدمت میں کثرت حاضری کی وجہ سے اکثر ساتھی بندے کو "کوہاٹی" سمجھتے تھے حالانکہ بندہ وزیرستان سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت استاد صاحبؒ نے جو احسانات بندے پر کیے انھیں بھلانا ممکن نہیں، صورت دیکھ کر کسی کی سیرت کا اندازہ کرنا اپنے کو فریب دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ آدمی کی حقیقت تین مواقع پر کھل کر سامنے آتی ہے، سفر، معاملات یا پھر پڑوس میں رہنے کا موقع۔ اور حضرت الاستاذ کے ساتھ بندہ کو تینوں باتیں برتنے کا موقع ملا۔

اسٹرائیک کا واقعہ اور حضرت بنوری کا اعتماد

آپ انتہائی اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے، یہ اعلیٰ اخلاقی اور روحانی صفات ہی تھیں کہ وقت کے بڑے بڑے اکابر آپ سے محبت اور اعتماد کا رشتہ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا حضرت استاد محترم سے خصوصی قلبی تعلق تھا۔ اعتماد کا ایسا رشتہ تھا کہ جب کبھی اپنوں یا پرایوں نے استاد محترم کے دست گریبان سے الجھنے کی کوشش کی تو حضرت بنوریؒ نے آپ کا بھرپور دفاع کیا۔ اس سلسلہ میں استاذ صاحب کے خلاف بعض بد بخت طلبہ کے اسٹرائیک کا ذکر اور اس بارے میں حضرت بنوریؒ کے اقدام کا ذکر مناسب ہوگا۔

حضرت استاذ صاحب کو حضرت بنوریؒ نے 'مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن' کا نگران اعلیٰ بنایا کیونکہ آپ اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ نگران اعلیٰ بننے کے بعد جب آپ نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مدرسہ میں انتظامی، اخلاقی اور روحانی ماحول کو بہتر سے بہتر کرنے کے لئے کچھ عملی اقدامات کیے تو صورتحال نے کروٹ لی۔ چند آزاد منش اور عاقبت نا اندیش طلبا نے حضرت استاذ صاحب کی نگرانی کو سختی سے تعبیر کیا اور مدرسے میں سیاسی ہلچل پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ میں استاذ صاحب کے لئے دودھ لایا کرتا تھا، ایک دن جب میں کمرے میں داخل ہوا تو مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ حضرت استاذ صاحب کے پاس بیٹھے معلومات کر رہے تھے کہ یہ مسئلہ کیا ہے؟ استاذ صاحب نے بتایا کہ رات کو دار الاقامے کے دروازے کھلے رہتے تھے، انتظامی حوالے سے ان کا بند کرنا ضروری تھا، دوسرا چھوٹے اور بڑے طلبہ کے آزادانہ اختلاط پر پابندی لگائی گئی، اس پر یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہے کہ ان دو پابندیوں کو واپس لیا جائے۔ اس کے بعد دروازے بند کرنے کی پابندی اٹھا دی گئی لیکن ان طلبہ کا اصل مقصد تو کچھ اور تھا اس لئے انہوں نے حضرت بنوری سے شکایت کی کہ ''نگران اعلیٰ'' مزاج کے سخت ہے۔ لہٰذا انھیں اس ''عہدے'' سے ہٹا دیجئے۔ انہی دنوں درسگاہوں میں ایک درخواست پر دستخطی مہم بھی چلی جس میں کڑی پابندیوں کو ہٹانے کا مطالبہ تھا اور طلبہ نے باہم عہد و پیمان بھی کر رکھے تھے کہ اگر ہمارے مطالبات تسلیم نہ ہوئے تو ہم مدرسہ چھوڑ دیں گے۔ حضرت بنوریؒ نے جب ''سیاسی مزاج'' کے حامل طلبا سے ان کے اعتراضات پوچھے تو ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا طلبا نے یہ بے ہودہ اور بے بنیاد بات کہی کہ اگر مولانا ہمارے اوپر اختلاط کی پابندی لگاتے ہیں تو ان سے چھوٹے طلبہ کیوں ملتے ہیں؟ اس پر حضرت بنوریؒ نے حلفیہ طور پر کہا کہ مجھے مولانا امین پر اتنا اعتماد ہے، کہ رات کو خلوت میں انتہائی حسین عورت بھی اگر ان سے ناجائز مطالبہ کرے تو مولانا امین خوف خدا سے اس تنہا حسین عورت کو بھی دھتکار دیں گے۔

چند دن اسی پریشانی کے عالم میں گزرے، ایک دن اعلان ہوا کہ حضرت بنوریؒ صاحب نے 'خصوصی خطاب' کرنا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کو جمع کیا گیا۔ حضرت بنوریؒ نے انتہائی ناصحانہ گفتگو فرمائی، آپ کے خطاب کا خلاصہ یہ تھا

کہ میں جس کو کوئی ذمہ داری دیتا ہوں، استخارے اور مراقبے کے بعد دیتا ہوں، میں نے مولانا کو یہ ذمہ داری اشارہ غیبی پر دی ہے لہٰذا مولانا محمد امین صاحب اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے، ان تمام حالات کے باوجود حضرت مولانا محمد امین صاحب کو ان کے عہدے پر برقرار رکھنا حضرت بنوری کی استاذ صاحب پر اعتماد کی واضح دلیل تھی۔ لیکن دوران بیان شریروں کے سرغنے نے اٹھ کر احتجاج شروع کیا، اس پر حضرت بنوری اٹھے اور فرمایا کہ اس مدرسہ میں یہ لوگ رہیں، اپنے لئے مہتمم بھی دیکھ لیں، شیخ الحدیث بھی چن لیں، میں یہاں نہیں رہ سکتا، یہ کہتے ہوئے آپ چل دیئے، اساتذۂ کرام جلدی سے اٹھے، کوئی پاؤں پڑ رہا ہے، کوئی دامن پکڑ رہا ہے، بمشکل حضرت کو واپس بٹھایا گیا۔ اس پر یہ تلخ مجلس ختم ہوئی۔

کچھ اس قسم کی اطلاعات تھیں کہ ان طلبہ نے اسلحہ بھی لایا ہے اور حضرت استاذ صاحب پر حملہ کا ارادہ ہے۔ مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ حضرت استاذ صاحب کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ آپ میرے ساتھ گھر چلیں، مدرسہ میں نہ رہیں۔ لیکن استاذ صاحب نے جانے سے معذرت کر لی، اس وقت ہم چند طلبہ ساری رات حضرت کے کمرے میں ساتھ رہتے، کچھ جانثار کمرے کے دروازے کے پاس بستر بچھاتے تھے اور ایک لمحہ کے لئے آپ سے جدا نہ ہوتے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا اسلم شیخوپوری شہیدؒ جو دونوں پاؤں سے معذور تھے اپنا بستره لا کر حضرت کے کمرہ کے سامنے دروازے کے پاس سو رہے ہیں، کسی نے کہا کہ آپ واپس چلیں، اگر خدانخواستہ حملہ ہوا تو آپ اس معذوری میں کیا کریں گے۔ اس نے کہا کہ میں کم از کم چیخ و پکار تو کرا دوں گا۔ رات خیریت سے گزری، صبح حضرت بنوری تشریف لائے اور سارے شریر طلبہ کے اخراج کا اعلان کر کے کتابیں جمع کرنے کا حکم دیا۔ حضرت بنوری نے خود مکتبہ کے سامنے کرسی بچھائی اور با آواز بلند ناظم مکتبہ سے کہنے لگے کہ "جلدی جمع کریں، جلدی جمع کریں" اس کے بعد ایک اور استاذ کو معاونت کے لئے بلایا۔ یوں پچاس سے زائد طلبہ کا اخراج عمل میں آیا جس میں اکثر دورۂ حدیث کے تھے۔ چند دن بعد طلبہ کے گھروں میں پتہ چلا، تو والدین انہیں پکڑ پکڑ کر معافی مانگنے کے لئے حاضر کرنے لگے، کئی طلبہ نے حضرت کو معافی کے خطوط لکھے، پھر جامعہ کی طرف سے اعلان: یہ توبہ نامہ کی ایک تحریر بنی جو ہر طالب علم لگاتا تھا، اس طرح اکثر طلبہ توبہ تائب ہو کر اور استاذ صاحب سے معافی مانگ کر دوبارہ داخل ہوئے۔

اس واقعے کے کچھ مدت بعد حضرت بنوری صاحب نے مفتی احمد الرحمن رحمہ اللہ کو حیاتاً اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کے بعد اور بھی بہت سی انتظامی تبدیلیاں کی گئیں یہاں تک کہ ناظم تعلیمات کو بھی تبدیل کر دیا گیا۔

اکابر سے تعلق

حضرت بنوری صاحبؒ سے آپ کا تعلق تو سب پر عیاں تھا، ان کے بعد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری سے آپ کا بہت گہرا تعلق تھا۔ حضرت رائے پوریؒ بھی حضرت استاذ پر حد درجہ شفقت اور محبت کا معاملہ رکھتے تھے۔ حضرت رائے پوری ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں، جن کی اصلاحی مجالس میں مولانا ادریس میرٹھی، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مفتی احمد الرحمنؒ، اور مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب جیسی شخصیات حاضر ہوتی تھیں۔ حضرت بنوریؒ اکثر لوگوں کو اصلاحی تعلق قائم کرنے کے لئے حضرت رائے پوری سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

حضرت استاذ محترم جب بھی سرگودھا جاتے، تو حضرت شاہ عبدالعزیز بڑی محبت سے پیش آتے۔ ایک دفعہ حضرت رائے پوریؒ نے ''حجیت قیاس'' کے بارے میں دلائل کا پوچھا۔ استاذ محترم کا مطالعہ وسیع تھا لہٰذا خوب تفصیل سے ''مسئلہ قیاس'' بیان کیا۔ منکرین قیاس کے کمزور دلائل کو پیش کر کے ان کا جواب دیا اور پھر ''حجیت قیاس'' کے اثبات میں بھرپور دلائل پیش کیے۔ حضرت رائے پوریؒ بہت خوش ہوئے اور خوب دعائیں دیں۔

حضرت رائے پوریؒ کے رمضان شریف میں ذکر و عبادت کا یہ حال تھا کہ وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت استاذ محترم رمضان میں حاضر ہوئے، اور آپ کے صاحبزادے سے عرض کیا کہ حضرت رائے پوریؒ سے کہیں کہ بندہ صرف دعا چاہتا ہے۔ صاحبزادے نے پیغام پہنچایا تو حضرت رائے پوریؒ نے خلاف معمول استاذ محترم کو ملاقات کا شرف عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری خصوصیت ہے، ورنہ رمضان میں ملاقات کا معمول نہیں۔

حضرت رائے پوریؒ کے علاوہ حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مولانا فقیر محمد صاحبؒ کی خدمت میں بھی حاضری دیتے تھے۔ مولانا فقیر محمدؒ صاحب استاذ محترم سے انتہائی شفقت اور محبت کا معاملہ کرتے تھے۔ استاذ محترم کا تقریباً تمام اکابر علما اور مشائخ سے قریبی تعلق تھا۔ مگر قابل رشک بات یہ تھی کہ ان تمام اکابر کی حضرت استاذ محترم سے بھی حد درجہ محبت تھی اور آپ پر انتہائی اعتماد تھا جس کا ایک زمانہ گواہ ہے۔

علمی مقام:

حضرت الاستاد صاحب کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ بنوری ٹاؤن میں آپ نے کئی دفعہ منطق کی مشہور کتاب ''سلم'' پڑھائی، صرف بنوری ٹاؤن کے طلبا ہی نہیں بلکہ پورے کراچی کے مدارس میں اس کا چرچا تھا، حالانکہ آپ کی تدریس کا دوسرا یا تیسرا سال تھا۔ علم نحو میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بہت بڑے استاد کو شرح جامی میں کچھ اشکالات پیش آئے تو اس کے حل کے لئے حضرت استاذ محترم کے پاس آئے تھے۔

فرمایا کہ میں نے میراث مفتی رشید احمد صاحبؒ سے پڑھی، ایک بار مفتی صاحب نے مجھے میراث کا ایک انتہائی

مشکل مسئلہ سپرد کیا جو بفضل اللہ ڈھائی منٹ میں حل ہوگیا، اسی مجلس میں سندھ کے ایک مولوی صاحب تشریف لائے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ نے وہ صورت ان کے سامنے رکھی تو وہ بے چارے تین گھنٹے لگے رہے، تین گھنٹوں بعد جا کر کہیں مسئلہ حل ہوا۔ ایک بار میراث کا کوئی مشکل مسئلہ بصورت استفتاء جامعہ میں آیا تھا تو مفتی احمد الرحمن صاحبؒ حضرت الاستاذؒ کے پاس لائے تھے، دونوں حضرات نے مل بیٹھ کر کافی غور وغوص کے بعد حل کیا تھا۔ مفتی احمد الرحمن صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ اتنا مشکل مسئلہ تھا لگتا ہے جیسے مفتی رشید احمد صاحب نے بھیجا ہو۔

درس وتدریس کا انداز بہت اعلیٰ اور امتیازی شان کا حامل تھا۔ ہر فن میں آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی، لیکن علم نحو پر آپ کو کامل دسترس تھی۔ علم النحو میں آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، میرے خیال کے مطابق ہمارے خطے میں شاید ہی کسی کا آپ جتنا مطالعہ علم نحو میں ہو۔ علم حدیث اور علم رجال میں آپ کی مہارت اہل علم پر مخفی نہ تھی۔ اسی طرح ''مکاتیب ہدایت بجواب مکاتیب ضلالت'' نامی آپ کی غیر مطبوعہ کتاب میں آپ کے عقلی وکلامی علوم ومعارف کا خوب پتہ چلتا ہے۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مودودی فکر علما کے جواب میں لکھے گئے۔

زمانہ طالب علمی میں ایک بار ایک استاذ کے مشورے پر میں نے شبلی کی سیرت النبی پڑھنا شروع کی تو مجھے سختی سے ٹوکا کہ جب تک اپنے اکابر کی کتابوں سے سیرت کا مضمون اچھی طرح راسخ کر کے ذہن میں نہ بٹھالو، آزاد فکر لوگوں کی کتابیں ہرگز نہ پڑھو، کیونکہ اولاً جو تصویر ذہن میں جم جائے اسے زائل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک بار جامعہ میں ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث صاحب تشریف لائے تھے، وہ ذرا آزاد فکر تھے، حضرت بنوریؒ موجود نہ تھے تو طلبہ نے دارالحدیث میں لے جا کر ان سے درس دلوایا، جب حضرت بنوریؒ کو پتہ چلا تو سخت غصہ ہوئے۔ استاذ صاحب کو بڑی حیرت تھی کہ حضرت تو تواضع وانکساری اور اہل علم کے احترام کے پیکر ہیں، اس غصہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ جب ان شیخ الحدیث صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت بنوریؒ نے اناللہ پڑھی اور استاذ صاحب کو از خود بتایا کہ ان کے بیان پر غصہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ موصوف آزاد فکر تھے، زمانہ طالب علمی میں جب طلبہ آزاد فکر لوگوں کے بیانات سنیں یا تحریریں پڑھیں، تو عقیدت کی وجہ سے وہی ان کا نظریہ بن جاتے ہیں، جو مستقبل میں انتہائی خرابی کا باعث بنتے ہیں۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔

انتظامی صلاحیتیں:

آپ کی انتظامی صلاحیتیں انتہائی اعلیٰ تھیں۔ ایک دفعہ حضرت استاذ صاحبؒ نے جامعہ بنوری ٹاؤن کے نظام تعلیم وتربیت میں بہتری کے لئے ''دس تجاویز'' تیار کر کے حضرت بنوریؒ کو پیش کیں۔ جنہیں دیکھ کر حضرت بنوریؒ

نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ حضرت بنوریؒ نے استاذ صاحب کی فراست کی تعریف کرتے ہوئے ان تجاویز کو مجلس علمی میں بھی پیش کیا۔ استاذ محترم نے حضرت بنوریؒ سے عرض کیا تھا کہ وہ ان تجاویز کو اپنی طرف سے پیش کریں، اس میں مصلحت ہوگی۔ لیکن خلاف توقع حضرت بنوریؒ نے اساتذۂ کرام کی مجلس میں حضرت کے نام کے ساتھ ہی یہ تجاویز پیش کیں اور کافی تعریف فرمائی۔

اصلاحی تعلق:

آپ نے طالب علمی کے زمانے میں حضرت نصیرالدین غورغشتویؒ سے بیعت کرلی تھی۔ یہ اپنے وقت کے حدیث اور طریقت میں ''امام'' سمجھے جاتے تھے۔ حضرت غورغشتویؒ طلبا کو بیعت نہیں کرتے تھے۔ حضرت الاستاذؒ نے جب حضرت غورغشتویؒ سے بیعت ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ ہم طلبا کو بیعت نہیں کرتے، کیونکہ اس سے ان کی تعلیم میں حرج آتا ہے، لہٰذا آپ درس نظامی کی تکمیل کے بعد تشریف لائیں۔ حضرت الاستاذؒ نے عرض کیا کہ میں بیمار ہوں، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ تکمیل سے پہلے موت آگئی تو میں بغیر بیعت کے ہی دنیا سے چلا جاؤں گا۔ حضرت غورغشتویؒ پر حضرت الاستاذؒ کی گفتگو کا عجیب اثر ہوا، انہوں نے تین چار بار'استغفراللہ' پڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت استاذ محترم کو بیعت کرلیا اور پھر کچھ ''اسباق'' دے دیئے، جنہیں مدرسے آتے جاتے ہوئے پڑھنے کی تاکید کی۔ حضرت غورغشتویؒ کی صحبت کا اثر تھا کہ حضرت استاذ صاحب بھی ''دینی تعلیم'' حاصل کرتے وقت غیر نصابی مشاغل کو'' یکسوئی'' میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔

حضرت غورغشتویؒ کی وفات کے بعد حضرت استاذ محترم نے حضرت بنوریؒ سے بیعت کی، لیکن اس کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ حضرت بنوریؒ کی وفات کے بعد آپ اپنے اصلاحی تعلق کے حوالے سے بہت متفکر رہتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بہت دلی رغبت تھی۔ ان سے بیعت ہونے کے لئے کئی دن استخارہ کیا مگر شرح صدر نہیں ہوا۔ آپ کی تیسری بیعت کا واقعہ یہ ہے کہ جامعہ یوسفیہ کا دوسرا سال تھا، چھٹیوں میں فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ سے بیعت کرانے کی درخواست کی۔ (واضح رہے کہ حضرت مولانا فضل محمد صاحب صرف شیخ الحدیث ہی نہیں تھے، بلکہ قطب وقت بھی تھے) تو حضرت نے چند وجوہات کی بنا پر بیعت کرنے سے انکار کردیا۔ البتہ بطور شفقت فرمایا کہ سوات میں دو بڑی شخصیات ہیں: ایک'جورے شریف' والے مولانا محمد اکرم صاحب جنگلی خیلؒ اور دوسرے 'گڑھئی شیخ' جو مٹہ تحصیل کے رہنے والے ہیں۔ لہٰذا ان کی خدمت میں چلنا ہے۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب کا رجحان مولانا محمد اکرم صاحبؒ کی طرف زیادہ تھا۔ میں بھی حضرت استاذ محترم کی معیت میں مولانا محمد اکرمؒ

سے ملنے چلا گیا۔ دن کے بارہ بجے ہم ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو وہاں مسجد کے سامنے درختوں کے سائے میں تین چار چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں، حضرت مولانا محمد اکرمؒ کی زیارت کرنے سے عجیب سی روحانی تسکین محسوس ہوئی۔ دل نے گواہی دی کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجاتے ہیں۔ حضرت استاذ صاحب نے بیعت کی درخواست کی، تو حضرت مولانا محمد اکرم صاحبؒ نے انکار کر دیا، حضرت استاذ محترم نے ادب کے ساتھ اصرار کیا اور ان کے ساتھ خلوت میں جا کر بات کی لیکن خلوت میں بھی انکار فرمایا۔ جب باہر آئے تو فرمایا کہ آج کل ولایت کی کرسی ''گڑھی شیخ'' کے حوالے ہے۔ ان کی زندگی میں ہم کسی کو بیعت نہیں کر سکتے۔ فرمایا: میں خود آپ کو ان کے پاس لے کر چلتا ہوں، چونکہ راستہ پیدل اور پہاڑی تھا اور استاذ صاحب کو آپ کی تکلیف گوارا نہ تھی، اس لئے استاذ محترم نے ادب سے ٹال دیا۔ انہوں نے رہنمائی کے لئے ایک شخص ہمارے ساتھ کر دیا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پیدل چل کر ہم ''گڑھی'' پہنچ گئے۔ عصر سے پہلے ہم شیخ کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ شیخ کے چہرے پر نظر پڑی تو بس دل کی گہرائیوں سے آواز آئی کہ یہی ہے وہ ہستیاں ہیں جن کے دم سے دنیا آباد ہے۔ استاذ محترم نے حضرت گڑھی شیخ سے بیعت کی درخواست کی جو حضرت نے قبول کرتے ہوئے استاذ محترم کو بیعت کر لیا۔

حضرت گڑھی شیخ بڑے اونچے درجے کے اولیا میں سے تھے، اولیاء کرام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ شہرت کے بجائے گمنامی کو پسند کرتے ہیں، یہ استاذ محترم ہی تھے، جنہوں نے حضرت گڑھی شیخ کی طرف عوام وخواص کی توجہ مبذول کروائی، اس کے بعد خیبر پختون خواہ اور قبائل سے تعلق رکھنے والے اکثر علما، طلبا اور صالحین نے حضرت گڑھی باباجی سے اصلاحی تعلق قائم کیا۔ حضرت باباجی کی وفات کے بعد حضرت الاستاذؒ آپ کے عطا کردہ اوراد ہی پڑھا کرتے تھے، سفر وحضر میں ناغہ نہ کرتے تھے۔ گڑھی شیخ نے آپ کو خلافت بھی عطا فرمائی۔ اس کے بعد کئی مشائخ سے تعلق رہا اور ان کی صحبت اٹھائی، آخری بار حضرت الاستاذؒ حضرت مولانا صندل باباجیؒ سے بیعت ہوئے۔ (واضح رہے کہ حضرت صندل باباجی اور مولانا محمد قمر صاحب جورے شریف والے دونوں کے مرشد مکرم آفتاب معرفت، اشدفی امر اللہ حضرت مولانا ولی احمد صاحبؒ المعروف بہ سنڈا کے باباجی تھے۔ سنڈا کے بابا مجاہد فی سبیل اللہ ولی کامل معروف بہ آذے ملا صاحب کے خلیفہ اور قطب وقت تھے۔)

حضرت صندل باباجی گمنامی میں درس وتدریس اور خدمت خلق میں عام انسانوں کی طرح مصروف تھے، جب ان کے سلسلے کے بزرگوں کی طرف سے بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع کرنے کے مناسی پیغامات ملے، تو خلق خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دینے کے لئے میدان میں آگئے۔ کراچی کے بعض علما کی تحریک اور پرزور دعوت پر آپ کراچی تشریف لے گئے۔ حضرت الاستاذؒ اس پورے سفر میں آپ کے ہمراہ تھے، کراچی کے بڑے بڑے اکابر علما اور کثیر تعداد میں

طلبا اور عوام ان سے بیعت ہوئے۔ حضرت صندل بابا جیؒ نے حضرت الاستاذؒ کو خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حیا و ادب:

حضرت الاستاذؒ میں حیا اور ادب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بہت سخت گرمی اور حبس میں بھی قمیص پہنتے تھے، شرم و حیا کا اتنا غلبہ تھا کہ ساتھ رہنے والوں نے بھی انتہائی شدید ضرورت کے وقت استاذ محترم کو قمیص اتارے ہوئے نہیں دیکھا یہاں تک کہ کسی نے قمیص تبدیل کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

عشق نبوی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز اور ہر ادا میں سنت نبوی کو ملحوظ نظر رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنی عمر کے حوالے سے آپ کا یہ ارشاد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ میری بھی عمر ۶۳ سال سے کم یا زیادہ نہ ہو اور اسی محبت کی وجہ سے حضرت الاستاذؒ کے یہاں درود شریف کی بہت زیادہ تاکید تھی۔

درود شریف کے حوالے سے حضرت الاستاذؒ کا بہت بڑا کارنامہ دلائل الخیرات کا وسیع پیمانے پر چھاپ کر مفت تقسیم کرنا اور اپنے حلقہ احباب میں اس کے ورد کی تاکید کرنا ہے، حضرت کو شروع ہی سے دلائل الخیرات سے بہت محبت تھی۔ ہمیں بھی طالب علمی کے زمانے میں حضرت بنوریؒ کے پاس لے جا کر پڑھنے کی اجازت حاصل کی۔ خود حضرت الاستاذؒ کو بھی بڑے اکابر سے اجازت حاصل تھی جن میں حضرت مولانا غور غشتویؒ، حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا بنوریؒ، حضرت مولانا فضل محمدؒ اور حضرت شیخ گڑھئی بابا جی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مروت اور رواداری:

مروت اور رواداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کراچی میں حاجی اسرائیل مزار شریف والے کا کتب خانہ ہوتا تھا، ان کے پاس ایک میمن نوجوان آیا کرتا تھا، ان کا مذہبی تعلق ''بریلوی'' مسلک سے تھا، استاذ محترم اس کتب خانے میں اکثر تشریف لے جاتے تھے۔ اس نوجوان نے استاذ محترم سے ''علم غیب'' کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے۔ استاذ محترم نے اس کے مشکل سوالات کے انتہائی عام فہم اور مدلل جوابات دیئے، اس پر وہ نوجوان آپ کا عقیدت مند بن گیا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ وہ نوجوان بریلوی مسلک سے تائب ہو گیا۔ حالانکہ ان کا پورا خاندان بریلوی مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ استاذ محترم کے ہنگو تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد یہ نوجوان ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا۔ استاذ محترم کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو ان کے گھر والوں سے تعزیت کے لئے خاص طور پر ایک دن کے لئے کراچی تشریف لائے۔ اندازہ کیجئے حضرت استاذ محترم کی

رواداری اور مروت کا کہ ایک ایسا خاندان جس کا تعلق بریلوی مسلک سے تھا، آپ ان سے تعزیت کرنے کے لئے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں، جس سے آپ کی شناسائی نہ ہونے کی برابر تھی۔

حضرت الاستاذ اپنے شاگردوں اور دوستوں کے ساتھ انتہائی محبت اور ہمدردی فرماتے تھے۔ اسی وجہ سے آپؒ کے تلامذہ ملک کے دور دراز علاقوں سے ملاقات کے لئے وقتاً فوقتاً حاضر خدمت ہوتے تھے، چند سال پہلے بندہ فاضل دیوبند حضرت مدنیؒ کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث حضرت مولانا معز الحق صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرتؒ نے پوچھا کہ ہمارے بھی ہزاروں شاگرد ہیں، لیکن ہمارے شاگرد ہمارے ساتھ اس قدر محبت کا اظہار نہیں کرتے جس قدر حضرت مولانا محمد امین صاحب کے تلامذہ ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو بندہ نے کہا کہ خود حضرت الاستاذ کی اپنے تلامذہ کے ساتھ محبت اور تعلق بہت زیادہ ہوتا ہے، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ واقعی یہی وجہ ہے۔

یہ چند بے جوڑ کلمات عرض کیے تاکہ حضرت الاستاذ کے ثناخوانوں میں ہمارا نام بھی آجائے، ورنہ حضرت الاستاذ جیسی عظیم شخصیات پر ہمارے جیسے کم علم لوگوں کے لئے کچھ لکھنا بے ادبی اور گستاخی ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ

مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہیدؒ

جمعرات کا دن تھا، گیارہ بجے کا وقت۔ بذریعہ فون اطلاع ملی کہ زہد و ایثار کے پیکر، استقامت کے کوہِ گراں، اسلاف کی چلتی پھرتی یادگار، صبر و رضا کی جیتی جاگتی تصویر، جامعہ یوسفیہ ہنگو کے مدیر گرامی، سیدی واستاذی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی مدرسہ پر ہونے والی بمباری کے نتیجہ میں جام شہادت نوش فرما گئے۔ ''بے شک ہم سب اللہ تعالیٰ کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے جانے سے تشنگان علم اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتے ہیں۔ بیواؤں، یتیموں اور غریبوں کے سر سے سہارا سرک جاتا ہے۔ زمین روتی اور عرش الٰہی کانپ جاتا ہے، انسانیت کا پرچم سرنگوں اور وقت کی رفتار تھم سی جاتی ہے۔ ہواؤں سے نالہ وشیون کی آوازیں آتی اور وطن کی فضائیں حزن والم سے بھر جاتی ہیں۔ شہید مظلوم مولانا محمد امین اورکزئی صاحب ایسے ہی انسان تھے۔

آج سے چھتیس سال قبل جب ہم نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا تو یہ مولانا کے شباب کا دور تھا۔ ان کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ کا زیادہ وقت ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی'' میں مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار نور اللہ مرقدہ کی معیت میں گزرتا تھا، جہاں محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے حکم پر ڈاکٹر صاحب ''ترمذی'' پر اور آپ امام طحاویؒ کی مشہور کتاب ''معانی الآثار'' پر کام کر رہے تھے۔ ان دونوں حضرات میں مثالی محبت تھی۔ اتفاق سے دونوں کو شہادت کی موت نصیب ہوئی۔ تصنیف کے ساتھ ایک دو اسباق بھی آپ کے ذمہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفہیم کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی بات سمجھ جاتا۔ دھیمے انداز میں آپ پڑھاتے تھے۔ آپ کا درس حشو وزوائد سے قطعاً پاک ہوتا تھا۔ قصے کہانیاں سنانا اور سیاسی حالات پر تبصرہ آپ کی عادت نہ تھی۔ وقت کی پابندی کرتے۔ عین وقت پر درسگاہ کے باہر موجود ہوتے اور گھنٹہ لگتے ہی سبق شروع فرما دیتے۔ بلا کے منتظم تھے۔ دار الاقامہ (ہاسٹل) کے جملہ امور کے ذمہ دار وہی تھے۔ ایک ایک طالب علم کے اخلاق اور حالات پر نظر رکھتے۔ جامعہ کے اصول وضوابط کی خلاف ورزی، آوارگی اور بداخلاقی قطعاً برداشت نہ کرتے۔ انہیں منصب نظامت پر اس عظیم شخصیت نے فائز کیا تھا جس کا یہ مقولہ بہت مشہور تھا: ''ہمیں صالح غبی چاہیے غیر صالح ذکی نہیں۔'' ہمارے شہید استاذ رحمہ اللہ نے یہ مقولہ پلے باندھ رکھا تھا اور وہ ایسے طلبہ پر کڑی نظر رکھتے تھے جن کا کردار اور عمل جامعہ کے تعلیمی اور تربیتی ماحول کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ دوسری جانب محنتی، صاحب استعداد اور نیک طلبہ کے لیے آپ سایہ رحمت تھے۔ کتنے ہی غریب طلبہ تھے جن کی انتہائی خاموشی سے آپ اعانت کیا کرتے تھے۔ جو طالب علم امتحان میں پوزیشن حاصل کرتا اسے مختلف کتابیں اور نقد رقم دے کر اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ خود یہ ناچیز حضرت کی عنایت سے بارہا مستفید ہوا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آج

میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں حضرت کی محبت وشفقت اور توجہات کا بڑا دخل ہے۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ بھی ان کی تعلیم اور تربیت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اپنے آرام کے اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر وہ ایسی کتابیں ذی استعداد طلبہ کو پڑھاتے جو نصاب میں داخل نہ تھیں۔ حضرت استاذ صاحب کی صحبت میں ہم نے زندگی کے جو ماہ اور سال گزارے، اس میں ہم نے اسلامی اخلاق کے وہ مناظر دیکھے جنہیں دیکھنے کے لیے آج آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ اخلاص اور للّٰہیت تو گویا آپ کی زندگی کا جلی عنوان تھا۔ صدقہ خیرات، جہد و جہاد، عبادت اور اطاعت، درس و تدریس اور اصلاح و تربیت سمیت آپ جو کچھ کرتے تھے اس کا مقصد رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ایسی جماعتیں، ادارے اور افراد دسیوں تھے جن کے ساتھ آپ تعاون فرماتے تھے لیکن کانوں کان بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ وہ دائیں سے دیتے تو بائیں کو پتہ نہ چلتا۔ انہوں نے اپنی ذات اور اپنے کارناموں کو اتنا چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ ان کی شہادت کی خبر سن کر عام آدمی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا بڑا انسان بزم جہاں سے اٹھ گیا ہے۔

جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل محروم نہ رہتا۔ دستر خوان پر کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہوتا، باہر سے کوئی نہ آتا تو چند طلبہ ہی کو شریک طعام کر لیتے۔ لگتا تھا انہیں پیسے سے قطعاً محبت نہیں، طالب علمی کا دور ختم ہونے کے بعد باری تعالیٰ نے حج کی سعادت نصیب فرمائی۔ اتفاق سے حضرت الاستاذ بھی تشریف لے گئے تھے۔ ملاقات ہوئی تو ایک معقول رقم دیتے ہوئے فرمایا: کتابوں کی خریداری پر کافی پیسے خرچ ہو گئے، ورنہ زیادہ پیش کرتا۔ عرض کیا: حضرت اب تو میں برسرِ روزگار ہوں۔ مجھے ضرورت نہیں، مگر وہ کہاں ماننے والے تھے، نہال کر کے ہی چھوڑا۔ علمی اور کتابی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔ میرا غالب گمان ہے کہ اپنی کمائی کا زیادہ حصہ وہ مہمان نوازی اور کتابوں کی خریداری پر صرف فرماتے تھے۔ علمی اور تاریخی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ ان کی وسیع لائبریری کی زینت تھا۔ کتابوں نے بھی ان کے ساتھ خوب وفا کی کہ ان کے ساتھ ہی شہید ہو گئیں۔ کون جانے کہ اس لائبریری میں قرآن کریم کی کتنی تفسیریں، حدیث اور فقہ کی کتنی شروح اور علم و ادب کے کتنے شہ پارے تھے؟ آج وہاں جلی ہوئی جلدوں، عمارت کے ملبے اور بموں کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ تواضع اور انکسار کا وصف بھی آپ کی شخصیت میں خوب نمایاں تھا۔ اپنے سے چھوٹوں کا ایسا اکرام فرماتے کہ باید و شاید۔ پیالیوں میں چائے ڈال کر خود پیش فرماتے۔ نوالے توڑ کر سامنے رکھتے۔ اس محبت آمیز سلوک کے پردے میں اصلاح فرماتے۔ آگے بڑھنے اور کام کرنے کی ترغیب دیتے۔ قیمتی مشوروں سے نوازتے۔ زمانے کے پیچ و خم سمجھاتے۔ حریف اور حلیف کا فرق بتاتے۔ مجھے یاد ہے مولانا ضیاء الرحمن فاروقی شہید جامعہ میں نو وارد کی حیثیت سے تشریف لائے۔ وہ ان کی اٹھان کا دور تھا۔ کوئی واضح تشخص ان کا نہیں بن پایا تھا، بہت محدود سا حلقہ تھا جس میں وہ متعارف تھے۔ حضرت الاستاذ صاحب واحد شخص تھے جنہوں نے فاروقی

صاحب کا استقبال کیا۔ جمعرات کی بزم میں ان کا بیان رکھا اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔

محدث العصر مولانا محمد یوسفؒ امام طحاویؒ کی عبقریت اور فقہ وحدیث میں ان کی مہارت کے بڑے قائل تھے اور محسوس فرماتے تھے کہ دیگر کتب حدیث کی طرح اس کی خدمت نہیں ہوسکی۔ چنانچہ آپ نے مولانا امین صاحب کو طحاوی شریف کی جامع شرح کی تالیف پر مامور فرمایا۔ آپ نے حضرت بنوریؒ کے منشا کے مطابق شرح لکھی مگر افسوس کہ حضرت کی زندگی میں یہ شائع نہ ہوسکی۔ اب یہ شرح ''نثر الازھار'' کے نام سے کتب خانوں پر دستیاب ہے۔ غرض یہ کہ حضرت استاذ کی ساری زندگی درس وتدریس، اصلاح وتزکیہ اور تصنیف اور تالیف میں گزری۔ اللہ نے ان کی چاہت کے مطابق شہادت کی موت نصیب فرمائی۔ بظاہر تو یہ موت ہے مگر حقیقت میں ایسی زندگی ہے جس کا چراغ کبھی گل نہیں ہوسکتا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آفتاب رشد وہدایت

مولانا قاری محمد قاسم، کراچی

سلف صالحین وعلمائے ربانیین کے تذکرے، ان کے کارنامے، اُن کی خدمات، دعوت وتبلیغ کی مساعی، احقاق حق وابطال باطل کے لئے قربانیاں، اشاعت دین کے لئے جدوجہد، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، اصلاح معاشرت، اصلاح بین الناس اور اصلاح ذات البین کے لئے کدوکاوش اور اخلاص وللّٰہیت کے واقعات قلم بند کرنا عظیم سرمایہ اور بہترین دینی خدمت ہے۔ اکابر علمائے دین سے تعلق رکھنا، نسبت قائم کرنا اور ان کی سیرت واحوال سے لوگوں کو آگاہ کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت الاستاذ المکرم، شیخ الاسلام، شیخ الحدیث، المحقق، الفقیہ، الادیب، الماہر فی الفنون المختلفۃ، المصنف والمؤلف، المدرس والمربی، الباحث فی العلوم الاسلامیہ، مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ اپنے دور اور عہد کے جامع الکمالات، پیکر اُلفت ومحبت، ہر دل عزیز اور باکمال شخصیت تھے۔ عبقری صفات سے متصف تھے، عزم وہمت کے کوہ گراں تھے، غیرت وحمیت دین رگ رگ میں پیوست تھی۔ اپنے گفتار، کردار، اقوال واعمال میں سلف صالحین کا کامل نمونہ تھے۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں ایک دن حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے عصر کے بعد علما وطلبا کی مجلس میں کسی مناسبت سے اکابر دیوبند کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ساتھ ساتھ موازنہ بھی فرماتے رہے، جب حضرت مدنیؒ کا ذکر آیا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور فرمایا: واللہ ما رآیت مثل المدنی پھر یہ بار بار فرماتے رہے۔ آج جب اپنے محبوب شیخ ومربی ومحسن اور مشفق استاذ حضرت اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا، تو میری حالت بھی یہی ہے کہ واللہ ما رأیت مثل الشیخ محمد امین، واللہ ما رأیت مثل الشیخ محمد امین، واللہ ما رأیت مثل الشیخ محمد امین۔

حضرت الاستاذ صاحبؒ کے اوصاف وکمالات اتنے اُونچے اور بلند مرتبہ ہیں کہ میرے جیسا شخص اُن کو کیا بیان کرے، تاہم خریداران یوسف میں نام لکھوانے کا موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا جا سکتا، اس لئے ذیل میں حضرت کے کچھ حالات اجمالاً پیش خدمت ہیں۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ یہ تذکرہ میرے لئے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔

اخلاص وللّٰہیت:

حضرت الاستاذ کا سب سے نمایاں وصف جس میں آپ "لا مثل لہ ولا نظیر لہ" تھے وہ اخلاص وللّٰہیت تھی۔ اپنا مدرسہ قائم کیا تو اس نیت سے کہ اس میں جتنے اعمال خیر ہوں گے اُن سب کا اجر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بخش دیا ہے۔ اپنی زندگی میں درجنوں ملی اور قومی کارنامے سرانجام دیے لیکن ہمیشہ اپنے آپ کو چھپا کر رکھتے اور کبھی کسی پر اظہار نہیں فرمایا، جو کرتے اللہ تعالیٰ کے لئے کرتے اور آپ کے کسی فعل سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ اس میں مخلوق کی خوشنودی کو پیش نظر رکھ رہے ہیں، جب اپنا مدرسہ قائم کیا تو پھر حسبۃً للہ پڑھایا اور اپنے بے پناہ

اخلاص وللہیت کی وجہ سے علوم دینیہ کی تدریس پر معاوضہ لینا گوارا نہیں فرمایا۔

غیرت دینی:

اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ کو دینی غیرت وحمیت کا جذبہ ایسا عنایت فرمایا تھا کہ دین کی خاطر کئی موقعوں پر سر ہتھیلی پر رکھ کر مردانہ وار میدان میں نکلے۔ شجاعت و بہادری آپ کی نمایاں صفت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ فرمودہ "اینقص الدین وانا حی" آپ کی زندگی میں جھلکتا نظر آتا تھا، جب کوئی امر خلاف دین مشاہدہ کرتے تو رنگ مبارک متغیر ہوجاتا اور دینی حمیت کے باعث برداشت نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے علاقہ میں بدعات ورسومات کا قلع قمع کیا اور ساری زندگی احیاء دین کی تحریکوں اور دینی کاموں کی سرپرستی فرماتے رہے۔ حق کی آواز کو عمر بھر بلند رکھا، باطل قوتوں کی سرکوبی کے لئے ہمہ وقت سرگرم رہے، اس کے لئے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، قاتلانہ حملے سہے، لیکن آپ کے جذبہ خدمت دین میں ذرا برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔

توکل وخودداری:

اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدسؒ کو مجسمہ توکل بنایا تھا، حد درجہ خوددار انسان تھے، سفر وحضر میں اپنے اخراجات تو کیا شرکا تک کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ بظاہر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اپنے آپ کو پوری طرح للہ فی اللہ دینی کاموں کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ مدرسہ میں جو اساتذۂ کرام تدریس کے کام میں شریک تھے، وہ بھی سب کے سب متوکلین تھے، کسی کا متعین مشاہرہ مقرر نہ تھا، مدرسہ کے لئے نہ چندہ کی کوئی ترتیب تھی نہ کوئی سفیر مقرر تھا، غالباً یہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے بعد دوسرا مدرسہ تھا جس کی بنیاد اس درجہ توکل پر پڑی تھی۔ اگر حضرت کے پاس کہیں سے کچھ آتا تو اساتذہ پر خرچ کرتے، ورنہ خود بھی فقر ودرویشی کی زندگی تھی اور دیگر اساتذہ بھی اسی طرز پر چلتے تھے لیکن ذاتی طور میں نے حضرت الاستاذؒ کو ہمیشہ دوسروں کے حق میں انتہائی فراخ پایا۔ خرچ کرنے سے کبھی ہاتھ نہیں رُکا، غریبوں بے سہاراؤں پر تو اپنا فریضہ سمجھ کر خرچ کرتے تھے۔

زندگی کے دیگر مشکل معاملات میں بھی توکل کا پیکر رہے۔ امن وامان کے حوالے سے ہنگو میں مشکل ترین حالات میں آپ اللہ تعالیٰ کے بھروسے اور توکل پر میدان عمل میں اُتر پڑتے اور پھر اسی اعتماد اور بھروسے کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمام راستے کھولتے جاتے۔

ہماری کوشش ہوتی تھی کہ حضرت اقدس کے قائم کردہ گلشن علم وعمل جامعہ یوسفیہ میں قریبی احباب کا کچھ نہ کچھ حصہ پڑتا رہے۔ استاذ صاحبؒ تو اتنے خوددار تھے کہ از خود کبھی اپنی ذاتی ضرورت کا تو کجا مدرسہ اور طلبا کی ضرورت کا

بھی کسی سے اظہار نہ کرتے تھے اور یہ خودداری آپ کو اپنے شیخ حضرت بنوری قدس سرہ سے وراثتاً منتقل ہوئی تھی، اس لئے عموماً ہمارے تعاون کی صورت ایسی ہوتی تھی کہ مدرسہ کی ضرورت سے بے خبر کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کی توفیق ہو جاتی تھی۔ لیکن بعض دوستوں کی خواہش تھی کہ حضرت سے مدرسہ کے تمام شعبہ جات کے اخراجات معلوم کر کے اُس کے مطابق مختلف مدات کے لئے منظم طریقے سے تعاون کرنا زیادہ بہتر ہوگا، لیکن حضرت اقدس سے یہ معلوم کرنا آسان کام نہ تھا۔ بندہ پر خصوصی شفقت، محبت اور اعتماد سے دوستوں کو توقع تھی کہ مجھے بتا دیں گے لیکن حضرت تو خودداری میں ڈوبے ہوئے تھے، بہر حال پیہم اصرار اور مسلسل درخواستوں پر ایک بار حضرت نے جوابی مکتوب میں کچھ اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ مدرسہ کی کارگزاری لکھ دی، جس سے ضروریات کا بھی بخوبی پتہ چل گیا اور ساتھ اس بات کا بھی اظہار کر دیا کہ اس قسم کی باتیں اُنہیں پسند نہیں لیکن دوستوں کے اصرار پر لکھ دیا تا کہ اُن کی دل شکنی نہ ہو، ذیل میں مکتوب کا وہ حصہ نقل کرتا ہوں، ان شاء اللہ بہت سے حضرات کے لئے نافع ہوگا۔

''آں محترم نے مدرسہ کی کچھ تفصیلات لکھ کر بھیجنے کے لئے فرمایا، ہر چند طبعاً ایسا کرنا بڑا دشوار تھا، حضرت شیخ (مراد حضرت مولانا بنوریؒ، راقم) کا یہ سبق لوحِ قلب پر سیدنا صدیق اکبرؓ کے مبارک الفاظ میں نقش ہے: "أسمعت من ناجیت" "اپنے کریم ورحیم، خبیر وبصیر مالک کا علم وخبر ہر بندہ کے لئے کافی ہے۔" "الیس اللہ بکاف عبدہ" لیکن آنجناب کے ارشاد کی تعمیل اور مخلص احباب کے اموال کے صحیح مصرف میں خرچ ہونے کے جذبے نے یہ چند سطور لکھوا دیے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

جامعہ یوسفیہ میں فقیر کے علاوہ گزشتہ سال بارہ اساتذہ پڑھاتے رہے۔ چار ان میں قاری حضرات تھے درجہ حفظ کے لئے اور آٹھ اساتذہ درجہ رابعہ تک پانچ درجات کی کتابیں پڑھاتے تھے، (مراد یہ کہ اعداد یہ بھی داخل تھی۔ راقم) طلبہ کی کل تعداد ڈھائی سو سے متجاوز تھی، جن میں تقریباً ۱۲۰ کتابیں پڑھنے والے اور تین متخصصین فی الحدیث اور باقی ماندہ درجہ حفظ میں تھے۔ مدرسہ میں ''خباز'' کے علاوہ کسی کی تنخواہ نہیں ہے۔ نادار اساتذہ حضرات کے ساتھ زکاۃ کی مد سے تعاون ہوتا ہے، جس کی مقدار متعین نہیں۔ نو اساتذہ ایسے تھے جن کے ساتھ یہ تعاون ہوتا رہا، سوا لاکھ روپیہ ان حضرات کو دیا گیا۔ طلبہ حضرات میں سے نادار طلبہ کو زکاۃ کی مد میں سے ۳۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا گیا۔ تملیک کے بعد بنوریؒ ٹاؤن کے طریقہ پر ۲۷۰ روپیہ پھر ان سے کھانے کے لئے واپس لیا جاتا رہا اور ایسے طلبہ کی تعداد شروع میں زیادہ آخر سال میں کم رہی۔ مجموعی طور پر ایک سو سے زیادہ طلبہ کو دیا گیا اور کبھی علاج وغیرہ کے لئے زکاۃ کی مد میں سے انہیں حسب ضرورت رقم ملتی رہی۔ تقریباً چار لاکھ روپیہ کی مد میں اس طرح صرف ہوا۔ ایک چار دیواری، ۱۶ لیٹرین اور ۸ غسل خانوں کی سادہ سی تعمیر پر تقریباً ۲ لاکھ روپیہ غیر زکاۃ کی مد سے خرچ ہوا اور خرید کتب اور بجلی کے مصارف ایک لاکھ روپیہ

تک ہوئے۔خباز کی تنخواہ میں ہزار روپے دی گئی، یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہوا اور ہو رہا ہے۔غیر زکاۃ کی مد میں مدرسہ ایک لاکھ سات ہزار روپے کا مقروض ہے۔اُمید ہے حق تعالیٰ اس کا بھی انتظام فرمادیں گے۔آپ اپنی مخلصانہ دعاؤں سے تعاون فرماتے رہیں اور سب سے زیادہ یہ دعا فرماتے رہیں کہ ٹوٹا پھوٹا کام اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ بنادے۔''

یہ خط ۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ کو لکھا گیا،اس سے اندازہ کریں کہ جب حضرت الاستاذ کا بندہ فقیر کی طرح ایک معتمد اور قریبی شاگرد'' جسے ہر طرح کا حکم دینا اُن کے لئے کوئی مشکل نہ تھا اور ہمارے لئے اُس پر جان تک دینا بفضل اللہ کوئی مسئلہ نہ تھا،کو اپنی ضرورت سے آگاہ کرنے کا یہ اسلوب وطرز ہے تو کسی اور سے مروجہ طرز کا چندہ یا تعاون کی اپیل کیسے اور کیونکر کر سکتے تھے،حضرت الاستاذ کی اس توکل کی برکت تھی کہ بحمد اللہ جامعہ یوسفیہ خوب شان وشوکت سے چلا اور تا حال بھی اُس کا فیض جاری وساری ہے۔

رسوخ فی العلم:

حضرت اقدس کی علمی شان کا تو ہم جیسے لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے چہ جائیکہ اُس کا تعارف کروائیں،بس اپنی بساط کی حد تک اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسبی اور وہبی علوم کا بحرِ ذخار حضرت کے ذہن میں جمع کر دیا تھا۔معقولات کے مشکل اور دقیق مباحث آپ کے سامنے محض موم تھے،کیا فلسفہ کیا منطق،ان سب علوم میں مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔آپ سے علم پڑھنے والے طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے آج علم کی بڑی بڑی مسندوں کو زینت بخشی ہوئی ہے،وہ بخوبی بتا سکتے ہیں کہ معقولات پر آپ کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔حدیث کے اُن متاخرین ائمہ میں سے تھے،جن کی تعداد اب پورے برصغیر میں اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ نے حضرت اقدس سید بنوری قدس سرہ کے علوم ومعارف کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لیا تھا۔فن رجال میں مہارت تامہ حاصل تھی کہ سال ہا سال تک کتب رجال آپ کا اوڑھنا بچھونا رہیں۔تفسیر قرآن سے خاص ممارست تھی،بات بات پر قرآنی مضامین کے ایسے دلنشین جواہر پارے ذکر کرتے کہ جس میں کسب سے زیادہ الہامی علوم کا رنگ جھلکتا۔اس کی ایک مثال آپ کا خزینہ علوم ومعارف کتابچہ''ارشاد الحلیم الی آداب التعلیم'' ہے،جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کی تفسیر لکھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے کتاب فہمی کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی عمدہ ذوق اور جذبہ عنایت فرمایا تھا۔اگر پڑھنے والا کوئی ایک مخلص بھی مل جاتا تو باوجود اپنی مصروفیات کے اس پر خوشی کا اظہار فرماتے اور اکیلے تنہا اُس ایک طالب علم کو پڑھاتے،بندہ کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''تمنا تھی کہ حسب وعدہ شعبان کے شروع میں حاضر ہو جاؤں،مگر ادھر بعض اتفاقی حوادث نے راستہ روک لیا

اور ساتھ کچھ طلبہ نے فرمائش کی کہ بعض ناتمام کتابیں تعطیلات میں پڑھائیں ان کے خلوص اور طلب صادق کی وجہ سے انکار کی جرأت نہ کر سکا۔''

اس کے ساتھ علمی مضامین کو لکھنے کا بھی خاص سلیقہ تھا، انتہائی جامع، مرتب اور سہل انداز میں لکھتے، کئی مسائل پر آپ کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔

اُصول فقہ کے امام تھے، سال ہا سال تک اُصول فقہ کی مختلف کتابیں پڑھاتے رہے اور اس فن کے دقیق اور مشکل مسائل کی تہہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ فقہ میں بھی گہری بصیرت حاصل تھی، حضرت امام اعظمؒ کے اقوال پر کاربند رہتے تھے اور اشد ضرورت کے علاوہ حضرت امام صاحب کے قول سے عدول نہیں فرماتے تھے۔ عموماً فقہی مسائل میں امام صاحب کے اقوال کی ترجیح ٹھوس دلائل سے بیان فرماتے تھے۔ حنفیت میں متصلب ضرور تھے لیکن شان تحقیقی تھی اور حنفی مسلک کی احادیث مبارکہ سے مدلل تائید فرماتے تھے، یہ آپ کا خاص ذوق تھا جس کا مشاہدہ آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف شرح طحاوی ''نثر الازہار'' میں کیا جا سکتا ہے اور اس کا اندازہ عرصہ دراز تک نصاب میں ''شرح النقایہ'' کے انتخاب اور تدریس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

آپ کے تلامذہ اپنی علمی کمزوریاں دور کرنے کے لئے دور دور سے آپ کے پاس آیا کرتے تھے، خود میرا بھی ارادہ تھا کہ فراغت کے بعد حضرت کے علوم سے مستفید ہونے کے لئے کچھ وقت آپ کے پاس گزاروں اور اپنی علمی وفنی کمزوریاں دور کروں لیکن اس کا موقع میسر نہ آ سکا۔

ذوق مطالعہ و ذوق تحقیق:

حضرت اقدس کو اپنے اکابر کی طرح اللہ تعالیٰ نے مطالعہ کا خاص شوق عنایت فرمایا تھا، کتاب کے دھنی تھے، کوئی نئی کتاب مکتبہ پر آ جاتی تو لینے کے لئے بے چین ہو جاتے اور اُسے حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتے۔ بندہ حضرت اقدس کے ساتھ حج کے سفر پر حاضر ہوا، تو وہاں کے ممتاز اور محقق اہل علم سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ آپ کا بہترین مشغلہ مکتبوں میں نایاب اور اہم کتابوں کو تلاش کرنا تھا۔ سفر سے واپسی پر زمزم اور کھجور کے علاوہ بس صرف کتابیں ہی کتابیں پاس تھیں حتیٰ کہ آپ کا سفری بیگ جس میں کپڑے لے گئے تھے وہ بھی کتابوں سے بھر گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سرعت مطالعہ کی دولت سے نوازا تھا، کئی کئی سو صفحات ایک مجلس میں مطالعہ کر لیتے، جامعہ یوسفیہ میں قائم کردہ آپ کی وسیع لائبریری اور لائبریری کی کتابوں پر آپ کے مطالعاتی نوٹس اور خلاصے آپ کے ذوق مطالعہ کا بہترین عکاس ہیں۔ عموماً باہر ملک جانے والے احباب سے قیمتی نئی چھپنے والی کتابیں منگوایا کرتے تھے، اس بات کی خاص اہتمام سے معلومات رکھتے کہ کون سی نئی کتابیں چھپ رہی ہیں یا کن کتابوں پر تحقیقی کام جاری ہیں۔

ایک بار بندہ نے 'المغنی' خرید کر بھیجی، اس پر ایک طویل مکتوب ارسال فرمایا، جس کا کچھ حصہ نذر قارئین ہے، لکھتے ہیں:

''جناب کی ارسال فرمود کتاب ''المغنی'' جو آرزوہائے حیات مستعار میں سے ایک بڑی آرزو تھی مل گئی، انسانی فطرت کے موافق اس قسم کے مواقع پر جو کیفیات قلب وقالب پر ظہور پاتی ہیں، بدرجہ کمال مشاہدہ میں آئیں، اس دن بہت سارے خاندانی بزرگ بھی مہمان بن کر آئے تھے، فرط مسرت کا یہ عالم تھا کہ ان سب سے غافل ہوا اور مطلوب کے ظاہری وباطنی حال وکمال کا مطالعہ کرتا رہا۔''

یہ ایک کتاب ملنے پر حضرت اقدس کی کیفیت کا بیان ہے جو خود آپ کے اپنے دست مبارک سے لکھا ہے، اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے ذوق مطالعہ کا کیا عالم ہوگا۔

تحقیق تو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اس ذوق کو جلا محدث العصر حضرت بنوریؒ کی بابرکت صحبت سے ملی، آپ کی تحقیق کا سب سے بہترین مظہر ''نثرالازہار'' ہے، حضرت بنوری قدس سرہٗ ''طحاوی شریف'' پر ایک خاص طرز سے کام کروانا چاہتے تھے، انہیں حضرت اقدس جیسی باصلاحیت اور گوہر بار شخصیت ملی تو ان کی امیدیں برآنے کا موقع میسر آگیا۔ حضرت نے ''نثرالازہار'' کی تصنیف کے لئے مطالعہ کی جو مشقت اٹھائی اور جو داد تحقیق پیش کی وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ حضرت اقدس کی زندگی میں اس کی دو جلدیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں، مزید مجلدات تیاری کے مراحل میں ہیں، امید ہے کہ جلد منظر عام پر آنے کی سبیل من جانب اللہ پیدا ہوگی۔

حضرت اقدس اپنے علاقہ میں عوام وخواص کے مرجع اور پیشوا ہونے کے باعث تحقیقی کاموں کے لئے وقت نہ نکال سکے، پھر طبیعت مبارکہ اتنی حساس تھی کہ معمولی خلاف طبع امر سے مکدر ہوجاتی، جس سے تصنیف وتحقیق کے لئے درکار نشاط مفقود ہوجاتی۔ ایک خط میں فقیر کے نام رقم طراز ہیں:

''ساتھیوں کا مشورہ تھا کہ طحاوی شریف کا نامکمل کام پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے، چنانچہ کام شروع کیا، خداوند متعال کی شان تھی کہ انہی ایام میں حضرت الاستاذ صاحب (مولانا فضل محمد سواتیؒ۔ راقم) تشریف لے آئے، ایک دن قیام فرما کر دوسرے دن بلا مشورہ اچانک روانہ ہوئے۔ اس کی وجہ سے اتنا شدید صدمہ دل ودماغ کو پہنچا کہ ڈھائی مہینے ہوچکے پھر ایک سطر بھی طحاوی شریف پر نہیں لکھ سکا۔ دعا فرمانے کی مکرر درخواست ہے، کل ارادہ تھا کہ پھر کام شروع کروں گا، لیکن موفق نہیں ہوا، آج پھر ارادہ تھا کہ شروع ہوجائے مگر توفیق نے ہاتھ نہیں دیا۔''

اس سے جہاں حضرت اقدس کی حساس طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں اپنے استاذ سے بے پناہ محبت وعقیدت کا بھی علم ہورہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے اساتذہ کی قدردانی نصیب فرمائے۔

حضرت الاستاذ کے تحقیقی کاموں میں رکاوٹ کے اگر دیگر اسباب سے صرف نظر کرلیا جائے تو محض مہمانوں کا ہجوم ہی اتنا ہوتا تھا کہ استاذ صاحب جیسی با مروت شخصیت اُن کو رخصت کرتے کرتے دن کھپا بیٹھتی۔ ان ہی مصروفیات کے باعث بعض اوقات چند معمولی سطور لکھنا کارے دارد بن جاتا چہ جائیکہ تحقیقی کام کیا جائے۔ بندہ کے نام مہمانوں کی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آج جمعۃ المبارک ہے، ذرا فرصت ملی، نماز فجر کے بعد دو مہمان تشریف لائے تھے، ان کو رخصت کیا تو ایک اور دوست تشریف لے آئے کرم (ایجنسی) سے۔ وہ تشریف فرما ہی تھے کہ سوات سے ایک دوست رائیونڈ سے ہوکر آئے اور ان کی موجودگی میں کچھ احباب ملنے آئے، بمشکل اشراق کا وقت ملا، ابھی ساڑھے نو بج رہے ہیں، دوسرے حضرات کو رخصت کیا، ایک دوست یہاں کسی کی تعزیت وعیادت کے لئے کچھ دیر کے لئے نکلے ہیں، اس فرصت کو غنیمت جانا (مگر یہ فرصت بھی ہاتھ سے نکل گئی، یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ دو اور دوست تشریف لے آئے) بہرحال آپ حضرات کو یقیناً اس ناچیز سے بجا طور پر برادرانہ شکوہ گیا شکوے ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہے کہ میری یہ کوتاہیاں آپ حضرات کی طرف بے توجہی کا ثمرہ کم ہیں اکثر مجبوری کا نتیجہ ہیں۔''

حضرت الاستاذ صاحب کا چونکہ بنیادی ذوق علم وتحقیق تھا، اس لئے بقیہ کاموں کو ایک فریضہ سمجھ کر ادا تو ضرور کرتے تھے لیکن طبعاً ایک خلش باقی رہتی، گویا علم وتحقیق کے بغیر گزرا وقت وہ ایک طرح سے عبث محسوس فرماتے اور اس پر رنج وکڑھن کا اظہار کرتے۔ بندہ کے نام علاقائی مصروفیات کے بارے اسی طرح کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جی تو چاہتا ہے کہ خود کم از کم ایک ہفتہ کے لئے کراچی آؤں اور مخلص احباب، اساتذہ کرام اور مشائخ کے مزارات کی زیارت کی سعادت حاصل کروں مگر جیسا کہ عرض کر چکا کہ بالکل گرفتار ہوں، اتنی رہائی کب نصیب ہوگی اور افسوس ہے کہ اپنی نااہلی کی وجہ سے انہی حالات نے تصنیف وتدریس کے کام سے محروم رکھا ہے، بلکہ ذکر تک کی توفیق کم ملتی ہے۔ وقت کے اس ضیاع کو پھر عمر کے اس حصے میں دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے، لیکن "وما تشاؤن الا ان یشآء اللہ" اپنی صداقت منوا رہی ہے''۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''بعد العصر حدیث میں لکھنا منع ہے، نظر کے لئے مہلک ہے، میں بعد العصر لکھ رہا ہوں کہ اس کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملی۔''

اتنی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود حق تعالیٰ نے توفیق بخشی اور ''نثر الازہار'' کا ایک بڑا حصہ پایہ تکمیل تک

پہنچا۔ یہ خالص آپ کی کرامت تھی، جب پہلی بار اشاعت کا ارادہ فرمایا تو بندہ ناچیز سے بھی مشورہ طلب فرمایا اور طباعت کا پورا خاکہ بھی لکھا۔ اس بارے میں خط لکھتے ہیں:

''کل برادرم..... کا ایک مکتوب گرامی ملا تھا جس میں یہ خوشخبری درج تھی کہ مجلس شوری کے مشورہ سے جناب ڈاکٹر صاحب زید مجدہم نے فقیر کے طحاوی شریف پر کیے ہوئے کام کی طباعت کی اجازت دے دی ہے۔ چند سال پہلے صدیقی المکرم حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم سے فقیر نے یہ درخواست کی تھی لیکن انہوں نے ایک ایسی صورت کا ذکر فرمایا جو میرے لئے ناقابل عمل تھی۔ اس وقت طباعت کے اسباب مہیا تھے جبکہ اس وقت وہ حالت نہیں۔ آپ دُعا بھی فرماتے رہیں اور برادرم محمد سعد صاحب سے مشورہ بھی لے لیں کہ یہ کام کراچی سے بہتر ہوگا یا لاہور یا پشاور سے۔

میرے ذہن میں' اگر اسباب اور سرمایہ کا انتظام ہوا، مشیت ایزدی نے ساتھ دیا' نقشہ یہ ہے کہ صفحہ کے حلب پر طحاوی شریف کا تصحیح شدہ متن ذرا جلی حروف میں آجائے، نیچے تلخیص وتخریج نسبتاً باریک حروف میں طبع ہو۔ رجال کا کام حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہم کے حکم پر کام میں طوالت کی وجہ سے روک دیا تھا، اگر احباب نے مناسب سمجھا تو اس کا انتظام بھی بتوفیقہ تعالیٰ کرلیں گے۔ حاشیہ پر رجال کا ذکر ہوجائے گا۔ سرمایہ کی فراہمی اگر اہل خیر حضرات کی طرف سے ہوئی تو فبہا ورنہ قرض سے فی الحال کام چلائیں گے۔ "واللہ سبحانہ حسبنا ونعم الوکیل" اپنے رائے گرامی سے آگاہ فرمالیں۔''

الحمدللہ حضرت کی حیات میں ''نثر الازہار'' کی دو جلدیں طبع ہو کر اہل علم وتحقیق سے داد تحسین وصول کرچکی ہے اور ان شاء اللہ مزید جلدیں تیاری کے مراحل میں ہیں۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر مؤمن کے ایمان کا جزء ہے، لیکن حضرت اقدس کی زندگی کا لمحہ لمحہ عشق نبوی سے لبریز تھا۔ اپنے مدرسہ کے سارے اعمال خیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایصال ثواب کی نیت کی تھی، کوئی کام سنت کے خلاف ہم نے نہیں دیکھا۔ نشست وبرخاست، رہن سہن، خورد ونوش اور زندگی کے دیگر معاملات میں سنن وآداب کی سختی سے پابندی فرماتے تھے۔ حج کے سفر میں روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مدینہ طیبہ کی گلیوں میں عشق ووارفتگی کی جو کیفیات تھیں، اُس کو بندہ الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔ ایک بار بندہ نے مدینہ طیبہ کی کھجور ہدیہ میں بھیجی تو جوابی مکتوب میں ارقام فرمایا:

''جب تمور مبارکہ کی تھیلی کھولی تو کیا کہوں حق تعالیٰ کے حضور تشکراً جبین نیاز رکھنے کے ساتھ آپ کے اس بے

نظیر اکرام واحسان کا حق سپاس ادا کرنے کی نا تمام کوشش کی۔ قاری صاحب! اپنی سیہ کاریوں کی وجہ سے تو یقین ہے کہ دوست فداہ نفسی وعرضی (صلوات اللہ تعالی وسلامہ علیہ) کی نگاہ ناز میں پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے راستہ کو چھوڑنے کی وجہ سے عتاباً رخ مبارک ادھر نہیں فرماتے ہوں گے، لیکن عشق کا درس ہے۔

اگرچہ دوست بہ یک جو نمی خرد مارا
بعالمے نفروشیم موئے از سر دوست''

میں نے پہلے ذکر کیا کہ بندہ نے ''المغنی'' ہدیہ میں بھیجی، چونکہ حضرت پر تواضع اور عجز کا بہت زیادہ غلبہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے اظہار عشق کے بعد معاً ایسی بات لکھدی جس میں عشق نبوی کے حوالے سے ایک عام دیہاتی آدمی کو اپنے اُوپر ترجیح دی اور اپنے جذبہ کو ناقص بتلایا، یہ سفر حرمین میں ہی خریدی تھی، اس حوالے سے حضرت کی صحبت میں بیٹھتے ہوئے یہ عام دیہاتی آدمی کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''المغنی کے جلدوں کے ساتھ پلاسٹک کے جو تھیلے تھے، جلدیں جب ان سے نکال دی گئیں، تو حجرہ میں بیٹھے ہوئے مہمانوں میں سے ایک مہمان' جو مولانا رفیع اللہ خان صاحب کے والد اور میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں' نے فرمایا کہ اگر ضرورت نہ ہو تو ایک تھیلا مجھے دے دیں، فقیر نے دو دے دیئے۔ تھیلوں کا ہاتھ میں لینا تھا کہ آنکھیں پرنم ہوگئیں، سبحان اللہ! ایک ہم ہیں کہ عشق ومحبت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، ایک یہ باکمال لوگ ہیں، "اغبر واشعث" جو بظاہر قلل جبال میں بھیڑ بکری چرانے والے چرواہے نظر آتے ہیں، مگر بباطن عشق ومحبت کی دولت کے بادشاہ ہیں۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد''

آہ! اب عشق ومستی سے لبریز ان تحریرات کے لئے آنکھیں صرف ترس ہی سکتی ہے اور یادوں کا سہارا ہی لیا جا سکتا ہے، کیونکہ موت تو برحق ہے، موت نے کیسے کیسے جبال ومینار ڈھادیئے۔ لاشک کہ "کل من علیها فان ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام" ایک اٹل حقیقت ہے اور باوجود طبعی غم وتکلیف کے عقلاً اس پر رضامندی ایک مؤمن سے مطلوب امر ہے۔

تواضع اور اصاغر نوازی:

حضرت اقدس کی تواضع اور شفقت کو دیکھنے والے سینکڑوں تلامذہ و متعلقین موجود ہیں۔تواضع وانکساری، اپنے چھوٹوں پر شفقت اور اپنے بڑوں کا ادب اگر کسی نے مجسم صورت دیکھنا ہوتا وہ حضرت اقدس کے سراپے میں نظر آتا۔سراپا تواضع اور شفقت تھے، بعض اوقات خوردوں کو غلط فہمی ہونے لگتی کہ ہم واقعی کچھ بن گئے ہیں جو حضرت یہ معاملہ فرمارہے ہیں۔میرے لئے مناسب تو نہیں کہ اپنے لئے حضرت اقدس کے وہ کلمات شفقت نقل کروں جن کا اہل ہونا، کبھی حاشیہ خیال میں بھی نہیں گزرا، لیکن حضرت کی تواضع، اصاغر نوازی اور مشفقانہ برتاؤ کی تصویر اُس سے بہتر شاید پیش نہ ہو سکے، اس لئے صرف ایک خط کا اقتباس نقل کرتا ہوں، اُس سے قارئین خود اندازہ فرمالیں کہ ایک کوتاہ علم و عمل اور ادنیٰ شاگرد سے اگر یہ طرز مخاطبت ہے تو یہ شخص اپنے اساتذہ اور مشائخ کے حق میں کیا رویہ رکھتا ہوگا؟ بندہ نے حضرت کی خدمت میں کچھ معمولی ہدیہ پیش کیا، اس کے جواب میں تواضع اور شفقت بھرے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''آپ کی سابقہ عنایات کے بار کے نیچے اس فقیر کی گردن جھکی ہوئی ہے، جب کہ مکافاۃ کی کوئی صورت نہیں پاتا۔آنجناب مزید زیر بار فرمارہے ہیں۔میرے لئے یہی سعادت کافی ہے کہ آپ جیسے پاک باطن، نیک نفس، اصحاب علم وتقویٰ کا اس سے اخلاص ومحبت کا تعلق ہے، جب کہ میں اس کا ہرگز اہل نہیں۔اس پر مستزاد گراں قدر ہدایا کا کیسے اہل بن سکتا ہوں۔حق تعالیٰ مجدہ آپ کو اپنے خزائن غیب سے اس کا بہتر سے بہتر صلہ عنایت فرمائے، میں تو مکافاۃ سے قاصر ہوں۔''

من آنم کہ من دانم، بندہ اپنے بارے میں خوب جانتا ہے۔جو کچھ حضرت اقدس نے لکھا وہ اُن کا حسن ظن تھا، اللہ تعالیٰ مجھے اس پر پورا اُترنے کی توفیق بخشے۔اس سے بتانا مقصود ہے کہ حضرت اپنے چھوٹوں کو کتنا اُونچا مقام دیتے تھے اور خود کتنی تواضع فرماتے تھے۔

آپ کی اصاغر نوازی کا عکاس ایک اور خط پڑھیے:

''آں محترم نے گراں قدر ہدیے سے پھر زیر بار کیا، فقیر کے لئے آپ جیسے احباب کا اخلاص، قلبی تعلق اور دعوات صالحہ بے بہا تحائف ہیں، چونکہ میرا قلب امراض کا ٹھکانا ہے، اس قسم کے ہدایا سے طمع کے ناکارہ مرض میں اضافہ سے خائف ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے خلوص کا بے انتہا بدلہ عنایت فرمائے اور مجھے ظاہری و باطنی امراض سے نجات بخشے، آپ حضرات کے ساتھ تعلق اُخروی نجات کا باعث بنائے۔''

اس اقتباس کے حرف حرف سے آپ کی تواضع، عاجزی، انکساری، اصاغر نوازی اور شفقت ورأفت ٹپک رہی ہے، آپ کی صحبت مبارکہ میں چند لمحے بیٹھنے والے کو یہ کیفیت منتقل ہونا شروع ہوجاتی کہ قلب سے دُنیا کی محبت نکلتی

اور آخرت کی رغبت بڑھتی جاتی۔ لیکن خود احتسابی اور تواضع کا عالم دیکھئے کہ اپنے آپ کو ہمارے حقیر ہدایا' جن کی ظاہری قیمت انتہائی معمولی ہوتی' پر بھی اتنے محتاط رہتے۔ "ذلک فضل اللہ یو تیہ من یشاء"۔

حضرت کی بندہ کے اُوپر ایسی عنایتیں اور شفقتیں رہیں کہ اگر بندہ اپنی آمد کی اطلاع دیتا تو بے چین و منتظر رہتے اور بار بار پوچھتے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آنجناب نے اپنا عزم ظاہر نہیں فرمایا کہ رمضان شریف کے آخر میں یا شوال کی ابتدا میں تشریف لائیں گے یا نہیں؟ یہ تشنگی باقی ہے، اگر مطلع فرمائیں تو خوشی ہوگی۔''

اس فقیر پر یہ احسان تو تادم مرگ نہ بھولے گا اور اس پر میں رب تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ حضرت اقدس مجھ جیسے ناکارہ کو کراچی آمد پر مستقل میزبانی کا شرف بخشتے اور قیام بندہ ہی کے ہاں ہوتا۔ اس اعتماد اور شفقت کو سوچتا ہوں تو دل شکر و امتنان میں ڈوب جاتا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حسنِ خط:

حضرت اقدس کو اللہ تعالیٰ نے باطنی و معنوی کمالات کے ساتھ جو ظاہری خوبیاں اور کمالات عطا فرمائے تھے، اُن میں حسن صورت اور جمال کی طرح آپ کا ''خط'' بھی انتہائی حسین اور خوبصورت تھا۔ عربی اور اُردو دونوں انتہائی عمدہ اور نفیس خط میں لکھتے تھے۔ ویسے تو پشتو اور فارسی پر بھی کامل عبور تھا اور ان دونوں زبانوں کے بھی بہترین لکھاری تھے لیکن آپ کے اُردو اور عربی خطوط دیکھ کر روح کو طراوت ملتی ہے، آپ کی عادت طیبہ تھی کہ ہر خاص و عام کے خطوط کا بالتزام جواب دیتے تھے اور خود بھی معمولی بیماری یا واقعے پر عیادت، تعزیت اور دریافت احوال کے لئے خطوط لکھتے تھے، کہیں کسی تنازع کا علم ہوتا، تو اصلاح ذات البین کے لئے خطوط لکھتے، اسی طرح کسی علمی مسئلے کے لئے رجوع کرنے والوں کو بھی بہترین مدلل جوابات پر مشتمل خطوط روانہ فرماتے، اگر آپ کے لکھے ہوئے خطوط کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

خدمتِ خلق:

حضرت اقدس نے ساری زندگی ہی خادمانہ بسر کی۔ اہل علاقے کے لئے بجلی، روڈ، پانی اور گیس کی سہولتوں کے حصول سے لے کر عام غریب افراد کی نجی زندگی میں درپیش مسائل تک کی خبرگیری رکھتے اور ہر ممکنہ تعاون فرماتے۔

مہمانوں کی خدمت بھی اپنے ہاتھ سے انجام دیتے، سفر حج میں حضرت الاستاذ کا یہی معمول تھا کہ اپنے کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ دوستوں کے کام بھی کر دیتے۔

اولیاء اللہ کی محبت:

حضرت اقدس علما اور اولیا کے بڑے قدردان تھے، یہ معمول تھا کہ جس علاقہ میں تشریف لے جاتے وہاں کے بزرگوں اور بڑے علما سے ضرور ملتے، اپنے قریبی دوستوں کو بھی اللہ والوں کی زیارت اور ملاقات کے لئے لے جاتے۔ حج کے موقع پر بھی عالم اسلام کے محققین علما سے ملنے کا مشغلہ رہتا، آپ نے آخری وقت تک اپنے آپ کو بزرگانِ دین کی صحبت میں رکھا، خود ولایت کے اُونچے مسند پر فائز ہونے کے باوجود اپنے خطے کے بزرگوں کے پاس عاجزانہ حاضری اور استفادے کا معمول تھا۔ حضرت مولانا سراج الیوم صاحب (گڑھئی سوات) کے ساتھ اصلاحی تعلق تھا اور سلسلہ قادریہ میں اُن سے سلوک کی منزلیں طے کر کے خلافت پائی تھی۔ آپ نے اپنے اکثر متعلقین کو بھی حضرت سے بیعت کروایا تھا، بندہ بھی حضرت اقدس اور حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتیؒ کی معیت میں حضرت الشیخ گڑھئی بابا جی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور حضرت نے بیعت فرما کر اذکار تلقین کیے تھے۔ جب ہمارے اور آپ کے مرشد کا انتقال ہوا تو غم والم سے بھرپور ایک اطلاعی خط بندہ کے نام لکھا، اس خط کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے، اس سے قارئین اندازہ لگائیں کہ آپ کیسے فنافی الشیخ تھے اور اس میں بندہ جیسے لوگوں کو بھی حضرت الشیخ نوراللہ مرقدہ کے لئے ایصال ثواب اور دُعا کے حرص میں کس قدر بلند کلمات ارشاد فرما دیئے، لکھتے ہیں:

> "وتوكل على الحى الذى لايموت وسبح بحمده، كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذى الجلال والاكرام، میرے عزیز بھائی! حقائق کتنے تلخ ہوا کرتے ہیں اور کتنے بھاری۔ اور یہ ضعیف لبنیان انسان کتنا نحیف ہے اور اکثر طبعاً لطیف بھی ہوتا ہے، مگر حقائق کے تلخ گھونٹ اسے حلق سے اُتارنے پڑتے ہیں اور ان کا کمرتوڑ بوجھ اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔ آہ ثم آہ! آج پھر اپنی یتیمی کا رونا رونا پڑا، ایک بار پھر ہم اور آپ یتیم ہو گئے، گڑھئی چوریال سے جو آفتاب ہدایت لاکھوں قلوب کے تاریک گوشے منور کرتا رہا، وہ آخر الامر غروب کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
>
> میرے قابل احترام بھائی! مجھے یقین ہے کہ یہ خبر جناب کے لئے انتہائی دُکھ اور تکلیف کا باعث ہوگی، بلکہ خرمن سکون پر بجلی بن کر گرے گی، مگر مجبوراً لکھنا پڑا کہ آپ جیسے صالح، مخلص، متقی احباب کی دُعائیں، ایصال ثواب کی مساعی حضرت الشیخ نوراللہ تعالیٰ مرقدہ کی روح مبارک کو خوش رکھنے کے ذرائع ہیں۔ دو ہفتے پہلے حاضر خدمت ہوا تھا۔ چہرۂ انور دیکھا، ان بدنصیب آنکھوں کو کیا پتہ تھا کہ پھر یہ دولت نصیب نہ ہوگی اور آنسو

بہا بہا کر بھی کبھی ٹھنڈک نہیں پائیں گی۔

آہ! میری بدنصیبی! خضرراہ پاکر بھی ہدایت سے محروم رہا۔ روئے زمین پر خیر و برکت اور رشد و معرفت کا عظیم ترین خزانہ پاکر بھی تہی دست و تہی دامن رہا۔ آہ ثم آہ! کہ اس عظیم ہستی سے اوروں نے بھی کما حقہ استفادہ نہیں کیا۔ طریقت و شریعت و حقیقت کے اس مجمع البحار سے وہ موتی حاصل نہیں کیے گئے، جو شاید ہی دوسری جگہ مل سکیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ,فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین , اللہ تعالیٰ ہی ہمارا اور آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ جریح القلب ,حریق الکبد ,محمد امین کان اللہ تعالیٰ لہ۔''

بندہ کی والدہ ماجدہ' جو انتہائی پارسا و متقی خاتون تھیں' کا انتقال ہوا،طبیعت پر اثر طبعاً لازمی تھا جو ایک عرصے تک رہا،ایک خط میں حضرت کے نام غالباً حسرت و افسوس کا اظہار کیا جس پر جوابی مکتوب میں درجہ ذیل کلمات ارشاد فرمائے:

''والدہ ماجدہ کے انتقال پر جس صدمہ کا اظہار فرمایا تھا برحق اور بجا طور پر تھا،رجال کے بارے میں قحط الرجال کا لفظ زبان زد خاص و عام بن چکا۔ نسواں کے بارے میں تو گویا صدیوں سے قحط کا عالم ہے کہ اب مثالی عورت کے وجود کا تصور اذہان میں نہیں آتا،ایسے حالات میں مرحومہ جیسی نیک سیرت ,پاک طینت ,علم و عمل و تقویٰ کے مجسمہ کا انتقال یقیناً ایک بڑے صدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

تلک عشرۃ کاملۃ

اللہ تعالیٰ نے محبوبیت سے ایسا نوازا تھا کہ جب آپ ہمارے ہاں تشریف لاتے تو محلہ کے لوگوں کا زیارت و ملاقات کے لئے تانتا بندھ جاتا،ایک بار آپ کے استاذ گرامی حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ بھی ساتھ تشریف لائے تھے،ایک دن لوگ جمع ہوئے۔ دوسرے دن پھر مجمع جمع ہوگیا،دونوں اکابر اس وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے،محلہ والے پوچھنے لگے کہ وہ ''فرشتے'' کہاں گئے،ہم ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم نے زندگی میں ایسی معصوم صورتیں کسی کی نہیں دیکھیں۔

ایک بار ایک اجنبی شخص آکر حضرت الاستاذ سے ملا اور آپ کو پیشکش کی کہ میں آپ کو حج پر لے کر جانا چاہتا ہوں لیکن آپ نے اس کا شکریہ ادا کر کے اسے ٹال دیا۔

حضرت اقدس سیدی وسندی،محبوبی و مولائی کی زندگی سراپا کمالات تھی۔ آپ رشد و ہدایت کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ کے اوصاف جمیلہ کا احاطہ کون کر سکتا ہے،مختصراً جو باتیں سامنے آتی گئیں وہ قلم بند کردی گئیں،آپ اپنے

عہد کے مثالی محقق، مصلح، مربی، مبلغ اور عبقری صفات کے حامل شخصیت تھے، اپنے پیچھے کئی صدقات جاریہ چھوڑ گئے ۔ جامعہ یوسفیہ، تعمیر کردہ مساجد، تصانیف، ہزاروں تلامذہ، نیک سیرت اولاد اور علم ماینتفع بہ ان شاء اللہ آپ کے لئے اُخروی ذخیرہ ہیں۔

سب سے بڑی سعادت یہ کہ حضرت اقدس نے تیرسٹھ سالہ زندگی کی دُعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ ۶۳ سال کی عمر، شہادت کی عظیم موت، روزہ کی حالت میں جمعرات کے دن نصیب ہوئی، یوم الخمیس وما ادراک مایوم الخمیس، یوم الخمیس ھو یوم الشھادۃ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کے فیوضات سے محروم نہ فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

محبتوں کے امین

قاری اسد اللہ خان، مردان

اللہ تعالیٰ نے دین کے احیاوبقااور انسانی ہدایت کے لئے اولین سرچشمہ 'رجال اللہ' کو قرار دیا اور 'کتاب اللہ' کی وہی تبیین وتشریح معتبر قرار دی جو'رجال اللہ' کے اقوال وافعال اور احوال وتقریرات سے موثق ہو۔ 'رجال اللہ' انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتے ہیں اور ان کی قدردانی اس نعمت میں بڑھوتری کا سبب بنتی ہے۔ لیکن اگر ان کی ناقدری ہو تو اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے اور ان کے فیوض وبرکات سے اہل زمین محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

'رجال اللہ' زمین پر ہزار فتنوں کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب وہ اٹھتے ہیں تو فتنے ٹوٹی ہوئی تسبیح اور بارش کے قطروں کی طرح اہل زمین پر ٹوٹتے ہیں، تب اندازہ ہوتا ہے کہ 'رجال اللہ' کا وجود کن برکات وفیوضات کا باعث ہوتا ہے اور اس سے محرومی کن آفات وبلیات کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ جب تک ان کا وجود باقی ہے تو یہ دین اپنی اصل شکل میں باقی رہے گا اور جب خدانخواستہ یہ ایک ایک کر کے ختم ہو گئے تو دین کی اصل شکل مٹ جائے گی۔

استاذ گرامی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ 'رجال اللہ' کے اسی قافلہ کے فرد تھے۔ جن کی پیروی و اتباع میں قوموں کی بقا ہوتی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے 'انعام یافتہ' طبقے میں ذکر فرمایا ہے۔ لاشک آپ کا ایمان صدیقین کا ایمان تھا، آپ کی حیات طیبہ صالحین کی حیات تھی اور آپ کو موت شہداء کی نصیب ہوئی، جو شخص وراثت نبوت سے سرفراز ہو، صدق واخلاص کے انتہائی مقام پر فائز ہو۔ صلاح وتقویٰ اس کا شیوہ ہو اور شہادت کی پسندیدہ موت سے ہمکنار ہو تو اس کی سعادت کو الفاظ میں کیسے اور کیوں کر سمیٹا جا سکتا ہے۔ حضرت الاستاذ پر ان انعامات الٰہیہ کا فیضان دیکھ کر قلم رکنے لگتا ہے اور سمجھ نہیں آتا کہ کس گوشے اور کس پہلو کو کھولا جائے، ایک بات لکھنے کا ارادہ ہوتا ہے تو ذہن کئی اور گوناگوں صفات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ انہیں سمیٹنے کا قصد کرتے ہیں تو پہلے مذکور میں تشنگی کا احساس قدم بڑھانے سے روک دیتا ہے۔ الغرض حضرت الاستاذ کی زندگی پر کچھ کہنا یا لکھنا، اس طرح کہ استقصا اور احاطہ کیا جائے ناممکن نہیں تو ہم جیسوں کے لئے مشکل ضرور ہے۔

پہلی ملاقات:

۱۹۷۷ء کے شعبان کی بات ہے۔ استاذ گرامی چینگورہ اپنے محبوب استاذ مولانا فضل محمد سواتی صاحب کی زیارت وملاقات سے واپسی پر مردان رکے ہوئے تھے۔ آپ کا قیام مسجد گجوخان مردان میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے

والد گرامی مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب کے ہاں تھا جو حضرت مدنیؒ کے انتہائی قریبی تلامذہ اور ہمارے خطے کے اجل فضلاء دارالعلوم دیوبند میں سے تھے۔ بندہ کو وہاں حضرت کی زیارت وملاقات کا پہلی بار شرف ملا، مجھے پتہ چلا کہ یہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم اور استاذ ہیں۔ بندہ نے عرض کیا کہ مجھے علم دین حاصل کرنے کا شوق ہے اور میں ان شاء اللہ تعالیٰ درجہ اولیٰ میں داخلہ کے لیے اگلے سال بنوری ٹاؤن آنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور تشجیع فرمائی۔ اس پہلی ملاقات ہی سے آپ کی تواضع، انکساری، سادگی اور اپنائیت کا نقش ذہن پر جم گیا۔

جامعہ میں بیتے دنوں کی یاد:

۱۹۷۷ء شوال میں بندہ نے درجہ اولیٰ کے لئے بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا، درجہ اولیٰ میں استاذ صاحب کا کوئی سبق تو ہمارے پاس نہ تھا، تاہم آپ کی شفقتوں اور عنایتوں سے ہم بدستور فیض یاب ہوتے رہے۔ آپ نے ہر حوالے سے ہماری نگرانی رکھی، ضروریات کا خیال رکھتے، وقتاً فوقتاً مالی تعاون کرتے، کوئی کھانے کی چیز آپ کے پاس آتی تو ہمیں بلا کر کھلاتے، ہمیں آپ کے آغوش شفقت میں جو اپنائیت، جو پیار، جو سکون وطمانیت اور جو محبت ملی۔ اس کے سامنے سگے باپ اور بھائی کی محبت کیا چیز ہے؟ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں، جنہوں نے اس چشمۂ صافی سے محبت وشفقت کے جام بھر بھر کر پیئے ہیں وہ اس کی بخوبی تصدیق کریں گے۔

ہمارے سالانہ امتحان میں نحو میر اور شرح مائۃ عامل کا امتحان آپ کے پاس تھا، امتحان انتہائی شفقت سے لیتے تھے۔ چہرے پر رعب اور علمی جلال کے باوجود پرکشش مسکراہٹ اور چمکیلی آنکھوں سے چھلکتی اپنائیت طالب علم کا دل موہ لیتے تھے، امتحان کا طریقہ کار ایسا تھا کہ ایک جگہ پر زور دینے کی بجائے کتاب کی جملہ جہات کا سرسری استفسار فرماتے، جس سے طالب علم کی استعداد کا اندازہ ہونے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا کہ کتاب کی فہم کس درجہ کی ہے۔ الحمدللہ! ثانیہ کے سال حضرت سے ہدایۃ النحو، الدروس النحویہ اور شذور الذہب پڑھی، اہل علم واقف ہیں کہ حضرت الاستاذ نحو کے امام تھے، جب کسی استاذ کی فنی مہارت مسلّم ہو اور کسی خاص کی بجائے فن کی جملہ جہات اور اصول وفروع پر اس کی نظر ہو تو ایسے استاذ کا کتابی درس، جامع، سہل اور گہرا ہوتا ہے۔ استاذ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے اسی درسی خصوصیت سے خوب نوازا تھا۔ یہ نہیں کہ آپ کو فن کی کوئی خاص کتاب ازبر ہو اور محض کتاب ہی پر نظر ہو بلکہ آپ کو اس فن سے پوری مناسبت ہوتی اور علی وجہ البصیرۃ پڑھاتے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ نحو کے قواعد کی عمدہ سے عمدہ ترین تعبیرات ہمیں سننے کو ملتیں اور فن کی بعض نادر باتیں علم میں آتیں۔ استاذ گرامی کی عادت یہ تھی کہ پہلے نیا سبق پڑھاتے تھے اور اس کے بعد کل گزشتہ کا سبق سنتے۔ یہ اس عمومی طرز کے خلاف تھا جو ہمارے ہاں مدارس میں رائج

ہے، نہ معلوم اس کی کیا حکمت تھی؟ لیکن اتنا اندازہ ہوتا کہ اس میں وقت کی کافی بچت ہوتی ہے۔ دوران درس اگر طالب علم سے کوئی کوتاہی ہوتی، یا سبق اچھی طرح یاد نہ ہوتا تو تنبیہ ضرور فرماتے لیکن زیادہ زجر وملامت والا طرز نہ ہوتا، خصوصاً ایسے الفاظ وتعبیرات میں قطعاً سرزنش نہیں فرماتے جس سے طالب علم کی عزت نفس مجروح ہو، یا اس کا دل ٹوٹے یا آپ کی بڑائی اس پر ظاہر ہو۔ انتہائی وقار اور شفقت کا انداز تھا۔ طالبعلم کو تنبیہ بھی ہو جاتی اور یہ تنبیہ اس میں مزید حوصلہ اور کام کا جذبہ بھی بڑھاتی۔ ایسا سراپا اعتدال رویہ اب طلبہ کرام کے ساتھ دیکھنے میں کم ہی آتا ہے۔ اس لئے استاذ وطالب علم کا وہ مثالی تعلق بھی نہیں بن پاتا جو ہمارے اکابر اور ان کے سعادت مند تلامذہ کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ حضرت الاستاذ کی نظامت بھی مثالی تھی طلبہ کی ہر حوالے سے کڑی نگرانی فرماتے۔ اگر میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس ذمہ داری کے باعث اور اپنے مطالعہ وعبادت کی وجہ سے آپ کے رات کا آرام مکمل ختم ہو چکا تھا اور رات بھر جاگتے رہتے۔ طلبہ پر شفقت کے باوجود اس قدر رعب تھا کہ جس دن مطعم میں کھانے پر آپ کی نگرانی ہوتی ہم آدھا کھانا بھی آپ سے شرم اور ہیبت کے مارے نہ کھانے پاتے اور طلبہ کے سامنے اس دن کھانا بچ جاتا۔ یہ میرا کئی بار کا مشاہدہ ہے۔

شاہو وام میں پہلی حاضری:

ہمارے ثانیہ والے سال ۱۹۷۸ء میں بندہ، مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور مولانا فیصل تنگی (افریقہ) سالانہ چھٹیوں میں حضرت الاستاذ کی زیارت وملاقات کے لئے آپ کے گاؤں "وام" حاضر ہوئے۔ اس وقت سفر کافی مشکل تھا، ہنگو شہر تک کوہاٹ سے سنگل سڑک تھی اور پھر ہنگو سے "وام" تک قریباً دس کلومیٹر کا کچہ راستہ تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور میرا سینہ سخت خراب تھا جس کی وجہ سے بخار بھی ہوتا تھا اور روزہ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ حضرت الاستاذ ہماری آمد پر بڑے خوش ہوئے، ہمارا خوب اکرام کیا، جس دن ہم واپسی کر رہے تھے، تو میں نے دیکھا کہ استاذ صاحب نے ایک تھیلے میں کیلے، سیب اور کچھ پھل اٹھائے ہوئے ہیں۔ آپ کی عادت تھی کہ مہمانوں کو چھوڑنے کے لئے دور تک ساتھ جاتے تھے، اس فقیر کے ساتھ بچپن سے یہ معاملہ رہا، حتیٰ کہ بعض اوقات ہنگو سے آگے کوہاٹ تک بعض اوقات پشاور تک چھوڑنے چلے آتے، ہم لاکھ منتیں کرتے لیکن آپ نہ مانتے، بلکہ ایسا انداز اختیار فرماتے گویا یہ کوئی احسان ہی نہیں، کبھی پشاور مکتبوں سے کتابیں لانے کا بہانہ فرما کر ساتھ چل دیتے کبھی کسی اور کام کا۔ لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں فرمایا۔ الغرض ہم تینوں ساتھیوں کو ہنگو شہر لے جانے کی بجائے "وام" سے جنوب کی طرف جو جنگل کے اندر اور پہاڑی کے اوپر سے ایک راستہ گزرتا ہے اور کوہاٹ کی طرف جانے والی مرکزی شاہراہ تک نکلتا

ہے، سے لے جانے کا فیصلہ فرمایا۔ ہم استاذ صاحب کے ساتھ پیدل اس راستے سے روانہ ہوئے یہ قریباً دو گھنٹے کا پیدل راستہ ہے آپ نے ایک مقام پر ہمیں ستانے کے لئے فرمایا۔ پھر مجھے بلا کر وہ پھل دیئے کہ آپ کا روزہ نہیں ہے اور بیمار بھی ہے، یہ تیرے لئے ساتھ اٹھائے تھے، یہاں سے ایک طرف ہٹ کر کھالیں۔ اللہ اکبر! مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ ''وام'' سے یہ تھیلی آپ نے میری خاطر اٹھائی تھی۔ اور آپ کو میری اس درجہ فکر تھی۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں حضرت الاستاذ جامعہ سے واپس اپنے علاقہ تشریف لائے اور اپنی مسجد میں 'مدرسہ یوسفیہ' کی بنیاد رکھی۔ بحمد اللہ! حضرت الاستاذ سے جس عقیدت ومحبت والے تعلق کی بنیاد پڑی تھی۔ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، ہم سالانہ چھٹیوں میں ضرور استاذ صاحب کے ہاں حاضری دیتے اور حضرت الاستاذ بھی ویسے ہی محبت وشفقت کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھے۔ ذیل میں بندہ حضرت کے چند اوصاف کا اجمالی تذکرہ پیش کرتا ہے:

مروت:

حضرت الاستاذ کی مروت انتہائی مثالی تھی، بعض اوقات آپ کی مروت سے ہم شرمسار سے ہو جاتے۔ جیسے ابھی ذکر کیا کہ ہمیں ہر حاضری سے واپسی پر شہر کے باہر تک چھوڑنے کا معمول تھا، اسی طرح اگر مجلس میں کوئی ایک آدمی بھی دوسری زبان بولنے والا ہوتا تو آپ قطعاً پشتو میں بات نہ کرتے بلکہ وہ زبان بولتے جو سب کو سمجھ میں آئے۔ غرض آپ کا اپنے اکابر، احباب، اصاغر غرض ہر طرح کے متعلقین کے ساتھ خوب مروت والا معاملہ ہوتا۔ اگر کسی کے لئے سخت سے سخت تکلیف کو بھی برداشت کرنا پڑتا، تو بعد میں اس کے سامنے اُف تک نہ کہتے، نہ ہی اس کا کبھی اظہار کرتے کہ آپ کے لئے اتنی مشقت اٹھائی۔ میں نے کہیں ایک دفعہ اظہار کیا کہ چار پائیاں بننے کے لیے ہنگو کا بان انتہائی اعلیٰ ہوتا ہے، اس پر استاذ صاحب نے بان مسلسل ہدیہ کرنے کی ایسی روایت ڈال دی کہ آج بھی گھر کی ساری چار پائیاں ہنگو کے بان کی بنی ہوئی ہے۔

استغنا:

حضرت الاستاذ کا وصف استغنا بھی مثالی تھا، کبھی کسی سے ایک آنہ کی طمع نہیں رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی استغنا کی شان عطا کی کہ روکھی سوکھی کھانے کے باوجود مالداروں اور رئیسوں کے ہدیے قبول نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح مدرسہ کے لئے جب تک خوب اطمینان نہ ہوتا ہر کسی کا چندہ نہ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبائل میں ایسی شان اور وجاہت عطا فرمائی تھی کہ بڑے بڑے مسائل آپ کے اشاروں پر حل ہو جاتے، ایسے معاملات میں عام سماجی اور سیاسی لیڈر اپنے ذاتی مفادات کے لئے جو کچھ کرتے ہیں اور قوم کے نام پر قوم کے اجتماعی اموال سے جس قدر

کھاتے ہیں وہ کسی ذی شعور پر مخفی نہیں، لیکن حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی استغنا بخشی تھی کہ ساری عمر اُن سے مستغنی ہو کر آپ نے ہمیشہ حسبۃً للہ لوگوں کے درمیان صلحیں کیں، حتیٰ کہ حکومت اور قبائل کے مابین ثالثی کا کردار بھی جس میں اسفار اور دیگر لوازمات پر ہزاروں خرچ ہوتے تھے حکومت اور قبائل سے بلا کچھ لیے ادا کیا اور ہمیشہ ایسے اموال سے مستغنی رہے۔ ایسے حضرات جن پر کسی طرح کا احسان کر لیتے اُن سے بوقت احسان مدرسہ کے لئے تعاون بھی نہیں لیتے تھے۔ آپ نے زہد کی زندگی گزاری لیکن ساری عمر اسی استغنا کے شان کے ساتھ گزاری۔

ایک بار بندہ نے ہدیہ میں گھڑی پیش کرنی چاہی، لیکن آپ کے استغنا کی وجہ سے کہنے کی جرأت نہ تھی، میں آہستہ سے ایک طرف جا کر بیٹھا اور موقع پا کر ہاتھ پر خود ہی باندھ لی، اس پر آپ نے قبول فرمالی۔

جود وسخا اور مہمان نوازی:

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے مہمان نوازی کا ابراہیمی وصف عطا فرمایا تھا۔ آپ کے دسترخوان پر عام سے عام مہمان کے لئے بھی کئی لوازمات جمع ہو جاتے، شاہو وام کی دور دراز بستی میں اس قدر اہتمام پر حیرت ہوتی تھی۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جانے والے اہل علم اور طلبہ مہمانوں کی ضرور مالی اعانت کرتے، لیکن اس انداز سے کہ اُنہیں بھی پوری طرح محسوس نہ ہونے دیتے۔ باتوں باتوں میں ہاتھ پکڑ کر گفتگو کی طرف پوری طرح متوجہ کر دیتے اور آہستہ سے ہاتھ میں رقم تھما دیتے۔ ایسا انداز ہوتا جیسے خود بھی اس کا علم نہیں تو پھر اندازہ کریں کہ ارد گرد والوں کو کیسے علم ہوسکتا۔ استاذ صاحب کی عادت تھی کہ مہمانوں کو خود بڑی رغبت سے کھلاتے بعض اوقات لقمے بنا بنا کر منہ میں شفقتاً ڈال دیتے۔ ہم حضرت کے دسترخوان پر اگر ایسی کوئی چیز دیکھتے کہ یہ حضرت رغبت سے کھلائیں گے تو شروع سے ہاتھ کنٹرول رکھتے تاکہ بعد میں جب حضرت الاستاذ اصرار سے کھلانا شروع کریں گے تو کچھ گنجائش ہو۔

ایک دفعہ ہم چند ساتھی سفر میں تھے، ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت الاستاذ صاحب اُسی روڈ پر واپسی سفر میں ہیں جس پر ہمارا سفر جاری تھا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ اے کاش! استاذ صاحبؒ سے ملاقات ہو جائے اور دل میں اُمید بھی بندھی تھی کہ ان شاء اللہ استاذ صاحبؒ کی زیارت وملاقات ضرور نصیب ہوگی۔ ہم ایک جگہ نماز پڑھنے رکے تو دیکھا کہ استاذ صاحب گاڑی میں بیٹھے، روڈ کی دوسری طرف اچانک ہوٹل اور پمپ کی طرف مڑے۔ میں نے جلدی سے ساتھیوں کو بھگایا کہ جائیں کہیں استاذ صاحب لوگ روانہ نہ ہو جائیں، بحمد اللہ وہاں ملاقات ہوئی۔ استاذ صاحب نے چپکے سے مجھے پانچ سو روپے کا نوٹ تھما دیا کہ ساتھیوں کی چائے ہے۔ یہ کوئی واحد عنایت نہ تھی بلکہ یہ معمول تھا، لیکن اس واقعہ کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ اچانک ملاقات اور دوران سفر بھی آپ کا یہ معمول نہ

چھوٹتا۔ سفر میں عادت تھی کہ اگر کھانا کھانے کی نوبت آئے تو خود رقم ادا کرتے یا کسی خاص معتمد نے ادا کر دی تو فبہا۔ ورنہ عام شرکائے سفر کے بارے میں کبھی یہ گوارا نہ فرماتے کہ وہ رقم ادا کریں۔ ایک دفعہ ایک سفر کے دوران ہم اسی طرح کھانا کھانے بیٹھے، میرے ساتھ ایک ساتھی بڑے باثروت تھے، لیکن میں نے انہیں پیشگی آگاہ کر دیا تھا کہ بھئی یہاں رقم دینے کے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ کھانے کے بعد وہ صاحب حسب عادت اُٹھ کر جیب ٹٹولنے لگے۔ ان کی یہ ادا اُستاذ صاحب کو پسند نہ آئی اور فوراً مجھ سے غصہ میں بولے: قاری صاحب! یہ شخص کیا کر رہا ہے؟ میں نے اُسے اشارہ سے خاموش بیٹھنے کو کہا اور بعد میں سرزنش کی کہ بھئی! آپ سے جس چیز کا خطرہ تھا منع کرنے کے باوجود آپ نے وہی کیا، ہمیں ڈانٹ پلوادی۔

شفقت ورأفت:

حضرت الاستاذ صاحب کو اللہ تعالی نے شفقت کا مثالی وصف عطا فرمایا تھا۔ حضرت کی شفقت کے کچھ مظاہر تو شروع میں لکھ چکا ہوں، کچھ واقعات ابھی یاد آرہے ہیں۔ ایک دفعہ بندہ اور برادرم مولانا ابراہیم بھام جی (افریقہ) حضرت الاستاذؒ کی ملاقات کے لئے ہنگو گئے اور قبیل المغرب ہنگو شہر پہنچے۔ انہی دنوں شیعہ سُنی فسادات کے باعث مغرب میں پورے شہر کے اندر کرفیو لگ جاتا اور کسی کو بازار میں گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ گولی مارنے کی سزا مقرر تھی۔ چونکہ ''وام'' جانے کا راستہ بازار سے ہوکر گزرتا تھا، اس لئے مجبوراً ہم وین اڈا سے متصل ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ ہوٹل کیا تھا، بس دُکان میں چائے، کھانے کے تھڑے لگے ہوئے تھے اور کرایہ پر سونے کو چارپائی مل جاتی تھی۔ ہم دونوں نے بیس روپے میں دو چارپائیاں کرایے پر لیں۔ ادھر ہم نے آنے سے قبل استاذ صاحب کو اطلاع بھی کر دی تھی۔ اب جب ہم رات تک نہ پہنچے تو استاذ صاحب سخت بے قرار و بے چین ہوئے، پتہ چلا کہ استاذ صاحب نے وہ رات سخت تکلیف اور اذیت میں گزاری، شہر کے جس جس ہوٹل کا فون نمبر میسر ہو سکتا تھا، اُسے فون کیا کہ ہمارے دو مہمان نہیں پہنچے، آپ کے ہاں قیام تو نہیں؟ لیکن ہمارا حال اُنہیں معلوم نہ ہو سکا۔ صبح جب ہم حاضر ہوئے تو انتظار و بے قراری کے اثرات واضح طور پر چہرہ انور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اللہ اللہ!!! اپنے تلامذہ پر اس درجہ شفقت ورأفت۔

ڈھونڈھ اب اُنہیں چراغ رُخِ زیبا لے کر

اور سب سے بڑھ کر کمال یہ تھا کہ اتنی بے چینی، بے قراری اور تکلیف میں رات کاٹنے کے باوجود ہمیں اُف تک نہ کہا بلکہ پوری بشاشت سے ملے، ورنہ ہم شاگرد اور چھوٹے تھے وہ استاذ تو کہہ سکتے تھے اور اُنہیں کہنے کا حق بھی تھا کہ

آپ کی وجہ سے تکلیف ہوئی۔لیکن اتنا بھی نہیں فرمایا بلکہ ہمیں اس کا شائبہ بھی محسوس نہ ہوا۔آئندہ میں یہ احتیاط کرتا کہ پہلے سے متعین وقت کی اطلاع نہ دیتا کہ مبادا ایسی صورتحال میں حضرت الاستاذ کو کوفت اُٹھانی پڑے۔

ہر شخص کے ساتھ شفقت و رأفت کا ایسا معاملہ فرماتے کہ ہر ایک یہی سمجھتا کہ حضرت کا میرے ساتھ اختصاصی تعلق ہے۔لیکن اس فقیر پر تو شفقت اتنی زیادہ تھی کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔اس شفقت کا ایک بڑا مظہر یہ تھا کہ حضرت مردان اور قرب وجوار کا جب بھی سفر فرماتے،چاہے کوئی کتنا ہی اصرار کرلے،رات کی رہائش اور کھانا میرے ہاں ہوتا۔جب تک مدرسہ قائم نہ ہوا تھا،اُس وقت تک گھر میں بلاتکلف آتے اور مدرسہ کی تعمیر کے بعد مدرسہ میں تشریف لاتے۔مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور ہمارے دیگر ساتھی اکثر خواہش مند رہتے کہ استاذ صاحب اُن کے ہاں رہ لیں لیکن آدھی رات بھی ہوتو سونے کے لئے فقیر کے غریب خانہ کو ہی شرف بخشتے۔یہی معاملہ کھانے کا تھا، بلکہ کھانے کے معاملے میں تو استاذ صاحب حد درجہ حساس تھے،ہر کسی کے ہاں کھانا نہیں کھاتے تھے،لیکن بحمد اللہ اس فقیر پر شفقت تھی اور اعتماد تھا کہ ہمیشہ میزبانی کی سعادت مجھے ہی ملی۔میں اس اعزاز وانعام پر رب تعالیٰ کا جتنا شکر کروں کم ہے۔حضرت الاستاذ صاحب کے اس اعتماد کو اپنے لئے نیک فال سمجھتا ہوں اور اللہ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ بھی ستاری کا معاملہ فرما کر ان اکابر کے سامنے روز قیامت رسوا نہیں فرمائیں گے،اللہ تعالیٰ سے قوی اُمید ہے کہ تا مرگ اکابر کے اعتماد کی لاج رکھنے کی توفیق دیں گے۔ان شاء اللہ

۲۰۰۷ء میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ استاذ صاحب نے احباب کے شدید اصرار اور بعض ناگزیر وجوہات پر رات دوسری جگہ قیام فرمالیا۔جب صبح تشریف آوری ہوئی تو چہرہ پر اُلجھن اور پریشانی کے اثرات تھے اور اس کا اظہار فرمایا کہ قاری صاحب!بڑی غلطی کی کہ رات وہاں گزاری،آپ کے گھر کے بغیر کہیں اور چین ملتا نہیں۔بندہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر احباب سے کہتا ہے کہ الحمدللہ حضرت نے اپنی شفقت اور عنایت سے اس علاقے میں میرے گھر کو وہ حیثیت بخشی ہے جو کراچی میں حضرت مولانا قاری محمد قاسم مدظلہ کے گھر کو ملی تھی اور جو اعتماد اُن پر تھا بحمد اللہ اُسی طرح کا معاملہ بندہ کے ساتھ تھا۔

اسی شفقت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حضرت ہماری حاضری کے وقت اپنے ہاں کے علاوہ کہیں اور رات کے قیام پر راضی نہ ہوتے تھے۔حضرت کی خواہش رہتی تھی کہ ہمارا کھانا اور رہائش اُنہیں کے ہاں ہو۔ایک بار ایسا ہوا کہ بندہ اور مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے حاضری کے وقت پہلے سے منصوبہ بنایا کہ ایک رات مولانا انوار الاسلام مرحوم کے ہاں''ورسمند''میں گزاریں گے۔مولانا ہمارے ہم سبق اور دیرینہ رفیق تھے۔حضرت الاستاذ صاحب سے اس کا اظہار کیا تو آپ نے ازارہ شفقت فرمایا کہ بھئی ادھر ہی رُکیں،لیکن چونکہ ہم نے طے کر رکھا تھا،اس لئے کوئی بہانہ

بنا کر اجازت لے ہی لی۔لیکن اس کی سزا یہ ملی کہ درسمند میں ساری رات میرے دانت میں سخت درد رہا۔نہ کوئی ڈاکٹر نہ کوئی دوائی، رات بھر جاگ کر سخت تکلیف میں گزاری۔استاذ صاحب کے منشا کے خلاف اس اقدام پر توبہ کی اور آئندہ کے لئے پھر احتیاط سے کام لینا شروع کیا۔ایک بار میں حج پر جا رہا تھا استاذ صاحب کو الوداعی فون اس لئے نہیں کیا کہ کہیں کتابیں نہ منگوالیں۔کیونکہ بیرون جانے والے احباب سے آپ رقم دے کر کتابیں منگوایا کرتے تھے جب حج کی مبارکبادی کیلئے آپ تشریف لائے، تو انتہائی شفقت اور محبت والے لہجے میں ارشاد فرمایا: قاری صاحب آپ نے اس لئے فون نہیں کیا کہ میں کتابیں منگواؤں گا؟ استاذ صاحب کو غالباً کشف ہو گیا تھا لیکن مجھے تو آپ کے مشفقانہ لہجے نے نہال کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رویے پر بھی سخت افسوس اور ندامت ہو رہی تھی۔

تواضع:

حضرت الاستاذ تواضع کا پیکر تھے۔اپنے ہاتھ سے ذاتی کام، گھر کے کام بلکہ اپنے دوستوں اور اپنے سے چھوٹوں کے کام سرانجام دینا ان کے ہاں معمولی بات تھی، بندہ نے ایک دفعہ حضرت الاستاذؒ اور مفتی رضاء الحق صاحب کے ساتھ کربوغہ شریف مفتی مختار الدین صاحب کے ہاں حاضری کی سعادت حاصل کی۔مفتی رضاء الحق صاحب استاذ صاحب سے عمر میں چھوٹے تھے اور ہم عصر بھی تھے۔حضرت الاستاذؒ ان کے سامنے جس طرح متواضعانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور جس ادب واحترام کا مظاہرہ فرما رہے تھے اس میں ہم اصاغر کے لئے تواضع کا بہت بڑا سبق تھا جب کہ مفتی صاحب کی طرف سے بھی احترام واکرام کا یہی رویہ تھا۔اپنے اکابر کی صحبت میں تو حضرت الاستاذ ایسے متواضعانہ تشریف فرما ہوتے کہ ان پر مبتدی طالب علم کا گمان ہوتا، جب بھی استاذ صاحب کی معیت میں ہماری حاضری حضرت صندل باباجیؒ یا دیگر بزرگوں کی خدمت میں ہوئی، ہم نے استاذ صاحب کے تواضع کے نئے نئے شاہکار ملاحظہ کیے۔آپ کی تواضع کا حال یہ تھا کہ جب ہمارے مدرسہ تشریف لاتے تو مہمان خانے میں سامنے کی مرکزی نشست پر بیٹھنے کی بجائے عام اساتذہ وخادمین کی جانب بیٹھ جاتے۔استاذ صاحب کے ساتھ طویل مصاحبت میں کبھی کوئی عجب یا خودنمائی کا جملہ سنا یاد نہیں، حتی کہ ہم انتہائی قریب احباب میں سے تھے لیکن ساری زندگی ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ ان کی وفاق کی سطح پر دورۂ حدیث شریف میں پہلی پوزیشن آئی، بلکہ میں نے جامعہ بنوری ٹاؤن میں اساتذہ کے تقرری کے رجسٹر میں حضرت بنوریؒ کے قلم سے لکھی ہوئی یہ بات خود پڑھی۔

اسی طرح اپنے تلامذہ کے لئے کبھی 'شاگرد' کا لفظ استعمال نہیں فرماتے تھے، بلکہ ہمیشہ تلامذہ کا تذکرہ ''زموننگ ملگری'' (یعنی ہمارے ساتھی) کے الفاظ سے کرتے تھے۔

خودنمائی کے مظاہر سے بچنے میں اس درجہ احتیاط رکھی کہ کبھی تقریر نہیں فرماتے تھے۔ خصوصاً بڑے مجمعوں میں تو چھپ کر ایک طرف بیٹھ جاتے تھے، اسی طرح امامت سے بھی اپنے آپ کو بچاتے تھے، آپ کو پرٹوکول اور کروفر سے طبعاً وحشت تھی۔ ۱۹۹۸ء میں جب آپ اور آپ کے استاذ مولانا عبداللہ صاحب گرفتار ہوئے اور قبائل نے حکومت کو الٹی میٹم دے کر رہا کروایا تو اورکزئی ایجنسی میں بہت بڑا استقبالی جلسہ منعقد ہوا جس میں لاکھوں قبائلی عوام ان دونوں اکابر کی زیارت کے لئے جمع تھے، بندہ اور مفتی کفایت اللہ صاحب بھی استاذ صاحب کے ہمراہ تھے۔ آپ نے قبائل کے حدود سے قبل اپنے ساتھیوں کو روک کر قبائلی سرداروں کو یہ پیغام بھیجا کہ ہماری آمد پر فخر ومباہات کا مظاہرہ، خصوصاً فائرنگ بالکل نہیں کرنی۔ وہاں رواج ہے کہ معزز مہمانوں کی آمد پر اعزاز میں خوب فائرنگ کی جاتی ہے۔ جب قبائل کے سردار اس پر آمادہ ہوئے تو تب جا کر آپ نے گاڑیوں کو آگے جانے کی اجازت دی۔ قبائلی عوام کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ ہمارے دوست مفتی کفایت اللہ صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ کاش استقبالی فائرنگ ہو، تاکہ یہ نظارہ بھی دیکھ لیں لیکن استاذ صاحب کے منع کرنے پر عمومی فائرنگ نہ ہوئی۔ ہاں کہیں کہیں سے لوگوں نے ضرور کوئی ایک آدھ برسٹ فائر کیا۔ ان شیخین کے استقبال کے لئے کئی کلومیٹر لوگوں کی لمبی قطار تھی جو سٹیج پہنچی تھی، بندہ نے دیکھا کہ استاذ صاحب سٹیج پر پہنچ کر ایک کونے کی طرف پیچھے کو آگئے اور چپکے سے بیٹھ گئے۔ ہم جیسے لوگ ہوتے تو نجانے اتنے بڑے استقبال میں خودنمائی کی کیا کیا حرکتیں سرزد ہوتیں اور سٹیج پر کیا کیا شیخیاں بھگارتے۔

ایک دفعہ میں نے حضرت الاستاذ سے بیعت کی درخواست کی، اس پر آپ برہم ہوئے اور اپنے بارے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ مجھے درخواست پر شرم آئی اور فرمایا کہ آپ مولانا اکرم جنگی خیلؒ سے بیعت ہوجائیں۔ یہ آپ کی تواضع تھی کہ اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے، ورنہ کئی اکابر نے آپ کو خلافت سے نوازا تھا اور آپ قافلہ صوفیا کے سرخیل تھے۔

بعض اوقات حد درجہ تواضع اور عاجزی وانکساری شخصیت کے اصل مقام کو پہچاننے میں حجاب بن جاتی ہے اور انسان اُن سے کچھ ایسا معاملہ کر گزرتا ہے جو بعد میں بڑی بے ادبی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۸۵ء میں میری شادی پر حضرت الاستاذ باوجود دعوت کے تشریف نہ لائے۔ اگلے ماہ رائیونڈ کے اجتماع پر ہمارا آمنا سامنا ہوا، تو بندہ نے لاڈ میں کچھ زیادہ ہی حد سے گزر کر استاذ صاحب سے ملنا اور سلام لینا تک نہ کیا اور آنکھیں بچا کر دوسری طرف نکل آیا۔ چاہیے تھا کہ میری اس جسارت پر استاذ ناراض ہوتے لیکن اس مشفق اور سراپا تواضع انسان کے کیا کہنے!!! جلدی سے میرے پیچھے آئے اور ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی گلے

لگالیا۔ فرمایا: قاری صاحب! ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا اور آپ ناراض ہو رہے ہیں۔ فرمایا: میرے چچا کا انتقال اُنہی دنوں ہوگیا تھا۔ تعزیت کے لئے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا جس کے باعث میں آپ کی دعوت پر حاضر نہ ہوسکا۔ پھر بڑے مشفقانہ انداز میں فرمایا کہ آپ نے بھی تو پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی کہ تعزیت قدرے کر لیتے۔

مجھے اس وقت آپ کی شفقت وتواضع سے جو شرمساری ہوئی وہ بیان سے باہر ہے کہ یہ میں نے کیا جسارت کردی ہے۔ لیکن آپ کے رویے اور تعلق میں کبھی اس طرح کے باتوں سے رتی بھر فرق محسوس نہیں کیا کیونکہ یہ باتیں تو ان لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہیں جن کو اپنے بڑے پن کا کسی درجے استحضار ہو جب کہ آپ تو اپنے آپ کو پوری طرح فنا کیے ہوئے تھے، آپ کے تواضع کا یہ عالم تھا کہ نثر الازہار جیسے علمی اور تحقیقی کام میں ہم جیسے طلبہ کو بھی معاونت کی سعادت بخشی اور پروف ریڈنگ کی ذمہ داری بندہ نے اٹھائی، یہ میری حیثیت سے بڑھ کر کام تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے قبول فرمایا اور مقدمہ میں اس فقیر کا بھی ذکر کردیا، یقیناً یہ آپ کا بڑا پن تھا ورنہ بندہ اس قابل کہاں تھا۔

حیا:

حضرت استاذ صاحب پر حیا کا ایسا غلبہ تھا کہ اگر مجلس میں مزاح کے طور پر بھی کہیں کوئی بات ذرا غیر محتاط تعبیر سے کہہ دی جاتی تو آپ کا رنگ متغیر ہوجاتا۔ وقار وسنجیدگی کا غلبہ تھا، اسباق میں کبھی اس حوالے سے غیر محتاط لطائف یا گفتگو نہیں سنی۔ اگر کہیں کتابوں میں ایسی تعبیرات یا اشعار آجاتے تو اس پیرائے میں ترجمہ ومفہوم بیان کرتے کہ رومانوی پہلو دب سا جاتا۔ نجی معاملات میں رشتوں کا ذکر خصوصاً خواتین کا ذکر جن الفاظ سے فرماتے اور جن اشاروں کنایوں کی تعبیرات میں مفہوم ادا کرتے، اُس سے آپ کی گفتگو اور طبیعت میں غلبہ حیا کا اندازہ ہوتا۔ بیٹھنے، لیٹنے میں جو انداز ہم نے دیکھا، وہ حیا کا پیکر ہوتا۔ الغرض جن احباب کو حضرت کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ صفت حیا میں کس درجہ کمال پر فائز تھے۔ ان چند اوصاف کا تذکرہ مشتے از نمونہ خروارے کے طور پر کیا، وگرنہ آپ کی ساری زندگی مجموعہ کمالات تھی اور آپ کے کمالات واوصاف کا احاطہ آسان نہیں۔

ذیل میں آپ کی زندگی کے چند ان متفرق گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جن کا یہ فقیر اپنی زندگی پر اثر محسوس کرتا ہے۔

مدرسہ کے اُمور میں رہنمائی:

۱۹۸۷ء میں اللہ تعالیٰ نے مدرسہ احیاء العلوم کی تاسیس کی توفیق دی، جو بحمد اللہ اب موقوف علیہ تک پہنچ گیا ہے

۔اس وقت ایک کچی مسجد تھی، اُستاذ صاحب تشریف لائے تھے، مسجد سے متصل پلاٹ کی بات چل رہی تھی لیکن مالک دینے پر راضی نہ تھے۔حضرت الاستاذؒ نے مسجد کی دیوار (جو کافی نیچی تھی) پر سینہ ڈال کر اُس پلاٹ کو ملاحظہ فرمایا۔ بندہ نے ساری صورت حال عرض کر کے دُعا کی درخواست کی۔استاذ صاحب نے پتہ نہیں کس سوز سے دعا فرمائی، ابھی مدرسہ سے رخصت ہوکر ایک کلومیٹر بھی نہیں چلے ہوں گے کہ پلاٹ کا مالک میرے پاس آیا اور خود ہی معاملات طے فرمالیے، یوں ہمیں مدرسہ کے لئے زمین مل گئی۔یہ زمین ملنا استاذ صاحب کی کھلی کرامت تھی، ورنہ بظاہر اس کے بالکل امکانات نہ تھے۔

حضرت الاستاذؒ نے ہماری مدرسہ کے حوالے سے جو ذہن سازی فرمائی، اُس میں اولین چیز مروجہ چندہ سسٹم سے احتراز تھا۔حضرت الاستاذ نے کبھی چندہ اکٹھا کیا نہ ہی کسی سے اپیل کی۔الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذؒ کی ہدایت کی لاج رکھنے کی توفیق دی اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق کے خواستگار ہیں کہ کبھی مروجہ طرز کے چندے اکٹھے کرنے اور اپیلیں کرنے کی نوبت نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی بندوبست ہوتا رہا۔

ایک دفعہ مدرسہ میں کافی مالی مشکلات پیش آئیں چونکہ چندہ کی اپیل سب سے بھاری اور مشکل کام تھا، اس لئے حضرت الاستاذؒ سے براہ راست تعاون کی اپیل کرنے کے ارادے سے میں ''وام'' جامعہ یوسفیہ حاضر ہوا، ارادہ تھا کہ حضرت کے سامنے ساری مشکلات رکھ کر مالی تعاون کی درخواست کروں گا، لیکن حضرت کی خدمت میں حاضری کے بعد گویا زبان گنگ ہوگئی، بات کہنے کی جرأت ہی نہ تھی، یہ حضرت ہی کا فیض تھا کہ مخلوق کے در پر مشکلات پیش کرنے سے روکا تھا، خود اُنہی کے در پر بھی باوجود عزم وارادہ اور سفر کے جرأت نہ ہو سکی۔ پتہ نہیں حضرت الاستاذ کو اس کا کشف ہوا یا میری پریشانی سے اندازہ ہوا، اسی مجلس میں مجھے چہل قاف کی اجازت عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اسے پڑھیں ان شاء اللہ مدرسہ کی مشکلات دور ہوں گی۔اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا، میں یقین سے عرض کرتا ہوں کہ اس کے بعد کبھی کسی مسئلہ میں پریشانی کا سامنا نہیں کیا، مشکلات ضرور آتی ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ اس طرح حل فرما دیتے ہیں کہ مشکل کا احساس ہی نہیں ہوتا۔یہ حضرت الاستاذؒ کا فیض ہے کہ بجائے مخلوق کے خالق کی طرف متوجہ کیا اور روحانی اسباب سے ان مالی مسائل کو در بار الٰہی سے حل کرانے کی طرف رہنمائی فرمائی۔

دوسری بار جب ہم مدرسہ کی توسیع کرنا چاہ رہے تھے تو استاذ صاحب ہی نے حکم دیا کہ متصل دو کنال کی اراضی توکلاً علی اللہ خرید لیں رقم پاس اتنی تھی نہیں لیکن حضرت کی ہدایت پر سودا کرلیا۔رقم کی ادائیگی کی مدت ایک ماہ مقرر ہوئی، حضرت الاستاذ نے دُعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے پہلے دو ہفتوں میں بندوبست فرمادیا۔

اسی طرح آج کل مدارس میں طرز چل پڑا ہے کہ سالانہ جلسوں اور دستار بندیوں میں ایسے لوگوں کو مدعو کر کے

مدرسہ کی کارکردگی دکھاتے ہیں جو تعاون کرسکیں یا ایسے خطبا بلائے جاتے ہیں جن کی اپیل اور ترغیب میں ذرا وزن ہو اور لوگوں کو چندہ پر آمادہ کرسکیں، حضرت الاستاذؒ اس طرز کے بھی سخت خلاف تھے اور الحمدللہ ہماری ایسی تربیت فرمائی کہ اُس کی برکت سے اس کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔

خطبا پر حضرت کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، حدیث شریف "ان من البیان لسحراً" کی تشریح میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے ابتدائی طالب علمی کے زمانہ میں جب ہم کوہاٹ میں پڑھتے تھے، ایک خطیب صاحب تشریف لائے اور ایسا عجیب بیان فرمایا کہ میں سمجھا یہ بہت بڑے عالم ہوں گے۔ مجھے ہدایۃ النحو میں کچھ اشکالات درپیش تھے جو کسی سے حل نہ ہو رہے تھے، میں نے ارادہ کیا کہ ان خطیب صاحب سے پوچھوں گا، یہ ضرور میری رہنمائی فرمادیں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ انہیں کتاب کی نفس عبارت تک سے مناسبت نہیں چہ جائیکہ فن سے متعلقہ اشکالات سلجھا سکیں۔ فرمایا: اس سے پتہ چلا کہ یہ خطبا جو اچھی اچھی تقریریں کرتے ہیں اس کے لئے مضبوط اور راسخ علم لازم نہیں

-

حضرت الاستاذ مدارس میں تعلیمی فضا کے علاوہ کسی طرح کے مشاغل گوارا نہیں فرماتے تھے۔ خصوصا سیاست کا مدارس میں داخلہ آپ کو سخت ناگوار گزرتا تھا اور سیاسی مشاغل کو طلبہ کے لئے زہر قاتل بتلایا کرتے تھے۔ بحمداللہ حضرت الاستاذ کی ہدایت پر مدارس کو کسی دوسرے شعبے کا کبھی تابع نہیں کیا بلکہ ایک مستقل شعبے کی صورت میں چلایا۔ خصوصاً سیاسی سرگرمیوں میں کبھی ملوث ہونے نہیں دیا۔

یہ بھی تمام احباب کو معلوم ہے کہ حضرت الاستاذ وفاق المدارس کے مروجہ نظام سے مطمئن نہ تھے اور آپ نے اپنے مدرسہ یوسفیہ کا نظام و نصاب جدا تجویز فرمایا اور خود اسی پر عمل پیرا تھے لیکن اپنے احباب پہ کبھی اپنا ذوق و مزاج اور اپنی رائے مسلط نہیں فرمائی۔ اگر آپ کی ترجیح کسی ایک طرف ہوتی تو اس کا اظہار ضرور کرتے لیکن یہ قطعاً نہ تھا کہ اپنے احباب کو بھی بزور اُسی طرف راغب کریں اس لئے ہمارے مدرسہ کی تاسیس سے لے کر تا وقت آخر ہم آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں چلتے رہے لیکن ہم پر کبھی یہ اصرار نہیں کیا کہ آپ بھی وفاق سے الحاق ختم کردیں اور ہمارا نصاب شروع کرلیں۔

اس میں آج کل کے علمی حلقوں کے لئے بڑی رہنمائی ہے، جن لوگوں کو اللہ نے پیشوائی کا منصب اور حلقہ بخشا ہو، ان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنی آرا (جن میں اختلاف رائے ممکن ہو) میں وسعت کا مظاہرہ کریں اور اپنا مزاج اور ذوق لازمی طور پر کسی پر نہ ٹھونسیں۔ عموماً جو ہمارے معاشرے میں بے اعتدالی اور علمی حلقوں میں باہمی بعد کے اندر روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو اس میں اس صورت حال کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ الحمدللہ حضرت

الاستاذ کے اس مثالی وسیع النظر فی سے ہم نے یہ سبق سیکھا ہے کہ اہل علم باہمی طور پر ایک دوسرے کے ذوق ومزاج اور رائے کا احترام کریں اور کسی بھی حوالے سے طعن وتشنیع یا تنقید سے گریز کریں۔

اختلاف رائے پر ایک دو واقعات اور یاد آ گئے۔ حضرت الاستاذ ہمارے ہاں جب بھی تشریف لاتے تو تازہ علمی اور سماجی ایشوز پر ضرور گفتگو فرماتے اور قیمتی ارشادات سے نوازتے۔ اہل علم میں بنکاری کے مسئلے پر ۲۰۰۸ء میں تفصیلی اختلاف چلا۔ اُس میں ہماری رائے بنوری ٹاؤن اور جامعہ فاروقیہ سے جاری ہونے والے فتویٰ کے مطابق تھی اور اس کو اب بھی درست سمجھتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذ کی رائے مفتی تقی عثمانی مدظلہم کے موافق تھی اور حضرت الاستاذؒ اس موافقت کا کھلے عام اظہار بھی فرماتے تھے، جب اس مسئلے پر تبادلہ خیال شروع ہوا تو بندہ نے کھل کر مفتی صاحب مدظلہم کی رائے کی مخالفت کی اور حضرت الاستاذ سے ایک طرح اس مسئلے پر بحث شروع ہوگئی اور کافی طویل بحث ہوئی آپ نے ہماری بات بھی سنی اور اپنی بات بھی ارشاد فرمائی۔ لیکن یہ قطعاً نہیں کیا کہ استاذ ہونے کے ناطے دباؤ ڈالنے کا طرز اختیار کیا ہو، یا ڈانٹ کر خاموش کروایا ہو۔ اس سے علمی مسائل میں آپ کے ذوق ومزاج اور اپنے اصاغر سے اختلاف کا طریقہ سمجھ آتا ہے جو شخص اپنے اصاغر سے یہ رویہ رکھے، اُس کا اپنے اکابر کے متعلق کیا رویہ ہوگا۔

ایک بار مولانا اکرم اعوان کے حوالے سے بھی کافی لمبی بحث ہوئی، مولانا کے تفصیلی حالات اُس وقت اُستاذ صاحب کے سامنے نہیں آئے تھے۔ عزیز مولانا یوسف مدظلہ کے مطابق حضرت الاستاذ کے ایک دیرینہ رفیق مولانا نور سید شاہ صاحب مولانا اکرم اعوان سے بیعت تھے اور استاذ صاحب کو ان کے تقویٰ وصلاح پر اعتماد بھی تھا، اکرم اعوان صاحب کے حوالے سے استاذ صاحب کی جملہ معلومات کا ذریعہ وہی تھے۔ ابتدا میں چونکہ استاذ صاحب کو اُن سے توقعات وابستہ تھیں اس لئے میرے ساتھ اختلاف فرمایا لیکن بندہ نے اُن کے خلاف شرع اُمور مثلاً تصویر سازی وغیرہ کے بارے میں اپنا مشاہدہ ذکر کیا اور حضرت الاستاذ کے موقف سے اتفاق نہیں کیا۔ بعد کے حالات میں مولانا یوسف صاحب کے مطابق اکرم اعوان صاحب کے حوالے سے استاذ صاحب کی رائے بھی بدل گئی تھی۔

ان واقعات کو پیش کرنے کا مقصد محض اتنا ہے کہ استاذ صاحب کے مزاج میں ایسی خشکی اور درشتی ہرگز نہ تھی کہ اپنے احباب کی آرا کا اختلاف بھی برداشت نہ کرسکیں، بلکہ بڑی بشاشت سے سنتے اور گوارا فرماتے۔ ہاں! جن کے بارے میں یقین ہوتا کہ ان کی استعداد ہی اتنی نہیں کہ اپنی الگ سے ہانکتے رہیں تو اُن کے ساتھ معاملہ جدا ہوتا۔

تحریکی اُمور میں رہنمائی:

ہماری مستقل مشغولیت تو کار تعلیم کی ہے، تاہم جہاں علاقے کی سطح پر کسی تحریک کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی توفیق بخشی ،لیکن اس میں بھی حضرت الاستاذ کی رہنمائی، مشورہ اور ہدایات شامل رہتیں۔

پہلی تحریک بے نظیر کے دور حکومت میں اس وقت ہم نے شروع کی جب حکومت نے ایک برلب سڑک مسجد کو گرانے کا حکم نامہ جاری کیا۔ اس پر ہم نے سٹینڈ لیا، بے نظیر اور شیر پاؤ سمیت پانچ افراد کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ الحمدللہ یہ تحریک کامیاب رہی اور حکومت کو حکم نامہ واپس لینا پڑا۔ استاذ صاحب کی اس حوالے سے واضح ہدایات یہ تھیں کہ اگر حکومت ہر حال میں مسجد گرانے کا ارادہ کر چکی ہے تو راستہ کی توسیع کے لئے اس کی گنجائش ہونے کے باعث ہرگز تصادم کی راہ اختیار نہ کریں۔ فرمایا: ان اُمور میں بہت زیادہ تشدد سے کام نہیں لیا کرتے ،جن میں شرعاً گنجائش موجود ہو۔ حضرت کی فکر یہ ہوتی کہ ساتھی کہیں ضائع نہ ہوں۔

دوسری تحریک ہم نے مردان کے دین دار انجمن کے خلاف چلائی۔ "دین دار با سوے شر" مرزا بشیر کا شاگرد اور ملحد انسان تھا۔ اس کی اولاد اسلام کے نائٹل سے مردان میں سرگرم تھی۔ الحمدللہ ہماری تحریک کامیاب رہی، ان کے لٹریچر پر پابندی عائد ہوئی اور مردان کی حد تک ان کا ناطقہ بند کر کے رکھا گیا۔ اس تحریک میں بڑے مشکل مراحل پیش آئے ،ایک اعلیٰ سطحی حکومتی آفیسروں کے اجلاس میں جب فریقین سے بات چیت جاری تھی۔ تو کمشنر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ اگر آپ لوگ باز نہیں آتے تو ایک فریق کو چترال اور دوسرے کو ڈیرہ اسماعیل خان جیل بھیج دوں گا۔ سب خود ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اس پر بندہ نے کمشنر کو للکار کر کہا کہ میں یہ سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکلا ہوں، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ گستاخ یہاں دندناتے پھریں گے اور میں آپ کی جیل کی دھمکی سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ آپ میرا سر کاٹ دیں تب بھی میں ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، آپ جو کر سکتے ہیں کر لیں۔ اس پر سارے آفیسروں کو سانپ سونگھ گیا اور بحمداللہ ان کے لہجے اور رویے میں منٹوں کے اندر تبدیلی آ گئی۔ ان میں سے ایک آفیسر سلطان حنیف اورکزئی حضرت استاذ صاحب کے ہم علاقہ وہم قوم تھے۔ بعد میں اُنہوں نے حضرت الاستاذ سے بندہ کی شکایت کی کہ یہ بہت متشدد ہے، مردان میں سارا کھیل اسی نے گرم کر رکھا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ یہ حضرت الاستاذ اور ہمارے دیگر اکابر کے اعتماد اور دعاؤں کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان فتنوں کی سرکوبی کی توفیق بخشی اور اپنی بساط کی حد تک اس میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔

اتحاد اُمت کی کوشش:

حضرت الاستاذ کی کوشش تھی کہ اپنی جماعت دیوبند کے سارے دھڑے اور شعبے ایک امیر پر متفق ہو جائیں اور سب اپنے میدان میں ایک امیر کے تحت کام کریں۔ آپ نے علما پر اس حوالے سے کافی زور دیا بلکہ ہمارے صوبے کی حد تک تو سارے صوبے کا دورہ فرمایا اور دارالعلوم سرحد میں علما کا ایک اجلاس بھی طلب کیا لیکن اس پر کافی مایوس تھے کہ حضرات اہل علم کی طرف سے آپ کی اس کوشش کو سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

وطن خداداد میں اسلامی نظام کے لئے سیاسی جدوجہد کرنے والی جماعتوں سے آپ کا بار ہا یہ مطالبہ رہا کہ وہ معاشرتی سطح پر اسلامی نظام کی جس قدر راہ ہموار ہو سکتی ہے، پہلے اس کی فکر کریں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی یہ کوشش ریاستی سطح پر نظام اسلام کے نفاذ میں ممد ومعاون بنے گی۔ اس سلسلے میں آپ کی دیرینہ تمنا تھی کہ قضا سے واقف علما کی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو دیوانی اور عام فوجداری مقدمات میں لوگوں کے شرعی فیصلے کروائیں جن لوگوں کو چاہت ہو کہ ان کے مسائل شرعی طریقے سے حل ہوں وہ جلد اور مفت انصاف کے حصول کے لئے ان کمیٹیوں سے رجوع کریں گے۔ اس سے شرعی فیصلوں کی برکات بھی معاشرے میں ظاہر ہوں گی۔ عدالتوں کا بوجھ بھی کم ہوگا، لوگوں کو کچہریوں میں بے جا مالی اخراجات اور رشوتیں دینے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی اور دینی جماعتوں کا ایک اچھا کردار بھی معاشرے میں سامنے آئے گا لیکن آپ کے اس فارمولے پر بھی سیاسی جماعتیں عمل پیرا نہ ہو سکیں۔

اہل علم کی نظر میں:

میں نے تمام اکابر اہل علم کو آپ کا ہر حوالے سے قدردان پایا، ایک دفعہ شیخ بشار عواد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن تشریف لائے تھے، غالباً ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہم کا دور اہتمام تھا۔ اتفاق سے حضرت الاستاذ بھی کراچی تشریف لائے تھے، اہل علم کی قیمتی مجلسیں جاری تھیں، شیخ بشار کی ملاقات جب حضرت الاستاذ سے ہوئی اور انہوں نے علم حدیث میں آپ کی وسعت وگہرائی اور فن رجال پر گہری نظر کا مشاہدہ کیا، تو پھر تو گویا آپ سے چمٹ ہی گئے، جدا ہونے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ فرماتے کہ مجھے ابھی "محدث" ملا ہے۔ شیخ کی اس درجہ عقیدت سے ہم طلبہ پر واضح ہوتا کہ اہل فن کے ہاں حضرت الاستاذ کا مقام کس درجہ کا ہے، شیخ بشار نے آخر میں اپنے بیٹے کے لئے اجازت حدیث کی درخواست بھی کی جسے آپ نے قبول فرما کر انہیں اجازت حدیث سے نوازا۔

اساتذہ کا احترام:

حضرت الاستاذ کی اپنے اساتذہ سے گہری عقیدت تھی، ایسے احترام کا معاملہ فرماتے کہ بندہ رشک کرتا رہ جاتا۔ ایک بار ایک بہت بڑے عالم' جو کہ حیات تھے' کے بارے میں ہم نے بعض ساتھیوں کا مقولہ سنایا کہ ان کا کہنا ہے

کہ یہ صاحب مفتی ولی حسن ٹونکیؒ سے بڑے عالم ہیں، اس پر تخت جلال میں آئے اور فرمایا: قاری صاحب! مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کے بارے میں ایسی بات کہنا اور ان کے علم کا آج کے کسی عالم سے تقابل کرنا سورج کو انگلی سے چھپانے کے مترادف ہے۔کیا سورج کی تابانی انگلی سے چھپ سکتی ہے؟

جب مفتی ولی درویشؒ کا انتقال ہوا تو جامعہ بنوری ٹاؤن کے اکابر اساتذہ اور حضرت الاستاذ بندہ ہی کے مدرسے میں قیام پذیر تھے۔ حضرت الاستاذ کو میں نے دیکھا کہ جب تمام حضرات سو گئے تو یہ آرام سے اٹھے، اس انداز سے کہ کوئی جاگ نہ جائے، بہت ہی آرام سے دروازہ کھولا اور ایک طرف کونے میں کمرے کے اندر گئے، پھر تھوڑی دیر بعد باہر نکل کر وضو کیا اور ایک ستون کے پیچھے تہجد کی نیت باندھ لی اور سحر تک تہجد میں مشغول رہے۔آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ ایسے اجتماع میں فجر سے قبل پھر جا کر بستر پر لیٹ جاتے تاکہ جب سب لوگ اٹھیں تو آپ بھی ساتھ اٹھیں اور کسی کو اندازہ ہی نہ ہو کہ یہ ساری رات جاگ کر عبادت کرتے رہے۔ اللہ اکبر! اخفاء للّٰہیت، خلوص کی ایسی مثالیں اب ڈھونڈھ کر لائیں بھی تو کہاں سے لائیں؟

ایک دلچسپ مباحثہ:

ایک بار بندہ حضرت الاستاذ کے ہاں جامعہ یوسفیہ حاضر ہوا۔ حضرت نے جن پیالیوں میں چائے ڈالی، ان میں سے ایک پیالے کا کنارا قدرے ٹوٹا ہوا تھا۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! ابوداؤد کی روایت کے مطابق ایسے برتن کو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ جب چائے ختم ہوئی تو حضرت مجھے لے کر کتب خانہ تشریف لائے اور پونے دو گھنٹے اس حدیث کی تحقیق کرتے رہے۔تقریباً تمام حضرات نے ممانعت کی علت ہونٹ کے زخمی ہونے کا خطرہ اور معدے کا نقصان لکھی تھی۔ تاہم حضرت مدنیؒ کے افادات میں یہ بات ملی کہ اس حدیث کی سند میں 'عبدالرحمن' نامی راوی ضعیف ہے۔ حضرت الاستاذ نے اس پر فرمایا: قاری صاحب! یہ لازمی حکم نہیں، ہمارے یہاں کے یہ غریب لوگ ہیں، ان کی پیالیاں عموماً کناروں سے ٹوٹ جاتی ہیں، اگر ان کو ایسے ہی پیالیاں پھینکنے کا حکم دیتے رہیں تو ان کے لئے حرج ہوگا۔ الغرض میں نے جس شد ومد سے اشکال کیا تھا، اس کا حل پیش فرما کر اعتدال برتنے کی طرف رہنمائی فرمائی۔

حضرت الاستاذ کی زندگی کی ایک ایک ادا ناقابل فراموش ہے، جب ساتھی باہم بیٹھتے ہیں اور گفتگو شروع ہوتی ہے تو کئی باتیں تازہ ہو جاتی ہیں اور بہت سے بھولی بسری چیزیں بھی یاد آجاتی ہیں، فی الوقت جو جو بات ذہن میں آتی گئی پیش کر دی اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے نافع بنائے۔

جس دن حضرت کی شہادت ہوئی، اس دن صبح سے طبیعت میں کچھ اضمحلال تھا، میں مدرسہ کی مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، پہلی سیڑھی پر یہ وسوسہ آیا کہ اکابر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اب اپنا تو ایک ہی سہارا حضرت الاستاذ باقی ہے۔ حالات ناساز ہیں، اللہ خیر فرمائے اور آپ کی حفاظت کرے۔ انہی وسوسوں سے ابھی ذہن نے خلاصی نہ پائی تھی اور صرف دو ہی سیڑھیاں اور چڑھی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا فون تھا۔ اٹھایا تو یہ دل خراش خبر سنا دی کہ حضرت الاستاذ شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ذہن نے کچھ لمحے تو کام چھوڑ دیا اور ہوش وحواس معطل ہونے لگے۔ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ حضرت الاستاذ ہمیں یوں چھوڑ کر اچانک رخصت ہو جائیں گے، کبھی سوچا بھی نہ تھا، دل بے قرار، آنکھیں بے قابو اور سوچ ماؤف تھی۔ فوراً جنازے پر جانے کی تیاری شروع کر دی، لیکن چونکہ استاذ صاحب کی وصیت تھی کہ اعلان کیے بغیر قبر تیار ہوتے ہی فوراً جنازہ پڑھا دینا ہے اس لئے باوجود کوشش کے درہ آدم خیل کے قریب ایک گھنٹہ فوجی آپریشن کے باعث تاخیر ہو جانے کی وجہ سے جنازہ پر نہ پہنچ سکے اور حاضری اپنے محبوب کی قبر پر ہوئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ علم وعمل کا آفتاب اور میرا روحانی باپ اب منوں مٹی تلے آسودۂ خاک ہے۔ اپنی کیفیت ان اشعار میں بیان کردہ کیفیت کی مانند تھی جو شورش کاشمیری نے کسی ایسے ہی دردناک اور ناقابل یقین جدائی پر کہے تھے اور میرے غمگین دل کے شاید یہی ترجمان بن سکتے تھے۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
تیری جدائی میں مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے زبان سے زورِ بیان گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے، امید کیا؟ کارواں گیا ہے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے
یہ کون اٹھا کہ دیر تک، کعبہ شکستہ دل خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم خواص پہنچے عوام پہنچے
تیری لحد پر خدا کی رحمت تیری لحد پر سلام پہنچے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے

ایک عبقری انسان

مولانا فضل محمد یوسف زئی، کراچی

دنیا کے اندر وہی قومیں زندہ رہتی ہیں اور فلاح وکامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں جو اپنے بڑوں کی زندگیوں سے سبق حاصل کر کے اُن کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو آنے والی نسلوں کے لئے زندہ رکھتے ہیں۔ الحمد للہ برصغیر پاک وہند کی علمی روایت ہے کہ ہمارے اکابر کے تذکروں کو مرتب کر کے تاریخ کا حصہ بنایا جاتا ہے اور علمی وعملی فتنوں کے خلاف اُن کے جہاد اور جدوجہد کو آئندہ نسلوں کے سامنے مشعل راہ بنا کر رکھا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل سہ ماہی المظاہر کوہاٹ کی انتظامیہ کا ایک خط موصول ہوا کہ وہ علامہ محقق محمد امین شہیدؒ کے احوال پر مشتمل کسی خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں، اور انہیں اس کے لئے مضمون درکار ہے۔ بندہ حضرت مولانا محمد امین صاحب شہیدؒ کی جامع شخصیت پر کچھ لکھنے کی پوزیشن میں اپنے آپ کو نہیں پاتا، تاہم حضرتؒ سے متعلق اپنی چند یادیں لکھ دیتا ہوں۔ قارئین کرام! انہیں مضمون کے طور پر قبول فرمالیں۔

پہلی ملاقات:

میں جب ۱۹۷۷ء میں دورۂ حدیث کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی آیا تو اُس وقت حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ جامعہ کے کل اختیارات رکھنے والے ناظم تھے۔ آپ کا دور انتظام تعلیمی، تربیتی اور انتظامی حوالے سے جامعہ کا ایک عمدہ اور ممتاز دور سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں آپ دارالتصنیف میں تصنیفی اُمور پر متعین تھے۔ اور تحتانی درجات میں تدریس کی ذمہ داری بھی سپرد تھی۔ اس زمانے میں میری آپ کے ساتھ چند ملاقاتیں ہوئیں، لیکن چونکہ ہمارا دورۂ حدیث کا سال تھا، اور مصروفیت بہت زیادہ تھی، اس لئے تفصیل سے ملنے یا استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

حضرت بنوریؒ کی مجلس میں:

اس زمانے میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی نیوٹاؤن کی مسجد کے پیچھے پارک میں مجلس ہوا کرتی تھی۔ مجھے بھی کبھی کبھار عصر کے بعد ان مجالس میں حاضری کی توفیق ہوتی تھی۔ ان مجالس میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ شریک ہوتے تھے اور حضرت بنوریؒ کے علمی وروحانی افادات وفیوضات سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ ان مجالس میں حضرت بنوریؒ کے ساتھ مولانا محمد امین شہیدؒ کا جو تعلق، قرب اور وابستگی مشاہدہ میں آئی تو اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ حضرت بنوریؒ کے بہت ہی قریبی اور خاص رفقا میں سے ہیں۔ ان مجالس میں حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہوتے تھے۔

پھر اس سال ہمارا دورۂ حدیث شریف مکمل ہوا اور میں جامعہ سے فارغ ہوگیا، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا بھی انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہ بھی مدرسہ سے واپس چلے گئے اور مولانا محمد امین شہیدؒ بھی ۱۹۸۰ء میں واپس اپنے علاقے چلے گئے۔ لیکن ان مجالس کی یادیں ذہن کے کسی گوشے میں ضرور محفوظ رہیں۔

کراچی تشریف آوری:

پھر بفضل اللہ میں جامعہ بنوری ٹاؤن میں بطور مدرس رہنے لگا، اس دوران کئی بار حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ جامعہ تشریف لائے۔ الحمدللہ ہر بار ملاقات ہوجاتی اور آپ کی تواضع اور مکارم ومحاسن کو دیکھنے اور اُن سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ یہ ملاقاتیں ظاہر ہے کہ وقتی ہوتی تھیں، اس لئے عموماً حال احوال پر ختم ہوجاتیں۔

پھر حضرت شہید امینؒ نے جب طحاوی کی شرح ''نثر الازھار'' لکھی تو کراچی میں ایک ملاقات کے دوران بندہ نے شرح سے متعلق سوالات اور تفصیلات پوچھیں، آپ نے نہایت شفقت کے ساتھ جوابات دیئے۔ ان سے آپ کی تواضع، حلم اور علم کا رنگ خوب چھلکتا رہا اور آپ کی علمی عبقریت کا اندازہ ہوا۔ واقعتاً وہ اُونچی شان رکھنے والے، حدیث کے ماہر اور فن رجال کے امام تھے۔

جامعہ یوسفیہ حاضری:

حضرت کی شہادت سے پہلے دارالعلوم ٹل کے مولانا علیم اللہ صاحب وغیرہ علما کی دعوت پر میں ٹل گیا۔ وہاں کے پروگرامات سے واپسی پر میں مولانا محمد امین شہیدؒ کی ملاقات کے لئے ہنگو میں ان کے مدرسہ جامعہ یوسفیہ آیا۔ ہنگو شہر سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر دور واقع جامعہ یوسفیہ حضرت کی سادگی، زہد وفقر اور ملنساری وانکساری کا مجسم نمونہ تھا۔ حضرت ہماری آمد پر بے انتہا خوش ہوئے، آپ کی ضیافت ومہمان نوازی تو ویسے بھی ضرب المثل تھی اور پھر اتنے

دور کے مہمانوں سے اکرام واحترام کا جو رویہ ہوتا تھا اُس کی حقیقی کیفیت تو وہاں جانے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

حضرت نے ہمیں اپنے مدرسہ کا تفصیلی دورہ کرایا، طلبہ کی درسگاہیں، مسجد اور عمارت دکھائی، پھر حضرت کی معیت میں آپ کا شاندار کتب خانہ دیکھا، ہزاروں علمی مأخذات اور کئی ایک نادر کتابوں پر مشتمل آپ کا یہ کتب خانہ آپ کے علمی وتحقیقی ذوق، کتاب شناسی، کتاب دوستی اور علم سے والہانہ عشق ومحبت کی دلیل ہے۔

آپ کی قبر پر حاضری:

دوسری بار جب انہی علاقوں کا سفر ہوا، تو یہ علامہ زمان اور محقق دوران وہاں موجود نہ تھا، وہ ظالموں کی فضائی بمباری میں جام شہادت پی چکا تھا، بندہ کے لئے ممکن نہ تھا کہ جس خاک میں علم وعمل کا مجسم پیکر آسودہ ہے، اُس کی زیارت کیے بغیر واپس آجاؤں۔ اس لئے اس بار جب جامعہ یوسفیہ حاضری ہوئی تو استقبال کے لئے بے تاب اور اکرام وضیافت کے لئے دیوانہ وار لپکنے والا وہ مسکراتا چہرہ موجود نہ تھا بلکہ بندہ کی حاضری اُن کی قبر پر ہوئی۔ شاہو وام کی نیم پختہ سڑک کے کنارے ان کی قبر یہ اعلان کررہی تھی کہ حق کا علم بردار اور قبائل کے اتحاد کا سردار اور علم وعمل میں یگانہ روزگار کی یہ آرام گاہ ہے۔ جن کو ظالموں نے بے آرام کرنے کی غرض سے اس آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا ہے۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل　　　شہید ناز کی تربت کہاں ہے

مجموعہ اوصاف وکمالات:

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ علیہ گوناں گوں اوصاف وکمالات کا مجموعہ تھے۔ آپ علم وحلم اور وقار وسنجیدگی کا مجسمہ تھے، ان کی خاموش طبیعت میں ایک متحرک انجمن پوشیدہ تھی۔ ملک وملت کی فلاح وخیر خواہی کا غم ہمہ وقت آپ کے سینے میں موجزن رہتا۔ آپ اورکزئی قبائل کے عوام کے ہاں بلا امتیاز محبوب الکل تھے۔ لوگ آپ کی اداؤں پر جان چھڑکتے اور نچھاور کرتے تھے اور آپ حضرات کا فیصلہ قبائل میں حرف آخر تصور کیا جاتا۔ حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کی شخصیت علاقہ کے فرقہ وارانہ فسادات کے راستے میں مضبوط حائل تھی، آپ کی گہری فہم وفراست اور حکمت وتدبر سے ہنگو میں قیام امن کی راہ ہموار ہوئی اور لوگوں کو امن وچین کی دولت نصیب ہوئی۔

آپ کی شہادت سے صرف آپ کی اولاد اور متعلقین ہی سایہ شفقت سے محروم نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ کی شہادت تمام قبائل کی شہادت تھی۔

وما هلك . قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

اور قیس کی موت اکیلے قیس کی موت نہ تھی، بلکہ وہ پوری قوم کی بنیاد تھے جو گر گئی۔

اللہ رب العزت حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کے درجات بلند فرمائیں اور ان کا تذکرہ مرتب کرنے والوں کو اجر عظیم سے نوازیں۔ (آمین)

باتیں ان کی یاد رہیں گی!!!

مولانا امداداللہ یوسف زئی، کراچی

کسی شخصیت پر جب قلم اٹھایا جاتا ہے یا کسی کی سوانح سے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو بلاارادہ بھی خود صاحب قلم اور متکلم کے احوال سامنے آجاتے ہیں، اور بسا اوقات اس میں اپنی تعریف وستائش بھی ذکر ہوجایا کرتی ہے، جو ایک حد تک تو قابل تسامح ہوسکتی ہے، لیکن حدود سے متجاوز ہو تو حساس طبیعتوں پر بوجھ بن جاتی ہے، ہمارے استاذ مکرم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ ایک محقق عالم، محسن ومربی استاذ اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دوراندیش ناظم گذرے ہیں، اس تحریر میں انہی سے وابستہ کچھ یادوں کا اظہار پیش نظر ہے، لیکن ڈر یہ ہے کہ اس میں خودستائشی کا عنصر حد سے بڑھ نہ جائے، اللہ تعالی اس جذبے سے محفوظ رکھے، آمین!

جب بندہ جامعہ میں درجہ اولی میں داخل ہوا تو جامعہ میں دو ناظم ہوا کرتے تھے، ایک حضرت مولانا عبدالقیوم چترالی اور دوسرے استاذ محترم مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہما اللہ، وسطانی اور افریقہ دارالاقامے استاذ محترم کی زیر نگرانی ہوتے تھے، صبح حضرت الاستاذ ہی طلبا کو اٹھانے آیا کرتے تھے، اب حالات بدلتے جارہے ہیں، اور ہر ادارے اور شعبے میں سستی اور کاہلی غالب آتی جارہی ہے، خیال آتا ہے کہ اس زمانے صرف یہی دو حضرات ناظم ہوتے تھے، جامعہ کے تینوں دروازوں پر کوئی چوکیدار نہیں ہوتا تھا، مسجد کے ایک بزرگ خادم رات کو گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان دروازے بند کیا کرتے تھے اور صبح فجر کی اذان پر کھول دیتے تھے، کوئی گارڈ تھا نہ چوکیدار، امن وامان اور چین وسکون کا دور تھا، لیکن بظاہر اتنی آزادی کے باوجود طلبا کی بلاضرورت جامعہ سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، پورے سال میں مشکل سے ایک آدھ بار دارالاقامہ کی حاضری ہوا کرتی تھی، کبھی کبھار مسجد کے صحن میں چکر

لگالیا کرتے تھے، کبھی دارالافتا کے سامنے برآمدے میں ایک جانب مولانا فضل محمد سواتی اور دوسری طرف استاذ محترم رحمہا اللہ آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور پوری مسجد کے طلبا ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتے تھے۔

جامعہ میں داخلے کی ابتدا سے ہی حضرت الاستاذ سے تعلق رہا، ان کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا، وہ طلبا پر نہایت مشفق تھے، اور ہم جیسے دور افتادوں کے لیے "آوی الی رکن شدید" کا مصداق تھے، ان کے رویے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہم انہی کی دعوت پر جامعہ آئے ہیں، اکثر اوقات برادرم مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، قاری اسد اللہ مردانی اور بندہ کو اپنے کمرے میں بلاتے اور منفرد انداز میں اپنائیت کا اظہار فرماتے تھے، محبت والفت کے اس نرالے انداز کے دسیوں واقعات ذہن میں ہیں، یہ مختصر تحریر ان کی متحمل نہیں، رہائشی طلبا تو مدرسے میں ایک پہلو سے بے سہارا ہوتے ہیں، کوئی مہمان آجائے تو ان کی خاطر مدارات کے سلسلے میں بھی پریشان ہوجاتے ہیں، لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس دور میں کبھی میرے والد صاحب رحمہ اللہ آئے ہوں اور استاذ محترم نے ان کو دعوت طعام نہ دی ہو۔

جود وسخا اور فیاضی

استاذ مکرم کی فیاضی معروف ومشہور تھی، اور اس حوالے سے بہت سے واقعات کا میں عینی شاہد ہوں، ایک واقعہ قارئین کی نذر کرتا ہوں، یہ سنہ ۱۹۷۹ء کا واقعہ ہے، اس دور میں آج کل کی طرح شعبان رمضان میں خوب گرمی پڑا کرتی تھی، جامعہ کی سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو ہم نے گاؤں جانے کے لیے "تیز رو" کی ٹکٹیں خرید لیں، استاذ محترم نے فرمایا کہ میں بھی تمہارے ساتھ سفر کروں گا، ہم تیس ساتھی تھے اور امتحانات کے اختتام پر جمعے کے دن ہماری روانگی تھی، جمعہ کی صبح ایسی تیز دھار بارش ہوئی کہ میں نے کراچی میں ویسی بارش کبھی نہیں دیکھی، چھوٹی گاڑیوں کا چلنا تو درکنار بڑی بسوں کا سڑک پر نکلنا بھی مشکل تھا، ہم نے دو ساتھیوں سمیت ایک سوزوکی میں اپنا سامان سٹی اسٹیشن کی طرف روانہ کیا اور ہر ساتھی اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح اسٹیشن تک پہنچ جائے۔ میں ایک گاڑی میں سوار ہوا، جو براہ راست سٹی اسٹیشن جاتی تھی، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ راستے میں سامان والی سوزوکی خراب ہوگئی اور ایک ٹرک میں سامان لوڈ کر کے اسٹیشن تک پہنچایا گیا، خیر کسی طرح ہم ساتھی اسٹیشن تک پہنچ گئے، لیکن اب اگلی پریشانی یہ تھی کہ گاڑی لیٹ ہے، اور صبح آٹھ بجے کے بجائے دوپہر بارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ ٹیلی فون کا انتظام نہیں تھا، موبائل کا تو اس وقت تصور بھی نہ تھا، اس لیے باہمی رابطہ کی کوئی صورت نہ تھی۔

ادھر استاذ محترم جامعہ سے نکلے تو انہیں یقین تھا کہ گاڑی روانہ ہوچکی ہوگی، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر

سیدھے حیدرآباد کے لیے نکل گئے، مرحوم مولانا انوار الاسلام نور اللہ مرقدہٗ بھی ان کے ساتھ تھے، ہم حیدرآباد پہنچے تو استاذ محترم بھی ہمارے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئے، ہم ساتھیوں میں عمر، علم اور تجربے کے اعتبار سے قاری اسد اللہ صاحب بڑے تھے، اس لیے سفر کے نظم کے لیے سب ساتھیوں نے ان کے پاس پیسے جمع کروا دیئے تھے، اس زمانے میں تیس چالیس روپے بھی بڑی رقم شمار ہوتی تھی، ادھر استاذ محترم نے بھی قاری اسد اللہ صاحب کو اپنی طرف سے رقم دے دی تھی کہ سفر میں اسی رقم سے خرچ کرنا، اور طلبا کو یہ علم نہ ہو کہ یہ استاذ محترم کی رقم خرچ ہو رہی ہے، تاکہ وہ اپنی جمع کردہ رقم کا خرچہ سمجھ کر کھانے پینے اور دیگر سفری ضروریات میں ہاتھ کھلا رکھیں اور خوب کھائیں پئیں، ٹرین نے مغرب کے قریب نوشہرہ پہنچنا تھا، لیکن بارش کی وجہ سے تاخیر کی بنا پر اگلی صبح ہم نوشہرہ پہنچے، جب جہانگیرہ پہنچے تو قاری اسد اللہ صاحب نے سب ساتھیوں کو ان کی جمع کرائی ہوئی رقم واپس کر دی اور بتایا کہ سفر کا سارا خرچ استاذ جی کی جانب سے تھا اور انہوں نے دوران سفر اس بات کو پوشیدہ رکھنے کا حکم فرمایا تھا، یوں اس سفر میں ہم تیس ساتھیوں کا پورا خرچہ استاذ محترم نے اپنی جیب سے ادا کیا اور ہمیں اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔

حضرت استاذ مکرم کے مزاج میں بعض اوصاف منفرد تھے، انہیں دعوتوں میں معمولی تکلف بھی گوارا نہ تھا، جہاں تکلف کا اندیشہ ہوتا تو لطائف حیل سے ٹال جاتے، اور جہاں بے تکلفی کا گمان غالب ہوتا تو ضرور تشریف لے جاتے تھے، ایک بار حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ ''وفاق المدارس العربیۃ'' کے ناظم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ''خیبر پختون خواہ'' کے سینٹروں کا معاینہ فرمار ہے تھے، ہم فجر سے پہلے پشاور سے روانہ ہوئے، صبح کے وقت سڑکوں پر رش نہیں تھا، اس لیے سفر تیزی سے طے ہو رہا تھا، ''کوہاٹ'' کے قریب ہم نے فجر کی نماز پڑھی، فجر کے بعد دوبارہ سفر شروع کیا، جب امتحان شروع ہوا تو ہم مختلف سینٹروں کا معاینہ کرتے ہوئے ساڑھے بارہ یا پونے ایک بجے ''میران شاہ'' کے قریب ایک مدرسے میں پہنچے، جہاں نگران حضرات بیٹھے جوابی کاپیاں ترتیب دے رہے تھے، وہاں سے مفتی انور شاہ صاحب اور مولانا محسن شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو گئے اور ہم اس نیت سے واپس لوٹے کہ یہ رات ''ہنگو'' میں استاذ محترم کے ہاں گزاریں گے، عشا کے قریب وہاں پہنچے تو استاذ محترم نے ہماری آمد پر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً ایک بکرا ذبح کیا، ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہمارے لیے انواع واقسام کے کھانوں سے دسترخوان سجا ہوا تھا، دونوں بزرگوں کی باہمی الفت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ جب اگلی صبح فجر سے قبل ہم روانہ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ مولانا حبیب اللہ مختار صاحب میرے جگری دوست ہیں، اب آپ کے گھر آئے ہیں تو کم از کم پشاور تک تو آپ ہمارے ساتھ جائیں گے نا! وہ تو گویا میرے کہنے سے قبل ہی یہ عزم کر چکے تھے، اب استاذ محترم بھی ہمارے ہمراہ تھے، اور پشاور تک ہمارے ساتھ تشریف لائے، حالانکہ اس

وقت ان کے پاس اپنی سواری نہ تھی، یہ ان کی مروت واخلاق کا ایک ادنی کرشمہ تھا۔

انداز تربیت

استاذ محترم کا انداز تربیت بھی نرالا تھا، زمانہ طالب علمی میں ہر طالب علم کو وساوس گھیر لیا کرتے ہیں، طرح طرح کے خیالات آتے جاتے ہیں، درجہ ثالثہ کے سال مجھ پر بھی ایسی کیفیت آئی، یہ خیال دماغ پر چھا گیا کہ میں کراچی سے لوٹ جاؤں اور مزید تعلیم جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں حاصل کروں، استاذ محترم کو یہ بات پہنچی تو مجھے طلب فرمایا، کافی دیر سمجھایا اور "دلائل الخیرات" کی اجازت دے کر ایک نسخہ مرحمت فرمایا، اور ایک ہفتے تک مجھے یوں مصروف رکھا کہ عصر کی اذان پر مسجد میں بلاتے اور مسجد میں بیٹھ کر ایک منزل پڑھنے کا حکم فرماتے، مغرب تک مسجد میں رہتا، ہفتے کے ساتھ ہی میری منزلیں بھی پوری ہوگئیں، اس عمل سے خیالات و وساوس کے سارے بادل دماغ سے چھٹ گئے اور قلبی سکون اور یکسوئی نصیب ہوگئی، والحمد للہ علی ذلک!

اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک نہایت قابل اور ذہین طالب علم نے اپنی کم فہمی کی بنا پر استاذ محترم کے متعلق ایسے جملے کہہ دیے، جس سے مشہور ہوگیا کہ استاذ محترم تبلیغی کام کے خلاف ہیں، حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل برخلاف تھی، واقعہ یہ تھا کہ وہ طالب علم پوزیشن لینے والا تھا، اس نے تبلیغی امور میں ایسی بے اعتدالی اختیار کی کہ پوزیشن نہ آئی، اس پر استاذ محترم نے اسے تنبیہ فرمائی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تبلیغ کی اہمیت اور اس کا مقام مسلم ہے، لیکن اس کی بنا پر طالب علم کی تعلیم متاثر نہیں ہونی چاہیے، آپ کی تبلیغی مصروفیات اتنی بڑھنی نہیں چاہئیں کہ پوزیشن نہ آئے، طلبا عام طور پر مزاجی اعتبار سے لاپرواہ ہوا کرتے ہیں، اور بے پر کی اڑادیا کرتے ہیں، اس طالب علم نے بھی ناسمجھی میں ایسے جملے کہہ دیئے کہ استاذ محترم کے متعلق غلط شہرت ہوگئی، تب استاذ جی رحمہ اللہ نے اپنے موقف کی وضاحت فرمائی، جس کا حاصل یہ تھا کہ:

> ''آج کل صلاحیتیں کند ہوتی جارہی ہیں، تدریس اور تصنیف وتالیف کے میدانوں کے لیے رجال کار کم ہوتے جارہے ہیں، ڈھونڈنے سے بھی کام کے لوگ نہیں ملتے، اس لیے جن طلبا میں تدریس یا تصنیف وتالیف کا ملکہ ہو تو انہیں خوب بڑھ چڑھ کر محنت کرنی چاہیے، تبلیغ کی اہمیت اپنے مقام پر ہے، لیکن اس کے لیے لوگ مل جاتے ہیں، لیکن ان میدانوں کے اہل لوگ نہیں ملتے''۔

استاذ محترم کے موقف اور تعبیر میں عام مشہور بات سے بہت فرق تھا، اسی مجلس میں فرمایا: ''دنیا میں خیر خواہ لوگ بہت مل جاتے ہیں، لیکن ان کے درجات اور فہم میں بھی فرق ہوتا ہے، ایک شخص کسی راستے پر رواں دواں ہے، جس میں ایک کلومیٹر آگے چل کر ایک گڑھا آتا ہے، اب ایک خیر خواہ وہ ہے جو اس گڑھے کے سرے پر پہنچ کر متنبہ کرتا

ہے: ''بھائی! خیال رکھنا، اگلے قدم پر گڑھا ہے''۔ اور دوسرا خیر خواہ وہ ہے جو راہ کی ابتدا میں ہی تنبیہ کر دیتا ہے: ''دیکھو! اس راستے پر نہ جانا، اس میں آگے ہلاکت کا گڑھا ہے، جہاں تم پھسل سکتے ہو، ایسے کسی راستے پر جاؤ ہی نہیں، جس میں انجام ہلاکت ہو''۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ بلند پایہ اور زیادہ دور اندیش ہے، اس لیے انسان کو اپنے خیر خواہوں کے انتخاب میں بھی ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔

سوات کا ایک یادگار سفر

حضرت استاذ محترم رحمہ اللہ جب بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کو چھوڑ کر اپنے آبائی علاقے میں تشریف لے گئے تو اس کے بعد بھی بندہ اور برادر مکرم مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ کا بارہا ان کے ہاں جانا ہوا، ایک بار ہم دونوں ان سے ملاقات کے لیے دوپہر بارہ بجے کے آس پاس ''ہنگو'' پہنچے ہی تھے اور کچھ دیر میں شہر سے ان کے گاؤں ''شاہو وام'' روانہ ہونے کا ارادہ تھا، معلوم ہوا کہ استاذ محترم اپنے بعض احباب کے ساتھ مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ سے ملاقات کے لیے ''سوات'' جا رہے ہیں، ہمیں دیکھ کر استاذ محترم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ میرے مہمان آگئے ہیں، اب میں ''سوات'' نہیں جا سکتا، سارے رفقا گاڑی میں بیٹھنے والے تھے، اس صورت حال سے وہ کسی قدر پریشان ہو گئے، ہم نے آگے بڑھ کر عرض کیا: استاذ جی! آپ اپنا ارادہ ملتوی نہ فرمائیں، ہم آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں، یوں ہم بھی آپ کی برکت سے ''سوات'' دیکھ لیں گے اور مولانا فضل محمد رحمہ اللہ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ سفر شروع ہوا اور رات کو نو ساڑھے نو بجے ہم ''مینگورہ'' پہنچے، مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ کے ''مدرسہ مظہر العلوم'' جانے سے قبل استاذ محترم نے ہم سب کو ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا اور فرمایا: ''مجھے معلوم ہے کہ استاذ جی ہوٹل میں کھانا کھانے پر ناراض ہوں گے، لیکن میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ اس وقت ان کے گھر پہنچ کر اہل خانہ کو زحمت دوں اور انہیں تکلیف میں مبتلا کروں''۔ رات کے قیام کے بعد صبح مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رات کے کھانے کا پوچھا، اور ہوٹل میں کھانا کھانے پر شدید ناراضی کا اظہار فرمایا کہ: ''تم نے مینگورہ پہنچ کر ہوٹل میں کیوں کھانا کھایا؟ کیا فضل محمد کا گھر موجود نہیں تھا؟''۔

اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے ان کے ساتھ مجلس رہی، اور پھر ہم ''مدین'' کے قریب ایک بزرگ کی زیارت کے لیے گئے، وہاں سے ''سوات'' کے مشہور و معروف حسین مقام ''کالام'' گئے، ہماری زندگی میں یہ ''کالام'' کا پہلا سفر تھا، وہاں استاذ محترم نے رفقائے سفر کا بہت اکرام کیا، مغرب کے بعد ''کالام'' سے نکلے اور رات کو دو بجے کے لگ بھگ مردان میں قاری اسد اللہ صاحب کے گھر پہنچے، اس سفر میں بھی استاذ محترم نے فیاضی کی انتہا کر دی، اس طرح کے

ان گنت واقعات میں ہمارے لیے بہترین دروس تھے۔

علمی وکتابی ذوق

استاذ محترم اعلیٰ درجے کا کتابی ذوق رکھتے تھے، کتابوں اور کتب خانوں سے ان کا شغف دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، ''پشاور'' کے ''قصہ خوانی بازار'' کے کتب خانوں کے مالکان استاذ محترم کی آمد کے منتظر رہتے تھے کہ مولانا کب آئیں گے اور ہمارا کتب خانہ خالی کریں گے، حالانکہ استاذ محترم کی معیشت اتنی مستحکم نہ تھی، لیکن کتابی ذوق کی بنا پر قرض کی نوبت آتی رہتی تھی، ان کی صحبت میں رہنے والے شاگردوں میں بھی یہ ذوق نمایاں نظر آتا ہے، مفتی ولی درویش رحمہ اللہ کا کتابی ذوق انہیں کا مرہون منت تھا، اور جامعہ کے موجود اساتذہ میں مولانا محب اللہ صاحب بھی اس پہلو سے ان کا پرتو ہیں، مولانا محب اللہ صاحب ان کے ہاں تین برس تک تدریسی خدمات بھی انجام دے چکے ہیں، اس لئے ان صحبتوں کے اثرات مولانا میں منتقل ہونا باعث تعجب نہیں۔

علمی مقام سے قطع نظر خاندانی اور علاقائی اعتبار سے بھی استاذ محترم کو اللہ تعالیٰ نے نمایاں مرتبہ عطا فرمایا تھا، وہ اپنے قبیلے کے بڑے اور بہت کچھ تھے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا مدرس، مربی اور محقق آج ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے، جہاں تک محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے ساتھ ان کے تعلق کی بات ہے تو اس بارے میں ہمارے بزرگ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ زیادہ بہتر جانتے ہیں، ہم اس دور میں ابتدائی درجات کے کم سن اور کم فہم طلبا تھے، اس لیے ان دونوں استاذ شاگرد کے باہمی تعلق کے ادراک سے قاصر تھے، البتہ یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ استاذ محترم کے دن رات مدرسے کی چار دیواری میں گزرتے تھے، وہ بہت کم ہی باہر چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے، ان کے پاس ایک ہی سبق ہوا کرتا تھا، باقی وقت تصنیفی کاموں میں گزرتا تھا، دارالتصنیف، درس گاہ، رہائشی کمرہ اور مسجد کی صف اول یا طلبا کی نگرانی کے لیے مسجد کے صحن میں ہی ان پر نگاہیں پڑتی تھیں، یہی ان کے ٹھکانے تھے اور انہی احوال میں ہم نے انہیں دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مظلومانہ شہادت کو قبولیت سے نوازے، اور ان کے علمی کارناموں کو زندہ وتابندہ رکھے، آمین!

نابغہ روزگار

مولانا محمد یوسف افشانی، کراچی

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے اپنا جو نظام ہدایت تشکیل دیا ہے، اس میں 'رجال اللہ' کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ 'رجال اللہ' یا 'علمائے ربانیین' ہی سے دین کی بقا وابستہ ہے اور اسلامی تاریخ کی تقریباً ساڑھے چودہ صدیوں میں جب بھی امت مسلمہ کو علمی یا عملی فتنوں کا سامنا کرنا پڑا، یا علوم اسلامیہ کی تدوین وترویج کی حاجت ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق 'رجال' کھڑے کیے۔ جنہوں نے امت کی رہنمائی کے لئے یہ تقاضے پورے کیے اور اس میں اپنی پوری زندگیاں اور صلاحیتیں کھپا دیں۔ ہمارے استاذ گرامی مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی 'رجال اللہ' کے اسی قافلے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے علمی، عملی اور روحانی کمالات سے ایک قرن کو مستفید فرمایا اور سعادت کی زندگی گزار کر شہادت کی موت سے بہرہ ور ہوئے۔

کچھ عرصہ قبل عزیزم مولوی محمد طفیل سلمہ نے بندہ سے رابطہ کر کے حضرت الاستاذ سے متعلق اپنی یادداشتیں لکھنے کا کہا اور اپنے مجلہ سہ ماہی ''المظاہر'' کوہاٹ کی خصوصی اشاعت کا ذکر کیا جو حضرت الاستاذ کی یاد میں شائع کی جارہی ہے۔ بندہ گوناگوں امراض اور حافظے کی کمزوری کے باعث قریباً چالیس سال قبل کی یادیں پوری طرح پیش کرنے سے تو معذور ہے۔ تاہم حضرت کی محبت وشفقت کے جو نقوش دل ودماغ پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئے، ان کا کچھ تذکرہ پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول ومنظور فرما کر لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (آمین)

حضرت بنوریؒ کے منظور نظر

استاذ گرامی حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ دورۂ حدیث کے لئے بنوری ٹاؤن تشریف لائے اور اپنی خداداد صلاحیت، صالحیت اور قدری صفات اخلاق واطوار سے اپنے اکابر اساتذہ کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی کہ یہیں کے ہو رہے۔ دورۂ حدیث کے امتحان میں وفاق المدارس کی سطح پر پہلی پوزیشن حاصل کی۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے آپ کو تخصص فی الحدیث کے لئے طلب فرمایا۔ تخصص میں آپ نے حضرت مولانا ادریس میرٹھیؒ کی نگرانی میں اپنا گراں قدر مقالہ ''مسانید الامام أبي حنيفة'' تصنیف فرمایا جس سے زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کے بلند ذوق تحقیق، علمی استعداد، عربی زبان سے شغف اور علم حدیث سے فطری لگاؤ کا باآسانی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت بنوریؒ نے آپ کو 'معارف السنن' کی تصنیف میں اپنی معاونت کے لئے منتخب کیا اور بعد ازاں ''طحاوی شریف'' پر اپنے مخصوص منہج کے مطابق تحقیقی کام حوالے کیا، جو حضرت الاستاذ کے لئے بہت بڑا اعزاز اور اپنے استاذ کی طرف سے اعتماد کی سند تھی۔ حضرت بنوریؒ آپ اور مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ''جناحای فی التصنیف والتالیف'' یہ تصنیف وتالیف کے کاموں میں میرے دو بازو ہیں۔

آپ کا دور نظامت

حضرت مولانا سید بنوری قدس سرہ نے آپ کی علمی استعداد کے ساتھ ساتھ آپ کی انتظامی صلاحیتیں بھانپ کر آپ کو مدرسہ کی نظامت کا اہم اور نازک کام سپرد فرمایا۔ آپ نے اسے بڑی ہی خوبی کے ساتھ نبھایا۔ آپ بلا کے بیدار مغز اور منتظم مزاج انسان تھے۔ آپ کا دور نظامت جامعہ کی تاریخ میں نظم وضبط کے حوالے سے مثالی دور سمجھا جاتا ہے۔ طلبہ کی تعلیم وتربیت پر گہری توجہ ور کیز رہتی۔ آپ کی فکر ہوتی کہ کوئی طالب علم تعلیمی یا اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کا شکار نہ ہو، اس لئے ایک مشفق باپ اور بڑے بھائی کی طرح طلبہ کی سرپرستی ونگرانی کا فریضہ سرانجام دیتے۔ دارالاقامہ کے امور میں بھی اسی حسن انتظام کو قائم رکھا، آپ کی تربیت اور نگرانی کی خوبی تھی کہ طلبہ دارالاقامہ میں ضیاع وقت اور لاابالی پن سے محفوظ رہتے۔ خود تشریف لاکر نماز کے لئے طلبہ کو بیدار کرتے۔ آپ کی مثالی شفقت کے باوجود آپ کا وقار، سنجیدگی اور رعب اس قدر تھا کہ دل میں محبوبیت کے ساتھ ساتھ ایک ہیبت بھی رہتی۔ اور طلبہ آپ کے مزاج یا قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی نادانستہ جرأت سے بھی اپنے آپ کو بچاتے تھے۔

شفقت واصاغر نوازی

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے کمال کی تواضع عطا فرمائی تھی، اپنے آپ کو اس قدر فنا کیا تھا کہ چھوٹوں کے ساتھ بڑوں جیسا رویہ اور معاملہ رکھتے۔ اپنے چھوٹوں پر اس قدر شفقت فرماتے کہ ہم چھوٹے اس وہم کا شکار ہوجاتے کہ ہم

تو بڑے ہو گئے ہیں۔ اپنے اصاغر کو اس درجہ نوازنے کا وصف حضرت الاستاذ کا امتیازی تھا، جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آج سے سولہ، سترہ سال پہلے کی بات ہے کہ ہم حضرت کی خدمت میں جامعہ یوسفیہ ہنگو حاضر ہوئے، آپ نے جو مثالی خدمت فرمائی وہ آج بھی نہیں بھولتی۔ بلا کے مہمان نواز تھے۔ اس جنگل نما بستی میں کئی لوازمات کا اہتمام کرتے۔ ہم نے حضرت کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر اپنے نظم سفر کے مطابق پشاور واپسی کا عزم کیا۔ اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حضرت الاستاذ اور آپ کے استاذ گرامی حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہماری مشایعت کے لئے ساتھ روانہ ہوئے، چونکہ ہمارے تو بڑے تھے اس لئے ہمیں ان کی پیرانہ سالی میں یہ زحمت کہاں گوارا ہو سکتی تھی، لیکن وہ کہاں مانتے تھے، اس لئے نہال کر کے چھوڑا۔

ایک لمبے فاصلے تک تو حضرت الاستاذ ہماری گاڑی میں ساتھ رہے اور ہم ان کی شفقتوں اور عنایتوں سے فیض یاب ہوتے رہے، پھر ایک جگہ سے وہ دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم مسلسل واپسی کا اصرار کرتے رہے، بالآخر ہمارے پیہم اصرار پر انہوں نے ایک جگہ سے واپسی فرمائی۔ حالانکہ ان علاقوں کے روڈ اور سہولیات بھی بڑے شہروں کی طرح نہیں ہیں اور اردگرد اہل تشیع کی کثیر آبادی اور حساس علاقے ہونے کے پیش نظر ان حضرات کے لئے اسفار خطرے سے بھی خالی نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے مہمانوں اور وہ بھی اپنے تلامذہ اور ضابطے میں چھوٹوں کے ساتھ اس قدر مشفقانہ رویہ باعث حیرت اور قابل رشک تھا۔

حضرت الاستاذ کی ایک عادت مبارکہ یہ تھی کہ طلبہ ساتھیوں کی معاشی خبر گیری رکھتے اور ضرورت مند طلبہ کی اسی طرح اعانت کرتے کہ کسی کو احساس تک نہ ہو اور ان کی عزت نفس بھی قائم رہے۔ طلبہ کے ساتھ آپ کا مجموعی رویہ مشفقانہ ضرور تھا لیکن کوتاہیوں پر مطلقاً چھوٹ اور تساہل بھی نہ فرماتے بلکہ ضروری تنبیہ کا اہتمام کرتے۔

تفہیم کا ملکہ

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے عبقری علمی شان کے ساتھ تدریس کا عمدہ ذوق اور سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ آپ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھے جو پڑھانے کے بجائے گھول کر پلانے کا ملکہ رکھتے تھے۔ دھیمی آواز سے تسلسل کے ساتھ انتہائی جامع اور سہل تعبیر اور مربوط و منضبط ترتیب سے درس دیتے۔ کتاب حل کرنے کا ایسا خداداد ملکہ تھا کہ مشکل سے مشکل مقامات اور پیچیدہ عبارات پگھل جاتیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ سے سلم العلوم پڑھنے کی توفیق بخشی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ سلم مشکل اور دقیق کتاب ہے۔ لیکن حضرت کی تفہیم کا انداز ایسا نرالا اور دلچسپ تھا کہ ہم نے بغیر کسی دقت اور مشکل کے پوری کتاب سمجھ کر پڑھی اور کسی جگہ الجھن پیش نہ آئی۔

کراچی کی مجالس

حضرت الاستاذ جامعہ سے تشریف لے جانے کے بعد اکثر کراچی تشریف لاتے۔ جب بندہ جامعہ فاروقیہ میں تھا ،تو حضرت ایک بار صندل باباجیؒ کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ آپ حضرات کی مجالس میں ماضی کی یادیں تازہ ہونے کے ساتھ ساتھ علمی وروحانی سوغات کے مزے لوٹنے کا موقع ملتا۔ اورآپ کی شفقتوں اور عنایتوں کے وہ مظاہر دیکھنے کو ملتے ،جن کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔

واذکرأیام الحمیٰ ثم انثنی
علیٰ کبدی من خشیة أن تصدعا
فلیت عشیات الحمیٰ برواجع
الیک ولکن خل عینیک الدمعا

کراچی میں عموماً آپ کا قیام مولانا قاری محمد قاسم صاحب مدظلہ کی رہائش گاہ پر رہتا۔ بندہ بھی موقع پاتا تو نیاز حاصل کرنے وہیں حاضر ہو جاتا ،ایک بار جب صحیح بخاری کی قدیم شرح ابن بطال چھپ کر آئی تو بندہ حضرت کی خدمت میں ساتھ لے گیا چونکہ شرح ابن بطال کے حوالے کثرت سے دیکھنے کو ملتے اور اس کا شمار بخاری شریف کے سرفہرست شروحات میں ہوتا ہے، اس لئے میرا خیال تھا کہ یہ کافی تفصیلی شرح ہوگی ،جس طرح علامہ ابن حجرؒ کی فتح الباری یا علامہ بدر الدین عینیؒ کی عمدۃ القاری ہے۔ لیکن وہ خلاف توقع بہت مختصر تھی۔ میں نے حضرت الاستاذ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت! یہ تو بہت مختصر ہے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: بڑوں کی باتیں مختصر ہوتی ہیں۔

الغرض! حضرت الاستاذ کا علم ،تقویٰ، للّٰہیت وخلوص ،سادگی وملنساری ،شفقت ورأفت سب کچھ اتنا مثالی تھا کہ اس کی صحیح تصویر کشی ہمارے لئے ممکن ہی نہیں۔ ایسی شخصیات کا تذکرہ زندہ رکھنا آنے والی نسلوں کے لئے حیاتِ نو کا پیغام بنتا ہے اور قوموں کی علمی ،عملی اور روحانی تربیت کے حوالے سے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ امید ہے کہ حضرت الاستاذ کی زندگی کے مختلف پہلو ہماری آئندہ نسلوں کی تربیت کے لئے اکسیر کا کام دیں گے۔ اللہ رب العزت آپ کی کامل مغفرت فرما کر درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کے فیوضات وبرکات سے فیض یاب فرمائے۔ آمین ثم آمین

مشفق وباکمال مربی

مفتی محمد عاصم زکی، کراچی

یوں تو ہر زمانے میں علمائے امت نے دین کی تعلیم وتعلم اور تربیت کے شعبے میں مثالی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن عالم اسلام اور خصوصاً برصغیر پاک وہند میں اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ابنائے دارالعلوم دیوبند سے جو کام لیا ہے، اس کی شان ہی نرالی ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے لے کر دور حاضر تک کے اکابر علمائے دیوبند میں ایسے علما کی ایک طویل فہرست ہے جو صحیح معنوں میں حضرات انبیا علیہم السلام کے وارث کہلانے کے مستحق ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی کہکشاں میں علامہ انور شاہ کاشمیریؒ وہ چمکتے ستارے ہیں جنھوں نے افراد سازی پر توجہ دی اور اپنے محیر العقول علمی شان کے چند پرتو تیار کیے۔ ان کے علم وعمل کے ایک وارث حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ ہوئے۔ حضرت بنوریؒ نے بھی اپنے استاذ کے منہج پر چند خاص ہیرے تراشے، جو اپنی صلاحیتوں اور علمی تنوع میں معارف کاشمیریؒ اور علوم بنوریؒ کے یادگار ثابت ہوئے۔ ان میں سے دو حضرات کو تو اعتماد کی سند خود حضرت بنوریؒ کے دربار سے عطا ہوئی اور ان کو آپ نے "جناحای" کہہ کر اپنے بازو قرار دیا۔ میری مراد حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ہیں۔

کوہاٹ سے ہمارے احباب نے رابطہ کیا کہ مولانا اورکزئی شہیدؒ پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اکابر جامعہ میں سے اکثر حضرات کے احوال وآثار اور علمی خدمات بہت جلد منظر عام پر آئیں۔ تکوینی طور پر حضرت اقدس بنوریؒ کے ان دو اخص تلامذہ پر یہ خدمت مؤخر ہوتی گئی اور اب بحمد اللہ دونوں حضرات کے احوال و

آثار اور کارناموں پر ایک ساتھ کام جاری ہے۔ ماہنامہ بینات نے مولانا حبیب اللہ مختار صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر خصوصی اشاعت کا عزم کرلیا ہے جب کہ حضرت مولانا اورکزئی شہیدؒ پر "المظاہر" کے احباب کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں اکابر کی زندگیوں کے تابناک پہلو جلد از جلد منظر عام پر لانے کا سامان پیدا فرمائے اور مخلوق خدا کو ان سے مستفیض ومستفید فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ بنیادی طور پر ایک مایہ ناز محقق و مدرس تھے اور آپ کا ذوق خالص علمی وتحقیقی تھا، لیکن طلبہ کی نگرانی وتربیت اور مدرسہ کی انتظامی ذمہ داریاں بھی اس شان سے نبھاتے تھے کہ ان کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے "آپ بیتی" میں اپنے والد گرامی مولانا یحییٰ صاحبؒ کی شانِ تربیت بڑی تفصیل سے ذکر کی ہے کہ ان کے ہاں طالب علم کے لئے تعلقات زہر قاتل کی حیثیت رکھتے تھے اور ایسی کڑی نگرانی فرماتے تھے کہ اگر میں دو وقت مسلسل نماز کی صف میں کسی کے ساتھ کھڑا ہوجاتا تو اس پر پوچھ گچھ ہوتی۔ حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ کا یہ معاملہ صرف حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے ساتھ تھا لیکن اگر میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا اورکزئیؒ کا یہ معاملہ ہر طالب علم کے ساتھ تھا۔

بغیر حاضری رجسٹر کے آپ کو اس کا ادراک ہوتا کہ کون غائب ہے؟ پھر غائبین کے متعلق پوری معلومات ہوتیں حتیٰ کہ طلبہ میں مشہور تھا کہ حضرت کے پاس جنات ہیں جو انہیں طلبہ کے احوال سے آگاہ کرتے ہیں۔ مہملین کی گرفت تو ویسے بھی فرماتے لیکن پڑھنے والوں پر بھی کڑی نظر رہتی کہ کہیں فضولیات اور ضیاع وقت کا شکار نہ ہوں۔ اس سلسلے میں خود میری بھی ایک دفعہ سخت گرفت فرمائی۔ ہوا یوں کہ درجہ ثانیہ میں میری پوزیشن آئی، میرے حفظ کے ایک ساتھی نے کہا کہ اس خوشی میں آپ کی ناشتہ کی دعوت کرنی ہے۔ بندہ نے والدہ صاحبہ سے اجازت لی اور اگلی صبح ساتھی کے ساتھ ناشتہ کرنے چلا گیا۔ راستہ میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت فیوضہم ملے۔ حضرت نے پوچھا کہ بھئی! کہاں جارہے ہو؟ ہم نے عرض کیا: حضرت ناشتہ کرنے جارہے ہیں۔ حضرت نے جانے دیا۔ واپسی پر جامعہ ریسٹورنٹ ..... جہاں اب مکتبۃ الحمد بن چکا ہے..... کے قریب مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ نے روک لیا کہ کہاں گئے تھے؟ ہم نے عرض کیا کہ حضرت ناشتہ کرنے گئے تھے۔ اتنا کہنا تھا کہ حضرت نے ایک زوردار تھپڑ مجھے اور ایک میرے ساتھی کو رسید کیا۔ ہم وہاں سے بھاگے، لیکن مجھے حیرت تھی کہ حضرت نے آخر کس وجہ سے مارا ہے، ہمارا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ میں نے ساتھی سے کہا کہ حضرت کے کمرے میں چل کر پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیوں مارا؟ ہم نے تو والدہ صاحبہ سے اجازت لی تھی، پھر ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب نے بھی ہمیں جانے

دیا تھا۔ اس پر میرا ساتھی کہنے لگا کہ ارے بھئی! حضرت بہت سخت مزاج ہیں، مزید ماریں گے، میں تو نہیں پوچھ سکتا، آپ بالکل کمرے میں نہ جائیں۔ وہ تو ڈر گیا لیکن میں اسباق کے بعد کمرہ میں حاضر ہوا۔ مولانا محمد بنوریؒ بھی کمرہ میں موجود تھے، وہ مجھے جانتے بھی تھے۔ جب میں نے حضرت سے کہا کہ جی! آپ نے مجھے بلاقصور مارا ہے۔ میرا کیا جرم تھا کہ آپ نے مجھے تھپڑ مارا اور میری بے عزتی کی؟ تو حضرتؒ نے کنڈی لگا کر ڈنڈا اٹھایا اور کہا: بے عزتی کے بچے! اس کے ساتھ میری پٹائی لگانا شروع کی اور خوب مارا۔ مولانا محمد صاحب نے بمشکل مجھے چھڑایا۔ میں گھر آیا تو والدہ صاحبہ کو شکایت کی کہ مدرسہ میں فلاں استاذ نے مجھے بغیر کسی جرم کے اس طرح دو دفعہ مارا ہے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آپ شور نہ مچائیں، میں والد صاحب سے کہہ دوں گی وہ جا کر پوچھ لیں گے۔ اگلے دن والد صاحب جامعہ تشریف لے گئے، وہاں ایک استاذ سے ملاقات ہوئی کہ بچہ کو یہ شکایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ بے فکر رہیں ان شاء اللہ تعالیٰ معاملہ ہم سنبھال لیں گے۔ شاید انہوں نے حضرت سے کچھ کہا ہو۔ اسی دن دوپہر کو حضرت نے مجھے دار التصنیف بلایا اور ایسی باتیں ارشاد فرمائیں کہ دل عقیدت ومحبت سے لبریز ہو گیا۔

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے، آج تقریباً ۴۰ سال اس کو ہو چکے ہیں لیکن ان باتوں کی لذت ذہن میں تازہ ہے فرمایا کہ:

☆ بیٹے! تم میری اولاد کی طرح ہو، اولاد کے نفع ونقصان کی ہر وقت والدین کو فکر رہتی ہے اور وہ اس کے لئے مناسب سزا کا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ اس میں اولاد کی خیر خواہی ہی ہوتی ہے۔

☆ تم پڑھنے والے ذہین طالب علم ہو۔ اپنا وقت یوں یاری دوستیوں میں لگاؤ گے تو استعداد ضائع کر دو گے۔ طالب علم کے لئے ایسی دوستیاں قائم کرنا کہ باہم دعوتیں کھاتے پھریں، میرے ہاں نا مناسب ہی نہیں زہر قاتل ہیں، ان سے بچنا از حد لازمی ہے۔

☆ اس طرح کی دوستیوں اور تعلقات سے لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جس سے انسان کی شخصیت اور وقار پر برا اثر پڑتا ہے۔

پھر آپ نے مجھے اپنے دست مبارک سے الحزب الاعظم عنایت فرمائی، اس پر اجازت تحریر فرمائی اور فرمایا کہ اسے پڑھا کریں، اس پٹائی اور پھر شفقت کی برکت تھی کہ حضرت سے تعلق، محبت اور عقیدت بڑھتی گئی اور اس کا یہ اثر ہے کہ آج ہم جامعہ جیسے مرکز علم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک بار جب ہم حفظ میں تھے اور بالکل چھوٹے بچے تھے، وضو خانے میں ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے تھے اور اسے ضائع کر رہے تھے۔ حضرت کی نظر پڑ گئی، انہیں یہ اسراف کب گوارا ہو سکتا تھا۔ حضرت نے ہمارے

پیچھے دوڑ لگادی، ہم تو ایسے بھاگے کہ ہوا ہو گئے اور ہاتھ نہیں آئے۔ حضرت کے اس مزاج کی وجہ سے طلبہ بڑے قابو رہتے تھے اور آپ کی غیر موجودگی میں بھی ان پر آپ کا رعب طاری رہتا۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ شرح الوقایہ کی جگہ اپنے مدرسہ میں شرح النقایہ پڑھایا کرتے تھے۔ ہمارے مکتبہ ایچ، ایم سعید کمپنی سے جب شرح النقایہ چھپنا شروع ہوئی۔ تو اس پر اظہار مسرت کے کئی خطوط لکھے۔ آپ نے شرح النقایہ کے اغلاط کی تصحیح فرمائی تھی اور عمدہ فوائد پر مشتمل ایک مختصر حاشیہ بصورت تعلیق رقم فرمایا تھا۔ اس دوران خطوط کے ذریعے مجھے بھی اہم مشوروں اور ہدایات سے نوازتے رہے کہ فلاں فلاں مقامات کی درستگی فرمالیں، فلاں تبدیلیاں کرلیں، اس طرح چھاپیں وغیرہ۔

جامعہ میں قیام کے دوران حضرت کی صحت کافی کمزور تھی۔ جب کراچی میں حضرت صندل بابا جی کے ساتھ آپ تشریف لائے تھے تو بندہ حاضرِ خدمت ہوا اس وقت صحت تو اچھی ہو گئی تھی۔ لیکن سر اور داڑھی کے بال مکمل سفید ہو گئے تھے۔ ہم نے جوانی کا زمانہ دیکھا تھا، اس لئے کافی تبدیلی محسوس ہوئی۔ متواضع ایسے تھے کہ ملنے کے لئے بے تابانہ اٹھے اور جب تک ہم نہ بیٹھے خود تشریف نہیں رکھی۔ ایسی شفقت ومحبت اور عاجزی وتواضع کہ ہم چھوٹوں سے اپنے بڑوں کا سا معاملہ فرما رہے تھے۔ یقیناً وہ سختیاں ہماری تربیت کے لئے تھیں اور جو اس بھٹی سے گزرے، پھر کندن بن کر نکلے اور زمانے میں نام کمایا۔ حضرت کے اخص تلامذہ میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ کی شہادت سے علمی حلقوں میں ایک نہ پر ہونے والا خلا پیدا ہو چکا ہے۔ خصوصاً اپنے علاقوں میں آپ کو جو مرجعیت حاصل تھی وہ بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ حضرت کے ہمارے اوپر جو احسانات ہیں، یہ چند سطور تو ہرگز ان کا حق ادا نہیں کر سکتے، لیکن خریدارانِ یوسف میں نام لکھوانے کے لئے یہ چند باتیں پیش خدمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ہمیں حضرت کی برکات سے محروم نہ فرمائے۔ آمین ثم آمین

استاذ جی کی یادیں

مولانا محمد انور، کراچی

قال اللہ عز و جل: یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین أوتوا العلم درجات، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: موت العالم موت العالم، وقال علیہ الصلاۃ والسلام: فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم وقال اللہ تعالی: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء، وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: الدین النصیحۃ۔

شیخ الحدیث استاذ مکرم ومحترم حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ پر سہ ماہی المظاہر کی خصوصی اشاعت زیر ترتیب ہے، انہوں نے احقر کو حضرت استاذ صاحبؒ کے بارے میں تاثرات لکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت والا کی سوانح عمری کے بارے میں کچھ لکھنا میرے جیسے ناکارہ کے لئے کافی مشکل کام ہے۔ لیکن اپنا حصہ ڈالنے کے لئے کچھ قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔ خالق کائنات اسے قبول فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

آپ میں فطری قابلیت کی انتہا تھی اور قوت حافظہ بھی غضب کا تھا، فطرت نے آپ کو طبع غیور وخوددار عطا کی تھی۔ جس کا اندازہ ہمیں شب وروز کے حالات واقعات سے روز روشن کی طرح ہوتا تھا۔ آپ بے پناہ ذہانت کے

مالک تھے، آپ کا شمار حدیث کے بڑے علما میں ہوتا ہے۔ آپ یکتائے روزگار تھے۔ علم حدیث، علم فقہ اور معقولات میں اپنے اقران پر فوقیت رکھتے تھے۔ کسی نے کیا خوب کہا:

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانہ کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہوکر

آپ بے حد محنتی تھے، آپ نے اپنے عہد کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ علوم اسلامیہ کراچی کے یگانہ روزگار علماء حق سے فیض حاصل کیا، ان کی صحبت سے بھرپور استفادہ کیا اور تحصیل علم میں غیر معمولی محنت، جانکاہی اور عرق ریزی نے آپ کو منفرد اور نامور عالم باعمل بنا دیا۔ صحبت صالح ترا صالح کند اور صحبت طالح ترا طالح کند

دورۂ حدیث کے سال وفاق المدارس العربیۃ پاکستان کے تحت ہونے والے سالانہ امتحان میں پورے پاکستان میں آپ نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے فراغت کے بعد شعبہ تخصص فی الحدیث میں داخلہ لیا اور تخصص فی الحدیث کی تحصیل وتکمیل کے بعد اسی جامعہ میں درس وتدریس کا آغاز کیا، کئی سال تک یہاں درس وتدریس کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

اس حقیر نے بھی ۱۹۷۳ء میں فن منطق کی مشکل ترین فنی اور اہم ترین کتاب سلم العلوم آپ سے پڑھی اور دیگر علوم وفنون میں بھی استفادہ کیا۔ مجلس درس نہایت شاندار اور وسیع تھی، ہر طالب علم کو سوال کرنے کا مساوی حق حاصل تھا۔ دوران تعلیم مجھے یا میرے درجہ کے ساتھیوں کو کسی کتاب کے کسی مقام کو سمجھنے میں اگر کوئی دشواری پیش آتی تو ہم متعلقہ کتاب کے استاذ کے بجائے حضرت نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرتؒ اس مشکل کو بہت آسان الفاظ میں شفقت کے ساتھ ہمیں سمجھا دیتے اور ہماری مشکل کو حل فرما دیتے اور چہرے پر مسرت کے آثار نظر آتے۔ ناگواری کے آثار کبھی نہیں دیکھے، بہر حال تمام رفقاء درس کو اطمینان اور تسلی ہوجاتی، ہر درجہ کے طلبہ اور تشنگان علوم دین ان کے سرچشمہ تحقیق سے فیض یاب ہونے کیلئے ان کی مجلس میں حاضر ہوتے اور علمی فائدہ اٹھاتے رہتے۔

قدرتی بات ہے کہ پڑھنے کے بعد جب پڑھانے کا دور آئے تو مطالعہ ہی ترقی علم وتکمیل علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ شاگردی کی قید سے آزاد ہوکر حضرت شیخ کو بھی اس طرف توجہ ہوئی اور ان کی ذہانت وذکاوت اپنا جوہر عیاں کرنے لگی، کتاب ہاتھ میں آجانے کے بعد مجال کیا تھی کہ بغیر اسے تمام کیے رکھ دیں اور یہی نہیں کہ پڑھ کے بلکہ اسے پورے طور پر سمجھ کر تمام کار آمد حاصل خزانہ دماغ اور گنجینہ حافظہ میں بھر کر چھوڑتے، راتیں جاگ کر کتب بینی میں بسر کرتے۔ اس کے ساتھ آپ بے حد متقی، زاہد، متورع، پاک باطن اور پرہیزگار شخصیت تھے۔

موصوف تبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ظریف الطبع اور خوش مزاج بھی تھے۔انکساری وتواضع آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اپنے تلامذۃ کو بھی سلام کرنے میں پہل کرنے کی پوری کوشش فرماتے اور اکثر اس میں کامیاب ہوجاتے۔

حضرتؒ نے سنت پر ہمیشہ عمل کیا اور اس کو قائم رکھا،شہادت تک ان کی زندگی اس پر قائم رہی۔سنت کی نشر و اشاعت اور بدعت سے نفرت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔اسلام کی ترویج اور احیا کے لئے ان کی خدمات و مساعی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آپ اپنے تمام اساتذۂ کرام سے عقیدت واحترام سے پیش آتے۔ان کا نام انتہائی محبت والفت وادب سے لیتے ،خصوصاً حضرت شیخ الحدیث و مدیر جامعہ علوم اسلامیہ کراچی علامہ محمد یوسف حسینی بنوریؒ سے تو والہانہ عقیدت و محبت تھی اور اسی طرح شیخ الحدیث مولانا فضل محمد سواتیؒ سے گہری محبت تھی اور موصوف سے گہرا قلبی تعلق بھی تھا جو ہمیشہ قائم رہا۔اپنے تمام شاگردوں کے لئے بھی ان کا یہی پیغام تھا کہ اساتذۂ کرام کا حق پہچانیں اور ان کا ادب واحترام کریں۔بے ادب بے نصیب اور باادب بانصیب کا ذکر بھی زبان پر جاری رہتا تھا۔

اپنی ماہانہ تنخواہ کے کم ہونے کے باوجود دوسرے حضرات کے علاوہ طلباء علوم دین اور مہمانانِ رسول کے ساتھ بھی خفیہ طور پر مالی معاونت فرماتے جس طالب علم کے ساتھ مالی معاونت فرماتے تو دوسرے ساتھیوں کو مطلقاً اس کا علم نہ ہوتا،انتہائی اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے مہمانون کے ساتھ فیاضی فرماتے ،کسی نے کیا خوب کہا:

وللناس من کاس الکرام نصیب

ایک دفعہ حضرتؒ کی حیات میں بندہ اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب (سابق مدرس جامعہ فاروقیہ) کو ہنگو آپ کی زیارت کے لئے جانے کا اتفاق ہوا،تو حضرتؒ نے ہماری مہمان نوازی کی حد کردی،حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت پرتکلف کھانوں کی وجہ سے ہم کچھ پریشان ہوگئے تھے۔اسی دوران ہمیں علم ہوا کہ آج حضرت کے بڑے بھائی محترم مسلم الدین صاحب ومحترم معین الدین صاحب دنبہ ذبح کرنے جارہے ہیں۔تو ہم نے مبالغہ کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ دنبہ ذبح نہ کریں،ہم تو صبح وشام گوشت کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔آج سبزی ہوجائے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔لیکن وہ حضرات کہاں ماننے والے تھے،انہوں نے فرمایا کہ ہمارے کام میں آپ مداخلت نہ کریں اور فوراً ایک بڑا دنبہ ذبح کرکے اس کا گوشت پکا کر اور بھون بھان کرلے آئے۔صرف حضرت شیخ کی سخاوت نہ تھی بلکہ پورا خاندان ہی سخی واقع ہوا ہے جس کا مشاہدہ ہم نے جامعہ یوسفیہ ہنگو کے چند روز قیام کے دوران کیا۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب

آپ ہمیشہ متہجدین کی صف میں ممتاز ومقدم تو رہے ہیں لیکن ہم جیسے نااہلوں کو بھی متہجدین بناگئے، تمام شاگردوں سے فرماتے کہ جس جس ساتھی کو نماز تہجد ادا کرنی ہے تو وہ رات کو مسجد کے شمال مشرقی برآمدہ میں سوئے، تاکہ تہجد کے لئے اٹھانے میں آسانی ہو۔ یہ ناکارہ بھی ان رفقا میں شامل تھا جس کو حضرت تہجد کی نماز کے لئے شب کے آخری حصہ میں بے حد پیار وشفقت کے ساتھ نیند سے بیدار کرتے تھے، اس طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری تربیت کا بھی بہت اہتمام فرماتے تھے۔

ویسے تو حضرت کو تمام مدارس دینیہ سے محبت تھی لیکن جامعہ فاروقیہ کراچی اور شیخ المشائخ رئیس جامعہ فاروقیہ حضرت اقدس مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے بے انتہا محبت تھی۔ حضرت کی زیارت کے لئے موقعہ بموقعہ تشریف لاتے تھے اور اپنے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسف اورکزئی (مدیر جامعہ یوسفیہ شاہو وام، ہنگو) کو دورۂ حدیث کے لئے جامعہ فاروقیہ کراچی بھیجا اور اپنے بھتیجے بھانجے اور دیگر طلبا کو بھی دورۂ حدیث کے لئے اہتمام کے ساتھ جامعہ فاروقیہ بھیجا اور اس حقیر وفقیر کو یہ حکم ہوتا تھا کہ یہاں آنے والے ساتھیوں کا اکرام کرے اور جامعہ میں ان کے داخلے کا انتظام کرے۔

حضرت اپنے صاحبزادے کے ختم بخاری کی تقریب میں شرکت کے لئے بھی جامعہ تشریف لائے۔ اسی طرح اپنے بھتیجے اور بھانجے کی ختم بخاری کے موقعہ پر بھی تشریف لائے، ان کا جامعہ فاروقیہ کراچی میں تشریف لانا میرے لئے بڑی سعادت تھی لیکن اب اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہوں۔

رب کائنات حضرتؒ کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ خالق کائنات ان کے تمام شاگردوں، اولاد اور قرابت داروں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں انہی باتوں پر اکتفاء کرتا ہوں۔ رب ذوالجلال تمام علماء امت کو دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے اور ہم سب کو اپنے اسلاف اور اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔ آخر میں اس قطعہ پر اپنا کلام ختم کرتا ہوں:

گلے خوشبوئے درحمام روزے
رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلآویز تو مستم

بگفتا من گلے نا چیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

جامعہ بنوری ٹاؤن کا عظیم فرزند

مفتی خالد محمود، کراچی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ یہ افراد سازی کا کارخانہ اور علما وصلحا کی تربیت گاہ ہے، اس مرکز نے ملت کے ایسے غمگسار پیدا کیے جو دین کے درد میں خود بھی روئے، دوسروں کو بھی رلایا، خود بھی تڑپے، اوروں کو بھی تڑپایا، جو شمع کی مانند خود پگھلتے رہے مگر دوسروں پر ضوافشانی کرتے رہے، خود جلتے رہے مگر مخلوق خدا کو جلا بخشتے رہے، جو خود بے قرار و بے چین رہ کر دوسروں کے لیے راحت کا سامان مہیا کرتے رہے۔

جامعہ نے ایسے جید علماء تیار کیے جن سے علم وعلماء کا وقار قائم رہتا ہے، جو علم کا منبع اور خزانہ تھے اور انہوں نے اقطار عالم میں یہ خزانہ تقسیم کرکے اور تشنگان علم کو سیراب کرکے پوری دنیا میں جامعہ کا فیض پہنچایا، جو صرف علم سے ہی آراستہ نہیں تھے بلکہ عمل کا بھی بہترین نمونہ تھے اور یوں یہ شخصیات علم وعمل کی جامع تھیں اور یہ عمل ہی علم کا اصل نتیجہ ہے ورنہ عمل کے بغیر علم کو غیر نافع کہا گیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پناہ مانگی ہے۔

اس جامعہ نے ایسے مجاہد اور سپاہی تیار کیے جو اسلام کی سربلندی کے لیے کفن بردوش میدان عمل میں اترے اور دین کی حفاظت کے لیے خود بھی قربانیاں دیں اور دوسروں کو بھی قربانی و جاں نثاری کا درس دیا، اس جامعہ نے ہر باطل تحریک کا مردانہ وار مقابلہ کیا، ہر فتنہ کا سر کچلنے میں سر دھڑ کی بازی لگادی۔ باطل نظریات کا رد کیا، لوگوں کے عقائد درست کرتے اور ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ اس جامعہ نے امت کو ایسے صلحا

عطا کیے جن کے دم قدم سے ارشاد وتلقین کی شمعیں روشن اور اصلاح وتربیت کی محفلیں آباد ہوتی رہیں۔

جید عالم دین حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں۔ حضرت الاستاذ گوناگوں صفات کے حامل تھے، علم وعمل کے جامع تھے، معلومات کا خزانہ اور مکارم اخلاق کا نمونہ تھے اور اسی بنا پر مرجع خلائق تھے، زہد وتقویٰ کا پیکر تھے، آپ کا چہرہ انتہائی نورانی تھا اور آپ کی مقناطیسی شخصیت ہر نو وارد کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھی، آپ کا حال وقال سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، بے شمار لوگوں نے آپ کے فیضان صحبت سے فائدہ اٹھایا، آپ مرجع خلائق تھے، اپنی تمام تر صفات وکمالات کے باوجود آپ تواضع اور انکساری کے پیکر تھے، طبیعت میں سادگی کے باوجود نفاست تھی اور مزاج انتہائی نازک تھا، خلاف طبع امور دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔

حضرت مولانا امین صاحب نے دورۂ حدیث کی تعلیم جامعہ علوم اسلامیہ میں حاصل کی، آپ جامعہ میں آئے تو تھے دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے لیکن محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی شخصیت نے آپ کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ حضرت کے آستانہ سے وابستہ ہوگئے اور حضرت بنوری رحمہ اللہ کی زندگی میں آپ کا در نہیں چھوڑا، حالاں کہ کراچی کی آب وہوا آپ کوراس نہیں آئی اور آپ مختلف عوارض کا شکار رہے، آپ نے یہ تمام تکالیف تو برداشت کیں مگر حضرت بنوری رحمہ اللہ کا دامن چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ حضرت الاستاد خود اپنی کہانی سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”۱۳۸۶ھ ذوالقعدہ کا مہینہ تھا، غیب سے نیوٹاؤن کراچی میں آستانہ بنوریہ پر حاضر ہونے کے اسباب پیدا ہوئے اور وقت کی اس نادرۂ روزگار شخصیت کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا جو بیک وقت قافلہ محدثین کے امیر، فقہائے وقت کے سرتاج، صلحائے عصر کے صدر نشین، جماعت علما کے میر محفل مجاہدین تحفظ ختم نبوت کے سپہ سالار اور تمام اہل حق کے سرکردہ تھے۔ پھر پورے گیارہ سال تک جو اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ ہے، اس آشیانۂ قدس سے وابستہ رہنے کے بعد ۳ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ کو اس نابغۂ وقت کے ظل عاطفت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑا۔ آپ کی رحلت سے خرمن عقل پر بجلی گری اور گویا حاصل زندگی ہاتھ سے جاتا رہا۔
>
> آتے وقت دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے چند مہینے قیام کی نیت کی تھی، مگر آنے کے بعد جمال یوسفی نے کچھ ایسا مسحور کیا کہ نہ وطن کا خیال رہا نہ گھر کا۔ نہ صحت کی فکر رہی نہ راحت کی:
>
> کراچی کی آہن خوردہ آب وہوا نے اگر چہ بی سالہ جوانی میں شصت سالہ بوڑھا بنا کر رکھ دیا

اور بجائے صحت کے مرض روز کا معمول بن گیا، مگر حضرت اقدس کی صرف چند لمحوں کی دید یہ سب کچھ بھلاتی رہی۔

بدقسمتی سے یہ سہارا بھی بالآخر جاتا رہا اور اس محبوب از جان و جہاں شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اچانک اس ویرانہ میں ہمیں تنہا چھوڑ دیا، جس کی خاطر ہم اپنے در و دیار کو خیر باد کہہ کر غربت کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ بے کسی اپنا مقدر تھی، ورنہ حضرت تو مثالی مروت کے مالک تھے۔ کہنے والے نے شاید ہماری ہی حالت زار دیکھ کر کہا تھا:

میرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

(بینات بنوری نمبر ص ۶۹۱، ۶۹۲)

حضرت بنوری رحمہ اللہ جو نہ صرف یہ کہ مردم شناس تھے بلکہ افراد کی قدر کرنا جانتے تھے۔ حضرت نے آپ کے جذبہ کی قدر کی اور آپ کو اپنے زیر تربیت لے لیا، آپ ذی استعداد اور صاحب صلاحیت تو پہلے ہی تھے مگر حضرت بنوری کی تربیت نے آپ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور آپ کی صلاحیتوں میں نکھار آتا چلا گیا، حضرت مولانا امین صاحب نے اپنی شبانہ روز محنت، دلجمعی اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت حضرت بنوری رحمہ اللہ کا دل جیت لیا اور آپ حضرت کے معتمد بن گئے یہی وجہ ہے کہ تدریس، نظامت کے ساتھ ساتھ مختلف ذمہ داریاں آپ کو دی گئیں اور جب حضرت بنوری رحمہ اللہ نے اپنے جامعہ میں دار التصنیف کا شعبہ قائم کیا تو حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ کو اس دار التصنیف سے وابستہ کیا یہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کا آپ پر بھرپور اعتماد کا اظہار تھا کیوں کہ دار التصنیف سے وابستگی معمولی بات نہیں تھی، دار التصنیف کے قیام کے وقت حضرت بنوری رحمہ اللہ کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ انتہائی اہم اور عظیم تھے، حضرت خود تحریر فرماتے ہیں:

''الحمد للہ! کہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں ایک مستقل شعبہ تحقیق و تصنیف قائم ہوا، اس طرح یہ دیرینہ آرزو پوری ہوگئی کہ ایک ایسا ادارہ وجود میں آجائے جو نئی نسل کی اصلاح و تربیت اور انہیں عصر حاضر کے الحاد پرور اثرات سے بچانے کے لیے اعلیٰ معیار کی دینی کتابیں شائع کرے۔ شعبہ تحقیق و تصنیف کے سامنے دو اہم مقصد ہیں:

ایک وقتی تقاضوں کے مطابق علمی موضوعات اور مسائل پر تحقیق کرنا اور ان تحقیقات کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانا، دوسرے عمدہ اور بہترین کتابوں کو منتخب کرکے ان کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

ہمیں اپنی کوتاہ سامانی اور کم مائیگی کے ساتھ ساتھ اس راستے کی مشکلات کا پورا احساس ہے،
تاہم اللہ تعالیٰ کی نصرت واعانت کے بھروسے پر اپنے حقیر وسائل کے مطابق کئی موضوعات پر کام
شروع کر دیا گیا ہے، الحمدللہ چار مخلص ومحقق اہل علم واہل قلم اس خدمت کے لیے وقف ہیں۔"

(بصائر وعبر ج ۲، ص

۵۵)

ان چار افراد میں سے ایک حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تھے، آخر میں اس شعبہ سے وابستہ دو افراد ہی رہ گئے تھے، جن میں سے ایک مولانا محمد امین صاحب اور دوسرے امام اہل سنت حضرت مفتی احمد الرحمن رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"دو فضلا علاوہ تدریسی مشغلہ کے "دار التصنیف" سے متعلق ہیں اور تصنیف وتالیف کی ایسی اہم ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں جن کے اہل علم محتاج ہیں۔ یہ ہیں مولانا محمد امین اورکزئی جو مشکلات طحاوی پر کام کر رہے ہیں، اگر یہ کام پورا ہوگیا (ان شاء اللہ العزیز مستقبل قریب میں پایۂ تکمیل تک پہنچنے والا ہے) تو علمی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔" (بینات بنوری نمبر ص ۲۲۵)

حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ جو خود بھی شعبہ دار التصنیف کے اہم رکن رہے ہیں وہ شہادت دیتے ہوئے مولانا امین اورکزئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ رحمہ اللہ نے علمی وتصنیفی کام کے لیے ایک کمرہ دار التصنیف کی حیثیت سے مخصوص فرمایا تھا، جس میں حضرت شیخ رحمہ اللہ کے ساتھ دو اشخاص مشغول کار تھے، ایک برادر محترم جناب مولانا محمد امین صاحب اورکزئی، فاضل درجہ تخصص فی علوم الحدیث ہیں جو شرح معانی الآثار للطحاوی کی احادیث کی تخریج اور مذاہب کا خلاصہ کر رہے ہیں، نہایت اہم اور عظیم الشان کام ہے، بیک وقت فقہ وحدیث کی جلیل القدر خدمت ہے، موصوف پہلی جلد مکمل کر چکے ہیں، آج کل دوسری جلد پر کام کر رہے ہیں، ماشاء اللہ موفق ہیں، اللہ تعالیٰ مزید توفیق، برکت وہمت دے۔"

(بینات بنوری نمبر

ص ۶۱)

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بنوری کے اس انتخاب اور اعتماد کی لاج رکھی اور اپنے آپ کو اس شعبہ کے لیے وقف کر دیا، اگرچہ آپ ایک اچھے اور کامیاب مدرس تھے اور آپ نے تدریس کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا مگر دار التصنیف سے وابستہ ہونے کے بعد آپ ایک دو سبق پڑھایا کرتے تھے مگر

زیادہ وقت اسی شعبہ کو دیا اور ہمہ تن اسی میں مشغول ومصروف رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سی خوبیوں اور اعلیٰ صفات سے نوازا تھا مگر آپ کا نمایاں اور ممتاز وصف ''علم'' تھا، آپ پڑھنے پڑھانے، تعلیم وتعلم سے تعلق رکھنے والے اور تصنیف وتالیف کے آدمی تھے، آپ نے اپنے آپ کو دیگر تمام دلچسپیوں اور دیگر مشاغل سے الگ تھلگ رکھا ہوا تھا، ہم نے آپ کو ہمیشہ تعلیم وتعلم میں ہی مشغول پایا، آپ اپنے تصنیف وتالیف کے شعبہ کا کس طرح حق ادا کرتے تھے اس کا اندازہ شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ کے اس اقتباس سے ملاحظہ کیجیے جو حضرت نے امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی احادیث کی تخریج کے بارے میں آپ کی محنت اور طریقۂ کار کے بارے میں لکھا ہے، حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''تخریج کے سلسلہ میں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ مرفوع احادیث تو اکثر وبیشتر صحاح، سنن، مسانید اور معاجم میں مل جاتی ہیں اور ان کی تخریج کی جاسکتی ہے، مگر طحاوی شریف میں آثار صحابہ بھی بکثرت ہیں اور کتب حدیث سے ان کے مآخذ تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، اس لیے کہ کتب احادیث میں آثار کی تخریج بہت کم ہوئی ہے۔ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن سعید بن منصور وغیرہ میں آثار صحابہ وتابعین کا اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، لیکن مؤخر الذکر دونوں اہم مراجع مکمل صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ مؤلف نے آثار کے تتبع میں ایک طرف تو ان کتابوں کی مراجعت کی، دوسری طرف سنن بیہقی، سنن دار قطنی، المحلی لابن حزم، جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے فائدہ اٹھایا اور پس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دفاتر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

۱: تاریخ بغداد خطیب بغدادی، ۱۴ مجلدات۔ ۲: حلیۃ الاولیاء ابونعیم اصفہانی، ۱۰ مجلدات۔ ۳: طبقات ابن سعد، ۸ مجلدات۔ ۴: تاریخ کبیر امام بخاری، ۸ مجلدات۔ ۵: الکنی، ابو بشر دولابی، ۲ مجلدات۔ ۶: معجم صغیر طبرانی، ۱ جلد۔ ۷: تاریخ جرجان حمزہ سہمی، ۱ جلد۔

اور پھر ان سات کتابوں کی تمام احادیث وآثار کو کتب حدیث وفقہ کی ترتیب میں مرتب کیا۔ مولانا موصوف نے تو صرف اپنی تخریج کے لیے یہ کام کیا تھا، مگر یہ بجائے خود ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جس پر علمی دنیا کو ممنون ہونا چاہیے اور اگر یہ محنت مطبوعہ شکل میں سامنے آجائے تو اہل علم کے لیے گرانقدر تحفہ ہوگا۔'' (بینات بنوری نمبر، ص ۲۴۷، ۲۴۸)

ان گوناگوں صفات اور علم کا منبع ہونے کے باوجود تواضع اور انکساری آپ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی ہمیشہ آپ نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، شہرت اور ناموری سے آپ کوسوں دور تھے، کبھی اپنے آپ کو نمایاں نہیں

کیا، آپ کے متعدد شاگرد اپنے وقت کے شیخ الحدیث، استاذ حدیث اور بہت سے مدارس کے مہتمم ہیں مگر آپ نے کبھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔

جامعہ علوم اسلامیہ سے جانے کے بعد آپ نے اپنے علاقہ میں حضرت بنوری رحمہ اللہ کے نام پر جامعہ یوسفیہ قائم کیا، اس مدرسہ میں شعبۂ تصنیف وتالیف بھی قائم کیا، علاقہ کے لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت تھی، علماء طلبا آپ کو عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، علاقہ میں امن وامان قائم کرنے اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کو ختم کرنے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا مگر بایں ہمہ آپ اس پر کسی صلہ کے متمنی رہے اور نہ ستائش وتعریف کے خواہشمند، آپ حقیقی معنوں میں ''من تواضع للہ رفعہ اللہ'' کا صحیح مصداق تھے۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ آپ کا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا تھا اس لیے ہمارے طالب علمی کے دور میں اسباق بہت کم پڑھاتے تھے، ہماری خوش قسمتی تھی کہ درجہ خامسہ میں آخری دس پاروں کا ترجمہ قرآن کریم کا ہمارا سبق آپ کے پاس تھا، بڑی محنت اور دلچسپی سے سبق پڑھاتے تھے یہ وہ سال تھا جس سال حضرت بنوری رحمہ اللہ کا وصال ہوا، حضرت کے وصال کے بعد آپ نے کوئی سبق اپنے ذمہ نہیں لیا، ترجمہ قرآن کا یہ سبق بھی دوسرے استاذ کے حصہ میں آیا یوں صرف چند ماہ ہی آپ سے سبق پڑھ پائے مگر آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہو گیا۔

ہمارے طالب علمی کے دور میں آپ باقاعدہ ناظم تو نہیں تھے لیکن آپ طلبہ پر بھرپور اور کڑی نظر رکھتے تھے، ان کی اصلاح فرماتے رہتے تھے، خصوصاً وہ طلباء جو محنتی اور ذی استعداد ہوتے تھے ان پر آپ کی خاص نگاہ ہوتی تھی، حضرت الاستاذ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ یہ طلبہ صرف اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دیں اور ایسے تمام مشاغل سے دور رہیں جو پڑھائی میں حارج ہوتے ہیں، اس ضمن میں باہمی دوستی اور باہر گھومنے پھرنے کو تعلیم کے لیے سخت مضر سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں وہ کسی رورعایت کے قائل نہیں تھے اور ان امور پر سخت گرفت کرتے تھے اسی لیے، طلبا میں وہ سخت مزاج مشہور تھے حالانکہ جو طلبا ان کے قریب تھے یا جن کو کسی معاملہ میں ان سے واسطہ پڑا وہ جانتے تھے کہ حضرت تو طلبا پر بہت شفیق تھے اور ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

میرے ساتھ بھی حضرت کا یہی برتاؤ رہا، وہ سمجھتے تھے کہ یہ پڑھنے والا بچہ ہے، عمر بھی زیادہ نہیں ہے، اس لیے دوسرے طلباء سے خصوصاً اپنے سے بڑی عمر کے طلبا سے میل جول اور دوستیاں ان کو پسند نہیں تھیں اس پر ٹوکتے بھی تھے، ڈانتے بھی تھے، لیکن ساتھ ساتھ شفقت اور دلجوئی بھی فرماتے تھے، کئی مرتبہ مجھے انعام بھی دیا، ایک امتحان میں غالباً ششماہی امتحان تھا اسمیں اپنی کلاس میں میری دوسری پوزیشن تھی جبکہ سہ ماہی امتحان میں اول پوزیشن تھی جب

نتیجہ کا اعلان ہوا تو مجھ سے پوچھا کیسا نتیجہ رہا حالانکہ انہیں سب کچھ معلوم تھا، میں نے بتایا کہ الحمد للہ دوسری پوزیشن ہے تو فرمانے لگے جو طالب علم پہلے امتحان کے مقابلے میں کم درجہ پر آجائے ہمارے نزدیک وہ فیل ہے، اس ایک جملہ میں سمجھا دیا کہ محنت کرو، اس دوسری پوزیشن پر خوش مت ہو، تم نے اس سے آگے بڑھنا ہے۔ ایک طرف تو یہ فرمایا اور پھر اسی مجلس میں مجھے ایک کتاب بھی انعام میں دے کر میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی، یہ تھا حضرت کی تربیت کا انداز۔

حضرت خود بھی نیک، متقی، عبادت گزار تھے، معمولات کے پابند تھے، ہمیشہ صف اول میں نماز ادا فرماتے تھے، اسی طرح چاہتے تھے کہ طلباء تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق بھی درست کریں، ان کے اندر بھی صلاح وتقویٰ پیدا ہو اس کے لیے مختلف انداز میں انفرادی کوششیں فرماتے رہتے تھے، کبھی انہیں وعظ ونصیحت فرماتے، کبھی دعاؤں کے اہتمام کی ترغیب دیتے، جو طلبا تلاوت قرآن اور دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کرتے ان سے بہت خوش ہوتے اور مزید انہیں ان چیزوں کی ترغیب دیا کرتے تھے، مجھے بھی ایک مرتبہ فرمایا کہ دلائل الخیرات میں درود شریف کے اچھے اچھے صیغے ہیں اور ہمارے اکابر کے معمولات میں یہ شامل ہے، تم بھی اسے پڑھا کرو، پھر خود ہی کتب خانہ سے بہت عمدہ کاغذ پر طباعت شدہ نسخہ لے کر آئے اور اس پر میرا نام لکھ کر اپنے دستخط فرمائے اور اس کے پڑھنے کا طریقہ بتایا اور روزانہ عصر کے بعد ایک ہفتہ تک ہر روز کی منزل مجھ سے سنی اور جب تمام منزلیں سنا چکا تو فرمایا کہ حضرت مفتی ولی حسن صاحب سے اس کی اجازت لے لو وہ صاحب نسبت بزرگ ہیں، یہ حضرت کی تواضع تھی، ساری محنت آپ نے کی مگر اسے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا فرمایا، الحمد للہ حضرت مفتی صاحب نے مجھے اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس طرح کئی مرتبہ حضرت کی ذانٹ بھی سنی، حضرت سے انعام بھی وصول کیے، حضرت سے دعائیں بھی لیں۔

جب پہلی مرتبہ نثر الازھار کی پہلی جلد طبع ہو کر آئی تو حضرت الاستاذ نے کمال شفقت فرماتے ہوئے اس کا نسخہ مجھے بھی عطا فرمایا اور اپنے دست مبارک سے اس پر لکھا:

''ہدیۂ مودت برائے برادرم محترم جناب مفتی خالد محمود زید مجدہم۔ از محمد امین عفا اللہ ۶/ ۹/ ۱۴۲۰ھ''

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے بعد آپ ان کی جدائی کا غم سہہ نہ سکے، طبیعت ناساز رہنے لگی تو مجبوراً کراچی چھوڑ کر اپنے علاقے میں چلے گئے اور وہاں تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا حالانکہ وہ ایک دور افتادہ جگہ تھی مگر حضرت کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کہ کچھ عرصہ میں آپ کا مدرسہ علاقہ کا ایک بڑا دینی ادارہ بن گیا۔

کراچی سے جانے کے بعد حضرت سے ملاقات کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا کئی بار کوشش کی کہ حضرت سے ملاقات کے لیے آپ کے علاقہ میں جاؤں مگر اپنی سستی و کاہلی کے سبب ایسا نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، جامعہ علام اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں آپ سے ملاقات ہوئی اس وقت اقرأ کے کام کے آغاز کو کچھ عرصہ ہوا تھا، ان دنوں میں تدریس چھوٹ گئی تھی تو ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ تدریس نہیں چھوڑنی چاہیے تدریس ضرور کرو، الحمدللہ حضرت کی نصیحت کے مطابق کچھ نہ کچھ تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے، مقام علیین میں جگہ عطا فرمائے اور حضرت کے علمی، روحانی سلسلوں کو جاری وساری رکھے۔ آمین

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ

بنوری علوم وافکار کا امین

مولانا منظور احمد مینگل، کراچی

احقر تقریباً ۱۹۸۰ء سے جامعہ فاروقیہ کراچی میں زیر تعلیم رہا اور ۱۹۸۷ء میں فراغت حاصل ہوئی۔ اس عرصہ میں کراچی میں سینکڑوں علما، مشائخ اور بزرگان دین کی زیارت نصیب رہی۔ کراچی پاکستان کا وہ شہر ہے جہاں مدارس اسلامیہ کی کثرت اور بہتات ہے، پھر پاکستان کے تمام بڑے ادارے اور اکابر علما کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں موجود ہے۔ ہر ایک کی زیارت اور ہر ایک کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کی کیفیت بدل جاتی ہے، یہاں آنے کے بعد ایک بڑی حسرت اور پریشانی اس بات کی تھی کہ کاش مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع کی زیارت ہو جاتی، لیکن شومیٔ قسمت کہ یہ پاک باز ان خدا ہمارے یہاں آنے سے پہلے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ پھر اللہ پاک نے یہ رحم فرمایا کہ میرے جیسے نالائق کو تقریباً تینتیس ۳۳ سال حضرت رئیس المحدثین مولانا سلیم اللہ خان کی خدمت میں رکھا۔ ۲۵ سال سے زائد احقر تقریباً جامعہ فاروقیہ کا امام رہا اور جامعہ ہی میں استاذ

الحدیث اور مفتی رہا۔ اس دوران مختلف علماء کرام کی زیارت نصیب رہی۔

لیکن جب بھی دوستوں سے ملاقات رہتی اور علماء کرام کا تذکرہ شروع ہوجاتا تو حضرت اقدس مولانا بنوریؒ کا تذکرہ ضرور زبانوں پر آجاتا اور میں اپنے افسوس کا ان کے سامنے بھی اظہار کرتا کہ میں نے تو مولانا کی زیارت نہیں کی۔ ایک دن سرحد کے دوستوں نے یہ فرمایا کہ اگر کوئی بنوریؒ کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ مولانا محمد امین ہنگو والے کو اور ان کے اخلاق اور مبارک چہرے کو دیکھ لے۔ دوران تعلیم اپنے اساتذہ حضرت اقدس مولانا محمد انور مانسہروی (استاذ الحدیث جامعہ فاروقیہ) اور برادر مکرم مولانا عطاء الرحمن شہید (مدرس جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی) سے بھی کئی دفعہ حضرت اقدس مولانا محمد امینؒ کا تذکرہ سننے کا موقع ملا اور ہمیشہ اس کا اشتیاق رہا کہ یا اللہ! وہ کون سی ایسی شخصیت ہے کہ جن کی شفقتوں اور عظمتوں کا اس قدر تذکرہ کیا جارہا ہے؟ اور وہ کون ہے جو حضرت اقدس مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا منظور نظر رہا ہے اور جس پر حضرت بنوریؒ کا علمی اعتماد رہا ہے؟ کاش! میں مولانا محمد امین صاحب کو دیکھ لیتا۔

پہلی زیارت وملاقات:

اللہ کا کرنا تھا کہ ۲۰۰۱ء میں اچانک کراچی میں اعلان کیا گیا کہ ایک معمر بزرگ جسے صندل بابا جی کہتے ہیں، کراچی تشریف لائے ہیں، احقر ان دنوں جامعہ فاروقیہ کے درجہ علیا کے اساتذہ میں سے تھا، زیارت کے لئے بنوری ٹاؤن حاضری دی، پھر حضرت صندل بابا جی جامعہ فاروقیہ تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین اور نورانی چہرے کا مالک، اخلاق کا پیکر، عاجزی اور انکساری میں ڈوبا ہوا شخص تھا، بڑے اکابر شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان اور صندل بابا جیؒ کے سامنے اس طرح بیٹھا ہوا تھا گویا کہ ایک چھوٹا شاگرد استاذ کے سامنے بیٹھتا ہے، میں سمجھا کہ شاید کوئی عام تبلیغی غیر عالم بزرگ ہوگا کہ اکابر کے سامنے اس طرح خاکساری کا اظہار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اکابر دیوبند سارے کے سارے نورانی چہروں کے مالک اور ہر ایک کی خوشبو الگ اور مہک میں جدا ..... لیکن اس مجلس میں زیادہ تر توجہ لوگوں کی اس فقیر کی طرف تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوگیا کہ یہ جاذب نظر جس کی طرف دل خود بخود کھنچ جاتا ہے اس کو بنوریؒ کا شاگرد اور ان کے علوم وافکار کا امین کہا جاتا ہے اور آپ ہی شیخ الحدیث عارف باللہ محمد امین کے نام سے مشہور ہیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ جامعہ فاروقیہ کے چھوٹے درجات کے ایک دو استاذ آپ کے آگے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ان کے پیچھے بیٹھے رہے۔ اس مجلس میں حضرت صندل بابا جیؒ سے بہت بڑے علما اور عوام میں سے بھی ایک بڑی تعداد نے بیعت کی۔ یقین جانیے کہ میری پہلی نظر جب اس فقیر اور مسکین

اور تواضع کے پیکر مولانا محمد امینؒ پر پڑی، آپ کی روحانیت تھی یا خصوصی توجہ..... مجھے یاد نہیں کہ پھر میری نظر آپ (امین شہیدؒ) سے گزر کر صندل بابا جی یا دیگر کسی اور عالم پر پڑی ہو بلکہ میں تو ان ہی کا گرویدہ ہو کر رہ گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

خاموش پیر:

حدیث میں اللہ والوں کی نشانی موجبہ کلیہ کی شکل میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ "اللذین اذا راو ذکر اللہ" کہ جب ان پر نگاہ پڑتی ہے تو خدا یاد آجاتا ہے، حضرت اقدس مولانا محمد امینؒ خالص اسی کے پیکر تھے اور اس زمانے میں اس حدیث کی تفسیر اور اس کا مصداق تھے۔

میری بدبختی سمجھیں یا حماقت کہ جہاں صندل بابا جی کا بیان ہوتا اور لوگوں کو بیعت کراتے تھے بلکہ حضرت اقدس امین شہیدؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف دامت برکاتہم مجھے کبریا مسجد لے گئے اور قاری قاسم صاحب کے گھر حضرت صندل بابا جی سے دم بھی کرایا۔ مگر امام النحو حضرت فراء کی طرح جنہوں نے یہ فرمایا تھا کہ "اموت وفی قلبی عن حتی شیء" مروں گا مگر لفظ حتیٰ کے بارے میں تردد رہے گا۔'' میرا حال بھی یہی تھا کہ مجھے بھی حضرت صندل بابا جی کی توجہ قائل نہ کر سکی اور لوگوں کی دھڑا دھڑ بیعت کا بھی مجھ پر اثر نہ ہوا، مگر اس خاموش پیر (مولانا محمد امینؒ) نے باوجود خاموشی اور سکوت کے میرا دل جیت لیا۔

ہمارے رئیس المحدثین مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت فیوضہم حضرت خواجہ خان محمدؒ (کندیاں شریف) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دس دن ان کی خانقاہ میں رہا، وہاں سوائے خاموشی کے اور کچھ سامنے نہیں آیا، مگر ان کی خاموشی مستقل ایک درس تھی، یہی حال میرے حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کا تھا۔

حضرت اقدس سے احقر کا رشتہ:

احقر چونکہ ایک خانہ بدوش، اونٹ چرانے والا شخص ہے جن شخصیات کی طبیعتوں میں جلال اور سختی رہی ہے، آج تک ان سے طبعی مناسبت بالکل نہیں رہی۔ خدا تعالیٰ میرے جیسے نالائق کو بزرگوں کی جوتیوں میں جگہ دے، میری سعادت ہوگی، لیکن جن بزرگوں کی طبیعتوں میں جلال ہوتا ہے ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت اقدس کی طبیعت میں جلال اور غصہ دور تک نظر نہیں آیا، اس لئے احقر تو آپ کے ہاتھ پر بک گیا اور آج تک یہ فروخت شدہ مبیع واپس نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ آپ ہی کا گن گاتا رہا۔

آپ کی فقیہانہ اور محدثانہ شان:

آپ ایک عام عالم نہیں تھے بلکہ ایک عظیم محدث بھی تھے۔ جو لوگ علم حدیث پڑھاتے ہیں ان سے یہ بات کسی طرح مخفی نہیں کہ علم فقہ کے بغیر حدیث پڑھانا بالکل ایک نامعقول بات ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حدیث کی معرفت کے ساتھ علم فقہ سے بھی ایک عظیم حظ وافر عنایت فرمایا تھا۔ ایک حدیث کے مختلف طرق اور اسانید کا علم آپ ہی کا طرۂ امتیاز تھا، آپ کی مجلس اور رفاقت میں حدیث کا جواب عقلی ڈھکوسلوں سے کبھی بھی نہیں سنا بلکہ جواب الحدیث بحدیث آخر اور اصول حدیث کی روشنی میں دیا کرتے تھے۔ یہ شان اور یہ طریقہ اپنے زمانے کے بہت کم محدثین میں پایا جاتا ہے۔ جامعہ فاروقیہ میں ایک طویل عرصہ احقر نے دورۂ حدیث میں پڑھایا ہے، ابوداؤد شریف کا ایک درس رفع الیدین سے متعلق حضرت اقدس کو شاید کیسٹ کے ذریعہ کسی نے سنادیا تھا، بہت حوصلہ افزائی فرمائی، شاباش دی، نیز جو خامی تھی وہ بھی آپ نے بتادی۔

آپ اپنے مذہب حنفیت میں یقینا متصلب تھے لیکن متشدد ہرگز نہیں تھے، احادیث صحیح کا تناقض اور تعارض پیش کر کے حدیث صحیح کو متروک قرار دینا آپ کا ہرگز وطیرہ نہیں تھا۔ اتنی بڑی شان اور علم کے مالک ہونے کے باوجود اعجاب ذی رأی برأیہ کے مصداق سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوسوں دور رکھا تھا، خود اکابر میں سے ہوتے ہوئے اکابر کے علوم کے سامنے اپنے آپ کو مٹا چکے تھے اور حد درجہ اپنے اکابر کے معتقد اور ان کی تشریحات کا حوالہ دینے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔

ایک عجیب واقعہ:

اللہ تعالیٰ حضرت کے صاحبزادوں کی دستگیری فرمائے ''الولد سر لابیہ'' کے قاعدے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے حضرت کو بیٹے بھی ایسے ہی عطا فرمائے ہیں کہ ماشاء اللہ اپنے والد ماجد کی نیک نامی کا سبب اور ذریعہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مزید ترقیوں سے نوازے۔ برادر مکرم مولوی یوسف صاحب نے حضرت اقدس کو شاید بتایا تھا کہ منظور احمد مینگل میرے استاذ ہیں، اسی لئے حضرت کی شفقتیں مجھ پر بہت ہی زیادہ رہا کرتی تھیں۔

احقر جامعہ فاروقیہ میں چوبیس سال کے لگ بھگ مدرس رہا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت فیوضہم کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ انہوں نے میری حماقتوں کے باوجود مجھے سینے سے لگائے رکھا اور ترقی دینے میں اور بڑے اسباق دینے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ احقر کے مزاج کا ہر ایک کو علم ہے کہ حضرت شیخ الحدیث رئیس المحدثین مولانا سلیم اللہ خان جیسے عظیم محدث کی صحبت میں رہتے گزرتے پھر بھی مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بات بالکل واضح ہے کہ سورج کا قصور نہیں سارا قصور چشم انسان کا ہے۔ اس طرح تیس پینتیس سال

اپنے شیخ حضرت اقدس سلیم اللہ خان کی نہ کوئی خدمت کر سکا نہ آپ کے فیوضات سے کما حقہ استفادہ کر سکا، اللہ تعالیٰ ان کے جوتوں کی برکت سے میری ان کوتاہیوں کو معاف فرمائے، ایک طویل عرصہ تدریس کرنے کے بعد میں نے اپنے چند عوارض کی وجہ سے جامعہ فاروقیہ چھوڑنے کا ارادہ کیا تو حضرت اقدس مولانا امین شہیدؒ کے صاحبزادے مولوی یوسف صاحب نے انہیں بتایا کہ میرے استاذ مولانا منظور احمد مینگل صاحب کچھ پریشان ہیں اور فاروقیہ کو خیر باد کہنا چاہتے ہیں، یہ ۲۰۰۰ء کے بعد کا واقعہ ہے، حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ نے مجھے فون کر کے فرمایا کہ بیٹا! میں آپ کو شیخ سلیم اللہ خان صاحب کی صحبت چھوڑنے کا مشورہ کبھی بھی نہیں دوں گا، فاروقیہ نہ چھوڑو لیکن اگر ہر صورت میں جانا ہے اور آپ جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہاں سرحد (موجودہ خیبر پختون خواہ) آجاؤ۔ ایک مدرسہ میں آپ کو دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں دی جائیں گی، آپ کے لئے مکان، گاڑی اور ماہانہ پچاس ہزار وظیفہ مقرر ہے۔ آپ کے بیٹے مولوی یوسف صاحب کو اس کا بخوبی علم ہے۔ احقر نے معذرت کر لی کہ حضرت سرحد بہت دور ہے، میرے لئے مشکلات ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت پاکستانی پیسے کی کچھ قیمت بھی تھی، یہ سب کچھ میری عدم موجودگی میں طے کرنا اور میرے جیسے نالائق کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ، اب ان باتوں کو یاد کر کے خون کے آنسو رو رہا ہوں کہ ہمارے اکابر کتنے کھلے دل کے مالک تھے اور کیسے اپنے نالائق شاگردوں اور روحانی اولاد کی نگہداشت فرماتے تھے۔

ایک پروپیگنڈے کا ازالہ:

سطور بالا میں میں نے عرض کیا کہ میں نے اپنے کچھ عوارض کی وجہ سے فاروقیہ چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن آج کل بعض حضرات نے یہ مشہور کیا ہوا ہے کہ مولوی منظور مینگل کو شیخ سلیم اللہ خان صاحب نے مماتی ہونے کی وجہ سے فاروقیہ سے نکالا ہے، میری طرف سے ان حضرات کے لئے یہ دعا ہے کہ **ھداھم اللہ وایای والا اغرقھم کما اغرق آل فرعون**۔ یقیناً میری طبیعت میں نرمی ہے۔ میری نشست و برخاست ختم نبوت، سپاہ صحابہ، جمعیت علماء اسلام (ف) جمعیت علمائے اسلام (س) تبلیغی جماعت، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کے شاگردوں کے ساتھ رہتی ہے اور رہے گی، ان شاء اللہ۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ میں مماتی ہوں ان لوگوں کا عقلی فتور ہے، اس افتراء اور بہتان کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں سے لے گا اور بعض سے اللہ تعالیٰ لے بھی چکا ہے۔

میں مولانا عبدالکریم (بیر شریف والے)، حضرت مولانا عبدالصمد ہالیجوی، حضرت مولانا حافظ نور محمد صاحب (خلیفہ مجاز حضرت شاہ حکیم محمد اختر) سے بیعت ہوں۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی جمعیت سے میرا تعلق رہا ہے اور

رہے گا۔ رئیس المحدثین شیخ سلیم اللہ خان، مفتی سعید احمد پالنپوری محدث اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت اقدس علامہ انظر شاہ محدث دارالعلوم دیوبند، مولانا شیر علی شاہ صاحبؒ، عارف باللہ حضرت اقدس عبدالکریم بئر شریف والے، دکتور تقی الدین اور دیگر علماء عرب وعجم کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جن سے اجازت حدیث احقر کو حاصل ہے۔ اس طائفہ منصورہ کو چھوڑ کر مجھے پنج پیری بنانے اور بتلانے میں ایک گھناؤنی سازش کے سوا اور کچھ نہیں۔ میری پوری صحاح ستہ کے دروس اور تفسیر قرآن کی ریکارڈنگ موجود ہے کسی بھی تقریر میں اس کی نشاندہی کی جائے میں مان جاؤں گا ...... ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک جاہل اور اردو مناظر نے شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کو مرزا غلام اللہ کہا تھا، اس پر میں نے اس کی ذرا خبر لی تھی، اس پر اس نے مشہور کردیا کہ یہ پنج پیری ہے۔ اب قارئین اس بہتان بازی کا خود ہی جائزہ لیں ...... میں نہ ہی پنج پیری ہوں، نہ پنج پیر میں پڑھا ہے، اور نہ پنج پیر کا علاقہ دیکھا ہے اور نہ دیکھوں گا۔ الغرض میرا تعلق تادم حیات حضرت شیخ مولانا محمد امینؒ جیسی اہل حق کی عظیم ہستیوں کے ساتھ رہا ہے اور رہے گا۔ میرا دماغ خراب ہے کہ اولیاء اللہ کی اس جماعت کو چھوڑ کر اکابر کی توہین کرتا پھروں اور اپنی عاقبت تباہ کروں۔ بہر حال استاذی المکرم شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان اور حضرت اقدس مولانا محمد امینؒ سمیت تمام اکابر علماء دیوبند اور دیگر محدثین اور مفسرین کرام میرا قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں جن کی عقیدت اور تعلق کو باعث نجات سمجھتا ہوں۔

کئی دفعہ ارادہ کیا کہ کوہاٹ ہنگو جا کر آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کریں اور علوم حدیث، علوم تفسیر، فقہ میں آپ سے استفادہ کریں۔ مگر خدا غارت کرے ان پاکستانی بھیڑیوں کا، جنہوں نے ہم سے اس وارث نبی کو چھین کر امت مسلمہ کو ایک روحانی باپ سے محروم اور یتیم کرایا۔ وہ تو یقیناً آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس اپنے جسم کے ٹکڑوں کو لے کر اپنی مظلومیت ثابت کر کے جنت کے بہاریں لوٹ رہے ہوں گے اور آپ کو شہید کرنے والے اور قرآن کو جلانے والے ابوجہل وعتبہ کی سنت ادا کر کے جہنم کے ایندھن بنیں گے، اللہ تعالیٰ میرے جیسے لاکھوں مسلمانوں پر رحم کرے اور صبر جمیل عنایت فرمائیں، آپ کے صاحبزادے برادر مکرم مولانا یوسف کی دستگیری فرمائیں، آپ کا صحیح جانشین بنادے اور آپ کو اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، آپ کے علمی کمالات اور تحقیقات کا ایک وسیع باب ہے، اس کے لئے موقع ملا تو کسی اور وقت کچھ تحریر کروں گا، اس وقت قلم ہاتھ میں لیتے ہی دل کے زخم پھر تازہ ہوگئے، ہمت نہیں ہاری، پر دل ودماغ ساتھ نہیں دے رہے ہیں، یا اللہ! ہمارے حضرت کو ہمارا سلام پہنچا اور ان کی پاکیزہ روح کو ہم سے راضی کرلے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلا۔ آمین یارب العالمین

دیدہ ور

مولانا سید محمد رزین شاہ، کراچی

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

استاذنا الکریم، شیخ المشائخ، مفکر اسلام، محدث زماں سیدی ومرشدی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ایسی خوبیوں اور کمالات کے حامل تھے کہ اگر میں یہ کہوں کہ میری آنکھوں نے ایسی جامع کمالات شخصیت نہیں دیکھی تو

مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا شہیدؒ کے شیخ اور استاذ محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ کو ہم نے اس وقت دیکھا جب ہم سن شعور کے اس مرحلے میں تھے جہاں کسی شخصیت کا کما حقہ ادراک نہیں ہو پاتا۔ مگر بعد میں حضرت کی وفات کے بعد" ماہنامہ بینات" کے خاص نمبر اور دیگر رسائل وجرائد میں حضرت کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے جن میں حضرت کی علمیت، تقویٰ، طہارت، استغنا، جامعیت کے جو اوصاف بیان ہوئے اسی طرح ہمارے اساتذہ ومشائخ نے حضرت بنوریؒ کے مذکورہ اوصاف وکمالات سے متعلق جو واقعات وشواہد بیان کئے ان سے حضرت کی شخصیت کا جو نقش ذہن میں رقم ہوا، اس کا عکس جمیل اگر کسی دوسری شخصیت میں نظر آیا تو وہ حضرت مولانا امین صاحب شہیدؒ تھے۔ مولانا امین شہیدؒ نے حضرت بنوریؒ کی ایک ایک ادا کو اپنی نگاہ عقیدت ومحبت میں نہ صرف محفوظ کیا ہوا تھا بلکہ اپنے عمل اور کردار کا حصہ بنا لیا تھا اور دیکھنے والا دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ یہ گل سرسبد چمنستان بنوریؒ کا پروردہ ہی ہوسکتا ہے۔ راقم کا داخلہ جب جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ہوا تو اس وقت حضرت مولانا امین صاحب شہیدؒ دار الاقامہ میں طلبہ کے نگران ہوتے تھے۔ حضرت کی پر وقار شخصیت کا کچھ ایسا رعب ذہن پر طاری ہوگیا کہ کبھی حضرت کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر سبق کے دوران آپ کے درس میں زبردست علمی تحقیقات، دلچسپ نکات، قیمتی نصائح اور شاندار انداز تربیت سے دیگر طلبہ کی طرح میں بھی انتہائی متاثر تھا۔

حضرت کی عقیدت ومحبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہوگئی تھی اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہماری فراغت سے پہلے ہی حضرت اپنے آبائی علاقہ ہنگو تشریف لے آئے اور وہاں ۱۴۰۰ھ میں جامعہ یوسفیہ کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں حضرت سے خط وکتابت کے ذریعے اصلاح ومشورہ لینے کا سلسلہ قائم تھا۔ فراغت کے بعد خوش قسمتی سے چار سال تک آنجناب کی نگرانی اور سایۂ عاطفت میں جامعہ یوسفیہ ہنگو میں درس وتدریس کی توفیق ملی اور آپ کو انتہائی قریب سے دیکھا۔ اس دوران آپ کی ان بے مثال خوبیوں کا بھی مشاہدہ ہوا جن کو آپ دیگر اہل اللہ کی طرح اخفا میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کے اندر اخلاص للّٰہیت اور دینی حمیت اس درجہ کی تھی کہ الفاظ میں اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔

حضرت کے علاقے میں بعض بدعات ومنکرات رائج تھیں اور وہاں کے بہت سے علما مصلحتاً ان کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ حضرت نے بلا خوف لومۃ لائم بدعات کے خلاف کام کیا، انہیں بہت سی مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن اس مرد مجاہد کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ باطل نظریات کے

خلاف تادم شہادت برسرپیکار رہے اور حق بات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ جہاں علم وتحقیق کے میدان کے شہسوار تھے وہیں انتہائی متقی، پرہیزگار، اور شب زندہ دار بھی تھے۔ سردی ہو یا گرمی سفر ہو یا حضر تہجد کی پابندی فرماتے۔ رات تین بجے اٹھنے کا مستقل معمول تھا۔ سنتوں کی پابندی اور مستحبات تک کے التزام میں اپنی مثال آپ تھے۔

آپ خود بھی اخلاص وللہیت کا مجسمہ تھے اور اپنے حلقہ احباب میں بھی اس کی تلقین فرماتے۔ خود بھی خالص اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھ کر علوم دینیہ کی تدریس کرتے اور آپ کے مدرسے کے بیشتر اساتذہ آپ کی اقتدا میں یہ خدمت بلاتنخواہ سرانجام دیتے۔ اس سلسلہ میں حضرت کے توکل علی اللہ کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ طلبہ کا وظیفہ ختم ہوگیا، حضرت نے اتفاقاً اس کا ذکر کیا، راقم نے پوچھا کہ حضرت اب کیا ہوگا؟ تو فرمایا: اللہ تعالیٰ چلاتا ہے، یہ نظام اگر اللہ کی مشیت میں نہ ہوا تو ہم یہ مدرسہ بند کردیں گے۔ ہم اپنی وسعت واستطاعت کے مطابق کام کرنے کے پابند ہیں۔

حضرت کے توکل علی اللہ کا ایک مظہر آپ کی بے مثال سخاوت، دریا دلی اور مہمان نوازی بھی تھی۔ آپ کے پاس کہیں سے بھی کوئی رقم ہدیہ وغیرہ کی شکل میں آتی تو آپ اپنے مہمانوں اور طلبہ واساتذہ پر بے دریغ لٹادیتے۔ ایک دیہاتی اور دورافتادہ علاقہ میں ہوتے ہوئے بھی آپ اپنے ہاں آنے والے مہمانوں کے لئے جن کی تعداد کچھ کم نہیں ہوتی تھی بلکہ ملک اور بیرون ملک سے بھی آپ کے تلامذہ وعقیدت مند ملنے آیا کرتے تھے، مہمان نوازی کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش فرماتے اور مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچانے کے لئے ہرممکن سعی فرماتے۔ محبت، کرم نوازی اور خلوص وہمدردی گویا آپ کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے جس بے پناہ علمی قابلیت سے نوازا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ محدث العصر حضرت علامہ یوسف بنوریؒ جیسی شخصیت نے آپ کو اپنے تحقیقی کاموں میں خصوصی معاون مقرر فرمایا تھا اور آپ کے اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "یہ دونوں میرے دو بازو ہیں"۔ آپ کی علمی قابلیت، دقت نظر اور ذوق تحقیق کا ایک شاہکار "نثر الازھار علیٰ شرح معانی الآثار" کی صورت میں علمی حلقوں سے داد وتحسین وصول کرچکا ہے اور قیامت تک کے لئے آپ کی یادگار کے طور پر زندہ رہنے والی کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شہیدؒ کو اگر اپنے علاقے کے مخصوص معروضی حالات اور مذہبی وعلاقائی مسائل کا سامنا نہ ہوتا اور یکسوئی کے ساتھ تدریس وتصنیف کا موقع ملتا تو شاید آپ کی تصنیفات کا کوئی شمار نہ ہوتا۔

حضرت شہیدؒ کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق تھا اور مطالعے کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیان ۲۰۰

صفحات کا ایک علمی رسالہ نہ صرف پڑھ کر ختم کیا بلکہ حاشیہ پر تنقیدی تبصرہ بھی لکھا۔

المختصر حضرت استاذ نا المکرم بہت بڑی خیر کی نشانی اور بہت سی نایاب صفات وکمالات کا مجموعہ تھے۔ان کی ذات سے ان کی زندگی میں ایک جہاں نے علمی وروحانی فیض حاصل کیا اور ان کی یاد میں ہم جیسے ہزاروں نیاز مندگان کے لئے زندگی کا بڑا اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔اللہ تعالیٰ حضرت شہیدؒ کی مظلومانہ شہادت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے ،اللہ ہم سب کو حضرت استاذ محترم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔غالب کے اس شعر پر معذرت کے ساتھ یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔

ورق تمام ہوئے اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

ہنگو کے قطبین

مفتی ابولبابہ شاہ منصور، کراچی

سب انہیں حضرت استاذ صاحب کہتے تھے۔یہ لقب ان کے ساتھ ایسا جچا کہ جب ان کے شاگرد یا متعلقین آپس میں گفتگو کے دوران یہ لفظ بولتے تو خود بخود سب کے ذہنوں کے پردے پر ان کی بارعب،اصول پسند اور علم دوست شخصیت کی پرچھائیں اپنا نقش بکھیر دیتی تھیں۔بندہ نے ان کو پہلی بار آج سے تقریباً تیس سال پہلے اس وقت دیکھا جب سب طلبہ انہیں حضرت ناظم صاحب کہتے تھے۔۸۰ء کی دہائی کے شروع میں جب بندہ حفظ قرآن کی

تکمیل کر کے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخل ہوا تو حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ تعالی رحمۃً واسعۃً جامعہ کے ناظم تھے۔ نظم پر ان کی گرفت اتنی مکمل اور ہر معاملے پر نظر اتنی گہری اور باریک بینی سے تھی کہ طلبہ کی کسی کوتاہی سے ان کی نظر چوکتی تھی نہ کسی طالب علم کو نظم کی خلاف ورزی کی ہمت ہوتی تھی۔ ان کی نظامت کا زمانہ نظم وضبط، اوقات کی پابندی، اسباق کی حاضری اور اصولوں کی پابندی کے لحاظ سے جامعہ بنوری ٹاؤن کی تاریخ کا ممتاز ترین دور سمجھا جاتا ہے۔

دوسری بار کئی سالوں کے بعد جب ان کی زیارت ہوئی تو وہ جوانی کے دور کے حضرت ناظم صاحب نہ رہے تھے، اب ان کو تمام شاگرد اور معتقدین 'استاذ صاحب' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی علمی خدمات، تدریسی مصروفیات، تصنیف اور تالیف کا ذوق اور دنیا سے ہٹ کٹ کر اپنے علمی واصلاحی اور روحانی مشاغل میں مصروفیت نے انہیں بیک وقت عظیم مدرس، محدث، مصنف، شیخ کامل اور مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ وہ سب کے استاد صاحب تھے۔ سب کے ہمدرد، سب کے خیر خواہ۔

غیرت، خودداری اور مہمان نوازی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خوددار اتنے کہ ان کو ہدیہ پیش کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ مہمان نواز ایسے کہ بغیر اطلاع کے عام مہمان بھی چلا جائے تو چار قسم کے کھانے، چار پانچ قسم کے لوازمات کے ساتھ ذرا سی دیر میں آجاتے تھے۔ حضرت خود دسترخوان کے ایک طرف بیٹھ جاتے تھے۔ سب مہمانوں پر نظر رکھتے جس کی رفتار ذرا سست ہوتی، اسے دسترخوان پر موجود سادہ اور کثیر مقدار میں کھانے کی طرف باری باری توجہ دلاتے جاتے، جب کھانے والے سیر ہوجاتے تو اب حضرت کا اصرار شروع ہوجاتا، یہ چیز تھوڑی سی اور لے لو، یہ چیز تو آپ نے بالکل نہیں لی۔ آپ پرہیز تو نہیں کرتے؟ آپ کے لیے کچھ اور لے آئیں؟ سمجھ نہیں آتا کہ معیشت کی تنگی اور اشیا خورد ونوش کی عدم دستیابی والے اس علاقے میں اتنی جلدی اتنی ساری چیزیں اتنی وافر مقدار میں کیسے تیار ہوکر آجاتی ہیں؟

ہمارے ہاں شہروں میں باقاعدہ دعوت میں اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مہمانوں کی عام آمد ورفت پر ان حضرات کے ہاں ہوتا تھا۔ اس سادگی اور بے تکلفی سے جو لطف آتا ہے اور روحانی تسکین ہوتی ہے، وہ ہمارے ہاں تکلف اور تصنع میں کہاں نصیب ہوسکتی ہے؟ ہمارے ہاں تکلف کی وجہ سے فطرت دب جاتی ہے اور دکھاوا ابھر آتا ہے۔

حضرت کو علم حدیث کا انتہائی شغف تھا۔ اللہ تعالی نے اس میں انہیں اتنا تبحر عطا فرمایا تھا کہ ان سے رابطہ رکھنے والے ملک بھر کے شیوخ الحدیث مشکلات الحدیث کے حل کے لیے ان سے رابطہ کرتے تو تشفی پا کر لوٹتے۔ کوئی روایت دستیاب نہ ہورہی ہو یا راوی کے احوال کا علم نہ ہورہا ہو یا علوم الحدیث کے حوالے سے اور کوئی مسئلہ زیر بحث

ہو، حضرت کی نظر اس فن پر اتنی وسیع اور ہمہ گیر تھی کہ اس فن میں عمریں صرف کر دینے والے اہل فن کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی تو آپ ہی کی طرف رجوع فرماتے تھے۔

حضرت کا وسیع وعریض کتب خانہ تھا۔ اس میں شاید کوئی کتاب ایسی ہو جو حضرت کے مکمل مطالعے سے نہ گزری ہو۔ اس کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا تھا جو حضرت ہر کتاب کے اندر اور شروع کے صفحے پر ذکر فرماتے تھے۔ تعجب اس پر ہے کہ جو کتابیں بیس بیس، پچیس پچیس جلدوں پر مشتمل تھیں۔ ان کی ہر جلد پر حضرت کے حواشی اور یادداشتیں لکھی ہوئی ملتی تھیں۔ بڑے شہروں کے علمی سرگرمیوں سے اور پہاڑوں کے دامن میں گوشہ نشین اس فقیر بے ریا کے علمی شغف اور استحضار کی شاید ہی کوئی اور مثال ہو۔

حضرت روحانی اعتبار سے بھی بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ آپ کا روحانی تعلق حضرت صندل بابا جی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے تھا۔ آپ اور آپ کے استاد محترم حضرت مولانا عبداللہ بابا جی صاحب رحمہ اللہ کو اہل نظر اس علاقے کے ''قطبین'' سمجھتے تھے۔ استاذ شاگرد دونوں سفید ریش دونوں معمر اور دونوں کے سینکڑوں ہزاروں شاگرد اور باہمی احترام ومحبت واعتماد کا یہ عالم کہ باید وشاید۔ یہ عاجز اس منظر کو تو کبھی بھول ہی نہیں سکتا، جب حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کے یہاں برادرم مولانا سید عدنان کاکاخیل کی معیت میں حاضری ہوئی اور عشاء کی نماز پڑھ کر حضرت فارغ ہوئے تو دیکھا کہ حضرت خلاف معمول سلام پھیرتے ہی اپنے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں، حاضری دی تو معلوم ہوا علاقہ کا یہ قطب اور ہزاروں مریدین کا شیخ اپنے ہاتھوں سے ہم جیسے مہمان طالب علموں کے لئے بادام توڑنے اور شہد طشتریوں میں ڈالنے میں مصروف ہے۔ جب کہ اسی حجرے میں کوئی سردار، وڈیرا یا خان آجاتا تو حضرت اپنی مسند پر تمکنت سے تشریف فرما رہتے اور کمال استغنا کا پیکر بنے رہتے۔

استاذ وشاگرد دونوں ایک ہی شیخ سے بیعت تھے اور علمی، تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کے باوصف اپنے اوقات کا بیشتر حصہ عبادات اور معمولات میں صرف ہوتا تھا۔ رمضان المبارک تو اعتکاف میں گزرتا تھا۔ اس دوران کسی سے بات چیت بھی کم ہی فرماتے تھے۔ ظاہری علوم میں اتنے رسوخ کے ساتھ باطنی مقامات میں اتنا عروج جو پرانے زمانے کے اہل اللہ کی یاد دلاتا تھا۔ ان کے تقویٰ اور للّٰہیت نے انہیں مرجع خاص اور عام بنا دیا تھا۔ اس اشاعت میں ان شاء اللہ ان بزرگوں کے تفصیلی احوال آجائیں گے، یہ عاجز تو عقیدت کے دو آنسو ان دونوں عظیم المرتبت ہستیوں کی خدمت میں بہانا چاہتا تھا، سو دل کا بوجھ ... جو ظاہر ہے ان چند لفظوں سے اتر نہیں سکتا ..... ہلکا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان مبارک ہستیوں کی برکت سے ہمیں محروم نہ فرمائے اور تمام پسماندگان کو ان کے مشن ومقصد کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نجانے حضرت استاذ مولانا محمد امینؒ کی شہادت کا غم کتنے سینوں میں گھائل کر گیا۔ ان کا گلگوں چہرہ جب خون شہادت سے رنگین ہوا تو نجانے آسمانوں میں کیا فیصلے ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے مقربین میں اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

جامع الکمالات شخصیت

مولانا محمد حبیب خان، ہنگو

سیدی و سندی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ عصر حاضر کے ان نابغہ روزگار علما میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری حسن و جمال کے ساتھ باطنی اور علمی حسن و جمال سے بھی نوازا تھا۔ میانہ قد، کشادہ پیشانی، چمکتا خوبصورت سفید چہرہ، کشادہ آبرو، باریک قدرے اٹھتی ہوئی ناک، ہمہ وقت متبسم ہونٹ اور ذہانت و بیدار مغزی کا پتہ دیتی ہوئی حیا سے بھری آنکھیں۔ آپ کی شخصیت میں ایسی جاذبیت پیدا

کرتی تھی کہ دیکھنے والا مسحور ہوجاتا۔لباس سفید استعمال کرتے ،عموماً سفید عمامہ باندھتے ، باوقار متوازن چال چلتے ، بدن میں بلا کی چستی تھی ، ہمت اتنی بلند تھی کہ بڑھاپے میں نوجوان رشک کرتے رہ جاتے ،عزم تو فولاد تھا ،توکل کا مجسمہ تھے ، اخلاص رگ رگ میں پیوست تھا، تواضع وانکساری طبیعت ثانیہ تھی ،دھیمی آواز سے بھاری لہجے میں بولتے گفتگو حشو وزوائد سے پاک جامع ، دوٹوک اور اصولی ہوتی تعبیرات بھاری اور علمی استعمال کرتے ،معمولی بات کہنے کا انداز بھی ایسا ہوتا کہ تسہیل کے ساتھ اعجاز و معنویت جھلکتی دکھائی دیتی فحش گوئی یا بازاری طرز گفتگو سے کوسوں دور تھے ، مخالف کا ذکر بھی احترام سے کرتے ،صبر وتحمل بنیادی خاصہ تھا، ملک وملت کے غمخوار تھے ،اتحاد واتفاق کے حریص تھے ، امت کے تفرقے پر روتے اور پریشان ہوتے ۔ بدعات ورسومات سے شدید نفرت تھی ،توحید کے نام پر توہین ، تعظیم کے نام پر شرک اور تحقیق کے نام پر خودرائی سے سخت بیزار تھے اور علمی حلقوں میں ان باتوں کی پذیرائی سے نالاں تھے ۔ اپنا مخصوص لباس اور خاص رنگ میں رنگا حلقہ رکھنا یا بنانا گوارانہ تھا، سب کو عام مسلمانوں کی طرح رہنے پر زور دیتے ، ملک وملت پر جب بھی کڑا وقت آیا اس میں حالات کے مقابلے کے لئے سینہ سپر ہوئے اور اپنی خدمات جلیلہ کی ایک تاریخ رقم فرمائی ۔

میری خوش قسمتی تھی کہ حضرت ہمارے خاندان کے بڑے تھے اور مجھے طویل عرصہ آپ کی نگرانی ،تربیت اور سرپرستی میں رہنے کا موقع ملا ، میرے والد صاحب کو ان سے حد درجہ محبت تھی ، اس لئے بچپن ہی سے میرا ہاتھ انہیں تھما کر حوالے کیا ۔ حضرت جب دورۂ حدیث کر کے آئے تو ہم چھوٹے بچے تھے ، کوہاٹ کے ایک خاندان نے انہیں ''محمد زئی'' گاؤں میں مدرسہ قائم کرنے کی پیشکش کی ۔ آپ نے ۱۹۶۸ء میں ''محمد زئی'' کوہاٹ میں مدرسہ امیر معاویہؓ کا افتتاح کیا ۔ بندہ اس مدرسے کا پہلا طالب علم تھا ، یہی آپ سے میں نے تعلیم الاسلام پڑھی ،لیکن ابھی دو ماہ گزرے تھے کہ عید الاضحیٰ کے قریب وفاق المدارس کا سالانہ نتیجہ منظر عام پر آیا ۔ حضرت بنوریؒ نے آپ کو خط بھیجا ، جس میں آپ کو کراچی طلب فرمایا ۔ آپ نے مدرسہ کا کام بند کر کے منتظمین سے معذرت کی اور ہمیں گاؤں چھوڑ کر کراچی کا رخت سفر باندھ لیا ۔ وہاں حضرت بنوریؒ نے آپ کو تخصص فی الحدیث کرنے کا حکم دیا ۔ تخصص کے بعد آپ تصنیفی کاموں میں حضرت بنوریؒ کے معاون ہو گئے ۔

۱۹۷۱ء میں حضرت ہمیں بھی ساتھ لے گئے ، اعدادیہ سے لے کر ثالثہ تک تعلیم ہم نے حضرتؒ کی نگرانی میں وہیں حاصل کی ۔ چونکہ حضرت دار التصنیف میں مصروف رہنے کی وجہ سے صرف دو گھنٹے پڑھاتے تھے اس لئے دوران درس آپ سے صرف شرح ابن عقیل پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ۔ انفرادی طور پر خارجی اوقات میں نور الایضاح بھی پڑھی ۔ کمال تدریس فرماتے تھے ۔ سبق انتہائی مدلل مگر سہل پڑھاتے اور متن کو مکمل کھول کر واضح کر

دیتے۔ اس طرح کہ کوئی اشکال باقی نہ رہ پاتا۔ آپ نے جامعہ میں سلم العلوم بھی کافی عرصہ پڑھائی۔

ہماری رہائش بھی حضرت کے ساتھ کمرے میں تھی۔ اس لئے مہمانوں کے لئے بازار سے کوئی چیز لانا یا چائے وغیرہ پکانے کی ذمہ داری میرے سپرد تھی، صبح ناشتے میں ایک پیالی چائے اور خشک روٹی کے چند لقمے نوش فرماتے۔ دوپہر اور رات کا کھانا مطبخ سے کمرے لانا بھی میرے ذمے تھا، انتہائی قناعت پسند اور قلیل الطعام تھے۔ آپ کے دسترخوان پر کھانے کا ضیاع سخت جرم تھا۔ دسترخوان پر ذرات تک بچنے نہیں دیتے تھے۔ آپ کے کپڑے دھونے کی سعادت بھی مجھے ملتی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ تین سال متواتر یہ خدمتیں میسر رہیں۔ مدرسہ کے کاموں میں انتہائی اخلاص سے پیش پیش رہتے، اسی اخلاص کی وجہ سے حضرت بنوریؒ کی آپ سے خاص محبت تھی۔

مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہیدؒ آپ کے انتہائی قریبی دوست تھے۔ دونوں حضرات مولانا بنوریؒ کے ساتھ دارالتصنیف میں کام کرتے تھے۔ حضرت صبح ناشتہ کرنے کے بعد دارالتصنیف تشریف لے جاتے اور دن بارہ بجے تک کام کرتے۔ کھانے اور نماز کے بعد پھر وہاں چلے جاتے۔ رات کھانے کے بعد بھی کام میں مشغول رہتے۔ صبح تہجد کے لئے لازماً اٹھتے۔ تہجد کے بعد دلائل الخیرات، حزب البحر اور ذکر واذکار میں مشغول رہتے۔ اگر وظائف رہ جاتے تو فجر کی نماز کے بعد مکمل کرتے۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں آپ کو کوئی انتظامی ذمہ داری حوالہ نہ تھی، نظامت وغیرہ بعد میں ملی۔ اس لئے آپ کا سارا وقت تصنیف وتالیف اور عبادت میں گزرتا۔ ہمیں بھی پڑھنے اور آرام کے علاوہ فضول گوئیوں یا دوستیوں کی بالکل اجازت نہ تھی، بلکہ وقت کے ضیاع پر سخت ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں حضرت استاذ صاحبؒ جامعہ سے مستقل تشریف لائے تو شفقت واعتماد فرماتے ہوئے مجھے بھی تدریس کے کام میں شریک فرمالیا۔ اس وقت جامعہ یوسفیہ کی کل اساس ایک مسجد اور اس سے متصل حجرہ تھا۔ پانی، بجلی کی سہولیات تک نہ تھیں۔ طلبہ کے اخراجات وانتظامات کے لئے چندہ کا کوئی نظام نہ تھا۔ حضرت الاستاذؒ اور طلبہ مل کر سارے کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ بعد میں مدرسہ کی جتنی تعمیر ہوئی وہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کی۔ آغاز میں مطالعہ لالٹین کی روشنی میں ہوتا تھا۔ بعد میں میرے ماموں زادؒ جو حضرت الاستاذؒ کے قریبی دوستوں میں سے تھے نے چھ ہزار روپے میں ایک جنریٹر خرید کر مدرسہ کے لئے وقف کیا تو روشنی کا انتظام ہوا۔ حضرت جب ۱۹۸۴ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے تو بندہ کو ازراہ شفقت اپنا قائم مقام مقرر فرمایا اور وصیت بھی کی اگر خدانخواستہ میں نہ رہا تو مدرسہ کے مہتمم حبیب اللہ ہوں گے۔

حضرت خوددار انسان تھے۔ اس لئے مدرسہ کے امور کے لئے بھی چندہ نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہمیں بعض اوقات سخت مصائب اور دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن ہر دفعہ اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتے اور کوئی نہ کوئی

سبب بن جاتا۔ ۱۹۹۳ء تک بندہ آپ کے ہاں تدریس کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ مالی پریشانیوں کی وجہ سے تجارت شروع کردی۔ پھر اپنے مدرسہ ''خلفائے راشدین'' کی بنیاد ڈالی۔ مدرسہ اور مسجد کی بنیاد حضرت مولانا عبداللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ نے رکھی اور بحمد اللہ اب تک آباد اور جاری وساری ہے۔

حضرت نے مجھے گڑھی باباجی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت بھی کروایا۔ جب بندہ حضرت استاذ صاحبؒ کے ساتھ وہاں حاضر ہوا تو حضرت باباجیؒ اتنے ضعیف تھے کہ انہیں کندھے پر سوار کرکے مسجد لایا جاتا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ صف میں آکر ایسے کھڑے ہوجاتے جیسے بدن کا سارا ضعف ہوا میں اڑ گیا ہو اور ساری قوت واپس لوٹ آئی ہو۔ کھڑے ہوکر نماز پڑھاتے۔ لیکن نماز کے بعد وہی ضعف والی حالت ہوجاتی۔ بڑے فصیح وبلیغ انداز میں بولتے تھے اور حضرتؒ سے حد درجہ محبت تھی۔ آخر میں اپنی وفات سے قبل 'جو غالباً ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی' حضرت الاستاذ کو خلافت بھی عطا فرمائی۔

حضرت الاستاذؒ پر مدرسہ چلاتے وقت بڑے مشکل مراحل آئے لیکن تمام مراحل کو صبر واستقامت سے برداشت کیا۔ ایک بار فرمایا کہ مدرسہ میں کھانے کا سب کچھ ختم ہوگیا، فاقے کی نوبت آگئی، میرے پاس ذاتی بھی کچھ نہ تھا کہ مولانا فضل محمد سواتیؒ کو ہماری حالت منکشف ہوئی، وہ تشریف لائے اور مجھے تنہائی میں لے جاکر مدرسہ کے لئے علیحدہ اور ذاتی خرچ کے لئے علیحدہ رقم عطا کی۔ ایک بار فرمایا کہ ایسے حالات بھی آئے کہ میں نے صرف مرچ کے ساتھ روٹی کھائی ہے۔

حضرت ایک دفعہ مجھے تیراہ اورکزئی ایجنسی کے علاقے ''خوا'' میں ایک بڑے اللہ والے بزرگ مولانا بہاء الحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں لے کر گئے، ان کا خاندان سارا اہل اللہ کا خاندان تھا۔ اور وہ علاقہ میں ''خوا صاحبان'' کے نام سے مشہور تھے۔ انتہائی خاموش مزاج بزرگ تھے، باتیں بالکل نہیں کرتے تھے، سادات میں سے تھے۔ اس سفر میں مولانا فضل محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ساتھ تھے۔ مولانا بہاء الحق صاحبؒ کی عوام میں وہاں کافی مقبولیت تھی اور سارے لوگ انہیں اپنا روحانی مرجع تصور کرتے تھے۔

حضرت الاستاذؒ کا علمی اور روحانی مقام ایسے مواقع پر مشاہد ہوتا جب یہ بڑے بڑے اولیا آپ سے محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے۔ وگرنہ خود تو حضرتؒ نے اپنے آپ کو اخفا کے ان پردوں میں چھپایا تھا کہ کبھی اپنی ایک ادا سے بھی مخدومیت کا اظہار نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ خادم بن کر زندگی گزاری۔

حضرت کا ارتحال ایک عظیم سانحہ ہے۔ افسوس کہ ہماری قوم ایک باعمل عالم، ایک کامل صوفی اور مدبر رہنما سے

محروم ہوگئی۔ آپ کا علم علمی فتنوں اور آپ کی روحانیت عملی فتنوں کے لئے مضبوط ڈھال تھی۔ اللہ والوں کی رحلت سے فتنوں کا جو تار ٹوٹ کر گرتا ہے، ہمارے علاقوں میں بھی یہی ہوا۔ حضرت الاستاذ کی شہادت اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کی وفات کے بعد گویا ہمارے علاقے یتیم اور بے سہارا ہوگئے اور اب ان علمی و عملی فتنوں کی بہتات ہے جن کا ہم حضرات شیخینؒ کی زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ہمیں ان کے ساتھ جنت الفردوس میں جمع فرمادے۔ آمین ثم آمین

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

مولانا ظفر احمد، کوہاٹ

سیدی وسندی استاذِ گرامی مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ ہماری عقیدتوں، محبتوں اور تعلقات کے واحد محور تھے۔ بچپن سے ان کی آغوش تربیت میں داخل ہوئے تو بحمد اللہ داڑھی سفید ہونے تک پھر کسی اور طرف دیکھنے کی حاجت نہ ہوئی۔ نظر اول میں دل کا جو سودا ہوا تو پھر تمام ہی عمر ان کے آستانے پر کاٹنے کی توفیق ہوگئی۔

دراصل اس میں ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں۔ میں کیا! میرے درجنوں دوستوں کی بھی یہی حالت تھی اور اس کی واحد وجہ حضرت الاستاذ کی ہمارے اوپر کمال شفقت اور بچوں سے بڑھ کر محبت تھی، جس نے انہی کا اسیر بنا کر رکھا۔

آپ کی ذات والا صفات سخاوت، شجاعت، رأفت، ہمدردی، ایثار وقربانی، جہد واخفا، خلوص وللّٰہیت، توکل علی اللہ، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ جیسی اونچی صفات کی نمایاں، عمدہ اور کامل تصویر تھی۔ ہم نے آپ کی صورت میں حاتم طائی کی سخاوت دیکھی، نبوی شفقت ورأفت کا فیض دیکھا، صدیقی استقامت دیکھی، فاروقی غیرت وحمیت دیکھی، حیدری شجاعت کا مشاہدہ کیا اور اسلاف امت کے علم وعمل کا زندہ وجاوید نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس چشمۂ صافی سے تو کما حقہ کوئی استعداد والا ہی سیراب ہوسکتا تھا ہمارے لئے تو بس یہی اعزاز کافی ہے کہ ان کی صحبت میں جگہ میسر آئی۔

بندہ ۱۹۸۰ء میں بنوری ٹاؤن درجہ اعدادیہ پڑھنے گیا۔ حضرت الاستاذ اس وقت وہاں درجات علیا کے مدرس اور ناظم مدرسہ کی خدمات سرانجام دیتے تھے، مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ دارالتصنیف سے بھی آپ وابستہ تھے۔ ہم حضرت ہی کی تربیت ونگرانی میں پڑھتے تھے۔ ششماہی سے چند ایام قبل حضرت نے بعض وجوہات کی وجہ سے جامعہ سے استعفیٰ پیش کیا۔ آپ کے چلے جانے کے بعد ہم ایسے بے قرار ہوئے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مدرسہ میں دل نہیں لگتا تھا۔ مولانا محمد زاہد صاحب کوہاٹی اس وقت درجہ ثانیہ کے طالبعلم تھے آپ نے استاذ صاحب کو خط لکھا کہ '' آپ کے جانے کے بعد جامعہ سے ہمارا دل اچاٹ ہو گیا ہے، لہٰذا ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کے پاس آجائیں''۔ ہمیں اس کا علم نہیں تھا کہ استاذ صاحب گاؤں میں کیا ترتیب شروع کریں گے۔ بہر حال استاذ صاحب نے جلد ہی مولانا کے خط کا جواب دیا اور ہمیں اپنے پاس آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ درجہ اعدادیہ میں بندہ نابالغ اور چھوٹا تھا۔ دو اور ساتھی مولانا محمد زاہد اور ان کے بھائی مولانا محمد صالح مجھ سے ایک درجہ آگے تھے۔ ہم کراچی سے ٹکٹ لے کر سیدھے گھر آئے اور اگلے دن ہنگو اور وہاں سے حضرت کے گاؤں شاہو وام پہنچے۔ ہم مدرسہ کے ابتدائی طالب علم تھے، ہم سے ہی جامعہ یوسفیہ کی بنیاد پڑی۔ کچھ اور طلبہ بھی جمع ہو گئے اور غالباً ایک درجن لڑکوں کی اعدادیہ، اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ کے اسباق پر مشتمل جماعتیں بنیں۔ حضرت الاستاذ نے تمام طلبہ کو خود پڑھانا شروع فرمایا۔

مدرسہ کیا تھا؟ ہنگو سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر دور پہاڑوں میں گھرا جنگل اور اس میں چند گھروں پر مشتمل چھوٹا سا بانڈہ نما گاؤں ...... وام ...... ۔ حضرت کے خاندان کی زرعی زمین کے پاس آپ کے خاندان کے چند کچے گھر تھے۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی کچی مسجد تھی اور پختون روایات کے مطابق مسجد سے متصل مہمانوں کے لئے ایک کچا حجرہ۔

اسی میں حضرت الاستاذ جیسی عبقری اور ہمہ گیر شخصیت نے پڑھانے کا آغاز فرمایا۔

آپ کے جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن جیسے ادارے میں تدریس، تصنیف اور مختلف علمی کاموں کے مواقع چھوڑ کر اس دور دراز جنگل میں بسیرا کرنے کی توجیہ شاید ہم نہ کر پاتے لیکن حضرت اپنے اس اقدام کی جو وجوہات بار ہا بیان فرماتے تھے ان میں دو وجہیں مجھے بخوبی یاد ہیں فرماتے تھے: کہ ہمارے علاقے کے حالات دینی اعتبار سے بہت خراب ہیں، رواج اور رسوم کا دور دورہ ہے، لوگ جہالت میں مبتلا ہیں۔ میرے لئے شرم کی بات ہے کہ اپنے علاقہ کی ضروریات سے غافل رہ کر اور اس کو اپنی حالت پر چھوڑ کر کراچی جاؤں۔ دوسری وجہ یہ کہ اپنا مدرسہ میرے لئے بنانا باعثِ شرم ہے مگر تنخواہ لے کر تدریس وغیرہ کا کام کرنا گو کہ جائز ہے لیکن میرے ضمیر پر ہمیشہ سے بوجھ رہا ہے کہ اجرت علی الطاعت کی ممانعت حنفیہ کا اصل مذہب ہے۔ خواہش تھی کہ بغیر تنخواہ اللہ کا م لے لے۔

جب مدرسہ کا آغاز ہوا تو اسی سال مولانا رفیع اللہ صاحب اور مولانا حبیب اللہ صاحب نے دورۂ حدیث کیا تھا۔ حضرت الاستاذ نے ان کو بھی معاونت کے لئے بلالیا۔ مولانا جمیل صاحبؒ جو استاذ صاحب کے قدیم شاگرد تھے، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تخصص کر رہے تھے ان کو بھی طلب فرمایا۔ اس طرح ان مخاصین کی جماعت خالص توکل اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ اس جنگل میں فروکش ہوگئی نہ تنخواہ تھی نہ وسائل بس نقد فی اللہ کام شروع فرمایا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت الاستاذ تنہا اس وقت تیرہ کتابوں کا درس دیتے تھے۔ آپ کی تدریسی شان سے تو آپ کے تلامذہ نے وہ مزے لوٹے جو جنت میں نہ ہوں گے۔ بندہ کو اعدادیہ سے سلم تک اکثر کتابیں حضرت الاستاذ سے پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ آپ انتہائی جامع مختصر اور تحقیقی تقریر فرماتے۔ طوالت سے اجتناب کرتے خصوصاً فنون کی ابتدائی کتابوں کو گھول کر پلاتے تھے۔ سلم تک یہاں پڑھنے کے بعد استاذ صاحب نے ہمیں مولانا فضل محمد سواتی صاحب کے مدرسہ ''مظہر العلوم مینگورہ'' بھیجا۔ وہاں ایک سال پڑھنے کے بعد بندہ اور مولانا محمد صالح کوہائی نے حضرت سے درخواست کی کہ ہم کم عمر ہیں اور موقوف علیہ و دورۂ حدیث کر کے ضابطے کی تعلیم سے فارغ ہونا نہیں چاہتے، بلکہ مزید پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور ہمیں واپس بلا کر متفرق کتب تجویز کر دیں۔ آپ نے اسی سال فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح النقایہ'' کی تدریس شروع فرمائی تھی۔ استاذ صاحب سے ابتدا میں ہمیں ہی اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت بخشی، سلم بھی اس سال دوبارہ آپ سے پڑھی۔ اس سال متفرق کتب پڑھنے کے بعد ہمیں دوبارہ مظہر العلوم بھیجا اور پھر وہیں سے موقوف علیہ اور دورۂ حدیث مکمل کرنے کی سعادت ملی۔

حضرت الاستاذ کے ہاں سبق کا ناغہ بہت بڑا جرم تھا۔ اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس سے بڑھ

کہ بعض اوقات چھٹیوں میں اسباق جاری رہتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۸۰ء میں جب ہم کراچی سے واپس آگئے تو سالانہ چھٹیوں میں چند ہی مہینے باقی تھے۔ میں اعدادیہ پڑھ رہا تھا لیکن ساتھ ایک استاذ سے نحو میر کی فارسی عبارت سمجھ کر یاد کرنا شروع کی۔ عبارت تو مجھے ساری ازبر یاد ہوگئی لیکن نحو میر کے مباحث پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ دوبارہ نحو میر حضرت سے سمجھ کر پڑھوں لیکن آپ نے فرمایا: کہ آپ نحو میر پڑھ چکے ہیں ۔لہٰذا شرح مائۃ عامل خود ہی شروع فرمادی، اس کی ترکیب خود بنانی ہوتی اور حضرت کو سنانی ہوتی۔ مجھے چونکہ نحو میر کی پوری سمجھ نہیں تھی اس لئے کتاب حل کرنے میں سخت دقت تھی، ادھر سالانہ چھٹیاں ہوئیں اور میرا سبق بدستور جاری رہا۔ چھٹیوں میں وقت کے ساتھ سبق پڑھنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ طلبہ کرام کر سکتے ہیں۔ میری کوشش تھی کہ کس طرح اجازت لے کر گھر چلا جاؤں لیکن اس کا تصور کرتے ہی کانپ جاتا تھا۔ اسی اثناء رمضان میں ۱۹۸۰ء کا مشہور شیعہ سنی تصادم شروع ہوا، اس جنگ سے لوگوں کے جو مشکلات بنے وہ تو بنے لیکن مجھے بے حد خوشی ہوئی اور چھٹی کا بہانا ہاتھ آگیا کیونکہ استاذ صاحب قیام امن کی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ بندہ نے جرأت کر کے اجازت چاہی تو فرمایا: کہ چلے جائیں۔ اس طرح شرح مائۃ عامل کی مشکل سے جان چھوٹ گئی۔

جامعہ یوسفیہ کا ابتدائی دور انتہائی مجاہدے کا دور تھا۔ ہم طلبہ کا کھانا استاذ صاحب کے گھر میں تیار ہوتا، اور استاذ صاحب، ان کے بھائی اور طلبہ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر مل کر کھاتے۔ پانی کی سخت قلت تھی مسجد کے کنویں سے حضرت استاذ صاحب خود ہی بالٹیاں بھر بھر کر ہمارے لئے پانی نکالتے تھے۔ بجلی کا پورے علاقے میں نام ونشان نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مدرسہ کے لئے پہلا تعاون آٹے اور دالوں وغیرہ کی صورت میں حاجی نور اکبر مرحوم ایک مقامی مخیر لائے تھے، کچھ عرصہ بعد ایک ہوٹل والے صاحب جن کا نام حاجی سیدان گل تھا۔ استاذ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ طلبہ کے لئے اپنے ہوٹل سے بنا بنایا کھانا لے کر آؤں گا، لیکن استاذ صاحب نے اسے منظور نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: کہ ہمارے اکابر دیوبند حضرات اسی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ مدرسہ کے اندر میسر ہو، اس سے اپنی ضروریات پوری کریں۔ خوامخواہ باہر سے بنا بنایا کھانا خلاف توکل ہے، الغرض بطریق احسن حاجی مرحوم کو رخصت کیا۔

جامعہ یوسفیہ ۱۴۰۰ھ میں قائم ہوا ہے، تقریباً چار مہینے مدرسہ کے طلبہ واساتذہ مسجد کے ساتھ ملحقہ حجرے کے دو کمروں میں رہائش پذیر تھے۔ اسباق بھی مسجد میں پڑھتے تھے، پھر شوال میں اللہ تعالیٰ نے کچھ تعمیر کے اسباب پیدا کر لیے۔ تو مسجد کے ساتھ حضرت نے اپنی ذاتی اراضی میں چند کمروں کی تعمیر شروع فرمادی۔ اینٹیں ڈھونا، بازار سے تعمیراتی سامان لانا، تعمیر میں کاریگروں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرنا استاذ صاحب کا معمول تھا۔ ہم نے

تیس سالہ دور میں استاذ صاحب کو سوائے کھیل کے ہر کام میں اپنے ساتھ شریک کار پایا۔ مدرسہ کی صفائی، گندم کی کٹائی، تعمیراتی کام، پودوں کی کاشت، پانی بھرنے کی خدمت غرض ہر کام میں حضرت الاستاذ خود شریک رہتے۔

اس زمانے میں گاڑیوں کا رواج کم تھا، ہم بارہا "وام" سے ہنگو دس کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے آئے۔ استاذ صاحب بھی پیدل آتے جاتے، کبھی ٹریکٹر وغیرہ میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر چلے جاتے، غرض اپنے لئے کوئی امتیازی شان نہیں بنائی بلکہ ہمیشہ ایک عام شخص کی سی زندگی بسر کی۔

حضرت الاستاذ بلا کے مہمان نواز تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ مہمانوں کی کثرت کے باعث گھر میں کھانا ختم ہو جاتا اور آپ کو بچے کچھے ٹکڑے کھانے پڑتے یا فاقہ کرنا پڑتا۔ طلبہ جب کھانے پینے کی اشیا میں بے احتیاطی کرتے یا عیب نکالتے تو فرماتے کم بختو! تم اس پر شکر نہیں کرتے، تیار کھانا مل جاتا ہے۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ بسا اوقات اساتذہ اور آپ کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ مجھ سے بعض اوقات فرماتے کہ ہنگو جانے سے اس لئے کتراتا ہوں کہ جیب میں کچھ بھی نہیں، اگر کوئی مہمان مل گیا تو مہمان نوازی نہ کر سکنے کا افسوس ہوگا۔

نام ونمود اور شہرت سے حضرت کو طبعی نفرت تھی، یہ بات تو سب کے سامنے ہے کہ حضرت کو وفاق المدارس کے نصاب پر بعض تحفظات تھے اور اپنا علیحدہ نصاب مقرر فرمایا تھا۔ ایک بار حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ تعالیٰ جامعہ تشریف لائے غالباً اس وقت وہ وفاق کے کسی عہدے پر مقرر کیے گئے تھے۔ آپ نے استاذ صاحب سے نصاب کمیٹی کی سربراہی لینے کی درخواست کی۔ ہمارا مشورہ بھی استاذ صاحب کو یہی تھا کہ آپ اس ذمہ داری کو سنبھال لیں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ نصاب میں ترمیم کی خواہش پوری ہو سکے گی اور آپ کو مزید بہتری لانے کا موقع ملے گا، لیکن استاذ صاحب نے سختی سے اسے ٹالا اور انکار فرمایا۔ ایک تو آپ عہدوں سے اور مظاہر شہرت سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے، دوسرا حج کی مثال بیان فرمائی کہ بعض اوقات حج میں بندہ ایک طرف کا قصد کرتا ہے لیکن ہجوم کی کثرت اسے بلا ارادہ دوسری طرف لے جاتی ہے۔ وفاق میں عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی، میں کچھ کرنا چاہوں گا لیکن ہجوم کی کثرت بلا ارادہ کچھ کروا دے گی۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل واعتماد کا جو مشاہدہ ہم نے حضرت کے ہاں کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دنیا کی کوئی فکر آپ کو قطعاً لاحق نہ ہوتی، ایک دفعہ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیمیائے سعادت میں ایک بزرگ کی بات لکھی ہے کہ اگر سارا بغداد میرا اہل وعیال ہوتا اور گندم کا ایک دانہ ایک اشرفی کا ملتا تو میں تب بھی معاش کے لئے پریشان نہ ہوتا، یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر دفعۃً فرمایا کہ کیا تیرا یہ ایمان نہیں ہے؟ اس سے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس درجہ ایمانی کیفیت پیدا کرنے کی تعلیم دی۔ اس سے آپ کے ایمانی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت کے اونچے احوال مشاہدہ کر کے اپنی حالت پر حد درجہ پریشانی ہوتی تھی، ایک دفعہ ٹانک کے سفر میں بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ میں مؤمن ہی نہیں۔ فرمایا کہ اگر کوئی اتنے کروڑ دے کر تجھ سے مطالبہ کرے کہ کلمۂ کفر کہہ دو تو کہہ دو گے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ تو نہ ہو سکے گا۔ فرمایا: بس سمجھو کہ آپ کے دل میں ایمان ہے۔ باقی سب وساوس ہیں جن کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔

حضرت الاستاذ کو فضولیات ولغویات سے سخت چڑ تھی۔ اساتذہ کے وقت ضائع کرنے پر سخت ناراض ہوتے تھے، اور اکثر شکایت فرماتے کہ ذوق ختم ہو گیا ہے کوئی استفادہ کرنے والا ہی نہیں۔ آپ اساتذہ کے لئے واقعات وتاریخ کی عام کتابیں جو محض تفریح طبع کے لئے مطالعہ کی جاتی ہیں، بھی پسند نہ فرماتے تھے، اور اسے ضیاع وقت سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ اہل علم کو علمی کتابیں مطالعہ کرنی چاہئیں، خود مطالعہ کا مثالی ذوق تھا اکثر کتاب کے مطالعہ میں مستغرق رہتے، فرماتے کہ دنیا کی زندگی مطالعہ کے مزے لوٹنے کے لئے بہت کم ہے، یہ میری غذا ہے، کاش! کہ جنت میں بڑا کتب خانہ ہو اور مطالعہ کرتے رہیں۔ تفریح طبع کے لئے گھومنے پھرنے کا بھی قطعاً معمول نہ تھا، مقصد کے لئے سفر فرماتے جیسے ہی مقصد پورا ہوتا فوراً واپسی فرماتے۔ بندہ ایک دفعہ آپ کے ساتھ کابل گیا، مزار شریف میں طالبان کی مظلومانہ شہادت پر آپ نے کچھ تعاون کی رقم افغان طالبان حکومت تک پہنچائی تھی، ہم جب کابل پہنچے تو چند قدم ہی چلے تھے کہ مولانا نظام الدین شامزئی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے احباب کے ساتھ نظر آئے، ان کی نظر استاذ صاحب پر پڑی فوراً لپکے اور استاذ صاحب کو لے کر آریانا ہوٹل میں اپنے کمرہ میں لے آئے۔ حضرت شامزئی نے ہمارے لئے اسی کمرے کو آرام کے لئے خالی فرمایا جو اچھا اور کشادہ تھا اور خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر کے ایک پسماندہ ہوٹل میں جا کر رات گزاری، کیونکہ آریانا میں دوسرا کمرہ خالی نہ تھا، ہمیں بعد میں اس کا پتہ چلا۔ الغرض دوسرے دن تمام حضرات کا حضرت استاذ صاحب سے اصرار شروع ہوا کہ فلاں مقام دیکھنے چلتے ہیں تا کہ طالبان کی حوصلہ افزائی ہو جائے، فلاں مقام کا دورہ کرتے ہیں، مولانا شامزئیؒ نے بھی کافی اصرار کیا۔ ہماری بھی گھومنے پھرنے کی خواہش تھی، لیکن حضرت الاستاذؒ نے فرمایا کہ جس مقصد کے لئے حاضری ہوئی تھی وہ پورا ہو گیا لہٰذا واپسی کا رخت سفر باندھا اور ہم بلا گھومے پھرے واپس چلے آئے۔

اس حوالے سے طلبہ کی بھی سخت خبر گیری کرتے۔ آپ کا معمول تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً چہرہ موڑ کر ساری مسجد کا ایک سرسری جائزہ لیتے، اس سے مسبوقین کا بھی اندازہ لگا لیتے اور یہی آپ کی حاضری بھی ہوتی تھی، تجربہ اتنا تھا کہ غائبین کا اندازہ بھی فرما لیتے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ ہمیشہ نپی تلی اور اصولی بات فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے آکر کچھ دینی جماعتوں کی شکایتیں شروع کر دی کہ ان کے طرز عمل سے تفرقہ پھیل رہا ہے اور یہ

دیوبندیت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ آپ نے بڑی اصولی گفتگو اس کے جواب میں فرمائی: کہ اصل الاصول ''توحید'' ہے۔ قرآن مجید پر ہمارا ایمان اسی وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا پرچار اور شرک سے منع کرتا ہے۔ سنت وحدیث پر ہمارا ایمان اس وجہ سے ہے کہ یہ قرآن کی درست تشریح وتفسیر ہے، حنفیت کے ہم اس لئے قائل ہیں کہ یہ قرآن وحدیث کی اصح عملی تطبیق پیش کرتی ہے اور دیوبندیت کو ہم اس وجہ سے مانتے ہیں کہ ہماری نظر میں یہ سنیت وحنفیت کی درست ترین تعبیر سے عبارت ہے۔ لہٰذا اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر اس کی روشنی میں باقی ترتیب طے کرنی چاہیے، نہ یہ کہ دیوبندیت یا حنفیت کو اصل بنا کر قرآن وحدیث کو ان کا خادم بنا دیا جائے اور ساری کاوشیں اسی کے گرد گھومیں۔

ایک دفعہ بڑا دلچسپ لطیفہ ہوا۔ حضرت استاذ صاحب نے غائبانہ ایک عالم دین کے بارے معلومات کرکے اپنے ایک دوست کے مدرسے میں ان کی تقرری کی توثیق فرمادی تھی، ان عالم صاحب کی کافی متحرک سیاسی وابستگی تھی، عموماً استاذ صاحب سیاسی وابستگی والے حضرات کے بارے تعلیمی امور میں تساہل کا تجربہ رکھتے تھے۔ ہم حضرت کے پاس بیٹھے تھے کہ وہی صاحب تشریف لائے اور سلام کرکے حضرت کے پاس ہی بیٹھ گئے، ہم میں سے کوئی بھی ان کو نہیں پہچانتا تھا، اسی دوران ہمارے ایک مدرس دوست نے گردن بڑھا کر حضرت سے کہا کہ فلاں صاحب کی آپ نے تقرری کی توثیق فرمادی حالانکہ وہ تو فلاں سیاسی تنظیم سے بڑی پختہ وابستگی رکھتے ہیں۔ استاذ صاحب نے اس موقع پر بھی اصولی جواب دیا کہ بھئی! ان کی تعلیمی استعداد، تعلیم سے لگاؤ اور مدرسانہ مزاج کی میں نے معلومات کی ہیں۔ وہ مدرسی کے اہل ہیں، میں نے اس لیے توثیق کردی ہے، باقی رہی سیاسی وابستگی تو اگر وہ اس کے تعلیمی مزاج پر اثر انداز نہیں تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟ استاذ صاحب نے اتنا فرمایا تو وہ صاحب بول پڑے کہ جی! وہ میں ہوں۔ اس پر ہماری تو ہنسی چھوٹ گئی اور وہ مدرس ساتھی بڑے ہی شرمندہ سے ہوگئے۔

انتظامی حوالے سے استاذ صاحب نے مدرسہ کا نظم ہمیشہ سے مثالی چلایا، اسباق کی تقسیم میں ہمیشہ ہماری خواہش کی رعایت رکھتے، تو استاذ صاحب ہی کی تقسیم پر ہمیشہ سے اعتماد رہا۔ تاہم ایک دو کتابیں مدرس کی خواہش پر ضرور عنایت فرماتے۔ ہمیں اس بات کی تاکید کرتے کہ طلبہ کی کوئی شکایت آئے تو فوراً اس کا ازالہ کریں۔ شکایت پر اگر فوراً کارروائی نہ کی جائے تو اس سے طلبہ میں مزید انتشار وفساد پھیلتا ہے، اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ طلبہ کی شکایت سے مقدمہ بازی نہ بنائیں بلکہ فوراً نمٹائیں۔ اپنا سبق وقت پر مکمل کرتے تاکہ دوسرے استاذ کا حق ضائع نہ ہو کبھی مجبوراً دوسرے استاذ کا وقت لینا پڑتا تو ضرور معذرت کرتے میرے ساتھ بھی ہمیشہ یہی معمول رہا۔

بندہ کے ساتھ ہر معاملے میں خصوصی رعایت رکھی، فرماتے کہ اس مدرسے کے اولین طلبہ اور میرے ساتھ کراچی

سے آنے والوں کو میں کبھی ناراض نہیں کروں گا۔ ساری عمر اس قول کو نبھایا اور کسی حوالے سے ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ استاذ صاحب کے جلال کے سامنے عموماً ساتھیوں کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن یہ فقیر عموماً ایسے مواقع پر بھی جب آپ سے کسی رائے میں اختلاف کی نوبت آئی کھل کر بولتا۔ کئی احباب کے مسائل میں بندہ نے سخت لہجے میں بات کی بھی جسارت کی، لیکن آپ نے ہمیشہ تحمل اور عفو سے کام لیا اور کبھی محسوس نہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی ہر دلعزیزی عطا فرمائی تھی کہ ہر شخص کا یہ گمان ہوتا کہ مجھ سے سب زیادہ محبت رکھتے ہیں اور مجھ سے سب سے بڑھ کر تعلق ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت بھی ہوتا جب آپ کے آرام یا کام کے وقت کوئی ملنے آتا، ہم منع کرتے کہ استاذ صاحب کے کام یا آرام کا وقت ہے، ملاقات نہیں ہوسکتی۔ آپ انتظار کرلیں یا بعد میں تشریف لے آئیں، لیکن وہ بااصرار کہتا کہ آپ میرا کہہ دیں کہ فلاں آیا ہے استاذ صاحب ضرور ملیں گے۔ دراصل وہ محسوس کررہا ہوتا کہ سب سے خصوصی تعلق تو میرے ہی ساتھ ہے، یہ ویسے ہی آڑے آجاتے ہیں۔

اسی خاطرداری کے نتیجے میں بعض اوقات ناگوار صورت حال بھی پیش آجاتی مثلاً لوگ آپ کی اجازت کے بغیر کہیں آپ کے احباب یا متعلقین کے پاس جاکر آپ کی وجاہت سے کام نکلواتے۔ ٹیلیفون تو تھا نہیں کہ رابطہ کرکے تصدیق ہوجاتی، اس لئے لوگ باآسانی آپ کا حوالہ دے کر مقصد پالیتے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ایک طالبعلم کا ہے جو دارالعلوم کراچی داخلے کے لئے گئے اور میوہ جات اور پھل خرید کر دارالعلوم کے ایک بزرگ استاذ کے پاس حاضر ہوئے اور استاذ صاحب کا حوالہ دے کر کہا کہ میں ان کا عزیز ہوں، یہ پھل انہوں نے ہدیہ بھیجے ہیں اور میرے داخلہ کی سفارش کی ہے۔ وہ بڑے ممنون ہوئے شکریہ ادا کیا، ان کے داخلے کا بندوبست کیا اور ان سے کہا کہ جب علاقہ جانا ہو تو مجھ سے ضرور ملیے گا۔ واپسی پر ان بزرگوں نے استاذ صاحب کے لئے کوئی ہدیہ بھی دیا، لیکن یہ صاحب ہدیہ خود ہی ہتھیا گئے، کیونکہ استاذ صاحب کے سامنے اس کارستانی کے احوال کے ساتھ تو حاضری کی جرأت نہ تھی۔ بہرحال یہ قصہ اپنے ایک دوست کو انہوں نے رازدار بنا کر سنایا تھا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ لوگ استاذ صاحب کی وجاہت سے کہاں کہاں کام نکالتے تھے۔

ایک دفعہ تبلیغی مرکز کے ذمہ دار ولی اللہ خان مرحوم اور سماجی رہنما ملک الطاف خان جامعہ یوسفیہ تشریف لائے اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ سے گزارش کی کہ ہنگو شہر میں امن وامان کے سلسلہ میں اہل تشیع کے علما آپ حضرات کے ساتھ کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو قبول فرمایا۔ ملاقات کے لئے ملک الطاف کا حجرہ مقرر ہوا۔ بندہ بھی حضرت الاستاذ کے ہمراہ الطاف خان کے حجرے گیا۔ ہمارے پہنچنے کے چند لمحے بعد اہل تشیع کے دو علما آئے۔ گفتگو کا آغاز انہوں نے کیا اور امن کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں،

اس کے بعد امن اور سلامتی پر اس انداز میں باتیں شروع کیں جیسے کہ ان کے سامنے بالکل ان پڑھ لوگوں کا مجمع ہو۔ بالکل ابتدائی اور سطحی گفتگو کی۔ بعض باتیں انتہائی غیر ذمہ دارانہ بھی تھیں۔ مجھے تو بالکل یہ نہ لگا کہ یہ قوم کے دانشور یا علما ہیں کیونکہ انہوں نے بدامنی کے اسباب ومحرکات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف امن وسلامتی کے لغوی اصطلاحی معنی اور فضائل ہی بیان کیے تھے۔ جب وہ اپنے معروضات سے فارغ ہوئے تو حضرت الاستاذ صاحبؒ نے انتہائی مختصر طور پر اصولی باتیں ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ امن انتہائی اہم چیز ہے، اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر زبان سے فقط ''امن امن'' کی رٹ لگانا کچھ فائدہ نہیں دیتا، بلکہ امن وامان قائم کرنے کے لئے اہل تشیع اور اہل سنت حضرات کے ذمہ داروں کو کچھ عملی اقدامات کرنا ہوں گے۔ اہل سنت کی طرف سے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان سے کسی قسم کی تکلیف کسی کو نہیں پہنچے گی۔ اگر شیعہ کے ذمہ دار صرف اتنا کام کریں کہ دل آزار لٹریچر و دل آزار زبان کے استعمال پر پابندی لگا دیں۔ نیز مذہبی جلسے وجلوس وغیرہ اپنے اپنے علاقوں تک محدود کر دیں تو امن وامان خود بخود قائم ہو جائے گا۔ اگر اس لٹریچر پر پابندی نہیں لگتی تو صرف شیعہ وسنی علما کا آپس میں بیٹھنا محض ضیاع وقت ہے۔ استاذ صاحب کی باتوں کے اختتام پر انہوں نے کہا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بار بار اس طرح کی گفتگو موقع بموقع کریں گے مگر یہ لوگ تادم شہادت پھر کبھی نہیں آئے۔

اسی طرح کا ایک وفد ایرانی انقلاب کے بعد حضرت الاستاذ سے ملنے اور انقلاب کے اہداف ومقاصد بتانے آیا تھا، اس وفد میں ایرانی علما اور قصبہ ابراہیم زئی کے اہل تشیع رہنما بھی شامل تھے۔ ان حضرات کا مدعا یہ تھا کہ خمینی صاحب عالم اسلام اور اسلامی افکار کے نمائندہ ہیں اور اس سلسلے میں اہل السنۃ علما ودانشوران کا ساتھ دیں۔ نیز شیعہ سنی طبقات کے درمیان ہماری امن پسندانہ سوچ کی حمایت کریں۔

حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ امن اور اتحاد تو بہترین مقاصد ہیں اور اس بنیاد پر امت کا اکٹھا ہونا بھی لازمی ہے، لیکن اپنے رویوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اتحاد وامن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا چیز ہے، اس پر انہوں نے کہا کہ یہ تو اولین ضرورت ہے۔ تب استاذ صاحب نے خمینی صاحب کی ایک تازہ تصنیف اٹھا کر ان کے سامنے پیش کی، جس میں صحابہ کرام کو معاذ اللہ ناکام جماعت کہا گیا تھا اور دیگر تبرائی تحریرات تھیں۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا اس قسم کی تحریروں کی مسلسل اشاعت اور موجودگی میں امت کو اتحاد یا امن پر لایا جا سکتا ہے، یہی تو وہ چیزیں ہیں جنہوں نے اتحاد کو پارہ پارہ کیا ہے اور امن کا بیڑا غرق کیا ہے۔ امن اور اتحاد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اگر صحابہ کرام کی مقدس جماعت کی عزت وناموس پر ایسے واشگاف حملے ہوں اور انہیں اعلانیہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے۔ اس پر وہ صاحب سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے اور کوئی بات نہ کر سکے۔ حضرت الاستاذؒ نے انہیں انتہائی

احترام سے رخصت کر کے آخر میں فرمایا کہ میرا یہ پیغام اپنے بڑوں تک پہنچا دیں کہ امن کسی کی خواہش نہ ہوگی لیکن اس کے حصول کے لیے ہمیں سنجیدہ ہونا پڑے گا اور اپنی ان چیزوں کی اصلاح کرنی ہوگی، جو امن شکنی کا بنیادی سبب ہیں۔

حضرت الاستاذؒ کی ساری زندگی المیلی تھی، کس کس بات کو یاد کیا جائے، کس کس ادا کا ذکر کیا جائے۔ آپ کی ناگہانی شہادت کے بعد ہمیں اپنے یتیمی کا احساس ہوا۔ آج ''وام'' کی فضائیں سونی ہیں، جامعہ یوسفیہ اپنے طمطراق سے قائم ہے۔ طلبہ کی چہل پہل ہے۔ وسائل ہیں، کسی چیز کی کمیابی نہیں، تاہم استاذ صاحب کا پرنور چہرہ ہمارے درمیان موجود نہیں تو ہماری رونقیں ہی نہیں۔ ہماری رونق تو ان ہی کی ذات بابرکات سے وابستہ تھی۔ ان کے بعد زندگی کا وہ مزانہ رہا جو ان کے حیات طیبہ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمارے دوستوں کی محنت قبول فرمائے جنہوں نے آپ کے تذکرہ کو محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ آمین

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی!

مولانا عبدالستار، ہنگو

کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہم ہوں گے اور حضرات شیخین یعنی حضرت مولانا عبداللہ رحمہ اللہ تعالیٰ (صدر

مدرس مفتاح العلوم ،ہنگو)اور مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان سے یوں اٹھ جائیں گے۔ دونوں حضرات قوم کو یتیم کر گئے ۔جب تک یہ دونوں حضرات زندہ تھے،ہمیں کسی مشکل اور کٹھن میں کوئی پریشانی اور غم پیش نہیں آیا،ایک طرح کا سایہ اپنے اوپر محسوس کرتے تھے،لیکن اب احساس ہوا کہ جیسے مشفق والدین اپنے ناتواں بچوں کو ایک لق ودق صحرا میں کسی انجان منزل کی طرف سفر میں تنہا چھوڑ دیں، بعینہٖ ہماری یہی حالت ہے۔ خصوصاً مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ کی مظلومانہ شہادت اہل اسلام کے لئے ایک جانکاہ حادثہ تھا جس کی توقع ہی نہ تھی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے علم کے بارے میں ان کے وہی شاگرد لکھیں گے جن کا علمی مرتبہ اس وقت سند کی حیثیت رکھتا ہے۔آپ کے تقویٰ وللّٰہیت کو وہ حضرات اُجاگر کریں گے جنہیں باطنی نور نصیب ہے اور جو خود اہل دل ہیں۔ ہمارے پاس تو محض حضرت کے تلمذ اور ادنیٰ تعلق کی نسبت ہے اور اپنی حیثیت کے پیش نظر یہ اتنی اونچی سعادت ہے کہ کبھی تصور کرتے ہیں تو شکر میں ڈوب جاتے ہیں۔اسی تلمذ اور تعلق کی کچھ یادیں پیش خدمت ہیں۔ان سے حضرت استاذ صاحبؒ کا مقام تو بالکل بھی واضح نہ ہوگا، ہاں!ان مقدس ہستیوں کی معیت میں ہماری اپنی اچھل کود کچھ ضرور سامنے آجائے گی۔اللہ تعالیٰ ان چند سطور کو قبول فرما کر میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین

میں نے ۱۹۸۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور تحصیل علم دین کے شوق میں اپنے ہاں کے مقامی مدارس میں دینی تعلیم شروع کی۔ ہمارے ہاں مدارس میں درجات کا کوئی لگا بندھا نظام اس وقت تک رائج نہیں تھا۔ ہر طالبعلم کی اپنی مرضی ہوتی تھی کہ وہ جو کتاب پڑھنے کے لئے چاہے چُن لے اور جس استاذ کے حلقۂ درس میں چاہے جا کر بیٹھ جائے۔مطالعہ وتکرار کا بھی کوئی مربوط نظام نہ تھا بلکہ یہ سب ذاتی ذوق وشوق پر موقوف تھا۔عموماً طلبہ چند گھنٹے پڑھ کر مسجدوں میں چلے جاتے اور وہیں حجروں میں قیام کرتے۔ مدارس میں لنگر اور مطبخ کا رواج بھی نہ تھا بلکہ نوعمر طلبہ کی ٹولیاں گلی کوچوں سے کھانا اکٹھا کرتی تھیں،جنہیں ہم مقامی زبان میں ''چانڑ'' کہتے تھے اور ایسے نوعمر طلبہ کو'چنڑی'' کہا جاتا تھا۔میں چونکہ سکول سے مدرسہ آیا تھا اس لئے خواہش تھی کہ سکول کی طرح ہر سال کا مخصوص نصاب اور متعین درسگاہ ہونی چاہیے۔اس دوران کسی نے بتایا کہ ہنگو کے ایک دور دراز قصبے ''شاہو وام'' میں کراچی سے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی تشریف لائے ہیں اور انہوں نے درجات کے اعتبار سے تعلیم شروع کی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔غالباً یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے،سالانہ امتحانات سے کچھ عرصہ قبل ہم حضرت کے ہاں حاضر ہوئے۔حضرت نے ہمیں کھانا کھلایا، مجھے کھانے میں روٹی کے ساتھ پودینے کی چٹنی اب بھی یاد ہے۔پھر چند سوالات پوچھے ہم نے جوابات عرض کیے تو فرمایا کہ اگلے تعلیمی سال کے آغاز میں آجائیں ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کا داخلہ ہوجائے گا۔میں

نے گو کہ دور ۲ سال متفرق کتابیں پڑھی تھیں لیکن پھر اولی سے پڑھنا شروع کیا۔

مدرسہ میں سخت عسرت کا حال تھا، پینے کا پانی استاذ صاحب اپنے گھر سے بھر کر لاتے تھے لیکن اتنا کم ہوتا تھا کہ بس ایک ایک گلاس ہی بمشکل پورا ہوتا، اساتذہ اور طلبہ مل کر وضو وغیرہ کا پانی کئی کلومیٹر دور سے بھر کر لاتے تھے۔ ہم ظہر سے قبل اپنے اپنے لوٹے بھر کر کپڑوں کے بکسوں یا الماریوں میں چھپا کر رکھ دیتے تھے، کیونکہ قیلولہ سے جاگنے پر عموماً پانی ختم ہو جاتا۔ صبح بھی یہی حالت ہوتی، اگر غسل جنابت کی ضرورت پیش آتی تو پانچ کلومیٹر دور قصبۂ شاہو جاتے یا تین کلومیٹر دور ایک تالاب پر نہانے جاتے، ایسے طلبہ سحری ہی سے جاگ کر علی الصباح تالاب پر پہنچتے تھے۔

مدرسہ کی کچی عمارت اور چند گھروں کے علاوہ دور دور تک جنگل ہی جنگل تھا۔ اب تو کافی آبادی ہو گئی ہے۔ بجلی کا تو نام ونشان تک نہ تھا۔ اسی جنگل کے درختوں تلے سائے میں بیٹھ کر امتحان کے دنوں میں سبق یاد کرتے۔ ہر طالبعلم نے ایک ایک درخت تلے ڈیرا جمایا ہوتا تھا، اسی درخت تلے رومال بچھا کر اور ہاتھ کا تکیہ بنا کر آرام کرتے۔ ایک صاحب جنریٹر لائے تھے جس کے چلانے کا انچارج میں مقرر تھا، جب کبھی تیل میسر ہوتا تو ہماری عید ہوتی، رات کو مطالعہ وتکرار کے لئے جنریٹر چلاتے لیکن عموماً وہ بھی تیل سے خالی ہی ہوتا تھا۔ حضرت استاذ صاحب کراچی سے دو بڑی لالٹینیں لائے تھے، وہی ہماری روشنی کا کل سرمایہ تھیں۔ صاحب ثروت طلبہ اپنا تیل خریدتے اور بوتل میں تیل ڈال کر اور سرے پر روئی رکھ کر دیسی دیا بناتے تھے اور اس کی روشنی میں پڑھتے تھے، بہت ہی امیر کبیر وہ شمار ہوتا جو ذاتی لالٹین خرید کر لے آتا۔

اس عسرت کے زمانے میں حضرت استاذ کی شفقت اور محبت ہی وہ واحد ذریعہ تھی جو ہمیں روک کر رکھتی۔ ہم آئے تو اسی در کے اسیر ہو کر رہے اور پھر جب تک استاذ صاحب نے دوسری جگہ نہ بھیجا خود کہیں اور جا کر قدم نہ رکھا۔

بندہ کو استاذ صاحب سے فصول اکبری، صرف میر، شرح شذور الذہب، اوضح المسالک، شرح النقایہ، سلم، تحریر کندیا اور شرح جامی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ انداز تدریس میں ایسی کشش تھی کہ وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ زبان کی چاشنی اور حلاوت اس پر مستزاد تھی۔ انداز تحقیقی لیکن سہل تھا، متن گھول کر پلا دیتے تھے۔ حضرت الاستاذ سے پڑھتے ہوئے مجھے یاد نہیں کہ ان مذکورہ کتابوں کا کوئی مقام سمجھ نہ آیا ہو، یا دوبارہ آپ سے رجوع کی نوبت آئی ہو۔ سبق پر پوری طرح دل مطمئن ہو جاتا۔ آج کل کی طرح اردو امالی اور شروحات کا رواج نہ تھا کہ طالبعلم درسگاہ میں سوتا رہے اور بعد میں ان سے رٹتا رہے۔ حضرت جامعیت اور اختصار سے پڑھاتے تھے، کبھی طولانی تقریریں کرتے نہیں دیکھا۔ ہمارے خطے کے مروجہ طویل اشکال وجواب اور قیل وقال والے طرز سے بھی

اجتناب کرتے تھے۔ متن کے حل کو ایسے جامع جملوں سے تعبیر کرتے تھے کہ کوئی اشکال ہی وارد نہ ہوتا تھا بلکہ جملہ اشکالات کے جوابات اسی تعبیر میں ادا ہوجاتے۔

استاذ صاحب حد درجہ حساس آدمی تھے۔ درسگاہ میں بے توجہی یا بے رغبتی سے بیٹھنا ممکن نہ تھا، حتی کہ قلم کا ڈھکن کھولنے کی معمولی آواز بھی طبیعت مکدر کر دیتی۔ بلا وجہ سبق کا ناغہ کبھی نہ فرماتے تھے بلکہ اگر رات گئے دور دراز کے کسی سفر سے تشریف آوری ہوتی تو طلبہ کو جمع کر کے سبق شروع فرمادیتے اور دن کی قضا کر دیتے۔ استاذ صاحب سے چھٹی لینے کا تصور نہ تھا، چھٹی پر سخت ناراض ہوتے۔ ایک دفعہ میں عصر کو کسی کام سے بلا اجازت گھر آگیا، خیال تھا کہ اسباق میں تو ویسے بھی شریک رہا ہوں، صبح پہلے سبق میں پہنچ جاؤں گا، لیکن استاذ صاحب مطالعہ وتکرار کی نگرانی دیگر اساتذہ کے سپرد کرنے کے باوجود خود بھی چکر لگا لیتے تھے اور ہر نماز کے بعد ایک اُچٹتی نگاہ طلبہ پر ڈالنے کا بھی معمول تھا، اس لئے میری غیر حاضری پر مطلع ہو گئے۔ صبح حاضری ہوئی تو طبیعت کے تکدر کا اندازہ ہو گیا، سلام کیا اور مصافحہ کرنا چاہا، تو مصافحہ نہ کیا، اس پر جو تکلیف اور پریشانی مجھے ہوئی وہ سخت سے سخت جسمانی سزا سے بھی زیادہ تھی۔

حضرت کو مہمل طلبہ بالکل پسند نہ تھے، بلکہ مہمل لوگ آپ کے ہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے۔ نیک وصالح طلبہ سے محبت تھی۔ کبھی تہجد قضا کرتے نہیں دیکھا۔ تہجد پڑھنے والے طلبہ کو خود جا کر جگاتے۔ اذان فجر کے ساتھ دار الاقامہ کا چکر لگا کر سب طلبہ کو بیدار کرتے۔ ایک چکر کے بعد دوبارہ کسی طالبعلم کو بستر ے پر پڑے رہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ایسی جسارت کر لیتا تو پھر حضرت کی زبان کے بجائے ہاتھ ہی چلتا۔

فراغت کے بعد استاذ صاحب نے تدریس کے لئے طلب فرمایا اور تقریباً چودہ سال تدریس کی سعادت ملی۔ اس عرصہ میں مختلف مجالس، قومی وملی جرگوں اور سفر وحضر میں استاذ صاحب کا ساتھ نصیب رہا۔ میں واحد مدرس تھا جسے موٹر سائیکل کی نعمت میسر تھی۔ اس لئے حضرتؒ کو مختلف مقامات پر لے جانے کی خدمت مجھے نصیب ہوئی۔ اسفار میں سارا خرچ خود برداشت کرتے، رفقا کو بالکل خرچ کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ہماری مالی حالت الحمدللہ اچھی تھی، ایک سفر میں کھانا کھانے کے بعد میں نے ہوٹل والے کو پیسے ادا کرنے چاہے، جیسے ہی آگے بڑھا استاذ صاحب نے غصہ ہو کر سختی سے ڈانٹا کہ تم کب سے بڑے ہو گئے ہو؟ اور خود بڑھ کر کھانے کی رقم ادا کر دی۔

تدریس کے زمانے میں اساتذہ محض ملازمین کی سی ڈیوٹی ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ استاذ صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سارے انتظامی کام خود ہی بخوشی انجام دیتے تھے۔ آج کل تو گھنٹی بجانے اور صفائی کرنے کے لئے بھی مدرسہ کے چندے سے علیحدہ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جب کہ استاذ صاحب نے تو ہماری ایسی تربیت کی تھی کہ تعمیراتی

کام کے لئے مزدور رکھنا بھی مدرسہ کے چندے کا بلا مصرف ضیاع محسوس ہوتا تھا۔ مدرسہ کے کمروں اور دیواروں کی لپائی کا کام ہم خود ہی کرتے تھے، استاذ صاحب بھی ساتھ شریک ہوتے اور ایک عام مزدور کی طرح بیلچہ چلاتے، تغاریاں اٹھاتے اور پانی بھرتے۔ کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بنوری علوم کا امین اور وارث ہے اور ملک کے گنے چنے محدثین اور محققین میں سے ایک ہے۔ ایک دفعہ پندرہ ٹریکٹر ٹرالی مٹی کا گارا بنا کر لپائی کی جس میں اساتذہ و طلبہ کے ساتھ اہل علاقہ بھی جوش وخروش سے شریک ہوئے۔ مدرسہ کے ان کاموں کے لئے کبھی مزدور رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بلکہ ہم چھٹیوں کا انتظار کرتے اور چھٹیوں میں مدرسہ کے تعمیراتی کام نمٹاتے۔

ایک بار ہم نیا مطبخ تعمیر کر رہے تھے، سخت گرمی کے روزے تھے، اس لئے دن کے بجائے رات کو کام کرنا پڑتا، آخری دن لنٹر ڈالنا تھا تو رات ایک بجے جا کر لنٹر سے فراغت ہوئی، سخت تھکاوٹ تھی، عشا کی نماز پڑھ کر کام شروع کیا تھا اور تراویح باقی تھی۔ ایک بجے کے بعد تراویح کی جماعت کھڑی ہوگئی، ہمارے قاری صاحب بہت ہی آہستہ رفتار سے اہتمام کے ساتھ پڑھتے تھے۔ بس موصوف نے اس دن بھی اپنا یہی انداز برقرار رکھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کی یاد تازہ ہوگئی۔ خوب غصہ قاری صاحب پر آ رہا تھا لیکن استاذ صاحب کے خوف سے کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔

حضرت استاذ صاحب کے دیگر کمالات واوصاف پر تو کئی احباب لکھیں گے بندہ ذرا قومی وملی خدمات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے کیونکہ تقریباً تمام اہم قومی وملی مسائل میں اس فقیر کی حضرت کے ساتھ شرکت ومعیت رہی اور اپنے بعد سنی سپریم کونسل جیسے نازک، حساس اور بھاری ذمہ داری کا کام بھی بندہ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ اس امتحان میں بندہ کو سرخرو فرمائے۔

نائن الیون کے بعد ہمارے خطے میں مسلح تحریکوں کا جو عروج شروع ہوا، اس کے بڑے ہی بھیانک نتائج سامنے آئے۔ حضرت استاذ صاحب اس خطے کو پُرامن دیکھنا چاہتے تھے، اسی وجہ سے آپ نے افغان طالبان اور احمد شاہ مسعود کے درمیان بھی صلح کرنے کی کوشش کی اور ہنگو میں قیام امن کے لئے حکومت کو ممکنہ تجاویز پر مشتمل طویل خطوط لکھے اور خود بھی عملی اقدامات کیے۔

حضرت بتلاتے تھے کہ قبائل کے لوگوں کو مسلح کر کے حکومت سے بغاوت پر آمادہ کرنے کی بین الاقوامی سازش کے دو بڑے مقاصد ہیں۔ ایک تو دینی طبقے کی عوامی سطح پر وقعت ختم کر کے اس پر گھیرا تنگ کرنا، جس میں شریعت اسلامی کے عنوان سے ناروا کاموں کا اجراء، اور اس کے نتیجے میں معاذ اللہ شریعت سے لوگوں کا تنفر اور مدارس دینیہ کا خاتمہ شامل ہے۔ دوسرا پاکستانی فوج کو کمزور کرنے کی کوشش۔ حقیقت یہی ہے کہ قبائل اور فوج کے تصادم سے ان

دونوں ملک دشمن سازشوں کی تکمیل کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر دینی قوت خصوصاً جذباتی نوجوان اس آگ کے بھینٹ چڑھے ہیں۔ اس کے نتیجے میں امن پسند دینی قوتوں کی راہ میں بھی روڑے اٹکائے گئے اور مدارس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاک فوج کے ہزاروں نوجوان بھی اس جنگ کے بھینٹ چڑھے۔ فوج جو ملک میں تقدس اور احترام کے نگاہ سے دیکھی جاتی تھی پاکستانی عوام خصوصاً قبائلی عوام کی نظروں سے گرادی گئی اور اپنے ملک کے اندر ہی ان کے ٹھکانے غیر محفوظ ہوگئے۔

استاذ صاحب نے اپنی بساط کی حد تک اسلام اور ملک دشمن عناصر کی اس گہری سازش کو روز اول سے ناکام بنانے کے لئے پوری جدوجہد کی۔ جب ہمارے صوبہ کے گورنر ہمارے دور کے رشتہ دار جناب علی محمد جان اورکزئی بنے، تو انہوں نے بندہ اور چند دیگر احباب کی وساطت سے استاذ صاحب سے اپیل کی کہ قبائل اور فوج کے ٹکراؤ کو روکنے اور قیام امن کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ حضرت استاذ صاحب کا منشا تو پہلے سے یہی تھا۔ لہٰذا ہم نے پوری تندہی اور دل جمی سے اس ایشو پر کام کیا اور بحمد اللہ اس کے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

سب سے پہلا قضیہ شمالی وزیرستان میں حافظ گل بہادر اور حکومت کے مابین صلح کا قیام تھا۔ الحمد للہ اس کے لئے ہمارے کئی اسفار ہوئے، ملاقاتیں ہوئیں، جانبین کو متفقہ نکات تک لانے کے لئے طویل کام کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں ۲۰۰۶ء میں امن معاہدہ ہوگیا جو بحمد اللہ استاذ صاحب کی حیات کے بعد ۲۰۱۴ء تک چلا۔

ان گھمبیر مسائل میں استاذ صاحب کا نکتہ نظر یہ تھا کہ قبائل کے لوگوں کو اول وہلہ میں غیر مسلح کرنا ناممکن ہے اور اس کی ضد سے سنگین مسائل جنم لیں گے، اس کا حل یہ ہے کہ فوج اور یہ مسلح تحریکیں ایک ضابطۂ اخلاق کے تحت مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے کام کریں۔ جس میں اہم طویل ترین سرحد کی حفاظت اور افغانستان وکشمیر میں ملک دشمن عناصر کی سرکوبی کی تجویز شامل تھی۔

اسی نوعیت کی جدوجہد جنوبی وزیرستان کی مسلح تحریکوں کے ساتھ بھی کی گئی، تاہم وہ اس فارمولے پر راضی نہ ہوئے اگر جنوبی وزیرستان کے قبائل استاذ صاحب کے ساتھ اس فارمولے پر اتفاق کر لیتے تو امید تھی کہ وطن عزیز ان خون آشام حالات کا شکار نہ ہوتا، کیونکہ جنوبی وزیرستان ہی سے پورے پاکستان میں اداروں اور فوج کے ساتھ جنگ کی کمانڈ کی گئی اور آپریشن کی صورت میں یہی حضرات شمالی وزیرستان میں داخل ہوئے، جہاں ۲۰۱۴ء میں بالآخر ان کی پالیسیوں سے ایک بار پھر آپریشن کی راہ ہموار ہوئی اور وہ علاقہ جو استاذ صاحب کی جدوجہد کے نتیجے میں امن کا گہوارہ بن رہا تھا، آگ وخون کے لپیٹ میں آگیا۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ عالمی سازش کے تحت ہی یہ کھیل کھیلا گیا کہ شمالی وزیرستان کا امن تاراج کرنے کے لئے

یہ طریق اختیار کیا گیا اور استاذ صاحب کی شخصیت کو راستے سے ہٹانے کے پیچھے بھی انہی قوتوں کا ہاتھ تھا جو ملک میں اس سطح کے امن کی کامیاب کوششوں والی شخصیات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل میں زبردست رکاوٹ سمجھتے تھے۔

افغانستان تک مال اور اسباب جنگ سپلائی کرنے کے لئے امریکہ کے پاس سب سے محفوظ اور مختصر راستہ پشاور سے تورخم شاہراہ ہے۔ عالمی طاقتوں نے اسے مجاہدین کی دسترس سے دور رکھنے کے لئے خیبر ایجنسی میں بھی بدامنی پیدا کی تاکہ وہاں کا جہادی ذہن باہم دست وگریباں ہوجائے اور عالمی دہشت گرد کو کھلی چھوٹ مل جائے۔ اس سلسلے میں باڑہ (خیبر ایجنسی) کے پیر سیف الرحمن اور مفتی منیر شاکر کے درمیان مسلکی اختلافات کو زور دے کر مسلح ٹکراؤ تک نوبت پہنچائی گئی، جب پیر سیف الرحمن نے علاقہ چھوڑ دیا تو ایک نئی سازش کے تحت مولوی محبوب اور منگل باغ کے گروہوں کے درمیان تصادم کروادیا گیا، اس جنگ میں جانبین سے سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور کثیر مالی وسائل برباد ہوئے۔ گورنر صاحب کی خواہش پر استاذ صاحب نے قیام امن کے لئے یہاں بھی پوری کوشش کی، یہ کوشش فریقین کی ضد وعناد کے باعث زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی اور اس جنگ کے شعلے وطن خداداد کو جھلسانے آج بھی بھڑک رہے ہیں۔

لال مسجد کے قضیہ میں بھی بندہ استاذ صاحب کے ساتھ تھا، کربوغہ کے مفتی مختار الدین صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ استاذ صاحب نے حکومت کے ارکان کو اپنے فارمولے پر راضی کر لیا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ محض تلاشی کے بعد پریس کانفرنس کر کے بیان جاری کر دیا جائے گا کہ مسجد ومدرسہ سے کچھ بھی نہیں ملا اور مولانا عبد العزیز صاحب بھی اپنے اقدام سے واپس ہٹ جائیں گے۔ ہم تین دن تک اس سلسلے میں اسلام آباد میں رہے۔ غازی عبد الرشید شہیدؒ استاذ صاحب کے فارمولے سے متفق تھے لیکن مولانا عبد العزیز راضی نہ ہوئے۔ استاذ صاحب نے شاگرد ہونے کے ناطے سخت باتیں بھی سنائیں اور ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی، آپ نے مولانا عبد الحفیظ مکی صاحب کو بھی مکہ سے سمجھانے کے لئے بلایا لیکن کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کھیل کی جڑیں کافی گہری ہیں اور اس کے ڈورے بڑے دور سے ہل رہے ہیں۔ اسے اتنی آسانی سے سلجھانا ممکن نہیں، یوں ہم ناکام واپس لوٹ آئے۔

ہنگو کے عوام کے لیے آپ کی کاوشیں بھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ حضرت الاستاذ نے ہنگو کی تعمیر وترقی کے لیے علاقائی افسران، سیاسی نمائندوں اور مقتدر حلقوں پر ہمیشہ دباؤ ڈالے رکھا۔ جس زمانے میں علی محمد جان (سابق گورنر خیبر پختون خواہ) فوج میں حاضر سروس تھے، تو آپ نے انہیں ہنگو سے کوہاٹ تک ''سماری'' گاؤں کے راستے روڈ

تعمیر کرنے کے بارے میں خط لکھا، آپ کا مدعا یہ تھا کہ یہ شاہراہ فوجی نقطہ نگاہ سے اہم جغرافیائی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ہنگو کے سنی عوام کی بڑی ضرورت ہے، کیونکہ کوہاٹ سے ملنے والی واحد اہم شاہراہ پر کئی کلومیٹر تک مخصوص فرقہ کی اجارہ داری ہے، جو کسی وقت بھی سیاسی مقاصد کے لئے اسے بند کر کے علاقے میں معاشی بحران اور سنگین مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ علی محمد جان نے انہیں جوابی خط میں یقین دہانی کرائی کہ واقعی یہ شاہراہ دفاعی وفوجی نقطہ نگاہ سے اہم اور محفوظ علاقوں سے گزرتی ہے اور اس کا تعمیر ہونا ملکی مفاد میں ہے جس کے لئے وہ اپنی بھرپور کوشش کریں گے۔ جب وہ ایک طویل عرصہ بعد گورنر بنے تو استاذ صاحب اور بندہ نے ان سے ملاقات کر کے وہ خط دکھایا، جس پر انہوں ایک بار پھر اپنے عزم کا اعادہ کیا، جب حضرت الاستاذ نے اس شاہراہ کا اپنی مدد آپ کے تحت افتتاح کرایا تو بعد میں حکومت نے بھی دلچسپی ظاہر کی اور تعاون کر کے اس روڈ کو پختہ کرنے کے لئے خطیر رقم کی منظوری دی۔

حضرت الاستاذ نے اس روڈ کی آبادی اور کامیابی کے لیے اس کے نقطہ آغاز کے قریب H.D.A کے نام سے ایک پوش علاقے کی تعمیر کے نئے منصوبے پر غور وفکر شروع کیا۔ اس کے لئے کئی سیاسی نمائندوں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور انہیں یہ باور کرایا کہ اس طرح کے منصوبے ہنگو کی ترقی کے لئے ازحد ضروری ہے، طویل جدوجہد کے بعد بحمداللہ یہ منظور ہوا، عنقریب اس کا آغاز ہونے والا ہے۔

جب ۲۰۰۶ء میں شرپسند عناصر نے ہمارا ایک کلومیٹر لمبا بازار مکمل جلا کر راکھ کر دیا، تو حضرت الاستاذ نے اس جگہ سے بازار کی منتقلی کا فیصلہ کیا، کیونکہ جب بھی فسادات ہوتے یہ علاقہ شرپسندوں کی دسترس میں ہونے کی وجہ سے عوام کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا، اس لیے مستقل بنیادوں پر اس کا حل لازمی تھا، حضرات شیخین نے اعلان کیا کہ سنی قوم کا کوئی فرد دکان نہیں کھولے گا نہ ہی ازخود تعمیر کرے گا، جب تک حکومت تاوان ادا نہ کردے بصورت دیگر بازار کوئی جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ تقریباً چھ مہینے حکومت کے ساتھ ہمارے اعصاب شکن مذاکرات ہوتے رہے، اس عرصہ میں مکمل ہڑتال رہی، بالآخر ہماری سنی سپریم کونسل اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہوئی، حکومت کی طرف سے ۲۳ کروڑ تاوان ملا، اس سے محض سنی ہی مستفید نہیں ہوئے، بلکہ اہل تشیع کو بھی امداد ملی گو کہ یہ جدوجہد سنی سپریم کونسل کی تھی، لیکن حضرت الاستاذ کی پالیسی ایسے مواقع پر اجتماعی مفاد کی نوعیت کی ہوتی، وہ سنیوں کو صرف نقصان سے بچا کر اپنا حق دلانا چاہتے تھے اگر اس ضمن میں علاقہ کے دیگر طبقات فیض یاب ہوتے تو ان کے استحصال کی آپ نے کبھی کوشش نہیں کی۔

ہنگو عوام کے لئے جدید ہسپتال کی تعمیر انتہائی ضروری تھی، موجودہ ہسپتال چھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ بازار میں واقع تھا، جدید ہسپتال کے لئے حضرت الاستاذ نے کافی بھاگ دوڑ کی، بالآخر اکرم درانی سے ۸۰ لاکھ روپے اس کے

لئے منظور کروائے، اس کے لئے جگہ کا انتخاب آپ کے منشا کے مطابق ہوا، وہ جگہ ایسی ہے کہ ہنگو کے ساتھ ساتھ اورکزئی، کرم اور وزیرقبائل کے لئے بھی اہم ہے۔ اس جگہ کو مسترد کرنے کے لیے مخالفین کی طرف سے سخت کوششیں ہوئیں، کئی عرصہ کام رکا رہا، لیکن حضرت ڈٹے رہے، اس پر وزیراعلیٰ حیدر ہوتی نے مقامی انتظامیہ کو عوامی رائے لے کر اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ ڈی سی آفس میں ہمارا اجلاس طلب کیا گیا، بحمد اللہ تمام اقوام کے نمائندوں نے حضرت الاستاذ کے انتخاب کو اپنا حتمی مؤقف بتلایا، یوں ہسپتال کی تعمیر اسی مجوزہ مقام پر ممکن ہوئی۔

ہنگو عوام پر آپ کا بڑا احسان سنی سپریم کونسل کا قیام تھا، جب شیعہ سنی تنازع کے پس منظر میں مفاد پرست عناصر اور ملک دشمن قوتیں سرگرم عمل ہوئیں تو آپ نے اپنی دوراندیشی سے مستقبل کے مہیب خطرات کا اندازہ کرتے ہوئے کونسل کی تجویز پیش کی، آپ کی آواز پر تمام سیاسی، مذہبی تنظیموں اور سماجی رہنماؤں نے لبیک کہا اور تقریباً پونے چار سو افراد کی نمائندہ شوریٰ نے مولانا عبداللہ صاحبؒ کو امیر اور آپ کو نائب امیر چنا۔ سنی سپریم کونسل کا بنیادی مقصد حکومت کے ساتھ امن کے لئے تعاون اور سنی حقوق کی بازیابی و بحالی تھا، لیکن ہمارے خطے کے کشیدہ حالات میں جب تمام سیاسی رہنماؤں نے ہنگو عوام کو بے سہارا چھوڑ کر اسلام آباد اور پشاور کی راہ لی، تو مجبوراً ہنگو کا سیاسی میدان بھی کونسل کو سنبھالنا پڑا، اور ہنگو عوام کے اکثر سیاسی کام بھی کونسل کے مرہون منت رہے، ان اکابر نے جب اس ناچیز کے کندھوں پر کونسل کی ذمہ داری ڈالی تو اس وقت ہنگو اور اردگرد کا خطہ آگ و خون میں کھیل رہا تھا، کونسل وہ واحد عوامی تنظیم تھی جس نے میدان نہیں چھوڑا، مسلح تحریکوں کا بھی سامنا کیا اور حکومت کے جبر کو بھی مذاکرات اور عوامی قوت سے روکے رکھا۔

استاذ صاحب کی ایک خواہش ہنگو میں عصری علوم کی بہترین درسگاہوں کا قیام بھی تھا، اس سلسلہ میں سنی سپریم کونسل کا دیرینہ مطالبہ ہنگو میں یونیورسٹی کے قیام کا رہا ہے، اگر فی الوقت یونیورسٹی قائم نہ ہو سکے تو کسی بڑی یونیورسٹی کے کیمپس تو ضرور قائم ہونا چاہیے۔ یہ استاذ صاحب کی ایک خواہش تھی، امید ہے کہ ہم اسے پورا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ہنگو کے عوام کے لیے حضرت الاستاذ نے تمام ملکی و ملی مسائل میں وطن دوستی کے ناطے اپنا خالص علمی و تحقیقی مزاج قربان کیا اور میدان میں اترے، آپ پر اخفا کا غلبہ تھا، کردار ہمیشہ خاموش ادا کرتے تھے اور اپنی کاوشوں کو میڈیا وغیرہ سے بچا کر انجام دیتے۔

بندہ نے اس طویل جدوجہد میں ایک عجیب بات ملاحظہ کی کہ واللہ! استاذ صاحب نے اس ساری بھاگ دوڑ میں حکومت کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا، بلکہ اسفار کا خرچہ بھی خود برداشت کیا حتی کہ گورنر صاحب...... جو ہمارے رشتہ

دار تھے ..... کے گھر کا پانی بھی نہیں پیتے تھے۔ گورنر علی محمد جان کا کہنا تھا کہ علما کے بارے میرا تصور شفاف نہ تھا لیکن مولانا محمد امین صاحب کو دیکھ کر مجھے سمجھ آگئی کہ علما کون اور کیسے ہوتے ہیں؟ آپ کے خلوص کے ناطے انہیں آپ پر بھرپور اعتماد تھا اور آپ کے پیش کردہ امن فارمولوں کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ افسوس کہ امن کے لئے طویل جنگ لڑنے والا یہ سپاہی خود امن کے رکھوالوں کے ہاتھ جان کی بازی ہار گیا۔ ہم تو آپ کے ہم سفر تھے، سوچیے کہ اس ناروا سلوک اور ظلم وستم سے ہم پر کیا بیتی ہوگی؟

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانوں پہ کیا گزری

ایک عہد زریں کا خاتمہ

قاری اقبال احمد، بشام

حال من در ہجر حضرت کمتر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود من پدر گم کردہ ایم

علما انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں اور وارث وہ ہوتا ہے جس کو مورث کے ترکہ میں ہر نوع سے حصہ ملے۔ اگر مورث کے ترکہ میں ہر نوع سے حصہ نہ ملے، تو وہ وارث نہیں وائن ہوتا ہے۔ شیخ الحدیث استاذنا المکرم استاذ العلماء، شہید اسلام حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ ان علما میں تھے، جنہوں نے دین اور قال اللہ وقال الرسول کی ترویج کے لئے اپنا تن من دھن وقف کیا تھا۔ بندہ ناچیز کی حضرت اقدس سے پہلی ملاقات ۱۹۸۲ء میں ہوئی، جبکہ بندہ فقیر کی عمر اس وقت سولہ سال تھی۔ حفظ اور تجوید سے فراغت کے بعد بندہ اور بندہ کے بھائی قاری مشتاق احمد اور چند اور رفقا کے بارے میں حضرت محترم والد صاحب مولانا نذیر صاحب مدظلہ العالی نے حضرت مولانا فضل محمد صاحب (مینگورہ سوات) کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ درجات کتب کے لئے تمہیں ہنگو جانا پڑے گا۔ لہٰذا ستمبر ۱۹۸۲ء میں ہم سب ہنگو جامعہ یوسفیہ شاہوو ام میں داخل ہوئے اور ۱۹۸۶ء تک یہیں پر تعلیمی سلسلہ جاری رہا، اس دوران ہم نے جو دیکھا اور سنا میرا قلم اس کے لکھنے سے قاصر ہے، لیکن احباب کے اصرار پر اور والد صاحب کی تاکید پر جرأت کر کے شروع کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ صحیح اور سچ لکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شہیدؒ کو ایسے علم سے نوازا تھا کہ وقت کے کبار علما حضرت کے علم کے قدردان تھے، ایک بار ہم تبلیغ میں سال کے سفر سے واپسی پر حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت کے حجرے میں رات کے کھانے سے فارغ ہوئے، تو استاذ گرامی کا تذکرہ چھڑ گیا۔ اس پر مولانا فضل محمد سواتیؒ نے فرمایا کہ ایسا علم اور ادب جس سے اللہ تعالیٰ نے مولانا امین کو نوازا ہے، ہم نے اپنے اکابر میں دیکھا تھا۔ حضرت مولانا فضل محمدؒ کی حضرت شہید سے محبت اور تعلق کسی سے مخفی نہیں ہے، جو خطوط حضرت مولانا فضل محمدؒ کی طرف سے حضرت شہیدؒ کے نام پر ہیں، وہ خطوط مولوی یوسف کے پاس موجود ہیں، ان خطوط سے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب اکثر ہمارے ہاں میرہ بشام تشریف لاتے تھے، فرماتے تھے کہ میرا دل تین جگہوں پر خوش ہوتا ہے۔ ہنگو میں مولوی محمد امین صاحب کے ہاں۔ مولوی محمد صالح صاحب (ڈیرریحان پور) کے ہاں اور تیسرا میرے والد مولانا نذیر صاحب کا نام لیتے کہ ان کے ہاں اور یہ تینوں حضرات حضرت مولانا فضل محمدؒ کے متعلقین تھے۔ حضرت شہیدؒ ایک جامع صفات کے مالک تھے، اپنے اکابر سے انتہائی عقیدت اور محبت رکھتے تھے، خصوصاً انور شاہ کشمیریؒ، علامہ زاہد کوثریؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ کے انتہائی قدردان تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت مولانا فضل محمدؒ کے بے

شمار صفات اپنی جگہ لیکن میں حضرت کی دینی حمیت اور غیرت سے بہت متاثر ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کی دینی حمیت اور غیرت باقی صفات پر غالب تھی۔

حضرت شہید کو ہر فن میں کامل مہارت حاصل تھی، جس فن میں بحث شروع کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ اس فن کے موجد ہیں۔ ایک دفعہ رمضان میں اعتکاف کے موقع پر مسئلہ حیات الانبیاء پر بحث کرتے ہوئے آخر میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ قاری صاحب! بعض اوقات ایک مسئلہ پر بحث کے دوران اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے القائی اور الہامی دلائل مستحضر ہوتے ہیں۔ یہ دلائل پہلے مجھے یاد ہوتے ہیں نہ بعد میں یاد رہتے ہیں، اگر ہو سکے تو ان کو محفوظ کرو لیکن افسوس! ہمیں کیا معلوم حضرت اتنی جلدی ہمیں الوداع کہتے ہوئے دار الفناء سے دار البقاء رحلت فرمائیں گے۔ حضرت شہیدؒ خود جبل علم تھے اور جبال علم کے قدردان تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ حضرت بنوریؒ مجھے اور حبیب اللہ مختارؒ کو فرماتے تھے کہ "انتمالی بمنزلة جناحیی "معارف السنن جو حضرت بنوریؒ کی مایہ ناز تالیف ہے، ہم نے اپنے بعض احباب سے سنا ہے کہ اس تالیف میں حضرت شہیدؒ کا اہم کردار ہے۔ دوران مطالعہ کتاب کے حاشیہ پر اکثر ضروری تحقیق ضبط فرماتے تھے تو وہ ایسی تحقیق ہوتی کہ کتابوں میں نہ ملتی تھی۔ ملا علی قاریؒ کے بہت قدردان تھے اور ہمیشہ یہ آرزو کرتے تھے کہ کاش! مدارس والے ملا علی قاریؒ کی کتاب شرح النقایہ کو داخل نصاب کریں اور اپنے مدرسہ جامعہ یوسفیہ میں غالباً ۱۹۸۴ء سے داخل نصاب کی ہے اور آج تک درجہ رابعہ میں شرح الوقایہ کی جگہ پڑھائی جاتی ہے، علامہ ابن ہشام مؤلف اوضح المسالک کے بھی نہایت قدردان تھے اور اوضح المسالک درجہ ثالثہ میں بجائے کافیہ کے پڑھائی جاتی تھی اور دوسرے مدارس والوں کو بھی پڑھانے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت شہیدؒ فنون سے فراغت کے بعد دورۂ حدیث کے لئے جامعہ اشرفیہ لاہور گئے، لیکن بعض عوارض کی وجہ سے چند دنوں کے بعد وہاں سے کراچی جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن گئے اور وہاں حضرت بنوریؒ اور حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ اور دیگر اکابر علما کی صحبت میں ٦٧ء سے ٨٠ء تک ۱۴ سال رہے اور ٨٠ء میں حضرت بنوری کی وفات کے دو سال بعد اپنے آبائی علاقہ شاہو وام ہنگو آئے چونکہ اس علاقے کے لوگ دین سے محبت رکھنے والے تھے، علاقہ کے لوگوں نے خوب تعاون کیا اور ایک دینی ادارہ جامعہ یوسفیہ مشورہ سے قائم ہوا جو الحمد للہ اب ملک کے عظیم جامعات میں سے ہے، اگرچہ حضرت کو مختلف مدارس سے شیخ الحدیث کے منصب کے لئے پیش کش آئی تھی لیکن حضرتؒ یہ چاہتے تھے کہ علاقہ میں دینی خدمت ہو جائے، خصوصاً رسومات، بدعات کے خلاف حکمت عملی سے کام کیا جائے۔ چنانچہ حضرتؒ مدرسہ بھی چلاتے تھے اور عوام کی تربیت بھی کرتے تھے۔ الحمد للہ جتنی بدعات اور رسومات تھیں وہ حضرت کی محنت سے ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرتؒ مختلف دینی جماعتوں کی سرپرستی بھی فرماتے

تھے، یہ ان کی اخلاص اور للّٰہیت کی علامت تھی۔

تصوف سے حضرتؒ کا خاص شغف تھا اور قطب زمان حضرت مولانا سراج الیوم صاحب عرف (گڑھئی بابا جی صاحب) سے سلسلہ قادریہ اور نقشبندیہ میں خلافت حاصل تھی۔ دلائل الخیرات میں آپ حضرت مولانا فضل محمد سواتی کے مجاز تھے، وہ حضرت مولانا محمد قمر صاحب عرف جرہ استاد صاحب کے مجاز تھے، وہ حضرت ولی احمد صاحب (عرف سنڈاکی بابا جی صاحب) کے مجاز تھے اور سنڈاکی بابا جی دلائل الخیرات میں شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق صاحب کے مجاز تھے۔ دلائل الخیرات کے ورد کا خود بھی اہتمام کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اہتمام کی ترغیب دیتے تھے۔ حضرتؒ میں دینی حمیت اور غیرت اتنی تھی کہ دین کے بارے میں بال کے برابر کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ریاکاری اور شہرت سے انتہائی نفرت تھی، ایسی شخصیت کی طرف بالکل توجہ نہ فرماتے تھے جو شہرت کے لئے کام کرتا ہو۔

مدرسہ کے لیے چندہ کے سلسلے میں اپنے مربی حضرت بنوریؒ کا ایک جملہ 'اسمعت من ناجیت' اکثر دہراتے تھے۔ آپ اس حوالے سے مکمل حضرت بنوریؒ کے نقش قدم پر تھے، مدرسہ کا کوئی سفیر نہیں ہوتا تھا اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اللہ چلائے گا ہم لوگوں سے سوال کے مکلف نہیں ہیں۔ جب بھی چلانے کے اسباب ختم ہوجائیں بند کردیں گے۔

حضرت کتابوں کا مطالعہ اتنے اہتمام اور شوق سے فرماتے تھے کہ گویا حضرتؒ صرف مطالعہ ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں، فرماتے تھے کہ جنت میں بھی مطالعہ کا شوق پورا کروں گا اور طلبہ کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، متعلقین میں سے جو ساتھ رہتے تھے اور مطالعہ نہیں کرتے تھے، ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے، اتنا عمیق مطالعہ کرتے تھے کہ ہر کتاب کے مطالعہ کے بعد صرف مسئلہ کا اخذ نہیں بلکہ مؤلف کتاب کا مزاج بھی معلوم کر کے بتاتے تھے۔

۱۹۹۶ء سے رمضان کا یہ معمول تھا کہ پورا مہینہ اعتکاف کرتے تھے، دوران اعتکاف سب سے زیادہ عمل قرآن کی تلاوت ہوتا تھا۔ لیکن مطالعہ کا شوق بہت زیادہ تھا اسی وجہ سے کبھی سارا دن مطالعہ میں مصروف رہتے، رات کا اکثر حصہ تلاوت میں صرف کرتے تھے، بندہ حقیر ۲۰۰۰ء سے اخیر عشرہ کے اعتکاف میں شریک ہوتا تھا اور یہ سلسلہ شہادت تک جاری رہا، اپنے اکابر سے انتہائی عقیدت اور محبت تھی، ایک دفعہ فرمایا کہ میں کچھ نہیں ہوں اور سرتاپا گناہوں میں ڈوبا ہوا ہوں لیکن چند اکابر کے نام لئے کہ ان حضرات کی توجہ کے چشموں کا فیضان میرے اوپر ہے جو مجھے صاف کرتا ہے: ۱۔ حضرت مولانا بنوریؒ ۲۔ مولانا عبدالغفار صاحبؒ کوہاٹ۔ ۳۔ مولانا فضل محمد صاحبؒ سواتی ۴۔ مولانا سراج الیوم صاحب۔ ۵۔ مولانا محمد کریم کاکاخیلؒ۔

اپنے اساتذہ میں سے مولانا بنوریؒ صاحب اور مولانا عبدالغفار صاحبؒ کے علم کے مداح تھے۔ ایک دفعہ میں

نے پوچھا کہ حضرت آپ مولانا عبدالغفار صاحب کے درس کی بہت تعریف کرتے ہیں، کیا حضرت بنوریؒ سے بھی تدریسی مہارت زیادہ تھی؟ فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا: حضرت احادیث میں قرأۃ فاتحہ خلف الامام کی بہت تاکید آئی ہے، اگر تکبیر تحریمہ کے بعد مقتدی ثنا کی بجائے سورۃ فاتحہ ثنا کی نیت سے پڑھے تو ثنا اور فاتحہ دونوں ادا ہو جائیں گے؟ فرمایا کہ قاری صاحب! یہ محض ادعا ہے، حقیقت اور ہے یعنی مسلک حنفی کے سخت پابند تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کے احتیاطی قول پر عمل کرتے تھے۔ اگر چہ اس مسئلہ میں صاحبین کے قول پر فتویٰ ہوتا۔

ضیافت اور سخاوت میں آپ امتیازی شان رکھتے تھے۔ مہمان جو بھی ہوتا حد سے زیادہ اکرام فرماتے تھے، حضرت کی سخاوت کو دیکھ کر فرزدق کا وہ شعر یاد آتا ہے جو غالباً امام زین العابدینؒ کے حق میں کہا تھا:

ماقال لاقط الا فی تشهده

لولا التشهد کانت لا ء ه نعم

خصوصاً رمضان میں حضرت اپنے اقارب اور متعلقین پر بہت مالی شفقت فرماتے تھے اللہ تعالیٰ کے تعلق کا یہ حال تھا کہ رات کا اکثر حصہ ذکر میں گزارتے تھے، اپنے اکابر کا انتہائی احترام کرتے، لیکن فرماتے تھے کہ میں مقلد صرف امام ابوحنیفہؒ کا ہوں۔ عصر حاضر کے علما حضرت مولانا علی شیر حیدریؒ اور مولانا منظور احمد مینگل کے انتہائی قدردان تھے، ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ ارادہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا علی شیر حیدریؒ کو دو تین دن کے لئے آپ کے ہاں بشام لے جاؤں کہ وہاں کے معقولی علما کو پتہ چلے کہ پنجاب اور سندھ میں بھی معقولی علما موجود ہیں۔ اخیر دور میں حضرت عارف باللہ چلاسی بابا مدظلہ العالی سے تعلق قائم ہوا تھا اور حضرت چلاسی بابا کا ذکر احترام سے کرتے تھے، فرماتے تھے کہ حضرت چلاسی علمی مباحثہ میں کبھی کبھی وہاں تک جاتے ہیں، جہاں ہمارا علم کام نہیں کرتا۔

تبلیغی جماعت سے بہت گہرا تعلق تھا، اکثر تبلیغی اجتماعات میں شرکت فرماتے، ایک دفعہ فرمایا کہ اخیر میں ان شاء اللہ ان بستر ے والوں کی حکومت ہوگی۔

حضرت مولانا عزیر گل صاحبؒ اسیر مالٹا بھی آپ پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے حضرت عزیر گل صاحبؒ سے تبلیغی جماعت کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ بہت اچھا کام ہے، اچھے لوگ ہیں، لیکن امارت کی بو ان سے آتی ہے۔

حضرت میں استغنا بہت زیادہ تھی۔ مدرسہ کے لئے کبھی بھی اندرون یا بیرون ملک چندہ کے لئے نہیں گئے، ایک دفعہ رمضان میں جب میں اپنے معمول کے مطابق اخیر عشرہ میں اعتکاف کے لئے حاضر ہوا تو خیر و عافیت پوچھنے کے بعد میرے بھائی کے متعلق فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ قاری مشتاق احمد صاحب کراچی چندہ کرنے گئے تھے۔

میں نے کہا: نہیں، وہ تو شیخ الحدیث مولانا عنایت اللہ کی شہادت پر تعزیت کے لئے گئے تھے۔ فرمایا کہ قاری صاحب سے کہو کہ سوال کا دروازہ کھولنا آسان ہے لیکن پھر اس کو بند کرنا مشکل ہے۔

حضرت کے کارناموں میں ایک کارنامہ ہمارا مدرسہ جامعہ عائشہ صدیقہؓ ہے جو حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ ، ہمارے والد صاحب مولانا محمد نذیر صاحب مدظلہ العالی مہتمم جامعہ عائشہ صدیقہؓ، شنگ بشام شانگلہ، حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ اور حضرت مولانا عبداللہ صاحب، شیخ الحدیث مفتاح العلوم ہنگو کا عظیم کارنامہ ہے کہ ان اکابر کے استخاروں اور استشاروں کے بعد معرض وجود میں آیا ہے اور الحمدللہ اب تک ان حضرات کی دعاؤں اور برکات سے چل رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت شہیدؒ صفات کمالیہ کا مجموعہ تھے۔

مولانا رشید احمد مؤلف عوارف الجامی شرح شرح جامی کا قول بجا ہے کہ حضرت شہید متقدمین میں سے تھے لیکن زمانہ متاخرین کا پایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت شہید علم وادب، تواضع وانکساری، سخاوت وشجاعت، درس و تدریس، زہد وتقویٰ، تعلیم وتربیت، محبت وشفقت، خدمت دین وخلق، ایثار وہمدردی، عبادت وضیافت، تالیف و تصنیف اور اخلاص وللّٰہیت میں متقدمین کا نمونہ تھے۔ حضرت کی شہادت کے بعد الحمدللہ حضرتؒ کا لگایا ہوا باغ خوب زور سے پھل دے رہا ہے۔ حضرتؒ کے جانشین مولانا محمد یوسف (حفظہ اللہ تعالیٰ) نے باقاعدہ جامعہ کا انتظام سنبھالا اور حضرت شہیدؒ کی وفادار جماعت اور احباب مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ العالی، مولانا مفتی عظمت اللہ صاحب مدظلہ العالی، مولانا فیض الرحمن صاحب مدظلہ العالی، مولانا عبدالمالک صاحب مدظلہ العالی، مولانا احسان اکبر صاحب اور دیگر احباب نے جامعہ کے ساتھ اس عظیم وفاداری کا ثبوت دیا کہ جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ومعین ہو اور ان کی ہر مشکل آسان فرمائیں۔

تھکی ہے فکر رسا مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا مدح باقی ہے

منبع عنایات

مولانا محمد ہاشم مسعود، نانک

ہمارے ساتھیوں نے حکم دیا ہے کہ حضرت الاستاذ سے وابستہ اپنی یادیں مضمون کی شکل میں دے دیں، بندہ لکھنے کا تجربہ نہیں رکھتا، اس لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں کہ اس مضمون میں آپ کو کوئی صحافیانہ رنگ نظر نہیں آئے گا۔ بس جو منتشر باتیں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی یاد آتی جائیں گی، بے ربط سی عرض کر دوں گا۔ اہل اللہ کے تذکرے خواہ جس شکل میں ہوں برکت سے خالی نہیں ہوتے، ان شاء اللہ حضرت کا یہ تذکرہ لکھنے والے اور قارئین کے لئے یکساں باعث خیر ثابت ہوگا۔

استاذ نا المکرم منبع عنایات بے غایات والطاف بے نہایات نور اللہ مرقدہ سے ابتدائی تعارف ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ بندہ حضرت کے ہاں جامعہ یوسفیہ میں درجہ ثانیہ میں داخلہ لینے کیلئے حاضر ہوا اور مسلسل تین سال تک آپ کے فیض سے فیض یاب ہوتا رہا۔ جامعہ یوسفیہ مجاہدات کا مرکز تھا، اس لئے پہلا سال کچھ کش مکش میں گزرا۔ لیکن پھر حضرت الاستاذ کی شفقتوں اور مخلصانہ توجہات کی برکت سے الحمدللہ یہاں سے جانے کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ آپ کی عنایات اتنی تھیں کہ ہمیں دوسری طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اور ساری عمر آپ ہی کی رہنمائی اور سرپرستی میں چلتے رہے۔ آپ کی شفقتوں کا احصا ناممکن ہے۔ لیکن جو بڑی عنایت آپ کی ہم پر رہی وہ اہل اللہ کی صحبت سے مستفید کرانا تھا۔ آپ ہی کی ارشاد و برکت سے گڑھئی باباجیؒ (سوات) اور حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ سے اصلاحی تعلق قائم ہوا۔ آپ اصلاح نفس پر بہت زیادہ ضرور دیتے تھے اور اپنے متعلقین کو اہتمام سے اہل اللہ کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ فرماتے کہ علوم ظاہریہ کی نافعیت باطن کی اصلاح پر موقوف ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ احادیث کے استفادہ کے لئے مہارت سے زیادہ طہارت کی ضرورت ہے پھر فرماتے کہ یہ وصف حضرت مہتمم صاحب (مولانا فضل محمد صاحبؒ) میں بدرجہ اتم موجود ہے بلکہ شاید اس کا ثانی نہیں۔

آپ کی تواضع کا یہ حال تھا کہ ہمیں کبھی کبھار زمین کے اوپر بغیر کسی کپڑے یا چٹائی کے بیٹھ کر پڑھاتے جس کی وجہ سے ہمیں بھی زمین پر ہی بیٹھنا پڑتا۔ ہم آپ سے حدیث پڑھانے کی درخواست کرتے تو آپ کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا کہ میں حدیث پڑھانے کا اہل نہیں، حالانکہ آپ کی حدیثی مہارت سے واقف اہل علم جانتے ہیں کہ آپ کے معیار کے ماہر حدیث برصغیر پاک وہند میں چند گنے چنے لوگ تھے۔ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ نے بارہا آپ کو واپس جامعہ آنے اور بخاری شریف کی تدریس سنبھالنے کی دعوت دی لیکن آپ بھی عذر کر کے ٹالتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ نے بھی دعوت دی لیکن آپ نے معذرت کر لی۔

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست نے بیعت کرانے کا مطالبہ کیا تو آپ کا ارشاد تھا کہ میں اگرچہ افسق وافجر نہیں

لیکن فاسق وفاجر ہوکر آپ کو کیسے بیعت کرالوں۔ حالانکہ آپ کا تقویٰ وطہارت اپنی مثال آپ تھا۔

اخلاص وللٰہیت کا یہ عالم تھا کہ ارشاد فرماتے: میں نے یہ مدرسہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے بنایا ہے۔ اس لئے روز اول سے میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ بغیر چندہ کے اگر اللہ تعالیٰ چلائیں گے تو فبہا ورنہ تالا لگادوں گا، کیونکہ چندہ تک نوبت آنا میرے اخلاص کی کمی کی دلیل ہوئی۔ لیکن الحمدللہ حضرت کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے بغیر چندہ کے مدرسہ کو خوب چلایا جو آپ کے اخلاص کی بڑی علامت ہے۔ پورے پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہو جو بغیر فیس اور بغیر چندہ کے چلتا ہو۔ یہ واحد حضرت کا مدرسہ جامعہ یوسفیہ ہی ہے جو آپ کی حیات تک بغیر چندہ وفیس کے چلتا رہا۔ بلکہ مدرسہ کی طرف سے طلبہ کو خورد ونوش ، رہائش وآسائش کے علاوہ جیب خرچ بھی ملتا رہا۔

مہمان نوازی میں تو آپ اپنی مثال آپ تھے، صرف ناشتے میں کئی انواع کا کھانا کھلاتے، جس میں مرغ، پراٹھا سادہ روٹی، شہد، حلوہ، سویاں وغیرہ بہت ساری چیزیں ہوتی تھیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ حضرت کے ہاں تو ہمیشہ سحری ہی سحری ہے۔ حالانکہ سحری تو صرف رمضان المبارک میں ہوتی ہے۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ مہمان کی خوب خاطر مدارت اور اکرام کر کے رخصت کرتے وقت حسب حال آنے جانے کا کرایہ بھی مرحمت فرمایا دیتے۔ اگر چہ آپ پر اخفا کا غلبہ تھا لیکن خشیت الٰہی صاف ظاہر ہوتی تھی چنانچہ رات کے اکثر حصہ میں ذکر وعبادت اور گڑگڑا کر دعا کرنے کا معمول تھا جو کہ عادت مستمرہ بن چکی تھی۔

شجاعت تو ہم نے آپ جیسی کہیں دیکھی نہیں، چنانچہ جب شیعہ سنی فساد برپا ہوا تو سنی قوم کے دیگر مشران حالات کے سامنے ہمت ہار گئے لیکن حضرات شیخین کریمین ہی تھے جنہوں نے ان شرپسند خونخواروں' جنہیں ایران کا خفیہ عسکری تعاون حاصل تھا' کی پرواکیے بغیر ڈٹ کر سنی قوم کی قیادت کی اور انہیں کسی بھنور میں تنہا ہونے نہیں دیا ۔ جب حکومت نے سنگین حالات میں حضرت الاستاذ کو سکیورٹی گارڈ مہیا کرنا چاہے تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور ایسے سنگین حالات میں بھی آپ کی معمول کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دشمن آپ کے وجود کو اپنے مکروہ مقاصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا اس لئے بارہا آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر دفعہ حفاظت فرمائی، آپ کو شہید کرانے کے لئے اجرتی قاتلوں کو رقم دی گئی لیکن وہ آپ کے قتل پر قادر نہ ہو سکے۔ آپ کے بھتیجے کے بقول اورکزئی ایجنسی کا ایک بڑا بدمعاش اور اجرتی قاتل آپ کی خدمت میں معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو کبھی اس سے پہلے نہ دیکھا ہے، نہ جان، نہ پہچان۔ پھر معافی کس چیز کی؟ وہ عرض کرنے لگا کہ حضرت آپ مجھے معاف کردیں پھر میں سارا قصہ بتادوں گا۔ آپ نے فرمایا: چلو معاف کر دیا۔ تو اس نے کہا کہ حضرت آپ کے قتل کے ارادے سے میں اس سے پہلے یہاں دو دفعہ آیا ہوں ،لیکن

دونوں بار مجھے ناکامی ہوئی اور کلاشنکوف ہاتھ میں لے کر ایسا لرزہ طاری ہوجاتا کہ انگلی دبانے پر قادر نہ ہوسکتا، اب تیسری دفعہ میں معافی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

آپ کی تدریس طلبہ کا دل موہ لینے والی تھی، عجیب وغریب علمی نکات بیان کرتے۔ احقر نے تین سال مسلسل آپ سے استفادہ کیا، یہ میری زندگی کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، آپ کے درس کا یہ اثر تھا کہ ہر بات دماغ کا حصہ بنتی رہتی، سمجھنے میں کوئی رکاوٹ یا دقت محسوس نہ ہوتی، دل کی دنیا بدل جاتی، ایک نئی زندگی محسوس ہوتی۔ علمی باریکیاں اور اصلاحی اقوال حرز جان بنی رہتیں، الحمد للہ آپ کے درس اور نصاب میں ایسی برکت تھی کہ بندہ کا تعلیمی سلسلہ تھوڑے سے وقت یعنی چھ سال میں مکمل ہوا، اگرچہ فی الحقیقت علم کا زمانہ مہد سے لحد تک ہے۔ آپ ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ اصلاح باطن کی طرف توجہ ہوئی، ایک دفعہ عرض کیا کہ حضرت اصلاح باطن کیسے ہو، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کریں اور بے فکر رہیں۔ سلّم العلوم کے سبق میں کبھی کبھار ایسے علمی نکات اور صوفیانہ رموز بیان فرماتے جو ہمیں کہیں شرح وغیرہ میں نظر نہ آتے۔ بعد میں جب آپ سے ان کے بارے میں پوچھتے تو ارشاد فرماتے کہ وہ باتیں اب میرے ذہن میں بھی نہیں۔ یقیناً بلا مبالغہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے آپ کو علم لدنی سے نوازا تھا۔ جس پر آپ کی دیگر تحریرات کے علاوہ ایک چھوٹا سا رسالہ ''ارشاد العلیم'' شاہد ہے۔ نحو اور منطق کے بارے میں تو آپ ارشاد فرماتے کہ اگر یہ علوم آج ناپید بھی ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں انہیں از اول تا آخر لکھ سکتا ہوں۔ علم حدیث میں مہارت کے لئے آپ کی شرح کافی وشافی ہے۔

محنت کی سخت تلقین فرماتے تھے اور محنت سے جی چرانے والے لوگ بالکل پسند نہیں تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ گڑھئی باباجیؒ کی خدمت میں میں نے عرض کیا کہ حضرت خصوصی توجہ سے نوازیں، تو انہوں نے فرمایا کہ مولانا! بڑوں کی توجہ پر اکتفا نہ کرنا، یہ چیز دیر پا نہیں ہوتی۔ اصل چیز اپنی محنت ومجاہدہ ہے اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا الاية۔

حیدرآباد کے ایک بزرگ سے جب آپ نے بیعت ہونے کا عرض کیا تو اس بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ آپ جس منصب علمی پر فائز ہیں، یہی آپ کے لئے کافی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ امام مالکؒ کا قول مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تک وصول کے مختلف طرق وذرائع بنائے ہیں لیکن ہم اس پر بہت راضی وشاکر ہیں کہ ہمیں اپنے تک پہنچنے کے لئے علم کا راستہ دکھایا۔

ایک موقع پر فرمایا کہ پشاور میں ایک مکتبہ سے چند کتب ضرورت کی بنا پر قرض خریدنی پڑیں، جب بل بنایا گیا تو قریباً ستر ہزار روپے تھے اور میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا، خیر ایک ہفتہ کے قرض پر کتابیں لے لیں، کچھ

پریشانی سی بھی ہورہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ رقم وقت پر ادا نہ ہو سکے، تاہم اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کتابیں لے آیا۔ اسی دن ایک ساتھی نے فون کیا کہ حضرت کچھ خدمت کرنی ہے اگر موقع عنایت فرمادیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے بار بار اصرار کیا تو میں نے ان کتابوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے پچاس ہزار روپے پیش کرنے چاہے لیکن میں ٹالتا رہا۔ بالآخر اس کی ناراضگی کے ڈر سے پانچ ہزار قبول کرنے پڑے اور فرمایا کے اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہفتہ پورا ہونے سے پہلے پہلے وہ سارا قرضہ ستر ہزار ادا ہو گیا۔

طالب علمی کے زمانے میں آپ کے بھتیجے نے بتایا کہ ابتدائی ایام میں حضرت کا کھانا طلبہ کرام سے بچے ٹکڑے ہوا کرتا تھا، وہ بھی سبز مرچ اور کبھی گڑ کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ اس زمانہ میں بندہ نے آپ کے جسم پر استری شدہ کپڑے نہیں دیکھے تھے۔ آپ کے گھر کے درودیوار سے صحابہ کرامؓ کے زمانہ جیسی سادگی عیاں تھی۔ آپ کا مزاج و مذاق سو فیصد اپنے اکابر علمائے دیوبند کا آئینہ دار تھا۔ حق گوئی، ادب واخلاص، راست بازی، حب خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حب صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کبھی فرماتے: لوگ مجھے جو کچھ کہیں لیکن میں صحابہ کرامؓ کے ناموس پہ غیرت نہ کرنے والوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا خواہ جو بھی ہو۔

آپ کی بیسیوں کرامات مشہور ہیں، ایک بار درس میں مولانا فضل محمد صاحبؒ نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ شاگرد اساتذہ سے بہت آگے بڑھ گئے۔ اس سے مراد استاذ صاحب کی علمی و روحانی حالت کی طرف اشارہ تھا۔ اس حقیر وفقیر پر آپ باپ سے زیادہ مہربان تھے اور آپ کی جدائی یقیناً ہمیں باپ کی جدائی سے زیادہ گراں گزری۔ آپ نے ہماری جس انداز سے تربیت فرمائی، اس کا کیا عرض کیا جائے۔ آپ نے ہمیں تواضع سکھائی، اخلاص سکھایا، چنانچہ ہم بوقت فراغت درس پر تنخواہ لینے کو ایک جرم سے کم نہیں سمجھتے تھے، استغنا کا درس دیا، توکل علی اللہ کا اعلیٰ پیمانے پر سبق دیا۔ آپ کی شہادت سے ہمارا خطہ یتیم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں بھی آپ کے ساتھ جنت کے باغات میں جمع فرمائے۔ آمین

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

مولانا فیض الرحمن، ہنگو

قسام ازل نے حضرت سیدی واستاذی مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کو جن گوناگوں کمالات اور قدسی صفات سے نوازا تھا، اس کی مثال ڈھونڈیں تو اسلاف کے قافلوں ہی میں ملتی ہے۔ ہم نے حضرت استاذ صاحبؒ میں رسوخ فی العلم، اخلاص وللہیت، تقویٰ وتدین، اخفاء وبے نفسی وتواضع، جود وسخا، زہد وفقر، جرأت و شجاعت، عبادت وریاضت، حب فی اللہ وبغض فی اللہ، مادیت سے نفرت، دنیا ومال سے استغنا اور ایثار وقربانی کا جو رنگ دیکھا وہ بس سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اپنے اسلاف کے تذکروں میں پڑھا تھا۔ آپ چلتا پھرتا دین کا کامل نمونہ تھے۔ اگر آپ علم تفسیر پر بحث کرتے تو علامہ آلوسی وابن عاشور کی تصویر دکھائی دیتے۔ شرح حدیث پر بولتے تو عسقلانیؒ وقسطلانیؒ کو پیچھے چھوڑ دیتے۔ رجال کی باری آتی تو ذہبیؒ وابن حجرؒ کی یاد تازہ ہوتی۔ بلاغت کے ابواب کھولتے تو زمخشریؒ وجرجانیؒ کا پرتو محسوس ہوتے۔ معقولات میں آپ کا قدم مولانا عبدالعزیز فرہارویؒ تک پہنچتا، اور غزالیؒ ورازیؒ کے علوم کے اسرار کھلتے، علم الکلام پر آپ کی دسترس متقدمین کی یاد دلاتی، فقہ میں آپ کی رائے ابن الہمام سی تحقیق، کاسانیؒ سا نظم وضبط اور ابن نجیم سی عبقریت رکھتی۔ آپ کی عبادت وریاضت اور سلوک واحسان کا باب کھلتا تو چھٹی صدی ہجری کے صوفیا یاد آجاتے۔ الغرض ایک بحرِ بے کراں تھا جس کے ساحل کا اندازہ ہم جیسوں کے لئے ایک خواب دکھائی دیتا۔ ان تمام تر صفات کے ساتھ تواضع وانکساری ایسی نصیب ہوئی کہ مجمع میں کوئی خاص امتیاز ہی نظر نہ آتا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو مٹا کر رکھتے اور بعض اوقات اپنے بارے میں بے نفسی کے ایسے کلمات بولتے کہ ہم شرم سے ڈوب جاتے۔

بندہ بالکل چھوٹا بچہ تھا جب ۱۹۸۲ء میں جامعہ یوسفیہ حفظ کی غرض سے آیا۔ اس وقت سے استاذ صاحب کی شہادت تک الحمدللہ حضرت کی توجہ، شفقت اور تربیت میں رہنے کی سعادت میسر آئی۔ ان ۲۸ سالوں میں سینکڑوں اَن مٹ یادیں ہیں جو دل ودماغ پر رقم ہیں۔ مشتے از نمونہ خروارے چند ایک کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

یہ میرے حفظ کے زمانہ کا واقعہ ہے، ہم سال بھر مدرسہ میں رہتے، ۲۵ شعبان کو چھٹیاں ہوتیں تو اپنے علاقہ ٹانک جاتے۔ ہمارے علاقہ میں قومی سطح پر کچھ بدامنی تھی، درجہ کتب کی چھٹیاں ہوئیں تو ہمارے استاذ مولانا محمد جمیل صاحب گھر جانے لگے، یہ ہمارے اہل علاقہ تھے اور ہم انہی کی نگرانی میں پڑھتے تھے۔ مولانا محمد جمیل صاحب نے گھر جاتے ہوئے استاذ صاحب سے کہا کہ علاقہ میں قوموں کی آپس میں کچھ لڑائی اور دشمنی چل رہی ہے، ان بچوں کی جب چھٹیاں ہوں تو کسی کو ساتھ کر دینا تاکہ کوہاٹ تک اپنی نگرانی میں لاکر ہمارے علاقہ کی گاڑیوں تک پہنچا دے۔ یہ بات مولانا محمد جمیل صاحب نے سرسری ہی فرمائی تھی۔ جب ہماری چھٹیاں ہوئیں تو گمان یہی تھا کہ استاذ

صاحب سے بھول بھال گیا ہوگا، لیکن استاذ صاحب نے ہمیں تیار ہونے کا فرمایا، ہم چار ساتھی تھے، ہمارا خیال تھا کہ استاذ صاحب کسی بڑے طالبعلم یا متعلق کو ہمارے ساتھ بھیج دیں گے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ استاذ صاحب خود ہی ہمارے ساتھ روانہ ہوگئے۔ باہر روڈ پر گاڑیاں نہیں تھیں، آپ نے فرمایا کہ ابھی ہنگو بازار جائیں گے اور وہاں سے کوہاٹ...... تو کافی وقت لگے گا، یہاں انتظار کی بجائے پہاڑی راستے سے کوہاٹ روڈ پر نکلتے ہیں، راستہ بھی کٹ جائے گا اور وقت بھی بچ جائے گا۔ ہم استاذ صاحب کے ساتھ جنگل سے ہوتے ہوئے ''بہادر باندہ'' کی طرف واقع پہاڑوں کے راستے کی جانب روانہ ہوئے۔ استاذ صاحب طویل عرصہ پہلے کہیں اس راستے سے گزرے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر آپ ذرا ٹھہرے اور فرمایا کہ ہم نے راستہ گم کر دیا اور غلط راستے پر آگئے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم پہاڑی دروں میں بھٹک گئے ہیں۔ اسی اثنا میں دیکھا کہ ایک کتا کہیں سے نکل آیا اور استاذ صاحب کے آگے آگے چل کر دُم ہلانے لگا۔ استاذ صاحب نے فرمایا: اس کے پیچھے چلیں یہ راستہ بتانے آیا ہے۔ ہم اس کے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ ہمیں درست راستے پر ڈال دیا، پھر پہاڑی کے نیچے تک ہمارے آگے آگے ہی چلتا رہا۔ جب روڈ نظر آنے لگا جس پر کوہاٹ کی طرف دوڑتی گاڑیاں نظر آرہی تھیں تو اچانک وہ کتا مڑا اور تیزی سے بھاگ کر پیچھے چلا گیا۔ استاذ صاحب نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گئے، جب ہمیں کوہاٹ پہنچایا تو ہمارے لئے کافی سارے پھل خریدے کہ یہ راستے میں کھاتے رہنا۔ پھر ہمیں بنوں کی گاڑی میں بٹھا کر ڈرائیور کو تاکید کی کہ ان کو بنوں میں نانک کے گاڑی میں بٹھادیں اور راستہ میں کہیں ادھر ادھر اترنے نہیں دینا۔ جب تک گاڑی روانہ نہ ہوئی آپ وہیں کھڑے رہے جب ہم روانہ ہوگئے تو تب آپ واپس ہوئے۔

اگر ہم چھٹیوں میں مدرسے میں رُک جاتے تو اتنی شفقت کا معاملہ فرماتے کہ والدین کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر محبت کا احساس ہوتا اور ہمیں کسی حوالے سے گھر کی کمی محسوس نہ ہوتی۔ ہمیں بلا کر ہماری ضروریات پوچھتے، معمولی معمولی باتوں کا خیال رکھتے اور کسی طرح پریشان ہونے نہ دیتے تھے۔

بندہ نے تکمیل حفظ کے بعد جامعہ ہی میں درس نظامی کا آغاز کیا۔ حضرت الاستاذ سے ہمیں مختصر المعانی، جلالین، متنبی اور قصیدہ بدء الامالی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت استاذ صاحبؒ نے بندہ کو بعض کتابوں کے پڑھنے کے لئے گوجرنوالہ قاضی حمید اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس بھیجا وہاں سے فراغت کے بعد موقوف علیہ اور دورۂ حدیث کے لئے مظہر العلوم سوات حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھیجا۔ ۱۹۹۳ء میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کے بعد جامعہ یوسفیہ ہی میں تدریس کے لئے تقرری فرمائی۔ زمانہ طالبعلمی میں حضرت الاستاذ نے ہماری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ہماری درجنوں کوتاہیاں ایسی ہیں جن پر خوب تنبیہ فرمائی اور

تربیت کے لئے سخت انداز بھی اختیار کیا لیکن ان میں وہ واقعات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں جن کا ذکر قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

مولانا عبدالستار صاحب (چیئرمین سنی سپریم کونسل ہنگو) ہمیں درجہ ثالثہ میں ترجمۂ قرآن پڑھاتے تھے۔ایک دفعہ ظہر کے بعد ان کے سبق سے ناغہ کر کے ہم چند ساتھی ''شاہو خیل'' بستی کسی کام سے چلے گئے۔حضرت الاستاذ کو کسی طرح علم ہوا کہ ہم نے مولانا عبدالستار صاحب سے اجازت لئے بغیر ناغہ کیا ہے۔آپ سخت ناراض ہوئے کہ یہ استاذ کی ناقدری ہے،آپ کی ناراضگی کا ہم پر سخت اثر ہوا،رات گئے تک معافی کی درخواست لئے بیٹھے رہے لیکن معاف نہیں فرمایا،بالآخر ہم گھر کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئے اور فجر تک بیٹھے رہے،اس پر حضرت نے ہماری ندامت قبول فرمائی۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدرسین کی ناقدری پر طلبہ کی کتنی سخت گرفت ہوتی تھی۔

حضرت الاستاذ سیاست سے اجتناب کی سخت تاکید کرتے تھے اور اسے طلبا کیلئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ہم علاقائی ماحول کی وجہ سے زمانہ طالبعلمی میں کبھی کبھار چھپ چھپا کر سیاسی دلچسپیوں کا اظہار کر لیتے تھے۔کوہاٹ میں ایک دینی سیاسی پارٹی کا جلسہ تھا،ہم چند دوست چھٹی کر کے چلے گئے،حضرت الاستاذ کو علم ہوا کہ جلسہ کے لئے چھٹی لے کر گئے ہیں بس ہماری تو ایسی شامت ہوئی کہ آئندہ چھٹی سے پکی توبہ کر لی۔حضرت استاذ صاحب مکمل ناراض ہو گئے،بولنا بند کر دیا اور درسگاہ میں بھی آنے سے انکار فرما دیا۔ہم نے جا کر رو رو کر معافی مانگی،اتنا روئے کہ استاذ صاحب نے معاف کر دیا۔یہ سب ہماری اصلاح کیلئے تھا،اللہ تعالیٰ ہمیں کامل اصلاح نصیب فرمائے۔آپ کی انہی اداؤں نے مزاج میں یہ ساری باتیں ایسی راسخ کر دی تھیں کہ سبق کا ناغہ سب سے بھاری کام محسوس ہوتا اور جب تدریس کی ذمہ داری سنبھالی تو تب اندازہ ہوا کہ طالب علم کے ناغے پر دل میں کتنا درد اٹھتا ہے۔

زمانہ تدریس میں بھی آپ نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح رکھا اور تربیت میں ذرا برابر کمی نہیں فرمائی۔ایک دفعہ غالباً میرے بھائی نے میرے بارے میں حضرت کو شکایتی خط لکھا کہ خرچ میں ہاتھ کافی کھلا رکھتا ہے،اس پر حضرت نے مجھے بلا کر استغنا کی بڑی تاکید کی اور خرچ میں قناعت کا اہتمام کرنے کو فرمایا،پھر ترغیباً اپنے فقر و فاقہ کے کثیر واقعات سنائے۔فرمایا کہ بعض اوقات میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہوتا،لیکن کبھی اپنے بھائیوں یا اقربا سے بھی سوال نہیں کیا۔بسا اوقات ہنگو جانے کی ضرورت ہوتی لیکن کرایہ نہ ہونے کے باعث گاڑی کی بجائے پیدل جاتا۔ اس طرح کے واقعات سنا سنا کر مجھے اس بات کا پوری طرح احساس دلایا کہ کسی اور پر بالکل بوجھ نہیں بننا چاہیے۔

حضرت استاذ صاحب نے ۱۹۹۳ء ہی میں بندہ کی بطور امام ایک قریبی مسجد میں تقرری فرمائی۔یہ مسجد علاقہ کے مالدار لوگوں کی تھی۔حضرت نے مجھے تاکید فرمائی کہ نہ تو ان سے تنخواہ لینی ہے اور نہ ہی بچوں کے سبق کی فیس۔بحمداللہ

بندہ اس پر کار بند رہا، ان چوبیس سالوں میں وہاں بیٹھ کر اللہ نے جو کام لیا، مجھے اندازہ ہے کہ تنخواہ اور فیسوں میں وہ کام ممکن نہ تھا۔ یہ وہ گُر ہے جس میں بندہ فقیری میں بادشاہی کے مزے لوٹتا ہے۔ ایک بار اسی مسجد کے مقتدیوں میں سے ایک بااثر صاحب حضرت استاذ صاحب کے پاس اپنی کسی ضرورت کے لئے حاضر ہوئے، ان کے پاس اپنی ذاتی گاڑی تھی، جب وہ اپنی ضرورت سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا کہ میں ہنگو شہر جا رہا ہوں۔ بندہ کو بھی شہر جانا تھا لہٰذا ان کے ساتھ گاڑی پر بیٹھ کر چلا گیا۔ واپس آیا تو استاذ صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار محسوس کیے۔ میں نے سوچا کہ آخر کیا ایسی بات ہوئی ہے جس پر استاذ صاحب ناراض ہو سکتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ استاذ صاحب کو میرا ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جانا ناگوار گزرا کہ یہ ایک طرح سے اپنے مقتدی سے طمع پوری کرنے کی صورت ہو گئی، جب کہ حضرت استاذ صاحب تو ایسے معاملات میں بڑے خوددار تھے اور بھرپور استغنا کا مظاہرہ کرتے تھے۔

زمانہ تدریس میں استاذ صاحب نے جو کتاب پڑھانے کے لئے سپرد فرمائی اُسے سعادت سمجھ کر پڑھایا۔ ایک واقعہ اس سے مستثنیٰ ہے، میری تدریس کے ابتدائی زمانہ میں مجھے شرح تہذیب پڑھانے کے لئے سپرد فرمائی، تو بندہ نے بڑی شدت سے معذرت کی کیونکہ مجھے شرح تہذیب سے زمانہ طالبعلمی میں خاص مناسبت پیدا نہ ہو سکی تھی اور میرا گمان تھا کہ میں طلبہ کا حق ادا نہیں کر پاؤں گا۔ ہم نے شرح تہذیب مولانا محب اللہ صاحب (حالاً استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی) سے پڑھی۔ حضرت بہت عمدہ پڑھاتے تھے، لیکن ہماری جماعت بدذوق تھی، یہاں تک کہ استاذ محترم درسگاہ میں داخل ہوتے تو مزاحاً با آواز بلند فرماتے: السلام علیکم یا أہل القبور۔ بہر حال میرا اصرار تھا کہ میں شرح تہذیب نہ پڑھا سکوں گا۔ لیکن استاذ صاحب کتاب کی واپسی پر کسی طرح راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ رات میں مجھ سے پڑھیں، سمجھ کر صبح طلبہ کو پڑھا دیا کریں۔ بندہ نے تعمیل ارشاد میں کتاب لے لی، استاذ صاحب نے دعا فرمادی، دعا اور تعمیل ارشاد کی برکت تھی کہ کتاب مجھ پر خوب کھلی اور ایسی کھلی کہ بحمد اللہ طلبہ بھی پورے مطمئن ہوئے، نتیجہ بھی اچھا آیا اور مجھے بھی حل کتاب کے لئے استاذ صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

بغیر مطالعہ کے تدریس پر سخت ناراض ہوتے۔ فرماتے کہ مدرس کے لئے مطالعہ فرض ہے۔ ہمیں یہ ترتیب سکھائی تھی کہ مطالعہ میں محض حل کتاب پر اکتفا نہ کریں بلکہ مسئلہ پر پوری بصیرت حاصل کرنے کے بعد اسے سہل اور جامع انداز میں اس طرح ترتیب دیں کہ متن سے خروج بھی نہ ہو اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ اس طرح مسئلہ کی تعبیر اور سبق کی ترتیب پہلے سے طے کر کے درسگاہ میں جائیں، وہاں جا کر ٹکل نہ ماریں۔

استاذ صاحب کا معمول تھا کہ عمدہ نتائج پر مدرس کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ سلم العلوم میرے

پاس تھی اور سلم کا پرچہ استاذ صاحب نے بنایا تھا۔ ہمارے ایک طالب علم مولوی انعام اللہ سلمہ نے بہت ہی عمدہ پرچہ حل کیا، پرچہ دیکھنے کے بعد استاذ صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں حاضر ہوا تو سینے سے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ فرمایا: ماشاء اللہ! آپ کے طلبہ نے سلم خوب پڑھی ہے۔

زمانہ تدریس میں ہمارے اندر خوب خود اعتمادی پیدا فرمائی، حالانکہ وہ ہماری ناقص استعدادوں سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن اس کے باوجود ایسا معاملہ فرماتے جیسے ہم ہر حوالے سے کامل ہوں۔ ہمارے کچھ احباب نے مل کر استاذ صاحب سے تخصص فی الفقہ شروع کیا، استاذ صاحب کی ترتیب یہ تھی کہ متخصص طلبہ سے مطالعہ کروایا کرتے تھے۔ میں بھی شوق میں شریک ہو گیا، لیکن تدریس کے ساتھ اصول السرخسی اور تاسیس النظر وغیرہ کتابوں کا مطالعہ میرے لئے بہت مشکل تھا۔ ہم ساتھیوں نے کافی اصرار کیا کہ ان کتابوں کے بعض مباحث ہماری استعدادوں سے بڑھ کر ہیں، اس لئے مطالعہ سے کما حقہ سمجھ نہیں آتے۔ آپ کوئی ایک کتاب ہمیں درساً پڑھائیں۔ لیکن استاذ صاحب ہمیں بار بار فرماتے تھے کہ میں آپ کو کیا پڑھاؤں گا؟ آپ مدرسین ہیں، مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، خود مطالعہ کی کوشش فرمائیں۔ اس سے مقصد شاید ہماری کاہلی و سستی کا علاج بھی ہو لیکن اس طرح کی گفتگو سے عموماً خود اعتمادی پیدا فرماتے تھے اور کام کے لئے حوصلہ بڑھاتے تھے۔

استاذ صاحب مطالعہ کے خوگر تھے، کتاب سے فراغ نہ تھا، بعض اوقات پوری پوری رات مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ ایک دفعہ قریہ ''شاہو خیل'' میں بعض بدعتی حضرات سے اہل سنت علما کا کسی مسئلے پر اختلاف ہوا اور استفتا استاذ صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ آپ نے بعض اساتذہ کو طلب فرمایا اور ایک طویل فہرست حوالے کر کے کتب خانے سے کتابیں نکلوائیں۔ پھر رات بھر حوالے نکالتے رہے، پوری رات مطالعے کا نچوڑ آپ نے صرف ایک صفحہ فتویٰ کی شکل میں لکھا۔ پھر اس فتویٰ پر ملک کے بڑے دار الافتاؤں سے تصدیقی دستخط لیے۔ بندہ خود بھی کئی حضرات کے پاس دستخط کروانے کے لئے حاضر ہوا۔

ایک دفعہ مجھ سے ہمارے علاقہ کے ایک صاحب علم نے اعتکاف میں مستحب وضو کا مسئلہ پوچھا، وہ استاذ صاحب کے دیرینہ دوست تھے، مجھ سے فرمایا کہ استاذ صاحب سے مسئلہ پوچھ کر بتلانا۔ استاذ صاحب اعتکاف میں تھے، بندہ نے مسئلہ پیش کیا تو کتابیں طلب فرمائیں، یہ بھی اکثر معمول تھا کہ مسئلہ دیکھ کر بتلاتے تھے۔ بندہ کتابیں لے کر مسجد حاضر ہوا، آپ نے مسئلہ نکال کر بتلا دیا اس کے بعد بندہ اقامت گاہ چلا گیا۔ صبح مسجد حاضری ہوئی تو استاذ صاحب نے بتلایا کہ آپ تو جلدی چلے گئے۔ میں تو کتاب کے مطالعے میں لگ گیا اور سحری کا وقت ہو گیا، رات بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

حضرت الاستاذؒ کو اللہ تعالیٰ نے ''توکل'' کی صفت خاص امتیازی شان سے عطا فرمائی تھی۔آپ کی پوری زندگی مجسم توکل تھی۔کبھی مدرسہ کے لئے چندہ کی اپیل نہیں کی، بلکہ ہمیشہ توکل کے اصول پر چلایا۔کبھی کبھار توکل کی بنیاد پر بہت بڑے فیصلے فرمالیتے تھے اور بظاہر معلوم ہوتا کہ ایسا کرنا شاید آپ کے لئے مناسب نہ تھا اوراس میں سخت تکلیف اور مشقت کا اندیشہ ہوتا لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسئلے حل ہوجاتے،تب اندازہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے خاص بندوں کے ساتھ استثنائی معاملات ہیں جن کی حقیقت تک ہم ظاہر بینوں کی رسائی ممکن نہیں،اس ضمن میں بطورِ خاص مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے:

۲۰۰۸ء میں کرم ایجنسی کے اندر اہل تشیع کی طرف سے اہل سنت کے علاقوں پر لشکرکشی ہوئی جس کی وجہ سے کئی لوگ اپنے علاقوں سے ہجرت کرکے ہنگو اور گردو پیش میں آباد ہوئے۔اس میں ہمارے علاقے کے ایک صاحب سرکاری افسر تھے جو کرم میں تعینات تھے اور وہاں کرین وغیرہ کے ذریعے کھدائی کا کام بھی کرتے تھے۔ہنگو کے قریب اورکزئی ایجنسی کے اہل تشیع نے انہیں کام کے بہانے بلاکر اغوا کرلیا۔کئی مہینے بعد ان کے خاندان نے کسی طرح مجھے اطلاع پہنچائی اور میرے ذریعے استاد صاحب کو علم ہوا۔آپ بہت سخت بے چین ہوئے،آپ کی بے چینی اور پریشانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کا کوئی قریبی رشتہ دار اغوا ہوگیا ہے۔حالانکہ ان صاحب سے نہ شناسائی تھی نہ ملاقات وتعلق۔بہرحال آپ کی کوششوں سے اغواکاروں سے کسی طرح رابطہ ممکن ہوا اور انہوں نے ایک خطیر بھاری رقم کے عوض چھوڑنے پر رضامندی ظاہر کی۔ان لوگوں کے لئے اتنی رقم ادا کرنا ممکن نہ تھی اور ہمیں بھی کوئی خاص شناسائی نہ تھی کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟اس لئے قرض وغیرہ کسی سے مانگ کر تعاون کرنے پر بھی شرح صدر نہ تھا کہ بعد میں کون اتنی رقم بھرتا پھرے گا۔لیکن استاذ صاحب نے توکل علی اللہ تین لاکھ روپے ادا کردیے، یہ رقم استاذ صاحب کے ایک دوست حاجی سید رضا نے آپ کے پاس رکھوائی تھی اور اجازت بھی دی تھی کہ کہیں اپنی ضرورت ہو تو بے شک خرچ لیا کریں۔استاذ صاحب قریبی اور بے تکلف احباب کی ان امانتوں کو گو بطورِ قرض رکھ لیتے کہ اس میں ان کی ''امانت'' کی حفاظت زیادہ ہے لیکن عموماً استعمال کی نوبت نہ آتی۔اس مرحلے پر آپ نے اپنے مزاج کے خلاف رقم دلواکر ان صاحب کو آزاد کرالیا۔بعد میں وہی ہوا جس کا خطرہ تھا کہ وہ حضرات رقم ادا کرنے میں تساہل بلکہ ٹال مٹول سے کام لینے لگے۔مجھے بڑی شرم آئی کہ یہ سارا معاملہ میری وجہ سے ہوا،استاذ صاحب اتنی بڑی رقم اپنے پاس سے حاجی فیض اللہ کو کیسے ادا کریں گے۔لیکن استاذ صاحب پوری طرح مطمئن تھے۔بڑے عرصے بعد میری ہی کوشش سے ان صاحب کا کرین ... جو ایک شوریدہ حال علاقے میں پھنسا ہوا تھا ... نکالنے میں ہم کامیاب ہوئے اور اسے بیچ کر رقم کی ادائیگی کا کچھ بندوبست ہوا۔

استاذ گرامی کو اہل مدارس کے لمبے چوڑے منصوبے، کام شروع کرنے سے قبل ہی عالی شان تعمیرات اور اس کے لئے بے مہابا چندے سخت ناپسند تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ جتنے وسائل دستیاب ہوں ان کے دائرے میں توکلاً علی اللہ کام شروع کر دینا چاہیے، جب کام قبول ہوگا اور دائرہ بڑھے گا تو وسائل خود اللہ تعالیٰ مہیا فرماتے رہیں گے۔ ہمارے علاقے ٹانک میں ایک عالم دین صاحب نے مدرسہ کے لئے ایک بہت بڑی جگہ حاصل کی۔ استاذ صاحب ایک دفعہ بندہ کے ہاں مہمان تھے، وہ مولوی صاحب تشریف لائے اور استاذ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! ہم مدرسہ بنا رہے ہیں، آپ سے دعا کے لئے تشریف آوری کی درخواست ہے۔ استاذ صاحب نے خوشی کا اظہار کیا اور منظور فرما لیا۔ اگلے دن ہماری وہاں حاضری ہوئی، اسباق وغیرہ کی ابھی کوئی ترتیب نہ تھی لیکن کافی حصہ تعمیر ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب نے استاذ صاحب کو لمبے چوڑے منصوبے بتائے کہ وہاں فلاں چیز تعمیر کرنی ہے۔ یہاں فلاں عمارت بنانی ہے۔ استاذ صاحب پر مروت کا غلبہ تھا، خلاف مزاج باتیں بھی سن کر برداشت کر لیتے اور کچھ نہ فرماتے۔ بعد میں واپسی پر مجھ سے فرمایا کہ بیٹا! یہ جو آج کل مہتممین پریشان ہو کر لوگوں کے دروازوں پر پھرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ پہلے سے اتنے لمبے لمبے منصوبے سوچ رکھے ہیں۔ مہتمم کے ذہن میں جب اتنے بڑے منصوبے ہوں گے تو وہ صبح و شام انہی کو پورا کرنے کا سوچے گا۔ حالانکہ ہمارے بزرگوں کی ترتیب یہ تھی کہ وہ ایک چھپر اور خیمے میں کام شروع کرتے، کام بڑھتا تو مجاہدہ اور دعا سے کام لیتے، اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی اور تعمیرات بھی ہو جاتیں اور باقی بندوبست بھی ہو جاتے۔

استاذ صاحب خود بھی ہر معاملے میں سنت کی پابندی لازم سمجھتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی اس پر زور اور ترغیب دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ قاری مشتاق صاحب نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جامعہ یوسفیہ میں طلبہ کو نصیحت فرما رہے ہیں۔ حضرت استاذ صاحب نے اس کی تعبیر یوں بیان فرمائی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ مدرسہ میں کوئی متبع سنت بزرگ تشریف لائیں گے اور طلبا کو نصیحت و وعظ کریں گے۔ پھر ایک دن ایک سفید ریش بزرگ تشریف لائے، استاذ صاحب فرماتے تھے کہ میرا گمان ہوا کہ شاید وہ متبع سنت بزرگ یہی ہوں گے لیکن میں نے دیکھا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت انہوں نے بایاں پاؤں پہلے رکھا، مجھے یقین ہوا کہ وہ یہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ جو شخص اپنے ہر عمل کو سنت کے مطابق نہ ڈھال دے اس وقت تک اس پر ولایت کا دروازہ نہیں کھلتا۔

استاذ صاحب میں رحمت و شفقت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، چھوٹوں بڑوں پر آپ کی شفقت مثالی تھی، حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں کے ساتھ بھی قابل رشک شفقت و رأفت کا معاملہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ہم استاذ صاحب

کے ساتھ کھیت میں گندم کی کٹائی کر رہے تھے کہ چھوٹے بچے غلیل لے کر چڑیوں کے گھونسلے درختوں سے گرانے لگ گئے۔ اس پر استاذ صاحب سخت ناراض ہوتے تھے کہ پرندوں کو اذیت دی جائے۔ آپ نے بچوں کو ڈانٹ کر بھگایا اور پھر جب تک استاذ صاحب کھیت میں تھے بچوں کو دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

آپ صبح کی چائے گھر میں پیتے تھے لیکن جب کوئی مہمان ہوتا تو مدرسہ میں ناشتہ فرماتے۔ ایک دن ایک عالم دین تشریف لائے تھے۔ استاذ صاحب ان کے لئے گھر سے ناشتہ لائے۔ بندہ بھی حاضر تھا، ناشتے کے بعد آپ نے روٹی کے ٹکڑوں کے ذرات دسترخوان سے اکٹھے کر کے پرندوں کے لئے ڈال دیے۔ سارے پرندے اکٹھے ہو گئے، آپ دیر تک باتوں باتوں میں بچی ہوئی روٹی کے ذرات بنا کر پرندوں کے لئے ڈالتے رہے۔ پھر ان عالم دین صاحب سے فرمایا کہ مولانا! بس یہ بے کاری عادت پڑ گئی ہے۔ گھر میں ناشتہ کے دوران ان کے لئے روزانہ ذرات بنا کر ڈالتا ہوں، یہ پرندے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب پہلے سے میرے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں، اب گھر کی عادت ادھر مدرسہ میں بھی نہیں چھوٹتی۔ اس سے آپ کے جذبۂ رأفت اور قدر رزق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مدرسہ کے اردگرد آبادی میں استاذ صاحب کی وجاہت کی برکت سے شادی بیاہ اور موت غمی کے رسوم کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ پر ڈھول تماشوں کے قدیم رواج بھی ماند پڑ گئے تھے۔ استاذ صاحب اپنے قریبی احباب کو تو اس سختی سے روکتے تھے کہ کسی میں خلاف ورزی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ رہے عوام تو ان کے لئے بھی ترغیب وتبلیغ کا ایسا مشفقانہ انداز اپنایا کہ یہ چیزیں سرے سے ہی ختم ہو گئیں تھیں۔ اگر کہیں ایک آدھ واقعہ ہو جاتا تو استاذ صاحب تنبیہ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ فرماتے تھے۔ اسی ضمن میں ایک دو واقعات پیش خدمت ہیں:

حاجی نور اکبر مرحوم استاذ صاحب کے دیرینہ دوست تھے۔ ایک دفعہ ان کے خاندان میں کسی کی شادی تھی، کچھ من چلے نوجوانوں نے چوری چھپے رات کو ڈھول باجوں والے بلا کر "تماشہ" وغیرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ عشا کے بعد ان کے حجرے سے ڈھول کی آواز آئی جو مدرسہ کے قریب ہی تھا تو استاذ صاحب ڈنڈا لے کر تشریف لے گئے۔ جیسے ہی حجرہ میں داخل ہوئے تو دروازے کے پاس ہی ڈھولکی والوں نے نشست جمائی ہوئی تھی۔ آپ نے ڈھول باجوں کو دو تین لاتیں رسید کیں تو وہ ہوا میں اڑ کر دور جا گرے۔ نوجوانوں نے جو دیکھا کہ یہ تو استاذ صاحب ڈنڈے سمیت تشریف لائے ہیں تو سب کی ایسی دوڑیں لگ گئیں کہ شامت آگئی، کوئی کمروں کے کواڑ لگا کر اندر چھپ رہا ہے۔ کوئی چارپائیوں تلے گھس رہا ہے۔ کسی کو بیت الخلاء میں چھپنے کی جگہ مل رہی ہے، تو کوئی کھسیانا ہو کر سر جھکائے کھڑا ہے۔ بہت سوں نے تو حجرے سے باہر بھاگ کر کھیتوں میں جان بچائی۔ ڈھولک والے بھی کسی طرح جان بچا

کر بھاگ نکلے۔ آپ نے ٹیپ ریکارڈوں کے تار پھاڑ کر سارا سامان لہو ولعب توڑ دیا۔ حاجی نور اکبر اور معززین خاندان بڑی معافیاں معذرتیں کرتے ہوئے حاضر ہوئے کہ جی! ہمارے علم میں لائے بغیر نوجوانوں نے یہ حرکت کردی ہے۔ للہ ہمیں معاف کردیں، ہمارا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ الغرض اس واقعے سے جہاں آپ کی غیرت دینی کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں قریبی لوگوں کی اصلاح میں ہاتھ سے کام لینے اور کسی طرح تسامح نہ برتنے کا پتہ چلتا ہے۔

ایک دفعہ کراچی سے کچھ اہل علم تشریف لائے ہوئے تھے۔ مدرسہ سے کچھ فاصلے پر ایک خاندان کے ہاں شادی کی تقریب تھی۔ وہاں بھی کچھ نوجوانوں نے بڑوں کے منشا کے بغیر رات کو تیز آواز میں موسیقی کی کیسٹیں چلا رکھی تھیں۔ استاذ صاحب نے ان کے بڑوں کو کہلا بھیجا کہ مدرسہ میں اہل علم مہمان بھی ہیں، اس طرح کی واہیات مناسب نہیں لہٰذا انہیں بند کردیں۔ لیکن غالباً وہ پیغام بڑوں تک نہ پہنچ پایا، جس کے باعث موسیقی بدستور چلتی رہی۔ آپ نے چند اساتذہ اور بڑے طلبہ کا وفد ساتھ لیا اور ڈنڈا اٹھا کر خود چل دیے۔ جب ان کے حجرہ کے قریب پہنچے تو کسی طرح خاندان کے بڑوں کو علم ہو گیا کہ استاذ صاحب بذاتِ خود تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً موسیقی وغیرہ بند کروا کر حجرے سے باہر نکل کر استاذ صاحب کا استقبال کیا اور پاؤں پڑ کر غلطی کی معافی مانگنے لگے کہ یہ چند نوجوانوں کی حرکت ہے جو باز نہیں آرہے تھے۔ آپ نے بڑی ہی نرمی اور شفقت سے انہیں سمجھایا کہ نیچے مدرسہ میں قرآن کی تلاوتیں ہو رہی ہیں، دینی علوم پڑھے جا رہے ہیں اور ادھر یہ تماشے شروع ہیں، یہ اس مقدس ماحول کی ناقدری ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہو سکتی ہے، لہٰذا اس سے توبہ کریں۔ حضرت استاذ صاحب ایسے مواقع پر اپنی وجاہت اور شخصیت کی پروا کیے بغیر خود ہی ان محافل میں پہنچ کر نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ یہ آپ کے تقویٰ، خوفِ خدا، مخلوقِ خدا سے خیر خواہی اور دینی غیرت وحمیت کے وہ شاہکار ہیں جس کی مثالیں اس مداہنت اور غرض پرستی کے دور میں ڈھونڈے نہیں ملتیں۔

حضرت استاذ صاحب کا ایک نمایاں وصف مدرسہ کے اجتماعی مال میں حد درجہ احتیاط تھی۔ آپ نے مدرسہ یوسفیہ سے کبھی تنخواہ نہیں لی، ساری عمر حسبۃً للہ پڑھایا، مدرسہ پر اپنے اموال خرچ کرتے تھے، لیکن مدرسہ کے مال میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ اورکزئی ایجنسی میں مولانا بہاء الحق صاحبؒ ایک بڑے صاحب حال، اللہ والے بزرگ تھے۔ استاذ صاحب مدرسہ کے ابتدائی زمانے میں پیدل کئی کلومیٹر کا پہاڑی فاصلہ طے کر کے ان کی خدمت میں بغرض زیارت وحصول نیاز جاتے تھے۔ فرمایا کہ میرا معمول تھا کہ حضرت کو ضرور حسب استطاعت کچھ رقم پیش کرتا اور وہ میرا ہدیہ بڑی بشاشت سے قبول فرماتے تھے، جس پر مجھے بڑی تسلی اور خوشی ہوتی کہ مال پاک ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے مجھے مدرسہ کے لئے پچاس روپے چندہ راہ چلتے دے دیا۔ میں نے جیب میں رکھ لیا کہ

مدرسہ جا کر مدرسہ کی رقم میں شامل کر دوں گا۔ لیکن بھول گیا اور اسی دوران مولانا بہاء الحق صاحبؒ کی زیارت کے لئے چلا گیا۔ واپسی پر حسب عادت حضرت کی خدمت میں ہدیہ پیش کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رقم بند مٹھی میں حضرت کے ہاتھ تھمانا چاہی۔ لیکن حضرت نے ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے بہت اصرار کیا لیکن حضرت نے بالکل قبول نہ فرمایا۔ مجھے بڑی پریشانی ہوئی کہ آخر کیا وجہ ہے جو حضرت نے اس دفعہ ہدیہ قبول فرمانے سے انکار کر دیا۔ کافی دیر سوچتا رہا، بالآخر وہ نوٹ نکالا جوان کو تھمایا تھا تو ایک جھٹکا لگا کہ یہ تو وہی پچاس روپے کا نوٹ ہے جو میرے دوست نے مدرسہ کے لئے چندے کے طور پر دیا تھا۔ تب عقدہ کھلا کہ اللہ والے نظر باطنی سے حلال وحرام اور طیب وخبیث کی پہچان کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد سے کبھی مدرسہ کے چندہ کی رقم ذاتی رقم کے ساتھ ملا کر نہیں رکھی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بندہ کو مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ کا بھی یاد آرہا ہے۔ ایک دفعہ حضرت ہنگو تشریف لائے تھے۔ قصبہ ''درسمند'' میں کسی مدرسے کا جلسہ تھا۔ حضرت استاذ صاحب، مولانا فضل محمد صاحبؒ، مدرسہ کے اساتذہ اور کثیر تعداد خدام کی ساتھ تشریف لے گئی۔ واپسی پر مدرسہ کے مہتمم صاحب نے مولانا فضل محمد صاحب رحمہ اللہ کے لئے جو گاڑی بک کروائی اس میں ڈرائیور کے علاوہ حضرت کے ایک خادم ساتھ بیٹھے اور یہ لوگ حضرت استاذ صاحب اور دیگر اساتذہ سے کچھ پہلے ہنگو واپس چل دیے۔ خادم کا بیان ہے کہ حضرت گاڑی میں مراقب ہوئے اور کچھ دور جا کر گاڑی کو رکوا دیا۔ گاڑی سے اترے مجھے بھی اتارا اور ڈرائیور کا شکریہ ادا کر کے انہیں واپس بھیج دیا۔ وہ بے چارے حیرانی کے عالم میں تک رہے تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ مجھے بھی سخت حیرانی تھی کہ حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ بہر حال روڈ پر چلنے والی ایک کرایہ کی گاڑی کو اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ کر مجھے بھی ساتھ بٹھلایا اور سیدھے ہنگو شہر میں گاڑیوں کے اڈے پر جا کر اترے۔ وہاں مجھے سخت جلال میں مخاطب کر کے فرمایا کہ میرے جانے تک یہیں کھڑے رہو اور پھر سیدھے جامعہ یوسفیہ چلے جاؤ۔ ادھر ادھر حرکت کی تو ایسی بددعا دوں گا کہ یہیں کھڑے کھڑے آگ لگ جائے گی۔ خادم بے چارہ پہلے سے سہا ہوا تھا، یہ سن کر مزید گھبرایا، چپ چاپ کھڑا رہا، یہاں تک کہ حضرت تن تنہا پشاور روانہ ہو گئے۔ خادم جامعہ یوسفیہ پہنچا تو کچھ دیر بعد استاذ صاحب اور دیگر اساتذہ بھی پہنچ گئے، سب پوچھ رہے تھے کہ حضرت مولانا سواتیؒ کہاں ہیں؟ خادم نے ساری صورتحال بیان کر دی، بڑی پریشانی تھی کہ آخر کیا وجہ ہوئی جو حضرت بغیر بتائے سارے خدام کو چھوڑ کر اکیلے چل دیے۔

بعد میں حضرت نے ایک موقع پر فرمایا کہ آج کل مہتممین چندہ وصول کرنے میں احتیاط نہیں کرتے، مال حرام وصول کر کے جلسے کرتے ہیں اور مہمانوں کے لئے انہی اموال سے کرایہ کی گاڑیاں بھیج دیتے ہیں۔ یہ خالص آپ کا کشفی معاملہ تھا، ورنہ ان مہتمم صاحب یا مدرسہ کے انتظامیہ کے احوال کا نہ آپ کو پہلے سے علم تھا نہ کسی نے بتایا تھا۔ جو

لوگ تقویٰ کے اس اعلیٰ منہاج پر فائز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے ان خاص بندوں سے ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ حرام یا مشتبہ چیزوں کے اثر تک سے بھی بچا کر رکھتے ہیں اور ان کو اپنے خاص فضل سے مطلع فرما دیتے ہیں۔

استاذ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ''محبوبیت'' کے وصف سے بھی خوب نوازا تھا، ہر شخص یہ سمجھتا کہ مجھ سے سب سے زیادہ تعلق ہے، کیونکہ ہر ملنے والے کو شفقت و محبت سے نوازتے تھے، اس لئے لوگ بھی آپ کو دیوانہ وار چاہتے تھے۔ ہمارے علاقے میں ایک ڈرائیور تھا، اس نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ استاذ صاحب کی سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہے اور مجھے جتنا چاہتے ہیں اتنی محبت کسی اور سے نہ ہوگی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک گاڑی ڈرائیور سے بھی آپ کا رویہ اور تعلق ایسا رہا کہ وہ بھی آپ کی محبت کو سب سے بڑھ کر محسوس کرتا ہے۔

استاذ صاحب میں اللہ تعالیٰ نے مروت اور دوسروں کا خیال رکھنے کا عجیب مادہ رکھا تھا، ایک بار مولانا عدنان کاکاخیل نے بتایا کہ میرے بھائی سفیان کی اہلیہ ہسپتال میں داخل تھیں، میں نے حضرت الاستاذ کو فون کر کے ان کے لئے تسہیل ولادت کے تعویذ کی اجازت چاہی، حضرت نے فون پر تعویذ تو بتلا دیا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چند گھنٹوں میں آپ ہنگو سے سیدھے اسلام آباد ہسپتال پہنچ آئے۔ میں نے جلدی سے ہسپتال کی کینٹین سے مشروب لایا تو فرمایا کہ آپ سادات کا اس پریشانی اور مشکل وقت میں بھی مہمانی کا تکلف نہیں چھوٹتا۔ پھر خود ہی دست مبارک سے تعویذ لکھ کر باندھنے کا طریقہ بتلایا۔ ہمدردی، مروت اور تعلق کی ایسی مثالیں نفسانفسی کے اس دور میں ملنا عنقا ہیں۔

اسی مروت پر ایک واقعہ حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ کا یاد آیا، ایک بار جون کی سخت دوپہر میں عین ظہر کے جامعہ یوسفیہ وقت پہنچے، اتنی شدید گرمی تھی کہ پگڑی اتار کر سر پر ٹھنڈے پانی سے بھیگا ہوا رومال رکھا، عام سوزوکی وین میں سات گھنٹے کا طویل سفر کر کے تشریف لائے تھے۔ جیسے ہی بیٹھے تو فرمایا کہ بس زیارت ملاقات ہوگئی، میں نے واپس چلنا ہے، ہم حیرت میں ڈوب گئے کہ یا اللہ! یہ اچانک واپس جانے کی کیا وجہ بنی؟ اور وہ بھی اس شدید گرمی میں۔ فرمایا کہ میں نے کسی کے ساتھ رات کے کھانے کا وعدہ کر رکھا تھا، وہ بھول گیا تھا، ہنگو پہنچ کر یاد آیا، لہٰذا واپس جانا ضروری ہے۔ حضرت الاستاذ نے عرض کیا کہ جی ہنگو شہر سے فون کر کے صاحب دعوت کو بتادیتے ہیں، معذرت کر لیتے ہیں کہ استاذ جی آج نہیں آسکتے۔ فرمایا: مولانا! وہ کیا سمجھیں گے کہ یہ مولوی بھی وعدہ کر کے مکر جاتے ہیں اور دنیاداروں کی طرح نخرے کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اور ہمیں حیرت میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر اسی وقت واپس چل دیئے۔ اب مروت کی ایسی مثالیں لائیں تو کہاں سے؟؟؟

حضرت استاذ صاحب نے مختلف ملکی وملی مسائل میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ جس وقت

خیبر پختونخواہ میں حالات خراب ہوئے تو آپ نے قیام امن کے لئے جان کی بازی لگا کر کام کیا، خصوصاً جب گورنر علی محمد جان اورکزئی نے قیام امن کے حوالے سے اپنی دلچسپیاں ظاہر کیں اور استاذ صاحب سے تعاون کی درخواست کی، تو آپ نے پیرانہ سالی اور ضعف و کمزوری کے باوجود اپنی پوری قوت قیام امن کے لئے صرف فرمادی۔ کبھی کبھار صبح ہم دیکھتے کہ آنکھیں لال سرخ ہیں، استفسار پر فرماتے کہ آج ساری رات قیام امن کے لئے حکومت اور مسلح تحریکوں کے درمیان متوقع معاہدات کے لئے تجاویز سوچتے اور مرتب کرتے گزری۔ پوری پوری راتیں جاگ کر آپ خاکے بناتے رہتے کہ کسی طرح قبائل میں امن کی بہاریں لوٹ آئیں۔

مسلح تحریکوں اور حکومت کے مابین ثالثی کے دوران آپ جانبین سے ملاقاتوں کے لئے طویل اسفار فرماتے رہتے۔ بندہ کو بھی جنوبی وزیرستان کے مسلح گروپوں سے حکومتی مذاکرات کی راہ ہموار کرنے اور انہیں جاری خانہ جنگی سے روکنے کے لئے آپ کے ساتھ ایک سفر میں رفاقت حاصل رہی۔ گو کہ اس زمانے میں ابھی آپریشن یا فوجی اثر ورسوخ ان علاقوں میں نہیں بڑھا تھا، تاہم ان تحریکوں کے سرکردہ افراد جن علاقوں میں رہائش پذیر تھے ان تک دشوار گزار پہاڑیوں اور دروں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ آپ نے طویل اور پر مشقت سفر کر کے وہاں ملاقات کی اور ان کے سامنے یہ فارمولا رکھا کہ حکومت کے ساتھ خانہ جنگی مول لینے میں قبائل، اہل دین اور اہل پاکستان کی تباہی ہے۔ اس کام سے باز رہ کر اپنی نئی حکمت عملی ترتیب دیں۔ حکومت کو منوانے کی کوشش کی جائے گی کہ آپ کا تشخص تسلیم کر کے ان علاقوں میں بارڈر کی حفاظت اور شوریدہ خطوں میں ملک اور دین دشمن عناصر کی سرکوبی کے لئے مشترکہ اہداف کے حصول میں آپ کو شریک کار رکھے۔ آپ کی کوشش تھی کہ جذبۂ جہاد سے سرشار قبائل حکومت سے ٹکرانے کی بجائے طاغوتی قوتوں کے خلاف استعمال ہوں اور ملک کی بنیادیں مضبوط کرنے میں معاون بنیں۔ لیکن افسوس کہ جنوبی وزیرستان کی مسلح قیادت نے آپ کے فارمولے کو دوٹوک اور واضح انداز میں مسترد کر کے قبول کرنے سے انکار کیا اور معذرت ظاہر کی کہ وہ ان خطوط پر حکومت سے معاہدات کے لئے تیار نہیں۔ استاذ صاحب نے بعد میں مجھ سے فرمایا کہ چلو اچھا ہوا منافقت سے کام لینے کی بجائے انہوں نے صاف بات تو کہہ دی ہے۔

استاذ گرامی کی ایک ایک ادا، ایک ایک وصف مستقل مقالات کا متقاضی ہے۔ آپ کی خودداری، استغنا، شجاعت، توکل، زہد وفقر، اخلاص وللّٰہیت، رسوخ فی العلم، تقویٰ وطہارت، مال وجاہ سے نفرت، احباب کی خبر گیری اور ملک وملت کی ترقی کے لئے تڑپ مثالی تھی۔ افسوس! کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہی وہ دردناک منظر ہمیں دیکھنا پڑا جب بے گناہ معصوم طلبہ کے جاری حلقہ ہائے درس پر بلا کسی جرم بمباری شروع کر دی گئی۔ آپ اس وقت گھر میں تھے۔ اہل خانہ کے روکنے کے باوجود نکل کر مدرسہ آئے، طلبہ واساتذہ مدرسہ سے نکل چکے تھے، باقیوں کو بھی نکال

دیا، خود تنہا مدرسہ میں رہ گئے، اس اثنا ایک بم عین مسجد اور کتب خانہ کے درمیان گر گیا جس سے آپ جام شہادت نوش کر گئے۔ ہمارے ہوش وحواس معطل ہو گئے، اعضا شل ہو گئے، زبانیں گنگ ہو گئیں۔ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا جس شخص نے پوری زندگی کسی کو اذیت دینے کا سوچا تک نہ تھا، جس نے آخری دم تک امن کے قیام کے لئے جنگ لڑی تھی، آج امن کی رٹ قائم کرنے والوں کے ہاتھ خود اس کے خون سے رنگین ہو گئے۔

یہ حادثہ ہمارے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا، نا معلوم ہم اس کو کیسے برداشت کر گئے۔ اللہ کی ذات ہی صبر بخشنے والی ہے، ورنہ استاذ صاحب کے بغیر ہم زندہ رہیں گے اس کا کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔ حضرت کی شہادت کے بعد ہم پر جس انداز سے زمین تنگ کی گئی، ہمارا جینا دوبھر کر دیا گیا، ہمیں مختلف حیلے بہانوں سے سخت ترین ذہنی اذیتوں سے گزارا گیا کہ اب اس زمین پر ہمارا رہنا ہمارے حکمرانوں کو گوارا نہیں۔ ہم اس ملک کی خاطر جو کچھ کر سکے وہ کیا اور ایسے حالات میں کیا اور ان علاقوں میں کیا، جہاں حکومت کے تنخواہ داروں کی زبانیں گنگ تھیں اور وہ ذمیوں کی طرح ٹیکس دے کر اور تاوان کاٹ کر جیتے تھے۔ لیکن ہمارے اخلاص وجدوجہد اور ہماری کاوشوں کا یہ ثمرہ ہمیں ملا کہ ہم سے ہماری محبوب ہستی چھین لی گئی۔ ہم قیامت کے دن دربار الٰہی میں ضرور مجرموں کے گریبان پکڑیں گے۔ یقیناً وہ دن آنے والا ہے جب واحد بادشاہ ہر مظلوم کو انصاف دینے اپنی عدالت قائم کرے گا۔ اس دن ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ظالموں سے اس ظلم کا حساب ضرور وصول کریں گے۔

حضرت استاذ صاحب کی مظلومانہ شہادت سے ایک بات بخوبی واضح ہوئی کہ وطن خداداد کی باگیں پوری طرح دین دشمن اور بیرونی طاقتوں کے آلہ کاروں کے قبضے میں ہیں اور وہ اس وطن میں یونہی بدامنی اور خون کی ہولی کا کھیل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ اس ملک کے جوان اور نئی نسل باہمی نفرتوں کے بھینٹ چڑھ کر ایک دوسرے کو اپنا دشمن باور کرتی رہے اور اپنے ہی ہاتھوں ایک دوسرے کے گلے کاٹتی رہے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جو کالی بھیڑیں اقتدار میں گھس کر اپنے آقاؤں کے طے کردہ ایجنڈوں کی تکمیل کے لئے یہاں سرگرم عمل ہیں وہ ضرور رسوا ہوں گے، ناکام ہوں گے، تباہ وبرباد ہوں گے۔ پاکستان کے حقیقی اور محب وطن سپوتوں کا مظلومانہ لہو رنگ لائے گا اور اس ملک میں قیام امن اور قیام شریعت کا وہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا جس کی نوید ہمارے اکابر خصوصاً حضرت سیدی ومرشدی مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مقدس خون سے لکھ کر دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ

میرے مربی، میرے مرشد

مفتی عظمت اللہ، کوہاٹ

یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے بندہ ناچیز نابالغ بچہ تھا، پڑھنے کے شوق میں کچھ احباب کے ساتھ جامعہ یوسفیہ شاہووام ہنگو آیا اور درجہ اعدادیہ میں داخلہ لیا۔ جامعہ کی بنیاد اس سے ایک سال قبل عارف باللہ محدث العصر حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ نے ڈالی تھی۔ اُس وقت یہاں ایک مسجد اور چند کمرے تھے، دور دور تک آبادی کا نام ونشان نہ تھا اور فاصلے فاصلے پر چند گھر اور بقیہ ویران جنگل۔ اس وقت حضرت والا شہیدؒ کے تھوڑی کے بال کالے تھے، طلبہ کے ساتھ آپ کا رویہ اپنے باپ سے بڑھ کر تھا۔ ہر کام میں طلبہ کے شریک رہتے۔ بندہ ان ابتدائی ایام میں حضرت کی شفقت ومحبت سے بہت متاثر ہوا۔ قلبی تعلق اور محبت کا جو لگاؤ حضرت نور اللہ مرقدہ سے پیدا ہوا، اس میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ حضرت کے پرنور اور پرکشش چہرے کو ایک بار دیکھنے سے لوگوں کی زندگیاں بدلتی تھیں اور اتنی اپنائیت کے ساتھ لوگوں سے ملتے کہ ہر آنے والا محسوس کرتا کہ میرا تعلق حضرت کے ساتھ سب سے بڑھ کر ہے۔

حضرت والا کی صفات حسنہ بہت ہیں لیکن بعض صفات آپ کی خمیر میں شامل تھیں۔ مروت ودینی حمیت، حیاو استغنا، مہمان نوازی وانکساری، اخلاص وللہیت جیسی صفات میں آپ کا ثانی نہ تھا۔ انتہائی امن پسند اور محب وطن تھے جب بھی کوئی ناگوار واقعہ یا وطن خداداد کے حوالے سے کچھ خطرات لاحق ہوتے تو طلبہ کو جمع کر کے ختم قرآن اور دعا فرماتے۔ بندہ ناچیز نے حضرت شہیدؒ کے ساتھ تقریباً ستائیس سال گزارے ہیں، اس طویل مدت میں حضرت کی زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اگر حضرت کے سفر وحضر کے واقعات لکھنا شروع کروں تو یقیناً احاطہ مشکل ہو جائے گا، صرف چند واقعات ذکر کرتا ہوں، تا کہ قارئین کو اندازہ ہو کہ آپ کتنی عبقری شخصیت کے مالک تھے۔

سادگی وتواضع:

ہمارے ایک دوست نے یہ واقعہ ہمیں سنایا کہ میں دارالعلوم کراچی میں پڑھتا تھا، جب بھی کسی بڑے عالم یا شیخ الحدیث سے ملاقات ہوتی تو تعارف کے دوران پوچھتا کہ آپ ہنگو سے آئے ہیں، وہاں مولانا امین صاحب سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں؟ میں کہتا کہ میں تو انہیں نہیں پہچانتا۔ وہ حیران رہ جاتے کہ اتنے بڑے عالم کو آپ نہیں

پہنچانتے۔ وہ دوست کہتا ہے کہ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوجاتا کہ یہ کون سی ہستی ہے کہ سارے اہل علم ان سے واقف ہے اور میں ان کی زیارت وملاقات سے محروم ہوں۔ فرمایا کہ میں نے پختہ ارادہ کیا کہ اس دفعہ چھٹیوں میں ضرور حضرت سے ملاقات کروں گا۔ جب چھٹیاں ہوئیں تو میں حضرت اقدس کی زیارت وملاقات کی غرض جامعہ یوسفیہ شاہو وام آیا، اس وقت چھٹی کی وجہ سے مدرسہ خالی تھا اور تقریباً دوپہر کھانے کا وقت تھا، حضرت انتہائی سادہ لباس میں تھے، جس کی وجہ سے میں نے انہیں نہیں پہچانا۔ میرے ساتھ انتہائی ادب وتواضع کے ساتھ ملے، احترام کے ساتھ بٹھایا اور خود جلدی سے گھر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کھانا لے آئے اور لوٹا بھر کر ہاتھ دھونے کے لئے پانی ڈالا، پھر دستر خوان پر کھانا رکھ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے اور گھر کے حال واحوال پوچھتے رہے۔ میں دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بابا جی مدرسے کا کوئی خادم ہوگا، حضرت شاید آرام فرما رہے ہوں گے۔ میں بہت بے تکلفی سے گفتگو کرتا رہا۔ اس دوران میں نے ان سے پوچھا کہ مولانا محمد امین صاحب کہاں ہوں گے، ان سے ملاقات کرنی ہے۔ تو حضرت نے تبسم فرمایا کہ وہ یہاں قریب ہی ہے، ملاقات ہوجائے گی۔ اس کے متبسمانہ لہجے سے میں نے معلوم کیا کہ حضرت تو یہی ہے۔ میں شرم کے مارے سکڑنے لگا تو حضرت نے مجھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: نہیں بیٹھے رہیں، بے تکلفی اچھی چیز ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت کتنے متواضع اور سادہ زندگی گزارنے والے تھے۔

حضرت کی گھریلو زندگی انتہائی سادہ تھی جس پر حضرتؒ کا ذاتی کمرہ شاہد ہے جو مکمل طور پر کچا ہے جس میں بمشکل دو چار پائیاں سما سکتی ہیں، حضرتؒ کی شہادت کے بعد ادھر اُدھر سے مختلف علمائے کرام تشریف لاتے تھے اور حضرتؒ کا کمرہ دیکھتے ہی رونے لگتے تھے، ہمارے ایک دوست حضرت کے بارے میں کہتے تھے کہ حضرت اصلاً صحابہ کرامؓ کے قافلے کے فرد تھے، لیکن ہمارے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔

ایک مرتبہ بندہ ناچیز کو اہتمام کے ساتھ فرمایا کہ اکثر ساتھی گھریلو حالات کی وجہ سے درس وتدریس جیسا مقدس شعبہ چھوڑ چکے ہیں جو انتہائی قابل اور ذہین ہیں آپ سے کہتا ہوں کہ ان مصنوعی حالات کی وجہ سے ہرگز تدریس کا شعبہ نہ چھوڑیں۔ بندہ نے حضرت سے عہد کیا کہ آپ کی دعائیں ساتھ ہوں تو ان شاء اللہ میں تدریس نہیں چھوڑوں گا۔ پھر فرمایا کہ افسوس یہ ہمارے ساتھی ضرورت اور سہولت میں فرق نہیں کرتے، ضرورت کی حد مقرر ہے اور سہولت کی کوئی حد نہیں۔ فرمایا کہ اگر اس حدیث پر پختہ یقین ہو کہ "من عمل بما علم کفاہ اللہ ویرزقہ من حیث لا یحتسب" تو کوئی پریشانی نہ رہے گی۔ کئی بار حضرت کے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین صاحب نے ارادہ کیا کہ حضرت کے لئے پختہ مکان بنالیں کیونکہ حضرت کے پاس دور دراز سے بڑے بڑے لوگ آتے ہیں، لیکن حضرت سختی سے منع فرمادیتے۔

اتنے منکسر المزاج تھے کہ جب کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو جواب دیتے کہ میں مفتی نہیں ہوں۔ اکثر بندہ کے پاس بھیج دیتے، اگر بندہ نہ ہوتا تو پھر کتاب دیکھ کر مسئلہ بتاتے۔

اخلاص وللہیت:

سمعت وریاسے کوسوں دور تھے، ایک مرتبہ بندہ کے ساتھ حضرت شہیدؒ ہمارے گاؤں چلے گئے۔ رات کو ہمارے حجرے میں قیام فرمایا، بندہ ناچیز بھی حجرے میں ساتھ رہا، چونکہ سخت سردی کا موسم تھا، اس لئے بندہ نے سوچا کہ اگر میں سوگیا اور حضرت کو باہر نکلنے یا گرم پانی وغیرہ کی حاجت ہوئی تو ایسا نہ ہو کہ حضرت کو کوئی تکلیف پہنچے، اس لئے میں نے جاگنے کا عزم کرلیا اور لحاف کے کنارے سے حضرت کو دیکھتا رہا، تقریباً رات ساڑھے تین بجے حضرت انتہائی آرام سے اٹھے۔ 'سردیوں میں ساڑھے تین بجے کے بعد فجر تک اچھا خاصا وقت ہوتا ہے' اور دروازہ بہت سلیقے سے کھولا، حجرے سے باہر وضو بنایا اور نفلوں کے لئے کھڑے ہوگئے، بڑی دیر تک نفلیں پڑھتے رہے، پھر مصلیٰ پر بیٹھ کر ذکر واوراد کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی اذان کا وقت ہوا، پھر آرام سے آکر چارپائی پر ایسے لیٹے جیسے گہری نیند سورہے ہوں۔ اس دوران میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد انور حجرے میں داخل ہوئے اور حضرت کو جگایا تو حضرتؒ آنکھیں ملتے ہوئے فرمانے لگے کہ رات ایسی گزری کہ پتہ ہی نہیں چلا۔

مطالعہ کا شوق وانہماک:

حضرت مطالعہ کے انتہائی دلدادہ تھے، جب کبھی کوئی نئی کتاب ہاتھ لگ جاتی تو پھر کسی چیز کی پروا نہیں رہتی تھی، ایک مرتبہ کسی ساتھی نے کوئی نئی کتاب دے دی، حضرت نے کھڑے کھڑے مطالعہ شروع کیا، بندہ ناچیز نے دیکھا کہ حضرت کھڑے مطالعہ فرمارہے ہیں، میں نے ایک گھنٹہ کامل پڑھایا، درسگاہ سے نکلا تو حضرت کتاب کے مطالعے میں مستغرق ویسے ہی بدستور کھڑے تھے۔ میں دوسرا سبق پڑھانے چلا گیا، ایک گھنٹہ پڑھا کر نکلا تو حضرت ویسے ہی منہمک کھڑے ہیں۔ میں تیسرا گھنٹہ پڑھانے درسگاہ میں داخل ہوا، جب تیسرا گھنٹہ پڑھا کر نکلا تو آپ بدستور اسی جگہ کھڑے مطالعہ کررہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور جسارت کر کے عرض کیا کہ حضرت! اگر آپ بیٹھ جائیں تو بہتر ہوگا، کیونکہ آپ مسلسل تین گھنٹوں سے کھڑے ہیں، حضرت نے گھڑی دیکھی اور فرمایا، اناللہ! مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

علمی گہرائی کا اندازہ حضرتؒ کی بعض تحریرات وتصنیفات سے لگایا جاسکتا ہے خاص طور پر ''نثر الازہار'' جس کی دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور بقیہ پانچ جلدیں زیر ترتیب ہیں، اس کا ایک ایک صفحہ علم رجال پر آپ کی گرفت، حدیث میں وسعت نظر، تفقہ میں کمال مہارت اور عربی ادب سے گہری شناسائی پر دلالت کرتا ہے۔ جہاں کہیں امام

طحاوی بھی حنفیت کے دفاع سے عاجز دکھائی دیں، وہاں ہمارے حضرت کی وسعت نظر کو داد دینی پڑتی ہے کہ حنفیہ کے مذہب کو اتنی احادیث سے مؤید ومبرہن کردیتے ہیں کہ حنفی مسلک کا اوفق بالحدیث ہونا ظاہر و باہر ہوجاتا ہے۔

طلبہ کے ساتھ شفقت:

طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت کا اندازہ تو زندگی کے آخری لمحات سے لگائیں کہ جب جیٹ طیاروں نے پہلا بم مدرسے پر گرایا تو اس وقت حضرت گھر میں تھے اور مدرسے کی طرف نکلنے کے لئے بڑھے، گھر والوں نے بہت اصرار کیا کہ مدرسے پر جیٹ طیارے بمباری کررہے ہیں، آپ باہر نہ جائیں لیکن حضرت نے کسی کی بات نہ مانی اور فرمانے لگے کہ میرے (روحانی) بچے ملبے تلے پڑے رہیں گے اور میں گھر میں رہوں گا، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اور جو نہی مسجد کے احاطہ میں داخل ہوئے تو طیارے نے دوسرا بم داغا اور اس سے شہید ہوگئے۔

مضی من فقدنا صبر نا عند فقده

وقد کان یعطی الصبر والصبر عازب

ایک بار مجھے بہت سخت بخار ہورہا تھا، غالباً میں ابتدائی درجے کا طالب علم تھا، میرا ارادہ ہوا کہ بازار جاکر ڈاکٹر سے دوائی لیتا ہوں۔ مدرسہ سے اکیلا ہی چل دیا، اس اثنا میں حضرت استاذ صاحب گھر سے باہر نکلے، مجھے باہر نکلتے دیکھا تو پوچھا کہ کہاں جارہے ہو، میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بخار ہے، ڈاکٹر کے پاس جارہا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ ڈاکٹر کی دکان کا علم ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! کسی سے پوچھ لوں گا، خود تو پہلے کبھی نہیں گیا۔ آپ نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور باہر روڈ پر گاڑی روک کر اگلی نشست پر بٹھایا، مجھے آپ سے آگے بیٹھنے پر حیا آئی اور انکار کرنے لگا۔ اس پر آپ غصہ ہوئے اور فرمایا: آپ بیمار ہو، آگے بیٹھو، میں تو تندرست ہوں۔ پھر خود پک اپ گاڑی میں پیچھے بیٹھے، مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاکر دوا دلوائی اور واپس مدرسہ تک پہنچایا۔

اجتماعی اموال میں احتیاط:

حضرت استاذ صاحبؒ مدرسہ کے اجتماعی اموال میں انتہائی محتاط تھے اور معمولی اسراف پر بھی سخت غصہ ہوتے تھے۔ ہمارے مدرسہ کا تعمیری کام کرنے والے ایک ٹھیکیدار تھے، جب حضرت کے پاس تعمیری مد میں کچھ رقم آتی تو انہیں تعمیری ضروریات بتلا کر رقم حوالے کردیتے، وہ بھی کافی نیک آدمی تھے، اکثر مدرسہ کے کام للہ فی اللہ کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے وضو کے لئے پانی کا حوض بنایا اور وضو کے لئے بیٹھنے والے کی جگہ ایک دو بالشت زیادہ چوڑی رکھ دی، اس پر استاذ صاحب سخت ناراض ہوئے اور اس کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی کہ اتنی مقدار جو سیمنٹ اور

اینٹ زیادہ خرچ ہوئی ہے، اس کا حساب قیامت میں کون دے گا؟ پھر آپ نے اس کا حساب لگا کر اپنی ذاتی رقم سے مدرسہ کی مد میں وہ اخراجات داخل کیے۔

اس انتہائی احتیاط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ خاص فضل فرمایا تھا کہ مدرسہ میں کہیں معمولی خیانت بھی ہوتی تو آپ کو کشف ہو جاتا۔ ایک بار عشا کے بعد کا وقت تھا اور آپ اچانک گھر سے تیزی سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ مدرسہ میں کہیں خیانت ہو رہی ہے۔ ٹارچ آپ کے ہاتھ میں تھی، اِدھر اُدھر کافی تلاش کیا لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں بھی ساتھ ہو گیا فرمانے لگے کہ واللہ العظیم میرے لئے مدرسہ چلانے کا کوئی حق نہیں بنتا اگر میں سویا ہوں اور مدرسہ میں اس طرح خیانت ہوتی رہے۔ اس کے بعد مدرسہ کے مطبخ میں گئے تو دیکھا کہ کچھ طالب علم وہاں رات گئے اپنے لئے مدرسہ کے اجتماعی آٹے سے پراٹھے بنا رہے تھے۔ آپ نے انہیں خوب تنبیہ کی بلکہ سزا دی کہ اس طرح اجتماعی اموال اپنی ذات پر خرچ کرنا بالکل جائز نہیں۔

استغنا:

حضرت استاذ صاحبؒ میں صفت استغنا کامل طور پر موجود تھی، ذاتی ضروریات ہونے کے باوجود کسی سے بھی اظہار نہیں فرماتے، البتہ قومی ضروریات کے بارے میں حکومتی اہلکاروں سے ضرور اظہار فرماتے تھے، بجلی کی منظوری کے لئے بہت کوششیں کیں یہاں تک کہ علاقے کے لوگوں کو بجلی فراہم ہوئی۔ اس طرح علاقہ وام اور روچ بازار میں پانی کی شدید قلت تھی اس کے لئے بہت کاوشیں کیں۔

علاقہ سماری پر سے جو سڑک گزرتی ہوئی کوہاٹ ہائی وے سے جا ملی ہے، یہ سڑک بھی حضرت کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، جب بھی کسی وجہ سے عام شاہراہ بند ہو، اسی ''سماری'' روڈ پر ضرورت مند لوگ بلا خوف وخطر سفر کرتے ہیں۔

عارف خان بنگش سرحد (خیبر پختونخوا) کے گورنر تھے، اہل علم کے قدردان تھے، اس لئے علما کے بہت سارے وفود ان سے ملاقات کے لئے جاتے، اکثر لوگ ذاتی وخاندانی مسائل بھی حل کروانے کی کوشش کرتے لیکن بقول گورنر صاحب یہ دو شیوخ (مولانا عبداللہ صاحبؒ اور مولانا محمد امین شہیدؒ) جب بھی آئے ہیں کبھی بھی ذاتی کام کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا۔

اپنے گھر اور مدرسہ کا راستہ کچا تھا بارش کے بعد کیچڑ بن جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب کوئی ایم، پی، اے یا ایم، این، اے آجاتا تو وہ اسے پختہ کرنے کے لئے اصرار کرتا لیکن حضرت انکار کرتے اور فرماتے کہ اس کے بجائے عامۃ الناس کی ضروریات کا خیال رکھیں۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اعدادیہ میں پڑھائی جاتی ہے ہمیں پڑھائی تھی، حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر مصائب کا تذکرہ ہوتا تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ آپ کے ہر قول وعمل سے سنت نبوی کا رنگ جھلکتا تھا۔ بندہ نے حضرت کو خوشی وغم کے ہر موقع پر سنت نبوی کا اتباع کرنے والا دیکھا۔

ماہ رمضان میں اعتکاف:

جب بھی ماہِ رمضان شروع ہوتا حضرت رحمہ اللہ مسجد کے ایک کونے میں اہم کتب اور کچھ ادویات رکھ دیتے اور پورا مہینہ اعتکاف میں گزارتے، تراویح میں مسلسل ختم قرآن کا اہتمام فرماتے۔ آخری عشرہ میں پوری رات ذکر واذکار اور عبادت میں گزارتے۔ اپنے تلامذہ ومعتقدین کو بھی نصیحت وترغیب دیتے کہ رمضان شریف کا مہینہ فضول ضائع نہ کریں۔ حضرت جب اعتکاف میں بیٹھتے تو ایک بلا جو حضرت رحمہ اللہ کے ساتھ بہت زیادہ مانوس تھا، وہ بھی مغرب کی نماز کے بعد حضرت کے پاس آکر کچھ دیر حضرت کے پاس ادب کی ساتھ بیٹھ جاتا اور پیار وشفقت وصول کرنے کے بعد چلا جاتا۔

مدرسین کے ساتھ رویہ:

مدرسہ کے مدرسین کے ساتھ بہت احترام سے پیش آتے، مروجہ مہتممین کا رویہ بالکل نہ تھا، جب کسی استاذ کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہوتا تو اکیلے کمرے میں بلا کر انتہائی ادب وشائستگی کی ساتھ سمجھاتے۔

بندہ ناچیز عصر کی نماز کے فوراً بعد مسجد سے نکل کر ورزش کے لئے چلا جاتا، ایک دن مسجد میں تمام طلبہ کرام کو بٹھایا اور بندہ سے فرمایا کہ آپ بھی مسجد میں بیٹھیں، اگر مجھ سے مسئلہ بیان کرنے میں غلطی ہو جائے، تو آپ میری تصحیح فرمائیں کیونکہ آپ مفتی ہیں، میں مفتی نہیں ہوں۔ پھر طلبہ کو تسبیحات کے بارے میں ترغیب دی اور آخر میں مجھ سے فرمایا کہ اس میں اگر مجھ سے کچھ غلطی سرزد ہوئی ہو تو آپ تصحیح فرمائیں۔ بندہ نے شرمندگی سے سر ہلاتے ہوئے تصویب فرمائی۔ یہ آپ کی تربیت کا انداز تھا، مجھے احساس دلایا کہ تسبیحات نظر انداز کرنے کی چیز نہیں اور بحمد اللہ بس یہی سبق ہمیشہ کے لئے کافی ہو گیا۔

جب اساتذہ کرام کو کچھ رقم دینی ہوتی تو استاد کا ہاتھ پکڑ کر کوئی بات شروع کر دیتے کہ بھئی! فلاں کام کیسے چل رہا ہے، فلاں کام کا کیا بنا اور خفیہ طور پر استاذ صاحب کے ہاتھ میں رقم تھما دیتے، کسی کو احساس تک نہ ہوتا تھا۔ یہ مدرس کی عزت نفس کا خیال رکھنے کی وجہ سے کرتے تھے تاکہ اُسے رقم لینے میں شرمندگی نہ ہو، حضرت کی یہ ادا بہت

ہی نرالی تھی۔

ایک بار ہم چند دوستوں نے شکار پر جانے کا پروگرام بنایا، مجھے پروگرام کے لئے رقم کی ضرورت تھی، جیب بالکل خالی تھی، اس لئے ایک دوست سے تین ہزار روپے قرضہ لیا، جب میں واپس مدرسہ آیا، تو حضرت کو سخت غصے کی حالت میں پایا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر کیا غلطی سرزد ہوئی ہے، جو حضرت اتنے سخت غصہ میں ہے۔ آپ نے مجھے قریب بلایا تو یہ دیکھ کر مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی کہ جلال کی وجہ سے آپ کی آنکھیں بالکل سُرخ لال ہو رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا: بتاؤ! کتنے پیسے قرض لیے تھے؟ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی کیونکہ جس دوست سے قرضہ لیا تھا، اُس کے علاوہ کسی کو بھی اس کا علم نہیں تھا اور پھر وہ بھی تو ہمارے ساتھ پروگرام میں شریک تھا یہ تو امکان ہی نہ تھا کہ اُس نے آپ کو بتلایا ہوگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کو اس کا کشف ہوگیا ہے، چونکہ آپ کو انتہائی سخت اور اشد ضرورت کے علاوہ قرض لینا سخت ناگوار تھا، اس لئے آپ کا یہ عتاب بھی برمحل تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تین ہزار روپے لئے تھے۔ آپ نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین ہزار روپے نکال کر مجھے تھماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ لیں قرض ادا کریں اور آئندہ کبھی کسی سے قرض لینے کی جرأت نہ کرنا۔

اسباق یا مدرسہ کے نظم وضبط کے حوالے سے اگر اساتذہ سے کوتاہی ہوتی اور بات اجلاس میں اجتماعی سطح پر کرنا ضروری ہوتی تو بجائے کسی متعین فرد کی نشاندہی کے خود کو مخاطب اور متعین کر کے اپنے بارے میں بات کرتے۔ عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے، اس سے جس میں جو کمی ہوتی اُسے اندازہ ہو جاتا۔

اُستاذ کی تقرری میں محتاط تھے، مخلص اور بے لوث حضرات کو ترجیح دیتے تھے لیکن تقرری کے بعد اس کے مقام واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، تقسیم کتب یا ابتدائی نظم طے کرنے کے اجلاس میں اساتذہ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لئے کچھ قواعد وضوابط بیان کرنا ضروری ہوتے تو پہلے ان سے خوب معذرت کرتے اور فرماتے کہ میری کوئی حیثیت نہیں کہ آپ کے سامنے یہ باتیں کروں لیکن مدرسہ کے نظم کی وجہ سے بطور مذاکرہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس وقت اپنے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے کہ اب میرا قلم اُن کو نقل کرنے سے عاجز ہے۔ اس طرح کی باتیں سن کر ہمارے کلیجے پھٹنے کے حالات ہو جاتے اور دل کرتا کہ چیخ چیخ کر روئیں کہ اتنے بلند علمی وروحانی مقام پر فائز ہونے کے باوجود عام مدرس کے مقابل بھی اپنی حیثیت کچھ نہیں سمجھتے۔

اکابر کا احترام:

اکابر کا انتہائی احترام فرماتے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا فضل محمدؒ جامعہ یوسفیہ تشریف لائے

وہ تا حال گاڑی میں تھے۔ حضرتؒ نے چھوٹے بچے کی طرح گھر کی طرف سے دوڑ لگائی اور اتنی عجلت فرمائی کہ عمامہ کھل کر نیچے آگیا۔ جب بھی کوئی بزرگ یا حضرتؒ کے استاذ جامعہ تشریف لاتے تو حضرتؒ کا چہرہ مبارک خوشی سے کھل اٹھتا۔ ایک مرتبہ شیخ الحدیث مولانا شیر علی شاہ صاحبؒ ہنگو چشمہ مسجد تشریف لائے تو حضرتؒ نے اپنے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین صاحب سے فرمایا کہ ہنگو شہر میں ایک بہت بڑے عالم تشریف لائے ہیں، آپ بھی اگر ہمارے ساتھ چلے جائیں تو حاجی صاحب نے برجستہ جواب دے کر کہا کہ میں نہیں جا سکتا، ایسے کاموں کے لئے میں فارغ نہیں ہوں۔ حضرتؒ بہت برہم ہوئے اور فرمایا: بھائی جان آپ کو پتہ ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور صرف ایک نظر دیکھنے سے آدمی صحابیت کا مرتبہ پالیتا ہے اور علماء حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی وارث ہیں لہٰذا اتنے بڑے شیخ الحدیث اور عالم دین کا صرف چہرہ دیکھنا بھی خیر سے خالی نہیں۔ اسی طرح شیخ الحدیث مولانا عبداللہ جو کہ حضرت کے استاذ تھے ان کی انتہائی قدر کرتے تھے، جب بھی کوئی مسئلہ وغیرہ پیش آتا۔ حضرت کی مسجد جو ورچ بازار میں واقع تھی جا کر ان کے ساتھ ضرور مشورہ کرتے۔ جب دونوں حضرات کسی اجلاس یا جرگہ میں ہوتے تو عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، دونوں کو یکجا دیکھ کر عوام وخواص بہت خوشی محسوس کرتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ رعب بھی بہت طاری ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑا ملک اور خان ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا، یقیناً جنہوں نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے وہی ان کا مرتبہ ومقام جانتے ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ یہ ایک گلدان کے دو پھول تھے۔

مضت الدهور وما اتين بمثله

ولقد اتی فعجزن عن نظرائه

علمی تبحر:

حضرت استاذ صاحبؒ کے علمی مقام کا اندازہ آپ کے مطالعے اور کتابوں سے والہانہ محبت سے لگایا جا سکتا ہے، جب کسی مجلس میں کسی فقیہ یا کسی کتاب کا تذکرہ ہوتا تو آپ اس کے متعلق نادر اور قیمتی گفتگو شروع فرماتے کہ فلاں کی اتنی کتب شائع ہو چکی ہیں اور فلاں کتاب فلاں مکتبہ میں قلمی نسخہ کے طور پر پڑی ہے، اندرون ملک مکتبوں کے علاوہ بیرون ملک مکتبوں سے بھی اپنے آپ کو باخبر رکھتے تھے، جہاں سے بھی کسی نایاب کتاب کی اطلاع ملتی تو فوراً حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح جب بھی پشاور جانا ہوتا تو موقع ملتے ہی مکتبوں کا چکر ضرور لگاتے۔

آپ کے علمی تبحر کا اندازہ جامعہ یوسفیہ کے مکتبہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جس میں الحمدللہ اکثر نایاب کتابیں موجود ہیں، دور دراز سے علماء کرام آکر اس مکتبہ سے علمی پیاس بجھاتے ہیں، اور تصنیف وتالیف کا شغل رکھنے والے علماء کرام اس مکتبہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ حضرت استاذ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا عموماً زیادہ تر وقت مطالعہ میں

صرف ہوتا تھا، مکتبہ ہذا کی اکثر کتب کے شروع کے خالی ورق پر حضرت کے انتہائی اہم علمی نوٹس اور حواشی رقم ہیں۔

بعض کتابوں کے درس وتدریس کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ نحو میں ابن ہشامؒ کی شذور الذہب اور اوضح المسالک پر بہت زور دیتے تھے۔ اسی طرح فقہ میں ملا علی القاریؒ کی شرح النقایہ کی بہت تاکید کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر شرح النقایہ صحیح طور پر پڑھی جائے تو دورۂ حدیث کے مباحث پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی اور طالب علم کبھی غیر مقلدین سے متاثر نہیں ہوگا، کیونکہ ملا علی القاریؒ "جو خود بھی بہت بڑے محدث ہیں" نے نقلی دلائل پر زیادہ زور دیا ہے۔

اسی طرح مبسوط سرخسیؒ کی بہت زیادہ تعریف کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں ایسی نایاب فقہی جزئیات ہیں جو کسی اور کتاب میں ہرگز نہیں ملیں گی لیکن ساتھ یہ تمنا بھی کرتے تھے کہ کاش کوئی عالم اس طرف توجہ فرمائے کہ مبسوط کی تخریج کرلے اور اس کو مبوب طرز پر لکھ دے کیونکہ اس وقت مبسوط غیر مبوب حالت میں تھی جس سے استفادہ ذرا مشکل تھا۔ اب تو مبسوط پر کافی تحقیقی کام ہو چکے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں بندہ جب فراغت کے بعد جامعہ یوسفیہ آیا تو حضرت استاذ صاحبؒ نے فتویٰ لکھنے کی ذمہ داری مجھے سپرد کردی، الحمد للہ اس مدت میں آپ سے بہت استفادہ کیا۔ بعض مسائل لکھتے وقت حضرت خود مکتبہ تشریف لاتے، اس وقت بہت فائدہ ہوتا جب کسی مسئلہ میں کسی روایت کی ضرورت ہوتی تو رواۃ اور متن حدیث پر بحث کے وقت حضرت کی علمی گہرائی خوب آشکارا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو پختہ قوت حافظہ عطا فرمایا تھا، اسمائے رواۃ وکُنیٰ پر زبانی بحث کرتے تھے اور ائمہ جرح وتعدیل کے حوالے دیتے وقت فرماتے تھے کہ میرا تو اب قوت حافظہ بھی جواب دے گیا ہے، ۲۰ سال پہلے فلاں کتاب نظر سے گزری تھی، انہوں یہ لکھا ہے۔ ۲۵ سال پہلے فلاں کتاب دیکھی تھی انہوں یہ لکھا ہے۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ یہ تو اب حافظہ خراب ہوگیا ہے جس وقت ٹھیک تھا تو اس وقت کیا عالم ہوگا۔

جب مجھے فتویٰ کی ذمہ داری سونپی، تو میں نے کافی عذر کیا کہ حضرت میں بالکل اس کا اہل نہیں، میرے فتووں سے جامعہ کی بدنامی ہوگی لیکن آپ مسلسل میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ایک بار ابتدائی دنوں میں میں نے ایک استفتا کا جواب لکھا تو بڑی شاباش دی اور فرمایا کہ اس فتویٰ کو لے کر پورے ملک میں پھرالو، اس طرح کا جامع اور منضبط جواب بمشکل کوئی لکھ سکے گا۔ مجھے اپنی حقیقت کا بخوبی علم تھا، یہ محض حضرت کی اصاغر نوازی اور دوسروں سے کام لینے کا انداز تھا کہ اس طرح کے جملوں سے حوصلہ بڑھاتے اور کام کا جذبہ بناتے۔

آپ ہر فتویٰ کو گہری نظر سے مشاہدہ کرتے اور غلطی کی تصحیح فرماتے۔ اصل مأخذ سے رجوع کا فرماتے اور بغیر

اصل مأخذ سے رجوع کے ثانوی مأخذ کے حوالے یا کسی دوسرے کے حوالے پر اعتماد قطعاً گوارا نہ فرماتے تھے ۔ایک بار مجھے استفتا دیا کہ اسے آج ہی حل کرلیں ،میں نے کسی کام غالباً شکار پر جانا تھا اور بہت جلدی تھی ،اس لئے فتاویٰ محمودیہ سے جواب لکھ کر اس کی تخریج سے شامی کا حوالہ درج کردیا اور اُن کے حوالے پر اعتماد کرتے ہوئے فتویٰ حضرت کو دیکھنے کے لئے کھڑے کھڑے پیش کیا۔آپ نے متعلقہ عبارت پڑھ کر اس پر جلد اور صفحے کا حوالہ دیکھا تو فرمایا:مفتی صاحب !شامی کا یہ نسخہ تو ہمارے ہاں مکتبہ میں نہیں ہے جس میں یہ باب ،اس جلد میں اور اس صفحے پر آرہا ہو۔ایک تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ان کو عبارات اور ابواب کی جلدیں اور صفحات بھی مستحضر ہیں اور دوسرا شرمندگی بھی ہوئی کہ آپ کے اُصول کے خلاف فتویٰ لکھ دیا ہے۔میں نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت !جلدی تھی ،اس لئے اصل کی طرف مراجعت نہ کرسکا اور فتاویٰ محمودیہ کی تخریج سے حوالہ درج کردیا۔فرمایا:مفتی صاحب !فتوے دینا جلدی کا کام نہیں ہوتا ،جب فارغ ہوں تو تسلی سے اصل مأخذ میں سے دیکھ کر لکھ لینا۔

رؤیتِ ہلال کے بارے میں آپ کی رائے

حضرت استاذ صاحبؒ موجودہ ہلال کمیٹی کے بارے میں مطمئن نہیں تھے اور فرماتے تھے کہ نمائندہ کمیٹی کو چاہیے کہ وہ جلدی اجلاس برخاست نہ کریں کیونکہ اکثر رؤیت دیہاتی علاقوں میں ہوتی ہے ،اس کے دو وجہیں ہیں:

۱۔شہری علاقوں میں کاروبار اور گاڑیوں کی کثرت کی وجہ سے دھواں اور دُھندسا چھایا رہتا ہے ،جس کی وجہ سے چاند دیکھنے کے امکانات کم ہوتے ہیں ،اس کے علاوہ شام ہوتے ہی شاہراہوں پر لائٹس کی روشنیاں پھیل جاتی ہیں ، جس کی وجہ سے چاند دیکھنے میں دقت ہوتی ہے۔

۲۔شہری لوگ رؤیت کا اہتمام بہت کم کرتے ہیں جب کہ دیہات میں عیدین اور رمضان کے چاند دیکھنے میں بہت کوشش اور اہتمام ہوتا ہے ،جس کا نظارہ آپ کو ۲۹ /شعبان یا ۲۹ رمضان کو دیکھنے کو ملے گا ہر جگہ عمارتوں اور کھلی جگہوں پر چھوٹے بڑے چاند دیکھنے کیلئے جمع رہتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہری لوگوں کی نسبت دیہاتی لوگوں کی صحتیں اچھی ہوتی ہیں اور ان کی قوت بینائی زیادہ ہوتی ہے ،جب کہ شہری لوگوں کی قوت بینائی زیادہ برقی آلات استعمال کرنے کی وجہ سے کمزور ہوتی ہے۔

بہرحال دیہات میں جب شہادت ہمیں موصول ہوتی ہے تو اس میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں کیونکہ دیہات میں اسباب و وسائل کم ہوتے ہیں اور یہی شہادت جب ضلعی کمیٹی پھر مرکزی کمیٹی تک پہنچتی ہے تو اس میں کافی وقت لگ جاتا ہے جب کہ مرکزی کمیٹی مغرب کے متصل بعد اعلان کردیتی ہے کہ "پاکستان کے کسی کونے میں چاند نظر نہیں آیا۔"

حکومت سعودیہ کی شہادت کے بارے میں حضرت کا موقف

حضرت استاذ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ حکومت سعودیہ کی شہادت کے بارے میں فرماتے تھے کہ رؤیت کے بارے میں چونکہ اگر مطلع صاف ہوتب بھی ان کے ہاں ایک شاہد عدل کی گواہی معتبر ہے اس لئے مسلک حنفی سے متصادم ہونے کے وجہ سے معتبر نہیں البتہ اگر وہ حنفی مذہب کی رعایت کریں اور تین طرق میں سے ایک طریق پر ہمیں شہادت موصول ہوتو اس پر عمل کیا جاسکتا ہے: (۱) شہادۃ علی الشہادۃ (۲) شہادۃ علی القضاء (۳) استفاضۃ الخبر۔

حضرت کا ذاتی عمل

حضرت استاذ صاحبؒ بہت تاکید سے فرمایا کرتے تھے کہ ذاتی عمل جس کے موافق بھی ہولیکن فساد وفتنہ سے گریز کریں، جب بھی حضرت کو ہلال رمضان کے بارے میں خبر استفاضہ کے درجہ میں اطلاع پہنچتی کہ سعودیہ میں ہلال رمضان کی شہادت ہوچکی ہے تو ذاتی طور پر روزہ رکھتے تھے اور کسی کو بھی یہ نہیں کہتے کہ تم روزہ رکھو۔ یہ عمل احتیاط اور تقویٰ کی بنیاد پر تھا کہ احناف کے ہاں اختلاف مطالع معتبر نہیں۔ آپ نے اس بارے میں کبھی کسی سے اختلاف ظاہر نہیں کیا، عیدین کے بارے میں حکومت سعودیہ کی شہادت پر کبھی ذاتی عمل نہیں کیا بلکہ مقامی کمیٹیوں پر اور خاص طور پر پشاور مسجد قاسم علی خان کی کمیٹی کے اعلان پر عمل کرتے تھے، کیونکہ وہ لوگ عیدین ورمضان کے لئے رؤیت ہلال کا بہت اہتمام کرتے ہیں، اس کے علاوہ ہنگو کی مقامی ہلال کمیٹی میں بھی شریک ہوتے تھے، جس کے سربراہ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تھے البتہ عید الفطر کیلئے اجلاس میں اعتکاف کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتے تھے، پھر بھی مقامی کمیٹی کے ساتھ ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ رہتا تھا، اس طرح فتنہ وفساد سے بچنے کیلئے تکبیرات تشریق کے بارے میں ذاتی عمل مقامی ہلال کمیٹی کے مطابق تھا، کبھی ایسا نہیں کیا کہ تکبیرات تشریق حکومت سعودیہ کے مطابق پڑھی ہوں حضرت استاذ صاحبؒ اختلاف وفساد سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے معتقدین اور تلامذہ کو بھی اس کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ لیکن ایسی اختلافی صورت حال میں قربانی کو تیسرے روز تک مؤخر کرنے سے علی الاعلان منع کرتے۔ فرماتے: ویسے بھی فضلیت اول ایام کو حاصل ہے اور اختلاف کی وجہ سے احتیاط بھی اسی میں ہے کہ پہلے دو ایام میں ادا کرلی جائے۔

حضرت کی شہادت سے ہماری کمر نوٹ گئی، جن غلط معلومات اور اوہام کو بنیاد بنا کر یہ ظلم کیا گیا، حضرت اُس سے کوسوں دور تھے، آپ نے زندگی بھر امن کی دُہائی دی، نہ تو امن شکن قوتوں کی کبھی حمایت کی اور نہ ہی اُن کے کسی فعل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، بلکہ آپ اتنے سخت بیزار تھے کہ علاقہ میں آپ کا دل تنگ ہونے لگا تھا اور میرے

سامنے اس کا اظہار فرمایا کہ دل کرتا ہے یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں، یہ بدامنی دیکھی نہیں جاتی۔ فرماتے کہ یہ ایک ایسا سیلاب ہے جس نے سارے بند توڑ دیئے ہیں اور اب ہاتھوں کے منڈیراسے کہاں قابو کر سکتے ہیں۔

حضرت کی شہادت نہ صرف یہ کہ علمی حلقوں کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے بلکہ علاقہ کے عوام کے لئے بھی بہت بڑا زخم ہے، کیونکہ حضرت ہر اپنے بیگانے اور غریب امیر کے یکساں پرسان حال تھے اور اپنی حالت خواہ کیسی بھی ہو، دوسروں کی راحت اور آرام کے لئے ہر وقت بے چین رہتے تھے اور اس کے لئے عملی، مالی، دعا اور مفید مشوروں کی صورت میں ضرور تعاون فرماتے تھے۔ بندہ کی چھوٹی بچی حدیقہ بھی حضرت کے ساتھ ہی جنت الفردوس میں اپنی جگہ بنا گئی، اللہ رب العزت حضرت اقدس، میری معصوم بچی اور برادرم مولانا محمد طاہر صاحب کے پیارے بیٹے عزیزم عبدالرحمن کی شہادت قبول فرمائے اور انہیں ہمارے لئے ذخیرہ آخرت بنا کر ہماری شفاعت ونجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم)

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

مولانا ڈاکٹر انعام اللہ، اسلام آباد

شہادت جن کی مقدر تھی:

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی کے اندر نماز فجر پڑھانے کے لئے مصلیٰ پر تشریف لاتے ہوئے جب خنجر سے زخمی کیا گیا اور بتایا گیا کہ زندہ بچ جانے کے امکانات معدوم ہیں، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ألم أقل لك: أنك لاتموت الا شهيدا؟ وأنت تقول: أين وأنا في جزيرة العرب؟!

(طبقات الکبریٰ، لابن سعد: ۳/ ۲۵۹)

(یعنی کیا میں آپ سے نہیں کہتا تھا کہ آپ کو شہادت کی موت نصیب ہوگی؟ آپ فرماتے: یہ کیسے ممکن ہے، میں تو میدان جہاد سے دور جزیرۃ العرب میں بیٹھا ہوں؟!)

گویا بالفعل میدان جہاد میں جوہر شجاعت دکھاتے ہوئے شہادت کی موت سے سرفراز ہونا، قابل رشک مقام کے حصول کا واحد راستہ نہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اس حقیقت کا ادراک تھا، اطمینان قلبی کے لئے نیز تمنائے شہادت کے اظہار کے لئے استفہامی اسلوب اپناتے ہوئے گویا ہوئے "من أين، وأنا في جزيرة العرب ؟!" ورنہ دعا نہ مانگتے ہوتے: "اللهم ارزقني شهادة في سبيلك واجعل موتي في بلد رسولك"

(صحیح البخاری، رقم ۱۸۹۰)

(الٰہی! اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں میری موت مقدر فرما۔)

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ بھی اس قافلہ حق کے ایک ایسے سپاہی تھے، شہادت کی موت جن کی دہلیز پر اتر آئی اور سعادت کی موت کو گلے لگا کر زبان حال سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے:

کرو کج جبین پہ سر کفن، میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

سعادت مندیوں سے سرفراز ہونے کے لئے کسب واختیار سے زیادہ توفیق الٰہی، نصرت خداوندی اور انتخاب اور قضاء رحمانی کی اہمیت ہوتی ہے:

این سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

تاہم سعی ایمانی، ریاضت عملی اور اتصاف باوصاف حمیدہ کے لئے شعوری محنت اور اس پرخار وادی کے راہ رووں سے ارادی قلبی محبت وہ ظاہری اسباب وعلامات ہیں، جو قافلہ حق میں شمولیت کے لئے مؤہلات کا درجہ رکھتے ہیں، لسان نبوت نے اس کی خبر یوں دی ہے: "اعملوا فکل میسر لما خلق له (صحیح البخاری، رقم: ۴۹۴۹) (عمل کیے جاؤ کہ ہر ایک کو اسی عمل کی توفیق ملتی ہے، جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا۔) کلام الٰہی نے اس پر یوں مہر تصدیق ثبت کر دی ہے: یاأیها الذین امنوا اتقوا الله وکونوا مع الصادقین (التوبۃ: ۱۱۹) اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو ساتھ سچوں کے۔)

مولانا کا ذکر خیر اور شوق زیارت:

مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کے شب وروز کے معمولات اور زندگی کے تفصیلی مشاہدہ سے تو محرومی رہی، براہ راست استفادہ اور تلمذ بھی نصیب نہیں ہوا، تاہم ان کے تلامذہ، دوست احباب اور متعلقین سے ان کے علمی مقام عمل وتقویٰ، اوصاف حمیدہ، اسی طرح حسن صورت وسیرت کے بارے میں جو کچھ سنا، معدودے چند ملاقاتوں میں اس کی تصدیق ہوگئی، اسی علم وعمل اور ریاضت ومجاہدہ کی بدولت مولانا شہیدؒ کو اپنے زمانہ کے قافلہ حق، جس کی کڑیاں اسلاف سے ملتی ہیں، میں ایک نمایاں حیثیت مل گئی، اپنے خاندان کے دیگر چھوٹے بڑے تمام افراد کی طرح مجھے بھی مولانا شہید سے عقیدت تھی، ۱۹۸۱ء میں جب مادر علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی میں درجہ اولیٰ میں داخلہ کی سعادت مل گئی، اس وقت مولانا شہید رحمہ اللہ جامعہ سے رسمی تعلق منقطع کر کے اپنے علاقے ہنگو، شاہو وام منتقل ہوگئے تھے، تاہم استاذ محترم مولانا مفتی ولی درویش رحمہ اللہ، برادر بزرگوار جناب مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، برادرم مولانا امداد اللہ صاحب وجناب قاری اسد اللہ صاحب دامت فیوضہم ودیگر احباب وتلامذہ سے مولانا کا تذکرہ کثرت سے سنتا رہتا تھا، یہ حضرات جس عقیدت، تعظیم واحترام اور محبت سے مولانا کی علمیت، تدریسی وانتظامی صلاحیتوں، عمل وتقویٰ، جامعہ اور بانی جامعہ (حضرت بنوریؒ) اور اساتذہ سے تعلق وعقیدت، رفقاء سے محبت واحترام اور طلبہ سے شفقت کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، اور مولانا کے زیر ترتیب گزارے ہوئے لمحات کو بڑے اشتیاق سے یاد کرتے رہتے تھے، صرف یہی نہیں، بلکہ سالانہ تعطیلات کے دوران گاؤں میں خاندان کے بڑوں اور بزرگوں کی زبانی بھی حضرت مولانا کا ذکر خیر سننے کا ملتا تھا، تو دل میں عقیدت کا پیدا ہونا، اور رفتہ رفتہ کماً وکیفاً مضبوط اور راسخ

ہونا فطری عمل تھا، اس غائبانہ عقیدت نے شرف زیارت وملاقات کا داعیہ بھی پیدا کیا، لیکن اس زمانے میں، جب رابطوں کے جدید ذرائع ابھی وجود میں بھی نہیں آئے تھے، سفری سہولیات عنقا تھیں، مجھ جیسے راستوں سے نابلد، معدوم الوسائل طالبعلم کے لئے ہنگو، شاہووام جیسے دور دراز غیر معروف علاقے تک پہنچنا عملاً ناممکنات میں سے تھا بالخصوص جبکہ حضرت مولانا سے براہ راست تعارف بھی نہیں تھا اور خاندان کے بزرگوں سے اجازت لینے یا اطلاع دیئے بغیر گھر سے نکلنے اور گھومنے پھرنے کو ابھی تک اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ صورت حال طویل عرصے پر محیط رہی، لیکن اس عرصہ طویل میں مولانا کا ذکر خیر بار بار سننے سے عقیدت بڑھ گئی، اور شوق ملاقات دل ہی دل میں انگڑائی لیتا رہا، میری خوشی کی انتہا نہ رہی، جب ایک دن برادرم مولانا امداد اللہ صاحب نے مژدہ سنایا، کہ سالانہ چھٹیوں میں مولانا امین اورکزئی صاحب کی ملاقات کے لئے ہنگو شاہووام جائیں گے، اب تو حالت اس شعر کی مصداق ہوگئی:

وعدہ وصل چوں شود نزدیک
آتش عشق تیز تر گردد

آخر کار وہ فرصہ ذہبیہ (سنہری موقع) آپہنچا، شدید گرم موسم میں دن بھر کے مسلسل سفر کے بعد بوقت عصر ہم جامعہ یوسفیہ شاہووام ہنگو کے صحن میں حضرت مولانا کے سامنے چار پائیوں پر بیٹھے شرف زیارت حاصل کر رہے تھے، مولانا کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس میں پہلے بھی کوئی تردد نہیں تھا، اس لئے کہ بیان کرنے والے، اہل صدق ووفا تھے، اصحاب علم وفضل تھے، اور کہنے والا کہہ گیا ہے کہ "انما یعرف ذاالفضل من الناس ذووہ" تاہم شخصیت کا ابتدائی مشاہدہ مزید اطمینان قلبی کا باعث بنا۔ سنت کے مطابق لباس، سر پر سفید عمامہ، ہنس مکھ نورانی چہرہ، عالمانہ تمکنت ووقار، فاضلانہ گفتگو، مربیانہ شفقت، فیاضانہ مہمان نوازی اور قدر دانی کے جذبات کے پیکر مجسم کے سامنے ہم دو مہمانوں سمیت تمام شرکاء مجلس کی حالت کچھ یوں تھی، "کان علی رؤوسھم الطیر" برادرم مولانا امداد اللہ صاحب سے فرداً فرداً تمام احباب جامعہ اور افراد خاندان کے احوال پوچھے، اپنے علاقے کے چند روایات ورسم رواج کا تذکرہ فرمایا، شگفتہ انداز میں مزاح فرماتے رہے، بے آب وگیاہ پہاڑی علاقے میں اپنے قائم کردہ جامعہ یوسفیہ کے احوال بتائے، درسگاہوں کا مشاہدہ کرایا، بعد نماز مغرب مٹی کے بنے وسیع کمرے میں قیمتی ونادر دینی کتابوں پر مشتمل لائبریری کا تفصیلی معاینہ کرایا، شرح معانی الاثار پر "نثر الازھار" کے نام سے اپنی شرح کے حوالے سے گفتگو فرمائی، گھر اور مدرسہ کے درمیان اس چھوٹی مسجد میں نماز عصر، مغرب، عشا اور اگلے دن فجر کی نمازیں باجماعت ادا کیں، جس کے دروازے پر چند سال بعد مولانا نے شہادت کی موت کو گلے لگانا تھا۔

عزم وتوکل کا پیکر مجسم:

اس پہلی زیارت میں ان کی شخصیت کے جس پہلو نے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کا عزم وتوکل تھا، جس کا ادراک و احساس اس شخص کو ہوسکتا ہے، جو قدرے پس منظر سے واقفیت رکھتا ہو، ایک ماحول یہ ملاحظہ فرمایئے: حضرت مولانا کا علمی مقام، اپنے وقت کے اساطین علم، جن کے سرخیل حضرت بنوریؒ تھے، سے تلمذ وعقیدت کا تعلق، اسی تعلق کے نتیجے میں کراچی جیسے شہر میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، جیسے عظیم علمی مرکز میں نمایاں حیثیت سے انتظامی وتدریسی خدمات کی انجام دہی، ملک اور بیرون ملک شاگردوں کی ایسی کھیپ، جن میں سے اکثر اپنے اپنے وقت پر مرجع خلائق بنے۔ دوسرا ماحول یہ ہے: بے آب وگیاہ، زندگی کے وسائل وسہولیات سے محروم ایسا علاقہ، جہاں تک پہنچنے کے لئے مناسب راستہ ہے، نہ بجلی کی سہولت موجود ہے، پانی صرف اتنا کہ پینے کے لئے کافی ہو، ذرائع معاش ناپید ہیں۔ دو باتیں البتہ موجود ہیں، ایک آبائی علاقہ، جس سے محبت وعقیدت کو ایمانی تقاضا قرار دیا گیا ہے، دوسرا وہاں کے باشندے علما، اہل علم اور مدارس ومساجد سے ایمان کی حد تک عقیدت رکھنے والے اور دیندار، پہلے والے ماحول کو چھوڑ کر دوسرے والے ماحول میں منتقل ہونا، وہاں علمی مرکز قائم کرنا اور اس کو بام عروج پر لے جانا عزم صمیم اور توکل جیسی عظیم دولت سے مالا مال ہوئے بغیر ممکن نہیں، سو مولانا نے یہ کر ڈالا اور صاحب عزیمت اور متوکل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء:

مولانا سے دوسری مرتبہ شرف ملاقات حاصل کرنے کے احوال بھی عجیب ہیں، کئی سالوں بعد جس سے مشرف ہوا، مدرسہ عربیہ ملیر، شاخ جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی میں میری تدریس کا پہلا سال تھا، رجب المرجب میں تعلیمی سال کے اختتام پر استاذ محترم مفتی محمد ولی درویشؒ کی معیت اور نگرانی میں وفاق المدارس کے سالانہ امتحان میں مظہر العلوم مینگورہ سوات میں ڈیوٹی لگی، اس زمانے میں مدرسے کے ایک نوآموز مدرس کے لئے اس طرح کی امتحانی ڈیوٹی اعزاز اور خوشی کا باعث ہوا کرتی تھی، خوشی اس لئے بھی تھی کہ مولانا فضل محمد سواتی، سابق استاذ الحدیث وناظم تعلیمات جامعہ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کی زیارت وملاقات کی سعادت حاصل ہو جائے گی، دعائیں لینے کا موقع مل جائے گا، مینگورہ، سوات پہنچ کر جب پتہ چلا کہ مولانا بیمار ہیں اور گھر میں مشکل سے ملاقات کی اجازت ملتی ہے تو بڑی مایوسی ہوئی، لیکن اس دن خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اختتام امتحان سے ایک دن قبل مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی آمد کی پر مسرت خبر سنی، خوشی دوبالا ہوگئی، انہی کی معیت میں بعد از نماز عشاء مولانا

فضل محمد صاحبؒ کے آستانہ پر حاضری نصیب ہوئی، اور شرف ملاقات حاصل ہوا، راقم کو مفتی محمد ولی درویشؒ سے براہ راست شرف تلمذ حاصل تھا، مفتی ولی صاحب کو مولانا امین اورکزئیؒ سے اور مولانا امین اورکزئی صاحب کو مولانا فضل محمد سواتی صاحب سے میرے لئے یہی کیا کم تھا کہ شاگردانہ حیثیت میں مفتی ولی صاحبؒ کے رعب و دبدبے کے سامنے ساکت وساکن بیٹھا رہوں، اوپر سے اس بابرکت نشست کا مشاہدہ کہ مفتی ولی صاحب اور مولانا امین اورکزئی صاحب دونوں اپنے استاذ کے سامنے انتہائی ادب واحترام سے بچھے جارہے ہیں، مولانا امین صاحب البتہ گفتگو فرمارہے تھے، یاد پڑرہا ہے کہ اسلامی ریاست کے خدوخال، فی زمانہ حائل مشکلات، رائج الوقت سیاست کی خامیوں اور علما کی ذمہ داریوں کی نشاندہی فرمارہے تھے اور ایک موقع پر انتہائی جلال میں بھی آئے۔

جامعیت کی حامل شخصیت:

اس نشست میں مولانا کی شخصیت کا یہ پہلو عیاں ہوا کہ وہ اپنے اکابر کی طرح جامعیت رکھتے تھے، ان کی سوچ مسجد ومدرسے کے احاطے تک محدود نہ تھی، جیسا کہ علما پر عامیانہ سا اعتراض ہے، وہ سمجھتے تھے کہ اسلام میں احکام کی روح ایک عادلانہ نظام حکومت کے قیام میں مضمر ہے، جس کے لئے مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہے، جو وحی کے علوم پر دسترس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہے، بہرحال! جمہوری سیاست کے علمبرداروں کو ان سے بعض جزئیات میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ یہ میدان ہی اختلاف کا ہے، لیکن ان کے دل کے اندر چھپے درد اور امت کی غمگساری کی جذبات کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، اپنی علمی وعملی کم مائیگی وبے بضاعتی کے باوجود علما صلحا کی نشست میں شرکت میری زندگی کے پرسرور لمحات میں سے ایک ہے، جو میرے لئے سرمایہ افتخار ہے، جس نے حسب ذیل شعر کے حقیقی معنی سمجھادیئے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حدیث نبوی کی یاد دلانے والی ایک ملاقات:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آپ خود حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم جبل احد پر کھڑے تھے اور احد پہاڑ ہلنے لگا، مخاطب کرکے فرمایا" اثبت أحد فإنما عليك نبي، و صديق، وشهيدان"(صحیح البخاری، رقم: ۳۶۷۵) ٹھہر جا، اے احد! تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں) یہ حدیث شریف جب بھی نظر سے گزرتی ہے، تو آخری لفظ" وشھیدان" کی مناسبت سے ایک

ملاقات کی یاد ذہن میں تازہ ہوجاتی ہے ،۲۰۰۱ء کے اواخر میں ایک دن بوقت صبح جناب مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی معیت وقیادت میں راقم ، برادرم جناب مولانا امداد اللہ صاحب وجناب مفتی ابرار احمد صاحب اسلام آباد سے ''ٹل کوہاٹ'' کے لئے روانہ ہوئے ، جہاں مفتی صاحب نے جامعہ کے ایک فاضل کی دستار بندی کی تقریب میں شرکت کرنی تھی ،کوہاٹ سے آگے بڑھے تو تجویز آئی کہ اگر مولانا امین اورکزئی صاحب گھر پر موجود ہوں تو پہلے ان کی زیارت کی جائے ، مجھے یاد ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے نہ صرف یہ کہ فوراً حامی بھر لی بلکہ دلچسپی ظاہر فرمائی ، ہماری خوشی دیدنی تھی ، زندگی میں دوسری مرتبہ حاضری کا موقعہ نصیب ہورہا تھا ، اور وہ بھی اکابر کی معیت میں ، حضرت مفتی صاحب عمر میں چھوٹے تھے ، لیکن مولانا امین صاحب اپنے ہاں ان کی آمد پر اتنے مسرور نظر آرہے تھے کہ نورانی چہرے پر خوشی کے آثار ہویدا تھے ، حضرت مفتی صاحب احترام وعقیدت کا پیکر مجسم بنے ہوئے تھے ، تو مولانا محمد امین اورکزئی صاحب تواضع وانکساری کے ساتھ اکرام ضیف کی سنت پر عمل پیرا نظر آرہے تھے ، منع کرنے کے باوجود اپنے علاقے کی روایت کے مطابق پر تکلف کھانے کا اہتمام فرمایا تھا ، خود دسترخوان پر نہیں بیٹھے ، بلکہ ایک ایک فرد اور مہمان کے پاس جا کر اکرام کرتے رہے ، میں تو اس وقت شرم سے پانی پانی ہوگیا ، جب میرے پاس تشریف لا کر بیٹھ گئے ، کھانے کا بار بار فرماتے رہے ، اور احوال پوچھتے رہے ، کسے معلوم تھا ، کہ اس مختصری مجلس میں رونق افروز دونوں بزرگ ، جن کے دیدار اور صحبت سے ہم مستفید ہورہے تھے ، ہم سے اس طرح جدا ہوں گے کہ عمر بھر کے لئے حدیث نبوی کے آخری لفظ "۔۔۔وشہیدان" کے تناظر میں یاد آتے رہیں گے ، دونوں شخصیات نے اپنے اپنے اجل موعود پر قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں کی گونج میں جام شہادت نوش فرمایا ۔ (من المؤمنین رجال صدقوا ماعاهدوا اللہ علیه ، فمنهم من قضی نحبه) (الاحزاب: ۲۳) ایمان والوں میں سے ایسے آدمی بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا پھر ان میں سے بعض تو اپنا کام پورا کر چکے) کے مصداق بننے والوں کے دیوان میں اپنا نام رقم کرایا ۔ فرحمه اللہ رحمة واسعة ۔

نعمت غیر مترقبہ:

چوتھی ملاقات تو میرے لئے بالکل ایک نعمت غیر مترقبہ تھی ، کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ہماری قسمت میں آنکلی ، ہوا یوں کہ صندل باباجی رحمہ اللہ ، اسلام آباد تشریف لائے تھے ، بروز جمعہ میں نے ان کو اپنے ہاں جامع مسجد ابوبکر صدیق آئی ، ایٹ ، فوراً اسلام آباد میں قدم رنجہ فرمانے کی درخواست کی ، جو قبول ہوئی ، بزرگوں ، علماء وصلحاء سے تعلق ، ان کی زیارت وملاقات کے لئے جانا ، ان کو اپنے ہاں دعوت دینا اور ان کے علم وعمل اور صحبتوں سے استفادہ کرنا ان

عظیم سعادتوں اور خوش بختیوں میں سے ہے، جن کی نصوص میں ترغیب دی گئی ہے اور امت کے اکابر جو ہمارے لئے مقتدیٰ و پیشوا ہیں، کا اس پر تعامل بھی رہا ہے، اپنے وقت کے بزرگ عالم دین، جن سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کی بیعت وارشاد کا تعلق قائم تھا، کی تشریف آوری ہمارے لئے سعادت تھی ہی کہ ایک اور سعادت سے بہرہ ور ہوئے، یہ اطلاع ملی کہ مولانا محمد امین اورکزئی صاحب بھی باباجی کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں، یہ خواب میرے اور پورے خاندان کے لئے حقیقت بن گیا، دونوں بزرگ اپنے شاگردوں اور معتقدین سمیت تشریف لائے ہمیں سعادت بخشی، سینکڑوں لوگوں نے ان کی زیارت کی، استفادہ کیا، دعائیں لیں، مولانا امین صاحب رحمہ اللہ البتہ چھپنے کی کوشش کرتے رہے اور جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور ہمیں اس سے واقفیت تھی، پردہ خمول میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن کتنا چھپتے، علما وصلحا والی ان کی ہیئت ولباس، چہرے کی نورانیت اور اخلاق وکردار کی خوشبو ان کو کہاں چھپنے دیتے تھے، میں نے درخواست کی کہ جمعہ کی نماز پڑھائیں، تاکہ عوام الناس سمیت ہم سب کو استفادہ کا موقع اور اقتدا کی سعادت ملے، حسب توقع مسکرا کر فرمایا، آپ خود پڑھائیں، برادرم عطاء الرحمن صاحب شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ بنوری ٹاؤن میں طلبہ کو وعظ ونصیحت کرنے کی درخواست کی تھی، انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا ، بدلہ لوں گا، آپ میرے مزاج سے واقف نہیں؟! یہ بات میرے ذہن میں تھی، لیکن درخواست کرنا میرا فرض تھا، سو کردی۔ تاہم مجھے وہ جواب نہیں دیا جو اپنے براہ راست شاگرد کو دیا تھا، اس لئے کہ استاذ شاگرد کا تعلق تھا، شاگرد کے دل میں استاذ کے لئے عقیدت واحترام کے جذبات موجزن تھے، تو استاذ کا دل شفقت ومحبت کے جذبات سے لبریز تھا اور ایسے میں عتاب کا مزہ اور لطف آتا ہے، شاعر نے کہا ہے:

اذاذهب العتاب فليس ود

ويبقى الود مابقى العتاب

اسی لئے شاگرد نے برا نہیں منایا، بلکہ اپنے لئے باعث فخر سمجھا، اس لئے تو بیان کیا کرتے تھے، اس لئے کہ وہ اس حقیقت کے معترف تھے کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن جیسی عظیم درسگاہ کی نظامت تعلیمات کا منصب اور اساتذہ کے مسند پر تدریس حدیث کی خدمت وسعادت ان اساتذہ کرام کی عنایتوں اور نظر کرم کی مرہون منت ہیں، جن میں مولانا کا نام نمایاں ہے، بہرحال! خواہی نخواہی میں نے منبر پر بیٹھنے کی جرأت کی، آپ مسجد کے دائیں جانب صف کے بالکل آخر میں تشریف فرما ہوئے، سر پر رومال دیا، مجھ جیسا فن تقریر وخطابت سے ناواقف، علم سے تہی دست عوام الناس کے سامنے تو گزارا چلا لیتا ہے، لیکن اپنے وقت کے ایک عالم ربانی کے سامنے لب کشائی سخت اور کڑے امتحان وآزمائش سے کم نہیں تھی، سو تقریر تو کردی، لیکن سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہا؟ کیسے کہا؟ میری تو یہ حالت ہو

رہی تھی، لیکن آپ بے نفسی، تواضع اور انکساری کے پیکر بنے عوام الناس کی طرح تقریر سماعت فرماتے رہے، کسی بھی موقع پر اور کسی بھی طریقے سے علمی برتری نہ جتلانا، آپ کی شخصیت کا وہ نمایاں پہلو تھا جس نے آپ کو محبوبیت بخشی تھی۔ اپنی موجودگی میں تقریر اور نماز جمعہ کی امامت کروا کر اعتماد کی دولت سے مالا مال کیا اور ہم جیسے اصاغر کے دینی مشاغل کو سند صحت و جواز عطا فرمایا، اس ملاقات میں آپ کی زندگی کے ایک اور پہلو کا بھی مشاہدہ ہوا، صندل باباجی کی زیارت کرنے اور دعائیں لینے کے لئے کثیر تعداد میں علما وطلبا اور لوگ موجود تھے، سر پر رومال ڈالتے ہوئے پورے مجمع سے یکسو ہو کر دیوار کی طرف رخ کیا، اور "دلائل الخیرات" کا حزب پڑھ لیا، یعنی معمولات میں ناغہ نہ آنے دیا، جو حدیث نبوی کی رو سے کسی بھی عمل کے مفید ہونے کے لئے ضروری ہے، اور دین میں پسندیدہ طریقہ ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کان أحب العمل إلی رسول صلی اللہ علیه وسلم مادیم علیه" (سنن الترمذی، رقم: ۲۸۵۶) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہوتا تھا، جس پر مداومت اختیار کی جاتی تھی)

چند خطوط بنام مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ:

مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق خاندانی تھا، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، برادرم مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ اور برادرم مولانا امداد اللہ صاحب دونوں ان کے خصوصی تلامذہ میں شامل تھے، تلمذ کے اس خصوصی تعلق کی بنیاد پر آپ ہمارے خاندان کے اکابر اور بڑوں سے عقیدت واحترام کا رشتہ رکھتے تھے، تو خاندان کے تمام اصاغر بشمول راقم، جن میں سے اکثر نے مولانا کی زیارت بھی نہیں کی، مولانا سے عقیدت واحترام رکھتے ہیں، بچپن سے اس باہمی عقیدت واحترام کے جذبوں کا مشاہدہ خاندانی ماحول میں اور مجالس میں ہوتا رہا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نانا جان (باباجی رحمہ اللہ) کی وفات کے بعد کسی اہم معاملے پر مشاورت کے دوران ماموں جان رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر مسئلہ نمٹا دیا کہ مولانا امین صاحب نے یہ رائے دی ہے اسی کے مطابق میرا فیصلہ ہے، مولانا کے نام آنے سے سب کو بڑی خوشی ہوئی، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

در سخن مخفی شدم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا

کسی کا کلام اور تحریر اس کی شخصیت کی درست اور صحیح آئینہ دار ہوتی ہے، برادرم مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ کے نام مولانا کے خطوط کے بارے میں عزیزم مولوی مسیح الرحمن و فصیح الرحمن نے اطلاع دی، تو تعجب آمیز سرور سے مالا مال ہوا، خوشی تو اس پر ہوئی کہ یہ خطوط اس خاندانی عقیدت واحترام پر مبنی تعلق کی شہادت کے ساتھ ساتھ اس تعلق

کی درست ترجمانی کریں گے، تعجب اس پر ہوا کہ برادرم عطاالرحمن شہیدؒ نے ان خطوط کو حرز جان بنا کر محفوظ تو کیا تھا، لیکن کبھی ان سے اس کا تذکرہ نہیں سنا تھا کہ ذاتی تشہیر اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے کوسوں دور تھے، خطوط کا مطالعہ کیا، جو مرسل اور مرسَل الیہ کے خصوصی وقلبی تعلق پر شاہد صادق کی حیثیت کے حامل تو ہوتے ہی ہیں، متعدد جزئی باتوں اور حقائق کی بھی گواہی دیتے ہیں، بالخصوص جب ایک عظیم المرتبت استاذ اپنے تلمیذ رشید کی طرف مراسلوں کا آغاز حسب ذیل شفقت ومحبت بھرے دعائیہ الفاظ سے کرتے ہوں:

☆ گرامی قدر برادرم جناب عطاء الرحمن صاحب حفظکم اللہ تعالیٰ

☆ برادرم عزیزم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب زیدت معالیھم

☆ برادرم عزیزم محترم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب زیدت الطافھم

☆ برادرم مکرم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب زیدت محاسنھم

☆ برادرم محترم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب زیدت مکارکم

☆ بخدمت گرامی برادر مکرم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب زیدت مکارکم

☆ برادرم عزیز جناب مولوی عطاء الرحمن صاحب اکرمہ اللہ تعالیٰ بعطاء غیر مجذوذ برحمتہ الواسعۃ

☆ برادرم محترم مولوی عطاء الرحمن صاحب اکرمہ اللہ تعالیٰ بالمنح والعطایا

اخلاص قلب اور سچی محبت ومؤدت پر مبنی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک استاد کے قلم وزبان سے نکلی ہوئی یہ دعائیں قبول ہوئیں اور یہ شاگرد ان تمام الطاف ربانی، معالی، محاسن ومکارم، عطایا ومنح سے نوازے گئے، اپنے شاگردوں کے لئے تو اعزاز واکرام پر مشتمل القاب ودعاؤں کا تحریر کرنا تو بڑا پن ہے ہی، متعدد خطوط میں اپنے لئے کس قدر متواضعانہ الفاظ استعمال کیے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

☆ از فقیر محمد امین عفااللہ عنہ

☆ خویدمکم الفقیر محمد امین عفااللہ عنہ

☆ آپ کا ناچیز خادم، خویدمکم محمد امین عفااللہ تعالیٰ عنہ

☆ من العبد المذنب المھین محمد امین عفااللہ تعالیٰ عنہ

گویا متذکرہ الفاظ میں اپنے لئے اس حیثیت ومقام کے حصول کی خواہش کا اظہار فرما رہے ہیں، جس کے مانگنے کی تعلیم لسان نبوت نے حسب ذیل ماثور دعاؤں میں دی ہے:

''واجعلني في عيني صغيراً'' (مسند البزار، رقم: ۴۴۳۹) نیز: ''اللھم أحيني مسكيناو أمتني مسكيناو احشرني

فی زمرة المساکین۔" (سنن الترمذی رقم: ۲۳۵۲)

بہر حال! ان خطوط سے جہاں مولانا اور برادرم عطاء الرحمن شہیدؒ کے درمیان تعلق کا پتہ چلتا ہے، وہاں مولانا کی زندگی کے کئی گوشوں اور اوصاف واحوال سے پردہ اُٹھتا ہے، ہمارے خاندان کے بزرگوں بالخصوص باباجی رحمہ اللہ سے کس قدر عقیدت تھی؟! تحریر فرماتے ہیں:

☆" حضرت باباجی صاحب کی عافیت کی خبر پا کر قلبی مسرت ہوئی، حق تعالی ان بزرگوں کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ یاد رہے، تو خط یا وکتا با فقیر کے لئے دعوات خیر کی درخواست ان کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔

☆ (مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے) دادجان کا نورانی چہرہ اور حضرت والد صاحب کی شرافت، چچاجان کی محبت کے نقوش دل پر کندہ ہیں۔

☆ حضرت باباجی صاحب دامت برکاتہم اور قبلہ والد صاحب کی خدمت میں خط لکھتے ہوئے اس ناکارہ کا سلام اور دعا کی درخواست ضرور تحریر فرمایا کریں، ملنے کی شدت سے پیاس ہے مگر دست و پابستہ ہوں۔"

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے علمی ماحول کے کس قدر دلدادہ تھے؟! اور اپنے رفقا و علما اور اپنے تلامذہ سے کس قدر محبت ان کے دل میں رچی بسی تھی؟! اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اکثر خطوط میں نام بنام سلام لکھا ہے، ایک مراسلہ میں رقمطراز ہیں:

"دعوات صالحہ میں یاد فرمانے کی درخواست ہے، امید ہے سابقہ تعلق دعا گوئی کے لئے شفیع ثابت ہوگا، تمام احباب جناب قاری اسداللہ صاحب، قاری عبیداللہ شاہ صاحب مواخوانہ اور برادرم حاجی امداداللہ صاحب اور دوسرے تمام مخلص رفقاء کی خدمت میں سلام نیاز عرض ہے، حضرت مولانا ادریس صاحب اور حضرت شاہ صاحب، حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا محمد صاحب، حضرت مولانا رضاء الحق صاحب اور رفیق مکرم حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب اور دوسرے اساتذہ کرام سے اگر ممکن ہو سلام عرض فرمائیں۔"

ایک اور مراسلہ میں اپنے اساتذہ، رفقاء اور تلامذہ سے سچی محبت و مودت کا اظہار یوں فرمایا ہے:

"کاش ان بزرگوں سے ایک مرتبہ پھر ملاقات نصیب ہوتی، بہر حال فقیر کا سلام نیاز ضرور عرض کرتے رہیں، اور دعوات خیر کی درخواست بھی، اس دنیا میں وصال واجتماع کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا، خداوند تعالی کرے کہ قیامت میں ان صلحا کی دائمی صحبت نصیب ہو، قاری اسداللہ صاحب، قاری عبیداللہ صاحب، قاری کفایت اللہ صاحب، حاجی امداداللہ صاحب، اور دوسرے احباب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے، حضرت مولانا رضاء الحق صاحب کی خدمت میں خصوصی سلام پہنچائیے۔ برادرم حافظ انوارالاسلام کی خدمت سلام پہنچا کر

ممنون فرمائیں، اب تو واقعی حضرت بن گئے نا۔''

یاد رہے کہ حافظ انوار الاسلام مرحوم کے مخصوص مزاج کی بنا پر اساتذہ اور رفقا ان سے مزاح فرماتے تھے، وہ بھی تلک بتلک جواب دے کر حساب برابر کر لیتے تھے، آخری جملے میں لطیف پیرائے میں یہی انداز اپنایا ہے۔

بہر حال! یہ خطوط تین حوالوں سے انتہائی متاثر کن ہیں:

☆ خوش نویسی

☆ اردو انشا پردازی

☆ اعلیٰ معانی ومضامین

خوش نویسی دیکھنے کے لئے ہاتھ کی تحریر کا مشاہدہ ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا اگر خصوصی نمبر میں مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کی تصویر بھی شامل کی گئی ہو، البتہ آخری دو امور کے لئے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

خطوط تاخیر سے ملنے کے حوالے سے مولانا عطاء الرحمن کے نام لکھتے ہیں:

''بعد عرض اینکہ! جناب کا ایک والا نامہ چند دن پہلے ملا تھا، جبکہ دوسرا والا نامہ جس پر ۹ ربیع الاول کی تاریخ درج تھی، آج ایک ماہ بیس دن بعد موصول ہوا۔ دراصل فقیر کے نام مراسلت سابقہ پتہ پر ہی ہو رہی ہے۔ جناب انوار الاسلام صاحب کے انوار و برکات ہیں کہ وہاں سابقہ پتہ کی افواہیں پھیلا چکے ہیں۔۔۔۔ بہر حال معذرت خواہ ہوں کہ آپ حضرات کی کرم نوازی کی قدر دانی نہیں کر پاتا، عوارض وقواسر کے ازدحام کو قابل قبول عذر تصور فرما کر معاف فرمائیں گے''۔

حوادثات زمانہ کے متعلق ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''چند روز پیشتر کچھ حوادث پیش آئے تھے، مگر یہ دنیا انہی تغیرات وانقلابات کے مجموعہ کا نام ہے۔ عسر و یسر، قبض وبسط، نعمت ونقمت کے متوازی سلاسل ہیں، جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، عبد مؤمن کامل الایمان کی حقیقت اس لئے صبار شکور، کا مرکب ہے''۔

مدرسہ میں انتظامی امور اور تدریسی خدمات دینے سر انجام دینے نیز کامیاب مدرس بننے کے حوالے سے کس طرح اپنے شاگردوں کی رہنمائی فرماتے تھے؟! ملاحظہ فرمائیے:

''مدرسہ کے انتظامی امور سنبھالنا بھی عبادت ہے، لیکن تعلیم وتعلم کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے، شرم سے کام نہ لیں، ایسی کتابیں درس کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، جن سے علمی استعداد میں اضافہ ہوتا ہو، ہو سکے تو امسال اصول الشاشی، مختصر القدوری اور شرح ابن عقیل وشرح تہذیب لیں۔ منطق ونحو کی کتابیں خاص طور پر مفید ہوتی ہیں۔ مختصر المعانی۔۔۔۔ بھی بہت نافع کتاب ہے۔''

فقہ کا ذوق کس طرح پیدا ہوا؟ فرماتے ہیں:

''فارغ اوقات میں بالاستیعاب ایک ایک علمی کتاب کا مطالعہ کرتے رہیں۔ فقہ میں بدائع الصنائع کا بامعان مطالعہ ہو جائے پھر مبسوط کا تو اچھا ذوق پیدا ہوتا ہے۔''

مطالعہ کا طریقہ بتلاتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک کاپی اپنے پاس ہو کہ نادر قسم کی تحقیق یا غیر مظان میں آیا ہوا مسئلہ اس میں نوٹ کر لیا جائے، یہ مواقع پھر میسر نہیں ہوتے ہیں اور نہ صحت وطاقت ہمیشہ رہتی ہے۔''

فارسی اور پشتو ادب سے بھی شغف تھا بلکہ مثنوی مولانا روم کی تدریس کو تو علما وطلبا کے لئے گویا لازم سمجھتے تھے، ایک مراسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''عصر کے بعد بڑے شوق سے مثنوی کا درس شروع کیا تھا، بمشکل پندرہ سبق ہو چکے ہوں گے۔''

پشتو ادب سے تو شغف کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے لگائیے:

''عارف باللہ عبدالرحمن بابا کا دیوان قریب پڑا تھا، خط لکھنے کا ارادہ کیا تو چاہا کہ تبرکاً اس مبارک دیوان میں سے ایک آدھ شعر جناب کے ذوق کے مطابق درج کروں، کتاب کھولتے ہی دائیں صفحہ پر یہ اشعار ملے مع اختصار نقل کیے جاتے ہیں:

ترخودی په هو رته بله بلا نشته
خاد می د بیخودانو په دلبار کزه
دا پېزه ورزی ژوندون چه غنیمت دی
شکر انه په دا نعمت د کردگار کزه
که غمخوار غواڑے په غم وپه اندوه کیی
شیشه ذکه د شرابو اختیار کزه
سو دی دوه ستر گے غزیگی په جهان کیی
ننداره په هر ساعت د خپل نگار کزه
هغه سوک دی چه تهمت پری وایه نشی
غوگ په هیچا باندے مه باسه خپل کار کزه
مدعی چه په خوله ورشی هغه وانی
گوش وهوش د محبانو په گفتار کزه

بے وفا دی د دی دهر یاران وازه
چه دی پس له مرگه یار شی هغه یار کزه
رحمان وائی دا دنیا جاری فانی ده
البته په ناخبرو اعتبار کزه"

گویا اپنے شاگردوں کے علمی ادبی ذوق سے باخبر رہتے تھے، اور خطوط میں اس کی رعایت رکھتے تھے۔
شاگردوں وتلامذہ کے احوال، بالخصوص تعلیمی احوال سے باخبر رہنا، تعلیمی ترقی پر خوشی وحوصلہ افزائی کا اظہار کرنا اور پیچھے رہ جانے پر ڈھارس بندھانا، ایسی عادات استاذ کے انتہائی اخلاص اور طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھنے پر شہادت صادقہ ہیں، مولانا امین صاحبؒ ان اوصاف سے کس قدر متصف تھے؟ مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں :

''برادرم امداداللہ صاحب کے خط سے خیر وعافیت کا علم ہوا، خدا کرے کہ دوام حاصل ہو، نتیجہ کا علم ہوا، آپ کے امتیازی نمبر حاصل نہ کرنے پر رنج ہوا، دعا ہے کہ سبب تساہل نہ ہو، برادرم محب اللہ صاحب ونعیم اشرف صاحب ومحمد اشرف ومحمد الیاس کو مبارکباد عرض کیجئے اور درجہ کے تمام مخلص ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض فرمائیں۔''

دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے پر خوشی ہوئی، کافی مسافت طے ہوچکی ہے تھوڑی سی باقی ہے، ہمت سے کام لیں پورے ذوق وشوق کے ساتھ منزل مقصود پر نظر رکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھیں، خزائن المنن کو لوٹنے کے لئے قناطر المحن کو پار کرنا ہی پڑتا ہے بقول کسے: خدا تعالیٰ جل جہد کے اس پار ملے "والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا" اور جو اس جہد ومحنت میں احسان کا رنگ بھرتا ہے، تو اس کے ساتھ تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں، "وان الله لمع المحسنین" اس محروم کے لئے بھی دعا کریں کہ اس طرف بھی التفات کرم ہوجائے''

پس ماندہ علاقے میں اپنے قائم کردہ جامعہ یوسفیہ کے حوالے سے احسان مندی، عجز وانکساری اور صبر وشکر کے جذبات پر مشتمل یہ اقتباس حرز جان بنانے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

''جامعہ یوسفیہ اپنے عہد طفولیت میں بحمداللہ تعالی ومنه وکرمه من غیر حول منا وفوقع توقع سے بڑھ کر روبترقی ہے، جتنا ڈر تھا، شاید ہمارے ضعف ایمان کی وجہ سے اتنا شدید امتحان نہیں رہا، قدم قدم پر رحمت حق کی طرف سے حوصلہ افزائی ہورہی ہے۔''

مدرسہ کے بارے میں ایک اور مراسلہ میں ارقام فرماتے ہیں:

''ہمارا کام الحمدللہ جاری ہے، روز وشب الحمدللہ ثم الحمدللہ انتہائی سکون کے ساتھ گزر رہے ہیں، حضرت اقدسؒ (حضرت بنوریؒ) کی خدمت میں گزرے ہوئے ایام کے علاوہ گذشتہ زندگی کا بقیہ حصہ کاش پہلے ہی سے ادھر گزرتا، عربی کے طلبہ تو وہی ہیں، صرف دو تین نئے آئے ہیں، نئے سال کے لئے تو نئے احباب نے آنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، حفظ میں دس بچے پڑھ رہے ہیں، ہمارے پاس موجودہ دو کمروں میں اب مزید گنجائش نہیں رہی، آج سے نئے کمرے تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں، حق تعالیٰ کی نصرت وتوفیق کا طالب ہوں، دعاؤں سے نوازا کریں۔''

حسن التعاھد من الایمان:

بخاری شریف میں حدیث کے ان الفاظ کو ترجمہ الباب بنایا ہے، یعنی تعلق نبھانا ایمانی تقاضا ہے، مولانا خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے اس ایمانی تقاضے پر بالخصوص اپنے اساتذہ کی حد تک کس قدر عمل پیرا تھے؟ ملاحظہ فرمائیں:

''مصروفیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ دو مہینے سے زیادہ عرصہ ہوا حضرت مولانا فضل محمد صاحب زید مجدہم کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ دل ہی دل میں انگڑائیاں لیتا رہا، آج جب اسباق موقوف ہو چکے ہیں یہ ارادہ جامہ عمل پہن سکا۔''

''احباب کے خطوط جو صرف کراچی تک محدود نہیں ہیں، اتنی کثرت سے آتے ہیں کہ اب تو جواب دینے کا مضبوط عزم بھی متزلزل ہو گیا، حالانکہ یہ انتہائی بے مروتی ہے، مگر مضطر کے لئے کیا کچھ جائز نہیں۔''

نیز اپنے شاگردوں کو کس قدر خوبصورت انداز میں ہی حسن التعاہد (تعلق نبھانا) کی ترغیب دیا کرتے تھے، حسب ذیل اقتباسات حسن طلب کی بھی اعلیٰ مثال ہیں، لکھتے ہیں:

''تعلیمی سال قریب الاختتام ہے شاید تعطیلات میں شرف ملاقات کا موقع دیں گے۔''

''کمزور سی امید تو تھی کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ملاقات نصیب ہوگی، مگر پوری نہ ہوئی، رمضان شریف پھر عید الفطر کے موقع پر تو قوی امید تھی، غالباً قوی اعذار مانع ہوں گے، امید ہے اپنی خیریت وعافیت کی اطلاع سے کبھی کبھی مسرت واطمینان کا موقع دیتے رہیں گے۔''

''میرے عزیز! آپ حضرات کے تو شاید ذہن کے کسی گوشہ میں بھی اس ناکارہ کا تصور نہیں رہتا ہو، لیکن آپ حضرات کی مخلصانہ اور برادرانہ اداؤں کی تصویریں لوح قلب پر ایسے نقش ہیں، جو تا زیست تو کیا، رب نے چاہا بعد از مرگ بھی نظروں سے غائب نہیں ہو سکیں گی۔''

''خطوط لکھنے میں دیر ہوتی مگر سبب، یقین مانیے، تغافل نہیں ہے، بلکہ انتہائی مصروفیت ہے، کافی دنوں سے

شدید خواہش تھی کہ چند سطور لکھوں مگر فرصت میرے لئے عنقا ہو چکی ہے۔“

اس مضمون پر مشتمل ایک مختصر مگر جامع خط کو یہاں مکمل نقل کرنا بے جانہ ہوگا تحریر فرماتے ہیں:

”برادرم مکرم جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب، زیدت مکارمکم!

السلام علیکم!

بارہا کراچی آنے کا عزم کیا، مگر فاسخ العزائم نے توڑنے کی کوئی صورت ظاہر فرمادی، ملاقات احباب کے لئے بے تاب ہوں، اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری حاصل کرنے کی تڑپ ہے اور حضرت اقدس نوراللہ مرقدہم (حضرت بنوریؒ) کے مرقد انور سے سکون حاصل کرنے کی تمنا، اب تو اسباق بھی بڑھ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے کوئی مناسب صورت پیدا فرمائے، برادرم مولانا محمد ولی صاحب و برادرم مولانا امداداللہ صاحب اور دوسرے احباب سے سلام عرض فرمائیں، سب سے دعاؤں کی درخواست ہے۔

والسلام۔خویدمکم: محمد امین عفااللہ عنہ“

شاگردوں پر اعتماد:

حزب البحر کی طباعت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تمہیدی کلمات کے حوالے سے ارقام فرماتے ہیں:

”حزب البحر کی اچھی طباعت پر دلی خوشی ہوئی۔۔۔فقیر نے تمہید اجوالتی سیدھی خامہ فرسائی کی ہے اگر آپ کے نزدیک تعریب بہتر ہو تو از خود زحمت فرمالیں۔۔۔نیز آپ خود ایک بار پھر نسخہ پر نظر فرمالیں تاکہ حد امکان غلطی نہ رہے۔“

برادرم عطاء الرحمن شہیدؒ کو بھی اپنے استاذ کے اس اعتماد کا ادراک واحساس تھا، جس کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے تھے، گو اس کا کبھی از خود اظہار نہیں کیا، البتہ ایک مرتبہ جب دلائل الخیرات کے ورد کرنے اور پڑھنے کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو میرے استفسار پر فرمایا: ”میں باقاعدگی سے پڑھتا تو نہیں تاہم پڑھاتا ہوں، اس لئے کہ مولانا امین صاحب بنوری ٹاؤن کے طلبا کو اجازت دیتے وقت یہ شرط لگاتے ہیں کہ مجھ (عطاء الرحمن رحمہ اللہ) سے سبقاً پڑھ کر اعراب کی تصحیح کروالیں پھر پڑھنے کی اجازت ہے، اس لئے جو طلبا میرے پاس آتے ہیں میں ان کو پڑھاتا ہوں۔“

نماز باجماعت کا اہتمام:

دوران سفر باجماعت نماز چھوٹ جانے پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”بعد از سلام معروض اینکہ بندہ بخیریت گھر پہنچا، سفر بہرحال سفر ہی ہوتا ہے، تکلیف سے خالی نہیں رہتا، تاہم اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان تھا کہ زیادہ تکلیف پیش نہیں آئی، رات بھر ریکارڈنگ اور بغیر جماعت کے نمازوں کی ادائیگی کا صدمہ رہا، حق تعالیٰ معاف فرمادے، بغیر ساتھی کے سفر میں جماعت کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔“

رضا بالقضاء اور شکر نعمت:

تقدیر الٰہی پر راضی وخوش رہنا اور نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا نیک بندوں کا شیوہ رہا ہے، یہ وہ نعمت الٰہی ہے، جس کے لئے نبی رحمت نے دعا مانگنے کے الفاظ وطریقہ تک تعلیم فرمایا ہے، ادعیہ ماثورہ میں سے ہے: "و أسألک الرضاء بالقضاء" (سنن النسائی، رقم: ۱۳۰۶) نیز: اللھم انی اسألک الأمن و الایمان و الصبر و الشکر و الغنی و العفاف۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۹۱۹۵) اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس نعمت سے نوازا تھا، فرماتے ہیں:

> ''نومولود کے لئے پیغام تبریک کا شکریہ، دعا کیجئے کہ دنیا اور آخرت میں پریشانی کا سبب نہ بنے حقیقت یہ ہے کہ اپنے افتاد طبع کی وجہ سے آپ جیسے روحانی نسبت رکھنے والے عزیزوں کی موجودگی میں اپنے کو لا ولد نہیں سمجھا تھا، پھر بھی حق تعالیٰ کا احسان ہے، جس پر شکر واجب ہے۔''

مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے خصوصی تعلق:

مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے خصوصی تعلق تھا، خطوط میں اس کا اظہار فرمایا ہے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مدت مدید کے بعد جناب کا مکتوب پڑھ کر محظوظ ہوا، یاد فرمائی کے لئے منت پذیر ہوں اور صدیق محترم (حبیب اللہ مختار صاحب) کے فرزند ارجمند کی خوشخبری دینے پر تہ دل سے شکر گزار، حق تعالیٰ آپ کو اس مسرت بخش خبر پہنچانے پر دائمی مسرتوں سے نوازے آمین، رفیق مکرم جناب مولانا محمد ولی صاحب نے بھی خوشخبری دی تھی۔۔۔ بہرحال اللہ تعالیٰ آپ سب حضرات کو اجر جزیل سے نوازے کہ اس فقیر کے ملول اور حزین قلب کو سرور اور فرحت کا سامان مہیا کرنے کی سعی مبرور فرما چکے۔''

ایک اور مراسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب زید مجدہم تو اپنے بے پناہ اخلاص کی وجہ سے ایسے دھن کے پکے ہیں کہ کسی کی سنتے نہیں ہیں، اس ناچیز کے ساتھ اڈہ تک تشریف لے جا کر پھر بس کی روانگی تک انتظار فرماتے رہے ،بس میں بیٹھے ہوئے کچھ دوست ان کی مروت ومحبت سے بہت متاثر ہوئے اور مجھے ان کی اس ذرہ نوازی پر شرم آتی ہے، مگر عالی حوصلہ لوگ ہیں، اللہ نے انہیں زبردست حوصلہ اور بہت وسیع ظرف عنایت فرمایا ہے، وہ اپنے آپ کو شاید اپنی فطرت اور جبلت سے مجبور پاتے ہیں۔''

ان خطوط کی روشنی میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر کے سطور میں مولانا کی زندگی کے بعض پہلوؤں اور گوشوں کی طرف اشارہ کیا گیا، جو تصویر سامنے آتی ہے، اس کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے، کہ حضرت کو اللہ نے حسن صورت اور حسن سیرت سے نوازا تھا، وہ ایک عالم باعمل، کامیاب مدرس ومربی تھے، جنہوں نے اپنے علمی شمع سے کئی چراغ روشن کئے، اپنے روحانی فیض کو عام کیا، قافلہ حق کے عظیم سپوت تھے، جو اکابر کے نقش قدم پر

زندگی گزارنے کے خواہاں تھے، اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہے، بجا طور پر ان کو نمونہ اسلاف کہا جا سکتا ہے، ان کا نام ہمیشہ کے لئے علماء حق کی فہرست میں نمایاں حیثیت سے شامل رہے گا، ختامہ مسک کے طور پر تبرکا مولانا کے ایک خط کے مکمل متن کے ساتھ ان گزارشات کو ختم کرتا ہوں۔

''از فقیر محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادرم عزیز جناب مولانا عطاء الرحمن صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

مکتوب گرامی مع التحائف مل گیا، ملا پھر للے کا ملا، جزاک اللہ تعالیٰ خیرا ہی کہہ سکتا ہے، یاد فرمائی دل کی گہرائیوں سے منت پذیری کا اظہار کرتا ہوں اور دعا ہے کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کو دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور سرفرازیوں سے نوازے اور آپ جیسے ارباب اخلاص احباب کے طفیل اس سیاہ کار کو بھی توفیق مرضیات بخشے، آمین، کمزوری امید تو تھی کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ملاقات نصیب ہوئی مگر پوری نہ ہوئی، رمضان شریف پھر عید الفطر کے موقع پر تو قوی امید تھی، قوی اعذار مانع ہو گئے، امید ہے، اپنی خیریت وعافیت کی اطلاع سے کبھی کبھی مسرت واطمینان کا موقع دیتے رہیں گے، والسلام علیکم''

ھذا وصلی اللہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

ایک مرد آہن

مولانا سعید اللہ شاہ، پشاور

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ بنوری ٹاؤن کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مدرسے میں ایک استاذ کی حیثیت سے رہ چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جب بندہ نے ۱۹۸۱ء اگست موافق شوال ۱۴۰۱ھ میں درجہ اولیٰ میں داخلہ لیا تو اس وقت حضرت مولانا شہیدؒ بنوری ٹاؤن سے آکر اپنے علاقے شاہووام ہنگو میں طلبہ دین کو اپنی امانت پہنچانے میں مصروف ومشغول تھے۔ لیکن کثرت سے طلبہ ساتھیوں اور اساتذۂ کرام سے حضرت شہیدؒ کے بارے میں سنتا تھا۔ میں چونکہ جہانگیرہ سے گیا ہوا ایک دیہاتی آدمی تھا۔ مدرسے سے پہلی والی زندگی میں زیادہ تر علماء سے واقفیت نہیں تھی۔ اس لئے سوچتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کیسی ہوگی۔ حضرت شہیدؒ کے بعض خدام طلبہ کو بسااوقات ان کا تذکرہ کرتے ہوئے دیکھتا کہ ان کے آنکھوں میں آنسو آتے تھے۔

حضرت شہیدؒ کی پہلی زیارت:

جامعہ بنوریہ کے تدریس کے زمانے میں جب میرا تعلق میرے مشفق ومہربان شیخ ومربی حضرت مفتی مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم سے ہوا تو اکثر اپنے شیخ ومرشد سے بعض مجالس میں کسی موضوع کے ضمن میں حضرت شہیدؒ کا تذکرہ سنتا۔ اس سے اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی طرح حضرت شہیدؒ کی زیارت ہوجائے۔ چنانچہ ایک بار کربوغہ شریف میں اصلاحی اجتماع کے موقع پر زیارت ہو ہی گئی۔ اس کے بعد تو کئی دفعہ حضرت شہیدؒ کے ہاں ان کے مدرسہ شاہووام میں جانا بھی ہوا۔ باوجود یہ کہ بندہ نے باقاعدہ حضرت سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں کیا لیکن حضرت بڑی شفقت فرماتے تھے، کئی دفعہ امداد العلوم پشاور صدر بھی تشریف لائے، وہاں بھی ملاقات ہوتی رہی، ہر ملاقات میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت سے ایک دیرینہ تعلق ہے، حضرت شہیدؒ ہنس مکھ چہرے سے ملتے اور ہر دفعہ بڑی شفقت فرماتے۔

علمی مقام:

حضرت شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے اونچے درجے کے علمی مقام سے نوازا تھا۔ کسی چیز پر قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلاف کے قافلے سے کوئی فرد پیچھے رہ گیا ہے۔ چنانچہ امام طحاویؒ کی مشہور کتاب ''شرح معانی الآثار'' کی شرح ''نثر الازہار'' کے نام سے اس بات کا بین ثبوت ہے۔ حضرت شہیدؒ نے اس وقیع شرح کے دو سیٹ دو مجلدات میں بندہ کے پاس بھیجے تھے۔ جو ایجاز واختصار کے باوجود مدلل انداز میں لکھی گئی ہے۔ اسانید کے رجال پر مختصر لیکن ضروری بحث کے ساتھ مافی الباب کی ایسی تلخیص کی گئی ہے۔ جو اس سے قبل کی گئی تلخیصات سے بالکل ہی ممتاز نوعیت رکھتی ہے اور کتابتی اغلاط کی تصحیح کے علاوہ دوسرے کئی فوائد پر مشتمل ہے۔

تواضع وعاجزی:

کسی میں علم اور تواضع دونوں صفات جمع ہوں تو واقعی بڑی بات ہوتی ہے۔ حضرت مولانا شہیدؒ کے اندر تواضع اور انکساری حد درجے کی پائی جاتی تھی۔ لوگوں میں پہچانے نہیں جاتے تھے کہ یہ بڑے پائے کے عالم ہیں۔ جب کبھی کربوغہ شریف میں اجتماع ہوتا تھا تو ایک بار نہیں بلکہ اکثر بار آپؒ بھی اس اجتماع میں یا پھر رمضان مبارک کے آخری عشرہ کا جب اعتکاف ہوتا تو آپ تشریف لاتے تو مجمعے میں یوں گھل مل کر بیٹھ جاتے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں ہیں؟ ہمارے شیخ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو جب ان کا پتہ چلتا کہ تشریف لائے ہیں تو پوچھتے کہ استاذ صاحب کہاں ہیں؟ وہ آگے تشریف لے آئیں۔ لیکن حضرت شہیدؒ سر جھکائے اور چادر سر پر لٹکائے یوں بیٹھے رہتے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مولانا کہاں ہیں؟ الا یہ کہ جو شخص ان کے قریب ہوتا اور وہ جانتا بھی ہوتا تو ان کے ذریعے سے پتہ چلتا تھا۔

رعب وہیبت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ رعب عطا فرمایا تھا کہ جو ایک مہینے کی مسافت سے دشمن کے اوپر پڑتا تو دشمن ہیبت زدہ ہو جاتا۔ اس کی ایک جھلک اس امت کے بعض افراد میں بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ حضرت شہیدؒ کا گاؤں ہنگو بازار کے قریب ہی کچھ فاصلے پر ہے۔ جب آپ مدرسے سے یا گھر سے بازار کی طرف نکل کر تشریف لاتے تو آپؒ کا رعب رافضیوں پر بھی پڑتا اور جو سنی مسلمان اپنی دکانوں میں گانا بجانے اور سننے میں مشغول ہوتے تو فوراً اپنی ٹیپ ریکارڈ کی آواز کو مولاناؒ کے خوف سے بند کر دیتے۔

ایک یادگار سفر:

یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب افغانستان میں امارت اسلامیہ طالبان کی حکومت قائم ہوگئی اور دینی مدارس کے

طلبہ کی ایک جماعت طالبان نے کابل پر قبضہ کرلیا تھا۔ مسلمان خوش ہو رہے تھے اور دشمن کو یہ بات نہ بھاتی تھی تو وہ ہر حربہ استعمال کرتے تھے کہ کسی طرح افغانستان کی حکومت ان دین دوست اور اسلام پسند طبقے کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے؟ ان دنوں طالبان کابل کی شمال میں دشمن سے نبرد آزما تھے اور وہ ان درویش صفت انسانوں کے راستے میں ہر قسم کے روڑے اٹکاتے تھے۔ اسی سلسلے میں مختلف قسم کے مشوروں کے لئے مختلف اطراف سے وقت کے جید علماء کرام کابل جاتے اور طالبان کو مفید مشورے دیتے۔ اس زمانے میں بندہ امداد العلوم الاسلامیہ جامع مسجد درویش میں پڑھاتا تھا اور رات کو مدرسے ہی میں رہتا تھا اور ہفتہ میں ایک دفعہ یعنی جمعہ کی رات کو گاؤں جہانگیرہ جانا ہوتا تھا۔ انہی دنوں ایک دفعہ عصر کے وقت حضرت شہیدؒ ہنگو سے دو شاگردوں (خادموں) کے ساتھ مدرسہ تشریف لائے اور فرمایا: کہ میرا تو کابل جانے کا ارادہ ہے میرا خیال یہ ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو میں نے عرض کیا: ٹھیک ہے، حضرت میں بھی ساتھ چلوں گا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں رات مدرسے ہی میں ٹھہرنے کے بعد صبح کو روانہ ہوگئے۔ اس زمانے میں پشاور سے ہائی ایس (فلائنگ کوچ) سیدھے کابل کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی کا انتخاب کیا اور ہم سب اسی میں بیٹھ گئے۔ سفر چونکہ لمبا تھا تو حضرت شہیدؒ کے ڈرائیور کے ساتھ متصل دو سیٹوں کا انتخاب کیا گیا۔

ایثار اور دوسروں کو آرام پہنچانا:

آگے والی دو سیٹوں میں ایک پر حضرت بیٹھ گئے اور ساتھ ہی بندہ بیٹھ گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ ان دو سیٹوں میں جو سیٹ شیشے اور دروازے کی طرف ہوتی ہے وہ آرام دہ ہوتی ہے اور جو ڈرائیور کی طرف ہوتی ہے اس میں دوران سفر مشقت زیادہ ہوتی ہے چنانچہ میں پہلے چڑھ گیا تاکہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں اور حضرت دوسری سیٹ پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ تو حضرتؒ نے فرمایا: کہ آپ نیچے اتر آئیں، پہلے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ جائیں لیکن حضرت نے فرمایا کہ اس سیٹ پر اترنا چڑھنا زیادہ ہوتا ہے اس لئے آپ جوان آدمی ہیں آپ اسی پر مناسب ہیں۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کسی صورت میں ماننے والے نہیں تو بادل نخواستہ اس سیٹ پر بیٹھ گیا۔

درویشی میں سخاوت وفیاضی:

راستے میں کھانے کے لئے جب گاڑی رکی تو جلال آباد سے آگے ایک جگہ دریائے کابل کے کنارے ہم نے کھانا کھالیا۔ جب بندہ نے ہوٹل والے کو رقم دینے کا ارادہ کیا تو حضرت نے اپنے خدام کو اشارہ کیا چنانچہ مجھے سختی

سے روکا اور کھانے کی رقم خود ادا کی۔

کابل کا آریانہ ہوٹل:

کابل پہنچ کر رہائش کا انتخاب طالبان کی طرف سے آریانہ ہوٹل میں ہوا۔ ہوٹل میں ہر چیز یورپی ممالک سے لا کر جوڑی ہوئی تھی حتیٰ کہ آئینے تک پر بیلجیم لکھا ہوا بندہ نے دیکھا اور اسی طرح دوسری اشیاء۔ بندہ ہوٹل کو دیکھتا رہ گیا اور سوچوں میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں کہ اس ہوٹل پر مختلف قسم کے ادوار گزرے ہوں گے۔ کس قسم کے لوگ یہاں پر آئے ہوں گے اور آج تاریخ نے یہ دن بھی دیکھ لیا کہ آج کل یہی پر تکلف ہوٹل مدارس کے اندر زمین پر بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے والے بوریہ نشین فقیروں کا مسکن بنا ہوا ہے۔

کراچی کے مقتدر علماء کرام کے وفد سے ملاقات:

اللہ تعالیٰ کا کرنا عجیب ہوتا ہے کہ اسی دن کراچی سے بھی علما کی جماعت آئی ہوئی تھی، ان کو پتہ چلا کہ حضرت مولانا محمد امین صاحب بھی تشریف لائے ہیں تو حضرت شہیدؒ سے ملنے کے لئے آئے۔ بندہ نے دیکھا تو ہمارے مادر علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے اساتذہ کرام تھے۔ جن میں حضرت مولانا محمد انور بدخشانی، حضرت مولانا عبد السمیع، حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی، حضرت مولانا مفتی جمیل خان صاحبؒ اور حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ تھے۔ عجیب بات یہ کہ اس پوری جماعت میں سوائے حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب کے سارے مرتبۂ شہادت کو گلے لگا چکے ہیں، ان میں اول الذکر دو حضرات میرے استاذ ہیں۔ حضرت مفتی محمد جمیل خان صاحبؒ شہید نے بھی درجہ اولی میں چند دن ہمیں پڑھایا ہے۔ ان حضرات سے ملنے کے بعد ہم آرام کرنے کے لئے ہوٹل آ گئے۔ حضرت شامزئی شہیدؒ نے حضرت مولانا شہیدؒ سے فرمایا کہ آپ ناشتہ کل صبح ہمارے ساتھ کریں گے جس کو حضرتؒ نے قبول فرمایا۔

دوسروں کی راحت پر اپنی راحت کو قربان کرنا:

انسان کا نفس راحت و آرام کا خوگر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں آرام سے رہوں چاہے لوگ تکلیف میں ہوں۔ اور دوسروں کی راحت کو اپنے آرام و راحت پر ترجیح دینا واقعی مکارم اخلاق میں سے ہے۔ حضرت شہیدؒ میں یہ چیز میں نے تقریباً ہر موقع پر محسوس کی۔ رات کے آرام کے لئے جس کمرے کا انتخاب کیا گیا تھا اس میں دو پلنگ تھے ایک ڈبل بیڈ تھا اور سنگل بیڈ تھا، کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ تم اس چوڑی چارپائی پر سو جاؤ، بندہ نے بہت اصرار کیا کہ نہیں! آپ اس پر سو جائیں، لیکن وہ کسی صورت میں ماننے والے نہیں تھے۔ چنانچہ الامر فوق الادب کے تحت

وہ ہوا جو حضرت شہیدؒ چاہتے تھے۔

صبح کا ناشتہ حضرت شامزئی شہیدؒ کے ہاں:

حسب وعدہ حضرت شہیدؒ حضرت شامزئی شہیدؒ کے ہاں ناشتہ کے لئے چلے گئے، ان کی طرف سے راہنمائی کے لئے ایک ساتھی آیا ہوا تھا۔ ناشتہ میں چونکہ ہمارے ہاں کالی چائے (دودھ پتی چائے) کی مرکزی حیثیت ہوتی ہے، لیکن کئی ہوٹلوں میں دیکھنے کے بعد دودھ والی چائے نہیں مل رہی تھی۔ چائے کے لئے دوڑ دھوپ اور ساری خدمت حضرت مفتی جمیل خان شہیدؒ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ سے ابلے ہوئے انڈے اٹھائے، دوسری جگہ سے پنیر، ایک جگہ سے روٹی اور رس وغیرہ مختلف قسم کی چیزیں اٹھا کر لے آئے، البتہ کالی چائے کہیں نہیں ملی۔ ان سے کسی نے کہا کہ پورے کابل میں دودھ والی چائے نہیں ملے گی، البتہ سبز قہوہ ہر ہوٹل میں مل سکتا ہے۔ تو بامر مجبوری سارے حضرات ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے اور ہوٹل والے کو قہوہ بنانے کو کہا۔ چائے بنانے والے بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ اور رنگ وروغن کچھ اور طرح تھا۔ تو استاذ محترم بدخشانی دامت برکاتہم نے فرمایا کہ ''اس لال بیز (سرخ بندر) کو دیکھو اس کو جانتے ہو یہ یہاں کا ہزارہ شیعہ میں سے ہے''۔

طالبان کے ایک وزیر سے ملاقات:

ناشتہ سے فارغ ہو کر طے شدہ پروگرام کے مطابق سارے حضرات طالبان کے ایک وزیر سے ملاقات اور ان کو کچھ مشورے دینے کے لئے ان کے ہاں گئے۔ بندہ بھی ان حضرات کی معیت میں وہاں گیا۔ غالباً اس وزیر کا نام ملا حمد اللہ یا ملا احمد اللہ تھا۔ کافی دیر گفتگو میں شامزئی شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ نے کچھ مفید مشورے دیئے، اگرچہ ان کی طرف سے ان مشوروں کی خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی، کیونکہ ان کا ایک جواب تھا کہ اب تک جو فتوحات ہم نے کی ہیں تو وہ بغیر کسی تجربے اور گر اختیار کرنے کے ہوئیں اور سادگی سے ہوئیں آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ بہر حال یہ ان کی اپنی ایک بات تھی اور یہ کہاں تک درست تھی واللہ تعالیٰ أعلم۔ کیونکہ امور حرب میں تجربہ مشاہدہ اور عقل سے کام لینا انتہائی ضروری ہوتا ہے اور یہ چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک اور حضرات صحابہؓ کی زندگی سے ثابت ہیں، البتہ انہوں نے مہمانوں کی بڑی خاطر تواضع کی یہاں تک کہ کھانے میں پاکستانی آم وہاں کابل میں انہوں نے کھلائے۔

کابل سے واپسی:

وہاں سے فارغ ہو کر حضرت شہیدؒ اور بندہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ جب گاڑی میں بیٹھ گئے تو جنگ کی وجہ سے

غربت کے مارے ہوئے بچے اور عورتیں گاڑی کے ارد گرد جمع ہو گئے کچھ مانگنے کے لئے۔ بندہ کے پاس جو افغانی روپے رہ گئے تھے، وہ ان کو دینے لگا تو مزید بھاگے ہوئے آئے۔ تو حضرت شہیدؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ ابھی اور زیادہ آئیں گے اور تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ راستے میں کنڈیکٹر جب کرایہ وصول کر رہا تھا تو ایک بابے نے کرائے میں ایک ہزار کا نوٹ کم دیا تو کنڈیکٹر نے کہا کہ یہ کرایہ کس کا ہے یہ تو کم ہے۔ تو بابے نے جواب دیا'' سہ اوشو یوزر گون چکے کم دے'' کیا ہوا ایک ہزار کا نوٹ ہی تو کم ہے۔ بندہ نے سنا تو تصور میں گھوم گیا۔ کہ پاکستان میں ایک ہزار پر لوگ کٹ مرتے ہیں اور یہاں ایک ہزار کی کوئی حیثیت نہیں، کیونکہ حالت جنگ کی وجہ سے افغانستان کی کرنسی بہت گر گئی تھی۔ حتی کہ اس وقت ایک پاکستانی روپیہ بمقابلہ بارہ سو (۱۲۰۰) افغانی ہوتا ہے۔ جب تورخم بارڈر کو ہم عبور کر گئے اور پاکستان کی طرف آ گئے تو دو دن کابل کی امارات اسلامیہ میں رہنے کی وجہ سے یہاں کا معاشرہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر طرف دکانوں سے گانوں کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھی اور عورتوں کی آویزاں تصاویر دکانوں اور سڑکوں پر دیکھی تو دل سے ایک آہ نکلی کہ کاش! اس پورے خطے میں اسلامی نظام نافذ ہو اور دین کا بول بالا ہو۔ (آمین)

وفات:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ جو اپنوں کے لئے ریشم کی طرح نرم اور اغیار اور طاغوت کے لئے مرد آہن تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

ایسی شخصیت کو دشمنان اسلام کہاں برداشت کرتے تھے کیونکہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو بے حیائی، بے غیرتی اور فحاشی و عریانی کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہوتے ہیں۔ اس لئے امریکی سامراج اور طاغوت نے ہماری نا سمجھ حکومت کے ہاتھوں ان کی مسجد و مدرسہ پر بغیر کسی وجہ کے بمباری کرتے ہوئے انہیں شہید کیا لیکن شاباش عوام کے غیور مسلمانوں نے اسی وقت دوبارہ نئی تعمیر شروع کر دی۔ اللہ تعالی حضرت شہیدؒ کی شہادت قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں مراتب عالیہ سے نوازے۔ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب کو ان کے نقش وقدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور دوسری اولاد و اقربا کو اپنی محبت اور دنیا و آخرت کی خوشیاں نصیب فرمائے۔ آمین

اٹھا سائبان شفقت

مولانا عزیز الرحمن مروت، ٹانک

انسانیت کی ہدایت وراہ یابی کے لئے اللہ تعالی نے ہر دور میں رجال اللہ یعنی اپنے خاص بندوں کا جو سلسلہ چلایا ہے، انہی کے دم سے یہ کائنات آباد ہے، انسانیت انہی سے معرفت رب کی راہ پاتی ہے اور کفر و باطل ہمیشہ انہی سے پسپا ہوتا ہے۔ استادگرامی حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ بھی ''رجال اللہ'' کے اسی قافلے کے فرد فرید تھے۔ آپ کا علم انتہائی گہرا تھا، عمل کی دولت سے مالا مال تھے، فکر ونظر کی وسعت مثالی تھی، مخلوق خدا کے لئے خیر خواہی کا جذبہ منفرد تھا اور تمام روحانی صفات خلوص، للّٰہیت، خشیت، تواضع وانکساری، زہد وفقر، توجہ الی اللہ، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی عملی تصویر تھے۔ حضرت کی صحبت میں بیتے ہوئے دن میرا عظیم سرمایہ ہے اور حضرت کی خدمت اور عنایات و توجہات میں اپنے لئے ذخیرہ آخرت سمجھتا ہوں۔

میرا داخلہ اور حضرت کی اصول پسندی

بندہ زمانہ طالب علمی میں سیاسی دلچسپیاں رکھتا تھا، یہ بات تو حضرت کے تمام تلامذہ کو معلوم ہے کہ حضرت طلباء کے لئے سیاست کو زہر قاتل سمجھتے تھے اور طلبہ میں یہ کوتاہی ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے۔ حضرت استاد صاحب میرے والد مولانا فتح خان رحمہ اللہ اور مجھ سے واقف تھے۔ یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے، میں درجہ رابعہ میں حضرت کے ہاں پڑھنے کے لئے حاضر ہوا۔ ارادہ یہی لے کر آیا تھا کہ ہر قسم کے سیاسی مشاغل سے کنارہ کش ہو کر پڑھنا ہے۔ اس لئے استاد صاحب کی صحبت اور جامعہ یوسفیہ کا انتخاب کیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ یہاں طلبا حضرت کے مزاج کے خلاف پر بھی نہیں مار سکتے۔ میں شوال کے آغاز میں حاضر ہوا اور استاد صاحب سے داخلہ کی درخواست کی۔ آپ نے حسب توقع معذرت فرما دی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! یہاں پڑھنا انتہائی مشکل کام ہے، یہاں اسباق اور

مطالعہ وتکرار کی پابندیاں ہیں، سہولیات زندگی ناپید ہیں، مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، آپ موجودہ مزاج کے ساتھ یہاں وقت نہیں گزار سکیں گے، بجائے اس کے کہ آپ کا سال ضائع ہو آپ ابھی کہیں اور تشریف لے جائیں، مدارس میں داخلے جاری ہیں، درمیان سال میں جائیں گے تو کہیں داخلہ ملنا بھی مشکل ہوگا۔ میں نے ہر چند تسلی دی اور باور کرانے کی کوشش کی کہ حضرت میں اپنا مزاج مدرسہ سے باہر چھوڑ کر محض پڑھنے آیا ہوں، لیکن آپ نہ مانے۔

میں سات دن تک بغیر داخلے کے بطور مہمان مدرسہ میں فروکش رہا، مدرسہ کے اساتذہ کے ساتھ کھاتا تھا اور مدرسہ کے مہمان خانے میں سوتا تھا۔ وہاں مروت کا اتنا غلبہ تھا کہ کسی نے مجھ سے معذرت تو کرنی نہیں تھی کہ میاں! کیوں مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو جب داخلہ نہیں مل رہا تو چلے جاؤ۔

جب طلبہ کا داخلہ مکمل ہوا اور اسباق شروع ہو گئے، تو میں نے بھی درجہ رابعہ کی درسگاہ میں بیٹھنا شروع کردیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا یہ سارا عمل غیر قانونی ہے اور مجھے شرعاً واخلاقاً درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں، تاہم میں پر امید تھا کہ میں نے جامعہ یوسفیہ میں رہنا ہے۔ عصر کے بعد میں نے استاد صاحب سے صاف الفاظ میں عرض کیا کہ حضرت! اگر داخلہ دینا ہے تو فبہا، ورنہ میرا یہ فیصلہ ہے کہ میں یہی رہوں گا، آپ زبردستی مجھے درسگاہ یا دسترخوان سے تو اٹھا نہیں سکتے۔ اگر بطور طالب علم میں قبول نہیں تو بطور مہمان سہی۔ میں نے یہ سال ہر حال میں یہاں گزارنا ہے۔ استاد صاحب میرے عزم کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور فرمایا کہ ٹھیک ہے، اگر تم مدرسہ کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنے کے لئے تیار ہو اور سیاست سے دست بردار ہوتے ہو، تو آپ کو داخلہ مل سکتا ہے۔ میری آرزو برآئی اور بالآخر مجھے داخلہ مل گیا۔ اس سال میں نے حضرت استاد صاحب سے مسلم الثبوت کا کچھ حصہ، قصیدہ بدء الامالی اور شرح النقایہ پڑھنے کی سعادت حاصل کی، بقیہ اسباق دیگر اساتذہ کے پاس تھے۔

جامعہ یوسفیہ: مرکز مجاہدہ وریاضت

جامعہ یوسفیہ ہنگو شہر سے کافی دور ایک جنگل نما علاقے (وام) میں واقع ہے۔ اس وقت قریب میں چند کچی آبادیاں تھیں اور باقی پہاڑوں کے دامن تک جنگل اور درخت ہی درخت تھے۔ یہاں اساتذہ کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ کسی کی تنخواہ مقرر نہ تھی بلکہ سب متبرعین تھے۔ پانی بجلی کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا، مستقل ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی میسر نہ تھی، مدرسہ محض توکل پر چلتا تھا، نہ چندہ کے لئے کوئی رسید بک تھی اور نہ ہی کوئی سفیر مقرر تھا، ایک چھوٹی سی مسجد اور چند رہائشی کمرے کل تعمیری سرمایہ تھا، جن کمروں میں طلبہ سوتے تھے وہیں درسگاہیں تھیں۔ طلبہ اور اساتذہ کا کھانا حضرت استاذ کے گھر پکتا تھا۔

اسباق شروع ہوئے تو گرمی کا زمانہ تھا۔ دن کو شدید گرمی اور رات کو مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کی ضیافت۔ میں نے اپنے لئے ایک ہاتھ کا پنکھا خریدا تھا اور چونکہ پہلی بار اتنے مجاہدے کا سامنا تھا اس لئے دن بھر جھلتا رہتا تھا، لیکن بحمد اللہ میرے عزم میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ روز بروز اطمینان بڑھتا رہا۔

طلبہ پر حضرت الاستاد کی صحبت کی برکت سے فقر وفاقہ برداشت کرنے کا غلبہ تھا، کسی قسم کی شکایت زبان پر لانے کی جرأت ہی نہیں تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے پاس کپڑے دھونے کے صابن خریدنے کے پیسے نہ ہوتے تھے۔ ایک دفعہ مدرسہ کے قریب میرا ہم عمر لڑکا عطاء اللہ نامی فوت ہوا، اس کے گھر والے اس کے استعمال شدہ کپڑے مدرسہ میں وقف کرنے کے لئے لائے تو میں نے کالے رنگ کا ایک ٹیٹرس اپنے لئے پسند کیا کیونکہ اس کو کئی ہفتہ بلا دھوئے پہننا ممکن تھا اور دھونے کے لئے تو صابن نہیں ہوتا تھا اس لئے یہ کپڑے ڈیڑھ دو مہینے آرام سے پہنے رکھتا تھا۔ ایک دفعہ میرے جوتے ٹوٹ گئے، بنوانے کے لئے کچھ پاس نہ تھا اس لئے بغیر جوتوں کے گھومنا پھرنا شروع کیا۔ استاد صاحب سے حقیقت حال مخفی رکھنے کے لئے میں پاؤں پر نیلی روشنائی لگا لیتا، جو ہمارے ہاں زخموں اور پاؤں کے پھوڑوں پر دیسی علاج کے طور پر لگائی جاتی ہے، دیکھنے والے کو محسوس ہوتا کہ میرے پاؤں زخمی ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جوتے کے پیسے پاس نہ تھے۔ پتھریلی اور کانٹے دار زمین پر اس طرح چلنا بھی خطرناک تھا لیکن چلتے چلتے پاؤں خوب سخت ہو گئے تھے۔ استاد صاحب کی صحبت کا یہ سب سے معمولی اثر تھا کہ ہمیں ان چیزوں کی کبھی پروا ہی نہیں ہوتی تھی کہ جیب خالی ہیں اور سہولیات میسر نہیں، بس یہ نظریہ بن گیا تھا کہ دنیا کے گنے چنے چند دن ہیں جو کسی طرح رضائے الٰہی کی طلب میں کاٹ دینے ہیں۔

ہمارے دور میں بعض اوقات مدرسہ میں راشن ختم ہو جاتا اور ایک دو وقت کا فاقہ بھی ہو جاتا، استاد صاحب طلبہ کو جمع کر کے فرماتے کہ مرکزی دروازہ کھلا ہے اور روڈ پر گاڑیاں چلتی ہیں، جس نے جانا ہے خوشی سے چلا جائے، کیونکہ اب ہمارے پاس کچھ باقی نہیں لیکن مجال ہے کہ کوئی طالب علم آپ کو چھوڑ کر چلا جائے، بس ایک دو ہی وقت کے بعد اللہ تعالیٰ بندوبست فرما دیتے۔

اس محنت ومجاہدہ کے ساتھ پڑھنے کی جو برکت تھی وہ بالکل عیاں نظر آتی تھی۔ باہمی محبت، سکون واطمینان اور چین وراحت جو آج ہر طرح کی سہولیات میں ڈھونڈے نہیں ملتیں ہمیں مفت میں میسر تھیں۔ ان سارے امور کو بخوشی برداشت کرنے کے پیچھے طلبہ کے ساتھ حضرت کی حد درجہ محبت وشفقت کا بنیادی کردار تھا، آپ کا مشفقانہ رویہ ایسا اسیر بنا لیتا کہ نظریں دوسری طرف اٹھنا گوارا نہ ہوتی تھیں۔

صبح ناشتے میں ایک پیالہ چائے ملتی، ظہر سے قبل اور مغرب سے پہلے دو وقت کھانا ملتا۔ رات کو چارپائیوں پر

دیئے جلا کر مطالعہ کرتے، برسات کے موسم میں دیوں کے اردگرد پتنگوں اور کیڑوں کا انبوہ جمع ہوجاتا۔ ایک ہاتھ میں کتاب سنبھالنا اور ایک ہاتھ سے ان حشرات سے اپنا دفاع کرنا ہمارے گھنٹے دو کا وظیفہ ہوتا تھا۔ کبھی تیل میسر آجاتا تو جنریٹر چلا کر بلب کی روشنی میں مطالعہ کرتے، اس دن عید سا سماں ہوتا، اس پڑھنے میں جو مزہ اور برکت تھی اسے میں الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔ اس گرمی میں اکثر نو واردوں کو نیند نہ آتی لیکن میری نیند بڑی مشہور تھی، ایک دفعہ سو جاتا تو پسینے، مچھر اور کیڑے مکوڑے جگانے میں ناکام رہتے۔

مدرسے میں پینے کے صاف پانی کی سخت قلت تھی، ہم کافی دور سے ٹریکٹر یا پک اپ گاڑی میں بڑے ڈرم بھر کر لاتے تھے۔ کبھی اتنی قلت ہوجاتی کہ باقاعدہ حاضری رجسٹر پر طلبہ کو یومیہ چار گلاس پانی ملتا۔ ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ کبھی کبھار گاڑی موجود ہوتی لیکن اہل مدرسہ میں کوئی ڈرائیور نہ تھا، میں تھوڑی بہت ڈرائیونگ جانتا تھا اس لئے یہ خدمت میں نے سنبھال لی، میں نے زندگی بھر کبھی ٹریکٹر نہیں چلایا تھا، اسی خدمت کی برکت سے ٹریکٹر کا مشاق ڈرائیور بن گیا۔ مدرسہ کے قریب رہنے والے لوگ مدرسہ کے ساتھ بہت زیادہ تعاون کرتے تھے، جن کے پاس ٹریکٹر ہوتے، وہ کبھی کبھار مدرسہ کے کام کے لئے مدرسہ میں چھوڑ دیتے یوں ہمارا کام آسان ہوجاتا۔

مدرسہ میں کسی کام کے لئے ہمیں خادم یا مزدور کی ضرورت پیش نہ آتی، چھوٹے موٹے کام یعنی جنریٹر کا آئل تبدیل کرنا فلٹر تبدیل کرنا، مدرسہ کے واحد کنویں کی صفائی (جس میں پانی انتہائی کم اور محض وضو کے استعمال کے قابل تھا) بندہ کے ذمہ تھی۔ اسی دوران کچی مسجد کی توسیع کا کام شروع ہوا تو لوہے کا کام بندہ اور مولانا فیض الرحمان صاحب (حال صدر مدرس جامعہ یوسفیہ) نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ مستری کی نگرانی، چھتی کے بعد تعمیری کاموں میں معاونت، شٹرنگ، دیواروں کا پلاستر، اینٹیں ڈھونا، وائرنگ الغرض کوئی ایسا کام نہ تھا جو ہم طلبہ و اساتذہ مل کر نہ کرتے ہوں، استاد صاحب بھی ہمارے ساتھ ان کاموں میں شریک رہتے اور ہمارا حوصلہ بڑھاتے۔

حضرت الاستاد کی خدمت کا موقع

مدرسہ کے کاموں میں دلچسپی اور پڑھائی میں خوب دل جمعی نے مجھے استاد صاحب کی قربت نصیب کردی، اس میں میری خوشخطی بھی کام آئی۔ بندہ کو حضرت استاد نے تحریری کاموں کے نقل کے لئے اپنا معاون مقرر کرلیا، میں صاف خوشخط اور تیز لکھنے کا عادی تھا، استاد صاحب کی ہر تحریر نقل کرتا، اس طرح نقل محفوظ ہوجاتی۔ بعض اوقات استاد صاحب ضروری خطوط وغیرہ املا کروادیتے، یا رف دے کر صاف لکھوا لیتے تھے۔ بندہ کو درسگاہ میں حضرت الاستاد کی ساری تقریر شرح نقایہ لکھنے کی توفیق ملی، میں نے پوری کوشش کی کہ استاد صاحب کا فرمودہ ذرہ برابر بھی نہ چھوٹنے

پائے۔ان شاء اللہ شرح النقایہ کی یہ تقریر جو استاد کی فقہی مہارت کا شکار ہے اور فقہ الحدیث میں آپ کی عبقری شان پر دال ہے، جلد منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔

رات کو دار المطالعہ میں استاد صاحب کے لئے مطلوبہ کتابیں الماریوں سے نکالنا، متعلقہ صفحات نکالنا، حوالے جمع کرنا وغیرہ کام بھی کرنے کی توفیق ہو جاتی۔ مجھے ان کاموں سے کئی فائدے ہوئے۔ ایک تو حضرت الاستاد کی علمی تحریرات سے مناسبت ہوگئی اور ان کو سمجھنے میں آسانی ہونے لگی، کئی علمی مسائل میں حضرت کی نادر تحقیقات کا علم ہوا اور کتب خانہ کی اکثر کتابوں سے واقفیت ہوگئی، درجہ رابعہ ہی میں مختلف موضوعات پر بلند پایہ علمی وتحقیقی تصنیفات و ماخذ کا علم میرے لئے اعزاز تھا۔

استاد صاحب کے جنات شاگرد

دار المطالعہ میں استاد صاحب کی خدمت کے دوران معلوم ہوا کہ استاد صاحب کے شاگردوں میں صرف ہم ہی نہیں بلکہ جنات کی ایک کثیر تعداد بھی شامل ہے۔ اس کا میں نے کئی بار مشاہدہ کیا۔ میں استاد صاحب کے لئے ایک کتاب نکالتا اور مطالعہ کے لئے مکتب پر رکھ دیتا، اس دوران اچانک وہ کتاب وہاں سے غائب ہو جاتی۔ استاد صاحب آہستہ سے فرماتے: کتاب واپس کردیں اور کام کرنے دیں، یہ وقت تنگ کرنے کا نہیں۔ تو میں دیکھتا کہ کتاب اچانک اپنی جگہ واپس آجاتی۔ بعد میں استاد صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! کیا یہ جنات ہیں؟ آپ نے اس کی توثیق فرمائی کہ جی! یہ جنات ہیں، جو مختلف اسباق میں شریک رہتے ہیں اور علمی استفادہ کے لئے دار المطالعہ بھی آتے ہیں۔

مجھے جنات کے ساتھ قریب سے کام کرنے کا موقع بھی ملا، پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ استاد صاحب کے اردگرد ہوتے ہیں تو آپ کو اس کا علم ہوتا ہے اور آپ ان کی حرکات کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

ایک دفعہ بندہ کے مرشد حضرت سیدی سید مسرت حسین شاہ صاحب رحمہ اللہ (خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف سلیمانی رحمہ اللہ پشاور) جامعہ یوسفیہ تشریف لائے۔ عصر کا وقت تھا، حضرت استاد صاحب نے گھر جا کر بڑی عمدہ چائے بنوائی اور خود ہی اپنے دست مبارک سے لاکر پیش کی۔ حضرت مسرت شاہ صاحب کے ساتھ ان کا چھوٹا بیٹا معاذ بھی تھا۔ معاذ نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا: ابو! یہ کیسے لوگ ہیں، ہمارے سامنے خالی چائے رکھ دی، ہم تو مہمانوں کے لئے چائے کے ساتھ بسکٹ، کیک اور مٹھائی بھی رکھتے ہیں۔ استاد صاحب نے بچے کی یہ معصومانہ بات سنی تو مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھے اور گھر کی طرف چل دیئے اور تھوڑے ہی دیر میں زبردست، عمدہ اور نفیس مٹھائیاں

اور بسکٹ وغیرہ حاضر خدمت کیں۔ وہ مٹھائیاں اور بسکٹ اتنے نفیس تھے کہ عام بیکریوں اور پھر ہنگو جیسے پسماندہ شہر کی بیکریوں میں ملنا ممکن نہ تھے۔ بندہ کو دو باتوں پر سخت حیرت ہوئی، ایک تو یہ کہ استاد صاحب کی مہمان نوازی اور مہمانوں کا اکرام ہمارے روز وشب کا مشاہدہ تھا یہ تو ممکن نہ تھا کہ آپ کے گھر میں مٹھائی ہو اور آپ خالی چائے لا کر مہمان کے سامنے رکھ دیں یہ آپ کے مزاج اور عادت کے خلاف بات تھی۔ دوسرا یہ کہ میں مجلس کا مستقل حاضر باش خادم تھا، قریبی دنوں میں بیرون شہر سے متعلقین میں سے کوئی بھی تو نہیں آیا تھا پھر یہ تازہ مٹھائیاں کہاں سے آ گئیں۔ خیر! حضرت مسرت حسین شاہ صاحب رخصت ہوئے تو بندہ سے رہا نہ گیا اور حضرت سے پوچھ لیا، کہ جی! میرے شیخ تشریف لائے، آپ کے گھر میں مٹھائی اگر تھی تو چائے کے ساتھ کیوں پیش نہ فرمائی اور یہ تو آپ کے مزاج وعادت کے بھی بالکل خلاف ہے؟ پھر یہ اتنی عمدہ مٹھائی آخر کہاں سے آ گئی؟ حضرت استاد صاحب میری بات سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا: مٹھائی گھر میں نہ تھی بلکہ اسی وقت ان دوسرے شاگردوں (جنات) سے منگوالی، ایسے وقت میں ہی تو یہ کام آتے ہیں۔ مجھے اشکال ہوا کہ یہ جنات تو لوگوں کی چیزیں غائب کروا دیتے ہیں، یہ کہیں سے بلا اجازت، بغیر قیمت اٹھا کر لائے ہوں گے۔ آپ سے استفسار کیا تو فرمایا کہ ان میں معتمد کو پیسے دے کر خریداری کرائی جا سکتی ہے۔

مجلس درس میں انوارات کا مشاہدہ

استاد صاحب کا مقام ولایت بہت ہی اونچا تھا لیکن آپ نے اپنے آپ کو تواضع کے پردے میں چھپا رکھا تھا، آپ کے درس میں واضح انوارات محسوس ہوتیں، جب ہم جیسے کورے اس کو محسوس کر رہے ہوتے تو حقیقت حال سے شناسائی رکھنے والوں اور حقائق بین نگاہوں کے ادراک کا کیا عالم ہوگا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بڑا ہی عجیب پیش آیا۔ شرح النقایہ کے درس میں ایک عجیب کیفیت منکشف ہوئی۔ وہ یہ کہ جب استاد صاحب شرح النقایہ میں کوئی حدیث پڑھاتے، تو حدیث کا سارا منظر استاد صاحب کے آس پاس منکشف ہو جاتا اور بالکل ایسے واضح دکھائی دیتا۔ جیسے ایک بڑے پردے (سکرین) پر دوڑتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ مثلاً جمعہ کے دن دوران خطبہ (تحیۃ المسجد) پڑھنے پر حضرت ملا علی قاریؒ نے بحث فرمائی ہے اور صحابی سلیک غطفانیؓ کا مسجد میں آنا، اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ان سے ارشاد فرمانا کہ اٹھو اور تحیۃ المسجد پڑھو۔ یہ پورا واقعہ استاذ صاحب کے پڑھانے کے دوران میرے سامنے ایسا منکشف ہوا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے سارا منظر دیکھا۔ درس کے بعد میں سوچتا رہا کہ آخر یہ کیا ہے؟ کہ استاذ صاحب کی زبان سے حدیث کے جو کلمات مبارکہ نکلتے ہیں وہ بشکل صورت ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس

طرح میں نے احادیث میں مذکور کئی واقعات کا مشاہدہ کیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت پر بحث ہو رہی تھی، جرح و تعدیل والوں نے وہاں رواۃ پر بڑا طویل کلام کیا ہے اور بعض راویوں کے ضعف کی بنا پر اسے ناقابل استدلال سمجھا ہے۔ بحث چل رہی تھی کہ ایک عجیب صورت منکشف ہوئی وہ یہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدرسے کے قریب ایک خندق کے پاس کسی شے پر ٹیک لگائے تشریف فرما ہیں اور اماں عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے دائیں گھٹنے کے پاس بیٹھی ہے اور اپنے ہاتھ مبارک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گھٹنے پر رکھے ہوئے ہیں گویا آپ کے گھٹنے مبارک کو دبا رہی ہے۔ اسی اثنا میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیں آواز دیتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یقول:

جب مزید سننا اور دیکھنا چاہا تو یہ منظر غائب ہو گیا۔ میں نے استاذ صاحب کے درس کی یہ کیفیت اب تک چھپا کر رکھی تھی، لیکن اب برداشت نہ ہو سکا اور رات کو دار المطالعہ میں استاذ صاحب سے ساری صورت حال عرض کر دی۔ استاد صاحب نے سن کر ماتھے پر ہاتھ مارا اور فرمانے لگے: بے وقوف انسان! یہ باتیں بھی کوئی بتاتا ہے؟ یہ بتانے کی باتیں ہوتی ہیں؟ بد قسمت! یہ تو راز ہوتے ہیں اور بتانے سے یہ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر وہی ہوا کہ ہمیں استاذ صاحب کے درس میں یہ چیز نصیب نہیں ہو سکی، میں نے اس کے بعد بہت کوشش کی، بہت توجہ کی مگر بے سود۔ استاذ صاحب کی عظمت اور مقام کی ان واقعات سے ہم پر ایک طرح کی ہیبت طاری ہو جاتی اور اندازہ ہوتا کہ آپ کا مقام کتنا اونچا ہے۔

طلبہ کی رعایت

استاد صاحب ہر معاملے میں طلبہ کی بہت ہی رعایت فرماتے تھے، خصوصاً تعلیمی حوالے سے آپ کو طلبہ کے فائدے کا حرص کے درجے تک خیال رہتا تھا۔ استاذ صاحب سے ہم نے مسلم الثبوت پڑھنی شروع کی، لیکن سہ ماہی امتحان میں تقریباً ساری جماعت راسب آئی، نتیجہ منظر عام پر آیا تو استاد صاحب نے ہماری جماعت کو بلایا اور فرمایا:

> ''ایک مالی نے پودے لگائے اور تین ماہ تک ان کی آبیاری کی، بڑا خیال رکھا اور بڑی محنت کی، یہاں تک کہ ان پودوں پر پھل آنا شروع ہو گیا۔ مالی بہت خوش تھا کہ میری محنت ثمر خیز ہونے لگی ہے۔ مگر جب اس نے دیکھا، تو پتہ چلا کہ پھل کو تو کیڑے لگے ہوئے ہیں اور یہ تو سڑا ہوا ہے۔ تو کیا خیال ہے، مالی کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ اسے کتنا دکھ ہوا ہوگا؟ تم لوگوں نے بھی مجھے یونہی ناامید کیا اور میری محنت رائیگاں گئی۔''

استاذ صاحب ناراض بھی تھے اور غصہ میں بھی۔ لیکن کسی کی مجال کہ استاذ صاحب کے سامنے وضاحت دے

سکے، مگر میں نے جرأت کی اور عرض کیا کہ حضور! یہ مالی کی اپنی غلطی ہے اس میں پودوں کا کوئی قصور نہیں، مالی کو چاہیے تھا کہ تین مہینے پودوں کو جو کھاد، پانی دے رہا تھا یہ معلوم کرتا کہ ان پودوں میں اس خوراک کو ہضم کرنے کی استعداد بھی ہے یا نہیں؟ پھر عرض کیا کہ حضور! آپ کے اصول فقہ پڑھانے کا معیار اتنا بلند ہے کہ ہم تین مہینوں میں باوجود کوشش کے آپ کے معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہے، اس لئے کما حقہ سمجھ بھی نہ سکے۔

سبحان اللہ! کیا شان کریمی اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی۔ فوراً مسکرائے اور فرمانے لگے: واقعی یہ میری غلطی ہے، یہ میری ذمہ داری تھی کہ طلبہ کی استعداد کے مطابق پڑھاتا نہ کہ اپنے معیار کے مطابق۔ پھر دیر تک بلند آواز سے استغفار فرماتے رہے اور اٹھ کر مولانا رفیع اللہ صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے کہا کہ ان کو مسلم الثبوت آپ پڑھائیں گے۔ یوں ہماری یہ کتاب تبدیل ہوگئی۔ کیا اس زمانے میں اس بے نفسی وفنائیت اور طلبہ کی اس درجہ رعایت کی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

میرے شیخ کے بارے میں حضرت کی رائے

یہ ۸۵ء کی بات ہے میں ایک دن کپڑے دھونے ہنگو شہر گیا تھا، میرے مرشد وشیخ حضرت مسرت حسین شاہ صاحب رحمہ اللہ جامعہ یوسفیہ تشریف لائے، ارادہ مجھ سے ملاقات کا تھا، لیکن افسوس کہ میں موجود نہ تھا، حضرت الاستاد اس وقت تک ان سے واقف نہ تھے۔ میں واپس آیا تو استاد صاحب نے ایک پرچی تھمائی کہ یہ فلاں صاحب چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس میں میرے مرشد نے لکھا تھا کہ ملاقات شاید نصیب میں نہ تھی، لیکن مقدرات کے سامنے کیا کیا جاسکتا ہے۔ آگے کچھ اذکار تعلیم کیے تھے، پھر لکھا تھا کہ جاننا چاہئے! نماز میں تکبیر اولیٰ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ عابدوں کی عبادت اور نمازیوں کی نماز سے مستغنی وبرتر ہے اور تکبیریں جو ارکان کے بعد ہیں وہ اس امر کے رموز واشارات ہیں کہ یہ رکن جو ادا ہوا ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں عبادت کے لائق نہیں۔

استاد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آدمی کون تھے؟ اور آپ کا ان سے کیا تعلق ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ میرے شیخ ہیں اور میرا ان سے بیعت کا تعلق ہے۔ اس مرحلے پر استاد صاحب نے میرا اس زاویے سے امتحان لیا، جس میں کامیاب ہونا ہر مرید کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اگر مرید توحید مطلب کی دولت سے بہرہ ور نہ ہو تو اس کا اصلاحی تعلق فائدہ عام کا باعث تو ہوسکتا ہے، فائدہ تام کا کبھی نہیں۔ استاذ صاحب نے غالباً امتحاناً مجھ سے پوچھا کہ جب اکمل مشائخ موجود ہوں تو کامل کی طرف رجوع کی کیا حاجت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! اگر مقصد یہ ہے کہ میں مولانا سراج الیوم (گڑھی بابا جی صاحب) سے بیعت کرلوں جو آپ کے شیخ ہیں تو ان سے وہ

عقیدت نہیں جو بیعت کے لئے ہونی چاہئے۔ میری عقیدت اور محبت بس اسی شخص سے ہے۔ اس پر حضرت کے تاثر سے معلوم ہوا کہ میرا جذبہ صادق ہے۔

تاہم ایک بار حضرت نے سید مسرت حسین شاہ صاحب رحمہ اللہ کا بھی امتحان لیا، وہ اس طرح کہ حضرت شاہ صاحب علی الصباح مدرسہ تشریف لائے۔ استاذ صاحب نے فوراً ناشتہ کا اہتمام فرمایا اور بذات خود خدمت شروع کی، مہمان خانے میں اونچے گدے رکھے ہوئے تھے جو زمین سے تین چار انچ بلند تھے۔ استاذ صاحب گھر سے آملیٹ، روٹی اور چائے وغیرہ چنگیر میں رکھ کر تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اس گدے سے نیچے فرش پر دسترخوان بالکل شاہ صاحب کے سامنے بچھا دیا۔ اب شاہ صاحب دسترخوان سے اوپر۔ اور دسترخوان ان سے کچھ انچ نیچے زمین پر۔ اس پر شاہ صاحب نے دسترخوان اٹھایا اور فرمایا کہ ہم اسے گدے پر بچھا کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ساتھ ہی دھیمی آواز میں بولی: "اکرموا الطعام" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ کھانے کی عزت کرو۔ جب شاہ صاحب واپس چلے گئے تو استاد صاحب فرمانے لگے کہ بس انہیں مان لیا کہ یہ ایک کامل مرشد ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! ایسا کیا ہوا کہ دوسری ملاقات ہی میں آپ نے اتنے رسوخ سے رائے قائم کرلی۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ آج میں نے ان کا امتحان لیا، میں نے کھانا جان بوجھ کر نیچے رکھا، تاکہ یہ پتہ چلے کہ بندہ کتنا سنت کا پابند ہے؟ اور دینی فہم کس سطح کا ہے۔ مگر واقعی یہ بڑے ہی فہیم اور متبع سنت شخصیت ہے۔

مجھے اس پر بڑی خوشی ہوئی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ جہاں میرا بیعت کا تعلق ہے وہاں سے حضرت استاد صاحب جیسی گہری علم وفہم والی شخصیت بھی پوری طرح مطمئن ہے۔ اس کے بعد تو ان حضرات کا باہمی تعلق ہمارے لئے قابل رشک ہوگیا۔ استاد صاحب پشاور جاتے تو ضرور شاہ صاحب کے ہاں تشریف لے جاتے اور حضرت شاہ صاحب کی ہنگو تشریف آوری ہوتی تو استاد صاحب کے ہاں آنا مقدم رکھتے۔

جامعہ یوسفیہ میں حضرت الاستاد کی صحبت میں گزرا ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے منڈلا رہا ہے۔ یہ ایک زریں دور تھا، استاد صاحب کی صحبت سے ہم نے بہت کچھ سیکھا، ہم نے یہاں علم کی حفاظت اور وقار کو دیکھا، استغناء کی شان کا مشاہدہ کیا، عالم باعمل کیسا ہوتا ہے؟ اس کا پورے آب وتاب سے مشاہدہ کیا، علم کی پیاس، سیکھنے کا ذوق وشوق، ایک دوسرے کا احترام، کسی سے طمع نہ رکھنا، چندہ نہ مانگنا بلکہ حاجت وضرورت کا اظہار تک نہ کرنا۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جو بہت ہی کم ملتی ہیں۔

استاد صاحب کے خطوط

جب میں نے درجہ رابعہ مکمل کرلیا، تو اگلے سال تعلیم کا یہاں انتظام نہ تھا، استاد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ گوجرانوالہ یا ملتان جانا ہے۔ بندہ نے شوال کی ابتدا میں جا کر حسب حکم جامعہ خیر المدارس میں داخلہ لے لیا۔ استاذ صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آخر تک طالب علم سے رابطہ اور تعلق بحال رکھتے۔ یہ نہ تھا کہ طالب علم چلا گیا تو بس پھر اس کا ذکر ہی باقی نہ رہا۔ بلکہ حتی الوسع احباب کو اپنے ساتھ مربوط رکھتے۔ خیر المدارس میں داخلہ کے بعد استاد صاحب سے بدستور رابطہ رہا۔ جامعہ یوسفیہ سے جانے کے بعد حضرت نے مجھے کئی خطوط ارسال فرمائے، ان میں سے جو خطوط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں، ان کے کچھ چیدہ چیدہ اقتباسات شامل کرنا چاہوں گا۔

ہمارے والد صاحب مولانا فتح خان صاحب رحمہ اللہ سے حضرت الاستاذ کو تعلق خاطر تھا اور کوشش رہتی تھی کہ ان سے ضرور روابط و ملاقات قائم رہے۔ میرے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تقدیر الٰہی کے سامنے انسان کے تمام منصوبے، تدابیر، تجاویز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، حضرت والد صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضر خدمت ہونے کی تمنا تمنا ہی رہی اور پورا ہونے کی سعادت تاہنوز حصہ میں نہ آسکی، گزشتہ منگل کے دن استاذی العلام حضرت مولانا فضل محمد صاحب متعنا اللہ تعالی بفیوضاتہم کو رخصت کرنے پشاور گیا۔ حضرت شاہ صاحب مدظلہم (مراد سید مسرت حسین شاہ صاحب ہیں: راقم) سے ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ عزیز صاحب اور ان کے والد صاحب تشریف لائے تھے اور آج ہی رخصت ہوئے۔ بڑا افسوس ہوا لیکن غالب امید تھی کہ امید ہے کوہاٹ سے ذرا مڑ کر ہنگو کا رخ فرما چکے ہوں گے، اس لئے جلدی جلدی وکیل صاحب کا پتہ کرکے روانہ ہوگئے، (ہم وکیل سے ملنے گئے تھے: راقم) چونکہ وکیل صاحب بھی موجود نہیں تھے، اس لئے اپنے گمان کو اور بھی تقویت ملی کہ ہمارے ہاں تشریف لے گئے۔ ہنگو پہنچ کر احباب سے پتہ کیا کہ ہمارے ہاں مہمان آئے ہیں؟ لاعلمی کا جواب ملا، غریب خانہ پہنچے تو اپنی محرومی اور مایوسی کی وجہ سے سخت صدمہ ہوا، بہرحال کچھ بھی انسان سوچے ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔''

اس خط میں اپنائیت کا لہجہ، ایک شاگرد اور اس کے والد سے ملاقات کا اشتیاق اور اس کے لئے تندہی ملاحظہ فرمائیں، یہی وہ ادائیں تھیں جو استاد صاحب کی محبوبیت کی واضح دلیل ہیں۔ ہائے افسوس! کہ اس درجہ محبت کرنے والے اب اس دنیا میں ڈھونڈے نہیں ملتے۔

ایک دوسرے خط میں حضرت والد صاحب سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''رائے ونڈ کی اجتماع سے فارغ ہوکر میرے دیرینہ مخلص ساتھی برادرم مولانا محمد جمیل صاحب زید فضلہم سوات کی زیارت کرکے تشریف لے آئے، دو رات قیام فرمایا، جب کہ کراچی سے آئے ہوئے مہمان بھی

تھے، جب عازم وطن ہوئے تو ادھر مقامی حالات مجھے اجازت نہیں دے رہے تھے، چنانچہ میں ہنگو کی نیت سے گیا، پھر خیال تھا کہ کوہاٹ تک جا کر واپس آجاؤں۔ مگر مولانا (جمیل صاحب) کا اصرار تھا، ان کا اخلاص غالب آیا اور مجھے ساتھ ٹانک لے گئے۔ رات کو حضرت والد ماجد صاحب دامت برکاتہم کو زحمت دی، عصر سے لے صبح نو بجے تک ان کے ہاں قیام رہا، متعدد مسائل زیر بحث آئے، توقع سے بڑھ کر فیاض اور دور اندیش شخص پایا، انکساری اور طفساری کی ادا بہت پسند آئی، حق تعالیٰ ہمیں بھی ان کے مکارم ومحاسن سے آراستہ وپیراستہ فرمائے اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

''اوس پاس'' (جنوبی وزیرستان کا ایک گاؤں: راقم) میں دو دن گزارنے پر مجبور ہوا، تیسرے دن ٹانک تک مولانا موصوف کے بڑے بھائی حضرت مولانا نور سید شاہ صاحب مصر ہو کر ساتھ آئے تقریباً ساڑھے چار بجے رات کے وقت ''اوس پاس'' سے روانہ ہوئے تھے، تقریباً آٹھ بجے ٹانک پہنچ گئے، حضرت والد صاحب مدظلہم سے دوبارہ ملنے کی تمنا تھی، مگر وقت ساتھ نہیں دے رہا تھا، ۱۲ ربیع الاول کے جلسوں اور جلوسوں کی وجہ سے ٹریفک متاثر رہی، بمشکل چار بجے شاہو دام پہنچا، پہنچ کر آپ کا انتظار کرتا رہا، تاریخ گزرنے پر ۲۲ نومبر تک تو انتظار کرتا رہا، پھر نہ آنے کے اسباب پر غور کرتا رہا، اسی ذہنی اضطراب میں آپ کا مکتوب کاشف احوال بن کر آیا۔''

اس خط میں آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ استاد صاحب کا آنے والے معزز مہمانوں کے ساتھ ہنگو، کوہاٹ اور بعض اوقات پشاور تک جانے کا معمول تھا۔ جاننے والے احباب کو علم ہے کہ آج سے تیس سال قبل یہ روڈ موجودہ حالت سے بہت بدتر تھے، اپنی کوئی گاڑی میسر نہ تھی، لیکن استاد صاحب کا یہ مثالی اکرام ہمیشہ مہمانوں کے ساتھ رہا۔

دوسرا یہ کہ میں نے ملنے کے لئے تاریخ متعین کر کے وعدہ کیا۔ لیکن نہ آنے پر کوئی بدگمانی کا جملہ نہ لکھا۔ بلکہ ''نہ آنے کے اسباب پر غور کرتا رہا'' کی کتنی خوبصورت اور محتاط تعبیر اختیار فرمائی۔

تمام تر ملی وقومی مسائل کے ہجوم کے باوجود استاد صاحب کا علمی ذوق قائم ودائم رہتا اور اس کام کے لئے گوشۂ فراغ کی تلاش میں رہتے، اس جنگل میں آپ کو قدرداں اور مستعد طلبہ بھی کم ملے، جو ان کے علمی کاموں میں ان کے معاون بنیں، جب ہم کسی علمی کام یا کتاب کا ذکر کرتے تو آپ کی خوشی دیدنی ہوتی۔ عقائد پر ملا علی قاریؒ کا منظوم رسالہ ''قصیدہ بدء الامالی'' استاد صاحب نے نصاب میں داخل فرمایا تو اس پر تعلیق کا ارادہ تھا، اسی سے متعلق میرے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:

''بدء الامالی پر اب تک بالکل کام شروع ہی نہیں کیا، شرح معانی الآثار پر کام کی تمہید پر کام شروع کر چکا ہوں، بدء الامالی پر کام سہ ماہی امتحان کے بعد شروع کروں گا جب کہ درساً کتاب پڑھانا شروع کروں گا، ایک

کتاب کی ضرورت ہے، کہیں سراغ ملے تو حاصل کیجئے۔ نام ہے: اشارات المرام من عبارات الامام۔ علامہ بیاضیؒ کی تالیف ہے، امام صاحب کی عبارات کو متن بنا کر کلامی مسائل پر لکھی گئی بڑی عمدہ کتاب ہے۔ یسر اللہ سبحانہ حصولہ والتوفیق بیدہ۔"

پھر بندہ نے استاد محترم مولانا یٰسین صاحب (مدرس خیر المدارس ملتان) سے قصیدہ بدء الامالی کی ایک شرح کا فوٹو حاصل کر کے استاد صاحب کو روانہ کیا۔ اس پر استاد صاحب نے جوابی خط میں لکھا:

''بدء الامالی کا ہدیہ سنیہ بروقت موصول ہوا، ایک ہفتہ پہلے افتتاح کر چکے ہیں، کاش مستعد ساتھی ہوتے، صاحب ذوق اور نشیط و ذہین ساتھیوں کی برکت سے استاد کو بھی شرح صدر کی دولت نصیب ہوتی ہے اور قلب پر مضامین کا فیضان ہوتا ہے۔ بدء الامالی پر تعلیق کی ابتدا ابھی ہوئی ہے، مگر قدم قدم پر تعویق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ سے توفیق کی دعا کیجئے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ سے کچھ مواد ملنے کی توقع تھی مگر خلاف توقع بہت کم چیزیں ملیں، سب سے بڑی کمی مؤلف کے حالات زندگی کا نہ ملنا ہے۔ اپنوں نے بھی ناقدری کی ہے، دوسروں سے کیا شکوہ کیا جائے، آپ از راہ کرم ان استاد صاحب کا نام تحریر فرمائیں جن سے آپ نے شرح قصیدہ کا فوٹو حاصل کیا تھا اور اصل شرح دیکھ کر شارح کا نام، مطبع کا نام اور سن طباعت نوٹ فرمالیں اور کسی اور شرح یا حاشیہ کا سراغ اگر لگا سکیں تو اپنے کام میں کوتاہی کیے بغیر فارغ وقت میں لگا لیجئے۔''

اس پر استاد محترم مولانا یٰسین صاحب کا اگلے خط میں حوالہ دے دیا، لیکن قصیدہ بدء الامالی کی مذکورہ شرح کا صفحہ اول دستیاب نہ ہونے کے باعث شارح وغیرہ کا علم نہ ہو سکا، میرے خط کے جواب میں حضرت الاستاد رقمطراز ہیں:

''مولانا یٰسین صاحب کا اسم گرامی تو آپ کی تحریر سے معلوم ہوا مگر ان کی عنایت فرمودہ شرح کے مؤلف کا پتہ نہ چل سکا، نہ اس شرح کے محل طباعت اور سنہ کا علم ہوا، معجم المؤلفین سے کچھ توقعات وابستہ تھیں، پشاور میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، مایوسی ہوئی، انہوں نے جن مراجع کا ذکر کیا ہے، ان کی طرف مراجعت سے ہم پہلے ہی فارغ ہو چکے ہیں، ماسوائے ایک انگریزی تالیف کے جو ہمارے کام کی نہیں، کام بہت سست رفتاری سے جاری ہے۔ واردین صادرین ضیاع وقت کا سبب ہیں، کچھ تلاش وجستجو کے بارے میں اس ناکارہ کا جذبہ جنون ہے۔ تاحال پہلے شعر کی تشریح سے فارغ نہیں ہوئے۔ جب کے درسا دس بارہ اشعار ہو چکے ہیں۔''

اس خط میں استاد صاحب نے ضیاع وقت کے جس سبب کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا مشاہدہ ہم نے خود کیا۔ ایک تعویذ لینے والا آ کر ایک گھنٹہ اپنے نجی مسائل کی کہانیاں سنانے اور لاحاصل گفتگو کرنے میں ضائع کر دیتا۔ استاد صاحب پر مروت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ کچھ کہتے نہ تھے۔ لیکن ان لوگوں کو ذرا برابر احساس نہ ہوتا تھا کہ ہم کتنے بڑے عالم کا کتنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔

بندہ استاد صاحب کے ذوق کے موافق جن کتب کو مکتبوں میں دیکھتا ان کی قیمت اور نام وغیرہ لکھ کر بھیج دیتا، اسی طرح کے ایک خط کے جواب میں استاد صاحب لکھتے ہیں:

''شیعوں کی جن کتب کی فہرست آپ ارسال فرما چکے تھے، ان میں ''مسند الامام الرضا'' اگر چہ مہنگی ہے، تاہم شاید کچھ کام آجائے، خرید لیجئے، دوسری کتابیں زیادہ کار آمد نہیں ہیں، اصول کافی اور فروع کافی کسی وقت مناسب دام پر ہاتھ آگئے تو خرید لیں گے۔''

بندہ خیر المدارس میں اساتذہ سے حضرت کا تذکرہ کرتا رہتا، وہاں کے حضرات نے از راہِ محبت استاد صاحب کے نام ''ماہنامہ الخیر'' کا پرچہ اعزازی جاری فرما دیا۔ اس پر استاذ صاحب کا متواضعانہ خط ملاحظہ فرمائیں:

''الخیر کے اجراء پر خوشی ہوئی لیکن اعزازی اجراء خدا کرے باعث مؤاخذہ نہ ہو، آپ حضرات اس ناکارہ خلائق کے بارے میں غالباً اطراء اور غلو سے کام لیتے ہیں، اس لئے ناواقف حضرات کو دھوکہ لگتا ہے، ورنہ میں تو آپ بھی جانتے ہیں کہ روایتی 'معیدی' ہوں جن کے بارے میں کہا گیا ہے: تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ۔''

الخیر کے مضامین کو استاد صاحب بغور پڑھتے اور بعض مضامین کے بارے میں اظہار خیال بھی فرماتے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''الخیر بالخیر مل گیا، اچھا باوقار مجلہ ہے، کراچی میں فسادات کے بارے میں چھپی تحریر دردمندانہ ضرور تھی مگر جی ایم سید کے چیلے اور شیعہ لوگ جو سازش کر چکے اور جو کر رہے ہیں، کاش اس کی نقاب کشائی ہوتی، پٹھان اور مہاجر دونوں دین دار ہیں، ان کو آپس میں لڑانا یقیناً لادین عناصر کی سازش ہے، جس میں صوبائی وزارت اور وفاقی حکومت دونوں ملوث ہیں۔''

فرقہ باطلہ کا رد

حضرت الاستاد صاحب گمراہ کن افکار، بدعات و رسومات اور اسباب تفرقہ کی روک تھام کے لئے اپنے علاقے میں ہمیشہ سرگرم رہتے، لیکن اس حکمت و تدبر اور سلیقے سے یہ کام انجام دیا کہ باطل افکار و بدعات کا قلع قمع بھی ہوتا، لیکن فضا پر تشدد نہ ہوئی، نہ ہی تصادم یا بدامنی پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی کے افکار و نظریات سے متاثرہ اہل علم جن میں ٹل کے مولانا داؤد صاحب اور ہنگو کے مولانا سلیم صاحب سرفہرست ہیں کے ساتھ ایک طویل تحریری مکالمہ بھی ہوا، اسی طرح اہل بدعت کے ترجمان مولانا رفیع محمد صاحب کے ساتھ بھی طویل تحریری مناظرے ہوئے۔ ان حضرات کو علمی طور پر مکمل لاجواب کیا گیا، جس کا انہوں نے بعض مواقع پر اظہار بھی کیا۔ اس طرح مکالموں کی شکل میں تمام افکار کا بحمد اللہ ایسا انسداد ہوا کہ کسی باطل فکر و نظر کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکا۔

آپ نے رسوم ورواج کے انسداد کے لئے ہماری ایسی تربیت فرمائی تھی کہ جس میں عوام یا علماء سے ٹکراؤ نہ ہو بلکہ حکمت اور عوام کی ذہنی سطح کے مطابق عام فہم اور منطقی استدلال سے ان کو قائل کرنے کی کوشش ہو، اس سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کرنا چاہوں گا۔

جامعہ یوسفیہ کے قریب اورکزئی اقوام کے بڑے قومی رہنما اور لیڈر حاجی ملنگ کا حجرہ تھا، اس کی مسجد میں ہمارے مدرسے کے ایک قاری صاحب امام تھے، قاری صاحب چھٹی پر گئے تھے اور عارضی طور پر نمازیں پڑھانے کی ذمہ داری مجھے ملی تھی۔ ان ہی دونوں اہل تشیع واہل السنۃ کے مابین کچھ قومی مسائل اٹھے ہوئے تھے، اس سلسلے میں اورکزئی کے اٹھارہ اقوام کے ملک اور لیڈر مذاکرات کے لئے شاہو خیل آئے ہوئے تھے، ان کا قیام حاجی ملنگ کے حجرے میں رہتا تھا، پہلے دن جب میں گیا تو وہ سارے نماز میں شریک تھے۔ میں نے حسب عادت فرض نماز پڑھ کر مصلّی چھوڑا اور پیچھے آکر سنتیں ادا کرنا شروع کر دیں۔ اس دوران لوگوں میں پھس پھس شروع ہوئی، مجھے اندازہ تھا کہ یہ سارے لوگ چونکہ تیراہ سے آئے ہوئے ہیں اور وہاں امام مصلّی ہی پر رہتا ہے، یہاں تک کے سنتوں کے بعد اجتماعی دعا ہو، اس لئے یہ ساری کھسر پھسر اسی سلسلے میں ہے۔ میں نے سلام پھیرا تو حاجی ملنگ صاحب نے باواز بلند کہا: ''**استوز پنځ پیرانی شوی کا چه چل دی؟ اُوشه دَوا دی نه ووکړه۔**'' استاد پنج پیری بن گئے ہو یا کیا بات ہے؟ جو دعا نہیں مانگی۔'' میں نے ایسے مسائل کا حل تو استاد صاحب سے سیکھا تھا، اس لئے 'اچھا' کہہ کر سیدھا محراب میں آیا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ چونکہ اس علاقے میں تین بار دعا ضروری سمجھی جاتی ہے، اس لئے میں نے پہلی دعا پانچ منٹ لمبی مانگی۔ دوسری سات منٹ اور تیسری کے ابھی پانچ منٹ بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ حاجی ملنگ نے کہا: ''استاذ! کھانا تیار ہے، اب پوری رات تو دعا مانگنے سے رہے۔'' اس پر میں اٹھا اور مختصر تقریر کی کہ آپ حضرات اپنے قبائل اور اقوام کے سربراہان ہیں۔ عقل، تدبر، حکمت اور علم والے مانے جاتے ہیں۔ میرا آپ لوگوں سے ایک سوال ہے، غور سے سن کر اور سوچ کر جواب دے دیں۔ آج آپ میں سے گھر سے نکلتے ہوئے کس کس نے گھر سے نکلنے کی دعا پڑھی ہے؟ کس نے گھر میں داخل ہونے کی دعا پڑھی ہے؟ سورج ڈھل گیا ہے، شام کے اذکار کس کس نے پڑھے ہیں؟ ابھی مسجد آئے ہیں تو مسجد میں داخل ہونے کی مسنون دعا کس نے پڑھی ہے؟ اذان ہوئی تو اذان کا جواب اور اس کے بعد کی دعا کس کس نے پڑھی؟ اقامت اور تکبیر تحریمہ کے درمیان کس نے دعا پڑھی ہے؟ فرض نماز کے بعد مسنون دعا کس نے پڑھی ہے؟ ظاہر ہے ان میں سے کسی کو بھی یہ دعائیں یاد نہ تھیں۔ اس لئے سارے خاموش رہے اور کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ الحمد للہ میں نے یہ ساری دعائیں مانگی ہیں، پھر سنتوں کے بعد انفرادی دعا بھی مانگی ہے اور ابھی آپ کے ساتھ مل کر سترہ منٹ کی

اجتماعی دعا بھی مانگی ہے۔تو اب آپ بتائیں کہ دعا میں نہیں مانتا یا آپ نہیں مانتے؟ دعا کی اہمیت میری نظر میں نہیں یا آپ کی نظر میں نہیں؟ میری بات سن کر ایک معزز ملک صاحب اٹھے اور مسکرا کر کہنے لگے: **استاد! خلائے چه ذير چالوک سڑائے خويے۔** ''استاذ! قسم سے بہت ہی سمجھ دار آدمی ہو۔'' باقی سارے بول اٹھے کہ آج ہمیں مسئلہ سمجھ میں آیا کہ ہم بلاوجہ سنتوں کے بعد دعا پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ ہم نے ہر مسنون دعا چھوڑ رکھی ہے۔

استاد صاحب کا طریقہ کار یہ تھا کہ لوگوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر انہیں بدعات ورسومات کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔الحمدللہ اس کا بڑا فائدہ ہوا اور غلط افکار ونظریات کا سد باب ہوا، ورنہ عموماً لوگوں نے دیوبندیت کے نام پر یا تو محض تشدد کا مشاہدہ کیا ہوا تھا یا مداہنت وتساہل کا۔اس افراط وتفریط کی وجہ سے قبائل میں یہ مسائل روز افزوں تھے، جو استاد صاحب کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ختم فرمائے۔

ایک دفعہ میں نے خیر المدارس سے حضرت کو خط لکھا کہ مودودی صاحب کی تفسیر 'تفہیم القرآن' کی سعودی عرب سے اشاعت کے لئے کوشش جاری تھی جو قریب التکمیل ہے،اس پر آپ سخت فکر مند ہوئے اور مجھے درج ذیل خط لکھا:

> ''جناب کا گرامی نامہ ملا تھا، جواب دینے کی فکر میں تھا کہ ملتان سے یکے بعد دیگرے تین عدد خطوط وفاق کی طرف سے موصول ہوئے، وفاق سے ہمارے انقطاع کا علم آپ کو بھی ہے۔خود وفاق کے دستور سے میری رکنیت ختم ہونی چاہئے تھی، مگر یہ ہمارے بزرگوں کی شفقت ہے کہ یاد فرماتے ہیں، حسب سابق اب بھی حاضر ہونے کی جرأت نہیں کرتا، مگر مولانا محمد عارف کے حوالے سے جو اطلاع آپ نے مودودی صاحب کی تفہیم کی سعودیہ سے اشاعت کے بارے میں دی تھی۔وہ فقیر کے لئے انتہائی تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔وفاق کے عاملہ کے اجلاس میں اصولی طور پر ایسے مسائل زیر بحث نہیں آسکتے لیکن نجی طور پر شرکائے اجلاس سے گفت وشنید ہو جائے گی اور کوئی حل ڈھونڈنے کی ایک صورت ہوگی۔ ۱۴ اکتوبر کو اجلاس ہے ہو سکتا ہے فقیر ہفتہ کے دن ملتان پہنچ جائے۔''

مولانا حنیف جالندھری مدظلہم نے غالباً اس حوالے سے کچھ کوشش بھی کی اور بھی کئی حضرات کی کوشش شامل رہی، بحمداللہ تفہیم کی اشاعت وہاں سے نہ ہوئی۔آپ نے جو خط اس حوالے سے وفاق کے اکابر کے نام تحریر فرمایا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''وفاق المدارس جسے بجا طور پر مدارس عربیہ کی نمائندگی کا حق پہنچتا ہے، اس موقر تنظیم کی عاملہ کے ذمہ دار معزز ارکان کی توجہ ایک اور اہم ترین معاملہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ ایک قابل اعتماد ذریعہ سے

پہنچی ہوئی یہ اطلاع ہے کہ مدینہ طیبہ میں .... کے نام سے شاہ فہد کے فرمان پر ایک ادارہ بنایا گیا ہے جو دنیا کی اٹھارہ زبانوں میں مودودی صاحب کی تفسیر کا ترجمہ کر رہا ہے، تراجم کی تکمیل کے بعد سعودی حکومت اسے طبع کر کے نشر کرے گی، دین اسلام اور امت مسلمہ کا سچا درد رکھنے والے ہر شخص کی طرح یہ اطلاع یقیناً ہمیں اور آپ کو مضطرب کر رہی ہے جیسا کہ آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ پاک وہند میں اسلام کے مدعی بن کر جو لوگ دین کو نقصان پہنچا رہے ہیں ان میں قابل ذکر چار گروہ ہیں: رافضیہ، قادیانیہ، بریلویہ اور مودودیہ۔ اول الذکر تینوں فرقوں سے عالم عرب کافی حد تک واقف ہے۔ اور وہاں ان کے خلاف نفرت کے جذبات ہمارے ہاں سے کچھ کم نہیں، اگر زیادہ نہ ہوں۔ لیکن مودودیت کے بارے میں ہماری تسامح یا تغافل کی وجہ سے اہل عرب بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کا ایک سنگین نتیجہ یہ پیش آمدہ الیہ ہے، آپ حضرات سے بڑی دردمندی کے ساتھ اس فقیر کی یہ اپیل ہے کہ آپ اس مجلس میں اس اہم اور سنگین معاملے کے تدارک کے لئے کوئی صورت تجویز فرمالیں۔ خدانخواستہ یہ منصوبہ اگر مکمل ہوگیا تو نہ صرف یہ کہ عربی ممالک اور دیگر بیرونی ممالک میں مودودیت کے خلاف ہمارے لئے کام مشکل ہو جائے گا بلکہ اپنے ملک میں بھی اس فتنہ کی سرکوبی دشوار ہو جائے گی اور ہمارے اسلاف نے اب تک اس بارے میں جتنا کام کیا ہے، کوششیں کی ہیں سب پر پانی پھر جائے گا۔ ولا فعل اللہ ذلک''

اس حوالے سے آپ کو تشویش رہی اور ہمارے حضرات کی کوششوں سے آگاہ رہنے اور ان کے نتیجہ خیزی کا بھی شدت سے انتظار رہا، مجھے ایک خط میں لکھا:

''آپ نے اپنے گرامی نامہ میں تفہیم کے بارے میں حضرت مولانا حنیف صاحب زید مجدہم کے مساعی کے نتائج کا ذکر نہیں فرمایا تھا، امید ہے آئندہ مکتوب میں آگاہ کریں گے۔''

ہماری خبر گیری

حضرت الاستاذ نے ہر حوالے سے ہماری خبر گیری رکھی۔ مالی تعاون، اخلاقی تربیت اور تعلیمی استعداد سمیت ہر حوالے سے فکر رکھتے اور حوصلہ بڑھاتے رہتے۔ یقین جانیے! کہ ایک باپ اور بڑا بھائی بھی اپنے چھوٹوں کی اس طرح کی خبر گیری نہیں کرسکتا جس طرح استاذ صاحب اپنے تلامذہ کی کرتے تھے، ایک دفعہ مجھے خیر المدارس میں پڑھنے کے دوران خط لکھا کہ

''اپنے اسباق کی طرف زیادہ توجہ رکھیں اور ساتھیوں کو بھی تلقین کرتے رہیں، الحمدللہ مینگورہ (یعنی مظہر العلوم مینگورہ، سوات) میں تو ہمارے ساتھی ہاشم و محمد صالح وظفر احمد وغیرہ پورے مدرسہ میں ممتاز ہیں، کیا اچھا ہوتا اگر خیر المدارس میں بھی ایسی صورت ہوتی۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ استاذ صاحب کو تعلیمی حوالے سے بندہ کی کتنی فکر تھی اور وہ کس طرح مسابقت فی الخیر کا جذبہ پیدا فرماتے تھے۔

مولانا فقیر محمدؒ کی دعوت کا عجیب واقعہ

ایک دفعہ بندہ حضرت الاستاذ کے ساتھ ارباب گڑھی پشاور حضرت مولانا فقیر محمد رحمہ اللہ خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی مجلس میں حاضر ہوا، حضرت مولانا فقیر محمد صاحب پر اکثر اوقات گریہ طاری رہتا اور ''بکائی'' کے لقب سے مشہور تھے۔ مجلس ختم ہونے کے بعد مولانا فقیر محمد صاحب نے استاذ صاحب کو کھانے کی دعوت دی، استاذ صاحب نے خلاف معمول بغیر اصرار کے دعوت قبول کر لی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ استاذ صاحب عموماً کھانے کا بوجھ کسی پر ڈالنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ پھر جب کھانے کا دستر خوان لگا تو استاذ صاحب بڑے اضطراب میں کھانے کے منتظر تھے اور کھانا لگنے کے بعد ایسی جلدی جلدی رغبت کے ساتھ کھایا جیسے کئی دن کی بھوک ہو اور معمول سے زیادہ کھایا۔ یہ تمام خلاف معمول کام میرے استعجاب وحیرت میں دو چند اضافہ کر رہے تھے اور میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو کیے ہوئے تھا کہ کب استاذ صاحب یہاں سے نکلیں اور کب میں ان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے؟ جب استاذ صاحب وہاں سے رخصت ہو کر نکلے تو میں نے جھٹ سے پوچھا کہ حضرت! آج کیا ہو گیا تھا کہ آپ نے بہت جلد دعوت قبول کر لی اور معمول سے زیادہ بھی کھا لیا اور جلدی جلدی کھاتے رہے جیسے سخت بھوک لگی ہو؟ اس پر حضرت نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: عزیز الرحمن صاحب! حلال کھانا عبادت میں معاون ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے، مجھے یقین ہے کہ حضرت کے گھر کا کھانا حلال ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے محتاج ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس کھانے کا حد درجہ محتاج ظاہر کیا کہ نعمت کی کسی قدر قدر دانی ہو اور عبادت میں معاون ہو۔

لطیفہ

ایک بار بندہ استاذ صاحب کے ساتھ کسی کام سے پشاور گیا۔ وہاں ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وکیل صاحب اپنی گفتگو میں مسلسل انگریزی بولتے رہے۔ جب میری باری آئی تو میں نے عربی کتاب کا متن جو مجھے زبانی یاد تھا، تسلسل اور روانی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔ استاذ صاحب مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ اسے کیا ہو گیا۔ میں خاموش ہوا تو وکیل صاحب استاذ صاحب سے مخاطب ہوئے کہ کیا اسے پتہ ہے کہ مجھے عربی سمجھ نہیں آتی؟ میں نے جھٹ سے استاذ صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ حضرت! وکیل صاحب کو پتہ ہے کہ ہمیں انگریزی سمجھ نہیں آتی؟ اس پر استاذ صاحب خوب ہنسے اور وکیل صاحب شرمندہ ہو کر معذرت کرنے لگے۔ پھر دوبارہ پوری بات پشتو میں

سنائی تو ہمیں سمجھ آئی۔

آہ! استاذ صاحب کی صحبت میں بیتے کس کس لمحے کو یاد کیا جائے، ہر لمحہ دوسرے سے حسین ہے، آپ کی ایک ایک ادا اتنی پیاری تھی کہ دل پر نقش ہو جاتی۔ آپ کی مسکراہٹ، آپ کی محبت، آپ کا مشفقانہ رویہ، آپ کا جلال اور آپ کا غصہ ہر چیز ہمارے لیے پیاری تھی اور آپ کی ہر ادا اپنے حق میں سعادت عظمیٰ تصور کرتے تھے۔

استاذ صاحب کی یاد میں یہ چند سطور سیاہ کرنے سے اپنے بیتے دنوں کا پورا نقشہ ہرگز نہ کھینچ سکا، تاہم کوشش ضرور کی کہ کوئی اہم بات نہ چھوٹنے پائے۔ اللہ تعالیٰ استاذ صاحب کو کروٹ کروٹ راحتیں بخشیں، یقیناً آپ کی شہادت ہمارے لئے وہ عظیم صدمہ تھا جس نے ہمیں یتیم کر کے رکھا۔ وہ رونقیں، وہ بزمیں، وہ رعنائیاں اب کہاں؟ جن سے وام کی بستی مہکا کرتی تھی۔ میری دعا ہے کہ ہماری مادر علمی جامعہ یوسفیہ جو آپ کا قائم کردہ گلستان ہے یونہی شاد وآباد رہے اور آپ کے فیوض وبرکات کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا رہے۔

آخر میں المظاہر کے احباب کا شکریہ جنہوں نے انتہائی محنت وجانفشانی سے حضرت الاستاذ کی حیات طیبہ پر یہ تاریخی دستاویز تیار کرنے کی سعی کی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے دربار میں قبول ومنظور فرمائے اور اس کی برکت سے ہمیں استاذ صاحب کی فیوض وبرکات سے بہرہ ور فرمائے۔ (آمین)۔

وہ چل دیئے جنہیں عادت تھی مسکرانے کی

مفتی کفایت اللہ، مردان

مت سہل انہیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ اس عہد کے یادگار اور نایاب انسان تھے۔ ایسی جامع الکمالات شخصیات صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ آپ کا علم، وقار، سنجیدگی، خلوص وللہیت، حیا، جود وسخا، جرأت وشجاعت، حب فی اللہ، بغض فی اللہ، توکل علی اللہ، زہد وفقر، استغناء عن الخلق اور استقامت جیسی صفات مثالی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ظاہری وباطنی خوبیوں کا حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ کریمانہ اخلاق، محبت وشفقت اور غمخواری آپ کے لازمے تھے۔ آپ کی غیرت دینی اور خودداری ضرب المثل تھی، اپنے تلامذہ کی ایسی خبر گیری فرماتے جتنی لوگ اولاد کی بھی نہیں رکھتے۔ علم وعمل کا یہ مجسمہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا انتخاب تھا، آپ صرف دورۂ حدیث کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لائے، لیکن کچھ ہی عرصے میں اپنے اساتذہ کے نورِ نظر اور معتمد بن گئے۔ آپ کی ٹھوس علمی استعداد اور تقویٰ وتدین اکابر جامعہ کے ہاں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

بندہ ۱۹۷۵ء میں درجہ اولیٰ کے لئے بنوری ٹاؤن آیا۔ چونکہ حضرت والد صاحب مولانا قاری محمد ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ (جو حضرت مدنیؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے) کی صحبت اور گھریلو ماحول کے باعث صبح جلدی اٹھنے کا معمول تھا، اس لئے ہم تو صبح جلدی بیدار ہو کر مسجد چلے جاتے، لیکن جب واپس دار الاقامہ آتے تو طلبہ کو باہم اکثر یہ گفتگو

کرتے ہوئے سنتے کہ آج فلاں نہیں جاگ رہا تھا، مولانا امین صاحب آئے تو ایسے بھاگا اور ویسے بھاگا۔ غرض اس طرح کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ مولانا محمد امین صاحب کوئی انتہائی سخت مزاج استاذ ہیں جو طلبہ کو مار پیٹ کر جگاتے اور مسجد کی طرف بھگاتے ہیں۔ پھر ایک دن حضرت سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا تو ایسی شفقت سے نوازا کہ آپ کے بارے میں ذہن میں جو تصور بنایا تھا وہ ختم ہو گیا لیکن آپ کا رعب بہر حال ہم پر قائم رہا۔ میں آپ کی شفقت اور محبت کو بیان کروں تو کیسے کروں؟ میرے دامن میں وہ الفاظ ہی نہیں جو اس سراپا شفقت و محبت شخصیت کی اس ادا کا عشر عشیر بھی بیان کر سکیں۔ آپ نے ہر طرح سے ہمارا خیال رکھا، تربیت کے حوالے سے، تعلیم کے حوالے سے، اخلاقی حوالے سے۔ اور آپ کی یہ نگرانی اس انداز سے ہوتی کہ ہم نے کبھی اپنے آپ کو بندش میں محسوس نہیں کیا نہ ہی یہ سمجھا کہ ہم پر کوئی کڑی پابندیاں ہیں، بلکہ آپ کی محبت اتنی تھی کہ ہم خود ہی دیوانہ وار آپ کے منشا و مزاج کے مطابق چلنے میں قلبی سکون اور اطمینان محسوس کرتے۔

حضرت الاستاذ سے ہماری قربت کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ ہمیں حضرت کا رشتہ دار سمجھتے۔ بندہ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، مولانا قاری اسد اللہ مدظلہ، جناب قاری عبید اللہ شاہ اور ہنگو و کوہاٹ کے احباب کا حضرت خاص خیال رکھتے۔ استاذ صاحب کا معمول تھا کہ ہمیں روزانہ بلاتے، اسباق کے حوالے سے پوچھتے، یومیہ معمولات سے آگاہی پاتے، کسی کو کوئی مسئلہ یا تکلیف ہوتی تو اس کا تدارک کرتے، ہمیں کھلاتے پلاتے، ہدایات دیتے۔ حضرت سے اتنا انس ہو گیا تھا کہ سالانہ چھٹیاں ہمارے لئے گھر میں گزارنا مشکل ہوتی تھیں، اس لئے ہم چھٹیاں حضرت کے ساتھ آپ کے گاؤں 'وام' ہنگو میں گزارتے۔ کئی سال بندہ نے چھٹیاں حضرت کے پاس گزاریں، جب میں وہاں حاضر ہوتا تو کچی مسجد میں بچوں کے ناظرہ کی کلاس کو پڑھانے اور نمازوں کی امامت کرنے کی ذمہ داری میری ہوتی۔ تھوڑے فاصلے پر چند آبادیاں تھیں اور باقی سارا جنگل اور پہاڑ۔ بجلی وغیرہ کی سہولت بھی نہ تھی اور مردان سے وہاں تک کا سفر بھی اتنا آسان نہ تھا جیسے آج کل ہے لیکن حضرت کی محبت ہمیں وہاں تک لے جاتی اور ہم یہ دن بڑے ہی مزے سے وہاں گزارتے۔ اپنی زندگی کے جن پرسکون اوقات کا تصور کرتا ہوں اور آج ہنگامہ ہائے زندگی میں جن کے لئے ترستا ہوں، ان میں 'وام' کے جنگل میں بیتے ہوئے وہ دن سرفہرست ہیں۔ لیکن کاش! کہ اب انہیں یاد کرنے کے بجز کوئی اور چارہ نہیں۔ اب جب 'وام' کی بستی میں جاتا ہوں تو نقشہ بدل گیا ہے تاہم اپنے محبوب کے گھر کے پاس اس کچی مسجد کی جگہ کھڑے ہو کر ضرور یہ تمنا ابھرتی ہے۔ ؎

أیا منزلی سلمی سلامی علیکما

هل اللازمن اللاتی مضین رواجع

شاعر نے تو اپنے محبوب کے گھر وندوں کے پاس کھڑے ہو کر اپنے یاس وافسوس کو موزون کیا تھا۔لیکن ہمارے محبوب کی محبوبیت کا عالم دیکھنے والے بخوبی سمجھتے ہیں کہ ان کی صحبت میں بیتے دنوں کی یاد اس سے زیادہ ستاتی ہے۔

بجھا چراغ، اٹھی بزم، کھل کے رو اے دل!
وہ چل دیئے جنہیں عادت تھی مسکرانے کی

ویران ہے میکدہ، خم وساغر بھی اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اور کسی شاعر نے کیا خوب کہا: ؎

کوئی بات تو تھی ساقی کے میکدے میں ضرور
جو دور دور سے میخوار آ کے پیتے تھے

بہ فیضِ میکدہ دیکھو کہ چار ہی دن میں
ہم ایسے رند بھی پینا بنا کے پیتے تھے

الغرض زندگی کے وہ خوبصورت دن تھے جو حضرت الاستاذ کی صحبت مبارکہ میں گزرے۔جامعہ میں ہم نے حضرت سے شرح ابن عقیل، تعلیم المتعلم اور آخری دس پاروں کا ترجمہ پڑھا۔حضرتؒ کا انداز تدریس دل موہ لینے والا تھا، آواز قدرے پست تھی، اس لئے درسگاہ کا پنکھا بند فرمادیتے تھے، ہم شہریوں کے لئے بڑا مجاہدہ ہوتا تھا۔آپ کا دور نظامت بھی جامعہ کے سنہری ادوار میں شمار ہوتا ہے۔آپ کے دور میں انتظامی اعتبار سے جامعہ بامِ عروج پر پہنچا، طلبہ کی بھرپور نگرانی فرماتے اور طلبہ کے فائدے کے اتنے سخت حریص تھے کہ ہر وقت اس کی کڑھن رہتی۔ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت الاستاذ نے ان انتظامی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو کھپا کر رکھ دیا تھا۔اپنے آرام وراحت کی پروا کیے بغیر ہر وقت یہی دھن سوار رہتی کہ کام میں کوئی کمی نہ رہے اور انتظامی حوالے سے طلبہ کا حرج نہ ہو۔

حضرت الاستاذ کی سزا، ناراضگی اور طلبہ کی گرفت بھی حدود شریعت کے اندر ہوتی، ہم نے اس حوالے سے کبھی آپ کو آپے سے باہر آتے نہیں دیکھا کہ شریعت کے حدود سے کوئی امر متصادم ہو۔آپ کی ناراضگی بھی شفقت کا ایک پہلو لیے ہوتی کہ طلبہ میں اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کا احساس پیدا ہو۔

حضرت الاستاذؒ نے شفقت فرماتے ہوئے ہمیں دلائل الخیرات اور حزب البحر کی اجازت اپنے دو شیوخ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا فضل محمد سواتیؒ سے عنایت فرمائی، پڑھنے کا طریقہ بھی خود بتلاتے تھے بلکہ ایک ہفتہ خود پڑھواتے تھے اور تصحیح بھی کراتے تھے۔

حضرت الاستاذؒ پر تواضع کا حد درجہ غلبہ تھا، اپنے آپ کو بالکل مٹا کر رکھا، ایک دفعہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، درسگاہ میں آپ کو دورانِ درس ایک عبارت میں اشکال پیش آیا، سیدھے درسگاہ سے اٹھے اور متصل درسگاہ میں مفتی ولی حسن ٹونکی صاحبؒ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے استفسار فرمایا کہ حضرت! اس مقام کی تقریر فرمادیں، یہ حل نہیں ہو رہا، ہم سن رہے تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس مقام کو حل کر کے دیا۔ آپ واپس درسگاہ تشریف لائے اور مفتی صاحب کا بتلایا ہوا طلبہ کو پڑھا دیا۔ آج کل ہماری طرح کا کوئی مدرس ہوتا تو پتہ نہیں لاکھ جتن کر کے کسی طرح الٹا سیدھا طلبہ کو مطمئن کر دیتا لیکن دورانِ درس ہی جا کر کسی سے پوچھنا اپنی سبکی محسوس کرتا۔ چونکہ یہ حضرات اپنے آپ کو پوری طرح فنا کیے ہوئے تھے اس لئے ان کے سامنے یہ باتیں کچھ اہمیت نہ رکھتی تھیں۔

آپ کو جامعہ بنوری ٹاؤن کی ایک ایک چیز اور نسبت سے عشق تھا۔ میرے بھائی قاری عبداللہ شاہ صاحب زمانہ طالب علمی میں کبھی کبھار جامعہ کی مسجد میں امامت کرواتے تھے۔ جب استاذ صاحب نے جامعہ یوسفیہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنا چاہا تو صرف اسی نسبت کی خاطر میرے بھائی کے ہاتھ افتتاح کیا حالانکہ وہ عمر میں بہت چھوٹے اور حضرت کے شاگرد تھے۔

حضرت الاستاذ کا ایک وصف اخفا تھا، آپ اپنے کمالات کو چھپاتے تھے، کئی مواقع پر میں نے خود ہی مشاہدہ کیا کہ کوئی کارنامہ سرانجام پا گیا، اس وقت اصل محنت اور منصوبہ بندی آپ کی ہوتی تھی، لیکن منظرنامے پر نام کسی اور کا چل رہا ہوتا تھا اور آپ بالکل سامنے آنے سے اپنے آپ کو بچا لیتے، حالانکہ وہ شہرت و نمود کا بہترین ذریعہ بن سکتا۔ لیکن جو لوگ شہرت و نمود کو لاتیں مار مار کر دور پھینکتے ہوں وہ کیوں کر ان باتوں کو توجہ دے سکتے ہیں؟

ہم نے حضرت الاستاذ کو زندگی بھر اتباع سنت کا مرقع پایا، آپ کی سب سے بڑی کرامت میری نظر میں "اتباع سنت" ہے، یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آپ کو خلاف سنت کوئی کام کرتے دیکھا ہو، نشست و برخاست، خورد و نوش، عبادات و معاملات اور معاشرتی و سماجی رویوں میں ہر ہر امر کے اندر اتباع سنت کا اہتمام کرتے اور سنت کا نور آپ کے چہرہ سے چھلکتا نظر آتا۔

حضرت الاستاذ کا ایک وصف یہ بھی مشاہدہ کیا کہ آپ کے اردگرد ہر طرح کے لوگ جمع رہتے۔ اور ہر ایک یہ سمجھتا کہ سب سے زیادہ تعلق میرے ساتھ ہے۔ علماء بھی حاضر مجلس ہوتے، خوانین اور قبائلی زعماء بھی حاضر ہوتے۔ حکومتی آفیسرز بھی مختلف مسائل میں رجوع کرتے، عام عوام بھی، حتی کہ مزدور، دکان دار، ڈرائیور اور عام پیشوں سے وابستہ ان پڑھ افراد بھی کثرت سے آپ کے ہاں بیٹھے رہتے! آپ ہر ایک سے اُس کے مزاج اور مرتبہ کے مطابق برتاؤ کرتے، عوام اُنہیں اپنا حقیقی مقتدا اور محبوب سمجھتے اور آپ کی تنوع پر ہم حیران رہ جاتے کہ کس طرح ہر ایک سے

اُسکی طبیعت کے موافق معاملہ فرماتے ہیں۔ سچ ہے

کہ ایں سعادت بزور بازو نیست

ایک ایسا واقعہ جو آج نہیں بھولتا، وہ حضرت پر ایک قاتلانہ حملہ تھا جس میں ہم بھی اتفاق سے ساتھ تھے۔ یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے، غالباً ۱۹۸۰ء کا رمضان تھا، جمعہ کے دن ہم چند ساتھی صبح نو بجے سے حضرت الاستاذ کے ساتھ نماز جمعہ پڑھنے ہنگو شہر گئے، استاذ صاحب کا معمول تھا کہ جمعہ کے دن قبل زوال مسجد تشریف لے جانے کی کوشش فرماتے، ہم جیسے ہی چشمہ مسجد کے قریب پہنچے، جہاں اہل سنت کی آبادی نیچے اور پہاڑی کی طرف اونچائی پر اہل تشیع کی آبادی ہے تو اوپر سے حضرت پر مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی، ہم جلدی میں تتر بتر ہو گئے، میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اہل تشیع کے مورچوں سے اس زور سے گولیاں برس رہی تھیں کہ اللہ کی پناہ! حضرت الاستاذ اور دیگر احباب بھی مجھ سے قدرے دور ایک اوٹ میں چلے گئے، چونکہ میں ان سے جدا ہو گیا تھا اس لئے میں دیکھ رہا تھا کہ سامنے حضرت بہت ہی پریشان اور بے چین ہے اور بے قراری سے میری طرف دیکھ رہے ہیں کہ کہیں مجھے گولی نہ لگ جائے، اس دوران سنیوں کی مساجد میں اعلانات شروع ہو گئے کہ اہل تشیع نے اہل سنت کی آبادیوں پر حملہ کر دیا ہے لہٰذا فوراً مسلح ہو کر نکلیں، ہم نے دیکھا کہ لوگ چاروں طرف سے مسلح ہو کر نکلنے لگے اور ادھر سے بھی فائرنگ شروع ہوگئی۔ جوابی کارروائی پر جب اوپر سے کچھ فائرنگ تھمی تو ہم جلدی جلدی مسجد چلے گئے۔ جمعہ کی نماز بھی اسی فائرنگ میں پڑھی اور بچ بچا کر کسی طرح ''وام'' واپس آ گئے۔ یہی حملہ ۱۹۸۰ء کے شیعہ سنی فسادات کی ایک کڑی تھی۔ جس میں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ اس قاتلانہ حملے میں اللہ تعالی نے حضرت اور ہم سب کو اپنے خاص فضل وکرم سے محفوظ رکھا۔

حضرت الاستاذ کی ایک ایک ادا پر لکھا جائے تو دفتر بھر جائیں۔ بہرحال یہ چند یادیں عجلت میں پیش کر دیں۔ برادرم مولانا محمد یوسف اور عزیزم مولانا محمد طفیل سلمہما بندہ کے ہاں تشریف لائے اور حضرت الاستاذ سے متعلق تاثرات اور کچھ حالات لکھنے کا کہا۔ ہماری طرف سے سہ ماہی المظاہر کے احباب خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے حضرت کے حالات وآثار کو مرتب کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ یہ ہم سب پر ایک فرض تھا، جسے ادا کرنے میں ان احباب نے پہل کی۔ اللہ رب العزت ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ حضرت الاستاذ کی مقبولیت میں تو ذرا برابر شک نہیں، اور اللہ کے مقبول بندوں کے تذکرے اپنے ایمانی کیفیات واحوال میں ترقی کا سبب ہوتے ہیں، نیز یہ مقبولیت عند اللہ بہترین ذریعہ بنتے ہیں، حضرت الاستاذ کے علمی وعملی کمالات کو سامنے لانا ان شاء اللہ ان سب احباب کی قبولیت کا سبب بنے گا۔ اللہ رب العزت ہمیں حضرت کے فیوض وبرکات سے محروم نہ فرمائیں۔ اور

حضرت کے علمی وعملی مشن کو جاری رکھنے کی توفیق بخشے۔آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ایک علم پرور شخصیت

مولانا عبدالقیوم حقانی،نوشہرہ

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوۃ والسلام علی خاتم الرسالۃ

سب سے پہلی ملاقات کا تأثر:

محقق الکبیر حضرت مولانا محمد امین شہید سے میری سب سے پہلی ملاقات مادر علمی جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں ہوئی تھی۔موصوف شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے،میں نے حضرتؒ سے ملاقات میں ان کی رہنمائی کی تھی،اب نہ تو ملاقات کی غرض یاد ہے نہ اس وقت کی گفتگو،تاہم یہ منظر اب بھی سامنے ہے کہ محدث جلیل شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ نے ان کا بے حد اکرام کیا تھا۔حضرت الشیخؒ کی اداؤں سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت انہیں دل وجان سے چاہتے ہیں اوران سے بہت قریبی تعلق خاطر ہے۔

سراپا:

حضرت مولانا محمد امین صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات اور دید وشنید تھی،چہرہ نور علم سے منور تھا،معصومیت جھلکتی تھی،زیادہ تر خاموش رہتے،مگر دانائی کا ترشح واضح تھا،انداز گفتگو اور طرز نشست وحسن ساعت بڑا باوقار تھا،بدن بھر پور اور قامت کشیدہ تھی،آنکھوں میں محبت،شفقت اور انسیت کا نور تھا،اداؤں سے شرافت،سادگی اور بے تکلفی ٹپکتی تھی،پیشانی پر فکر وتدبر کی سلوٹیں،ہر ادا بلکہ انگ انگ میں خاکساری،تواضع اور بے نفسی کا رنگ غالب تھا،ہمہ وقت ہمہ دم ہونٹوں پر تبسم اور مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوا کرتی تھی۔

عزم وہمت اور استقامت:

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ سے ان کی یہ ملاقات ایسے وقت ہوئی جب ملکی حالات ناگفتہ بہ تھے، دینی اور مذہبی سیاسی قوتوں کے باہمی اتحاد کے عدم ٹھہراؤ اور سیاسی قوتیں انتشار کا شکار تھیں، نفاذ شریعت کی تحریک عروج پر تھی، دینی قوتوں کے باہمی اتحاد کے عدم ٹھہراؤ اور سیاسی انتشار کے اس عہد پریشان میں حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کی گفتگو، لب ولہجہ اور انداز تکلم بڑا مصلحانہ اور مفکرانہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ دینی قوتوں کے قائدین اور کارکن آشفتہ سے محسوس ہوتے تھے، مگر حضرت مرحوم میں سمندر کی گہرائی اور صحراء کا سکون چھلک رہا تھا۔ ملک میں اس کے بعد دینی اور مذہبی حوالے سے آشفتگی کے کئی دور آئے جس میں بڑے بڑے لوگ تحیر کا شکار نظر آئے، مگر مولانا محمد امین مرحوم بڑے مطمئن، اپنے کاز اور مشن کے حوالے سے کام میں لگے ہوئے پریشان خاطری سے دور اپنے اہداف کے حصول میں مگن رہے ان کے ہاں پریشان خاطری کا کوئی مرحلہ نہیں تھا۔

ایک تجربہ اور مشاہدہ:

ہم نے دیکھا کہ نازک حالات، کٹھن مراحل اور جان لیوا امتحانات کے وقت انسان کی بہادری، فطری نہاد، صبر وتحمل، عظمت فکری رفعت، حاضر دماغی اور بیدار مغزی آشکارا ہوتی ہے، فکر وتدبر سے عاری، حوصلہ مندی اور جرأت سے تہی دامن سطحی سوچ رکھنے والا انسان فکری بلندی اور بلند حوصلے سے تہی دامن ہوتا ہے۔ کٹھن مراحل، جان لیوا امتحانات اور صبر آزما آزمائشوں میں ایسے لوگ بسا اوقات عقل وخرد سے تہی دامن ہوجاتے اور حواس کھو بیٹھتے ہیں، پھر وہ درپیش ابتلاء وآزمائش اور زندگی کے نازک ترین موڑ اور حساس مرحلے سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی کارآمد تدبیر پر قادر نہیں ہوتے۔ مگر حضرت پہلے گروہ کے طبقہ اول میں سرفہرست تھے۔

بلند حوصلگی اور آہنی عزائم:

حضرت جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں استاذ تھے، انہیں اپنے حضرت بنوریؒ کی خصوصی توجہ اور اعتماد حاصل تھا، جب نثر الازہار علی معانی الآثار لکھنا شروع کی اور جب چھپ کر منظر عام پر آئی تو اہل علم عش عش کر اٹھے۔

مولانا نے مدرسہ یوسفیہ کے نام سے شاہو وام ضلع ہنگو میں اپنا ادارہ قائم کیا تو قلیل ترین مدت میں اسے مرکزیت اور محبوبیت حاصل ہوئی۔ بہرحال انہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اور جس راستے پر بھی چلے انہیں بے پناہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جملہ امور میں ان کی بے حساب کامیابیوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ، ان کا خلوص وللہیت، عبدیت وانابت، نیکی وسادگی، عاجزی وانکساری، تواضع وبے لوثی، تقویٰ، دیانت داری، خوش

اوقاتی، جذبہ احتساب، شب بیداری، ذوق مطالعہ اور جذبۂ فروغ علم اور عمدہ ذوق علم اور اپنے قائم فرمودہ ادارے، اساتذہ وطلبہ کی خدمت کو وسیلۂ نجات سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک یہ عظیم ترین وصف تھا کہ ان کا ضمیر مطمئن، ان کا باطن اُجلا اور ان کے اندر کا انسان بڑا حوصلہ مند اور غیر معمولی معنوی طاقتور یعنی روحانی قوتوں، مستحکم عزائم اور آہنی ارادوں کا حامل تھا۔

اخلاص کی عظمتیں:

مولانا محمد امین شہیدؒ سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ چند لمحات میں حاضرین وسامعین کے دلوں میں اپنی سیرت کی نیکی اور پاکیزگی، اخلاق کی طہارت اور شرافت کی جوت جگا کر محبین کو رخصت کرتے یا خود ان سے رخصت لے لیتے۔ وہ ملنے والوں کے درمیان آکر بیٹھتے تو ان کے خوبصورت چہرے سے عیاں ہوتا کہ لوگوں کی دل آزاری اور ایذارسانی کیا بلکہ ان کے دل شکنی کا وسوسہ بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوتا ہوگا۔ ان کے نورانی چہرے سے علم وفضل ظاہر ہوتا رہتا تھا، انہوں نے دنیا کے سالکین طریقت کی طرح باہمہ و بے ہمہ کا مسلک اختیار کر کے پوری زندگی گزار دی، احقر نے ان سے بارہا ملاقات میں ان کا یہ وصف محسوس کیا کہ وہ اپنے نفس کو دبا کر بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کو آرام پہنچانے ہی میں راحت ومسرت محسوس کرتے تھے۔

علمی کمالات:

تفسیر، حدیث اور متداول علوم میں ان کی استعداد پختہ تھی تاہم فقہ حنفی پر کامل دستگاہ تھی فقہ حنفی پر ایسی گہری نظر رکھنے والے ہر دور میں خال خال نظر آتے ہیں۔ حضرت کو تصنیف وتالیف کا بھی فطری اور خاص ذوق تھا جو ان کے رشحاتِ قلم سے چھلکتا ہے۔ ان کے تحریروں میں اپنے شیخ کے تحقیقی اسلوب کا پرتو اور اسی طرز کی عالمانہ، فقیہانہ، محدثانہ اور حکیمانہ تشریح وتعبیر نظر آتی ہیں۔ علمی کمالات بھی انہیں حاصل تھے، علاوہ ازیں حسنِ اخلاق میں بھی ممتاز تھے۔ موصوف اسلام کے فروغ وحمایت اور بدعات وخرافات اور فسق وفجور کے خلاف ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔

رواداری:

مولانا محمد امین شہیدؒ اپنے اکابر کی طرح ہمیشہ دیوبند کے طرزِ فکر سے پورے وابستہ اور حنفی مذہب پر شدت سے قائم رہے، تاہم ان کی طبیعت میں اعتدال اور میانہ روی تھی، فروعی مسائل میں رواداری برتتے تھے۔ فقہی مسائل میں غلو، اختلافات اور معرکہ آرائی کی ہمیشہ بھرپور مذمت کرتے تھے، انہوں نے ہمیشہ فروعی اختلافات کو حق وباطل کا معیار قرار دینے کے بجائے اولی وغیر اولی پر حمل کیا۔

درس وتدریس اور طلبہ سے محبت:

مولانا محمد امین شہیدؒ کو کلام مجید اور حدیث نبوی کا درس دینے میں خاص لذت ملتی، تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں کے ساتھ حدیث کے رموز ونکات مزے لے لے کر بیان کرتے، وہ جہاں اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، ان کی خاطر بعض حالات میں ارباب حل وعقد سے اختلاف کرتے، چاہے وہ ان کے عزیز دوست، احباب اور اپنی اولاد کیوں نہ ہوتی۔ ان کے مجالس، ارشادات اور درسی افادات سے سامعین اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے۔

علم پرور شخصیت:

ان کی علم پرور شخصیت کی وجہ سے ان کا قائم فرمودہ ادارہ بھی بیت الحکمت اور خالص علمی وروحانی تربیت گاہ بن گیا تھا۔ ان کا علمی مطالعہ بہت وسیع تھا، جو کچھ پڑھا تھا مستحضر رہتا۔ وہ علمی مشورے بچھا ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں۔ وہ علمی کاوشوں کے لئے جس طرح اُکساتے، خفتہ علمی جذبات کو جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے وہ حاضرین وسامعین اور مستفیدین کے لئے بڑی دولت بن جاتی۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے بصیرت کا درس لیا جاسکتا تھا، بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی سکت اور صلاحیت بھی ہو، مجھے ان کے دل کی کسک اور درد کا وہ منظر آج بھی یاد آرہا ہے جب وہ دارالعلوم حقانیہ سے واپس جانے لگے تو سامنے چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ اس ادارہ کی تعلیمی روایات میں گلاب ہی کی طرح شادابی اور رنگینی قائم ہے، کیا وہ آئندہ بھی باقی رہے گی، مگر وہ اس مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگے اور فرمایا:

''بنیاد اخلاص پر ہے یہ دارالعلوم دیوبند کی طرح ہمیشہ ضیاء بار رہے گا''۔

آخر میں انہوں نے مجھے بشارت دی کہ ہم لوگوں کو پرامید رہنا چاہیے: ''اس علمی مرکز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی ہمیشہ برستی رہے گی''۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

مفتی صادق حسین الحسینی ٹل

والد گرامی حضرت مولانا احمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (خلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ وفاضل دارالعلوم دیوبند) کی نسبتوں کی برکت ہے کہ اپنے علاقہ کے تمام اکابر اہل علم کا اس فقیر سے انتہائی محبت و شفقت کا برتاؤ رہا ہے۔ خصوصاً مادر علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اساتذۂ کرام اور سیدی مولانا معز الحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (شیخ الحدیث دارالعلوم ٹل تلمیذ حضرت مدنیؒ) کی شفقتیں تو بے حد وحساب تھیں۔ جامعہ کے اساتذۂ کرام میں حضرت اقدس مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بندہ کی کافی یادیں وابستہ ہیں۔ حضرت کے علمی وروحانی مقام کا ایک زمانہ معترف ہے۔ آپ کے سوچ کی بلندی، پاکیزگی، خدا خوفی، عاجزی اور علمی پختگی سب ہی صفات مثالی تھیں۔

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ میرے دادا مولانا یاسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم ٹل میں ۱۹۵۷ء، ۱۹۵۸ء میں داخل ہوئے، اس وقت والد گرامی مدرسہ کے مہتمم تھے۔ حضرت نے والد صاحب سے مختلف حیثیتوں سے استفادہ کیا تھا، اس کا دوبار باذکر بھی فرماتے اور میرے ساتھ مشفقانہ و برادرانہ مراسم کی ایک بڑی وجہ حضرت والد صاحب کی نسبت ہی تھی۔

آپ کی سب سے پہلی زیارت جامعہ بنوری ٹاؤن میں ہوئی، جب ہمارے زمانہ طالب علمی میں آپ کراچی کے اہل علم اور احباب سے ملاقات کرنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے ساتھ آپ کا بڑا

قریبی دوستانہ اور گہرا تعلق تھا۔ میں جب بھی چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو مولانا مختار شہیدؒ مجھے حضرت کے لئے ضرور کچھ ہدیے، مٹھائی اور کپڑے وغیرہ دیتے، ساتھ کوئی خط وغیرہ بھی لکھ دیتے کہ حضرت تک پہنچائیں۔ حضرت ہمیشہ یہ ہدایا بڑی محبت وتواضع سے قبول کرتے، جب میری واپسی ہوتی تو تاکید فرماتے کہ مل کر جانا ہے۔ واپسی پر مولانا حبیب اللہ صاحب کے لئے شہد، دیسی گھی وغیرہ بھیجتے۔ ایک بار مجھے پنیر دیا کہ یہ مولانا کے لئے لے کر جانا ہے، چونکہ پنیر جلدی خراب ہوجاتا ہے، اس لئے مجھے اپنے ایک عزیز نے مشورہ دیا کہ اسے حفاظت سے کراچی لے جانے کے واسطے آپ کولر خرید لیں، میں نے کولر خرید کر اس میں وہ پنیر کراچی پہنچایا جو بحمد اللہ خراب نہیں ہوا۔ ان دونوں حضرات کا یہ ہمیشہ معمول تھا، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کے درمیان گہری دوستی اور برادرانہ تعلقات ہیں۔

پھر ایک بار مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ کے دور اہتمام میں انتظامی حوالے سے کچھ ایسے مسائل پیش آئے تھے جو میرے لئے پریشان کن تھے۔ میں نے مولانا محمد امین صاحبؒ سے ان کا بالتفصیل ذکر کیا، آپ نے فی الفور مولانا حبیب اللہ صاحبؒ کو دو صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا، میں وہ خط تو نہ پڑھ سکا لیکن آپ نے زبانی ارشاد فرمایا کہ میں نے اس حوالے سے تفصیلی ہدایات وتجاویز دی ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ خیر ہوجائے گی۔

میرے درجہ رابعہ کا سال تھا۔ حضرت مولانا جامعہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا حبیب اللہ صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت مہمان خانے میں قیام پذیر ہیں، خدمت آپ کے سپرد ہے، رات کو آپ حضرت کے ساتھ ہی قیام کریں گے، تاکہ اگر پانی وغیرہ کی ضرورت ہو تو خادم ساتھ موجود ہو۔ میں نے مولانا حبیب اللہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! مجھے مولانا صاحب ساتھ کہاں چھوڑیں گے؟ فرمایا! ان سے بات ہوئی ہے۔ بس آپ اپنی خدمت سنبھالیں۔

بہر حال یہ میری خوش قسمتی کی انتہا تھی کہ حضرت مولانا کی خدمت کے لئے میرا انتخاب ہوا۔ رات کو حضرت نماز، کھانے اور معمولات سے فارغ ہوئے تو کچھ دیر مجھ سے حال احوال پوچھتے رہے، کچھ علاقہ کی صورت حال بھی بتلائی پھر فرمایا کہ سوجاتے ہیں۔ گرمی بڑی سخت تھی، پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ مجھے ایک تو گرمی کے باعث نیند نہیں آرہی تھی اور دوسرا جگہ بھی تبدیل تھی۔ اس لئے آنکھیں بند کرکے کروٹیں بدلتا رہا، کچھ دیر بعد حضرتؒ خاموشی سے اٹھے، میری طرف دیکھا تو اندھیرے میں کن انکھیوں سے دیکھ کر میں نے فوراً آنکھیں بند کرکے یہی تاثر دیا جیسے میں گہری نیند سو رہا ہوں۔ آپ نے آہستہ سے جاکر وضو کیا اور میرے سرہانے کچھ آگے مصلیٰ پر نفلوں کی نیت باندھ لی۔ نفلوں کے بعد دھیمے آواز سے ضرب کے ساتھ ذکر بالجہر شروع فرمایا۔ آواز ایسی دھیمی تھی کہ پنکھے کے شور

میں سوئے ہوئے کے جاگنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چونکہ میں پوری طرح بیدار تھا اس لئے مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی پانچ منٹ اسی طرح ذکر جاری ہوگا کہ اچانک رفتہ رفتہ ساتھ اور آوازیں بھی آنا شروع ہوگئیں اور ''ہمس'' کی کیفیت میں ہر طرف سے لا الہ الا اللہ کی آوازیں (جیسے زور کے سانس سے بولا جاتا ہو) بلند ہوئیں۔ مجھ پر تو ایسی ہیبت اور خوف طاری ہوا کہ دل بیٹھنے لگا، ڈر کے مارے بدن پر کپکپی طاری ہوئی اور پسینے چھوٹنے لگے۔ اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔ میں کوئی آدھا گھنٹہ، پینتالیس منٹ تو اس سارے منظر اور کیفیت کو بمشکل برداشت کرتا رہا، لیکن خوف اور دہشت کے مارے منہ سے چیخ کے ساتھ ''اونہہ'' کی آواز نکل گئی۔ میرے منہ سے چیخ نکلی تھی کہ یکلخت ساری آوازیں بند ہوگئیں۔ حضرت نے منہ پھیر کر پیچھے دیکھا، میں آنکھیں بند کرکے پسینے میں شرابور لیٹا ہوا تھا۔ آپ بھی آہستہ سے اٹھ کر بستر پر چلے گئے۔ صبح میں نے مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ سے اس کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا: کہ برخوردار! یہ باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں لیکن یہ کسی کو بتائیں نہیں، یہ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔ پھر دو تین راتیں میں مسلسل حضرت مولانا کی خدمت میں رہا اور ہر رات بندہ اسی ارادے سے جاگتا کہ حضرت کے معمولات کا مشاہدہ کرے۔ باقی راتوں میں حضرت کا معمول یہ دیکھا، کہ ہم سو جاتے تو آدھا پون گھنٹہ بعد آپ اٹھ کر وضو بنا کر مصلیٰ پر کھڑے ہو جاتے، طویل نماز اور اس کے بعد ذکر کرتے، پھر گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد بستر پر آجاتے تقریباً آدھا گھنٹے کی مقدار لیٹے رہتے، پھر اٹھ جاتے، وضو بناتے اور نماز و ذکر کا سلسلہ جاری رکھتے۔ یہی معمول آپ کا فجر کی نماز تک رہتا۔ بندہ حضرت کے سفر کی راتوں میں اس کا مشاہد ہے، نہ معلوم حضر میں عبادت کی کیفیت کیا ہوگی۔ لیکن یہ عقدہ مجھ پر آج تک نہ کھل سکا کہ یہ سوتے کب تھے؟ آرام کا وقت کون سا تھا؟ کیونکہ دن بھر تو مصروف رہتے، ملاقاتیں رہتیں، ادھر ادھر آنا جانا رہتا۔ لیکن یہ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص اولیا کے لئے بہت سی چیزیں مسخر بنا دیتے ہیں، اور وہ ان کو مغلوب کرنے کی بجائے خود ان کی خادم اور تابع بن جاتی ہیں۔ ان میں ایک ''نیند'' بھی ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے لئے اللہ تعالیٰ نے نیند کو مسخر فرمایا تھا۔ سونا اور جاگنا ان کے ہاں اختیاری تھا۔ جتنا چاہتے جاگ لیتے اور اگر دس منٹ کی نیند لینا چاہیں تو لے کر بغیر کسی کے جگانے از خود اٹھ جاتے۔ حضرت کے لئے بھی شاید اللہ تعالیٰ نے نیند کو مسخر فرما دیا تھا۔ کیونکہ بندہ کے مشاہدہ کے مطابق تو یہ بہت کم اور حیرت انگیز قسم کی نیند تھی۔

حضرت جب بھی کراچی تشریف لائے، میرے ساتھ شفقت کا معاملہ یہ تھا کہ جہاں کہیں بھی ہوں مجھے مطلع فرما دیتے، اگر میرے پاس تعلیمی اوقات سے کوئی وقت محفوظ رہتا تو میں ضرور حاضر خدمت ہوتا۔ ایسے کئی مواقع آئے جب جامعہ میں میرے نام ایک رقعہ چھوڑ دیتے۔ آپ کا یہ معاملہ ایک ایسے شخص کے ساتھ تھا جو آپ کے شاگردوں کا

شاگرد تھا۔ اس سے قارئین بخوبی اندازہ لگالیں کہ اپنے تلامذہ، معاصرین اور پھر اپنے اکابرین سے ان کا کیسا معاملہ رہا ہوگا۔ ایک رقعہ پر لکھتے ہیں:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ۔ بغرض ملاقات چندمنٹ کے لئے حاضر ہوئے ہیں، پھر حکیم عطاء اللہ صاحب کے ہاں جانا ہے، اگر ممکن ہو تو تشریف لے آئیں۔ والسلام۔ محمد امین عفا اللہ عنہ''

اس طرح کے مختصر والا نامہ میرے لئے باعث صد عز وافتخار ہوتے، کیونکہ حضرت کے اعتماد سے حوصلہ میسر آتا اور صحبت کی برکات اس پر مستزاد تھیں۔ حضرت جب بھی تشریف لاتے تو نارتھ ناظم آباد میں مقیم ایک شخصیت حضرت مولانا محمد اسحاق سندھیلوئیؒ کی خدمت میں ضرور تشریف لے جاتے۔ بندہ بھی کئی بار حضرت کے ساتھ حاضر ہوا۔ حضرت ان کے بڑے ہی قدردان تھے اور ان کے فکر وتحقیق کے مداح بھی تھے۔

حضرت کا ایک نمایاں وصف ''اصاغر نوازی'' تھا۔ آپ اپنے چھوٹوں کو اپنے رویے سے اس مقام پر فائز کر دیتے کہ بسا اوقات یہ شبہ ہوتا کہ وہ آپ سے بڑے یا کم از کم آپ کے معاصرین ہیں اور یہ معاملہ محض سامنے یا مجلس کی حد تک نہ تھا بلکہ تمام معاملات میں ان کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اب حضرت کی نسبت ہمارا کیا مرتبہ ہوگا، لیکن آپ کی اصاغر نوازی تھی کہ بعض اوقات اپنے متعلقین کو بندہ کی طرف رجوع کرنے کا کہتے بلکہ خود ہی ان کی سفارش بھی فرماتے۔ بندہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''برادر مکرم جناب مولانا مفتی صادق حسین صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

خداوند متعال سے التجا ہے کہ جانبین کی خیریت وعافیت کو دوام حاصل ہو، حامل مکتوب ہمارے کرم فرما علاقہ کی معروف شخصیت مشہور بہ ''بزرگ استاذ'' نزیل دربند ہنگو ہیں۔ آنجناب سے استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خود انتہائی عابد اور ریاض ہیں، مگر مشہور ہے کہ حکیم اپنا علاج خود بخوبی نہیں کرسکتا۔ امید ہے کہ آنجناب ان کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں گے۔''

اس کے ساتھ یہ بھی فکر رہتی کہ ہماری تربیت میں بھی کوئی کسر نہ رہے۔ اس کا ایک عمدہ طریق یہ اختیار فرماتے کہ اپنے متعلقین اور احباب کو وقتاً فوقتاً اولیاء اللہ کی زیارت وملاقات اور ان سے حصول نیاز کے مواقع بہم پہنچاتے۔ بندہ کے ساتھ بھی شفقت وخیرخواہی کا یہ معاملہ ہمیشہ جاری رہا۔ اس طرح کے ایک بزرگ کی آمد پر بندہ کو آنے کی اطلاع فرمائی۔ نامعلوم بندہ کن وجوہات پر حاضری سے محروم رہا، اس پر ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''چند دن پہلے دیر کی ایک انتہائی بابرکت شخصیت کا ورود ہوا تھا۔ فقیر نے آپ کو اطلاع دی تھی مگر شاید پہنچی نہ

ہو یا اور کوئی مانع پیش آیا ہو، آپ نہ آ سکے، دوبارہ اگر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور وہ تشریف لے آئے تو آپ کو مطلع کروں گا۔ ان سے ملنا ان شاء اللہ تعالیٰ از حد نافع ثابت ہوگا، میری دلی خواہش ہے کہ ہمارے احباب کا حلقہ ان کی برکات سے مستفیض ہو۔''

بندہ پر یہ عنایتیں اور شفقتیں ہمارے دوستوں کے علم میں بھی تھیں، اس لئے اگر دوست کسی معاملہ میں حضرت سے براہِ راست درخواست کرنے سے کتراتے تو مجھے آگے کر دیتے۔ ایک بار حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور مولانا امداد اللہ صاحب مدظلہ حضرات نے اپنے علاقہ ''بابوزئی مردان'' میں جلسہ کروانا تھا۔ ان حضرات نے ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر دامت برکاتہم سمیت کئی حضرات اکابر کو مدعو کیا تھا۔ لیکن حضرت کو دعوت دینے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے۔ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے بندہ کو فون کیا کہ حضرت اور مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہم کی دعوت آپ کے ذمے ہیں اور آپ ہی ان دو حضرات کو لا سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ براہِ راست تلامذہ ہیں، قدیم تعلق ہے، آپ خود کہیں۔ مجھے کیوں بیچ میں ڈالتے ہیں لیکن وہ حضرات ماننے کے لئے تیار نہ تھے اور مجھے مجبور کر دیا۔ بندہ اگلے دن علی الصباح حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے حیرت سے فرمایا کہ مفتی صاحب! آج کچھ بے وقت سے تشریف لائے ہیں، خیریت ہے؟ میں نے ساری صورتحال عرض کر کے جلسہ میں شرکت کی درخواست کی۔ فرمایا کہ خود کیوں دعوت نہ دی؟ میں نے عرض کیا: حضرت! ڈرتے ہیں، اس پر مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں ڈانٹ کا ایک لفظ بولا۔ حضرت نے فرمایا کہ ضرور چلتے لیکن اس تاریخ کو تو ہم نے صندل بابا جی کے ہاں جانا طے کر رکھا ہے۔ میں نے وہیں سے مولانا امداد اللہ صاحب کو فون ملایا کہ استاذ صاحب تو تیار تھے لیکن ان تواریخ میں انہوں نے دیر جانا ہے اور میں نے حضرت کے ہاں سے آپ کو فون کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے ......اور پھر خاموش ہو کر بولے: ''آپ اکیلے ہیں ناں''۔ میں نے کہا: بات کریں، حضرت فون کے اندر سے گھس کر آپ کے پاس نہیں نکل سکتے جو وہاں کانپ رہے ہو۔ بولے: نہیں یہ بتائیں حضرت پاس تو نہیں۔ میں نے کہا: وہ آواز نہیں سن رہے آپ کہیں جو کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تو صندل بابا جی کو بھی بلایا ہے اور وہ بھی ادھر ہی تشریف لا رہے ہیں۔ جب میں نے حضرت کو یہ بتلایا تو فرمایا: اب کوئی عذر نہیں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور چلیں گے۔ یہ بڑا ہی پرکیف منظر تھا۔ تمام اکابر جامعہ اور ہمارے خطے کے اجل علما کا اجتماع تھا اور بڑا ہی مزہ آیا۔ اس واقعہ سے مقصود ایک تو یہ بتلانا تھا کہ حضرت کی بندہ پر خاص شفقت تھی اور بہت ہی رعایت فرماتے تھے۔ دوسرا یہ کہ حضرت کے تلامذہ پر حضرت کی غیر موجودگی میں بھی اتنا رعب ہوتا تھا کہ دیکھنے والے بتا سکتے ہیں۔

ایک بار مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اپنے پورے مردانوی لاؤلشکر کے ساتھ حضرت کے ہاں تشریف لائے۔ میں

ان سب دوستوں کو مزاحاً ''ھتھوڑا گروپ'' کہتا تھا۔ آپس میں ان کا ربط، دوستی، تعلق، بے تکلفی سب دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ کوئی کام بلا مشورہ نہیں کرتے تھے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے ان کا مشورہ ہوتا تھا، ہمارے ہنگو کے ایک بڑے ظریف ساتھی حافظ انوار الاسلام مرحوم مزاحاً ان سب دوستوں کو کہتے کہ بنی اسرائیل کی طرح ہر وقت سر جوڑ کر منصوبہ بندیوں کی تمہیں عادت پڑی ہوئی ہے۔ بہر حال مولانا عطاؤ الرحمن شہیدؒ نے مجھے فون کیا، کہا کہ آپ حضرت استاذ صاحب کے پاس آئیں گے، وہاں سے رات کو آپ کے ہاں ٹل چلیں گے۔ ادھر انہوں نے باہم یہ منصوبہ بنایا کہ صادق حسین کو بلاتے ہیں، چلنا ولنا کچھ نہیں، بس ادھر اسے بھی روک لیں گے۔ میں خدمت کے ضروری انتظام کر کے مدرسہ یوسفیہ شاہو وام ہنگو پہنچا۔ میرا گمان تھا کہ مولانا عطاء الرحمن، مولانا امداد اللہ اور کوئی اکا دکا ساتھی ہوں گے۔ لیکن مولانا پوری فلائنگ کوچ لے کر آئے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے تو میں نے کہا کہ حضرت سے اجازت لیں اور چلیں، فرمایا: کہاں چلیں؟ بس ملاقات ہوگئی ناں۔ میں نے کہا: آپ نے جو رات گزارنے کا کہا تھا۔ مولانا بولے: بس! آواز اونچی نہ کرو، استاذ صاحب سن لیں گے۔ رات کے لئے نہیں چلنا، آپ ادھر ہی رکیں گے۔ اس پر میری اور مولانا کی تکرار اتنی بڑھی کہ آواز اونچی ہوگئی اور استاذ صاحبؒ خاموش ہوگئے۔ فرمایا: بھئی کیا بات ہے؟ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سیدھا استاذ صاحبؒ کے سامنے جو کچھ دور بیٹھے تھے، جا کر کھڑا ہوگیا، اور عرض کیا: حضرت! یہ جو عطاء الرحمن ہے اس نے مجھے فون کیا تھا کہ رات آپ کے ہاں گزاریں گے، میں نے انتظام کر رکھا ہے اور اب یہ چلنے سے انکار کر رہا ہے اور بہانے بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت نے مولانا عطاء الرحمن کی جانب سر نکال کر دیکھا اور کہا: عطاء الرحمانہ پاسہ۔ (عطاء الرحمن اٹھو) مولانا فوراً اپنی جگہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر فرمایا: چلو۔ بس سارے ہی اٹھ کر چل دیئے۔ دوسری بات کہنے یا پوچھنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ اللہ اللہ! حضرت کی کیسی شانِ محبوبیت تھی۔ راستہ میں فرمایا: مفتی صاحب! کیا انتظام کر رکھا ہے آپ کا تو یقیناً شاہانہ کھانا ہوگا، میں تو فقیر آدمی ہوں، میرے ہاں تو دال ساگ ہی ملتا۔ میں نے عرض کیا: حضرت! مجھے تو علم نہ تھا کہ مولانا عطاء الرحمن پوری قوم کو ساتھ لے کر آئیں گے۔ میں نے تو صرف دو دنبے کاٹے ہیں اور ۱۳۰ بٹیر بھونے ہیں اور باقی کچھ ادھر ادھر کی چیزیں لڑکے تیار کر رہے ہوں گے۔ غرض یہ تھی کہ مولانا عطاء الرحمن صاحب سے حضرت نے کہا: ''پاسہ'' (اٹھو) تو ایسے فوراً اٹھ کر چل دیئے کہ دوسری بات کی نوبت نہ آئی۔ اس میں حضرت نے جہاں میری رعایت رکھی اور شفقت کا مظاہرہ فرمایا، وہاں اپنے تلامذہ پر آپ کے رعب، ان کے احترام اور آپ کی محبوبیت کی شان بھی جھلکتی تھی۔ ان بزرگوں کی باہمی محبت اس نفسانفسی کے دور میں ہمارے لئے خلوص وللّٰہیت کی ایک بہترین مثال تھی۔

ایک بار حضرت اور مفتی رضاء الحق مدظلہم تشریف لائے۔ مردان کے مفتی کفایت اللہ اور قاری اسد اللہ بھی ساتھ

تھے۔ مدرسہ کا معائنہ کیا، خوشی کا اظہار فرمایا۔ پھر فرمایا کہ مفتی مختار الدین صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ بندہ بھی ساتھ ہولیا۔ عصر کی نماز کے قریب پہنچے، مفتی صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔ دیوانہ وار ادھر ادھر خوشی سے بھاگ رہے ہیں اور انتظام کر رہے ہیں۔ فوراً دو بکرے کٹوا دیئے اور فرمایا کہ بس آپ عصر کی نماز پڑھیں گے اور کھانا لگ جائے گا اور یہی ہوا، ہم عصر پڑھ کر فارغ ہوئے۔ تو دستر خوان لگنا شروع ہو گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ ہماری آمد پر بکرے کٹے، پھر یہ اتنی جلدی پک کیسے گئے؟ بس وہی بکرے سادہ پکائے تھے اور ساتھ روٹی تھی۔ بے تکلف، سادہ لیکن بڑا ہی پُر کیف منظر تھا۔ ان حضرات کی باہمی محبت، مودت، ایک دوسرے کا احترام ہمارے لئے کئی حوالوں سے باعث رشک تھا۔

حضرت علمی تحریرات اور اکابر کے تراث کے سخت حریص تھے۔ چونکہ علم رگ رگ میں رچا ہوا تھا، اس لئے اگر کوئی اہم علمی تحریر یا کتاب دیکھتے تو مچل جاتے، لیکن اگر کسی علمی تراث کے ضیاع کا سنتے تو قلق و بے چینی دیکھی نہ جاتی۔ ایک بار بندہ حضرت کے ہاں حاضر ہوا، واپسی پر فرمایا کہ میں بھی ساتھ ٹل چلوں گا۔ اس زمانے میں ہنگو سے ٹل ایک بس چلا کرتی تھی۔ ہم اڈے پر اس بس کے منتظر کھڑے تھے۔ جب دور سے وہ بس نظر آئی تو حضرت تقریباً بھاگتے ہوئے سوار ہوئے۔ ہمیں آخری نشست پر جگہ ملی، مجھے سخت شرمساری تھی کہ میرے ساتھ حضرت جا رہے ہیں اور سفر کا کوئی مناسب ذریعہ ہی نہیں۔ ہمارے ہاں بندہ نے حضرت کو والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مختلف پرانی تحریرات اور کتابیں دکھائیں۔ پھر عرض کیا کہ حضرت میری ایک سوتیلی والدہ تھی جس نے حتی المقدور مجھے بہت تنگ کیے رکھا لیکن اس نے ایک سخت تکلیف مجھے یہ پہنچائی کہ والد صاحب کے نام حضرت مدنیؒ کے ۴۰۰ خطوط تھے، جنہیں والد صاحب انتہائی حفاظت سے رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت مدنیؒ نے اپنے دست مبارک سے ایک سند لکھ کر دی تھی۔ یہ دونوں چیزیں انہوں نے میرے ضد میں جلا دی تھیں۔ اس پر حضرت کو جو پریشانی ہوئی وہ مجھ سے بھی نہ دیکھی گئی۔ آپ رو پڑے کہ یہ آپ کی والدہ نے کیا کیا؟ اسے اتنا احساس نہ تھا کہ میں کتنا اہم ذخیرہ نذر آتش کر رہی ہوں۔ غرض دیر تک حسرت و افسوس کا اظہار کرتے رہے۔

ایک بار میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت کتابوں میں کھڑے ہوئے ہیں۔ عرض کیا: حضرت! کیا مسئلہ درپیش ہے جو اتنی کتابیں اکٹھی کی ہیں؟ فرمایا: اس بات کی تلاش ہے کہ گندم میں عشر اولاً تو پودے میں واجب ہوتا ہے پھر جب خوشہ لگتا ہے اور دانے آتے ہیں تو عشر پودے (اصل) سے دانوں (فرع) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن خدانخواستہ اگر کہیں ژالہ باری ہو جائے، خوشے سارے جھڑ جائیں اور محض گندم کے ڈنڈے بچ جائیں، تو کیا عشر واپس پودے (اصل) کو منتقل ہوگا؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! اگر مجھے اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ فرمایا: بالکل! فرمایئے۔ میں نے عرض کیا کہ مبسوط میں اس حوالے سے ایک جزئیہ نظر سے گزرا تھا، آپ

نے غالباً اس وقت تک مبسوط نہ دیکھی تھی۔ فوراً اٹھائی اور متعلقہ جگہ سے حوالہ نکال لیا۔ اس پر بڑے خوش ہوئے، پھر فرمایا: دنیا میں ہر انسان دوسرے کا محتاج ہے اور "فوق کل ذی علم علیم" کے مظاہر آئے روز کھلتے ہیں۔ کبھی کبھار مجلس میں ایک طالب علم ایسے نکتے کی طرف رہنمائی کردیتا ہے جو اپنے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتا۔

حضرت کے ہاں سفارش کی صلائے عام تھی، لوگ مختلف دنیاوی ودینی امور میں سفارش لکھواتے اور آپ بلا تامل لکھ دیتے۔ سفارشی خط میں لکھوانے والے کے ساتھ اپنی نسبت وتعلق کا اظہار بھی کردیتے تاکہ اس کو پوری دلجوئی ہو کہ محض ٹرخایا نہیں۔ لیکن الفاظِ سفارش ایسے اختیار فرماتے کہ سامنے والے کے لئے پوری گنجائش چھوڑتے۔ اسی طرح کے ایک سفارشی مکتوب میں بندہ کے نام لکھتے ہیں:

''حامل مکتوب فقیر کے معتمد مخلصین میں سے ہے، آپ کی خدمت میں کچھ گزارش کرے گا، جناب کے مکارمِ اخلاق سے بطیب قلب سماعت فرما کر بقدر امکان قبول فرمانے کی درخواست ہے۔''

ایک دوسرے سفارشی خط میں لکھتے ہیں:

''حامل رقعہ بزرگوار استاذ حضرت مولانا میاں محمد کریم صاحب سابق مدرس دارالعلوم ٹل کے پوتے ہیں، یہ فقیر اس خاندان کے ہر فرد کا خادم ہے، آنجناب سے اس کے معاملہ پر مشفقانہ توجہ فرمانے کی درخواست ہے۔''

دونوں خطوط کی تعبیر میں جانبین کی رعایت کے پہلو مخفی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو دنیا سے جو بے رغبتی نصیب فرمائی تھی ہم جیسے کوتاہ عمل اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کے سامنے دنیا کے حسن وجمال کا تذکرہ آتا تو اس خوبصورتی سے اسے فکر آخرت سے جوڑ دیتے کہ گفتگو کا رخ دنیا سے آخرت کی طرف مڑ جاتا۔ ایک بار ہم حضرت کے ساتھ آپ کے کسی رشتہ دار کے ہاں تعزیت کے لئے گئے تھے۔ علاقہ بڑا ہی خوبصورت تھا، ہم نے ماحول کے حسن وجمال اور رعنائی پر گفتگو شروع کی اور اس میں کھو گئے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ کوہاٹ میں زمانہ طالبعلمی کے دوران ہم ایک مسجد میں رہتے تھے۔ وہاں امام صاحب کے پاس ایک مجذوب آیا کرتے تھے۔ امام صاحب انہیں چائے پلاتے تھے اور اکرام کرتے تھے۔ ہم سمجھتے کوئی پاگل ہے کیونکہ کپڑے دیوانوں کی طرح پھٹے اور گندے ہوتے تھے۔ ایک دن میں مطالعہ کررہا تھا، وہ صاحب آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ او طالب! کتابوں کے ورق تو الٹتا رہتا ہے کبھی زمین وآسمان کے ورق بھی الٹ لیا کر۔ حضرت نے فرمایا کہ اتنی گہری معرفت کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ پاگل نہیں بلکہ مجذوب ہے۔ پھر فرمایا: مفتی صاحب! کہ یہ ساری کائنات یہ سبزہ، پہاڑ، پانی اور ماحول کی رعنائی زمین وآسمان کے اوراق ہیں، انہیں معرفت خداوندی کی غرض سے پلٹیں تو ان میں گہرے رمز اور انوکھے راز پوشیدہ ہے۔ پھر فرمایا کہ کبھی تشریف

لائیے۔ اس سے بالائی علاقہ اس سے زیادہ خوبصورت ہے وہاں زمین وآسمان کے اوراق پلٹیں گے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! کچھ ان رموز واسرار سے پردہ سرکائیں۔ فرمایا: کسی اور موقعے پر بتاؤں گا۔ غرض گفتگو تخلیق کائنات، اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور مظاہر قدرت کے بیان کی طرف موڑ دیا۔

ایک زمانے میں مجھے تخلیق کائنات اور عالمین کی تشریح میں طرح طرح کے فلسفیانہ اشکالات پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا تو آپ نے کچھ ضروری تفصیل کے بعد ارشاد فرمایا: مفتی صاحب! فلسفہ الٰہیات اور فلسفہ عالم میں کبھی گہرے غور وغوص سے کام نہ لو۔ انسان کی عقل نارسا کی وہاں تک کوئی رسائی ہی نہیں۔ اپنے حد پر پہنچ کر جب یہ تھک جاتا ہے اور حقائق کے پردوں کو کھولنے سے قاصر رہتا ہے تو طرح طرح کے اشکالات وتوہمات کا شکار ہوجاتا ہے، اس طرح لوگ بعض اوقات ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، میں خود اس کوچے سے ہوکر گزرا ہوں۔ ان معاملات میں ''تفویض'' ہی احوط واسہل ہے اور اسی میں تمام تفکرات سے نجات ہے۔

جب ہمارے علاقہ میں حالات بگڑے اور فسادات شروع ہوئے تو میں انتہائی سخت پریشان تھا، آپ تشریف لائے ہوئے تھے۔ فرمایا: طبعی پریشانی پر حرج نہیں لیکن اتنی پریشانی کہ یاس تک پہنچ جائے، مناسب نہیں۔ پھر فرمایا کہ اس کائنات نے ختم ہونا ہے اور قیامت آنی ہے۔ قیامت سے قبل کے آخری حالات کی طرف یہ دنیا تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ جو ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جائے بلکہ شریعت کی رو سے جو ذمہ داری بنتی ہے وہ ضرور ادا کی جائے۔ فرمایا: موجودہ حالات وہ فتن ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا: ''من استشرف لها فقد وقع فيه'' جو ان کی طرف جھانکے گا وہ اس میں مبتلا ہوجائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! پھر تو میں پوری طرح محفوظ ہوں، کیونکہ میں تو مکمل گوشہ نشین ہوں۔ فرمایا: بالکل گوشہ نشین والا مزاج بھی درست نہیں اعتدال ہونا چاہیے۔ حکمت وتدبر سے اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ لوگوں اور معاشرہ سے رابطہ رکھیں اور ان حالات میں ان کی رہنمائی کریں۔

حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہر حوالے سے اہل اللہ کے قافلہ کی یادگار تھے۔ آپ کی شہادت محض ہمارے علاقہ ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے عظیم سانحہ وحادثہ ہے۔ آپ نے ملک وملت کے لئے علمی، روحانی اور سیاسی اعتبار سے جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ تاریخ کا روشن باب ہیں ان شاء اللہ العزیز یہ معاشرہ سالوں تک ان کا اثر محسوس کرے گا اور ان سے رہنمائی حاصل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں آپ کے فیوض وبرکات سے مستفید فرمائے۔ آمین

کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا عبدالصمد سیال، راولپنڈی

شہادت کی موت اللہ کا انعام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بار بار تمنا فرمائی ہے، ہمارے بنوری ٹاؤن کے اکابر کو اللہ تعالیٰ نے وقت موعودہ میں چن چن کر اس انعام سے نوازا ہے۔ پتہ نہیں کس قبولیت کی گھڑی میں ان اکابر نے اس سعادت کی موت کی تمنا کی تھی۔ مولانا حبیب اللہ مختارؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مفتی عبدالسمیعؒ، مولانا نظام الدین شامزئیؒ، مفتی جمیل خانؒ، مولانا محمد امین اورکزئیؒ، مولانا سعید جلال پوریؒ اور پھر مولانا عبدالمجید دین پوریؒ اور مفتی صالح... ان میں سے ہر شخصیت اپنے ذات میں انجمن تھی، سارے حضرات مظلومانہ مارے گئے "مظلوم شہید کا" ظالم قاتل' جنت کی بو بھی نہیں سونگھ سکے گا ان شاء اللہ، الحمدللہ ان حضرات کا خون رنگ لایا اور مزید رنگ لائے گا، دینی کام، مدارس کا استحکام، علم دین کے شوکت وشکوہ کو اللہ تعالیٰ مزید بڑھائے گا۔

برادر مکرم مولانا محمد یوسف مدظلہ اور مولانا محمد طفیل مدظلہ بندہ کے پاس تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے باعث یہ عزت بخشی کہ اُن کے حوالے سے خصوصی اشاعت کے لئے اپنے تاثرات قلم بند کروں۔ حضرت الاستاذ مولانا محمد امین شہیدؒ کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور زندگی دین کے احیاء وتحفظ کی کوششوں سے اتنی بھرپور تھی کہ میرے جیسا طالب علم اُس پر کیا لکھے گا، حضرت کی صحبت مبارکہ میں گزرے ہوئے دنوں کو بھی ۳۷ سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے، اُن کی صحیح تصویر کشی کا حق تو اُس وقت بھی ادا نہ ہو سکتا جب کچھ ذہن

میں تازہ تھا، اب تو حوادث زمانہ کے بوجھ ایسے آپڑے ہیں کہ حسین یادیں مزید بھی دھندلی ہوگئی ہیں، تاہم حضرت کی محبوب شخصیت کی بعض یادیں اور باتیں ایسی ہیں کہ آج بھی ذہن میں تروتازہ ہیں اور اپنے اکابر کی یہی یادیں متاع زندگی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے ہمارا بیڑا بھی پار لگادے تو اُس کے لطف وکرم سے بعید نہیں۔

بندہ جنوری ۱۹۷۹ء میں جامعہ بنوری ٹاؤن درجہ خامسہ کے لئے حاضر ہوا، بحمداللہ اُس وقت پنجاب کے مدارس میں ابتدائی اسباق خصوصاً فنون کی تعلیم عمدہ طریقے سے دی جاتی تھی، طلبہ میں ذوق وشوق بھی کافی تھا اس لئے پنجاب کے طلبہ سے اساتذہ کرام تعلیمی حوالے سے بڑے مطمئن ہوتے تھے، عموماً طلبہ میں یہ مشہور تھا کہ کراچی میں منطق وفلسفہ کا خاص ذوق نہیں ہے، طلبہ دلچسپی نہیں لیتے، اس وجہ سے اساتذۂ کرام کی بھی پوری توجہ نہیں بن پاتی، مجھے درجہ خامسہ میں ''سلم العلوم'' کی بڑی فکر تھی کیونکہ سلم کا شمار فن منطق کی اساسی کتابوں میں ہوتا تھا اور میں منطق بڑے ذوق وشوق سے پڑھ کر آیا تھا، اس لئے خواہش اور تمنا تھی کہ ''سلم'' اچھی طرح پڑھ لوں، نقشے میں سلم العلوم مولانا محمد امین اورکزئی کے نام لکھی ہوئی تھی، طلبہ سے معلوم ہوا کہ حضرت معقولات کے امام ہیں اور بڑے ہی عمدہ انداز سے پڑھاتے ہیں، جب سبق شروع ہوا تو اندازہ ہوا کہ منطق تو یوں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ حضرت کے انداز تدریس کا نقشہ پیش کرسکوں۔ درسگاہ میں آتے ہی بڑے باوقار انداز سے عاجزانہ نشست پر تشریف فرما ہوتے اور دھیمی آواز سے پڑھانا شروع کرتے۔ پڑھاتے کیا تھے، دل میں پیوست کر جاتے۔ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ گھنٹہ کیسے گزرا؟ تسلسل، تسہیل، فن پر عالمانہ گرفت اور متن کے مفاہیم کی ایسی دلکش تفہیم کہ اُس کی سحر آفرینی طالب علم کو اردگرد سے بےخبر کردیتی۔ کہاں سلم العلوم کے خشک منطقی مباحث اور کہاں یہ مدہوشی، بس یہ حضرت ہی کا کمال تھا جو ہمیں اپنے حصار میں بند کردیتے اور ہمیں وقت کا اندازہ ہی نہ ہو پاتا، دل چاہتا کہ حضرت مزید بولیں اور ہم سنیں۔

میرا کراچی کے بارے میں تاثر حضرت کے حلقہ درس سے پوری طرح زائل ہوگیا کہ یہاں منطق پڑھانے اور پڑھنے والے نہیں۔ سارے طلبہ خوب دلچسپی لے کر پڑھتے اور ہمیں حضرت کے سبق کا انتظار رہتا، بعد میں اندازہ ہوا کہ منطق کے ساتھ طلبہ کا عمومی رویہ وہی ہے جو ہم سنتے چلے آئے ہیں، تاہم یہ حضرت کا کمال تھا کہ جو طلبہ منطق سے گھبراتے تھے وہ بھی ذوق سے پڑھتے رہے اور انہیں سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ منطق کے ساتھ میرے ذوق نے مجھے حضرت کے قریب ہونے کا موقع دیا، یہیں سے عقیدت کی ابتدا ہوئی جو بحمداللہ پھر بڑھتی ہی گئی، میں جب بھی حضرت سے فن یا کتاب کے متعلق کوئی سوال پوچھتا تو آپ بہت ہی خوش ہوتے اور انتہائی شفقت سے تسلی بخش جواب عنایت فرماتے، اس کے لئے عموماً بندہ، مولانا ضیاء الدین ژوبی اور مولانا محب اللہ صاحب حضرت کے پاس

کمرے میں حاضر ہوتے۔

حضرت ہمارے زمانے میں جامعہ کے ناظم بھی تھے ،اُس وقت آپ کے متعلقہ کئی ذمہ داریاں تھیں ،اس میں کوئی تقابل یا مبالغہ نہیں کہ جس دن مطعم میں آپ کی نگرانی کی باری ہوتی ،اُس دن بڑا ہی سکون ہوتا کیونکہ آپ کی سنجیدگی ،وقار اور جلال کے باعث کسی قسم کا شور شرابا یا مسئلہ کھڑا ہونا ممکن ہی نہ تھا، عام دنوں میں کچھ نہ کچھ چلتا رہتا کم از کم شور شرابا تو ضرور ہوتا ہمیں تو آپ کی نگرانی کے دن کا انتظار رہتا تمام طلبہ اُس دن بڑے ہی پر سکون انداز سے کھاتے۔

حضرت الاستاذ طلبہ کی اس حوالے سے خوب نگرانی فرماتے ،عصر کے بعد آپ کا معمول تھا کہ کمرے کے سامنے برآمدے میں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور ہر آنے جانے والے طالب علم پر غیر محسوس طریقے سے نگاہ رکھتے۔ شروع شروع دنوں میں نئے طلبہ کو علم نہ ہوتا تھا کہ یہ مولانا محمد امین اورکزئی صاحب ہیں اس لئے نامناسب رویے یا چال پر پکڑے بھی جاتے۔ حضرت کا مزاج یہ تھا کہ مسئلہ کو مقدمہ نہیں بناتے تھے ،فوری فیصلہ کر کے اصلاح فرماتے ۔اگر کسی کے بال خلاف سنت دیکھتے تو وہیں بلا کر اُس وقت کٹوانے کا حکم دیتے ،کسی کی شلوار ٹخنوں سے لٹکتی دیکھتے تو وہیں بلا کر حسب ضرورت تنبیہ فرما دیتے ۔زیادہ اکڑ مزاجوں کے پائنچے قینچی سے بھی کاٹ دیتے ،لیکن اُس وقت طلبہ پر حیا کا غلبہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب میری تربیت و خیر خواہی کے لئے ہو رہا ہے اس لئے نہ ہمیں کبھی حضرت کی تنبیہات اوپری معلوم ہوئیں اور نہ سزا یافتہ طالب علم برا محسوس کرتے۔

عموماً ہوتا یہی ہے کہ نگرانی پر مامور اساتذہ اگر تربیت کے لئے سختی فرماتے ہوں تو اُن کے شفقت کا پہلو پوری طرح عیاں نہیں ہوتا لیکن ہمیں تعجب تھا کہ حضرت الاستاذؒ نے شفقت اور احتساب کو بڑی خوبی سے جمع فرمایا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک طرف تو آپ کا اتنا رعب تھا کہ آپ کے سامنے پر مارنے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی اور دوسری طرف کشش اتنی تھی کہ طلبہ دیوانہ وار آپ کے ارد گرد کھینچے چلے آتے تھے۔

حضرت کی خدمت کی بھی تمنا رہتی تھی لیکن وہ تو خود خادم بن کر رہتے تھے، میں کئی دفعہ خدمت کے ارادے سے کمرے میں حاضر ہوا لیکن خدمت لینے کا مزاج نہ تھا، اس لئے موقع نہیں دیا ،عموماً اپنا کام خود کرتے تھے چند علاقے کے طلبہ ساتھ تھے وہ کبھی کوئی برتن وغیرہ اٹھانے یا دھونے کا کام کر لیتے تھے۔

حضرت کے عصر کے بعد کی مجلس میں طلبہ بھی بیٹھتے تھے، میں بھی آکر بیٹھ جاتا ،طلبہ طرح طرح کے علمی و اصلاحی سوالات کرتے اور حضرت بڑی خوبصورتی اور شفقت سے جواب دیتے۔ حضرت کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے جامعہ کے ماحول میں استاذ اور شاگرد کے حقیقی تعلق کو زندہ کر دیا تھا۔ کراچی میں حضرات اساتذہ کرام عموماً مصروف

رہتے تھے، درسگاہ میں آتے اور پڑھا کر چلے جاتے، مقیم اساتذہ بھی اپنے اور ذاتی مصروفیات کے باعث توجہ نہ دے پاتے، اس وجہ سے یہ ماحول بن گیا تھا کہ استاذ وطالب علم کا رابطہ محض درسگاہ تک رہتا۔ ہم نے حضرت کے ہاں پہلی دفعہ استاذ وطالب علم کے رشتے کو انتہائی مستحکم محسوس کیا، طلبہ ایسے اردگرد رہتے اور اپنی علمی واصلاحی تشنگی بجھاتے جیسے میٹھے کنویں کے منڈیر پر کوئی پیاسا پہنچ جائے۔ اسی قربت کا نتیجہ تھا کہ طلبہ اپنے ذاتی مسائل تک حضرت کو بیان کرتے اوران میں رہنمائی حاصل کرتے، حضرت بھی ہر حوالے سے خبرگیری فرماتے۔ عصر کی مجلس میں عموماً دوطرح کے طلبہ آپ کے پاس آکر بیٹھتے تھے، ایک علمی ذوق وشوق رکھنے والے اور دوسرے تصوف سے دلچسپی رکھنے والے۔ حضرت اس مجلس میں تعلیمی وتربیتی باتیں، مشائخ کے واقعات اور تعلیمی ذوق وشوق بڑھانے والے واقعات بیان فرماتے۔ آپ اکثر یہ شکوہ فرماتے کہ آج کے طلبہ کا اساتذہ کے ساتھ اخذ علم میں وہ مزاج نہیں جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ آزادمزاج طلبہ حضرت سے سخت کتراتے تھے، اور ایسے مہمل لوگوں کی حضرت کے ہاں بھی کوئی چھوٹ نہ تھی، اس لئے وہ جان بچاتے پھرتے۔ بہرحال یہ حضرت کا کارنامہ تھا کہ کراچی کے ماحول میں جہاں استاذ وشاگرد کا باہمی رابطہ ناپید تھا آپ نے علم پروری کی ایسی مثال قائم فرمائی اور طلبہ کو اپنا قیمتی وقت عنایت فرمایا۔

بندہ کو بحمد اللہ حضرت الاستاذؒ سے طبعی انس تھا، اس لئے اپنے ہر کام میں استاذ صاحب سے مشورہ ضرور کرتا۔ جب ۷۹ء میں روسی فوج افغانستان میں داخل ہوئی تو ہمارا دل پڑھنے سے اچاٹ ہوگیا، مولانا ارشاد شہیدؒ اس وقت دورۂ حدیث کے طالب علم تھے، مولانا شہیدؒ، قاری سیف اللہ اختر اور بندہ تینوں پرعزم ہوئے کہ روسی فوج کے خلاف جہاد کے لئے افغانستان جانا ہے۔ ہم روزانہ مدرسہ سے باہر جاکر اس نیت سے ورزش کرتے تھے کہ فلسطین جائیں گے، کشمیر آزاد کرائیں گے، لیکن جب روس نے افغانستان پر حملہ کردیا تو انتہائی بے چین ہوگئے اور پڑھائی وغیرہ چھوڑ کر افغانستان جانے کا عزم کرلیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان میں اس وقت افغان جہاد کا نام تک کسی نے نہیں لیا تھا نہ مدارس میں یہ باتیں ہوا کرتی تھیں نہ ہمیں حالات کا کوئی تفصیلی علم تھا، نہ یہ پتہ تھا کہ جہاد ہوتا کس طرح ہے اور اس کی ضروریات کیا ہیں؟ بس ایک جنونی حالت تھی، اخباروں میں روزانہ روسی مظالم پڑھتے تھے تو مزید خون گرم ہوجاتا۔ بہرحال جب ہم نے پڑھائی چھوڑنے اور جانے کا پختہ عزم کرلیا، تو اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی استاذ یا بڑے سے اس کا تذکرہ کرلیں کہ مبادا کیا جواب ملتا ہے۔ صرف حضرت مولانا امین اورکزئی کی شخصیت ایسی تھی کہ بندہ ان کو بتائے اور ان سے مشورہ کیے بغیر جانا گوارا نہیں کرسکتا تھا، میں نے ظہر کی نماز کے بعد اکیلے کمرے میں حاضرِ خدمت ہوکر ساری صورت حال عرض کردی، مجھے اب بھی یاد ہے کہ میں نے آنکھیں نیچے کر کے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے عرض کیا کہ حضرت روسی فوجی افغانستان میں داخل ہوگئے ہیں اور ہمیں جہاد

پر جاتا ہے۔ حضرت آبدیدہ ہوئے، مجھے کمر پر تھپکی دی اور دو باتوں کی نصیحت کر کے اجازت دے دی۔ ایک یہ کہ جہاد کا کام راز داری کا مقتضی ہے۔ راز داری کا دامن کبھی نہ چھوڑنا اور دوسرا یہ کہ اس راہ کے شدائد ایمان کا اعلیٰ درجہ چاہتے ہیں اس لئے استقامت دکھانا۔ اس کے بعد حوصلہ افزائی کے کلمات ارشاد فرمائے اور رخصت فرمایا۔

جامعہ میں حضرت کے علاوہ میں نے کسی اور سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا، ہم سال کے درمیان میں چلے گئے ،حضرت کا مزاج خالص تعلیمی تھا لیکن پتہ نہیں کہ ہم فقرا میں کیا کچھ مکشوف ہوا جو بشاشت سے اجازت عنایت فرما دی۔ میں خود تو نااہل ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا ارشاد شہیدؒ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سرزمین پاکستان میں افغان جہاد کی نصرت کی بنیاد رکھی اور پھر اللہ تعالی نے ان نہتے نوجوانوں کی برکت سے جہاد کی ایسی شمع روشن کی کہ روس تباہ و برباد اور رسوا و ذلیل ہو کر نکلنے پر مجبور ہوا۔

ہم جنوری ۸۰ء میں افغانستان سے واپس آئے اور پھر چند ماہ بعد ہی حضرت جامعہ سے مستقل اپنے علاقہ منتقل ہو گئے۔ ہم تحریکی سرگرمیوں میں ایسے گھرے کہ باوجود خواہش وتمنا کے ملاقات کا شرف نہ مل سکا۔ بندہ نے آزمائش کی بھٹیوں سے گزرنے کے بعد پنڈی میں ''اقراء روضۃ الاطفال'' کا تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ حضرت الاستاذ پنڈی مولانا قاری یٰسین صاحب کے گھر تشریف لائے تھے تو بندہ بھی بغرض حصول نیاز حاضر ہوا، حضرت نے روایتی محبت وشفقت سے نوازا، بندہ نے درخواست کی کہ اگر برکت کے لئے روضۃ الاطفال تشریف لے چلیں تو ہماری سعادت ہوگی۔ حضرت نے یہ زحمت شفقتاً گوارا فرمائی، ورنہ ضعف اور بیماری تھی۔ آپ ادارہ میں تشریف لائے ،دعا فرمائی، کام کو سراہا اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

یہ حضرت سے آخری ملاقات تھی، پھر ظلم کی انتہا کر دی گئی کہ اس معصوم اور فرشتہ صفت انسان کو بموں کا نشانہ بنادیا گیا، مجھے یقین ہے کہ حضرت نے بالقصد کبھی کسی انسان کو در کنار کسی جانور کو بھی ایذا نہیں پہنچائی ہوگی۔ آخر ایسے بے ضرر انسان اور اللہ کے ولی سے کسی کو کیا تکلیف تھی جو اس بے دردی سے شہید کر دیئے گئے۔ آپ جیسے محبت و شفقت کے پیکر اساتذہ اب ڈھونڈیں سے بھی نہیں ملتے۔ آپ کی تربیت میں گزرے ہوئے دن ہمارے لئے سعادت عظمیٰ ہیں گو کہ آپ سے بہت کم شرف تلمذ نصیب ہوا لیکن جتنا نصیب ہوا اس کا نقش اور اس کا اثر آج اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت آپ کی قبر مبارک پر کروڑں رحمتیں نازل فرمائے اور برادر عزیز مولانا محمد طفیل صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے انتہائی محنت اور مشقت سے حضرت کے احوال وآثار پر کام شروع کر رکھا ہے، میری دعا اور تمنا ہے کہ یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے، ان شاء اللہ حضرت استاذ محترم کے احوال وآثار سے ایک خلق کثیر کا فائدہ ہوگا اور علما اور طلبا کو علمی وتربیتی حوالے سے ٹھوس مواد فراہم ہوگا اللہ رب العزت اس کاوش

کو قبول و منظور فرمائے۔ آمین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جا کر......!

مولانا یاسر حبیب، کراچی

فکیف الصبر عنک وای صبر
لعطشان من الماء الزلال
ذهب الذین یعاش فی آکنافهم
وبقیت فی خلف کجلد الآجرب
ابکی الذین اذا قونی مودتهم
حتی اذا آیقظونی للهوی رقدوا
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دنیا میں حیات و ممات کا سلسلہ مشیت ایزدی سے اٹل ہے، جو کوئی اس فانی دنیا میں آیا اسے ایک نہ ایک روز اس سے کوچ بھی کر جانا ہے، یہ نظام ہستی ہے جو چلتا چلا آرہا ہے اور چلتا رہے گا لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا وجودِ مسعود ہی دنیا والوں اور خاص کر اہل علم و فضل و کمال والے حضرات کے لیے نہ صرف باعث رحمت ہوتا ہے بلکہ ان حضرات کی محبوبیت کا ہی یہ عالم ہوتا ہے کہ ہر کس و ناکس کی ان حضرات سے محبت وارفتگی کی حد تک ہوتی ہے، یہ

شخصیات عند اللہ ہوتی ہی اتنی محبوب ہیں کہ رب کریم ان ہستیوں کی عقیدت ومحبت کو اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی جا گزیں فرما دیتے ہیں۔

گزشتہ دنوں برادر مکرم مولانا طفیل کوہاٹی صاحب نے ایک مراسلہ بھیجا اور پھر بعد میں بندے سے رابطہ کر کے حضرت والا مولانا امین اورکزئی شہید علیہ الرحمہ پر لکھنے کا کہا یقینا حضرت کا علمی مقام، مرتبہ اور آپ کی شخصیت اس بات کی محتاج نہیں کہ چند سطریں تحریر کر کے ان کی پر خلوص محبت اور شفقت کا حق ادا کیا جا سکے لیکن بندے کی عرصہ دراز سے یہ خواہش رہی ہے کہ ہمارے وہ تمام اکابر جو اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں ان پر لکھا جائے تاکہ آنے والی نوجوان نسل اور بالخصوص وہ نوجوان علماء اپنے اکابر سے روشناس ہو سکیں جنہوں نے براہ راست تو ان حضرات سے فیض حاصل نہیں کیا لیکن جو علم ان تک ان کے اساتذہ نے پہنچایا ہے اس علم کے ان تک پہنچنے میں ان حضرات اکابر کا، بڑا عمل دخل ہے، حضرت کی شخصیت پر لکھنا یقینا مجھ جیسے سیاہ رو کے لیے کسی اعزاز سے کم ہرگز نہیں، اگرچہ حضرت کے ساتھ میرا وقت نہیں گزرا لیکن حضرت والد شہید علیہ الرحمہ کا جو قلبی، دینی تعلق بندے نے ابتدائے طفولیت میں حضرت مولانا امین اورکزئی شہید علیہ الرحمہ کے ساتھ دیکھا اور سنا وہ یقینا ایسا عجیب تعلق تھا جس کی مثال اس دور میں ملنا بلا شبہ بہت مشکل ہے۔

میرے مادر علمی کے بانی ومبانی اور عصر قریب کے عظیم ترین محدث العصر میرے نانا حضرت اقدس علامہ سید محمد یوسف بنوری الحسینی نور اللہ مرقدہ کا ایک جملہ یقینا ان دو حضرات مکرمین کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے، آپ قبلہ والد محترم شہید علیہ الرحمہ اور حضرت والا مولانا امین اورکزئی شہید علیہ الرحمہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ''یہ دونوں حضرات میرے لیے پرندے کے دو پروں کے مانند ہیں'' یعنی میرے دو بازو ہیں۔

ان حضرات کا اس سے بڑا تعلق اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر چونکہ اس تعلق کی بنیاد حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کے عشق اور محبت پر مبنی تھی تو کیسے ہو سکتا ہے کہ ان دونوں حضرات کا باہمی تعلق کسی سے مخفی یا پوشیدہ ہو، چنانچہ حضرت بنوری کے عشق میں ڈوبی یہ دونوں مقدس ہستیاں اگرچہ ظاہری طور پر حضرت بنوریؒ کی رحلت کے بعد دور ہو گئیں لیکن باہمی ربط وتعلق ہمیشہ قائم ودائم رہا کبھی خط وکتابت کی صورت میں، کبھی ٹیلیفون کے ذریعے اور بسا اوقات بالمشافہ ملاقات کی صورت میں یہ رشتہ ہمیشہ ایسا استوار رہا کہ اس دور میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، بقول کسے:

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

قبلہ حضرت والد شہید علیہ الرحمہ کے سانحۂ پُر الم کی خبر جب آپ تک پہونچی ہوگی اس وقت حضرت کی کیا کیفیت ہوگی اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے آپ دونوں حضرات کے باہمی تعلق کا مشاہدہ کیا ہو، مجھے یاد ہے جب

آپ جامعہ تشریف لائے اور پھر جب ہمارے گھر آپ کی آمد ہوئی تو اس وقت آواز نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، آنسوؤں کی بہتی لڑی اور بمشکل ہچکیوں کو روکنے کی سعیٔ ناتمام کرتے ہوئے حضرت والا نے جب بندے کو اپنی آغوش شفقت میں سمویا تو اس وقت کی کیفیت کو بیان کرنے سے میں واقعتا عاجز ہوں البتہ ان سطور کو رقم کرتے ہوئے ایک ایک لمحہ اور آپ کا پرنور چہرہ اپنی بہتی آنکھوں کے سامنے پاتا ہوں، نجانے کتنی دیر آپ نے خود سے لپٹا کر رکھا لیکن اس تمام وقت میں بمشکل ایک یا دو الفاظ ہی آپ کی زبان سے ادا ہو پائے ہوں گے، وہ منظر جب کبھی یاد آتا ہے تو پھر تا دیر دل کی کیفیت عجیب رہتی ہے۔

یوں تو حضرت سے تعلق کم رہا، یقینا بندہ اسے اپنی بدقسمتی اور کوتاہی گردانتا ہے اس لئے کہ حق تو یہ تھا کہ حضرت والا سے جتنا زیادہ تعلق اور رابطہ رکھا جاتا وہ کم تھا اور حضرت کی رحلت کے بعد شدت سے یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ کاش حضرت والا آج موجود ہوتے تو نجانے کتنے معاملات میں ہم آپ سے راہنمائی حاصل کرتے اور آپ کی شفقتوں، محبتوں اور دعاؤں سے فیض یاب ہوتے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا اور پھر قانون قدرت بھی یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک نے اس فانی دنیا سے کوچ کر جانا ہے، بقاء اور دوام صرف ایک اللہ کی ذات کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی الحمدللہ دلی اطمینان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حضرت والا کے صاحبزادے اور میرے برادر عزیز مولانا یوسف سلمہ اللہ تعالیٰ سے باہمی تعلق، انسیت اور محبت اسی طرح قائم و دائم ہے جیسے حضرت والا کے ساتھ تھا اور آج بھی جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کو دیکھ کر، ان سے مل کر وہی کیفیت اور لطف پیدا ہوتا ہے جو حضرت والا سے مل کر ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے قبلہ حضرت والد ماجد شہیدؒ اور حضرت والا مولانا امین اورکزئی شہیدؒ کی ارواح بھی یقینا اس تعلق اور انسیت کو دیکھ کر یقینا شاد ہوتی ہوں گی، ان شاء اللہ۔ آپ کے صاحبزادے کے ساتھ جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو بس تذکرہ ذکر ان ہی دونوں محبوب ہستیوں کا ہوتا ہے ان کی باتیں ان کی یادیں، ان حضرات کے باہمی تعلق اور محبت بھرے واقعات پر گفتگو ہوتی رہتی ہے اور دل یہ چاہتا ہے کہ بس ذکر حسینین چلتا رہے، ان حضرات کے ذکر کے وقت ان حضرات مکرمین کے نورانی چہرے تخیل میں سامنے ہوتے ہیں اور ہر ملاقات میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ کچھ تشنگی رہ گئی کچھ وقت اور میسر ہوتا تو مزید گفتگو ہوتی۔

اتنا وقت گزر جانے کے باوجود آج بھی جب ان ملاقاتوں کو یاد کرتا ہوں جو حضرت والا کے ساتھ ہوا کرتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تعلق آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے۔ مجھے یاد ہے جب حضرت والا کی الم ناک شہادت کی خبر موصول ہوئی تو اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس دن ہم پھر سے یتیم ہوگئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دونوں حضرات کو اللہ جل شانہ نے شہادت عظمیٰ جیسی عظیم نعمت سے نوازا جس کی تمنا خود آقائے دو جہاں خاتم

الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی رکھی۔

آج سے تقریباً پچیس برس قبل کی بات ہے جب بندے کی عمر بمشکل سات یا آٹھ برس ہوگی حضرت والد شہید علیہ الرحمہ تمام گھر والوں کے ساتھ حضرت کے پاس ہنگو تشریف لے گئے، وہاں غالباً حضرت کے مہمان خانے میں قیام تھا اس وقت کا ایک واقعہ آج بھی جب کبھی یاد آتا ہے تو ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے، واقعہ کچھ یوں ہے کہ حضرت کے مہمان خانے میں قیام پذیر تھے کہ بندے نے حضرت والد صاحب سے عرض کیا کہ مجھے بندوق چاہئے۔ والد صاحب شہید علیہ الرحمہ نے قدرے حیرانگی سے میری طرف دیکھا اسی اثنا میں حضرت والا بھی وہاں تشریف فرما تھے، آپ نے ایک سات آٹھ سال کے بچے کی خواہش کو سن کر وہاں موجود ایک صاحب کے کان میں کچھ کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ صاحب ایک بڑی سی بندوق بغیر گولیوں کے لے کر آگئے اور میرے ہاتھ میں تھما دی، حضرت والد صاحب شہید علیہ الرحمہ حیرانگی کے عالم میں میری طرف دیکھتے رہے، اسی اثنا میں کچھ دیر دیکھنے کے بعد میں نے وہ لوڈ کر دی، اس وقت غالباً حضرت نے والد صاحب شہید علیہ الرحمہ سے دریافت کیا کہ اس بچے کو یہ لوڈ کرنا کس نے سکھایا تو حضرت والد صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ''پتہ نہیں اس کے باپ کو تو چلانی یا پکڑنا تک نہیں آتی'' یہ کہنا تھا کہ تمام محفل بے ساختہ ہنس پڑی۔

یہ غالباً اسی سفر کی بات ہے کہ والد صاحب شہید علیہ الرحمہ کو پھل بہت پسند تھے (اور آپ کا معمول تھا کہ کھانے کے بعد پھل ضرور تناول فرماتے اور خود انہیں کاٹ کر دسترخوان پر موجود تمام گھر والوں کو اصرار کر کے کھلاتے) تو واپسی میں حضرت والا نے والد صاحب علیہ الرحمہ کو انگور مٹی کے ایک کوزے میں دیئے جس پر غالباً چکنی مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا اور فرمایا کہ یہ کراچی پہنچنے تک خراب نہیں ہوں گے چنانچہ کراچی پہنچ کر جب اسے کھولا گیا تو واقعی وہ انگور اسی طرح تازہ تھے جس پر حضرت والد صاحب بڑے مسرور ہوئے۔

حضرت والد صاحب شہید علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد جب کبھی آپ کی کراچی تشریف آوری ہوتی تو بندے کے استاذ محترم حضرت مولانا قاری قاسم صاحب مدظلہ کے ہاں قیام فرماتے چنانچہ ہمارے ایک اور استاذ محترم اور میرے محسن حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید علیہ الرحمہ بندے کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتے اور تاکید فرماتے کہ جا کر حضرت سے ملاقات کریں چنانچہ جب کبھی جانا ہوتا تو حضرت والا کا محبت سے بھرپور والہانہ پن قابل دید ہوتا، مجھ جیسے سیاہ رو کا استقبال فرمانا اور پھر جب تک حضرت کے ساتھ بیٹھنا ہوتا تو حضرت والا اپنے مخصوص انداز میں بندے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھے رہتے بسا اوقات ایسا ہوتا کہ سامنے استاذ محترم حضرت مولانا قاری قاسم صاحب حضرت والا کے سامنے دوزانو بیٹھے ہوئے ہوتے اور بندہ حضرت کے ساتھ تو بڑا عجیب لگتا لیکن حضرت کی

والہانہ محبت کے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو پاتی بلکہ سچ پوچھئے تو وہ لمحے اور حضرت کا قرب ہمیشہ کچھ بھی کہنے سے مانع ہوتا بلکہ دلی خواہش یہ ہوتی کہ یہ وقت یہیں رک جائے لیکن پھر حضرت کچھ دیر بعد وقت کو دیکھتے ہوئے استفسار کرتے کہ کس طرح آئے ہیں اور پھر فرماتے کہ اب وقت کافی ہوگیا ہے تو آپ چلئے ۔اس کے بعد حضرت والا کھڑے ہوکر باہر تک چھوڑنے آتے اور بارہا اصرار اور درخواست کرنے پر بھی حضرت راضی نہیں ہوتے کہ وہیں سے رخصت فرمادیں بلکہ جب تک بندہ روانہ ہوکر حضرت کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجاتا اس وقت تک حضرت کھڑے رہتے۔

ایک مرتبہ حضرت جامعہ تشریف لائے یہ غالباً اس وقت کی بات ہے جب بندہ درجہ سابعہ میں تھا معلوم ہوا کہ حضرت حزب الاعظم اور دلائل الخیرات ''جو دعاؤں کا مجرب اور مستند مجموعہ ہے'' کی طلبہ کو اجازت مرحمت فرمارہے ہیں ،جس کا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ نسخہ خرید کر حضرت کے پاس لیجاتے اور حضرت اس پر اجازت مرحمت فرمادیتے، خواہش ہوئی کہ میں بھی حضرت سے اجازت حاصل کروں چنانچہ میں پہنچا اور کچھ دیر بعد حضرت سے اپنا مدعا بیان کیا اور اجازت چاہی ،حضرت سن کر کافی مسرور ہوئے اور اس کے بعد فرمایا میں نے حضرت بنوری رحمہ اللہ سے اس کی اجازت حاصل کی تھی ،اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کو بالاستیعاب پوری پڑھ کر سنائی بھی چنانچہ اسی سلسلے کے تحت اور ان کے واسطے سے آپ کو بھی (دلائل الخیرات) اجازت دیتا ہوں اور آگے آپ جسے دینا چاہیں اس کی بھی آپ کو اجازت ہے،چونکہ بندہ قاعدے کے مطابق کتاب لے کر حاضر نہیں ہوا تھا چنانچہ استاذ محترم مولانا قاری قاسم صاحب مدظلہ سے فرمایا کہ آپ انہیں بلکہ تینوں بھائیوں کے لیے اجازت والا ایک نسخہ بعد میں دیدیں، یہ حضرت کی وہ محبت تھی کہ آپ نے بلا تامل نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی بلکہ آگے بھی کسی کو دینے کی اجازت عطا کی ،فللہ الحمد۔

آہ.....حضرت والا کے کس کس واقعے کا ذکر کروں ،حضرت کی ہر بات ،ہر واقعہ ایسا ہے کہ دل اس بات پر مصر ہے کہ وہ تمام کے تمام واقعات اور ساری روئیداد قلمبند کردیجائے شاید حضرت کی شخصیت ،ان کی محبت کا کچھ تھوڑا بہت حق ادا ہو پائے لیکن حضرت کی شخصیت اتنی جامع الکمالات ہے کہ یقیناً اگر تمام واقعات بھی کسی صورت لکھ دیئے جائیں تب بھی شاید حضرت کے کسی ایک پہلو کا احاطہ ممکن ہو پائے۔

نہیں ممکن ادا ہو حق تری بندہ نوازی کا
اگر انسان سراپا بھی زبانِ شکر بن جائے!

حضرت کی شہادت سے کچھ عرصے قبل بندے کا پشاور جانا ہوا،عرصہ دراز سے یہ خواہش رہی تھی کہ حضرت والا

کے مدرسے میں حاضری دے سکوں چنانچہ قسمت نے یاوری کی اور بندے نے اپنے خالہ زاد بھائی مولوی جواد بنوری حفظہ اللہ سے اس خواہش کا اظہار کیا چنانچہ وہ فوراً راضی ہو گئے اور طے یہ ہوا کہ اگلے دن چلتے ہیں اگرچہ ہم دونوں میں سے کسی کو مکمل پتہ معلوم نہیں تھا چنانچہ اگلے دن وقت مقررہ پر ہم بس اڈے پہنچے اور وہاں سے کوہاٹ کے لیے روانہ ہو گئے کوہاٹ پہنچ کر راستے میں معلوم کرتے کرتے مغرب سے کچھ دیر قبل حضرت کے مدرسے پہنچ گئے، وہ مدرسہ جسے اس سے قبل قریباً پندرہ بیس سال قبل دیکھا تھا اس کو ویسا ہی پایا چنانچہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے تو حضرت کے صاحبزادے اور میرے بڑے برادر عزیز مولانا یوسف "اطال اللہ عمرہ" دیکھتے ہی آنے اور ہمیں لے کر ایک کمرے میں لے گئے حال احوال کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مسجد میں تشریف فرما ہیں چونکہ مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ہم مسجد پہنچے بندے نے برادرم سے عرض کیا کہ آپ نہ بتائیے گا چنانچہ مسجد میں پہنچ کر حضرت کے پیچھے بیٹھ گئے اسی دوران نماز کا وقت ہوا تو حضرت نے اشارہ فرمایا اور بندہ حضرت کے ساتھ کھڑا ہو گیا، قصہ مختصر نماز سے فراغت کے بعد حضرت اپنے معمولات سے فارغ ہو کر جیسے ہی مڑے، بندے نے قبل اس کے کہ صاحبزادے تعارف کراتے اپنا نام عرض کیا، حضرت والد شہید علیہ الرحمہ کا نام سنتے ہی حضرت نے یک دم سینے سے چمٹا لیا اور کافی دیر تک سینے سے چمٹائے رکھا، اس کے بعد حضرت کی معیت میں غالباً حضرت کے کمرے میں آپ خود لے کر پہنچے اور باصرار اپنے ساتھ بٹھا لیا، حال احوال کے بعد بندے نے عرض کیا کہ عرصہ دراز سے دلی خواہش تھی کہ یہاں حاضر ہو سکوں آج اللہ نے یہ خواہش پوری کر دی، اس کے بعد عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو رات میں واپس روانہ ہونا چاہتا ہوں لیکن حضرت نے اجازت مرحمت نہیں فرمائی اور فرمایا کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ آپ کچھ روز یہاں قیام کریں لیکن اگر آپ کا جانا ضروری ہے تو کل صبح سویرے آپ کو روانہ کرنے کا انتظام کر دوں گا، چنانچہ حضرت کے ساتھ کھانا تناول کیا، حضرت کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوران حضرت نے اپنے ہاتھوں چند لقمے بندے کے منہ ڈالے، الغرض کھانے کے بعد بندے نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے معمولات کا حرج ہو گا آپ اپنے معمولات پورے فرمالیجئے، چنانچہ حضرت تشریف لے گئے لیکن جاتے جاتے اپنے صاحبزادے کو ہمارے آرام کا بھرپور خیال رکھنے کی تاکید فرما گئے، بعد کی تفصیل اگرچہ طویل ہے لہٰذا مختصر کرتے ہوئے اصل بات کی طرف آتا ہوں، رات کے کسی پہر دوران نیند محسوس ہوا کہ کسی کے ہاتھ پاؤں پر ہیں، آنکھ کھلتے ہی حضرت کا پرنور مسکراتا چہرہ نظروں کے سامنے پاتے ہی ایک جست میں اٹھ بیٹھا اور نہایت لجاجت سے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت بندے کو کیوں گناہ گار کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: آپ میرے عزیز از جان بھائی کی اولاد ہیں، حضرت کے یہ کلمات اور قلبی محبت یقیناً مجھ جیسے گناہ گار کے لیے سرمایۂ حیات ہیں، اس دوران حضرت والا نے

اپنے بھتیجے کو بلوالیا تھا ہمیں واپس روانہ کرنے کے لیے، چنانچہ حضرت نے اپنی قیمتی دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا، کسے معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ثابت ہوگی، بقول شاعر

ابھی جامِ عمر بھرا نہ تھا کہ کف دستِ ساقی چھلک پڑا
رہیں دل کی دل میں ہی حسرتیں کہ نشاں قضا نے مٹا دیا

حضرت والا کے علمی مقام اور مرتبے کی بابت کچھ کہنا اور لکھنا یقیناً مجھ جیسے کم علم کے نہ تو بس میں ہے اور نہ ہی میں اس کی جسارت کر سکتا ہوں یقیناً دیگر اہل علم و فضل و کمال والے حضرات اس حوالے سے بہت کچھ لکھیں گے اور لکھ بھی چکے ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ حضرت کی رحلت و شہادت اس ملک و ملت کے لیے کسی سانحۂ عظیم سے کم نہ تھی، حضرت والا کو حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے جو ذمہ داری تفویض کی تھی جس پر آپ نے اپنی تمام زندگی صرف کر دی تھی، کاش وہ کام مکمل ہوکر زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آجائے تو دنیا کو پتہ چلے حضرت کا علمی مقام کیا تھا، حضرت بنوری رحمہ اللہ کو اللہ جل شانہ نے ابتداء سے ہی چن چن کر ایسے بیش قیمت ہیروں سے نوازا تھا جنہوں نے حضرت بنوری کے علمی ذوق کو سمجھ کر وہ کام سرانجام دیا جس کے لیے ایک پوری جماعت بھی ناکافی ہے، بندے نے اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ حضرت بنوری کے مقام اور مرتبے کو پہچاننے کے لیے صرف ایک بات ہی کافی ہے کہ آپ نے چن چن کر ایسے افراد کا انتخاب و اہتمام کیا جنہوں نے حضرت کے علمی ورثے اور ذوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی پوری عمر صرف کر دی، حضرت والد شہید علیہ الرحمہ نے "کشف النقاب عما یقولہ الترمذی وفی الباب" پر جو کام کیا جس کی تاحال پانچ جلدیں ہی منظر عام پر آسکی ہیں اگر وہ کام مکمل ہوکر سامنے آجائے یا پھر حضرت والا کے ذمہ حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے طحاوی شریف کی شرح کا جو کام تفویض کیا تھا جس پر آپ نے اپنی زندگی میں کام کیا اور آپ کی حیات ہی میں اس کی دو ضخیم جلدیں نثر الازہار کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں، بلاشبہ ان دونوں حضرات مکرمین کا اگر یہ علمی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو شاید ان حضرات کے مقام عالی سے اور حضرت بنوری کے وجدان سے دنیا صحیح معنوں میں روشناس ہوسکے۔

حضرت کے علمی مقام اور مرتبے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت بنوری کی اس منشاء کو پورا کرنے کے لیے آپ نے حضرت بنوری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کراچی کو خیرآباد کہہ کر اپنے آبائی علاقے میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی جس کا نام بھی آپ نے جامعہ یوسفیہ رکھا (اپنے شیخ کے نام پر، اسی طرح اپنے صاحبزادے کا نام بھی حضرت نے یوسف رکھا) جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت بنوری علیہ الرحمہ سے آپ کی عقیدت ومحبت

کا کیا عالم تھا۔

۲۰۰۹ء میں ملک میں جاری خانہ جنگی کی لپیٹ میں آپ بھی آ گئے، حالانکہ یہ آپ ہی کی شخصیت تھی جنہوں نے ہمیشہ کھل کر اس خانہ جنگی کی پرزور مخالفت کی، آپ حقیقی معنوں میں اتحاد بین المسلمین کے خواہاں تھے جس کا عملی ثبوت کئی مواقع پر آپ نے دیا، اور جب بھی جہاں کہیں ملکی سالمیت، استحکام کے حوالے سے آپ کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے ذرا تامل نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو پیش پیش رکھا، یہ آپ ہی کی شخصیت تھی کہ کئی مواقع پر کسی جگہ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا یا کوئی تنازعہ کھڑا ہو جاتا تو اس تنازعے کے حل کے لیے اپنے اور پرائے ہمیشہ ثالثی کے طور پر آپ کو چنتے، نتیجتاً آپ اس مسئلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل فرما دیتے، ہونا تو چاہئے تھا کہ ایسی نابغۂ روزگار ہستی کی حفاظت کی جاتی جو حکومت وقت اور عوام الناس کے درمیان پل کا کردار ادا کرتی ہو بلکہ وقت سے پہلے، بعد میں پیش آنے والے مسائل اور ان کے مضمرات سے بھی سب کو آگاہ کرتی ہو لیکن شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا چنانچہ حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کے مبارک ہاتھوں سے تراشا ہوا یہ قیمتی ہیرا بھی پیرانہ سالی میں اپنے خون سے باوضو ہو کر حیات جاوداں پا گیا اور شہادتِ عظمیٰ کی خلعت فاخرہ زیب تن کر کے اپنے پیاروں کے پاس چلا گیا۔

اس جرم میں کون کون شریکِ کار تھا اب اس کا فیصلہ یقیناً دنیا و آخرت کی سب سے بڑی عدالت میں رب کریم کے حضور پہنچ چکا ہے، لیکن دنیا ایک صوفی باصفا، عالم باعمل، متقی و پرہیزگار ہستی سے محروم ہو گئی، ایسی ہستی جو صدیوں میں کہیں جا کے پیدا ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ایسے اہل اللہ دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور ہمیشہ دل میں بسے رہتے ہیں، ان حضرات کے کارنامے، آثار اور خدمات ان کی طرح قائم و دائم رہتی ہیں اس لیے کہ یہ حضرات تو زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر چکے ہوتے ہیں لہٰذا یہ خود کیسے فنا ہو سکتے ہیں:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اللهم اغفرله وارحمه،وعافه،واعف عنه،واكرم نزله،ووسع مدخله،واجعله من ورثة جنة النعيم،واجعله مرقده روضة من رياض الجنة،وأفض عليه من شابيب رحمتك وعفوك ورضوانك،وغفرانك، وادخله الجنة جنة الفردوس بغير حساب ،اللهم لاتحرمنااجره ولا تفتنا بعده،وأسقنامن علومه وبركاته وتقواه،آمين يارب العالمين۔!!

میرے محسن، میرے استاذ

مفتی شاہد محمود راولپنڈی

صاحبزادہ حضرت مولانا یوسف صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ پر کچھ لکھوں، سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں؟ کہاں سے شروع کروں؟ استاذ صاحب کی شخصیت اتنی جامع و ہمہ گیر ہے کہ میں اس کا نقشہ کھینچنے سے ہی قاصر ہوں، جو کچھ ہم نے استاذ صاحب کے سراپا میں دیکھا اس کی مثال اب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ بہر حال احباب کے اصرار پر اپنی سعادت اور خوش بختی سمجھتے ہوئے چند باتیں اور واقعات لکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ درست لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۱۹۷۴ء میں میرے والد حاجی بشیر احمد صاحبؒ کو ان کے ہمسایہ دکاندار حاجی فقیر محمد صاحب نے بتایا کہ میرے دولڑکے کراچی مدرسہ پڑھنے جارہے ہیں، آپ کا کیا ارادہ ہے؟ والد صاحب نے رات کو مجھ سے پوچھا کہ مدرسہ میں پڑھنے اور اس کے لئے کراچی جانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کراچی کی خوشی میں فوراً ہاں کردی۔ رحیم یار خان سے راقم، میرے چھوٹے بھائی زاہد محمود اور ہمارے ساتھی مقبول اور محمود احمد اپنے اپنے بڑوں کے ساتھ کراچی پہنچے اور داخلہ ٹیسٹ' جو اخبار پڑھنے اور اس میں سے املا کرانے پر ہوا' کے بعد ہمیں داخلہ دے دیا گیا۔ میرا اور مقبول احمد کا داخلہ اولیٰ میں ہوا، اور چھوٹے بھائیوں کا داخلہ اعدادیہ میں ہوا اور ۳۲ نمبر ہال نما کمرہ

ہمیں رہائش کے لئے ملا۔ میری عمر اس وقت ۱۲، ۱۳ سال کے درمیان تھی اور پہلی دفعہ گھر سے باہر جانا ہوا اور وہ بھی اتنی دور اور پہلی دفعہ ہی گھر سے باہر کھانے کی نوبت آئی تھی۔ کچھ دنوں بعد اداسی ہوئی، جگہ بھی نامانوس اور علم بھی نامانوس حتی کے سال کا درمیان آگیا اور مدرسہ میں کچھ طلبا نے ہڑتال کر دی اور ان کے کچھ مطالبے تھے، مدرسہ والوں نے مطالبات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ استاذ محترم دار الاقامہ کے ناظم عمومی تھے، ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ان کو نظامت سے ہٹایا جائے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ دفتر کے باہر کرسی پر تشریف فرما تھے اور فرمار ہے تھے تمام ہڑتالی طلبا کتابیں جمع کرائیں اور اُن کا اخراج کر دیا گیا۔ اس وقت حضرت استاذ محترم کا نام سننے میں آیا۔ جب اولی کا سال ختم ہوا اور اگلے سال ثانیہ سے ہمارا مطالعہ شروع ہوا تو رات کا مطالعہ اور تکرار مسجد کے برآمدوں اور صحن میں ہوتا تھا، استاذ محترم کا کمرہ بھی بالکل برآمدہ کے سامنے تھا اور مغرب کے بعد اور کبھی عشا کے بعد استاذ جی برآمدہ میں تشریف فرما ہوتے اور مطالعہ وتکرار کی نگرانی فرماتے۔ کسی طالب علم نے کچھ سمجھنا ہوتا تو استاذ جی سے سمجھ لیتا، اس دوران مجھے بھی ضرورت پڑتی، میں بھی جاتا اور استاذ جی فوراً ایسا سمجھاتے کہ دماغ میں بیٹھ جاتا۔ اس دوران استاذ جی بھی ہماری نااہلیت سمجھ گئے کہ ان کو زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اب استاذ جی کا شفقت اور محبت والا دور شروع ہوا، ایک سبب تو شفقت کا یہ بنا۔ دوسرا میرا اندازہ ہے کہ ایک واقعہ اور بھی وجہ توجہ بنا ہوگا، وہ یہ کہ ہمارے ثانیہ والے سال کے دوران والد صاحب حج پر تشریف لے گئے اور مدرسہ بھی تشریف لائے، حضرت بنوریؒ سے بھی ملاقات ہوئی اور بے تکلفی ہوگئی، والد صاحب نے ہمارے جامعہ میں داخلہ کا سبب اپنا ایک خواب سنایا جس میں جامعہ دکھایا گیا تھا، تفصیل تو مجھے یاد نہیں، والد صاحب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اکثر ہوجاتی تھی، اس کے بعد تو حضرت بنوریؒ جب بھی مجھے دیکھتے والد صاحب کا حال پوچھتے اور اپنا سلام بھجواتے اور میرا اندازہ ہے کہ استاذ جی کو حضرت بنوریؒ نے بھی غالباً فرمایا ہوگا کہ ان پر توجہ رکھیں۔ واللہ اعلم

اب عصر یا مغرب کے بعد استاذ جی نے ترغیب سے "النحو الواضح" پڑھانی شروع کی، اس میں کبھی کبھی حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی مہتمم دار العلوم زکریا جوہانسبرگ والے بھی شریک ہوتے۔ استاد جیؒ نے ایک طرف پڑھنے کی طرف شوق دلوایا، دوسری طرف عبادات کی طرف مائل کیا، ساتھ دلائل الخیرات پڑھنے کی ترغیب دی، پھر خود ہی اس پر نشانی لگا کر ہمیں عنایت فرمائی اور ہم پانچ یا چھ ساتھیوں کو' جن میں مولانا شبیر سالوجی بھی شامل تھے' حضرت بنوریؒ کے گھر بیٹھک میں لے گئے اور حضرت بنوریؒ سے درخواست کی کہ آپ ان کو دلائل الخیرات پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ حضرت بنوریؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور تین چار ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو اجازت دی اور باقیوں کے بارے میں استاد جیؒ سے فرمایا کہ آپ ان کو اجازت دے دیں۔

آپ نفلی روزوں اور تہجد کی ترغیب بھی دیتے لیکن اس میں اعتدال کی تلقین فرماتے۔ اگر کوئی ساتھی نفلی عبادات زیادہ شروع کر دیتا تو مذاقاً فرماتے کہ اب شیطان آپ سے پڑھوا رہا ہے تا کہ درس گاہ میں سوتے رہو اور اسباق کے تکرار و مطالعہ میں سستی ہو۔ طلبہ پر پوری نظر رکھتے کہ کہیں غیر تعلیمی مشاغل میں نہ لگ جائیں۔ تعلیمی غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی آپ کو سخت کوفت ہوتی اور کوشش کرتے کہ طلبہ کی سرگرمیاں صرف نصابی رہیں۔ انہی سالوں میں ایک دفعہ کھڈہ مارکیٹ میں حضرت مولانا عبدالشکور دین پوریؒ اور حضرت مولانا عبدالمجید ندیم تشریف لائے، ان کے بیانات میں کراچی کے مدارس کے طلبا بھی شریک ہوتے، اگر جمعرات کی رات ہوتی تو ٹھیک ورنہ چھٹی لے کر، چھپ کر، بہانہ کر کے شریک ہوتے۔ ہم بھی ایسے ہی ایک رات چلے گئے، اگلے دن استاذ جی نے پوچھا: کہاں گئے تھے؟ بتایا کہ بیان سننے گئے تھے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ بیان بہت زبردست اور شاندار تھا۔ پوچھا کہ کیا بیان تھا؟ ہم نے کہا: استاذ جی بیان تو یاد نہیں، پھر استاذ جی نے بڑی محبت سے سمجھایا کہ رات بھی خراب ہوئی، تکرار و مطالعہ بھی رہ گیا، پیسے بھی خرچ ہوئے اور بیان بھی یاد نہیں۔ بس استاذ جی کی اس محبت وشفقت سے سمجھانے کی برکت تھی کہ پھر کبھی جانا نہیں ہوا۔ آپ نے ہمیں اچھے اور برے کی تمیز سکھائی، انسانوں کا پرکھنا سکھایا اور زندگی کے اصول وآداب سکھائے۔

ایک دفعہ میں رات کو مطالعہ کے وقت وسطی دارالاقامہ کے باہر ایک دو افریقی طالب علموں کے ساتھ کرکٹ کمنٹری ریڈیو پر سن رہا تھا، اس دوران استاذ جی تشریف لے آئے اور ایک تھپڑ افریقی ساتھی کو لگایا اور مجھے فرمایا کہ شاہد تم بھی یہاں، بس اتنا فرما کر واپس تشریف لے گئے، آپ کا یہ فرمانا عمر بھر کے لیے کام دے گیا، اتنی شرمندگی ہوئی اور ایسی حالت ہوئی کہ جسمانی مار سے بھی شاید ایسا اثر نہ ہوتا۔

استاذ جی کو لڑکوں کے بارے میں خبر ہو جاتی تھی کہ لڑکے کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ باتیں کر رہے ہیں یا تکرار کر رہے ہیں؟ میں تو آج بھی سوچتا ہوں کہ شاید اللہ پاک ہی دل میں ڈالتے تھے کیونکہ استاذ جی بطور ناظم عمومی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان طلبا کے افعال وکردار کے ذمہ دار تھے اور استاذ جی بھی طلبا کے ساتھ مخلص تھے، اس لیے اللہ پاک ہی استاذ جی کی لاج رکھ لیتے ہوں گے اور انہیں طلبہ کی کوتاہیوں کے بارے کشف والہام فرما دیتے ہوں گے۔ استاذ جی طلبہ کی شخصیت وکردار سازی پر بہت زیادہ توجہ دیتے، میں اپنے بارے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر استاذ جی ظاہری اسباب کے طور پر نہ ہوتے تو میں شاید عالم دین نہ بن پاتا اور علم سے محروم ہی رہتا اور نہ ہی مردم شناسی پیدا ہوتی۔ واللہ اعلم

حضرت الاستاذ طلبہ کی صحت کا بھی خیال رکھتے اور اکثر اوقات علاج ومعالجہ بھی خود اپنی نگرانی میں اپنے ذاتی

اخراجات سے کرواتے۔ حکیمی طریق علاج کو پسند فرماتے، کبھی کبھار خود بھی دیسی ادویات بنالیتے کیونکہ آپ کا مطالعہ طب بھی کافی وسیع تھا اور غالباً اس فن میں اطبا سے استفادہ بھی کیا تھا کیونکہ ایک دفعہ میرا کان بہنے لگا، بہت علاج کروایا لیکن ٹھیک نہیں ہوا، استاذ جی نے اپنے ہاتھ سے دیسی دوائی تیار کر کے دی، جس سے بحمد اللہ افاقہ ہو گیا تھا۔

استاذ جی سے ہم نے شرح ابن عقیل پڑھی، آپ نے پورا الفیہ ابن مالک ہمیں یاد کروایا۔ منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم بھی آپ سے پڑھنے کی سعادت ملی۔ منطق سے مجھے بالکل مناسبت نہیں ہوئی، سہ ماہی امتحان میں سلم کے پرچہ میں مجھے کچھ سمجھ نہ آیا لیکن غلط شلط تین صفحے لکھ دیئے۔ اس پر استاذ جی نے صفر نمبر لگائے، جب درس گاہ میں تشریف لائے تو ہنستے ہوئے فرمایا: اگر ایک بات بھی منطق کی ہوتی تو ایک نمبر ضرور دیتا۔

حضرت استاذ جی شہید بہت سی خصوصیات کے حامل تھے، تمام علوم مستحضر تھے اور سمجھانے کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ مشکل سے مشکل بات مختصر وقت میں ذہن نشین کرادیتے تھے، محبوبیت عامہ حاصل تھی، جو ایک دفعہ مل لیتا گرویدہ ہو جاتا، مہمان نوازی بے مثال تھی، اپنے قبیلے کے بڑے تھے، لوگوں کا آپ پر مثالی اعتماد تھا، بڑے بڑے جرگوں میں جاتے اور قومی مسائل حل فرماتے۔

استاذ محترم بعض وجوہات کی بنا پر مستقل اپنے علاقہ تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ یوسفیہ قائم کیا، سادسہ یا سابعہ کی چھٹیوں میں بندہ اپنے ساتھی مولانا مقبول احمد اور ان کے بھائی مولانا محمود احمد کے ساتھ رمضان میں خانقاہ سراجیہ کندیاں حاضر ہوا، وہاں سے ہم تینوں ہنگو استاذ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ استاذ جی بہت خوش ہوئے، آج بھی ان کا خوشی بھرا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے، مدرسہ کے کچے کمرے تھے، بجلی نہیں تھی، کنویں سے ٹھنڈا پانی نکال کر کمرہ کے فرش پر ڈلوایا تاکہ گرمی کم ہو۔

ان دنوں حافظ بہت تھوڑے ہوتے تھے، استاذ جی کے شاگرد اور ہمارے ساتھی مولانا انوار الاسلام مرحوم درسمند ہنگو کے رہنے والے تھے، قرآن سنانے کے لئے استاذ جی کے پاس مدرسہ میں آئے ہوئے تھے۔ استاذ جی نے ان سے مذاقاً فرمایا: یہ بہت پکے حافظ ہیں، آج آپ کا قرآن سنیں گے تاکہ پتہ چلے آپ ہمیں تراویح میں کیا سناتے ہو؟ وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے استاذ جی سے کہا کہ یہ لوگ مسافر ہیں، تھکے ہوئے ہیں، آرام کرنے دیں۔ استاذ جی نے اُن کو اور ڈرایا۔ رات کو وہ بے چارے واقعی گھبرا گئے اور غلطیاں کرتے رہے۔ تراویح کے بعد اس واقعے پر کافی مذاق ہوتا رہا۔

اس کے بعد مختلف اوقات میں حضرت کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہیں اور بہت سے امور میں مشترکہ مشورے بھی ہوتے رہے۔ آخری ملاقات حضرت سے راولپنڈی میں میرے گھر پر ہوئی، آپ بندہ کے ہاں تشریف لائے تھے۔

الکنز المتواری شرح بخاری' جو حضرت شیخ عبدالحفیظ مکی صاحب دامت برکاتہم نے لامع الدراری کے بعد اپنے علمی اور روحانی شیخ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا الکاندھلویؒ کے علوم کو ترتیب دے کر ۲۴ جلدوں میں تیار کی' وہ ایک سیٹ حضرت استاذ جیؒ کو بھی ہدیہ میں پہنچایا تھا، اس میں کچھ جلدیں ناقص تھیں وہ پوری کرانی تھیں، کچھ میرے پاس موجود تھیں وہ میں نے اس وقت پیش کردیں، ایک باقی رہ گئی تھی وہ میں نے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ جلد حاصل کر کے پہنچادوں گا، بس یہ آخری ملاقات تھی، اس کے چند دن بعد سانحہ شہادت پیش آگیا اور اپنے محبوب دوست بنوری ٹاؤن میں دار التصنیف کے رفیق ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے پاس خلد بریں میں جا مقیم ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا اورکزئی شہیدؒ کی عملی زندگی کا ایک منفرد خاصہ

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی، کراچی

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ بالواسطہ ہمارے اساتذہ ومشائخ میں سے تھے۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے وابستگی کے دوران جن نامور تلامذہ نے آپ سے استفادہ فرمایا، آپ کے وہی تلامذہ ہمارے نامور اساتذہ شمار ہوتے ہیں، بالخصوص حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، مولانا سید رزین شاہ صاحب، مولانا محب اللہ صاحب، مولانا سعید اللہ صاحب اور مولانا محمد یٰسین صاحب حفظہم اللہ۔ ان اساتذۂ کرام کی زبانی دوران درس حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کے بارے میں بہت کچھ سنا اور آپ کے علمی مرتبے، قلمی سلاست اور انتظامی قابلیت کے تذکرے ذوق سماعت میں حلاوت کا ذریعہ بنتے رہے، اگر رفقاء درس میں سے کوئی باذوق و باتوفیق ساتھی ان تذکروں کو محفوظ ومنضبط کرنے کی کوشش کرتا تو حضرت اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ کے تعارف وتذکرے کے لیے قدر کفایت مواد یکجا ہوسکتا تھا، مگر افسوس کہ ایسے قیمتی جواہر پارے اکثر وبیشتر طالب علمانہ لاابالی پن کی نذر ہی ہوجایا کرتے ہیں اور قریب قریب ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ بہرکیف دینی مدارس کے مختلف شعبوں کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد کا انتخاب ہوا کرتا ہے اور یہ حال رجال کار کے درمیان تقسیم کار کے لئے قدرت کا فطری قانون

بھی ہے، کسی شخص کے اندر کتاب دانی اور کتاب فہمی کا کمال ہوتا ہے، کسی میں انتظامی صلاحیت اور معاملہ فہمی کا ملکہ ہوتا ہے، جب کہ کوئی محنت وجفاکشی کا خوگر ہوتا ہے اور وہ ہر کام میں اخلاص ولگن سے اپنے آپ کو کھپانے کا عادی ہوتا ہے، اسی طرح کا ہر فرد کسی بھی ادارے میں اپنی جگہ اور اپنے رب کے ہاں اپنا مقام بنا سکتا ہے، مگر یہ صلاحیتیں یکجا طور پر بہت کم لوگوں میں نظر آئیں گی ،لیکن حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت میں ان تمام خوبیوں کا یکجا فرما رکھا تھا، آپ کا تدریسی شغف اور تعلیمی مشغلہ، محنت، مہارت اور کمال سے عبارت تھا، آپ نے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی سے وابستگی کے دوران دقیق فنی کتب کی تدریس ایسی محنت ومہارت سے فرمائی کی مغلق ومشکل فنون آسان وسہل بنا کر اپنے طلبا کو سمجھائے۔ یہی وہ محنت ولگن والی تدریس تھی جس کی بدولت آپ کے طلبا آپ کے گرویدہ بنے رہے، حلقہ درس سے لے کر محفل ومجلس تک آپ کو یاد رکھا جاتا رہا اور اب تک آپ اپنے تلامذہ کی مجلسوں میں زندہ ہیں۔

آپ کے اسی فنی کمال کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسوخ فی العلم کی دولت سے نواز رکھا تھا اور آپ کے علمی جواہر، علمی میدان میں نمایاں حیثیت کے حامل رہے، آپ کے علمی رسوخ اور علمی صلاحیتوں کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ آپ کے شیخ محدث العصر حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے آپ کو سند اعتماد عطا فرمائی اور اپنے ادارے کے متعدد شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے لئے آپ کو منتخب ومقرر فرمایا، آپ کا جامعہ میں تقرر بحیثیت مدرس، رفیق دار التصنیف اور ناظم جامعہ کے طور پر عمل میں آیا۔

تصنیف وتالیف حضرت بنوری رحمہ اللہ کا خاص شغف وشغل تھا، آپ کے تصنیفی ذوق کی لاجواب وعدیم النظیر مثال آپ کی ''معارف السنن'' ہے، جس کا اندازہ پائے کے اہل علم ہی کا کام ہے۔ ہمارے جیسے طالب علم صرف اس کا تذکرہ ہی کر سکتے ہیں، اس اعلیٰ تصنیفی ذوق کے حامل حضرت بنوری رحمہ اللہ نے اپنے شعبہ تصنیف وتالیف کے لئے جن دو ہستیوں کو اپنے ذوق اور معیار پر پورا اترنے کے قابل قرار دیا، ان میں ایک حضرت کے روحانی ونسبی فرزند حضرت الشیخ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ اور دوسرے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تھے، یہ دونوں حضرات اپنے شیخ کے اعتماد اور انتخاب کی ایسی تصدیق وتصویر ثابت ہوئے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ انہیں ''جناحای فی التصنیف والتالیف'' یعنی تصنیف وتالیف میں اپنے دو بازو قرار دیا کرتے تھے، گویا کہ آپ کے تصنیفی ذوق کی تکمیل وتعبیر کا مظہر یہ دو بزرگ تھے۔

حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ کے ذمہ ''سنن ترمذی'' کے ''وفی الباب'' کی احادیث کی تخریج کا کام سپرد تھا، جو انہوں نے ''کشف النقاب عما یقول الترمذی: وفی الباب'' کے عنوان سے اپنے شیخ کی حیات اور پھر

اپنی حیات میں تسلسل کے ساتھ جاری رکھا، جس میں سے ۶ جلدیں طبع بھی ہو چکی ہیں، جب کہ حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کے ذمہ ''شرح معانی الآثار'' کے مباحث کی تحقیق وتخریج کا کام سپرد ہوا تھا، جو انہوں نے اپنے شیخ کی حیات میں ان کی زیر نگرانی شروع فرمایا تھا، مگر مختلف احوال کی وجہ سے حضرت جامعہ سے عملی وابستگی ختم ہونے پر اپنے آبائی علاقہ کوہاٹ تشریف لے گئے اور اپنے شیخ کی عظیم علمی آرزو کی تکمیل کے لئے وہاں بھی کوشاں رہے اور مختلف مشاکل و مشاغل کے باجود آپ کا کام ''نثر الازہار'' کے نام سے دو جلدوں میں طبع بھی ہو چکا ہے اور شنید ہے کہ مزید جلدیں بھی جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی، ''نثر الازہار'' آپ کا علمی شاہکار ہونے کے علاوہ اپنے شیخ کے حسن انتخاب کی حسن تعبیر بھی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علمی موضوعات پر آپ کی علمی وقلمی خدمات ہیں جو علمی مرقع اور سند کا درجہ رکھتی ہیں، اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ تصنیف وتالیف کا کام کس قدر یکسوئی چاہتا ہے، دوسری طرف انتظامی ذمہ داریاں ہمہ وقت ذہنی، اعصابی اور عملی مصروفیت سے عبارت ہیں۔ دونوں کاموں کو ایک ساتھ اپنے لازمی حقوق کے ساتھ ادا کرنا محال نہ سہی مشکل ترین ضرور ہے، مگر مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ کا یہ منفرد خاصہ ہے کہ وہ بہترین ومشاق مدرس، راسخ العلم، وسیع المطالعہ مصنف ومؤلف ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

اساتذہ کرام کے بیان کے مطابق حضرت اورکزئی رحمہ اللہ اپنے دور نظامت میں تعلیمی اور غیر تعلیمی اوقات میں ایک راعی اور رکھوالے کی طرح طلبائے کرام کی نگرانی فرمایا کرتے تھے، آپ ہمہ وقت طلبا کی تعلیم وتربیت او شخصیت سازی کی فکر میں رہتے تھے اور غلط روش کی فوری اصلاح فرماتے تھے۔ آپ اپنے علمی رعب، انتظامی دبدبہ اور بلا رعایت سرزنش کے خوف کی بنیاد پر طلبا کے اعصاب پر ایسے چھائے رہتے تھے کہ آپ کی غیر موجودگی میں بھی بدنظمی کو ایسے ہی مشکل سمجھا جاتا تھا جیسے موجودگی میں بدنظمی کا ارتکاب ناممکن ہوتا تھا۔

میری ناقص سمجھ کے مطابق یہ عمری رعب وہیبت حاصل ہونے کی دو بنیادیں ہیں: ایک تو خوف خدا وخشیت الٰہی سے آراستہ ہو کر کوئی اقدام کرنا، دوسرا ذاتی ضد وعناد سے بالاتر ہو کر شرعی وانتظامی ذمہ داری کے طور پر کارروائی کرنا، جو بھی منتظم خوف خدا کے استحضار کے ساتھ محض ادارے کے انتظامی مفاد کی خاطر کوئی قدم اٹھائے یا کوئی فیصلہ کرے، وہ یقینا مؤثر ومفید ثابت ہوگا اور وہ کامیاب منتظم کہلائے گا۔ یہ خصوصیات اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کے اندر جمع فرما رکھی تھیں۔

حسن انتظام کی انہی صلاحیتوں کی بدولت جامعہ آپ کو اب بھی یاد کرتی ہے اور مختلف مراحل میں ان کے اصولوں سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے اور جب حضرت اپنے آبائی دیس ہنگو منتقل ہو گئے تو انہوں نے اپنے شیخ کے نام پر

''جامعہ یوسفیہ ،شاہو وام'' کے نام سے ادارہ قائم کیا، جو حضرت بنوری رحمہ اللہ کی علمی وراثت کی تقسیم کا مرکز بھی بنا اور آپ کی انتظامی صلاحیتوں کے آزادانہ تجربات کے لئے بہترین جولان گاہ بھی بنا اور بہترین تعلیم وتربیت اور حسن انتظام میں وہ نمایاں مقام پایا کہ ''جامعہ یوسفیہ'' ملک کے بڑے اور قابل اعتماد اداروں کی فہرست میں شامل ہو گیا جو حضرت شہید رحمہ اللہ کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت شہید رحمہ اللہ کے جملہ سلاسل خیر آپ کے لئے بہترین صدقہ جاریہ ثابت ہوں اور جو احباب آپ کی شخصیت کے سبق آموز گوشوں کو رہتی دنیا تک محفوظ کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنے اکابر ومشائخ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

آمین وصلی اللہ وسلم علی سیدنا محمد وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔

سراپا علم وکمال

مفتی محمد مجاہد، کوہاٹ

بندہ فقیر علماء کرام کی ایک مجلس میں شریک تھا، ایک عالم دین نے خواب سنایا کہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کھل گیا ہے اور استاذ محترم حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعلان کر رہے ہیں کہ اے لوگو! آؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرو، استاذ محترم وہاں کھڑے ہیں اور باری باری لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کروا رہے ہیں۔ اس خواب کو سننے کے بعد دل میں درد سا اُٹھا اور سوچنے لگا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدسہ کے ساتھ استاذ صاحب کا موجود ہونا اور خدمت اقدس میں زیارت کروانا کس چیز کی غمازی کر رہا ہے؟ خیر دل کو تسلیاں دیتا رہا اور مختلف تعبیریں سوچتا رہا، تقریباً ایک ہفتہ بعد استاذ محترم کی المناک شہادت کی خبر موصول ہوئی، دل پر ایک بجلی گری اور سکتہ طاری ہوا، ہوش وحواس گم ہو گئے اور انتہائی غم وبے چینی کا عالم طاری ہوا، ہمارے مدرسہ کے رفقا اور دیگر احباب نے گاڑی کا انتظام کیا اور جنازہ کے لئے روانہ ہو گئے، جس وقت ہنگو پہنچے، تمام شہر ہنگو بند تھا

خوف وہراس اور پریشانی کی فضا پورے علاقے پر چھائی ہوئی تھی۔نماز جنازہ سنت اور وصیت کے مطابق جلدی پڑھی گئی اور تدفین بھی جلدی عمل میں لائی گئی۔

آپ نے ابتدائی کتب اپنے علاقے میں پڑھیں، پھر متوسط درجات کے لئے مدرسہ تعلیم القرآن کوہاٹ شہر تشریف لائے، آپ کا اکثر قیام گاؤں جنگل خیل کے مسجد قطب شاہ میں رہا۔آپؒ کے ہم درس ساتھی آپ سے بہت متاثر تھے اور اعتراف کرتے ہیں کہ آپ شروع سے غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے، سبق کا شوق، مطالعہ کا ذوق، ذکر وعبادت میں انہماک، تقویٰ اور توکل، تصلب فی الدین، تعمق فی العلم، اساتذہ کرام کا احترام اور ہم درس ساتھیوں کے اکرام جیسی عالی صفات سے آغاز ہی سے متصف تھے۔

آپ نے تقریباً ۱۳ سال بنوری ٹاؤن میں باا ثر استاذ کی حیثیت سے پڑھایا، نظامت کی بھاری ذمہ داری بھی بحسن خوبی نبھائی۔جب تک حضرت مولانا یوسف بنوریؒ حیات تھے، انہوں نے آپ کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیا اور پدرانہ شفقت فرماتے رہے۔ایک دفعہ کچھ حالات کی وجہ سے آپؒ نے استعفیٰ پیش کرنا چاہا تو حضرت بنوریؒ بہت ناراض ہوئے اور استعفیٰ منظور نہیں فرمایا۔یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے، ملک میں ختم نبوت کی تحریک چل رہی تھی جس میں پورا ملک بے چینی واضطراب کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا، اسمبلی کے اندر و باہر ہر جگہ قادیانیت کا مقابلہ ہو رہا تھا، سب کی نظریں حضرت علامہ یوسف بنوریؒ پر لگی ہوئی تھی، وہ اس وقت تحریک ختم نبوت کے امیر تھے، مصروفیت کے اس عالم میں حضرت بنوریؒ نے استاذ محترم صاحبؒ کو اسلام آباد بلایا، استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت رات کے تقریباً ۱۲ بجے تھے، جب حضرت بنوریؒ فارغ ہوئے، تو مجھے تنہائی میں بلایا، بہت شفقت فرمائی اور فرمایا کہ" آپ نے جو استعفیٰ پیش کیا وہ منظور نہیں ہے، وہ واپس لے لو، میری موجودگی میں دوسرے جگہ جانے کی اجازت ہرگز نہیں ہے اور یہ میرا مشورہ نہیں فیصلہ ہے۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت بنوریؒ کو استاذ صاحبؒ سے کتنی محبت تھی اور آپ پر کتنا اعتماد تھا۔

حضرت استاذ صاحب کو اپنے عظیم استاذ سے والہانہ عشق تھا اور آپ پوری طرح حضرت بنوری کی ذات میں فنا تھے، جب تک حضرت بنوریؒ زندہ رہے، آپؒ حضرت بنوریؒ کے ساتھ رہے، پھر جب حضرت بنوریؒ کا انتقال ہوا، تو اپنے علاقے تشریف لائے اور اپنے گاؤں شاہو وام میں اپنے محبوب استاذ کے نام پر مدرسہ یوسفیہ کی بنیاد رکھی۔اس مدرسہ کے ذریعے پورے علاقے میں علمی وعملی کام پھیلا۔باطل فرقوں کا مقابلہ ہوا، علاقائی رسم ورواج کا قلع قمع کیا گیا، اہل سنت والجماعت علماء دیوبند کی صحیح ترجمانی اور دین کے تمام شعبوں کی سرپرستی ہوئی۔آپ نے افراط وتفریط سے بچ کر صراط مستقیم کی راہ اپنائی اور اسی کی دعوت دی اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔

آپ مدرسہ کے کام میں اخلاص کی سخت تلقین فرماتے تھے، اس پر ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا کہ ہماری فراغت والے سال حضرت بنوریؒ نے سب شرکاء دورۂ حدیث کو جانے کے بعد دوبارہ واپس بلایا۔ فرمایا کہ آخر کیا بات ہے جس کی وجہ سے اتنی دور دور سے مسافت طے کرا کے تمہیں دوبارہ بلایا ہے؟ میں نے ایک ضروری اور اہم بات کے لئے تمہیں دوبارہ زحمت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ حضرات نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے علم حاصل کیا ہے اور اس علم کے ذریعے درس وتدریس، امامت وخطابت، تبلیغ ودعوت کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو اس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، مصیبت ہی مصیبت ہے، مشکلات ہی مشکلات ہیں، گویا دنیا کا جہنم ہے جس میں موت تک آزمائش وامتحانات جھیلنا پڑتی ہیں، لیکن آخرت میں پھر مزے ہی مزے ہیں، خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور ہمیشہ رہنے کے لئے جنت ہی جنت ہے اور اگر مدرسہ کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے دنیاوی راحت و سکون حاصل کرنا چاہا تو آخرت میں آگ ہی آگ ہے، جہنم ہی جہنم ہے، جس سے خلاصی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ پھر جہنم جانے کے لئے کسی اور گناہ کی حاجت نہیں یہی کافی ہے۔ اب تم آزاد ہو، اپنے اپنے گھروں کو واپس جاسکتے ہو۔ تمہاری مرضی ہے کہ اس علم کو جنت کے حصول کا ذریعہ بناتے ہو یا جہنم کا ایندھن، یہ کہہ کر حضرت بنوریؒ نے طلبا کو دوبارہ رخصت کیا۔

بندہ کو ۱۹۹۴ء میں حضرت استاذ صاحبؒ کے زیر سایہ تخصص فی الفقہ کی توفیق ملی۔ اگر چہ نااہلی اور ناالفتی کی وجہ سے کچھ حاصل نہ کر سکا اور معدن علم اور تصوف سے کما حقہ سیراب نہ ہو سکا، لیکن اس نعمت غیر مترقبہ پر جتنا شکر کروں کم ہے، پھر اس وقفہ تربیت میں بندہ نے آپ کے جن صفات حمیدہ کو قریب سے دیکھا ان کا تذکرہ اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ صفات نصیب فرمائے اور اپنی خوشنودی کا ذریعہ بنائے، آمین۔ عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة

علمی وشوق وذوق:

حضرت کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا، ایک دفعہ فرمایا: میرا معمول تھا کہ عشا کے بعد مطالعہ کے لئے بیٹھ جاتا، صبح کی اذان ہو جاتی تھی، پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ کتنا وقت گزر رہا ہے؟ ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے پشاور میں ایک مکتبہ والے سے "محلی ابن حزم" کے بارے میں پوچھا، مکتبہ کا مالک غیر مقلد تھا، اس نے کہا کہ آپ نے "محلی ابن حزم" پڑھی ہے؟ میں نے کہا کہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ تیرہ مرتبہ بحمد اللہ مکمل مطالعہ کر چکا ہوں اور سینکڑوں بار تحقیق کے لئے ورق گردانی کی ہے۔ اس نے کہا کہ آپ غیر مقلد ہو؟ میں نے جواب دیا: نہیں، میں حنفی ہوں۔ اس نے کہا: حنفی کیسے رہے؟ میں نے جواب دیا کہ جتنا مطالعہ کرتا رہا حنفیت پر مزید پختگی نصیب ہوتی رہی۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے "مسند عائشہ" کا سو سے زیادہ مرتبہ مطالعہ کیا ہے۔ بندہ کو ایک مرتبہ پتہ چلا کہ استاذ صاحب سخت بیمار ہے، میں ساتھیوں کے ساتھ عیادت کے لئے ہنگو حاضر ہوا۔ استاذ صاحب اتنے سخت بیمار تھے کہ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، لیکن پھر بھی مسجد تشریف لاتے تھے، بندہ نے مصافحہ ومعانقہ کیا۔ دوران گفتگو مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، پھر فرمایا کہ ابھی میں نے تاریخ دمشق خریدی ہے، ۸۰ جلدوں میں ہے۔ ایک بزرگ کا قول بطور استشہاد کے پیش کیا اور ساتھ عربی عبارت بھی پڑھی اور فرمایا کہ ڈاکٹروں نے سختی سے مطالعہ اور گفتگو کرنے سے منع کیا ہے، لیکن کیا کروں اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ پھر فرمانے لگے کہ ایک ہفتہ میں تقریباً پانچ ہزار صفحات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ بندہ نے وہیں تاریخ دمشق کا نسخہ دیکھا، استاذ صاحبؒ نے اس کی خاص خاص باتیں بھی نوٹ کر لی تھیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ کتاب کا کم از کم حق یہ بنتا ہے کہ اس کو خریدتے ہی پہلے دن ۵۰۰ صفحات کا مطالعہ کیا جائے۔

حضرت استاذ صاحبؒ نے طحاوی شریف کی شرح "نثر الازھار" لکھی، اس کے لئے بہت زیادہ مطالعہ کیا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت غیر مرتب، نادر اور مطول کتب جن کی فہرستیں دستیاب نہیں تھیں، حضرت استاذ صاحبؒ نے طویل ترین کتب کا خوب مطالعہ کیا اور ان سے احادیث لے کر فقہی ترتیب پر فہرستیں بنائیں، اسی کام کے لئے تاریخ بغداد کے اطراف کی فہرست بھی بنائی اور اشاریہ بھی ترتیب دیا۔ حالانکہ یہ بہت ہی زیادہ دشوار کام تھا۔ حکیم العصر حضرت مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ ایک دفعہ جامعہ یوسفیہ تشریف لائے تھے، استاذ صاحبؒ کے کام کو دیکھا، بڑے حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے، اتنا کام کون کرسکتا ہے؟ پھر وہ فہرستیں فوٹو کاپی کرا کرا اپنے ساتھ لے گئے۔

جن کتابوں کی فہرستیں مرتب نہ تھیں اور حضرت استاذ صاحب نے ترتیب دیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) تاریخ کبیر للبخاری (۲) طبقات ابن سعد (۳) تاریخ بغداد (۴) تاریخ جرجان (۵) حلیہ الاولیاء (۶) مسند عائشہ (۷) معجم صغیر۔ ان کے علاوہ دیگر کئی کتابوں کی فہارس بھی ترتیب دی تھیں، لیکن بندہ ان کے نام بھول گیا ہے۔

ایک دفعہ بندہ کو ایک راوی عبدالرحمن بن صالح کے حالات کی تلاش تھی، بہت سی کتب رجال وتاریخ کو کھنگالا، کسی جگہ اس راوی کا اتا پتہ نہ چل سکا۔ اس وقت چونکہ غیر مقلدین کے ساتھ بندہ کا تحریری مباحثہ جاری تھا، اس لئے اشد ضرورت تھی۔ استاذ صاحبؒ نے طحاوی شریف کے تمام رواۃ کی فہرست بنائی تھی اور ہر راوی پر جرح وتعدیل کے ضروری اقوال ذکر کیے تھے، اس کے لئے سینکڑوں کتب کی ورق گردانی کی تھی اور بعد میں اس کا خلاصہ

لکھا تھا، وہ میں نے نکالا دیکھا تو اس میں صالح بن عبدالرحمن کی تعدیل موجود پائی ،فللہ الحمد۔ بڑا ہی دل خوش ہوا اور حضرت الاستاذ کی محنت پر رشک آیا۔

ذوق ذکر و عبادت اور دعا:

آپ کو اللہ تعالیٰ نے مثالی تقویٰ عطا فرمایا تھا۔حرام اور ناجائز امور سے بچنے میں نہایت درجہ محتاط تھے۔امور شریعت کے سخت پابند تھے۔اللہ تعالیٰ نے عبادت وذکر اور دعا کا بھی خاص ذوق مرحمت فرمایا تھا،آخر تک آپ نے علم وعبادت کو جوڑ کر ساتھ چلایا،کبھی بھی علم ومطالعہ کو آڑ بنا کر عبادت وذکر کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی مشاغل تصوف کو علم ومطالعہ میں مانع سمجھا۔

ہم نے دیکھا کہ استاذ صاحبؒ شدید علیل ہوتے پھر بھی نماز باجماعت کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور نماز باجماعت میں طلبا پر بھی سختی کرتے تھے۔ایک دفعہ ایک مہمان کئی دن مدرسہ میں مقیم رہا،ان سے جماعت کی نماز میں سستی ہوتی تھی ،استاذ صاحبؒ کو معلوم ہوا تو زجراً فی القول یہاں تک فرمایا کہ ہمارے ہاں تو کافر بھی نماز نہیں چھوڑ سکتا اور تو ہمارے ہاں نماز میں سستی کرتا ہے۔

آپ اکثر رات کے وقت مدرسہ کی مسجد تشریف لے آتے اور تہجد پڑھ کر اشراق تک ذکر واذکار اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔کئی دفعہ دیکھا کہ عصر کے بعد جب مہمان نہیں ہوتے تھے تو وظائف واوراد میں مشغول ہوجاتے تھے ۔عموماً عشا کی نماز کے بعد بھی دیر تک اوراد ووظائف کا معمول تھا۔

حضرت استاذ صاحبؒ نہایت رقیق القلب تھے،کئی دفعہ دیکھا کہ دعا میں رویا کرتے تھے،ایک دفعہ ایک بزرگ گل بابا کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے،وہاں دعا کے دوران دیکھا کہ استاذ پر گریہ طاری ہے اور خوب رو رہے ہیں۔ایک بار رائیونڈ اجتماع میں بندہ بھی ساتھ تھا،صبح کی تعلیم ایک عام ساتھی کررہا تھا،حضرت استاذ صاحبؒ بھی وہاں چپکے سے بیٹھ گئے،ہم بھی استاذ صاحبؒ کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے،ہم نے دیکھا کہ تعلیم کے اکثر حصہ میں آپؒ روتے رہے،حالانکہ تعلیم والے ساتھی کی سیدھی سادی باتیں تھیں۔

اولیاء کرامؒ کی مجالس میں شرکت کے نہایت حریص تھے اور اس کا کافی التزام تھا۔گڑھنی باباجیؒ ،شیخ الحدیث مولانا فضل محمد سواتیؒ ،مولانا جنگی خیل باباجیؒ ،صندل باباجیؒ ،شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان،مفتی رشید احمد لدھیانویؒ،غرض سب کے ہاں دل وجان سے حاضر ہوتے اور دعائیں اور فیض لیتے۔علمی ذوق،محدثانہ مزاج اور صوفیانہ رنگ خوب غالب تھا۔تمام دینی شعبوں کو حق پر سمجھتے تھے اور اس پر پوری زندگی عامل رہے۔اپنے شاگردوں

عقیدت مندوں، متعلقین اور محبین کو اسی رنگ میں رنگنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

اتباع سنت اور اجتناب عن البدعۃ:

درویشانہ وصوفیانہ مزاج کے ساتھ ساتھ سنت کے انتہائی درجہ پابند اور بدعت سے سخت متنفر تھے، اس میں ذرا بھر مداہنت گوارا نہ تھی، کوئی کام خلاف سنت دیکھتے یا بدعت کی کوئی بات دیکھتے یا سنتے تو انتہائی جلال میں آجاتے تھے اور رگ فاروقی پھڑک اٹھتی تھی۔ اپنے علاقہ میں بدعات کے خلاف خوب کام کیا، اس کی وجہ سے ابتدا میں کافی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا اور آپؒ پر فتوئی بھی لگے مگر آپ آخر وقت تک سنت کا پرچار کرتے رہے اور پوری ثابت قدمی سے بدعت کا مقابلہ کیا۔ بعد میں آپ کی محنت اور استقامت کی برکت سے پورا علاقہ بدعات سے پاک ہو گیا۔

ہمیں تخصص کے سال پہلے دن پگڑی باندھنے کی ترغیب دی۔ ہم نے آپ کو مسجد میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت سنت کے خلاف کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

ایک دفعہ مولانا فضل محمد سواتی سوات سے تشریف لائے تھے، اچانک نکاح کی بات چل پڑی، حضرت نے استاذ صاحبؒ کی صاحبزادی کے نکاح کے حوالے سے بات کی، استاذ نے اسی وقت حضرت سے نکاح پڑھانے کا فرمایا، لڑکے کو بلایا گیا اور بڑے ہی سادہ طریقہ سے یہ تقریب منعقد ہوئی، بغیر کسی پیشگی تیاری کے مہتمم صاحب نے نکاح پڑھایا۔ مدرسہ کے باہر دکان میں جو کچھ شیرینی وغیرہ موجود تھی، وہ منگوائی گئی اور سنت کے مطابق سادگی سے نکاح کا عملی نمونہ قائم فرمایا۔

اتباع سنت ہی میں استاذ صاحب نے وصیت لکھی تھی کہ میرا جنازہ جلدی پڑھایا جائے، جس میں ایک نماز کا وقت بھی نہ گزرے، تاخیر نماز جنازہ کے بڑے سخت مخالف تھے، جنازہ میں میت دکھانے کی رسم کے بھی مخالف تھے، کیونکہ اس سے دفن میں تاخیر لازم آتی ہے۔ استاذ صاحب کے جنازہ میں بحمد اللہ ایسی کوئی رسم نہ تھی۔ ورنہ مخلوق خدا اتنی امڈ آئی تھی کہ ایک نگاہ دیکھنے کو بے تاب تھی لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اولیا کی بات کی لاج رکھتا ہے تکوینی طور پر حالات ایسے بنے کہ میت دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔

حیا و اخلاص:

حضرت استاذ صاحبؒ پر حد درجہ حیا غالب تھی، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کنواری لڑکی سے زیادہ حیادار تھے، ہم نے استاذ صاحب کو اس کا مصداق پایا۔ آپؒ پر اخفا کا بھی بہت زیادہ غلبہ تھا

، ہر کار خیر میں اپنا حصہ ڈالتے تھے، مگر اس کو اخفا میں رکھا کرتے تھے، کسی سے اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ہمارے دوست قاری محمد زاہد مرحوم نے اپنی کتاب ''اخلاص'' تقریظ لکھنے کے لئے دی، اس پر آپؒ نے فرمایا کہ چونکہ کتاب کا نام اخلاص ہے، اس لئے اخلاص کا تقاضہ یہ ہے، کہ اس پر تقریظ نہ لکھی جائے اور یوں تقریظ لکھنے سے معذرت کر لی۔

تہجد، راتوں کا رونا، طلبا وعلما کی مالی اعانت کرنا، مدارس، مساجد اور دیگر دینی شعبوں میں جانی ومالی تعاون کرنا وصف لازم تھا، لیکن ان سب امور کو اخفا میں رکھتے تھے، بعد میں پتہ چلتا کہ اس میں بھی استاذ صاحبؒ کا حصہ تھا اور ایسے کئی واقعات ہمارے سامنے ہوئے۔

مہمان نوازی ومروت:

مہمان نوازی تمام انبیا علیہم السلام کی سنت اور اسلام کا وصف لازم ہے اور بہت سے فضائل اس باب میں وارد ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی ومروت دور دور تک مشہور تھی، بلکہ یہ اس علاقہ کا وصف خاص سمجھا جاتا ہے، آپؒ کے ہاں ہر وقت مہمانوں اور اہل تعلق کا ہجوم ہوتا تھا۔ دستر خوان قسم قسم کے کھانوں اور ہمہ قسم میووں سے بھرا رہتا۔ جو بھی جس وقت آتا اس کی خاطر داری، اکرام اور دل جوئی کرتے۔ کئی دفعہ ہم نے راستہ میں کھانا کھایا تاکہ بے وقت پہنچنے سے استاذ صاحبؒ کو تکلیف نہ ہو، اس پر کافی ناراض ہوتے اور ہمیں ڈانٹ سننی پڑتی۔ طلبا وعلما کو آنے جانے کا کرایہ بھی دیتے، ہر وقت مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا، ہر نوع کے مہمان آتے تھے اور پورے ملک سے آتے تھے۔ کوئی مسائل پوچھنے کے لئے، کوئی تحقیق میں رہنمائی کے لئے، کوئی مکتبہ میں مطالعہ کے لئے، کوئی دعا وتعویذ کے لئے، کوئی انفرادی یا اجتماعی مسائل کے لئے۔ وہاں دیکھا کہ آپؒ ہر ایک کی مہمان نوازی کر رہے ہیں، تسلی دے رہے ہیں، مسائل حل کرا رہے ہیں اور ہر ایک کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ مہمانوں میں علما وطلبا، محققین ومعززین، حکومتی افسران و سیاسی رہنما، عوام وخواص ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ آپ ہر ایک کو پوری توجہ دیتے، ہر ایک کے ساتھ دیر تک بیٹھے رہتے، اُن کے مسائل سنتے، جواب دیتے، مناسب حل تلاش کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے۔ خدانخواستہ اگر کسی مہمان کے کھانے، پینے یا چائے، پانی میں تاخیر ہو جاتی تو صاحبزادگان اور خادمین کی خیر نہیں ہوتی تھی، ان کو خوب ڈانٹ سننی پڑتی اور سخت غصہ ہو جاتے تھے کہ مہمان کی خدمت میں کیوں تاخیر ہوئی۔

ایک دفعہ استاذ صاحبؒ کے چچا صاحب سخت بیمار ہوئے اور کوہاٹ ہسپتال میں داخل تھے۔ غالباً دو، تین دن ہسپتال میں داخل رہے اور پھر فوت ہو گئے۔ بندہ بھی ساتھ تھا، حقیر سی خدمت کا موقع بھی ملا، پھر ہم چچا صاحب

مرحوم کی میت کو لے کر ہنگو چلے گئے، وہاں پہنچ کر جلدی سے استاذ صاحبؒ نے مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا اور ہمیں دوسرے حجرے میں لے گئے اور زبردستی کھانا کھلایا اور خود بھوکے رہے۔

اجتماعی فکر، دینی غیرت اور تصلب فی الدین

"من لم یہتم بامور المسلمین فلیس منا" (کنز العمال او کما قالہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ مسلمانوں کے اجتماعی امور کی فکر نہیں کرتے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

وارث نبوی کی حیثیت سے استاذ صاحبؒ مسلمانوں کے اجتماعی امور کے بارے میں نہایت فکر مند رہتے تھے، جہاں کہیں مسلمانوں کی بدحالی، زوال و کمزوری کی خبریں سنتے تو بے چین ہو جاتے۔ راتوں کی نیند اٹھ جاتی، رنگ لال سرخ ہو جاتا تھا، مرغ بسمل کی طرح تڑپتے اور کڑھتے اور ہر ایک سے اس کا اظہار کرتے، ذہن سازی کرتے اور اپنی بساط کے مطابق تدبیریں سوچتے۔ عراق وایران جنگ ہو یا افغانستان وروس کا معرکہ، افغان امریکہ جنگ ہو یا عالم اسلام کے دیگر خطوں پر کفر کی یلغار...... ہم نے آپؒ کو بڑا بے چین پایا۔ ہر مسلمان کی خیر خواہی آپ کے دل میں موجزن رہتی، کوئی بھی شخص آپ کو اپنا غم سنا دیتا تو آپ نہایت غمگین ہو جاتے تھے، اس کی فریاد سنتے اور اس کے ازالے کی کوشش کرتے۔ دم دعا سے لے کر جرگوں تک بھاگ دوڑ کرتے۔ مصالحتی جرگوں اور دم تعویز کو کبھی پیشہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ خدمت خلق کے جذبے سے سرانجام دیا۔ ایک دفعہ ایک شخص تعویذ لینے کے بعد شکرانے کے پیسے دینے لگے، تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کیا میں تاجر ہوں جو تعویذ پر پیسے لوں۔

حضرت الاستاذ کا منہج فقہی

استاذ محترم کا زیادہ مشغلہ وانہماک علم حدیث میں رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ علم فقہ پر بھی آپ کو بہت زیادہ دسترس حاصل تھی اور اس میں بصیرت افروز رائے رکھتے تھے، جس پر آپ کے بعض رسائل وفتاویٰ شاہد عدل ہیں۔

(۱) حضرت استاذ صاحبؒ علم فقہ میں حنفی المسلک تھے اور شدت سے اس پر عامل تھے، امام صاحبؒ کی رائے کو بہت زیادہ ترجیح دیتے تھے اور امام صاحبؒ کی فقہی بصیرت کو قرآن وحدیث اور اقوال صحابہؓ کا نچوڑ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک فقہی مسئلہ سامنے آیا اور اس کی مخالف جانب تحقیقات شروع کیں، دو تین ہفتہ کی تحقیقات اور سینکڑوں کتب کی ورق گردانی کے بعد جو مسئلہ منقح ہو کر سامنے آیا، وہ وہی تھا جو امام ابوحنیفہؒ نے ایک سطر میں بیان فرمایا تھا۔ اس پر حضرت استاذ محترم نے فرمایا کہ امام صاحبؒ کی تحقیق کو دیکھئے کہ اتنی تلاش وتحقیق بسیار کے بعد بھی

مسئلہ وہی ہے جو امام صاحبؒ نے دوٹوک الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

(۲) حنفیت میں متقدمین کی رائے کو شدت کے ساتھ ترجیح دیتے تھے اور متاخرین کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے متعلق نقل فرمائی تھی کہ تمام متاخرین کی رائے کو لینا اور ہر جزیہ کو دلیل کے مطابق منطبق کرنا اور اس کو حنفیت سمجھنا ہمارے لئے ضروری نہیں اور نہ ہی ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔

(۳) فقہی مسائل میں تقلید کو ضروری سمجھتے تھے اور اس بارے میں دلائل کے بھی قائل نہ تھے، ایک دفعہ بندہ نے تقلید کے بارے میں دلائل کا استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تقلید ائمہ پر ہمارا ایسا شرح صدر ہے اور ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اس پر دلائل کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) حضرت استاذ محترمؒ اپنے اکابر علماء دیوبند کی اتباع میں تقلید جامد مذموم کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس بارے میں معتدل رائے رکھتے تھے اور ترتیب مراتب کے قائل تھے، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا کہ اگر فقہی رائے قرآن وسنت سے معارض ہو جائے تو قرآن وسنت مقدم ہیں، پھر اگر علماء دیوبند کی رائے فقہائے متقدمین کے معارض ہو جائے تو فقہائے متقدمین مقدم ہوں گے، پھر اگر معاصر علما کی رائے اکابر علماء دیوبند کے معارض ہو جائے تو اکابر کی رائے مقدم ہوگی۔

(۵) حضرت استاذ صاحبؒ چاروں فقہوں میں حنفی مسلک کو کئی وجوہ سے مقدم سمجھتے تھے:

اولاً: اس لئے کہ اس میں جامعیت ہے جو دوسروں کی فقہ میں نہیں۔ تمام مسائل اس میں موجود ہیں۔

ثانیاً: امام صاحبؒ کی فقہی بصیرت، دقتِ نظر، شرف تابعیت، ورع وتقویٰ اور فقہ حنفی کا شورائی فقہ ہونا اس کی تقدیم کی بڑی وجوہات ہیں یہ خصوصیات باقی فقہی مسالک میں نہیں۔

ثالثاً: حنفی مسلک کو اقرب الی السنۃ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں بدعات کا شائبہ تک نہیں ہے۔

رابعاً: حنفی مسلک میں وسعت بہت زیادہ ہے، جو کہ دیگر مذاہب میں نہیں ہے، کیونکہ کبھی ایک جزیہ میں امام صاحبؒ کے کئی کئی اقوال ہوتے ہیں، جس میں مبتلی بہ کے لئے کافی گنجائش ہوتی ہے۔

خامساً: حنفی مسلک میں جدید مسائل کا حل بھی موجود ہے جو کہ دیگر مسالک میں اتنی گنجائشوں کے ساتھ نہیں ہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ نے تخصص فی الفقہ کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس میں ایک گھنٹہ فقہی اصول وقواعد کے متعلق تھا جو کہ پورے فقہی مسائل کا محور ومدار ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ فقہا کن اصولوں کی بنیاد پر مسائل جزئیہ کا استخراج کرتے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں اور ان قواعد سے کیا کیا جزئیات اخذ کیے جا سکتے ہیں، اس نصاب میں (۱)

الاشباہ والنظائر لابن نجیم ﷺ (۲) تاسیس النظر لابن زید دبوسی ﷺ (۳) شرح عقود رسم المفتی (۴) المو افقات لابن شاطبی ﷺ غرناطی (۵) اصول سرخسی۔ شامل تھیں۔

مصنفین اور فقہائے کرام کا تصنیفات وتالیفات میں کیا منہج رہا ہے اور فقہا کی خاص اصطلاحات کیا ہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لئے استاذ محترمؒ نے (۱) مقدمۃ ھدایۃ لعلامۃ عبد الحی لکھنوی ﷺ (۲) النافع الکبیر (۳) مقدمہ شامی وغیرہ کو نصاب میں رکھا ہے۔

مفتی کے لئے فقہی جزئیات کا احصا نہایت ضروری ہوتا ہے اور جزئیات کا یاد کرنا ضروری ہے ورنہ استفتا کے جواب میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے استاذ صاحبؒ نے عربی فتاوی جات کا نصاب مقرر کیا تھا، اس میں مندرجہ ذیل کتب تھیں: (۱) مبسوط سرخسی (۲) بدائع صنائع (۳) شامی

مبسوط سرخسی یہ کافی کی شرح ہے اور کافی امام حاکم شہیدؒ کی تصنیف ہے، یہ مکررات کو چھوڑ کر مرتب کی گئی تھی، جو امام محمدؒ کی چھ کتب پر مشتمل ہے، گویا یہ سب سے قدیم ذخیرہ ہے اور امام صاحبؒ کا فرمودہ ہے۔ بدائع صنائع وہ کتاب ہے، جس میں جزئیات کے دلائل کا احصا کیا گیا ہے اور اس میں وہ دلائل بھی موجود ہیں جو کہ عام کتب میں دستیاب نہیں۔ شامی کی معرفت کسی بھی عالم سے مخفی نہیں، جس میں جزئیات کے ساتھ دلائل بھی ہیں، حسن ترتیب بھی، ادیبانہ رنگ بھی اور فقیہانہ ذوق بھی۔ کوئی بھی عالم شامی سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

کوئی بھی مفتی جب فتوی دیتا ہے، بعض اوقات کتابوں، فتاوی جات میں تعارض وتناقض بھی ہوتا ہے، دو اقوال وفتاوی میں کون سا راجح اور کون سا مرجوح ہے، ناسخ ومنسوخ کا فیصلہ، قوی وضعیف، ظاہر الروایۃ ونادر الروایۃ کا تعین سب سے زیادہ مشکل کام ہے، ظاہر ہے اقوال وفتاوی جات میں جس کا جو درجہ ہوتا ہے، اس کا قول بھی اس کی حیثیت کے بقدر قوی وکمزور ہوتا ہے۔

علماء اسلام نے اس بارے میں کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کو تراجم کہتے ہیں، استاذ صاحبؒ نے تخصص کے نصاب میں تراجم کا بھی کافی حصہ مقرر کیا، جس میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں۔ (۱) مفتاح السعادۃ لعلامۃ طاش کبری زادہ (۲) فوائد البھیۃ لعلامۃ عبد الحی ﷺ لکھنوی (۳) تاج التراجم (۴) حدائق حنفیہ (۵) عقود الجمان۔

بعض اوقات زمانے کے تغیرات وانقلابات سے مسائل اور عرف بدل جاتے ہیں یا بعض جدید نوعیت کے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں یا نئی بدعات جگہ پکڑ لیتی ہیں اور قدیم وجدید ادوار کے مسائل وجزئیات کا آپس میں انطباق وتوافق پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے، جس میں مفتیان کرام کو فتوی دینا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہ

تحقیق وتطبیق صحیح ہے یا غلط، اکابر کے فتوی کے مطابق ہے یا نہیں، نیز استفتا کے حل کرانے کا طریقہ وسلیقہ کیا ہونا چاہیے۔اس کے لئے حضرت استاذ صاحبؒ نے اکابر علماء دیوبند کے فتاوی جات کو نصاب میں مقرر فرمایا کہ ہماری تحقیق اکابر کے خلاف نہ ہو،فتوی وجواب میں بصیرت وخوداعتمادی ہو،تطبیق میں آسانی ہو،طرز وطریقہ اکابر کے مطابق ہو نیز مخالف کی آراودلائل بھی سامنے آئیں،اردو کے درج ذیل فتاوی طالب علم سے پڑھوائے جاتے تھے:

(۱) امداد الفتاوی (۲) امداد الاحکام (۳) کفایت المفتی (۴) فتاوی محمودیہ (۵) فتاوی رحیمیہ (۶) فتاوی دارالعلوم دیوبند (۷) امداد المفتیین۔

اللہ تعالی حضرت الاستاذؒ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس کی راحتیں نصیب فرمائے، حقیقت یہ ہے کہ ہم اس بحر ذخار سے کچھ بھی استفادہ نہ کر سکے، اپنی اس محرومی کا احساس ستائے گا۔اللہ تعالی آپ کے فیوض وبرکات سے محروم نہ فرمائے۔آمین

فاضلانہ نقوشِ امینیہ کے چند ناتمام نقوش

مولانا محمد عمران ولی درویش، کراچی

بچیہ چرتہ زے؟ (بیٹا کہاں جارہے ہو؟)

موری اکوزی تہ زم! (اماں! اکوزہ جارہا ہوں)

بچیہ بیا چرتہ روان ئے؟ (بیٹا پھر کہاں روانہ ہوگئے؟)

موری ہنگو کوہات تہ، (اماں! ہنگو کوہاٹ کی طرف)

بارش ہو یا طوفان، سردی ہو یا گرمی، خزاں ہو کہ بہار، چند دنوں کے لیے گاؤں رخصت پر آئے ہوئے اور ان دو مقامات کے لیے پابہ رکاب والد محترم مفتی محمد ولی درویشؒ اور پیاری دادی جان مرحومہ کے درمیان یہ سوال و جواب کا وہ پرلطف منظر آج بھی نگاہوں میں گھومتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں ثبت وموجود ہے۔

قصہ مختصر کہ جب والد محترم جامعۃ العلوم الاسلامیہ سے اپنے آبائی وطن تشریف لاتے، تو بلا ناغہ ان مختصر چھٹیوں میں ان دو جگہوں پر جانا اولین ترجیح اور جانے کے لیے بے قراری اور تڑپ قابل دید ہوتی تھی۔

اکوڑہ خٹک تو دارالعلوم حقانیہ وفاق المدارس العربیہ کے تحت منعقدہ امتحانات سالانہ میں نگرانی کے لیے تشریف لے جاتے اور وہیں آپ کے جگری دوست اور کئی زبانوں کے ماہر مشہور شاعر حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی صاحب رحمہ اللہ بھی موجود ہوتے، جہاں علمی اور ادبی محافل اپنی آب وتاب سے منعقد ہوتیں اور شعر وشاعری وسخن گوئی کے اعلیٰ شذرے حوالہ قرطاس وقلم ہوجاتے۔

حضرت درویش رحمہ اللہ چونکہ خود بھی پشتو اردو اور فارسی ادب کے منجھے ہوئے شہسوار وادیب اور صاحب طرز شاعر تھے، تو حضرت فانی علیہ الرحمۃ سے ایسا قلبی تعلق استوار ہو چلا تھا کہ خط وکتابت کے ذریعے اپنی دوری نہ ہونے کا احساس جاگزیں رکھا، جب بھی کوئی نتیجۂ فکر بصورت غزل حوالہ قرطاس وقلم ہوتا یا شعری مجموعہ مرتب ہوکر طبع ہوتا یا کوئی تصنیف وتالیف منظر عام پر آتی تو بلا تاخیر حضرت درویشؒ کو ارسال فرما چکے ہوتے۔

بہرحال یہ الگ داستان الفت ومحبت ہے جو شاید کبھی دل کی گہرائیوں اور احساسات کے پردوں میں پردہ نشینی سے نکل کر زیب قرطاس ہوکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوجائے۔ رہی بات ہنگو کی طرف سفر اور بے قراری سے اس دن کے انتظار کی تو یہی ان چند بے ربط و بے جوڑ سطور کا محور ہے۔

والد محترم رحمہ اللہ نے ۱۹۶۹ء کو جامعہ علوم اسلامیہ میں بعمر ۲۶ سال درجہ ثانیہ میں داخلہ لیا، جامعہ اس وقت اکابر علماء کرام اور اساطین علم وفضل کا علمی وعملی قافلہ اور روحانی وفکری سلسلۂ ذہبیہ محدث العصر شیخ الاسلام علامہ بنوری علیہ الرحمۃ کی سرپرستی اور حسن اہتمام کے تحت اپنا مبارک سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

حضرت محدث العصر کی عقابی اور جوہر شناس نگاہوں نے ملک بھر سے وہ گوہر یکتا اور علوم وفنون کے شناور و شاہسوار اور علم وعمل کے وہ سمندر اپنی دور رس فہم وذکا، سلیقہ شعاری، علم دوستی، وہبی محبوبیت ومقبولیت اور اخلاص وللہیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کی بنا پر اس خوبصورت انداز سے ایک لڑی میں پروکر جامعہ کی خدمت کے لیے مہیا فرمادیئے تھے کہ ایک ایک بزرگ، ایک ایک استاد، ایک ایک مدرس اپنے وقت کے علمی وعملی ماہر محقق، مدقق اور

مجسمۂ اخلاق وسیرت والفت ومحبت اور دینی حمیت وغیرت کے گوہر نایاب تھے، ع: ؎

قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری

اسی لیے حضرت کا لگایا ہوا باغ روزِ اول سے آج تک محدث العصر علیہ الرحمۃ کی ان مقبول کاوشوں کی بنا پر مرجع خلائق اور اطراف عالم سے علم کے حصول کے لیے آنے والے طلاب علم کی اولین ترجیح تھی، ہے اور ان شاء اللہ رہے گی۔ من جملہ ان عظیم مثالی شخصیات میں سے، حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کے قافلۂ حق کے رکن رکین اور علوم وفنون کے شاہسوار حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ بھی تھے۔

حضرت مولانا شہید رحمہ اللہ کا نام نامی ہم نے بالکل بچپن میں ہی سنا تھا کہ والد محترم جب وطن آکر ہنگو کی طرف رخت سفر باندھتے تو "استاذ صاحب" کے پیارے الفاظ ان کی زبان سے کئی بار سننے کو ملتے اور اس وقت سے یہ نام از بر اور دماغ پر نقش تھا۔

والدہ محترمہ فرماتی ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے استاذ صاحب سے حد درجہ عشق اور بے پناہ محبت اور عقیدت تھی، باد وباراں اور سخت سردی ہو یا گرمی استاذ صاحب کی زیارت کے لیے بیحد بے قرار و بے چین رہتے، اسی (۱۹۸۰ء) کی دہائی میں آمد ورفت کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی، اس کا اندازہ اس وقت کے دیکھنے والوں کو خوب ہوگا، حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کے گھر سے مین روڈ تک جہاں سے بٹ خیلہ شہر کے لیے گاڑیاں دستیاب ہوتی تھیں اور وہ بھی اکا دکا، کافی پیدل راستہ تھا، جو دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ سنسان بھی ہوتا تھا اور گھر سے وہاں تک پیدل جانا کارے دارد۔

مردان کے حضرت مولانا قاری اسد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک بار میں ان کے ساتھ اسی راستہ پر مین روڈ تک حضرت مفتی صاحب کے گھر سے آیا تو جب روڈ تک پہنچے تو مفتی صاحب نے پیچھے مڑ کر سرد آہ بھر کر فرمایا کہ: انسان بے پر پرندہ ہے، یعنی اتنی مسافت طے کرلیتا ہے۔ بٹ خیلہ پہنچنے کے بعد کوہاٹ تک کا سفر اور پھر وہاں سے ہنگو کے دشوار گزار پہاڑی سلسلے، مگر:

میاں عاشق ومعشوق رمزیست

کراما کاتبین را ہم خبرے نیست

اپنے استاذ حضرت اورکزئی شہیدؒ کی محبت والفت میں ایسے سرشار کہ فرصت ملتے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور وسیع اعتقادی تعلق خالص للہ فی اللہ اور علمی تعلق تھا، مولانا اورکزئی شہید رحمہ اللہ خداداد وہبی صلاحیتوں اور علوم وفنون کے حامل تھے اور یہی ادائے محبوبانہ تھی جس کی بنا پر حضرت مفتی صاحبؒ ان سے بے حد متاثر تھے۔

جب ۱۹۸۰ء میں حضرت اورکزئی شہیدؒ جامعہ بنوری ٹاؤن سے اپنے آبائی علاقہ شاہو وام ہنگو تشریف لے گئے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ مضبوط علمی رشتہ اسی طرح نبھائے رکھا اور یقیناً یہ قلبی تعلق جانبین سے تھا، تمام علمی وعملی مشورے حضرت اورکزئی شہیدؒ سے ہی کیا کرتے تھے، جس پر ان کے مابین چلنے والا طویل مراسلاتی سلسلہ ہے۔

حضرت درویشؒ جس طرح اپنے قابل قدر محسن سے ملاقات اور ان کی زیارت کے لیے بے تاب رہتے، بعینہٖ یہی کیفیت حضرت اورکزئی شہیدؒ کی بھی ہوتی کہ وہ شدت سے ان کی آمد کے منتظر رہا کرتے، جو ان کے خطوط و مکاتیب سے ظاہر ہے۔

راقم کے نام بھیجے گئے ایک خط میں حضرت اورکزئی شہیدؒ حضرت درویشؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی کیفیت یہ تھی "کان مملوکی فصار مالکی" یہ مختصر سا جملہ جہاں اپنے اندر تعلق مابین کا ایک سمندر لیا ہوا ہے وہاں آپس کی الفت ومحبت اور اکرام واحترام کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ نے اپنے شیخ علامہ محدث العصر حضرت بنوری علیہ الرحمۃ سے قلبی تعلق اور جنون کی حد تک محبت کی بنا پر اپنے مدرسہ کا نام جامعہ یوسفیہ رکھا اور اپنے صاحبزادہ کا نام بھی 'یوسف' رکھا۔

حضرت درویشؒ اسی جامعہ یوسفیہ کی تاسیس کے موقع پر حضرت اورکزئی شہیدؒ کو بتاریخ ۱۱ جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ بمطابق ۲۷ اپریل ۱۹۸۰ء کو یوں مبارکباد اور ہدیۂ تہنیت پیش فرماتے ہیں:

هر بد خواه دِ په هر دو سرا سره بدرنگ شه
هر دشمن دِ شه ده بادله هنړے سپک
ده "درویش" دغه دعا صبح و مساده
شه یوسف "یوسفیه" دے مبارک

حضرت اورکزئی شہیدؒ سے والد محترمؒ کا طویل خط وکتابت کا سلسلہ چلا ہے، والد گرامی کے خطوط تو حضرت اورکزئی شہیدؒ کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے، مگر حضرت اورکزئی علیہ الرحمۃ کے خطوط کا عظیم ذخیرہ بحمد اللہ محفوظ وموجود ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کا ایک ایک خط سنبھال رکھا ہے، جو آج بھی ہو بہو ایسے ہی محفوظ ہیں، یوم الخمیس (وما ادراک مایوم الخمیس) ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء کو والد محترمؒ نے افغانستان کی سرزمین پر داعئ اجل کو لبیک کہا، نعش آبائی وطن لائی گئی تو جنازہ میں ایک جم غفیر امڈ آیا تھا، جامعہ کے اساتذہ کرام جو حضرت الاستاد مولانا امداد اللہ صاحب دامت برکاتہم (ناظم تعلیمات جامعہ ورکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان) کے بھانجے اور بھتیجے کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر مردان تشریف لائے ہوئے تھے، سب نے شرکت کی، نماز جنازہ حضرت رئیس الجامعہ ڈاکٹر عبد الرزاق

اسکندر صاحب مدظلہم نے پڑھایا، جنازہ کے بعد ایک نورانی شخصیت نے بے اختیار سینے سے لگائے رکھا اور ان کے بہتے آنسو مجھے ان کے کرب دروں کی خبرداری کر چلے، اور معلوم ہوا کہ یہی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ہیں۔

دوسری ملاقات جامعہ علوم اسلامیہ کے دفتر میں ہوئی جب بندہ (۱۴۲۱ھ) میں درجہ رابعہ کا طالب علم تھا، بہت الفت دی اور بار بار مجھے دیکھتے رہتے اور کسی گہری سوچ میں کھو جاتے۔ بندہ نے عرض کیا کہ ان شاء اللہ ہنگو حاضر خدمت بھی ہوں گا اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھوں گا، تو اس پر بہت مسرور ہوئے۔ چنانچہ جب ان کی طرف سے بندہ کے پہلے مراسلہ کا جواب آیا تو اس میں رقم طراز ہیں:

''معروض اینکہ ابھی تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بھتیجے مولوی معین الدین صاحب حیدری نے آں عزیز کا مکتوب پہنچایا۔ آپ اور خاندان کے دوسرے افراد کی خیریت اطلاع پا کر اطمینان ہوا، دفتر میں بوقت ملاقات آں عزیز نے مراسلت کا عزم ظاہر کیا تھا، اس کے عمل ہو جانے پر مسرت ہوئی''۔

حضرت شہیدؒ اسی حوالہ سے بطور پند و نصیحت مزید رقم طراز ہیں:

''حدیث شریف میں آیا ہے کہ والدین کی وفات کے بعد ان کے دوست واحباب سے تعلق رکھنا بر والدین کی ایک صورت ہے۔''

اسی مکتوب میں اپنے محبوب و محب شاگرد حضرت درویش علیہ الرحمہ کی ناقابل فراموش یادوں کے حوالہ سے یوں رقم طراز ہیں:

''فقیر تدیناً نہیں بلکہ اپنے مرحوم والد ماجدؒ سے موروثی طور پر پانے والی خصلت کی وجہ سے اپنے احباب کو کبھی بھولتا نہیں، کم از کم اپنی غفلت بھری دعاؤں میں سب کا ذکر کرتا ہوں، آپ کے والد ماجد نور اللہ مرقدہ کی یادیں تو اس ناکارہ کے لیے ناقابل فراموش ہیں، جس طرح خلوص و محبت کے ساتھ انہوں نے اس سیاہ کار کی طویل مدت تک باوجود اپنے علم و فضل کے خدمتیں کی ہیں ان کا نقش قلب حزیں پر اس طرح ثبت ہے جو شاید بعد از موت بھی نہ مٹ سکے گا''۔

حضرت اورکزئی علیہ الرحمۃ مزید فرماتے ہیں:

''بسا اوقات کسی نہ کسی مناسبت سے ان کا ذکر خیر احباب کی مجلسوں میں بلکہ جامعہ یوسفیہ کی درسگاہوں میں بتوفیقہ تعالیٰ ہوتا رہتا ہے، کل بھی اپنی مجلس میں اعتکاف کے ساتھیوں کے ساتھ مرحوم کا ذکر خیر ہوا، حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ اور آپ کے دوسرے برادران کو مفتی صاحبؒ کا خلف صدق بلکہ نعم البدل بنائے، آمین اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان بنا دے، واللہ علی کل شیٔ قدیر۔''

اپنے محب و محبوب شاگرد کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی محمد ولی صاحب کے ساتھ جس نوعیت کا تعلق اس فقیر کا رہا، ان کا حق نہ ان کی حیات میں ادا کرسکا اور نہ ان کے انتقال کے بعد، اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے خاندان کو ہماری طرف سے جزائے خیر بخشے۔'' انتہی۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ سے حضرت والد ماجدؒ نے شرف تلمذ طے کیا تو اسی دن سے ان کی محبت کے دام اسیری میں اسیر بن کر رہ گئے، حضرت مفتی صاحبؒ نے بڑی عمر یعنی ۲۶ سال کی عمر میں علم حاصل کرنا شروع کیا تھا، اس وجہ سے بڑوں کی قدردانی اور ان کے مزاج کو پہچاننا مشکل نہ تھا، حضرت اورکزئی شہیدؒ کے مزاج جلالی سے بہت متاثر اور تقریباً اصول وقوانین کے حوالہ سے انہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ جہاں علوم وفنون میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ غیور مزاج کے مالک اور قبائلی اسلامی روایات کے امین اور خوددار تھے وہاں ایک مشفق اور مہربان استاد اور اصاغر نوازی کے زیور سے آراستہ تھے۔

ان تمام امور کا بخوبی اندازہ حضرت شہید اورکزئی علیہ الرحمۃ کے ان مکاتیب سے ہوا، جو گاہے بگاہے حضرت درویشؒ کو ارسال فرمائے ہیں۔

علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اپنے نجی معاملات اور مسائل کا حضرت اورکزئی شہیدؒ سے تذکرہ اور پھر مشفق استاد کا دلنشین انداز سے سمجھانا، کبھی طوالت اور کبھی ایجاز سے، یہ سب ان کی شفقت اور محبت پر شاہد عدل ہے، حضرت اورکزئی شہیدؒ ۲۲/۳/۱۴۰۶ھ - ۳/۱/۱۹۸۶ء کے ایک مکتوب میں گویا ''دوا شنانہ گلہ مندیم'' فرماتے ہیں:

''ششماہی امتحان کے موقع پر کراچی حاضر ہونے کا تخیل تھا، لیکن فی الحال ناممکن نظر آرہا ہے، آپ نے بھی اس سال اپنی ملاقات سے محروم رکھا، "یابلال !ماھذاالجفاء" کی دردبھری فریاد نوک زبان پر بے اختیار آرہی ہے، حق تعالیٰ حشر میں اپنے احباب واولیاء کے زمرہ میں ہم سب کو پھر جمع فرمادے آمین۔'' انتہی۔

حضرت اورکزئی شہید علیہ الرحمۃ بعض احباب کی بے وقت جدائی پر رقم طراز ہیں:

''الیس اللہ بکاف عبدہ'' کا ظہور تام ایسے ہی مواقع پر ہوا کرتا ہے، آپ جیسے ارباب اخلاص احباب کی دعائیں اور اپنے اکابر کی کفش برداری کی برکت تھی عملاً ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔'' انتہی۔

جامعہ یوسفیہ شاہووام جب ابتدائی مراحل تعمیر سے گزر رہا تھا تو اس کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''تعمیری کام فی الحال روک لیا ہے، سخت سردی ہے، صبح زمین یخ بستہ ہوتی ہے، سیمنٹ کا کام کامیابی کے ساتھ نہیں ہوسکتا نیز دن بھی بہت چھوٹے ہوگئے ہیں، مستری صاحبان اور مزدوروں کی دیانت کے ساتھ دنوں کی

کوتاہی کو جمع کیا جائے تو کام کے لحاظ سے نتیجہ صفر ہی بنتا ہے، مسجد کا اندرونی حصہ بالکل مکمل ہو چکا ہے، رنگائی کا کام بھی ختم ہوا ہے، بیرونی کام باقی ہے، اور جوانب ثلاثہ شمال وجنوب اور شرق کا برآمدہ بھی بن گیا ہے، صرف پلاستر وغیرہ باقی ہیں انشاء اللہ تعالیٰ تعطیلات میں مکمل کرلیں گے۔'' انتہی۔

کراچی کے تشویشناک حالات کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

''کراچی جنونی جذبات کے طوفان سے کافی متاثر ہوگا، کون مجرم اور ظالم ہے، کون مجبور اور مظلوم؟ اس سوال کے جواب پر غور کرنے سے قطع نظر مجھے دونوں متحارب قوتوں کی سیاسی بصیرت پر ترس آتا ہے، خصوصاً مہاجر جیسے طباع اور ذہین عنصر پر، کہ وہ اتنی بدیہی حقیقت کا ادراک کیوں نہیں کرسکے، کہ پٹھانوں کا وجود کراچی میں ان کے لیے ایک مضبوط حصار کا درجہ رکھتا ہے، خدانخواستہ سندھ سے جس دن پٹھانوں کے قدم اکھڑ گئے، مہاجرین اور سندھ میں آباد پنجابی حضرات کے زوال کا وہ پہلا دن ہوگا، پختون ہی سندھی عصبیت کے راستہ میں سنگِ گراں ہے، اسی طرح پٹھانوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اگر انہیں پاکستان میں مذہب کے زندہ رہنے سے دلچسپی ہے اور یقیناً ہے تو دوسری قومیتوں کی بہ نسبت مہاجر پختون کے زیادہ ہم آہنگ ہوسکتے ہیں، انتخابات اور مسٹر بھٹو کے بارے میں سرحد اور کراچی کے ردعمل میں کافی مماثلت موجود رہی۔'' انتہی۔

یہ کلمات بالا جہاں حضرت اورکزئی شہیدؒ کی قوم ووطن اور ان کے اتحاد ویگانگت کے لیے دلی کڑھن پر دلالت کرتی ہے، وہاں یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ وقت کے حالات اور سیاسیات کے خدوخال اور اس کے نتائج پر گہری نگاہ رکھتے تھے، جہاں ان کے مکاتیب میں علمی وعملی نایاب باتیں بصورت گہر موجود ہیں وہاں ملکی مفاد، ملکی اتحاد وسالمیت اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے ان کی بے چینی بھی ظاہر وواضح ہوتی ہے۔

ایک مکتوب میں بنام درویش فرماتے ہیں:

''اشارات المرام استاد صاحب (حضرت اقدس مولانا فضل محمد سواتی صاحب نوراللہ مرقدہ) کے حوالہ کرچکا ہوں بہت خوش ہوئے، البتہ الأمالی کے بارے میں باصرار پوچھ رہے ہیں، فقیر نے شاید پہلے ذکر کیا تھا، بدء الأمالی پر کچھ لکھنے کا خبط ہے، ابتداء کرچکا ہوں لیکن پہلے قدم پر رکاوٹوں کا سامنا ہوا، مولفؒ کے حالات مطلوب تھے نہیں مل رہے، جواہر، حدائق، فوائد، تاج، وغیرہ نے یا تو کچھ نہیں لکھا، یا بہت ناکافی لکھا، کاتب چلپی نے تمیمی کے طبقات میں ان کے ذکر کا تذکرہ کیا ہے، ازراہِ کرم 'طبقات سنیہ'' میں تلاش فرمالیں، اگر تذکرہ ملے تو من وعن بتقید جلد وصفحہ روانہ فرمالیں، نیز بدء الامالی پر کسی شرح یا حاشیہ کا علم ہو تو مطلع فرمائیں، میرے سامنے اب ضوء المعالی مع تحفۃ الأمالی، اخوند درویزہ صاحب کی فارسی شرح، مابزاروی صاحب کی پشتو میں شرح، اور چکوالی صاحب کی اردو کا حاشیہ موجود ہیں، نیز ملتان سے ایک عربی شرح کا فوٹو

حاصل کیا ہے، لیکن شارح کا پتہ نہیں چلتا، نہ مطبع کا، ہندوستانی قدیم طبع معلوم ہو رہا ہے، مصنف کے حالات ہدیۃ العارفین اور کشف الظنون اور مندرجہ بالا کتابوں یعنی الجواہر اور تاج التراجم کے علاوہ کہیں نظر آئے ہوں یا آ جائیں تو اطلاع کی زحمت گوارا فرمانے کی درخواست ہے۔'' انتہی۔

۱۹۷۶ء کے ایک تحریر میں ناصحانہ انداز میں رقم طراز ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ انسان فطرتاً شریر نہیں ہوتا اور نہ گمراہ ہوتا ہے، اس عالم آب وگل میں وہ اپنے ساتھ صحیح فطرت لے کر آتا ہے، ماحول کے اثر اور صحبت کی تاثیر سے وہ شر پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور گمراہی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے، حضور (فداہ نفسی) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ''مامن مولود الاوھو یولد علی الفطرۃ ثم ابواہ یھودانہ'' الحدیث، اس بارے میں واضح اور کافی شہادت ہے، طلبہ کو میں ہمیشہ یہی تلقین کرتا ہوں کہ صحبت اور دوستی بنانے کا راستہ چھوڑ دو، صرف کتاب کو اپنا دوست سمجھو، آج جب کہ خضر کے لباس میں شیاطین پھرتے ہیں ''السلامۃ فی الوحدۃ'' ہی راہ نجات ہے۔''

مزید تحریر فرماتے ہیں:

''میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے اکثر بھائی صالح اور طالح کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر ہیں، صالح کا گمان کر کے طالح کے دام صحبت میں پھنس کر اپنی اولیٰ وعقبیٰ دونوں کو تباہ کر بیٹھتے ہیں۔'' انتہی۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ کے مایہ ناز مخلص ومحب شاگرد مفتی محمد ولی درویشؒ جب جامعہ علوم اسلامیہ میں ۱۹۷۸ء کو تخصص فی الفقہ الاسلامی سے سند فراغت حاصل کر چکے تھے تو آپ کے محبوب استاد ومشفق خیر خواہ سرپرست حضرت مولانا اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے غالباً ۱۹۸۰ء میں ہنگو میں جامعہ یوسفیہ کی بنیاد رکھی، آپ نے بہت اصرار کے ساتھ حضرت درویشؒ کو ہنگو شاہو وام میں آنے کی دعوت دی کہ یہاں آ کر اپنا علمی وعملی سفر جاری رکھیں، مگر شاید کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا، وہاں جانے کی ترتیب نہ بن سکی، مگر اس معاملہ کی وجہ سے نہ تو حضرت اورکزئی شہیدؒ کی بے تحاشا شفقتوں، الفتوں اور محبتوں میں فرق آیا اور نہ ہی ان کے مخلص ومحب شاگرد کی دلی عقیدت میں ذرہ برابر کمی آئی، یہی الفت تادم مرگ جاری رہی، یہاں تک کہ ۱۹۹۹ء میں ان کے محبوب ومحب شاگرد درویشؒ نے کم عمری میں جانب عقبیٰ رخت سفر باندھا اور مکاتیب کا یہ سلسلہ ذہبیہ بالآخر اختتام پذیر ہوا، انہی محبتوں اور اپنے شاگرد کی بے لوث الفتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت اورکزئی شہیدؒ بنام راقم بتاریخ ۱/۵/۱۴۲۴ھ کے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب مرحوم جو کہ ''کان مملوکی فصار مالکی'' کی تفسیر تھے، کی خدمات میرے لیے ناقابل فراموش ہیں، درس میں ساتھیوں سے اسی عنوان سے ان کا ذکر خیر کرتا رہتا ہوں۔'' انتہی۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ کی جہاں ہمارے والد مکرمؒ پر بے انتہا توجہات اور شفقتیں تھیں، وہاں ہم ادنی طالب علموں پر بھی ان کی توجہات وشفقتیں ان کی ''اصاغر وذرہ نوازی'' کی روشن دلیل تھی۔

جامعہ علوم اسلامیہ حضرت علیہ الرحمۃ سے پہلی ملاقات کا شرف ۱۴۲۱ھ کو حاصل ہوا تھا تب میں نے عرض کیا تھا کہ میں ان شاء اللہ آپ کی خدمت میں کوہاٹ ہنگو حاضر ہوں گا وقت گزرتا رہا، حالات، مشاکل ومصائب کے طوفانوں کے تھپیڑوں کی زد میں اتنی فرصت نہ مل سکی کہ ان کے در پر حاضری دے سکوں۔

ان کی حاضر دماغی، توجہ اور خودداری وشفقت کو داد دیجیے کہ جب غالباً ۲۰۰۷ء میں مردان میں ہمارے جامعہ کے ناظم تعلیمات اور اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مولانا مفتی امداد اللہ صاحب مدظلہ کے قائم کردہ ''جامعہ اسلامیہ بابوزئی مردان'' کے افتتاح کے بعد حضرت اورکزئی شہیدؒ سے جیسے ہی گلے لگا تو گلے لگاتے ہی پہلا جملہ سرگوشی کے انداز میں میرے کان میں فرمایا کہ: ''تہ رانغلے'' کہ تم آئے نہیں، تب یہ احساس اور زیادہ مضبوط ہو چلا کہ ہم الحمد للہ ان کی توجہات اور شفقتوں سے محروم نہیں۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ کا یہ محبت والفت کا معاملہ صرف کسی ایک فرد یا خاص شخص کے ساتھ نہ تھا، بلکہ اپنے تمام اکابر اساتذہ کرام کے ساتھ اور ان اکابر اساتذہ کا آپ کے ساتھ یہ مبارک سلسلہ تعلق تھا، اور مکاتیب کا سلسلہ برابر جاری رہتا، چنانچہ محدث العصر شیخ الاسلام حضرت علامہ محمد یوسف بنوری قدس سرہ اپنے ایک مکتوب بنام حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''برادر محترم وفقکم اللہ وسلمکم ...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ کہ بخیر منزل مقصود پر پہنچ گئے، الحمد للہ کہ وہ پریشانی ۴۸ گھنٹے بعد ختم ہوگئی صورت حال صحیح معلوم ہوگئی، دعوات صالحہ میں فراموش نہ کریں، سب اعزہ حضرات کو سلام قبول۔ والسلام

محمد یوسف بنوری عفی عنہ، ۲۳ شعبان ۹۳ھ''

یہ چند کلماتِ بابرکات بالا جو محدث العصر علیہ الرحمۃ نے حضرت اورکزئی شہیدؒ کے نام ارسال فرمائے ہیں، ایک چھوٹے سے جیبی سائز کارڈ پر درج ہیں اور بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سطور بہت سرعت میں لکھے گئے ہیں اور اس سے یہ بخوبی مترشح ہوتا ہے کہ مولانا اورکزئی شہیدؒ اپنے اکابر کے معتمد اور قابل اعتبار احباب میں سے تھے۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ سے ہمارے والد محترم حضرت درویشؒ کا جو قلبی تعلق، دلی عقیدت اور حضرت اورکزئی شہید علیہ الرحمۃ کی ہمارے والد محترم پر توجہات اور اکرام کا جو مثالی معاملہ تھا شاید اس دور میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے، پانچ، چھ سال کی عمر سے ہی ان کا یہ دوستانہ تعلق دیکھنے کو ملا، والدگاان کی طرف جانے کا وہ حسن اہتمام، فرطِ جذبات

میں جلدی جلدی سامان کی تیاری، مسکراہٹ کے ساتھ روانگی آج بھی نگاہوں میں وہ مناظر گھومتے ہیں۔

حضرت والد ماجد رحمہ اللہ زمانہ طالب علمی سے ہی ان کے گرویدہ تھے، جامعہ علوم اسلامیہ کے وسطانی دارالاقامہ میں ان کے کمرہ میں ان ہی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ والد محترم کی بعض درسی کاپیوں 'جس میں انہوں نے مختلف کتابوں کے دروس ضبط کیے ہیں' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اورکزئی شہیدؒ اپنی کاپیاں انہیں دیتے اور والد صاحبؒ ان سے نقل کر کے اپنے پاس ذخیرہ کرتے، سلم العلوم (۱۹۷۲ء) کی کاپی سے یہی مترشح ہوتا ہے۔

سلم العلوم کی درسی کاپی میں ایک جگہ بتاریخ ۶ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ بمطابق ۹ مئی ۱۹۷۳ء بروز جمعرات یوں تحریر ہے:

''الحمد اللہ والمنۃ کہ بحث تصورات بخیر وخوبی باختتام رسید وباہم افادات حضرت مولانا محمد امین صاحب زید مجدہم تا اینجا باختتام رسیدہ۔ الراقم محمد ولی درویش عفی عنہ درجہ خامسہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن''

سلم العلوم کی اسی درسی کاپی کے سرورق پر لکھی گئی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۱۹۷۲ء میں سلم العلوم مولانا اورکزئی شہیدؒ کے زیر تدریس تھی، ''تقریر سلم العلوم از افادات حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی حفظہ اللہ من شر حاسد اذا حسد'' کی اس عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ درویش علیہ الرحمۃ نے سلم العلوم آپ ہی سے پڑھی کہ اس کے آخر میں تاریخ ۱۹ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ درج ہے۔

شاعر ہونے کی بنا پر اس کاپی کے اسی سرورق پر پشتو کا ایک مزیدار شعر بھی درج ہے:

شوم پہ مینز دہ لارے کی حیران خدایہ

نطق م محتاج شودہ برھان خدایہ

جب کہ اس کے نیچے جلی حروف میں فارسی کا بھی یہ شعر ملاحظہ فرماتے جائیے:

زانگہ کہ ترا ہرمن مسکین نظراست

آثارم ازآفتاب مشہور تراست

جب کہ ایک رجسٹر کے ابتدائی صفحات پر حضرت درویش علیہ الرحمۃ کی ضبط کردہ تقریر تفسیر بیضاوی شریف کے آخر میں درج ہے:

''الحمد اللہ تعالیٰ کہ از نقل تقریر دلپذیر بروز جمعۃ المبارک بوقت صبح ۳۰ ربیع الاول فارغ گشتم۔ الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا أن ھدانا اللہ''

اور الراقم محمد ولی درویش بقلم خود کے نیچے حضرت اورکزئی شہیدؒ کے یہ چند مبارک کلمات ان کے دست مبارک

سے درج ہیں:

''مندرجہ بالاتحریر ہمارے جلیل القدر استاذ جامع معقول ومنقول حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عجل اللہ سبحانہ صحتھم وعافیتھم ورزقنا صحبتھم کے بیضاوی شریف پر فاضلانہ تقریر کے چند ناتمام نقوش جلوہ افروز ہیں جسے احقر نے قلم بند کیا تھا۔

محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ ۴ مئی ۷۳ء، ۳۰ ربیع الاول ۹۳ھ۔''

۴۳ سال قبل یہ تحریر بالا اور اس کے پس منظر میں بہت سے مناظر پوشیدہ اور الفتوں کی ایک داستان گم شدہ ہے، یہ حضرات ایک ایک کر کے جانب عقبیٰ کی طرف جاچکے ہیں، اور:

تلک الآثار تدل علینا

اپنے پیچھے بہت علمی آثار وانمٹ نقوش چھوڑ چکے، اور یہ وہ آثار ہیں کہ جسے مٹایا نہیں جاتا بلکہ عظیم لوگوں کی عظیم یادگاروں کے طور پر محفوظ کیا جاتا ہے۔ امرؤالقیس نے تو اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ یوں کہا تھا:

خرجت بھانمشی نجر وراثنا

علی أثرینا ذیل مرط مرحل

میں اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر نکلا اور ہم اپنے پیچھے ریشمی منقش چادر کو آثار قدم مٹانے کی غرض سے کھینچ رہے تھے۔

مگر شاید یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، یہاں ان آثار کو زندہ رکھا جاتا ہے، ان فاضلانہ نقوش کو جو ان کی علمی و عملی حیات بابرکات سے نقاب کشائی کرتی ہیں اگلی نسلوں تک منتقل کیا جاتا ہے، جس سے راہِ علم وعمل کے شاہسوار ذہنی دماغی اور فکری تشحید اور راہنمائی حاصل کر کے اپنے لیے راہ ہموار کرتے ہیں، ان کے کھٹن اور پُردرد حالات اور حصول علم میں جا بجا صعوبات اور مشاکل ومصائب کو مدنظر رکھ کر ہمت واستقلال حاصل کرتے ہیں، ان ہی بزرگوں کے حالات پڑھ کر کبھی تو دل شاداں وفرحاں اور باغ باغ ہوجاتا ہے اور کبھی غموم وہموم کی وادیوں کی سیر کو نکل جاتا ہے، تب اپنی مشکلات ومصائب ہیچ نظر آنے لگتی ہیں اور دل اطمینان حاصل کرتا ہے۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ نے بھی اپنے پیچھے کافی انمٹ فاضلانہ نقوش اور علمی عملی یادگار چھوڑے، بہت سے علمی امور جن پر آپ نے قلم اٹھایا تھا کچھ پورے ہوئے اور کچھ اسی طرح ادھورے کے ادھورے رہ گئے، جن کی تکمیل کا عزم مصمم تھا مگر:

ما کل مایتمنی المرء یدرکہ

تجری الریاح بمالاتشتھی السفن

صد افسوس کہ بتاریخ ۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ کو یہ المناک خبر سماعتوں سے ٹکرائی کہ مولانا محمد امین اورکزئی صاحب اپنے رفقا کے ساتھ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے باغ ''جامعہ یوسفیہ'' شاہو وام ہنگو میں جیٹ طیاروں کی بمباری کی زد میں آ کر ہمیشہ کے لیے زندہ وجاوید ہو گئے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس المناک حادثہ میں جہاں حضرت اورکزئی شہیدؒ نے جام شہادت نوش فرمایا وہاں ان کے بہت سے علمی وعملی نقوش اور نایاب ونادر اشیا شہید ہوئیں۔

اپنے والد ماجد مفتی محمد ولی درویشؒ جن کا سانحۂ ارتحال یوم الخمیس ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء کو قندھار افغانستان میں پیش آیا، جن کی جدائی کا غم آج بھی اسی طرح تر وتازہ ہے اور عجیب تر یہ کہ دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، والد کی جدائی ایک ایسا غم ہے کہ بھلانے سے بھولتا نہیں، انسان چاہے جس مقام پر بھی پہنچے، خود صاحب اولاد ہو جائے مگر والد کی جدائی کا صدمہ تازہ ہی رہتا ہے، کہیں نہ کہیں ان کی یادیں سامنے ہی رہتی ہیں۔

غم بھولتا نہیں بھلانے سے

آنکھ نم ہوئی مسکرانے سے

آج بھی مجھے بذاتِ خود اپنے والد ماجد جن کی جدائی کو گزشتہ ۱۱ دن پہلے سترہ سال مکمل ہوئے، اور آج ۳۰ اگست ۲۰۱۶ء کو اٹھارہویں سال کے ۱۱ دن اوپر ہوئے، ان کی ادائیں یاد ہیں، کم عمری میں ہی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے تھے مگر آج بھی عالم خیال میں باتیں کرتا، مسکراتا، گھر سے نکلتا، گھر میں داخل ہوتا، مسجد کی صف اول میں، مسجد کے حوض کے کنارے بیٹھ کر وضو کرتے، وضو سے قبل وضو خانہ کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھنا، صبح نماز کے بعد گھر آتے ہوئے ان کی آہٹ، چابیوں کا شور، دروازہ کھلنے کی آواز، اپنے بستر پر ہدایہ ثانی کی ملتان سے مولانا فیض احمد ملتانی علیہ الرحمۃ کی تحقیق سے چھپی ہرے رنگ کی ''عینی'' کا مطالعہ کرتے ہوئے، فکس سات بجے ناشتہ، ناشتہ سے قبل کڑوی جڑی بوٹی کا پینا، اور پھر آخری دن گھر سے نکلنے کا وہ منظر، آخری چائے کا پیالہ اور اس پر جمی ہوئی ملائی اور پھر رکشہ میں بیٹھ کر بس اڈہ کی طرف روانگی، افغانستان پہنچ کر پڑوس میں مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کے فون پر اپنے بخیر وعافیت پہنچنے کی اطلاع اور پھر اسی رات کی صبح کو ان کی وفات کی دلدوز خبر، ان کی نعش مبارک کی آمد اور نماز جنازہ وتدفین اور اس موقع پر ہلکی پھلکی پھوار: کچھ کچھ تو مجھے یاد سب یاد نہیں ہے

اس عظیم حادثہ کے بعد دوسرا عظیم حادثہ ہمارے استاذ نا المکرم مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت جس نے حواس باختہ کر دیا تھا اور ان کا زخم جدائی بھی تا ہنوز مندمل نہیں ہو پایا اور پھر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی اس طرح اچانک فرقت نے تو اعصاب توڑ کر رکھ دیئے تھے، مولانا اورکزئی شہیدؒ کی توجہ والفت کی بنا پر والد گرامی کا غم کافی ہلکا ہو چکا تھا، ان کی عنایات، دعائیں اور ذرہ نوازی نے بہت مطمئن کر دیا تھا مگر بقول خوشحال خان خٹک بابا:

دہ طبیبہ خلق حیلہ دہ شفاکڑہ

زہ خستہ دہ خپل طبیب دہ لاسہ یمہ

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ کے مکاتیب، مراسلات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آپ متصلب فی الحنفیہ، اپنے اکابر کے منہج اور طریقوں پر پابندی سے کاربند، اپنے علاقہ میں ایک عظیم مصلح اور اپنے نظریات پر پختہ طریقہ سے عمل پیرا تھے، آپ کے علمی آثار میں بہت ساری چیزیں ان شاء اللہ منظرِ عام پر آئیں گی، بعض تو طبع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں جن میں نشر الازہار قابل تذکرہ ہے۔

برادر مکرم جانشین حضرت مولانا اورکزئی شہیدؒ مولانا محمد یوسف صاحب اور برادرم مولانا محمد طفیل صاحب کی کوششوں اور کاوشوں سے حضرت شہیدؒ پر سہ ماہی رسالہ ''المظاہر'' کو ہاٹ خاص نمبر شائع کر رہا ہے، مجھے ان احباب کا حکم اور اصرار تھا کہ حضرت شہید کے حوالہ سے کچھ عرض کروں کہ ان کا اور میرے والد ماجد کا بہت زیادہ تعلق رہا ہے، یہ چند کلمات وسطور نہ معلوم کیسے زیر قلم آ گئے، جب بھی اس بابت سوچتا ہوں، ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے اور دل ودماغ بوجھل سے ہو جاتے ہیں۔ شاید خوشحال بابا کے غزل کا یہ شعر میری دلی کیفیت کا ترجمان بن سکے:۔

سہ خواگہ یاران چہ ماخوشحال لیدل پہ ستر گو

اوس ئے پہ ژڑا ژڑا مزار لرہ ور درومم

مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سطور میں حضرت الشہید ہی کے مبارک کلمات پر ختم کروں جو انہوں نے ۱۹۸۲ء میں ہمارے والد ماجدؒ کو بصورت خط ارسال فرمائے تھے:

''احباب بشرطیکہ مخلص ہوں، سے جفا کاری میرے نزدیک سب سے بڑی گالی ہے اور اس مجموعۂ عیوب کے ماضی کے اوراق پر بڑے بڑے بدنما داغ آپ کو نظر آئیں گے، لیکن داغ شاید صحیفۂ زندگی کے کسی ورق کے کسی گوشہ میں بھی نظر نہیں آ سکے گا تخم ہاشمی ہو، اور مٹی پختون سرزمین کی، بے مروتی اور بے وفائی شاید ایسے درخت کے پھل ہو ہی نہیں سکتیاس معاملہ کے بارے میں اتنا کہنا شاید کافی ہو ؎

بسیار در دل آمد اندیشہا و رفت

نقشے کہ آں نمی رود از دل
نشان تست با من ہزار نوبت اگر دشمنی کنی
اے دوست ہمچناں دل من مہربان تست۔"

ان تحریرات وان بے شمار رمز لیے اشارات اور عقیدت ومحبت کے مراسلوں کو دیکھتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر رقصاں ہو جاتا ہے:

یدوم الخط فی القرطاس دھرا
وکاتبہ رمیم فی التراب

اور حضرت درویشؒ ہی اکثر لکھا کرتے تھے:

گوتی قلم تہ پہ ژ ژا شوے
خط بہ باقی وی منگ بہ توری خاوری شونہ

بات شاید لمبی ہوگئی لیکن:

بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مولانا عمر انور بدخشانی، کراچی

حضرت مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کا نام پہلی بار کب سنا، یہ ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے آپ کی ملاقات اگرچہ بہت تاخیر سے اور بہت مختصر دورانیے پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن وہ آپ کے دل و دماغ کو اپنے اخلاق، کردار اور گفتار سے متاثر ضرور کر دیتے ہیں، مولانا امین اورکزئیؒ کی شخصیت بھی بندہ کے لیے کچھ ایسی ہی تھی، جن کی صحبت اور زیارت بہت کم نصیب ہوئی، لیکن ان کا تذکرہ خیر ہمیشہ اپنے اساتذہ کرام سے بار ہا سنا، حضرت بنوری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد امام اہل سنت مفتی احمد الرحمنؒ کے دور اہتمام میں وہ اپنے علاقے ہنگو واپس چلے گئے تھے، لیکن قلبی و روحانی طور پر وہ کبھی بھی اپنے آپ کو حضرت بنوریؒ اور جامعہ سے دور نہ رکھ سکے، مولانا امین اورکزئی شہیدؒ اگرچہ جامعہ سے جانا تو نہیں چاہتے ہوں گے، لیکن راقم کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ اپنے شیخ استاذ حضرت بنوریؒ کی آرزو کی تکمیل کے لیے انہوں نے یہ فراق بھی با دل نخواستہ برداشت کیا، چونکہ ہم نے اپنے اساتذہ کرام سے بار ہا سنا کہ حضرت بنوریؒ بسا اوقات یہ تمنا کیا کرتے کہ: ''کاش! میں گمنام ہوتا، کسی گاؤں دیہات میں ایک گمنام مسجد کا خادم ہوتا، اس مسجد کی صفائی کرتا، جھاڑو لگاتا، جب نماز کا وقت ہو جاتا تو اذان دے کر لوگوں کو بلاتا اور انہیں نماز پڑھاتا، پھر اس کے بعد نمازیوں کو وہیں مسجد میں بیٹھ کر قرآن کریم کی تعلیم دیتا''، حضرت بنوریؒ نے تو یہ آرزو اور تمنا کی تھی، لیکن اس آرزو کی تکمیل مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے حصے میں تھی، چنانچہ وہ بغرض خدمت دین اپنے آبائی علاقے آ گئے، وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھ کر تادم شہادت دین متین کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

ہمارا جب جامعہ بنوری ٹاؤن میں باضابطہ داخلہ ہوا تو امام اہل سنت حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب رحمہ اللہ کا دور اہتمام تھا، حضرت مولانا امین اورکزئیؒ تو جامعہ سے رخصت لے کر جا چکے تھے، اساتذہ کرام بسا اوقات سبق کے دوران ان کا بہت زیادہ والہانہ انداز سے ذکر کیا کرتے، اس لیے ان سے ملاقات اور ان کی زیارت کا شوق دل میں بہت زیادہ پیدا ہو گیا تھا، ہماری طالب علمی کے دوران کسی موقع کی مناسبت سے ان کا کراچی آنا ہوا، جب ان کو پہلی بار دیکھا تو یہی محسوس ہوا کہ جیسے بہت پہلے سے انہیں دیکھا اور جانا ہوا ہے، بالکل بھی اجنبیت یا دوری محسوس نہ ہوئی، درحقیقت دینی علوم کی سند کے سلسلے میں جو جڑتا ہے تو پھر وہ تمام کڑیوں سے مربوط ہو کر منظم ہو جاتا ہے اور مزید نکھر بھی جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک روحانی سلسلہ ہوتا ہے، جس کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے اور روح کے تعلق میں بظاہر کتنی بھی دوری اور مسافت کیوں نہ ہو، لیکن دل ہمیشہ جڑے رہتے ہیں، ان میں دوری پیدا نہیں ہوتی، چنانچہ ہم اگرچہ ان سے باضابطہ طور پر زیادہ مستفید نہ ہو سکے، لیکن روحانی طور پر ان کا فیض ہمیشہ محسوس کیا جو تا قیامت جاری رہے گا ان شاء اللہ۔

غالباً ۲۰۰۷ء میں اسلام آباد میں مقیم دو ہم درس ساتھی مولانا نصیر احمد صاحب اور مولانا عمر شوکت صاحب کی

رفاقت وسرپرستی میں حضرت مولانا امین اورکزئی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے بطور خاص پہلی بار ہنگو جانے کی ترتیب بنی، صبح کے وقت ہم اسلام آباد سے نکلے، عصر کے قریب ہنگو پہنچ گئے، مولانا امین اورکزئی بھی حضرت بنوریؒ کے عاشقین میں سے تھے، اس مناسبت سے اپنے قائم کردہ ادارے کا نام 'جامعہ یوسفیہ' رکھا تھا، جامعہ یوسفیہ کی مسجد میں ہم نے نماز عصر ادا کی، نماز کے بعد حضرتؒ سے ملاقات ہوئی، بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا ،ان کی صرف گفتگو ہی نہیں بلکہ ہر ہر ادا عاجزی وتواضع کا حسین مظہر تھی، مسجد اور مدرسہ کے درمیان برآمدہ نما صحن میں ہم بیٹھ گئے، گاؤں کی سادہ مگر پروقار مسجد، مہمانوں کے لیے ترتیب سے رکھی گئی چارپائیاں، سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا، دن چھوٹے تھے تو ملاقات اور حال احوال کے دوران ہی مغرب کا وقت ہو گیا، مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر پھر وہیں آگئے، جامعہ کے متعلق پوچھتے رہے، والد صاحب اور جامعہ کے اساتذہ کرام کی خیریت دریافت کی، جامعہ کے جن مشائخ سے خاص تعلق تھا، ان کے صاحبزادوں کا فرداً فرداً نام لے کر ان کی مصروفیات دریافت کیں، یہ راقم کی ان کے ساتھ اس فرصت کے سے انداز میں شاید پہلی اور آخری ملاقات تھی، ورنہ اس سے قبل یا اس کے بعد زیارت کا شرف ہمیشہ کراچی میں حاصل ہوا، مولانا کے مہمان ہوا کرتے تھے، شاگردوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا، اور شاگرد بھی کوئی معمولی نہیں، اللہ نے مولانا امین صاحبؒ جیسے اساتذہ کرام کی صحبت اور گلشن بنوری کی برکت سے ان شاگردوں سے بھی دین کا بہت کام لیا کہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، ایسے میں ملاقات کا شرف تو حاصل ہو جاتا، لیکن ان سے بات چیت اور استفادے کی نوبت بہت کم ملتی، راقم اسی سعادت کے حصول کے لیے ہنگو حاضر ہوا تھا، شوق کی کیفیت میں دوران گفتگو بندہ اپنی نادانی، کم علمی اور ناسمجھی کی بنا پر ایک عام سا سوال کچھ ایسی تعبیر اور انداز سے کر بیٹھا جس پر آج بھی سوچتا ہوں تو کچھ شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے، لیکن حضرت اورکزئی صاحبؒ کے جواب میں ہمارے لیے سبق کے بہت سارے اہم پہلو بھی تھے، جسے یہاں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اثنا گفتگو راقم نے ان سے پوچھا کہ: حضرت! آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟ حضرت مولانا امین اورکزئی جیسے محقق، مدرس، عالم نے نہایت تواضع اور عاجزی کے سے انداز میں فرمایا کہ مصروفیات کیا ہوتی ہیں، بس! وقت ضائع کرتا رہتا ہوں۔ ان کا یہ جواب کچھ اس انداز سے تھا کہ بندہ کو اپنے اس سوال اور تعبیر کی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا، ایک چھوٹے کا کسی بڑے سے یہ سوال کرنا مناسب نہیں تھا، پھر وہ بڑا بھی کوئی معمولی نہیں، ایسی شخصیت جن کا ہر لحہ قال اللہ وقال الرسول سے عبارت ہو، جن کا اوڑھنا بچھونا مطالعہ ہو، جن کی زندگی کا اکثر حصہ دین کی خدمت کے لیے وقف ہو، اس سب کے باوجود نہایت عاجزی سے یہ جواب دینا، اپنی مصروفیات کو کچھ بھی نہ سمجھنا اور ساتھ ہی وقت کی قدر وقیمت کی اہمیت کا احساس بھی دلا دینا، ان کے اس جواب سے

بہت کچھ سیکھنے کو ملا، بڑوں کی صحبت کا یہی سب سے بڑا فائدہ ہے، جس کے آگے دنیا واسباب دنیا سب کچھ ہیچ لگتے ہیں، کتابوں سے معلومات تو مل جاتی ہے، لیکن عملی اور حقیقی زندگی کے آداب بطور طریق کسی بڑے کی صحبت سے ہی سیکھنے کو ملتے ہیں۔

مولانا امین صاحبؒ جب جامعہ میں تھے تو بطور ناظم طلبا کی نگرانی اور سرپرستی کیا کرتے تھے، ان کی انتظامی گرفت اور بلا رعایت باز پرس اپنے زمانے میں بہت مشہور تھی، ہم نے اپنے ان اساتذہ کرام سے سنا جو مولانا امین صاحبؒ کے شاگرد بھی رہ چکے تھے کہ مولانا مدرسے کے ایک دروازے سے داخل ہوتے تو دوسرے دروازے تک موجود تمام طلبا فوراً متنبہ ہوجاتے، یا اگر ان کے کمرے کا دروازہ کھلتا تو مسجد کی پہلی صف میں بیٹھے طلبہ بھی یکدم طاری ہوجانے والے سناٹے سے سمجھ جاتے کہ حضرت استاذ صاحب اپنے کمرے سے چل پڑے ہیں، لیکن ان کی گرفت یا نگرانی صرف سختی برائے سختی نہیں تھی، بلکہ وہ طلبہ اور شاگردوں کے لیے ایک شفیق مہربان باپ کی سی حیثیت رکھتے تھے اور والدہی کی نگاہ سے تمام طلبہ کو دیکھا کرتے۔ چنانچہ ان کی تمام تر سختیوں کے باوجود ان کے شاگردوں کے دل ان کی محبت اور شفقت سے معمور رہتے، تمام طلبہ کے سبق تکرار اور مطالعہ کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر احوال سے بھی مطلع رہنا اور اس کے بارے میں قیمتی مشورے ہدایات اور رہنمائی کرنا یہ ان کی زندگی کے فرائض میں شامل تھا، چنانچہ ان کے بہت سے سعادت مند شاگرد ایسے بھی ہیں جو عملی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد بھی سال میں دو یا تین بار ان کے پاس ضرور جایا کرتے اور چھٹیوں کا ایک معتد بہ حصہ اپنے استاذ کی صحبت میں گزارنا اپنی زندگی کے فرائض میں سمجھا کرتے تھے، یقیناً ایسے ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے بڑوں کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں۔

ایک بار حضرت کراچی تشریف لائے، استاذ محترم حضرت مولانا قاری قاسم صاحب زید مجدہ کے ہاں کبریا مسجد دھوراجی میں ٹھہرے ہوئے تھے، مولانا امین صاحب کو درود شریف کے وظائف کی معروف کتاب ''دلائل الخیرات'' کی اجازت حضرت بنوریؒ سے حاصل تھی، حضرت بنوریؒ کے علمی فیض کے ساتھ ساتھ یہ روحانی فیض بھی مولانا امین صاحبؒ آگے پھیلایا کرتے تھے، چنانچہ بندہ ''دلائل الخیرات'' کی اجازت کے حصول کے لیے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، نہایت شفقت فرمائی، ایک نسخہ مع اجازت تحریر کرکے عنایت کیا اور فرمایا کہ: ''اسے یومیہ پڑھنے کی پابندی بھی کرو اور اس کی اجازت آگے اوروں کو بھی دے دیا کرو، حضرت بنوریؒ معمولی آدمی نہیں تھے، ان کی اجازت ان کے نسب کی طرح عالی ہے''۔

مولانا امین اورکزئی شہیدؒ جامعہ میں دار التصنیف کے رکن بھی رہے اور حضرت بنوری رحمہ اللہ کی سرپرستی اور

توجہات کے زیر سایہ انہوں نے کافی عرصہ علمی وتحقیقی کام کیا، حضرت بنوری رحمہ اللہ تصنیفی وتحقیقی امور کے لیے جامعہ کی وسطی عمارت میں واقع پہلی منزل پر دار التصنیف میں بیٹھا کرتے تھے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کے ایک طرف حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ کی اور دوسری طرف مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی نشست تھی اور حضرت بنوریؒ کی نشست ان دونوں کے درمیان، چنانچہ حضرت بنوری رحمہ اللہ غایت شفقت ومحبت کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ: ''دار التصنیف میں یہ دونوں میرے لیے پرندے کے دو پروں کی مانند ہیں، جن کے سہارے میں اڑتا ہوں''۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ امام طحاویؒ اور ان کی شہرہ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' کے بہت مداح اور اس کتاب پر علمی وتحقیقی کام کے خواہش مند تھے، چنانچہ شرح معانی الآثار کی شرح وتخریج کا کام حضرت مولانا امین اورکزئی صاحبؒ کے سپرد کیا، اس علمی وتحقیقی کام کی مکمل تفصیل حضرت مولانا یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ کے مضمون ''حضرت بنوری اور طحاوی شریف'' (بینات اشاعت خاص بیاد حضرت بنوریؒ) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، مولانا امین اورکزئی صاحبؒ نے طحاوی شریف پر تحقیقی کام کے لیے ابتداءً کتب رجال وحدیث کی سینکڑوں کتب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ان کتابوں میں خطیب بغدادیؒ کی تاریخ بغداد، امام بخاریؒ کی تاریخ کبیر، ابونعیم اصفہانیؒ کی حلیۃ الاولیاء، اور ابن سعدؒ کی طبقات سرفہرست ہیں، یہ صرف چند کتب کے نام بطور مثال تحریر کیے ہیں، ان میں ہر کتاب کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے، کتب حدیث پر تحقیق، تخریج اور شرح کا کام آج کے زمانے میں تو کافی آسان ہوگیا ہے، لیکن اب سے کوئی چالیس پینتالیس برس قبل جب یہ کام شروع کیا گیا تھا، اس وقت بہت سی اہم کتب حدیث نایاب تھیں، وسائل اور سہولیات کی قلت تھی، قلمی مخطوطات کو علمی دنیا میں تلاش کرنا اور پھر ان کو حاصل کرنا ، اور وہ بھی ہنگو جیسے دور افتادہ مقام میں رہتے ہوئے بہت کٹھن اور مشکل کام تھا، ایسے میں ایک ایک حدیث کی پندرہ، سترہ یا بیس کتب سے تخریج کرنا اتنا آسان نہ تھا، بلکہ ایسے کام کا سوچتے ہوئے بھی دانتوں تلے پسینہ آجاتا تھا، لیکن مولانا امین صاحبؒ نے اپنے شیخ اور استاذ کے مفوضہ کام کو بخوبی پورا کیا اور ''نثر الازہار'' کے نام سے اس کی متعدد جلدیں شائع بھی ہوگئیں، اب اس کا نیا اور مکمل ایڈیشن ان شاء اللہ بہت جلد جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کی طرف سے شائع ہوکر منظر عام پر آئے گا۔

مولانا امین صاحبؒ کی ساری زندگی درس وتدریس اور مطالعہ کتب سے عبارت تھی، درس وتدریس کے بعد نادر و نایاب کتب کا حصول ان کا خاص شوق تھا، قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ علم رجال وتاریخ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے اور عام رجحانات کے برعکس بہت سے تاریخی معاملات پر ان کی اپنی رائے ہوا کرتی تھی، جسے وہ تاریخی دلائل

سے ثابت بھی کیا کرتے تھے، گوشہ نشین وخلوت گزین حضرت اورکزئی شہیدؒ کو عالم اسلام میں طبع شدہ نئی کتاب، یا کسی بھی قدیم کتاب کا پتہ چلتا تو اسے فوراً منگوانے کی کوشش کرتے، کتاب دستیاب ہوجاتی تو اس کا اول تا آخر مکمل مطالعہ کرتے۔ مطالعہ کے دوران حاصل ہونے والے نکات یا اپنی تعلیقات بھی اہتمام کے ساتھ تحریر فرماتے۔ اس طرح ان کا ذاتی کتب خانہ بہت وسیع ہوگیا تھا، جس میں تقریباً ہر موضوع سے متعلق نایاب اور اہم کتابیں پائی جاتی تھیں، اگر یہ کہا جائے کہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں مولانا کا جمع کردہ ذخیرہ کتب اپنی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً ایک منفرد کتب خانہ کی حیثیت رکھتا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جو شخص مطالعہ اور تحقیق کے ذوق سے آشنا ہوجائے پھر اس کے لیے کتاب سے بڑھ کر کوئی ہم نشین نہیں ہوتا، لیکن مولانا اورکزئی صاحبؒ اپنی تمام تر علمی گوشہ نشینی کے باوصف اپنے علاقہ کے لوگوں کے مسائل حل کرتے۔ ان کی خوشی اور غم میں پیش پیش رہتے، سب سے بڑھ کر ہنگو اور اس کے گردونواح کے انتہائی حساس علاقوں میں فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے باہمی اتحاد واتفاق کی کوشش کرنا بھی ان کی زندگی کا ایک اہم فریضہ تھا، جسے وہ بحسن وخوبی نبھایا کرتے تھے، اس وجہ سے انہیں نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے فیصلے خوش دلی کے ساتھ قبول کیے جاتے تھے۔

تعلیم وتربیت، تحقیق وتدریس، مطالعہ کتب، گوشہ نشینی وخلوت گزینی، سماجی ومعاشرتی خدمات اور تبلیغ دعوت ودین جیسی صفات سے آراستہ وپیراستہ یہ عظیم شخصیت اب ہمارے درمیان تو نہیں، لیکن ان کی مثالی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے والا بنائے، آمین، مولانا امین اورکزئی شہیدؒ رب کے دربار میں سرخرو ہوکر حاضر ہوگئے، لیکن بزبان اقبالؒ یوں کہہ گئے:

مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلہ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ
تیری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

ایک عہد ساز شخصیت

حافظ خالد محمود، ہنگو

بعض شخصیات معاشروں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتی ہیں۔ ان کے وجود سے ایک تاریخ اور عہد کا وجود ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کے اثرات سے قوموں کے رسم ورواج اور مزاج تک پر تبدیلی کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور ان کی محنتوں کو ایک زمانہ یاد رکھتا ہے۔ ہمارے استاذ محترم مولانا محمد امین اورکزئی کی شخصیت ہمارے ہنگو کے لئے ایک عظیم انعام کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم آپ کی قدر آپ کی زندگی میں کما حقہ نہ پہچان سکے اور نہ ہی آپ کی شخصیت سے ویسا استفادہ کر سکے جیسا کہ کرنا چاہیے تھا۔

استاذ گرامی مولانا محمد امین شہید کا سنی قوم پر جو احسان ہے اسے ہماری سات نسلیں بھی نہیں چکا سکتیں۔ آپ نے اپنی جرأت وشجاعت اور بہادری وبسالت سے ہنگو عوام کے تحفظ کی جو پُرامن جنگ لڑی، اس کی مثال کم ملتی ہے۔ ہمارا خطہ صدیوں سے شیعہ سنی تصادم کا گڑھ رہا ہے اور قومی سطح پر کئی خون ریز جنگیں ہوئی ہیں، ہماری قوم ہمیشہ پسماندگی کا شکار رہی ہے۔ حضرت استاذ صاحب کی محنت سے سنی اس قابل ہوئے کہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکیں اور علاقے میں اپنی ساکھ اور اپنے وجود کو باوقار طریقے سے باقی رکھ سکیں۔

برادر معظم مولانا محمد یوسف اور برادرم مولانا محمد طفیل بندہ کے غریب خانے پر اس مقصد سے تشریف لائے کہ حضرت استاذ صاحب کے حوالے سے اپنی کچھ یادیں پیش کردوں۔ استاذ صاحب جیسی عہد ساز شخصیت پر ہم جیسے طالبعلم کیا کہہ سکتے ہیں۔ استاذ صاحب کا علمی وعملی مقام ہماری ناقص فہم سے بہت ہی اونچا ہے۔ ہم اسے بیان کریں بھی تو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم کچھ کہیں بھی تو یقیناً استاذ صاحب کے سراپا کی تصویر پیش کرنے میں ناکام رہیں گے۔ تاہم خریداران یوسف میں اپنا نام شامل کرنے والی بڑھیا کے مانند چند بکھری یادیں پیش خدمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کے مقبول بندے کے ساتھ وابستہ یہ چند یادیں میری مغفرت کا سامان بنیں گی۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے میرے ایک دوست مولانا یاسین صاحب نے شاہو وام میں قائم ایک نئے مدرسے میں داخلہ لیا تھا، ہمیں معلوم ہوا کہ کراچی سے وہاں ایک بہت بڑے عالم تشریف لائے ہیں اور انہوں نے مدرسہ کا آغاز کیا ہے۔ بڑے علما کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ بڑی بارعب اور سخت مزاج شخصیات ہوتی ہیں اور ان سے ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک دن اچانک مجھے اپنے دوست سے ملاقات کی ضرورت پیش آئی اور ناچار مجھے شاہو وام جانا پڑا، وہاں ایک کچی مسجد اور حجرے پر مشتمل مدرسہ تھا، میں ۱۵ کلومیٹر کچا راستہ طے کر کے آیا تھا اپنے دوست سے ملاقات کر کے فوراً واپسی کی اجازت چاہی لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اپنے استاذ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ

اللہ تعالیٰ سے ملوائیں گے۔ بندہ نے اپنا خدشہ بیان کیا کہ مجھے بڑے علما سے ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ استاذ صاحب بہت عاجز مزاج آدمی ہے وہ بالکل بھی ایسے نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ غرض ان کے اصرار پر میں ملنے حاضر ہو گیا۔ ایک فقیر منش، سادہ طبیعت لیکن روشن آنکھوں اور پیشانی کے مالک مولانا محمد امین صاحب میرے سامنے تھے۔ ایسے ملے اور ایسی شفقت کا مظاہرہ کیا جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ ہر پہلو سے ان میں اتباع سنت، ضیافت میں اتباع سنت، بیٹھنے میں اتباع سنت، ملنے میں اتباع سنت، لباس میں اتباع سنت، چلنے میں اتباع سنت، کھانا کھلانے میں اتباع سنت۔ غرض سنت کا پورا مرقع تھے۔ تا وقت شہادت یاد نہیں کہ استاذ صاحب کو کبھی خلاف سنت کرتے دیکھا ہو۔

بس اسی ملاقات سے شناسائی ہوئی جو تیس سال تک مسلسل قائم رہی۔ سفر و حضر میں کئی بار ساتھ رہا، آپ کا اخلاص، تقویٰ، للٰہیت، غمخواری، ہمدردی، تواضع، ایثار و قربانی، جذبہ اصلاح غرض ہر وصف مثالی تھا۔ بندہ کے ساتھ شفقت و محبت کا ہمیشہ یہ معاملہ رہا کہ نماز کے لئے آگے کرتے اور میری موجودگی میں میرا امام بننا یقینی ہوتا تھا۔

بندہ ہمیشہ سے دینی تحریکات کا معاون رہا، سیاسی، مذہبی جماعتوں سے بھی تعاون کا تعلق رہا، تبلیغی جماعت سے بھی الحمدللہ طویل عرصہ سے وابستگی ہے، تنظیموں اور جماعتوں میں تندہی اور سرگرمی سے کام کرتے وقت بعض موقعوں پر ایسی باتیں سامنے آئیں کہ شمولیت پر دل پشیمان رہتا۔ ایک دفعہ میں نے استاذ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! اب تمام تحریکات کی ایسی صورتِ حال ہے کہ مکمل شمولیت پر بہت سے مسائل کا انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات اپنا اخلاص باقی رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، میرا دل کرتا ہے کہ کسی تحریک میں بالکلیہ شمولیت سے احتراز کروں اور سب سے جدا رہ کر بوقت ضرورت حتی الوسع نصرت و تعاون کروں۔ آپ نے میری اس بات کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ کہا کہ میرا اپنا مزاج بھی یہی ہے کہ تمام دینی کاموں کے ساتھ بوقت ضرورت حتی الوسع تعاون اور عمومی طور دعا کا تعلق رکھوں۔

استاذ صاحب کی آمد سے پہلے ہمارے علاقے بدعات و رسومات کے گڑھ تھے، حضرت استاذ صاحب نے بڑی حکمت و تدبر سے ان بدعات و رسومات کا خاتمہ کیا، ہمارے بعض علما بھی ان چیزوں میں مبتلا تھے۔ مروجہ حیلہ اسقاط، دعا بعد از جنازہ وغیرہ کے مسائل عام تھے۔ استاذ صاحب نے ان مسائل پر بوقتِ ضرورت ان علماء کرام سے تحریری مکالمہ بھی کیا لیکن ان کے احترام میں آپ کے ہاں ہم نے ذرا برابر فرق محسوس نہیں کیا۔ بدعات و رسومات کے حوالے سے کتنا بڑا مخالف عالم ہی کیوں نہ ہو، بندہ نے اپنی ذات کی حد تک استاذ صاحب کو کبھی کسی عالم کے حق میں تحقیر یا توہین کا رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا نہ ہی کسی کی شان میں کوئی گری ہوئی بات سنی، استاذ صاحب کے اس

رویے سے ہم نے یہ سبق حاصل کیا کہ علمی اختلافات کو کبھی ذاتی ضد وعناد کا سبب نہیں بنانا چاہیے اور اختلاف کو خلاف میں نہیں بدلنا چاہیے، ایک دفعہ بندہ نے پوچھا کہ حضرت! ہمارے علاقہ میں دیوبند کے فضلا بھی ہیں لیکن ان حضرات کی موجودگی میں یہ ساری بدعات ہوتی رہیں ایسا کیوں ہوا؟ فرمایا حافظ صاحب! ایسا نہیں کہ ان حضرات نے کوشش نہ کی ہو کوشش سب نے کی ہے لیکن ایک فرد کے لئے پورے معاشرے کا مزاج بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دوستوں کی سعی میں برکت دی کہ رفتہ رفتہ بدعات ورسومات کا خاتمہ ہوگیا۔

بندہ کو استاذ صاحب کے ساتھ کئی اسفار کا موقع ملا، سفر میں بھی آپ کے عمل سے ہم نے بہت کچھ سیکھا، ایک چیز جو ہمیشہ میرے مشاہدہ میں رہی، وہ سفر میں راستہ ہی میں کسی ہوٹل وغیرہ یا گھر سے کھانا کھانے کا معمول تھا۔ لمبے اسفار میں ہم عین کھانے کے وقت بھی اگر مطلوبہ علاقے میں پہنچ جاتے تو میزبان کے گھر جانے سے قبل ہی بازار سے کھانا خرید کر کھالیتے اور کسی پر بوجھ بننا گوارا نہ تھا۔

آپ کو سفر میں بھی اپنے معمولات کا پابند دیکھا، گاڑی عموماً ہم اپنی استعمال کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت استاذ صاحب اور بندہ سفر پر تھے۔ راستے میں ایک جگہ نماز عشا پڑھنے رکے، امامت مجھے ہی کرنی تھی، بندہ اور مولانا عبداللہ صاحبؒ نے فرض کے بعد صرف وتر پڑھے اور ساتھ ہوٹل میں کھانے چلے گئے، استاذ صاحب نے تسلی سے سنتیں اور نوافل ادا کیں اور تشریف لے آئے۔ بندہ نے مولانا عبداللہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! ہمارے علاقائی عالم ''بزرگ استاذ'' فرماتے ہیں کہ سنت سفر میں ترک نہیں کرنی چاہیے، ہم تو تارکِ سنت ٹھہرے، مولانا عبداللہ صاحبؒ نے برجستہ فرمایا: کہ بھئی! ہم تارک سنت نہیں، زیادہ سے زیادہ تارک نفل ہیں کیونکہ سفر میں فرض کی تنصیف ہوجاتی ہے اور سنت کا اجر نفل کے برابر ہوجاتا ہے۔ اس پر استاذ صاحب مسکرا دیئے۔ سفر میں میرا مشاہدہ رہتا کہ ہم اگر رات بارہ بجے کسی جگہ پہنچے اور لیٹ جاتے تو ایک گھنٹہ آرام کرکے استاذ صاحب پوری نشاط سے مصلے پر کھڑے ہوجاتے اور لمبا تہجد ادا کرتے، ہمیں آپ کی ہمت پر حیرت ہوتی اور اپنے کم ہمتی پر شرم آتی۔

ہمارے علاقے میں شیعہ سنی جھگڑے کے باعث امن کی حالت اکثر ابتر رہی ہے استاذ صاحب کی ہمیشہ کوشش رہی کہ امن کی یہ حالت مستقل اور دائمی ہو، اسی مسئلے کو دائمی بنیادوں پر حل کرنے کے لئے آپ نے بڑی طویل جدوجہد کی، حکومت کو اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ کیا، گرینڈ جرگے قائم کئے، آپ نے سپاہِ صحابہؓ اور تحفظِ ناموسِ صحابہؓ کی دیگر کاوشوں کی سرپرستی ہمیشہ اس شرط پر کی کہ وہ پُرامن طریقے سے تحفظِ ناموسِ صحابہؓ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں آپ جنگ وجدال کے سخت مخالف رہے اور اسے عوام کی تباہی کا سبب بتلایا، آپ نے سنیوں کو یہ بات باور

کرائی کہ جنگ وجدال سے کبھی اہل تشیع کی قوت ختم نہیں ہوسکتی بلکہ وہ مزید منظم ہوں گے، اس کا واحد طریقہ سوشل بائیکاٹ اور مقاطعہ ہے، آپ لوگ شیعوں سے سودا سلف اور کاروباری روابط ختم کردیں، ان کی طاقت وقوت اور آپ کے حقوق کا استیصال ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گا۔

دینی تحریکوں کی انتخابی سیاست میں دلچسپی آپ کو سخت ناگوار تھی، سپاہ صحابہؓ کی انتخابی سیاست میں دلچسپی پر بھی آپ سخت نالاں تھے۔ اوراس سلسلے میں ذمہ داروں کو طویل خطوط لکھ کر اپنے مؤقف سے آگاہ کیا۔

افسوس یہ ہے کہ ہمارے خطے کے سنی عوام استاذ صاحب کی پالیسی پر متحد نہ ہوسکے۔ وقتی جنگوں میں تو اپنا سب کچھ بہانا انہیں منظور رہا لیکن دائمی اور پُرامن علاج پر متفق نہ ہوئے۔ آپ نے ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ سنیوں کی مثال ان منتشر اینٹوں کی ہے جن کا ڈھیر لگا ہوا ہو، یہ نہ سردی گرمی سے بچا سکتا ہے نہ بارش وطوفان سے حفاظت کرسکتا ہے، لیکن اس ڈھیر سے دس گنا کم اینٹیں ایک کمرے کی شکل اختیار کرلیں تو وہ ہر طرح سے بچاؤ کا سامان کرے گا۔ اہل تشیع اقلیت میں ہیں لیکن علاقہ میں ان کی مثال ایک کمرے کی ہے جس کی ہر اینٹ اپنی جگہ مضبوطی سے قرار پکڑے ہوئی ہے۔

استاذ صاحب کا ایک نمایاں وصف اپنے احباب کی خبر گیری تھا۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات سے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ ساتھی استاذ صاحب کو نجی مسائل بیان کرکے پریشان کریں، کیونکہ آپ کو پھر اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک ساتھی کا وہ مسئلہ حل نہ ہو، چاہے اس کے لئے آپ کو دوڑ دھوپ کرنی پڑے، ذاتی رقم خرچ کرنی پڑے یا کسی سے سفارش اور قرض لینے کی نوبت آئے۔ بندہ جب جامعہ یوسفیہ میں حفظ کا مدرس تھا تو اس وقت بڑی کس مپرسی کی حالت تھی، تنخواہ تو تھی نہیں، قرضوں کی نوبت آجاتی، لیکن اس بات سے بھی خوف ہوتا کہ کہیں استاذ صاحب کو علم نہ ہوجائے کہ یہ قرض لے رہے ہیں۔ استاذ صاحب سے ذکر کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ جیب میں کرایہ کی رقم نہیں ہے لہٰذا مدرسہ سے اپنے گاؤں 'بگلو' تک ۲۰ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کرکے آتا اور گھر سے پیدل مدرسے جاتا۔

بندہ کے گھر مہمانوں کی کثرت رہتی، لیکن مہمان خانہ نہ تھا، اس کے لئے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے حجرے استعمال کرنے پڑتے، چاہت تھی کہ ایک کمرہ تعمیر کرلوں، جس میں مہمان ٹھہر سکیں، بڑی تگ ودو کے بعد سولہ سو روپے اکٹھے کیے، استاذ صاحب کے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین صاحب کا اس زمانے میں ٹرک تھا اور وہ پشاور بھٹیوں سے اینٹیں لا کر بیچتے تھے۔ غالباً اس زمانے میں چھ ہزار روپے کی ٹرک بھر اینٹیں آتی تھیں۔ بندہ نے کسی ذریعہ سے استاذ صاحب کو سولہ سو روپے دیے کہ حاجی صاحب سے میرے لئے ایک ٹرک اینٹیں منگوادیں، بقیہ رقم

ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ادا کردوں گا، خود قرض کا معاملہ کرتے ہوئے شرم آئی اور استاذ صاحب کی وجاہت سے توقع تھی کہ حاجی صاحب با آسانی قرض اینٹیں لے آئیں گے۔ الغرض اینٹیں آگئیں، کمرہ تعمیر ہو گیا، کافی عرصہ بعد میرے پاس تین ہزار روپے جمع ہوئے تو حضرت استاذ صاحب کی خدمت میں حاجی صاحب کا قرضہ ادا کرنے لے گیا لیکن آپ نے لینے سے انکار فرمایا، میرے شدید اصرار پر فرمایا کہ حافظ صاحب! چھوڑیں، یہ رقم ان کو مل چکی ہے، زیادہ بحث وتکرار کی تو ہمت نہ تھی لیکن اس پر سخت پریشانی اور حیرت تھی کہ اتنی زیادہ رقم کس نے ادا کردی!!! بعد میں مولانا ظفر احمد صاحب نے بتایا کہ وہ رقم تو اسی وقت استاذ صاحب نے اپنی جیب سے ادا کردی تھی، خود فقر و فاقے کاٹنے والے انسان، لیکن اپنے رفقاء کار کی اس درجہ خبر گیری...... شاید ہی اس کی مثال مل سکے۔ اس کے بعد میں سختی سے اس پر عامل رہا کہ کبھی استاذ صاحب کے سامنے اپنی پریشانی ذکر نہیں کروں گا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی سختی سے روکتا کہ اپنے حالات ہرگز استاذ صاحب پر ظاہر نہ کریں۔

حضرت استاذ میں مہمان نوازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن مجھے ہمیشہ یہ بات گراں گزرتی کہ ہمارے لوگ معاشرت کے آداب کا ذرا پاس نہیں رکھتے، عین کھانے کے وقت بلا اطلاع پہنچ آتے، ہمیں تو استاذ صاحب نے یہ معاشرت سکھائی تھی کہ بلا دعوت قریبی ساتھیوں کے ہاں بھی کھا کر جائیں بہر حال استاذ صاحب جو کچھ تیار ہوتا مہمانوں کا اکرام ضرور کرتے، ایک بار کچھ مہمان کھانے کے وقت بلا اطلاع پہنچ گئے، آپ نے خود اس وقت کھانا تناول نہیں فرمایا تھا، گھر جا کر اپنا حصہ اور گھر والوں سے کچھ لے آئے اور خود کسی بہانے کام میں مصروف رہ کر مہمانوں کو کھلا دیا ان کو رخصت کیا تو کچھ دیر بعد کچھ اور مہمان آگئے، گھر میں کھانے کا کچھ نہ تھا، لہٰذا بھائیوں کے گھروں سے بچا کچھا جو کچھ تھا لا کر پیش کردیا، اور ان کو کھلا دیا خود غالباً طویل فاقہ تھا اس لئے بعد میں بندہ سے فرمایا کہ میں نے گھر جا کر تلاش کیا تو تین دن پرانے روٹی کے خشک ٹکڑے مل گئے بس وہی پانی کے ساتھ بھگو کر خشک ہی بغیر سالن کے کھالیے۔ اللہ اکبر! یہ وہ فقراء تھے جن کے دروازوں پر خوانین کی قطاریں لگتی تھیں لیکن کسی سے کبھی کوئی طمع نہ رکھی بلکہ خوانین کا ہدیہ تک بھی قبول نہ کیا اور دنیا کو ذلیل کر کے ٹھوکریں مارتے رہے۔

استاذ صاحب کی مانند خودداری، مروت اور احباب کی ضروریات کا خیال ہم نے حضرت مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ میں بھی دیکھا۔ ہم سب ان کو مہتمم صاحب کہا کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں اپنے شیخ حضرت مولانا سراج الیوم صاحب سواتی (گڑھئی باباجی) کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا، حضرت باباجی غریب آدمی تھے، میں پہلے مولانا فضل محمد سواتی صاحب کے ہاں گیا اور ان سے عرض کیا کہ میں تو باباجی کے پاس قیام کی نیت سے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا: بہتر ہے، پھر گاڑی منگوا کر مجھے بلایا اور حضرت باباجی کے قیام گاہ پر حاضر

ہوئے۔ مجھے اتار کر ڈرائیور سے کہا کہ کار کی ڈگی کھولو۔ اس سے آٹا، گھی، چینی، دالیں اور کھانے پینے کی کافی ساری چیزوں کے تھیلے نکالے اور باباجی کے ہاں پہنچانے کا کہہ دیا، یہ اس غرض سے لائے تھے کہ باباجی کے ہاں غربت تھی اور میں کئی دنوں کا مہمان بن کر آیا تھا۔ مہتمم صاحب نے گوارا نہ کیا کہ باباجی پر میرے قیام کا بوجھ پڑے۔ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ مجھے حیرت ہوئی اور اپنے اوپر افسوس بھی ہوا کہ حضرت مولانا کی توجہ وہاں تک گئی جہاں تک ہم نہ سوچ سکے۔

ایک دفعہ استاذ صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئیں، میں نے اپنے بھائی حاجی عین الدین صاحب سے عرض کیا کہ مدرسہ کے لئے سودا سلف لے آئیں، انہوں نے کہا کہ میرے پاس بھی رقم نہیں ہے کہاں سے لاؤں؟ استاذ صاحب فرماتے ہیں کہ اس پر پریشانی تو لاحق تھی لیکن پھر یہ سوچا کہ میں تو اتنا ہی مکلف ہوں کہ جب تک وسائل ہوں مدرسہ چلاؤں اور جب وسائل ختم ہوں تو بند کردوں۔ کسی سے سوال کی ذلت کیوں اٹھاؤں؟ لہٰذا پختہ فیصلہ کرلیا کہ نماز ظہر کے بعد سب طلبہ کو جمع کرکے اعلان کردوں گا کہ مدرسہ میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئیں ہیں، لہٰذا تعلیم سے انکار نہیں وہ تو جاری رہے گی، اپنا کھانے کا انتظام کرکے پڑھنے کی جس کی وسعت ہے وہ بے شک ٹھہر جائے اور باقی حضرات کسی دوسرے مدرسے میں تشریف لے جائیں۔ ظہر کے فرائض جیسے ادا کیے اور طلبہ میں اعلان کا ارادہ کیا تو دفعتہً کسی نے باہر سے زور سے آواز دی کہ مہتمم صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اچانک آمد پر اتنی خوشی ہوئی کہ اعلان ہی بھول گیا اور بھاگ کر باہر نکلا، حضرت سے مل کر ان کو مہمان خانے میں بٹھلایا، نماز مکمل کی اور خدمت میں پہنچ گیا، کھانے پانی کا پوچھ رہا تھا کہ اسی اثنا باقی اساتذہ بھی زیارت وملاقات کے لئے آکر بیٹھ گئے، حضرت نے فرمایا کہ مولانا! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے ذرا باہر چلتے ہیں، میں نے عرض کیا حضرت! اساتذہ کو باہر بھیج دیتے ہیں، آپ ابھی طویل سفر کرکے تشریف لائے ہیں، آپ فرمائیں، آپ کیوں باہر نکلیں گے؟ فرمایا: نہیں! ہم ہی باہر چلتے ہیں، میں اٹھ کر آپ کے ساتھ باہر نکل آیا، مدرسے کے مرکزی گیٹ سے باہر لائے تو سامنے روڈ پر گاڑی کھڑی تھی، مجھے حیرت ہوئی کہ گاڑی بھی حضرت نے ادھر کھڑی کی ہے، گاڑی کے قریب جاکر ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خطیر رقم نکال کر کہا کہ یہ مدرسہ کے لئے ہے میں نے بلا جھجک قبول کرلیے، کیونکہ مدرسہ کی حالت ابتر تھی۔ پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ رقم نکالی اور فرمایا: یہ آپ کے لئے ہے، میں نے یہ رقم قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا بلکہ انکار کرنے لگا۔ اس پر فرمایا: مولوی صاحب! میں اسی کام کے لئے آیا ہوں، بس یہ کہہ کر رقم تھمادی اور سلام کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نہ آرام، نہ کھانا، نہ قیام، بس فوراً ہی روانہ ہوکر چلے گئے۔ کہاں مینگورہ سوات؟ کہاں ہنگو کا دور دراز

شا ہوا ام؟ حضرت آئے اور رقم دے کر فوراً ہی چلے گئے یہ نصرت الٰہی کی واضح مثال تھی۔

بندہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت! مہتمم صاحب سے میں بہت متاثر ہوں، کیا ہی علمی وعملی شخصیت ہیں، فرمایا: حافظ صاحب! مہتمم صاحب تو با کمال ہے ہی، لیکن حضرت بنوریؒ کو دیکھ لیتے تو کامل'' دین'' تھے۔ یعنی ان کی زندگی پوری دین کی عملی تصویر تھی۔ آپ کا توکل، مدرسہ میں فقر وفاقہ اور خودداری بندہ کو انہی دو بزرگوں کی صحبت کا ثمرہ نظر آتی ہے۔

حضرت استاذ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بارہا ایسے ہی مواقع آئے کہ مدرسہ بند کرنے کا خیال ہوا لیکن اسی لمحے اللہ تعالیٰ کی نصرت کا کھلا مشاہدہ ہوا۔ مدرسہ میں فاقہ کی نوبت نہ آئی، کچھ نہ کچھ روکھا سوکھا بھی مل ہی جاتا تھا۔ لیکن کبھی کسی سے چندہ کی اپیل یا سوال کی نوبت نہ آئی۔ آج کوئی ہے جو اس منہج پر مدرسہ چلائے اور اس عزیمت کی مثال قائم کرے۔ ہائے کاش! یہ کس قافلہ کے لوگ تھے جو گزر گئے اور ہمارے لئے عمل کی ایسی مثالیں چھوڑ گئے جنہیں اس مادیت زدہ دور میں نبھانا تو در کنار ان کا تصور کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت استاذ صاحب میں بندہ نے اپنے بڑوں کے ادب کا جو معیار دیکھا وہ بھی مثالی تھا۔ بندہ کئی بزرگوں کی خدمت میں حضرت کی معیت میں حاضر ہوا، آپ مثالی ادب فرماتے تھے، جن بزرگوں کی قبور پر حاضری کا موقع ملتا آپ دور ہی سے جوتے اتار کر قبر کے پاس حاضر ہوتے۔ ایک بار بندہ حضرت کے ساتھ مولانا ولی احمد المعروف سنڈاکے باباجی کے قبر پر حاضر ہوا، حاضری سے قبل آپ نے فرمایا کہ کسی بزرگ کی قبر پر جانے سے قبل پچیس مرتبہ آیت الکرسی پڑھ کر ایصال ثواب کرنا چاہیے، اس سے ان کی ارواح متوجہ ہوتی ہیں اور صاحب قبر کی برکات ملتی ہیں۔ واپسی پر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے، سنڈاکے بابا مجھ سے بڑے خوش ہیں، ان کی روح بہت متوجہ تھی، اور یہ دلائل الخیرات کی خدمت کی برکت ہے کہ ان اکابر کی ارواح متوجہ ہوتی ہیں۔

ایک بار صبح کو اچانک مجھے اطلاع ملی کہ میرے عمرہ کا بندوبست ہو گیا ہے اور ظہر کے وقت جانا ہے، ضروری انتظامات میں لگنے کے باعث میں استاذ صاحب کو اطلاع نہ دے سکا، جب واپس آیا تو استاذ صاحب بھی ملنے آئے میں نے جاتے وقت اطلاع نہ دینے پر معذرت پیش کی، اور عرض کیا کہ حضرت بندہ نے آپ کا سلام روضہ انور پر پیش کر دیا تھا۔ فرمایا: حافظ صاحب! آپ کے بارے یہی گمان تھا کہ آپ سلام پیش کریں گے، ویسے بھی جب اس فقیر کا سلام روضہ طیبہ پر پیش ہوتا ہے، تو مجھے وہاں سے جواب کے اثرات بحمد اللہ یہاں محسوس ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے نور بصیرت سے نوازا تھا، کہ اشیا میں انوارات وظلمات کا مشاہدہ کر لیتے، ایک بار ہمارے خاندان کی ایک بڑی پارسا اور نیک خاتون نے کچھ رقم جمع کی اور پھر میرے پاس بھجوائی کہ اس سے حضرات شیخین

یعنی مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا امین صاحب کی دعوت کرلیں۔ میں نے دعوت کا انتظام کیا، دونوں حضرات اساتذہ تشریف لائے۔کھانے کے بعد استاذ صاحب نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا کہ حافظ صاحب! کھانے میں عجیب لذت تھی، بہت زیادہ کھایا گیا، گوشت سے زیادہ شوربے کا مزہ تھا، یہ بات بار بار فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ حضرت دعوت میری نہیں تھی، میں صرف منتظم تھا، یہ دعوت ہمارے خاندان کی ایک خاتون نے کی تھی۔آپ نے فرمایا کہ دیکھیں اخلاص کا اپنا ایک عجیب اثر ہوتا ہے اس خاتون کے خلوص کا اثر اس کی دعوت میں بھی واضح تھا۔

ایک بار صندل باباجی لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں داخل تھے، ہم سب عیادت کے لیے گئے، ہنگو کے کئی بزرگ علما تھے، حضرت الاستاذ بھی ساتھ تھے، جب ہم باباجی کے پاس بیٹھے تو ایک نرس آئی اور مجھے اشارہ کرکے بلایا، میں حاضر ہوا کہ شاید کوئی ضروری بات ہو۔ وہ استاذ صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگی کہ اس باباجی کو بلائیں ان سے ایک ضروری کام ہے۔ میں سمجھا شاید صندل باباجی کے علاج و دوا سے متعلق کوئی ہدایات دینی ہوں، میں نے استاذ جی سے عرض کیا کہ باہر نرس آپ کو بلا رہی ہے۔ استاذ صاحب اٹھے تو میں بھی ساتھ چل دیا۔ وہ نرس ہمیں لے کر دفتر آئی۔ اس نے چائے منگوائی، پھر کہا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، بہت سی مالی پریشانیاں ہیں، آج جب آپ کو دیکھا تو ویسے دل میں آیا کہ اس بزرگ سے کہہ دوں، یہ کوئی وظیفہ بتائیں گے تو ان شاء اللہ حل ہو جائیں گے۔ مجھے بڑی سخت حیرت تھی کہ اتنے سارے بزرگوں میں نرس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کیوں ڈالا، بہرحال استاذ صاحب نے اسے نماز پڑھنے کی تاکید کی اور چند وظائف بتا کر وہاں سے اٹھ آئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جتنا بھی چھپ جائیں، لوگ آپ کو پہچان ہی لیتے ہیں۔

استاذ صاحب کی شہادت کے بعد میں حج پر گیا، منیٰ میں ایک دن میں دعا کروا رہا تھا، اس میں حضرات شیخین کے لیے بھی دعا کرائی، دعا ختم ہوئی، تو دو آفیسر آکر ملے، ایک نے کہا کہ آپ نے مولانا محمد امین صاحب کا نام لیا، وہ تو بہت ہی عظیم انسان تھے۔ بڑے محب وطن، امن پسند، دانا اور زیرک آدمی تھے، میری ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور انہوں نے کئی مواقع پر ہمارے ساتھ ملکی وقومی مفاد میں انتہائی تعاون کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے، اور کس شعبے سے تعلق ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میرا نام مشتاق جدون ہے، میں کسی زمانہ میں کوہاٹ کا کمشنر تھا اور اب سیکرٹری تعلیم ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا اور کافی دیر تک حضرت کے اوصاف پر گفتگو کرتے رہے۔

حضرت استاذ صاحب میں خودداری کا وصف بھی انتہائی نمایاں تھا۔ طلبہ واساتذہ کی خودداری اور عزت نفس کا خوب خیال رکھتے تھے، ایک دفعہ ایک مخیر نے ۵۰۰ روپے چندہ مدرسہ کے لئے پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت! اگر کسی استاذ یا طالبعلم کو بھیج دیا کریں تو میں مدرسہ کا تعاون ہر ماہ ان کے ہاتھ ارسال کردیا کروں گا۔ فرمایا: حاجی صاحب!

میرے اساتذہ اتنے کم قیمت نہیں اور نہ ہی طلبہ میرے پاس چندے وصول کرنے آئے ہیں۔ استاذ تو کیا مدرسہ کا ادنی طالبعلم بھی میں اس کام کے لئے نہیں بھیج سکتا، چندہ دینا آپ کی ضرورت ہے، میری ضرورت نہیں۔ آپ اپنی ضرورت خود پوری کریں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ چندے وصول کرنے کے لئے طلبہ بھیجوں۔

آج کل جو ماحول بن چکا ہے اور جن حیلوں بہانوں سے مدارس کے لئے چندے اکٹھے کیے جاتے ہیں، اس ماحول میں ایسے اہل اللہ کی خودداری ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ کاش! کہ اہل مدارس ایسی خودداری پیدا کریں تو خود دیکھیں کہ دنیا کیسے قدموں پر گرتی ہے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالی کی شہادت ہمارے لئے ایک ناگہانی حادثہ تھا، آپ نے ہمیشہ امن کی دہائی دی، لیکن شریعت کے نام پر طوفان بدامنی برپا کرنے والے ہی اس کے اصل ذمہ دار ہے کہ خطے میں وہ حالات پیدا کر دیے کہ استاذ صاحبؒ جیسی پرامن ہستیاں بھی ظالموں کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکیں، حالانکہ استاذ صاحبؒ حکومت کے ساتھ تصادم کے سخت مخالف تھے اور مسلم تحریکوں کے طریق کار اور فکر کے سخت ناقد تھے۔ بندہ نے ایک دفعہ خود ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا کہ حضرت! یہ کیا ہیں؟ فرمایا: کہ حافظ صاحب! خارجی فکر افراد ہیں یہ مجھے اور آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔

اللہ تعالی آپ کی قبر پر کروڑ ہا رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

باخرد اٹھ گئے بے خرد چھپکے
زوال علم عقل کے زوال کے بعد

عالم تاریک شد

مولانا سید احمد یوسف بنوری، کراچی

کچھ شخصیات اپنی صفات کا ایسا آئینہ ہوتی ہیں کہ ان کا نام ان عالی صفات کا تذکار بن جاتا ہے، جہاں ان کا ذکر چھیڑا گویا عزم وہمت، ثبات واستقلال کی تذکیر ہونا شروع ہوگئی، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ سے میری ملاقاتیں انگلیوں پہ شمار کی جاسکتی ہیں لیکن میرے لیے ان کا نام ان لازوال صفات' جو اس تحتی برِاعظم کے علمی سلاسل کا طرۂ امتیاز ہیں' کی یاددہانی بن گیا ہے۔ ان کا تبتل، استغنا، علمی انہماک، للّٰہیت اور اپنے استاذ حضرت مولانا سید یوسف بنوری قدس سرہ سے عشق وہ خوبیاں ہیں جو ان کے نام سے وابستہ ہوکر رہ گئیں ہیں۔ ہر ان سے آشنا شخص ان کا نام ہی نہیں لیتا بلکہ ان تمام عناصر کو بھی اپنے مخاطب تک کی ساعتوں کا حصہ بناتا ہے، یوں اس دِگرگوں زمانہ میں ان کی سوانح کا اہتمام اس شام شہرِآشوب میں شمعیں روشن کرنے کے مترادف ہے۔

قوموں کی تاریخ میں ایسے قیامت خیز حادثے ہوتے رہتے ہیں جن کی اشک شوئی کے لیے آستینیں ناکافی پڑ جاتی ہیں۔ ملت اسلامیہ کی چودہ سالہ سرگذشت کا کوئی ورق ایسے حادثوں سے خالی نہیں لیکن بعض حادثے ایسے حادثے بن جاتے ہیں جو قوموں کے احوال واقعی کی مکمل تصویر ہوتے ہیں۔ ہر صاحب بصیرت کے لیے انہیں دیکھ کر نوشتۂ تقدیر بالکل عیاں اور واضح ہوجاتا ہے۔ اس کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قوم کے مستقبل کے بارے میں آسمانوں سے کیا فیصلے ہوچکے ہیں۔

حضرت مولانا امین صاحب کی المناک شہادت ایک ایسا سانحہ تھا جس سے ہمارے خطے کے لئے کاتب تقدیر کے لکھے ہوئے غضب کا ظہور ہوا اور ملک میں خونریزی اور خانہ جنگی بام عروج پر پہنچی۔ کیونکہ ایسے ابطال کی ناقدری پر اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سو سال تک انگریز اپنی پوری سفاکی اور بربریت کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ مگر حجرہ نشین علمائے کرام کو یوں بلاوجہ ڈھٹائی سے تہہ تیغ کرنے کی جرأت تو اسے بھی نہیں ہوئی۔

مولانا امین اورکزئی صاحبؒ کی شخصیت ہزار پہلو اور جامع صفات تھی۔ جسے کوئی یک لفظی عنوان میں بیان نہیں کرسکتا۔ ان کی بلند قامت پر ہر جامۂ تعبیر تنگ پڑ جاتا ہے اور اس کا زاویہ دامن نگاہ کھینچتا ہے۔ مگر ہم سے طالب علموں کے لیے ان کی پوری زندگی کا ''حجر الزاویہ'' (بنیاد کا پتھر)، ان کی موجودگی سے علوم اسلامیہ کی اس روایت کا تسلسل تھا جس میں شاگرد اساتذہ کے اقوال اور ظاہری علوم کو ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے انفاس عالیہ کا ایسا امین ہوتا ہے کہ اساتذہ کی ہر ادا کو بہر تسکین غنیمت جان کر رکھ لیتا ہے، یوں علوم اسلامیہ کو اصحاب عدل واستقامت کی وہ سند میسر

آتی ہے جس سے اسلام کے سوا ہر مذہب واعتقاد محروم ہے۔

مولانا امین اورکزئی صاحبؒ نے اپنے استاد محدث العصر حضرت بنوریؒ سے ایسا والہانہ تعلق اپنایا کہ گویا ان کی سیرت وکردار کے ایسے امین ہوئے کہ جس کی نظیر اس پیرفرتوت دنیا میں ممکن نہیں۔ اپنے مدرسہ، مسجد اور پہلوی اولاد تینوں کا نام یوسف سے معنون کیا۔ ان کی اولاد واحفاد سے جس وارفتگی سے ملے اس کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ تو کراچی سے آنے والی ہر ہوا میں اپنے محبوب کی زلف مشک بار کی خوشبو محسوس کرتے تھے۔ راقم الحروف درجہ رابعہ کے سال جب ان کی آمد کا سن کر ان سے ملنے پہنچا، تعارف ہونے پر جس طرح نمناک آنکھوں سے آپ نے معانقہ کیا اور جو مشفقانہ برتاؤ کیا اس کا گہرا تاثر آج تک محفوظ ہے۔ آپ سے مل کر علوم اسلامیہ کی بقا کا راز کھلا کہ یہ دین صحیفوں اور دفاتر کی صورت نہیں بلکہ سینہ در سینہ اس کی روایات منتقل ہوئی ہیں جس طرح حضرت بنوریؒ اپنے نادر روزگار استاد علامہ کشمیریؒ کی عبقریت کے ترجمان بنے اور علوم حدیث کے سلسلۃ الذہب کا حصہ بنے انہوں نے اپنا سرمایہ علمی آگے حضرت مولانا امین صاحبؒ ایسے شاگردوں کو منتقل کر دیا۔ یوں کاروان علم کا سفر زمان ومکان سے بے نیاز جاری وساری رہا۔ یہی شخصیات دین اسلام کی وہ کڑیاں ہیں جن کی مضبوطی اور جڑ ہمیشہ سے اعداء اسلام کے دلوں کا کانٹا رہی ہے۔

حضرت کے سوانح کا ذکر تو ان خوش قسمت لوگوں کو زیبا ہے جنہوں نے اس سحر کی شناوری کی ہے تمران کے بلند علمی مقام، علوم میں ماہرانہ دسترس کی شہادت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ محدث العصر حضرت بنوریؒ، امام طحاوی کی معرکۃ الآراء کتاب فقہ حنفی کے حدیثی مآخذ شرح معانی الآثار پہ جس تحقیق کے متمنی تھے، اس کی تکمیل کے لیے آپ کی نگاہ انتخاب آپ ہی پر پڑی، جب کہ ابھی آپ شباب کے ہنگامہ خیز دور ہی میں تھے۔ آپ نے بھی اپنے استاد کے اس امر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ یوں دنیائے عالم کا وہ شاہکار سامنے آیا جسے ''نثر الازہار'' کہتے ہیں۔ اس کتاب کی علمی قدر وقیمت کا اندازہ تو انہی کو ہو سکتا ہے جنہیں اصحاب حدیث کے علمی کارناموں سے واقفیت ہے، مگر یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ صاحب ''نثر الازہار'' کی عالم رنگ وبو سے رخصتی سے فن حدیث کا وہ چراغ بجھا ہے جس کے اجالے سے نہ جانے کتنی عمیق گھاٹیاں عبور ہوتی تھیں اور کتنے بھٹکے قافلوں کو نشان راہ ملتا تھا۔

آپ کی شخصیت کا یہ پہلو سیر وسوانح سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت خاصے کی چیز ہے کہ آپ نے دیگر صاحبان علم وفضل کی طرح اپنے آبائی علاقہ کو ترک کر کے بڑے شہروں میں اور مشہور مسندوں کی زینت ہو کر اپنے کمالات کا سکہ نہیں جمایا بلکہ آپ کا آفتاب کمالات غربت ہی میں چمکا۔ ہنگو کی سنگلاخ وادی میں ایسی انجمن قائم کی تھی جس کی چمک نے ملک کے گوشہ گوشہ میں نگاہوں کو خیرہ کیے رکھا، کیا ہی خوب ہو کہ اگر اس بات پہ توجہ کی جائے،

روشنی کے جس قافلے پہ شب ظلمت نے غارت گری کی ہے۔ وہیں پھر علم و دانش کی چراغاں کی کوشش کی جائے۔

رفتم ، از رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم رفتم بزم برہم ساختم

آہ! میرے شیخ و مرشد

حافظ یاسین محمد قریشی، انگلینڈ

غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد مجھے ہنگو میں شیخ المشائخ حضرت العلامہ میاں محمد کریم صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہ کے برادر زادے میاں خلیل الرحمن کاکاخیل نے بتایا کہ میں عنقریب علم حاصل کرنے کے لئے چچا کے ایک شاگرد کے ساتھ کراچی جانے والا ہوں چونکہ بندہ ناچیز کو بھی اپنے والد بزرگوار کی طرف سے پہلے ہی سے ہدایت مل چکی تھی کہ حفظ القرآن کا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے ابھی آپ نے علم حاصل کرنا ہے۔ میں نے اپنے والد محترم مدظلہ العالی سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے دن علی الصباح صاحبزادہ میاں فضل کریم کاکاخیل (مرحوم) کے ہمراہ بندہ ناچیز اپنے والد کی معیت میں حضرت الاستاذ نور اللہ تعالیٰ مرقدہ کی ملاقات کے لئے شاہووام روانہ ہوئے۔ پہلی ملاقات میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نورانی چہرہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جس گوہر نایاب کی تلاش تھی وہ مل گیا اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی بڑی خوشی سے ہم دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جانے کی حامی بھر لی۔ ان دنوں حضرت الاستاذؒ کراچی کی معروف اور مشہور دینی درسگاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں دار التصنیف کے علاوہ تدریسی اور انتظامی امور کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ہم دونوں کو درجہ اولیٰ میں داخلہ دیا گیا اور یوں ہم حضرت الاستاذؒ کے شرف تلمذ حاصل کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر حضرت الاستاذؒ نے کراچی کو الوداع کہہ کر اپنے علاقے میں اپنی ہی زرخرید زمین پر ایک دینی درسگاہ جامعہ یوسفیہ کی بنیاد ڈالی اور ہم چند ساتھیوں نے حضرت الاستاذؒ کے ہمراہ کراچی سے آکر جامعہ یوسفیہ کے سابقین اولین طلبہ ہونے کا شرف حاصل کیا۔ مولانا مفتی انوار الاسلام مرحوم ان کے بھائی قاری رضوان اللہ، کمبٹ کے مولانا محمد زاہد و مولانا محمد صالح غوریزی کے مولانا ظفر احمد صاحب اور ہنگو سے بندہ اور برادرم مولانا سید خلیل الرحمن کاکاخیل اور چند طلبہ حضرت الاستاذ صاحب کے رشتہ دار تھے، مولانا محمد طاہر صاحب، قاری محمد طیب مرحوم، قاری محمد رفیق مرحوم وغیرہ۔ ہم نے باقی ماندہ سال جامعہ یوسفیہ میں ہی پورا کر دیا۔

خلوص اور للّٰہیت حضرت الاستاذ صاحب کی ذات اقدس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ نام ونمود اور شہرت سے بیزار تھے، یہی وجہ تھی کہ جامعہ یوسفیہ میں پڑھانے والے اساتذہ کرام کی تنخواہ نہ تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر پڑھانا چاہتا ہے تو بے شک آئے ورنہ اپنی ذات کی حد تک جتنی طاقت ہے اسی پر اکتفا کروں گا، نہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہ چندے جمع کروں گا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ جو شخص اپنے آپ کو اللہ جل مجدہ کے حوالے کرے اللہ تعالیٰ اس کی تمام مہمات کے لئے کافی ہوتا ہے۔ دو تین سال کے دوران جامعہ یوسفیہ کو اللہ تعالیٰ

نے وہ شہرت عطا فرمائی کہ دیار غیر سے بھی تشنگان علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ جامعہ یوسفیہ کے سابقین اولین مدرسین میں سے حضرت الاستاذ صاحب کے شاگردوں میں سے حضرت مولانا محمد حبیب صاحب اورکزئی، مولانا محمد رفیع اللہ خان صاحب اورکزئی اور مولانا محمد جمیل صاحب محسود کے نام سرفہرست ہیں کہ کئی سالوں تک بے لوث ہمہ وقت ہمہ تن علمی خدمت سے وابستہ رہے۔

یہاں پر ایک امداد غیبی کا ذکر بے جا نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ جیسا ذکر کر چکا ہوں کہ نام ونمود اور شہرت سے بیزار تھے، اس لیے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے چونکہ جامعہ کا مالی نظام کا کوئی باقاعدہ ذریعہ نہ تھا، نہ سفیر تھے، نہ چندہ کرنے کی کسی کو اجازت تھی بس جن اہل خیر کو پتہ تھا وہ از خود حتی المقدور تعاون کرتے تھے، جامعہ یوسفیہ کے قیام کے دوسرے سال غالباً جمادی الاولی کے مہینے میں زکوۃ کا پیسہ جو طلبہ کے قیام وطعام پر خرچ ہوتا تھا ختم ہوگیا چونکہ بندہ ناچیز معاون کی حیثیت سے زکوۃ کا پیسہ وظیفے کے طور پر ہر طالب علم پر تقسیم کرتا تھا۔ تو مجھے فرمایا کہ بیٹا! اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مدد نہ آئی تو اس مہینے کے آخر میں سالانہ امتحان منعقد کر کے طلبہ کو چھٹی دیں گے۔ میں نے عرض کیا حضرت! یہ تو بڑے عیب کی بات ہے کہ سارے مدارس رجب کے آخر میں یا شعبان کے اوائل میں چھٹی دیتے ہیں اور ہم دو مہینے پہلے مدرسہ بند کریں، لوگ کیا کہیں گے۔ فرمانے لگے: "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" میرا معاملہ رب کے ساتھ ہے لوگوں کے ساتھ نہیں، اس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک انجان پردیسی مدرسے میں آیا اور اردو زبان میں کہنے لگا کہ مولانا محمد امین سے ملنا ہے۔ جب استاذ صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی تو ہم حیران اور ششدر رہ گئے کہ حضرت الاستاذؒ بھی اس کو نہیں جانتے ہیں۔ اس نے کچھ رقم استاذ صاحب کو پیش کی کہ یہ مدرسہ میں صرف کریں۔ استاذ صاحب نے نام پوچھا۔ وہ کہنے لگے: ایک بندۂ خدا۔ استاذ صاحب نے مصرف پوچھا تو وہ بولا: آپ کو اختیار ہے، جہاں صرف کرنا چاہو۔ استاذ صاحب نے رقم واپس کر کے فرمایا: یا تو مصرف بتاؤ ورنہ اپنا پیسہ واپس لے جاؤ، مجھے امتحان میں مت ڈالو۔ اس کے بعد اس نے زکوۃ کا مصرف متعین کیا اور فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے؟ اس طرح وہ سال اللہ تعالیٰ نے غیبی مدد کے ذریعہ پورا فرمایا۔

حضرت الاستاذؒ کی زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس میں اسلاف کی جھلک نہ ہو، ایک سچا پکا عاشق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جامع المعقول والمنقول محقق اور مدقق، حنفی مسلک کے بے باک وکیل، عارف باللہ، شریعت اور طریقت کا حسین امتزاج رکھنے والے اس درویش صفت انسان میں اللہ تعالیٰ نے جو علمی کمالات ودیعت رکھے تھے۔ عصر حاضر میں ایسی صفات کے مالک اگر نایاب نہ ہوں کمیاب ضرور ہیں۔ احادیث الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جب

بحث شروع فرماتے، چاہے رجال کی تحقیق ہو یا فقہ الحدیث، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کتب آپ کے سامنے اپنا دامن پھیلائے ہوئی ہیں۔ نثر الازہار شرح معانی الآثار کے نام سے حنفی مسلک کے مسائل کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے جس تحقیق اور تدقیق کے ساتھ مدلل فرماتے تھے وہ مشاہیر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ''آہ'' زمانے کی ستم ظریفی اور علاقے کے رفض و بدعت نے حضرت کے راستے میں وہ کانٹے بچھائے جس کی صفائی میں حضرت کا بہت سارا قیمتی وقت صرف ہو گیا اور اپنی مایہ ناز تصنیف کی عدم تکمیل کا غم اور افسوس اپنے سینے میں ساتھ لے گئے۔

یہاں پر حضرت الاستاذؒ کے علمی مقام کے بارے میں استاذ العلماء مولانا عبدالحنان دامت برکاتہم العالیہ (شیخ الحدیث تعلیم القرآن کوہاٹ) کے تاثرات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، شیخ الحدیث صاحب جو کہ حضرت الاستاذؒ کے شیوخ میں سے ہیں۔ غالباً ۱۹۸۱ء یا ۱۹۸۲ء میں انہوں نے ایک مرتبہ جامعہ یوسفیہ کے تدریسی سال کے افتتاح کے موقع پر فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد امین صاحب اپنے آپ کو ہمارے شاگردوں میں شمار کرتے ہیں لیکن میں حلفیہ کہتا ہوں کہ حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جو علمی مقام عطا فرمایا ہے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں مولانا کو اپنا شاگرد کہہ سکوں۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی کا یہ فرمان جہاں حضرت کی اپنی تواضع کا مظہر ہے وہاں حضرت الاستاذؒ کے علمی مقام پر بھی ایک واضح دلیل ہے۔

طبیعت میں شگفتگی، نرمی، مروت اور پہلی ہی ملاقات میں گھل مل جانے والی صفات تو ایسی تھیں کہ اپنے تو اپنے دشمن بھی معترف تھے۔ البتہ اتباع سنت اور تحصیل علم میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتے تھے، ایسے ہی موقعوں پر اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے، ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ایک عظیم محدث

مولانا اسد اللہ اخوندزادہ، کراچی

موت ایک تلخ حقیقت ہے جس کا آنا یقینی ہے اللہ رب العزت کے سوا کوئی مخلوق اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ اگرچہ بعض ہستیوں پر اس طرح کا فنا طاری ہونا حد سے زیادہ حزن وملال کا باعث ہوتا ہے مگر اللہ رب العزت کی پرحکمت تکوین کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کوئی استثنا نہ ہو،

درین دنیا کسے گر زندہ بودے

ابو القاسم محمد زندہ بودے

زمانہ طالب علمی میں جامعہ فاروقیہ ہی میں حضرت مولانا محمد امین صاحب نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کے بعض شاگرد ہمارے ہم سبق تھے، وہ حضرت کا تذکرۂ خیر کرتے رہتے تھے اور حضرت کے بعض علمی رسائل بھی ان کے پاس ہوتے تھے، قدرتی طور پر حضرت رحمہ اللہ رحمۃً واقرۃً سے غیر معمولی محبت پیدا ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے حضرت ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہمارے بہت ہی مشفق استاذ ہیں، یہ درحقیقت وہی محبت تھی جس کے بارے میں ارشاد بانی ہے: "ان الذین امنو او عملو الصلحت سیجعل لھم الرحمن وذا" کچھ عرصے کے بعد جامعہ فاروقیہ میں ہی تدریسی خدمت کا موقع ملا، اس دوران حضرت جامعہ فاروقیہ تشریف لائے اور اپنے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب حفظہ اللہ ورعاہ کا داخلہ جامعہ فاروقیہ میں کروایا، شرف ملاقات نصیب ہوئی اور حضرت کے مشفقانہ اور تواضع سے بھرپور رویہ نے ہمیں مزید گرویدہ بنایا۔ حضرت کا صاحبزادہ اس وقت درجہ سابعہ میں داخل ہوا اور میرے پاس بیضاوی شریف کا سبق تھا، بڑے باپ کا بیٹا تھا، عموماً ایسے افراد میں صاحبزادگی کے اثرات ہوتے ہیں مگر محمد یوسف انتہائی بااخلاق اور نیک سیرت خادم مزاج طالب علم رہا۔

پھر کچھ عرصہ بعد حضرت سے ملنے کے لئے میں اپنے ایک دوست مفتی دین محمد صاحب کے پاس کوہاٹ گیا، وہاں سے ہم دونوں حضرت کے پاس ہنگو چلے گئے حضرتؒ نے اس دوران حضرت صندل باباجی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واقرۃ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا ہمیں بھی خوشی خوشی شریک سفر کر دیا۔ دیر کی طرف دوران سفر موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے حضرت سے کچھ علمی استفادے کی خاطر بعض ایسے سوالات کیے جن کا حل ہمارے پاس ایک عرصہ سے نہیں تھا، نہ کسی سے کوئی تشفی بخش جواب ملا تھا۔ کتب حدیث، کتب فقہ اور تصوف سے متعلق انتہائی پیچیدہ سوالات کے جوابات حضرت نے نہایت تشفی سے دیئے اور امہات الکتب کے حوالے بھی بتائے، اس وقت مجھے یقین ہوا کہ الحمد للہ ہمارے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام میں ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو ہر طرح کے لاینحل عقدے کو حل کر سکتے

ہیں۔

اہل علم تو الحمدللہ بہت ہیں مگر ہمارے اکابر کی شان خاص یہ ہے کہ ان کو علم مستحضر رہتا تھا، حضرت مولانا محمد امین رحمہ اللہ تعالیٰ کا شمار بھی انہی اکابر میں ہوتا ہے جن کو اللہ رب العزت نے علمی استحضار کی دولت سے بہرہ ور فرمایا تھا، میں نے خود حضرت سے بخاری شریف کی ایک روایت کے بارے میں سوال کیا جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی آپس میں گفتگو ہوئی ہے اور وہ گفتگو ان کی شان سے بعید نظر آتی ہے تو حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ معمر بن راشد اس روایت کے راوی ہیں اور وہ بڑے محدث ہیں مگر خطیب بغدادی نے ان کے داماد کو دلال الکتب قرار دیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ معمر بن راشد کی روایات میں بعض اوقات تصرف کرتا تھا اس لئے جہاں روایت سنداً درست ہو مگر منکر المتن ہو تو اس کو ترک کر دیا جاتا ہے اور یہ زرین اصول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے وضع کیے ہیں جن سے بہت سارے عقدے حل ہوتے ہیں۔

چونکہ عالم کی شان ان کے کارناموں اور دینی خدمات کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے ہم سب کو اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے اور حضرت کے فیض کو خلق خدا تک پہنچانے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ حضرت کے دینی خدمات میں حصہ لے کر اس عظیم سعادت کے ساتھ ہماری بھی نسبت ہو جائے۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ وافرۃ صرف ایک فارغ التحصیل عالم نہیں تھے بلکہ مشاق مدرس، عظیم مربی، مدبر سربراہ اور اپنے علاقائی مختلف النوع مسائل میں اپنے علاقے کے عظیم مقتدیٰ اور امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ظاہری حالت اور سادگی کو دیکھ کر یہ یقین نہیں آسکتا تھا کہ یہ بزرگ اتنے بڑے عالم بھی ہو سکتے ہیں جن کو اللہ پاک نے مجتہدانہ صلاحیت عطا فرمائی ہو، انتہائی سعادت کی بات یہ ہے کہ زندگی بھی دین کی خدمت سے اور موت بھی جام شہادت سے سرشار رہی۔

این سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ علیہ ایک علمی ورثہ اور کردار کا نام ہے جس پر ان کی پوری زندگی، شاگرد اور علمی تالیفات شاہد عدل ہیں۔

حلف الزمان لیأتین بمثله

حنثت یمینک یا زمان فکفر

اللہ رب العزت ہمیں ان کے دینی اور علمی خدمات کے تسلسل کو برقرار رکھنے والے ان کے صاحبزادوں، شاگرد

اور تمام رفقاء کار کے ساتھ بھرپور تعاون اور ان کی حمایت کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم تقبل شھادتہ أکرم نزلہ وصلی اللہ وسلم علی خیر خلقہ محمد و الہ أصحبہ أجمعین و الحمد للہ رب العلمین

روایاتِ اسلاف کے امین

مولانا الطاف الرحمن عباسی، کراچی

انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے مختلف صفات رکھی ہیں اور جو جس صفت اور صلاحیت میں کمال وترقی حاصل کرتا ہے، اسی طرف اس کی زندگی گھوم جاتی ہے، دوسری صفات اور صلاحیتیں اسی ممتاز صفت وصلاحیت میں مدغم اور گم ہوکر رہ جاتی ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ مستقل ایک موضوع ہے۔

اس کے مقابلے میں ہمارے اسلاف کی زندگی میں ایک طرف میلان اور جھکاؤ کے بجائے جامعیت اور اعتدال نظر آتا ہے، ایک طرف علمی رسوخ، تو دوسری جانب عملی تصلب، ایک طرف تعلق مع اللہ ذکر وشغل میں پوری طرح انہماک، تو دوسری جانب مخلوق پر شفقت اور ان کے ساتھ ہمدردی کے مظاہرے، ایک طرف تسامح، چشم پوشی، دریا دلی، مروت اور رواداری، تو دوسری جانب منکر پر نکیر، کسی ملامت کی پروا کیے بغیر حق گوئی اور اظہار حق، ایک طرف تواضع، خاکساری اور ملنساری، تو دوسری جانب استغنا، خودداری اور زہد جیسی صفات۔

ان متضاد صفات کا ایک آدمی اور فرد میں مزاج نبوت سے قرب اور مناسبت کے بغیر جمع ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے جو مزاج نبوت سے جتنا نزدیک ہے اتنا ہی اس کی زندگی میں اعتدال ہے، بالفاظ دیگر اتباع سنت اعتدال کا راستہ ہے اور سنت سے دوری افراط اور تفریط کا راستہ ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد امین اورکزئی شہید کی زندگی میں ان گوناگوں صفات کو بہت آسانی کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکتا تھا، علمی رسوخ، وسعت مطالعہ اور علمی اشتغال میں وہ علما کے طبقے میں ایک مثال کا درجہ رکھتے تھے، حضرت بنوریؒ کا ان پر اعتماد اور شرح معانی الآثار پر تحقیقی کام کے لئے ان کا انتخاب ان کی علمیت کا بین ثبوت ہے، رات کے آخری ثلث میں بیداری اور صبح تک اذکار واشغال کی پابندی اور پورا رمضان اعتکاف ان کے عملی تصلب اور روحانیت کی واضح دلیل ہے۔

بڑے شیوخ سے لے کر چھوٹے طلبہ تک آنے والوں مہمانوں کا اکرام ان کی تواضع، ملنساری اور خلق خدا پر شفقت کا ایک باب ہے۔ استغنا، خوداری، زہد اور بڑے مناصب کو چھوڑ کر گاؤں میں گمنامی اور خودنمائی سے دور زندگی ان کی زندگی کا ایک اور مستقل باب ہے۔

مجھے حضرت شیخ مولانا امین شہیدؒ کی زندگی میں بڑی قابل تقلید صفات نظر آئیں، حضرت شیخ ان رجال آخرت

سے تھے جن کی نظر میں دنیا کی چمک دمک کی کوئی وقعت نہیں تھی، ان کی صحبت میں رہنے سے بھی یہ صفات، آدمی میں کسی حد تک اور حسب استطاعت منتقل ہو جاتی تھیں۔

شعبان و رمضان ۱۴۲۵ھ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مجھے اور برادر مفتی عبیدالرحمٰن عباسی کو جامعہ قرطبہ کے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحبؒ کے پاس دارالعلوم حقانیہ دورۂ تفسیر میں شرکت اور حضرت احمد علی لاہوریؒ کی سند حاصل کرنے کا موقع ملا۔ شعبان کی آخری تاریخ اور رمضان کی یکم تاریخ کو ہم سب حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے، اسی رات کو یکم رمضان ہوگئی اور حضرت شیخ مولانا محمد امین صاحبؒ پورے مہینے کے لیے اعتکاف میں بیٹھ گئے، وہ رات ہم نے حضرت کے ساتھ مسجد میں گزاری، حضرت کے ساتھ جو مجلس ہوئی اور اس میں جو گفتگو ہوئی، اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

میں نے حضرت شیخ سے یہ سوال کیا کہ حضرت! آپ نے بڑے شیوخ و اساتذہ کو دیکھا، ان کی صحبت اٹھائی، مدارس کے نظام کے حوالے سے ان کا مزاج بھی دیکھا اور اب ہم جیسے لوگ بھی آپ کے سامنے ہیں، تو آپ کیا فرق دیکھتے ہیں؟ وہ کون سی بات ہے جو وہاں تھی یہاں نہیں ہے اور آپ اس کی کو محسوس کرتے ہیں؟

اول تو اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق فرمایا: بھائی! ہم دیہاتی لوگوں سے کیا سوالات کرتے ہو، آپ شہر میں رہتے ہیں، آپ کے پاس نئی معلومات ہوتی ہیں لیکن میرے اصرار پر فرمایا: "میں نے اپنے شیوخ اور اساتذہ کی زندگی میں سادگی دیکھی ہے اور میں مدارس کے نظام میں اس سادگی کا قائل ہوں، طلبہ کو بہت زیادہ سہولیات فراہم کرنا اور تعیش کی زندگی کا ان کو عادی بنانا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے، بلکہ مضر اور خطرناک ہے، اس وجہ سے کہ شاید فراغت کے بعد یہ سہولتیں ان کو فراہم نہ ہوسکیں اور باطل ان کو یہ سہولتیں فراہم کرنے کی پیشکش کرے، تو اس بات کا امکان ہے کہ آپ کی محنت سے تیار شدہ افرادِ حق کے بجائے باطل کے ساتھی بن جائیں، اس لئے کہ وہ ان سہولتوں کے عادی ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی کا حصہ بنا چکے ہوں گے۔"

حضرت شیخ کی یہ بات سن کر میرا ذہن اس بیان کی طرف منتقل ہوا جو حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے ۱۹۹۶ء میں جامعہ خیر المدارس میں علما اور طلبہ کے سامنے کیا تھا جبکہ میں وہاں تخصص فی الدعوۃ والارشاد کا طالب علم تھا، حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے فرمایا تھا: "عیش وعشرت کے عادی نہ بنو، ورنہ ضمیر فروش بنو گے۔"

حضرت مولانا امینؒ کے ساتھ اس مجلس میں گفتگو کے درمیان فقہ حنفی اور غیر مقلدین کے طرز اور انداز کا ذکر چلا تو فرمایا: "فقہ حنفی کی بنیاد درؤیت ہے اور دیگر کی بنیاد روایت پر ہے، ولیس الخبر کالمعاینۃ۔ امام صاحب کے فتاویٰ کوفہ میں آباد صحابہ کرامؓ اور ان کے شاگردوں کے عمل پر ہے۔"

یہ سوال کہ جب تمام ائمہ برحق ہیں تو پھر امام صاحبؒ کی تقلید کیوں؟ اس کے جواب میں فرمایا:

"امام ابوحنیفہ خیر القرون کے آدمی ہیں اور ائمہ اربعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے سب سے زیادہ نزدیک ہیں اسی خیریت کی بنیاد پر ان کی تقلید کرتے ہیں۔"

جب وفاق المدارس نے درجہ سادسہ کے نصاب میں مسند امام اعظم شامل کی اور جامعہ قرطبہ میں اس کی تدریس میرے حوالہ ہوئی تو میں نے حضرت شیخ شہید کو اس حوالے سے ایک خط لکھا، کہ اس کی تدریس میں کن کتابوں کا مطالعہ ساتھ رکھا جائے تو حضرت نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:

"مسند الامام کے لئے تنسیق اور شرح العلامۃ القاری کے ساتھ عقود الجواہر المنیفۃ ہو سکے تو نافع ہوگا ان شاء اللہ۔ اور اگر حضرت مفتی مہدی حسن صاحب کی شرح میسر ہو تو وہ بہت مفید اور مفصل خزینہ ہے۔"

فقہی کتب میں "شرح نقایہ" تفسیر میں "جلالین کے بجائے "مدارک" اور" بیضاوی" کے بجائے "ابوالسعود" کے قائل اور مداح تھے، نثر الازھار علی شرح معانی الآثار ان کی زندگی کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے، کاش کہ وہ اس کی تکمیل فرما لیتے، لیکن کم حسرات فی بطون المقابر۔

ان کی زندگی کے قابل تقلید اور لائق اقتدا پہلو مثلاً ان کے مطالعے کا ذوق و انداز، معمولات کی پابندی، مختلف تعلقات کو نبھانے کا سلیقہ، مادیت سے تاثر کے بجائے روحانیت کا اہتمام، مدرسے کا نظام چلانے میں ان کا ذوق، اپنے اساتذہ اور شیوخ سے تعلق کا انداز، اولاد اور شاگردوں کی تربیت میں ان کا انداز وغیرہ ابواب تو ان کی اولاد اور صحبت اٹھانے والے شاگرد ہی بتا سکتے ہیں اور ان کو بتانا چاہیے کیونکہ نئی نسل اور خاص طور پر جدید فضلا کے لیے یہی باتیں مشعل راہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کا فیض ان کی صالح اولاد اور لائق تلامذہ کی شکل میں جاری رکھے۔ آمین

ہمارے مقتدا

مولانا غلام محمدؒ، راولپنڈی

بندہ عمر کی ۱۱۵ بہاریں کاٹ چکا ہے، اعضاوقویٰ مضمحل ہیں، پڑھنے لکھنے کی سکت نہیں لیکن مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد طفیل سلمہما اللہ کا اصرار تھا کہ مخدوم ملت، نمونہ اسلاف حضرت مولانا محمد امین صاحب کے بارے میں کچھ ضرور پیش کریں۔ بندہ نے جس زمانے میں دینی تعلیم حاصل کی، اُس وقت باضابطہ مدارس نہ تھے مختلف علماء کرام کے دروس ہوا کرتے تھے، ہم نے دردر پھر کر کتابیں پڑھیں، حدیث کے حلقے بھی کم تھے۔ مجھے صرف مشکاۃ اور ابو داؤد شریف مولانا محمد کریم کا کاخیلؒ سے پڑھنے کا موقع مل سکا۔ بعدازاں ہنگو کے قریب قصبہ درویزی پلوسہ میں کی مسجد کا امام وخطیب ہوگیا اور اپنے اساتذہ کے طرز پر مختلف کتابوں کا درس بھی شروع کردیا۔ قاعدہ سے لے کر شرح جامی تک مختلف طلبہ مختلف کتابیں پڑھتے تھے۔ عموماً یہ غیر اقامتی طلبہ ہوا کرتے تھے۔ مولانا محمد امین صاحب سے باقاعدہ تعارف اُس وقت ہوا جب آپ بنوری ٹاؤن میں مدرس تھے۔ بندہ نے ایک دوست کے ایما پر اپنے بچے حافظ یٰسین محمد صاحب کو تعلیم وتربیت کے لئے ان کے حوالے کیا۔ حضرت نے اُن کی تعلیم وتربیت کا حق ادا فرمایا، کراچی سے تشریف آوری کے بعد حافظ صاحب کو بھی ساتھ لے آئے، پھر اپنی نگرانی میں دورۂ حدیث تک پڑھایا۔

مولانا محمد امین صاحب علم وعمل میں کامل تھے، اخلاق حسنہ سے مزین تھے، بندہ اُن کی زیارت وملاقات کو سعادت سمجھتا تھا۔ آخری عمر میں جب ضعف زیادہ ہوگیا تھا تو میرے بچوں کو سختی سے تاکید کی کہ استاذ جی کو اکیلے نہ آنے دیا کریں، کوئی ایک بندہ ساتھ ضرور آیا کرے، تاکہ کہیں راستے میں تکلیف نہ ہو۔ اس میں کوئی تصنع نہیں کہ میں مولانا کے پاس استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتا تھا، میں سمجھتا تھا کہ یہ میرے مرشد اور پیر ہے۔ لیکن اُن کا معاملہ ایسے ادب اور تواضع کا ہوتا تھا اور مجھے ایسے احترام سے نوازتے تھے گویا میں اُن کا پیر ہوں اور وہ میرے مرید ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مہمان نوازی کا خوب جذبہ اور سلیقہ عطا فرمایا تھا، مہمان کو دستیاب چیزوں میں سے اچھی سی اچھی چیز کھلاتے تھے اور خود اپنے ہاتھ سے خدمت کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ادب کی صفت سے بھی خوب نوازا تھا۔ میرے لئے تو اُن کی حیثیت مقتدا کی تھی لیکن اُن کے ادب کا عالم یہ تھا کہ جب بھی ہمارے گھر تشریف لاتے تھے تو میرے مساوی چارپائی پر نہیں سوتے تھے۔ بچے اُن کی چارپائی میرے ساتھ کمرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے لیکن وہ فرش پر بستر ڈال کر سوجاتے تھے۔ میں نے ایک دو

دفعہ برا بھی منایا اور کہا کہ اگر آپ چارپائی پر نہیں سوئیں گے تو پھر میں بھی زمین پر سوؤں گا۔لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتے، نہ مجھے چارپائی سے اُترنے دیتے اور نہ خود اُوپر سوتے۔

بندہ نے ایک بار حضرت مولانا فضل محمد صاحب قدس اللہ سرہ سے درخواست کی کہ مجھے دلائل الخیرات کا وظیفہ عنایت فرمادیں، حضرت نے مولانا محمد امین صاحب کو حکم دیا کہ مولانا کو آپ وظیفہ دیں گے۔اپنے اُستاذ کے حکم پر حضرت نے مجھے سبقاً سبقاً دلائل الخیرات پڑھائی اور اپنے خاص طریقے پر اجازت عنایت فرمائی، یہ آپ کی شفقت اور عنایت تھی۔اس کے بعد تصوف کے مسائل میں بھی میرا رجوع مولانا محمد امین صاحب سے رہنے لگا۔ایک بار بندہ نے حاضر ہوکر مسئلہ پوچھا کہ ہمارے سلسلہ قادریہ کے اسباق میں تقدیم وتاخیر کی جاسکتی ہے یا نہیں۔حضرت نے جواب دیا کہ پہلے دو اسباق کے علاوہ باقی آٹھ اسباق میں تقدیم وتاخیر نہیں کی جاسکتی، ہر سبق کا وظیفہ حسب ترتیب پڑھنا ضروری ہے۔عام دینی مسائل میں بھی میرا رجوع حضرت ہی کی طرف رہتا۔ایک بار پنڈی میں مجھے سجدہ سہو کا ایک مسئلہ درپیش ہوا تو میں نے ہنگو حاضر ہوکر مولانا محمد امین صاحب سے مسئلہ دریافت کیا۔آپ نے کتاب منگوائی اور اس میں سے پڑھ کر مسئلہ بتلایا۔عام عادت یہی تھی کہ جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو زبانی یاد ہونے کے باوجود کتاب منگوا کر بتلاتے تھے۔مجھے یاد نہیں کہ آپ سے مسئلہ پوچھا گیا ہو اور آپ نے بغیر کتاب دیکھے بتلادیا ہو۔

چونکہ آپ گاؤں میں رہتے تھے جہاں اقامت جمعہ کی شرائط موجود نہیں تھیں، اس لئے جمعہ کی نماز اپنے استاذ شیخ القرآن والحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کی اقتدا میں پوخ (پکی) مسجد ہنگو میں پڑھتے تھے۔لیکن کبھی کبھار میری مسجد میں بھی تشریف لاتے۔ایک بار میں نے عرض کیا کہ حضرت میرے بیان کو غور سے سنا کریں اور اگر کوئی غلطی ہو یا نماز کی قرأت میں کوئی سقم ہو تو مجھے ضرور متنبہ کیا کریں۔اس پر سخت متعجب ہوئے اور تین بار بلند آواز سے ''سبحان اللہ'' فرمایا۔یہ آپ کی حد درجہ تواضع تھی ورنہ آپ ہر لحاظ سے ہمارے مقتدا و پیشوا تھے۔

آپ کی شہادت کے بعد قبر پر حاضری کا بہت دل کرتا ہے۔لیکن معذوری اور بیماری کے باعث اسفار کا متحمل نہیں، حافظ یاسین انگلینڈ میں ہے، آجائے تو کہوں گا کہ مجھے جیسے کیسے ہو مولانا کی قبر پر لے جائیں تاکہ اپنے محبوب کی آخری آرام گاہ کی زیارت کرسکوں۔اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمیں آپ کی فیوضات وبرکات سے بہرہ ور فرمائے۔(ملحوظہ: مولانا غلام محمد صاحبؒ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۶ء کو انتقال فرماگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضرت الاستاذؒ: سیرت و کردار کی چند جھلکیاں

مفتی وصی اللہ، اسلام آباد

مجھے اپنے ایک عزیز دوست نے بتایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا، میں لائبریری میں کھڑا کسی کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہوں کہ ایک صاحب آکر مجھے زور کا دھکا دے کر کہتے ہیں: پتہ ہے کیا ہوا؟ جی نہیں بتائیے کیا بات ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا۔ آپ ادھر کھڑے ہیں، جائیے باہر حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا انتقال ہوگیا ہے! اناللہ وانا الیہ راجعون، جلدی میں باہر کی جانب بڑھا تو لوگ جنازے میں شرکت کے لیے جوق در جوق دوڑے جارہے ہیں جنہیں دیکھ کر میں بھی بے اختیار چل پڑا۔

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی تو پریشانی سی محسوس ہورہی تھی مگر سمجھ نہیں آرہا تھا کہ تعبیر پوچھنے کدھر کا رخ کروں، ارباب علم وفضل میں سے کس شخصیت کے پاس جاؤں:

(۱) موصوف حضرت اورکزئی شہید صاحب رحمہ اللہ کے پاس۔

(۲) پائل کے شیخ الحدیث، تلمیذ حضرت مدنی حضرت شیخ معزالحق صاحب رحمہ اللہ کے پاس۔

دلی میلان حضرت اورکزئی صاحب رحمہ اللہ کی جانب زیادہ رہا، کیونکہ موصوف کا تعبیری ملکہ مثالی تھا، مگر کبھی اپنی اس گوہر یکتا صفت کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد فرماتے کہ تعبیر خواب کا جو ملکہ ہم نے حضرت العلامہ مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ کے ہاں دیکھا وہ واقعۃً الہامی تھا۔

بالآخر زیارت کی نیت سے حاضر خدمت ہوا، آپ کو "رسائل ابن ابی الدنیا" کی کسی جلد کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا، کتاب بند کی اور علیک سلیک کے بعد خواب عرض کیا، تو حسب عادت شریفہ تھوڑی دیر سکوت چھایا رہا، متفکر رہے، پھر ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں، خواب سے جو اشارہ مل رہا ہے وہ بڑا عجیب ہے وہ یہ کہ ہنگو شہر کے کسی ایسے عالم کا انتقال ہونے والا ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے محدث اور سنت پر سختی سے کاربند اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ النفس و ماہر تفسیر شخصیت کے مالک ہیں!!!(۱)

آہ! ٹھیک دو ماہ بعد جب شہادت کا عظیم سانحہ ارتحال برپا ہوا تو یک دم وہ خواب میری آنکھوں کے سامنے

منڈلانے لگا اور زبان سے بے اختیار آ نکلی کہ وہ اپنی علمی شان اور شوکت کی شہادت بزبان خود دے کر محبوب حقیقی سے جا ملے۔ اللھم لاتحرمنا اجرہ و لاتفتنا بعدہ۔

بدنیا گر کسے پائندہ بودے

ابوالقاسم محمد زندہ بودے

رجال اللہ (اللہ تعالیٰ کے خاص بندے) کا انتظام تکوینی امور میں سے ہے کہ بغیر اس کے تشریع کی تکمیل، مراد شریعت کے مرادات، وقت کی نزاکتوں کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ دگرگوں حالات میں صحیح بتھان اور معاشرے کی درست نبض شناسی کا کامل شعور انہی اللہ جل شانہ کے خاص بندوں کی تشخیص سے ممکن ہوسکتا ہے۔

بنابریں قرآن حکیم نے ہدایت کے سلسلہ میں ان دونوں عنصروں (کتاب وشخصیت) کے جمع رکھے جانے کو جو عدل واعتدال کی اساس ہے، بطور ایک کلی ضابطہ اور قانونِ عام کے اقوام و امم کے سامنے رکھا جس کی غرض وغایت ہی مخلوق میں قیام عدل وقسط ظاہر فرمائی۔ فرمایا:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معھم الکتب و المیزان لیقوم الناس بالقسط (2)۔

ترجمہ: ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔

غور کیا جائے تو اس آیت میں سابقہ آیت کی طرح ارسال رسل کو انزال کتب پر مقدم لاکر شخصیت کی ضرورت کو کتاب سے بھی زیادہ اہم قرار دیا گیا ہے جب کہ کتاب کا نزول ہی شخصیت پر ہوتا ہے، نیز کتاب اللہ کا کتاب اللہ باور کرانا اور اس کے الفاظ وتعبیرات کا پہنچانا، پھر اس کی مرادات کا سمجھانا اور لوگوں کے دل ودماغ کو زیغ اور کجی سے پاک کر کے صحیح صحیح مرادات سمجھنے کے قابل بنانا شخصیت ہی سے متعلق تھا نہ کہ محض کاغذی نوشتوں سے، اس لئے کتاب پر شخصیات مقدسہ کو مقدم رکھ کر ان کی اہمیت اور اقدمیت پر روشنی ڈال دی گئی۔

لیکن اس کے معنی کتاب کی عدم اہمیت کے نہ سمجھ لئے جائیں، معاذ اللہ۔ یہ نہیں کہ کتاب اللہ کا ظہور شخصیت پر موقوف ہے نہ یہ کہ کتاب اہم نہیں، ورنہ انزال کتب کا ذکر ہی نہ کیا جاتا۔ پس انزال کتب نہ صرف اہم ہی ہے بلکہ اس لئے لابدی اور ضروری بھی ہے کہ تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس وغیرہ کے قوانین وضوابط اور احکام وہدایات تو بہر حال کتاب ہی کے ذریعے سامنے آسکتے تھے۔ پس حسب معروضہ سابقہ کتاب مذکر ہے اور شخصیت مبین ہے اور سلسلہ ہدایت وارشاد اور راہِ تعلیم وتربیت کے لئے دونوں ہی عنصر ناگزیر ہیں۔ (3)

کچھ یادرفتگاں میں:

قدرت کے کرشموں سے کیا کچھ مخفی رہ سکتا ہے، ایک دور تھا جب حضرت شہید رحمہ اللہ کے مایہ ناز استاذ محدث العصر نابغۃ الدہر، نظریات اکابر کا محافظ، بانی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، حضرت العلامہ محمد یوسف البنوری رحمہ اللہ کا خاص نمبر چھپنے کی ہوا چلی تو آپ شہید اورکزئی نے جو نذرانہ اپنے استاذ محترم کی یادوں سے وابستہ پیش کیا، اور جس زورِ قلم سے آپ نے شاندار سوانحی خاکہ سپرد قرطاس کیا، وہ تاحیات انسانی نقش کا مجبر رہے گا، آج بعینہٖ وہی الفاظ وتعبیرات والقابات کا سہرا آپ کی نذر کرتا ہوں، چونکہ اس سے بہتر آنجناب کی رتبہ شناسی سے میں قاصر ہوں:

ظاہری حسن وجمال بھی بلاشبہ آپ کا مثالی تھا، لیکن جو چیز دل ودماغ کو متاثر کر کے آپ کا غلام بنا دینے پر مجبور کرتی تھی وہ آپ کے اخلاق حسنہ اور مکارم شیم تھے۔ طہارت ونظافت، شرم وحیا، عفت وغیرت، جود وسخا، شہامت وبسالت، زہد وقناعت، جرأت واستقامت، کرم ومروت، علم وحلم، عفو وصفح، ورع وتقویٰ، صدق وصفا، لطف ووفا، غنا واستغنا، خوش مزاجی وخوش گفتاری، دلداری وملنساری، قدردانی ورتبہ شناسی، الغرض فاضلانہ، کریمانہ اور مؤمنانہ اخلاق کی فہرست میں سے کوئی عنوان لیجئے، حضرت الاستاذ کی کتاب زندگی میں اس کے گہرے اور واضح نقوش آپ کو نظر آئیں گے۔ ہر چیز اور ہر کام میں لطافت وسلیقہ، طہارت ونظافت کا خیال رکھنا آپ کا شعار تھا۔ تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہے۔

اپنی شخصی عظمت کے باوجود تواضع وانکسار کا وصف بھی آپ میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا جو کہ ایک عالم ربانی کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ شخصی عظمت کے مینار کی بلندی کا تو یہ حال کہ دیکھنے والے کے سر سے کلاہ گر پڑے اور خدا گواہ ہے کہ اب تک مشروع القاب کے ڈھیر میں سے ایسا کوئی لقب نہیں پا سکا جو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے بلند وبالا قامت کی شایان شان ہو۔ لقب کا ہر جامہ آپ کے قد کی بہ نسبت کوتاہ ہی پایا۔

بہرحال اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود جب بھی کسی صاحب علم وفضل کا ورود ہوتا تو آپ کی متواضعانہ ادائیں ورطہ حیرت میں ڈال دیتی تھیں اور آپ عجز ونیاز کے پیکر نظر آتے۔ بسا اوقات واردین حضرات اور حضرت الاستاذ کے درمیان ثریٰ اور ثریا کی نسبت ہوتی تھی۔ مگر حضرت کا معاملہ ان کے ساتھ ایسا ہوتا جیسا کہ اصاغر کا اپنے اکابر کے ساتھ ہوتا ہے۔ علمی کمال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عظمت حق کا نقش دل پر ثبت ہو کر انسان اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے۔ عرفان حق حاصل ہوا اور عجب وپندار بھی باقی رہے، یہ ناممکن ہے۔ جیسا کہ خود پسندی کے ساتھ معرفت حق کا حصول ناممکن ہے:

اہل ظاہر جس قدر چاہیں کریں بحث وجدال
میں یہ سمجھا ہوں خودی میں تو خدا ملتا نہیں

حضرت کے کمالات اور محاسن کا حیطہ تحریر میں لانا تو درکنار مجھ جیسے حقیر کے لئے تو چشم تصور وادراک سے بھی ان کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔(4)

آپ کی شخصیت صرف دینی علوم ومعارف کے طبیب حاذق کی حیثیت سے ہی معروف نہیں تھی بلکہ للّٰہیت و اخلاص، زہد وتقویٰ، جذبہ، خدا طلبی، جوش عمل، عزم وہمت، صبر واستقامت کے بے باک وبرگزیدہ رہنما کی حیثیت سے قوم کے مقتدا وپیشوار ہے۔

کس تواضع وانکساری عاجزی ومسکنت سے اتباع سنت کی شاہانہ زندگی آپ نے بسر کی؟ اور کن دندان شکن دلائل سے آپ نے فرق باطلہ کا مقابلہ کیا؟ اور کس امانت ودیانت، اخوت ومساوات سے آپ نے سنی قوم کی سیادت وقیادت کی لگام سنبھالی؟ اس داستان کے چیدہ چیدہ واقعات یقیناً آپ اس خاص نمبر کے دیگر مختلف مضامین میں مشاہدہ کرلیں گے۔ راقم الحروف تو ان سطور میں صرف چند ملاقاتوں کی مختصر روئیداد پیش کرنے کا خواہاں ہے، جہاں تک آپ کا فقیہانہ ذوق وبصیرت راسخہ کا تعلق ہے، اسے راقم کے دوسرے مضمون "حضرت الاستاذ کے فقہی بصائر" میں ملاحظہ فرمالیں۔

علمی نشستیں:

کون نہیں جانتا آپ کی علمی بازگشت کو، موصوف کے متعلقین ہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ بھی جسے حضرت کے ساتھ نشست وبرخاست کا موقع میسر آیا اس نے بھی آپ کی علمی، روحانی نسبت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مجھ جیسا طالب علم جب بھی حضرت کی زیارت کے لئے حاضر ہوتا تو آپ ایسے ہشاش وبشاش اور والہانہ استقبال کے ساتھ ملتے کہ اپنائیت کا صحیح شعور اسی لمحہ محسوس ہوتا، دل وجان فدا کرنے کو بے تاب ہوجاتے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ راقم الحروف زیارت کی نیت سے رمضان المبارک ۲۰۰۶ء میں حاضر خدمت ہوا تو آپ کو دوران اعتکاف مسجد میں پایا۔ اردگرد کچھ سیاسی احباب حلقہ لگائے بیٹھے تھے، ان کے رخصت ہوجانے کے بعد بنگاہِ حسرت ارشاد فرمایا کہ بھائی! ہماری زندگی تو دیکھ لیں ان جیسے کاموں کی نذر ہوگئی ہے، آپ جیسے محب علم ساتھیوں کا مجھے بڑا انتظار رہتا ہے۔ پھر آپ نے حال واحوال دریافت کیے، تو بندو نے عمرہ کے لیے عنقریب جانے کا عزم ظاہر کیا اور ساتھ ہی تخصص فی الحدیث کے سال دوم میں مقالہ کے انتخاب کے لیے حضرت سے مشاورت

چاہی، آپ نے فرمایا: کہ بھائی! بہتر ہوتا کہ آپ مقالہ عرب کے محقق ومؤلف کتب کثیرہ جناب شیخ محمود سعید ممدوح کے زیر نگرانی "مرکز البحوث الاسلامی دبئی" میں لکھ لیتے (5)، چونکہ موصوف اورکزئی رحمہ اللہ مذکور بالا شیخ کی بعض نقاش علمی سے بہت متاثر تھے اور فرماتے تھے: کہ "التعریف باوھام من قسم السنن الی صحیح و ضعیف" میں ناصر الدین الالبانی - جو کہ غیر مقلدین کے بہت ہی مایہ ناز محقق سمجھے جاتے ہیں - کی نوسو ۹۰۰ احادیث پر انہوں نے بہترین محدثانہ ومحققانہ علمی مناقشہ کیا ہے، یہ کتاب چھ جلدوں میں چھپی ہے۔ حضرت اورکزئیؒ نے تو غالباً شیخ موصوف کے انہی مثبت پہلوؤں کی وجہ سے میری راہنمائی کی، اس وجہ سے کوئی تنقید نہیں فرمائی۔

ملاقات کے چند روز بعد راقم کا جب عمرے کا سفر ہوا، تو بفضل اللہ وعونہ کہ مدینہ منورہ میں روضۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عقب میں، اتفاقاً عرب کے مشہور محقق و مدقق حضرت العلامۃ المحدث الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ کے جانشین حضرت شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ وعافاہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا (حضرت اس وقت پورے عالم کے علمی حلقوں میں ایک مرجع کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں) حضرت شیخ نے حال واحوال دریافت کرنے کے بعد ملاقات کا سبب دریافت کیا؟ راقم نے جواب میں چند علمی اشکالات کے ازالے کے لیے عرض کیا کہ حضرت بعض معاصرین محققین بسا اوقات اپنی تالیفات میں کسی ایسے راوی کو جو سب کے ہاں ثقہ ہوتا ہے مجروح ٹھہراتے ہیں، یا سب کے ہاں مجروح ہے مگر وہ اسے ثقہ گردانتے ہیں، کیا ہم ان کے اس قول پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: کون ہے؟ عرض کیا صاحب "التعریف" شیخ محمود سعید ممدوح، سنتے ہی آپ علمی جلال میں آئے، اور ارشاد فرمایا: کہ "ھو لعاب فی الدین" وہ تو دین کو کھلونا بنانے پر تلا ہوا ہے، میرا یہ پیغام، پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے علما تک پہنچا دیں کہ عرب محققین میں سے دو شخصیات کی کتابوں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھیں!

(۱) مذکورہ بالا شیخ محمود سعید ممدوح (۲) شیخ حسن السقاف

اوّل الذکر کے بارے میں فرمایا: کہ میں نے ایک مؤتمر میں ان سے کہا تھا کہ تمہیں "تنشیف الاسماع بشیوخ الاجازۃ والسماع" (6) میں علامہ کوثری صاحب رحمہ اللہ کے مخالف لکھتے ہوئے حیا آ رہے نہیں آئی، محمود سعید ممدوح نے کہا کہ آئندہ طبع میں، اسے ختم کر دوں گا، مگر افسوس کہ نہیں کیا!

اسی طرح سے شیخ حسن السقاف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا کرتا ہے؟ عرض کیا کہ جی نہیں! ارشاد فرمایا کہ وہ آج کل "تقریب بین المذاہب" کے طوطوں کی زبان بول رہا ہے۔ الامان والحفیظ،

ساتھ ہی ساتھ میں نے عرض کیا کہ پھر ان صاحبان کی کتابوں سے بالکل استفادہ ترک کر دیں؟ ارشاد فرمایا: نہیں بلکہ اکابر کا اصول مدنظر رکھا جائے "خذ ما صفا ودع ما کدر" جو ابحاث عمدہ اور سلیقے کی ہوں اس کے اخذ میں

کوئی حرج نہیں۔ یعنی جمہور محدثین کرام کی پیروی ہی دراصل انسان کو اس کی فکری کجرویوں سے محفوظ رکھنے میں معین ومددگار ثابت ہوتی ہیں، پس جن ابحاث علمیہ میں جمہور کے راہ روے منزل ہوں اس سے اقتباس واستفادہ میں کوئی حرج نہیں۔

اور حضرت العلامہ موصوف صاحب کو بھی جو مناقشہ محمود سعید ممدوح کا پسند تھا اسی جمہور کی تائید وتعضید کی وجہ سے پسند تھا، اس لئے کوئی صاحب علم یہ نہ کہے کہ اب ان صاحبان کی ہر بات ہی مردود سمجھی جائے گی، کیونکہ موجودہ ملحدین اور ظاہریہ نے جو جادۂ اسلاف پر کیچڑ اچھالا ہے، اس کا عربی میں واقعتاً بہترین مناقشہ ان دونوں صاحبان نے ہی کیا ہے۔ لہٰذا گزشتہ بالا فروگذشت سے ان کی دیگر علمی کاوشوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سفر عمرہ سے واپسی پر حضرت اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جب حاضری ہوئی تو حضرت شیخ عوامہ حفظہ اللہ کی ساری داستان نقل کردی، جس پر آپ نے نہایت خوشی کا اظہار فرمایا کہ الحمد للہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہوگیا۔

حضرت الاستاذ کا حافظہ:

اسی طرح ایک اور نشست میں حضرت موصوف سے سنا کہ میں پشاور کی ایک کتب خانہ میں تھا، میں نے صاحب کتب خانہ سے شرح بخاری ابن ابی جمرۃ کے متعلق پوچھا تو موجود حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب نے لقمہ دیا کہ یہ ابن ابی حمزۃ ہیں ابن ابی جمرۃ نہیں!

تو میں خاموش ہوگیا کہ شاید بڑھاپے کی وجہ سے حافظہ کمزور ہوگیا ہے، تاہم واپسی پر جب میں نے کتابوں کی طرف رجوع کیا وہ تو ابن ابی جمرۃ ہی تھے، پھر میں نے ان صاحب کی طرف مکتوب لکھ کر اس کی تصحیح کروالی۔ یہ آپ کے حافظے کا عالم تھا کہ زمانہ بیت جاتا ایک بات کو پڑھے ہوئے، مگر حافظے میں یوم اوّل کی طرح نقش رہتا تھا!

پھر ارشاد فرمایا کہ حضرت تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے بھی "بیان القرآن" میں علم السلوک کے دوران شرح ابن ابی جمرۃ سے استفادہ کیا ہے۔ ایسے ہی ایک اور نشست کی سرگذشت ہے کہ محدث سرحد علامہ غور غشتوی صاحب رحمہ اللہ (7) ت: ۱۴۰۷ھ کا مشکوٰۃ شریف پر جو حاشیہ ہے اس کا قلمی نسخہ جو راقم کو ان کے پوتے سے میسر آیا تھا اور زاہدی کے مکتبہ سے قلمی نسخوں کی فہرست جب حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کی تو نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

اہل علم میں تواضع کی ضرورت:

فرمایا: بعض اہل علم میرے پاس آئے اور بڑے لمبے چوڑے دعوے کرنے بیٹھ گئے کہ میں ایسا ہوں اور ویسا

ہوں، میری اتنی کتابیں اور اتنا حلقہ احباب ہیں! روزانہ مجھے اتنے فون آتے ہیں اور میں نے حنفیت کی اتنی خدمت کی کہ میرا فتاوی ۱۲۰ جلدوں میں آنے والا ہے...!!

پھر تعجب سے ارشاد فرمایا کہ ہر چند ہم بھی رحم مادر سے حنفی ہیں مگر یہ دعوں پر دعوے تو ہرگز ہمارے اکابر کی شان نہیں! اہل علم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے علم پر تعلی کرتے پھریں! علماء ربانیین تو اپنی شان وشوکت تواضع ہی میں سمجھتے ہیں!! سبحان اللہ

اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند سطور کا خاتمہ محدث الاسکندریہ حضرت علامہ محمد ابراہیم عبد الباعث الکتانی حفظہ اللہ (جو کہ اس وقت مصر کے کاروان اہل علم کے منظور نظر اور نامور علماء ربانیین میں سے ہیں) کے قول سے کروں، فرماتے ہیں:

ان الشر لا یاتی من قبل خصوم الاسلام أو اعداء الاسلام و انما یاتی من قبل الادعیاء! نسئل اللہ العفو و العافیۃ فی الدین و الدنیا و الأخرۃ.

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد صفوۃ خیر البریۃ وعلی الہ وصحبہ ومن والاہ وبارک وسلم تسلیما کثیرا.

حوالہ جات:

(۱) یہ خواب مجھ سے مفتی ندیم صاحب (فاضل ومتخصص دارالعلوم کراچی) نے بیان کیا۔

(۲) سورۃ الحدید: ۵۴۔

(۳) علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج از قاری محمد طیب صاحب تخریج وتحقیق مجلس البحوث الاسلامیہ راولپنڈی ص: 38۔39۔

(۴) ماہنامہ بینات محدث العصر خاص نمبر بحوالہ مضمون حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ ص: 691۔

(۵) چونکہ اس زمانہ میں میری عارضی رہائش بھی وہیں تھی، اور حضرت کو اس کا علم تھا اس لئے آپ نے دبئی میں مقیم عرب شیخ کا مشورہ دیا۔

(۶) دیکھئے تفصیل کے لئے ص: 331 تا 352۔

(۷) دیکھئے تفصیل حالات تذکرہ علماء تھچھ از محمد نذیر رانجھا ص: 239۔

علم وعمل کے مینار

مولانا سید عدنان کاکاخیل، اسلام آباد

یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے، اسلام آباد کے ایک کالج میں یہ ناچیز سیکنڈ ائیر کا طالب علم تھا جس خزاں رسیدہ علمی گھرانے سے تعلق تھا اس کی صدیوں کی تاریخ علم وعرفان کی روایت تھی۔ خدا جانے کیا سودا سر میں سمایا تھا کہ ہم نے صدیوں سے جاری وساری روایت سے بغاوت کر کے ڈاکٹر بننے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ ایک دن شام کو گھر کی گھنٹی بجی۔ بندہ باہر نکلا تو ایک پرانی سی گاڑی میں دو سفید ریش بزرگوں کو دیکھا اور تیسرے صاحب جو ادھیڑ عمر ہوں گے، گیٹ پر کھڑے تھے۔ قبل اس کے کہ گیٹ پر کھڑے صاحب کچھ بتاتے۔ گاڑی میں بیٹھے بزرگ نے مجھے اشارے سے قریب بلایا اور پوچھا: ''مولانا عبداللہ کاکاخیل کے بیٹے ہو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فرمایا: جا کر والد صاحب سے کہو کہ فضل محمد سواتی آیا ہے۔ میں اندر آیا اور والد صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ باہر کوئی فضل محمد صاحب سواتی آئے ہیں۔ غور سے مطالعہ کرتے والد صاحب اچانک چونک گئے اور بڑی عجلت میں پوچھا: ''کون؟'' میں نے پھر عرض کیا۔ تو خلاف عادت بہت تیزی سے اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ باہر کھڑے دونوں بزرگوں اور والد صاحب کے درمیان جو پر جوش معانقے اور جن زوردار خیر مقدمی جملوں کا تبادلہ ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد صاحب پر بڑی مسرت اور غیر معمولی جوش وخروش کے اثرات تھے جو میرے لئے خاصی حد تک حیران کن تھے۔ دونوں بزرگوں کو بیٹھک میں بٹھا کر اندر گئے اور جا کر بتایا کہ فلاں فلاں آئے ہیں تو اندر بھی ایمرجنسی نافذ ہوگئی اور مہمانوں کے اکرام کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ میں ہنوز لاعلم تھا اور انتظار میں تھا کہ والد صاحب علیحدہ ملیں تو ان سے پوچھوں کہ یہ کون حضرات ہیں۔ مغرب کے بعد والد صاحب نے مجھے اوپر کی منزل میں مہمانوں کے کمرے کی تیاری کا حکم دیا تو میں نے موقع پا کر پوچھ لیا کہ یہ کون حضرات ہیں؟ فرمانے لگے کہ ان میں ایک میرے استاذ مولانا فضل محمد سواتی صاحب ہیں، بڑے بزرگ آدمی ہیں، دیوبند کے فاضل اور حضرت مدنیؒ کے شاگرد ہیں۔ ان سے بنوری ٹاؤن میں میں نے ابوداؤد شریف پڑھی تھی اور دوسرے میرے دوست مولانا محمد امین

اورکزئی صاحب ہیں جو بنوری ٹاؤن کی تدریس کے زمانے میں ہمارے ساتھی مدرس تھے۔ یہ ان دونوں ہستیوں سے پہلے مختصر تعارف کی کہانی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ امین الملۃ والدین حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحب شہیدؒ کا یہ مختصر تعارف بعد میں مستقل آمد و رفت، پھر تلمذ، پھر گہرے تعلق اور محبت کی منازل طے کراتا ہوا عشق کی حد تک جا پہنچائے گا۔ اس رات والد صاحب کی خوشی اور مسرت دیدنی تھی۔ بار بار فرماتے: مولانا امین صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کے وسیع کتب خانے کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس سے وہ واقف نہ ہوں۔ ساتھ ساتھ ان کے اخلاص، روحانیت اور للّٰہیت وتقویٰ کا بھی ذکر کرتے رہے۔ میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے ساری زندگی والد صاحب کو کسی زندہ انسان کے علم وتقویٰ سے متاثر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر تذکرہ کرتے بھی تھے تو حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی اور حضرت مدنی رحمہم اللہ کا ہی کرتے۔ ان کے شاگرد اور معاصر اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کا علمی معیار بہت بلند تھا اور اپنے معاصرین کے بارے میں کوئی اونچی رائے رکھنا اور ان کے ٹھوس علمی مزاج ومذاق کے لیے خاصا مشکل تھا۔ مگر مولانا امین صاحب کے بارے میں ان کے تاثر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اگرچہ وہ زمانہ ان باتوں کو سمجھنے کا نہ تھا کہ ہم مدارس اور حلقہ علماء وطلبہ سے دور ایک عام کالجی نوجوان کی سی زندگی گزار رہے تھے یا ضائع کر رہے تھے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایف ایس سی کے بعد اللہ تعالیٰ نے تبلیغ میں کچھ وقت لگانے کی توفیق عطا فرمائی۔ اسی تھوڑے سے وقت نے کایا پلٹ دی۔ وہاں سے قرآن پاک کے حفظ اور علم دین کا شوق پیدا ہوا۔ حفظ قرآن کی سعادت کے بعد اللہ تعالیٰ مدرسے میں لے آئے مگر ان سارے سالوں میں دل سے وہ دو بزرگ اور ان کی نورانی صورتیں محو نہ ہوسکیں۔ مدرسے میں دوسرا سال تھا کہ والد صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ والد صاحب مرحوم خاندان کے آخری عالم تھے۔ ان کے بعد پورے گھرانے میں کوئی عالم نہ بچا اور افسوس کہ یہ علمی افسردگی اس خاندان پر چھائی جو چودہ سو سالوں سے نسل در نسل مسند علم اور ارشاد کے صدر نشین پیدا کرتا رہا اور جس پر کوئی صدی ایسی نہیں گزری کہ تاریخ نے اس کے نامور اور باکمال علماء ومشائخ کا تذکرہ محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس لئے نئی نسل کا اس طرف سے بے اعتنائی دیکھ کر والد صاحب بہت غمگین ہوتے تھے اور بزبان حال کہتے تھے: ؎

مگر جس کے گھر کا چراغ ہے تو

ہے اس کا مذاق عالمانہ

چنانچہ والد صاحب کے انتقال کے بعد بندہ کو ایک ایسے سرپرست کی تلاش تھی جو علمی زندگی کی کٹھن راہوں میں رہنمائی کرے اور جس کا ہاتھ پکڑ کر اپنا اگلا سفر کیا جائے اور اس ضرورت کے احساس کے ساتھ ہی حضرت مولانا امین

صاحبؒ کا تصور دل میں آتا تھا کہ کسی طرح ان تک رسائی ہو جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں۔ جس مدرسے میں ہم زیر تعلیم تھے، وہاں ہنگو (کوہاٹ ڈویژن) کے کافی طلبہ پڑھتے تھے جن سے میں اکثر و بیشتر حضرت مولانا امین صاحب کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا۔ ایک دن دل میں ٹھانی کہ آج ہنگو چلنا ہے اور مولانا سے ملنا ہے۔ چنانچہ ایک دوست کو تیار کیا اور ہم دونوں ہنگو روانہ ہو گئے۔ ہنگو شہر سے مولانا کا مدرسہ ۸ کلومیٹر دور تھا۔ پوچھتے پاچھتے ہم شاہو وام جا پہنچے۔ جہاں جامعہ یوسفیہ مولانا نے بیس پچیس سال پہلے قائم کیا تھا۔ مولانا امین صاحب، محدث عصر مولانا یوسف بنوری کے عاشق زار تھے۔ مدرسے کا نام یوسفیہ، مکتبہ کا نام یوسفیہ، بیٹے کا نام یوسف...... غرض ہر طرف عشق یوسفی کی داستانیں بکھری ہوئی تھیں۔ مولانا باہر صحن میں تشریف فرما تھے اور علاقے کی کوئی معزز با اثر سیاسی شخصیت شہر کے کشیدہ حالات پر مولانا سے مشورہ کرنے آئی ہوئی تھی۔ ہم نے تو مولانا کو پہلی نظر میں پہچان لیا کہ یہ نورانی چہرہ حافظہ سے محو ہوا ہی نہ تھا مگر ہماری بدلی ہوئی وضع قطع مولانا پہچان نہ پائے۔ بڑی ملائمت سے پوچھا: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ میں نے جیسے ہی اپنے والد صاحب کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا۔ یک دم اٹھ کر دوبارہ سینے سے لگایا اور دیر تک لگائے رکھا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی اور بڑے عجیب لہجے میں ارشاد فرمایا: ''مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں''۔ پھر دیر تک والد صاحب مرحوم اور مولانا عزیز گل صاحب اور مولانا نافع گل صاحب کے تذکرے کرتے رہے۔ غضب یہ کیا کہ اصرار کر کے ہمیں چارپائی کے سرہانے بٹھایا اور خود پائنتی پر تشریف فرما ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے انگاروں پر بٹھایا ہوا ہو مگر کیا کرتا مولانا مصر تھے کہ یہیں بیٹھنا ہے۔ اتنی محبت، اتنی تواضع، اتنی شفقت نہ ہم نے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں اس کا عشر عشیر نظر آیا۔ شام کا کھانے پر مولانا نے دسترخوان پر دنیا جہان کی نعمتیں جمع کر دیں۔ میں حیرت زدہ اس دور افتادہ دیہات اور کچی تعمیرات کو دیکھتا اور پھر مولانا کے شاہی دسترخوان کو۔ پھر مولانا کا کھلانے کا انداز اور محبت بھری ادائیں اس پر مستزاد۔ کبھی بوٹی چھوٹی چھوٹی کر کے کھلا رہے ہیں۔ کبھی چاول سے گوشت نکال کر دے رہے ہیں۔ خود تو چند لقمے ہی بمشکل کھائے ہوں گے اور ہمیں اس قدر کھلا دیا کہ دسترخوان سے اٹھنا مشکل ہو گیا۔ پھر چائے اور پھر قہوے کا دور چلا۔ اس دوران بار بار بڑی ہی انکساری سے دسترخوان کی سادگی پر معذرت کرتے رہے کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں، بدوانہ تہذیب ہے، ہمارے ہاں بس یہی سادہ کھانا پکتا ہے جو مہمانوں کی سخت بے اکرامی ہے مگر کیا کریں سلیقہ کی کمی ہے۔ اور میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا کہ اگر یہ سادہ کھانا ہے اور دیہاتی پکوان ہیں تو ہم شہروں میں جو اپنے مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں وہ کیا ہے؟ صبح کو رخصتی کے وقت پھر سینے سے لگا کر پرنم آنکھوں سے رخصت کیا۔ میرا رفیق سفر جوان ساری نوازشوں، عنایتوں اور محبتوں کا عینی شاہد تھا، ورطۂ حیرت میں تھا اور بار بار مجھے کہتا: ''واللہ میں نے ایسا عالم اپنی

زندگی میں نہیں دیکھا۔" مجھے یوں لگا جیسے میری تلاش اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ مجھے قدرت نے اس شجر سایہ دار تک پہنچا دیا تھا جس کی محبتوں کے گھنے سائے تلے اور شفقتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کا اگلا سفر آسان ہو۔ میں نے دس سال حضرت کی صحبت کا لطف اٹھایا۔ تعلیم اور تدریس کے سلسلے میں جہاں بھی گیا، ان کے مشورے سے گیا۔ جو بھی پڑھا، یا پڑھایا ان سے پوچھ کر پڑھا پڑھایا۔ جو رائے قائم کی حتی المقدور حضرت سے موافقت کی کوشش کی۔ گھریلو مشورے، نجی زندگی، ملکی حالات، تعلیمی زندگی، کتابوں سے متعلق دریافت، اکابر کے حالات .....غرض کون سا موضوع تھا جس پر حضرت مولانا سے رہنمائی نہ ملتی ہو۔ اتنا صائب مشورہ، اتنی تچی تلی رائے، اتنی عقل کی بات کہ کیا کہنے.....ان دس سالوں میں اس اللہ والے کی دور رس نگاہ، بصیرت افروز گفتگو اور اخلاق نبوت کے جو مناظر ان آنکھوں نے دیکھے ہیں وہ لب پر آنہیں سکتے۔

قلم کے اس مسافر کو کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس قدر دشواری اور مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ پر لکھتے ہوئے ہو رہی ہے۔ اتنی ہمہ گیر، کثیر الجہت اور گوناگوں صفات اور خصوصیات سے مزین دلنواز ہستی کی شخصیت کے کس پہلو کو پہلے ذکر کیا جائے اور کس کو بعد میں؟ کیا لیں اور کیا چھوڑیں؟ یہ اس قدر دشوار کام ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت کے وسیع اور عمیق علم پر کچھ لکھنا چاہیں تو حضرت کا عدیم المثال تقویٰ اور پرہیزگاری یاد آجاتی ہے۔ حضرت کے زہد اور استغنا پر بات کرنا چاہیں تو حضرت کا جود و سخا مجسم ہو جاتا ہے۔ وسعت مطالعہ اور معلومات کی کثرت کا تذکرہ کرنا چاہیں تو شب بیداری اور کثرت ذکر اور دیگر اشغال و اوراد یاد آجاتے ہیں۔ اصول پسندی اور استقامت کی جھلک دکھانا چاہیں تو مروت اور دلداری اور خرد نوازی کی داستانیں آنکھوں کو بھگو دیتی ہیں۔ غرض عقیدت کیش اور کفش بردار عالم حیرت میں ہیں کہ کیا کہیں اور کیا چھوڑیں؟ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ بے ربط اور منتشر یادوں کو ترتیب کی ایک لڑی میں پرونے کی فکر کرنے کی بجائے کیف ما اتفق جیسے تیسے قرطاس کے سپرد کیا جائے۔

حضرت مولانا امین صاحب نے طالب علمی کا زمانہ بڑی محنت سے گزارا تھا۔ ذکاوت اور ذہانت کا جوہر فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ پتہ پانی کر دینے والی محنت کی توفیق اللہ سے ملی۔ دونوں چیزوں نے مل کر کمال کی منازل آسان کر دیں۔ دوسرا فضل یہ ہوا کہ اساتذہ بڑے باکمال ملے، ہر ہر کتاب اس فن کے امام سے پڑھی۔ اپنے اساتذہ کا تذکرہ بڑا مؤدب ہو کر کرتے تھے اور ان کے علمی اور فنی مہارتوں کے عجیب عجیب قصے سناتے تھے۔ مولانا عبدالغفار صاحب کا تذکرہ خاص طور پر فرمایا کرتے تھے، جو تمام علوم اور فنون پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے۔

حضرت شہید کا سب سے نمایاں اور ممتاز وصف ان کی غیر معمولی علمیت تھی۔ اس آخری زمانے میں ان کے علم

میں سلف صالحین کی سی رونق اور دل آویزی تھی۔ ان کے استاذ بلکہ اس آخری دور کے بیشتر بڑے علما کے استاد مولانا فضل محمد سواتیؒ اپنے اس شاگرد کے بارے میں اکثر کہا کرتے تھے: ''مولانا امین صاحب اس زمانے کے لوگوں میں سے نہیں۔ ان جیسے لوگ کئی صدیاں پہلے ہوا کرتے تھے''۔

میں نے بڑے ثقہ علما کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علم حدیث، جرح وتعدیل اور اسماء الرجال میں برصغیر پاک وہند میں مولانا امین صاحب کا ثانی کوئی نہ تھا۔ ان کی ساری زندگی حدیث پاک کے مطالعہ، اس پر غور وفکر، اس پر غیر معمولی عمل اور اسی کو سوچتے ہوئی گزری۔ کتب خانہ سے مطالعہ کی جو کتب نکل کر ان کے کمرے میں پہنچتیں ان میں بکثرت حدیث کی کتابیں نظر آتیں۔ اعتکاف میں بھی حدیث شریف کے مطالعہ کا معمول تھا اور سینکڑوں کتابیں ان کے کتب خانے سے نکل کر مسجد میں معتکف تک پہنچائی جاتی تھیں۔ حدیث شریف سے یہ غیر معمولی شغف اور انہماک حضرت بنوریؒ کے تلمذ اور صحبت کی برکت سے تھا۔ جس زمانے میں حضرت بنوریؒ ترمذی شریف پر اپنی معرکۃ الآراشرح ''معارف السنن'' تصنیف فرمارہے تھے تو دارالتصنیف میں مولانا امین صاحب ہی حضرت کی معاونت کرتے تھے۔ اس کام میں اس کے دوسرے رفیق حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید تھے جن کے ساتھ مولانا امین صاحب کے محبانہ اور محبوبانہ تعلق کو دیکھنے والے ابھی سینکڑوں زندہ ہیں۔ اللہ کی شان کہ ان دونوں دوستوں کو شہادت کی سعادت میسر ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ استاذ شہیدؒ کے ساتھ ہنگو سے کراچی آیا اور ہمارا قیام حسب معمول حضرت مولانا قاری قاسم صاحب استاذ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن کے دولت کدے پر تھا۔ مولانا قاری قاسم صاحب حضرت استاذ شہید کے محبوب ترین تلامذہ میں سے ہیں اور میرے انتہائی مشفق اور مہربان استاذ ہیں۔ مولانا کے دولت کدے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ حضرت مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ اور حضرت استاذ شہیدؒ نے مدۃ العمر ہمیشہ کراچی کا قیام وہیں فرمایا ہے۔ اور دیگر شاگردوں اور تعلق داروں کے پیہم اصرار اور منت سماجت کے باوجود کہیں اور ٹھہرنا پسند نہیں فرمایا۔ حضرت قاری قاسم صاحب کے مکان پر سارا دن ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک دن مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے صاحب زادے مولانا یاسر حبیب صاحب جو اس وقت طالب علم تھے اور اب جامعہ بنوری ٹاؤن میں استاذ ہیں ملنے کے لئے آئے، اپنا تعارف کرایا تو حضرت استاذ شہیدؒ پر بڑی عجیب کیفیت طاری ہوئی اور کوئی آٹھ دس منٹ کا طویل معانقہ فرمایا اور اس سارے وقت میں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی۔ اس کے بعد پوری مجلس میں انہیں کی طرف متوجہ رہے اور ان کے جانے کے بعد کئی گھنٹے حضرت پر حزن وملال کا اثر رہا۔ معارف السنن کی تصنیف کے زمانے میں استاذ شہید کو حضرت بنوریؒ کی صحبت اٹھانے کا خوب خوب موقع ملا اور اس دور کے واقعات بڑے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے: مجھے تو کوئی الساری سے کتاب

نکال کر دینے والا بھی نہیں ہے ورنہ ہم جب حضرت بنوریؒ کے ساتھ بنوری ٹاؤن کے دار التصنیف میں ان کی معاونت کرتے تھے تو ان کے مطلوبہ مقام سے کہیں آگے کے تمام حوالے پہلے سے نکال کر بالکل تیار رکھتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ حضرت کو کوئی حوالہ درکار ہو تو اس وقت نکالنے میں بلا وجہ وقت ضائع ہو۔ اس لئے ہم اپنا کام حضرت کے کام سے کافی آگے تک کر کے رکھتے تھے۔

مسلمانوں کے پاس علم حدیث شریف کا غیر معمولی قیمتی سرمایہ موجود ہے اس میں سے ایک اہم اور جلیل القدر کتاب امام طحاوی کی شرح ''معانی الآثار'' ہے جو ہمارے حلقوں میں ''طحاوی شریف'' کہلاتی ہے۔ تمام ائمہ احناف کو اپنے اپنے زمانوں میں اس کتاب کے بے پناہ بلند روایتی ودرایتی معیار کی وجہ سے اس سے غیر معمولی تعلق اور شیفتگی رہی ہے، آخری صدی کی دو غیر معمولی شخصیات امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور امام زاہد الکوثریؒ خصوصیت کے ساتھ اپنے تلامذہ کو اس کتاب کے غیر معمولی محاسن اور خصوصیات کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مدت العمر یہ خواہش رہی کہ یہ کتاب دینی مدارس میں اسی اہتمام سے پڑھائی اور مکمل ختم کرائی جائے جس اہتمام اور شان وشوکت سے بخاری شریف پڑھائی اور ختم کی جاتی ہے۔

علامہ کشمیری کے علوم کے وارث اور جانشین علامہ بنوریؒ کا بھی طحاوی شریف سے ایسا ہی تعلق تھا۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کے مجلہ ''بینات'' نے حضرت بنوریؒ کی وفات حسرت آیات پر جو فقید المثال ''بنوری نمبر'' شائع کیا تھا اس میں حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ شہید کا ایک خصوصی مضمون ''حضرت شیخ (بنوری) اور طحاوی شریف'' کے نام سے موجود ہے اس میں حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ شہید نے حضرت الاستاذ مولانا محمد امین شہیدؒ صاحب کا تذکرہ کیا ہے کہ بنوریؒ کی نگاہ طحاوی شریف پر کام کے حوالے سے ان پر پڑیں۔ واضح رہے کہ یہ مضمون آج سے تقریباً چالیس سال پہلے لکھا گیا ہے۔ یہ حضرت استاذ شہید کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا اور عمر بمشکل تیس سال تھی۔ اس زمانہ کی مہارت اور قابلیت کا یہ عالم تھا تو جب اس پر مزید ساڑھے تین دہائیاں گزری ہوں گی تو یہ سونا کیسا کندن بنا ہوگا؟

اس مضمون میں حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ شہید نے تفصیل بتائی ہے کہ حضرت بنوریؒ طحاوی شریف پر کس انداز میں کام چاہتے تھے جو صدیوں سے احناف کے ذمہ ایک فرض کی طرح باقی تھا اور پھر اس عظیم الشان کام کے لیے مولانا بنوریؒ کی جوہر شناس نگاہ اپنے لائق وفائق شاگرد حضرت مولانا امین شہید پر پڑی جن کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مشاہدہ معارف السنن کی تالیف کے دوران ہو گیا تھا۔ مولانا نے حضرت کے انتخاب کی لاج رکھتے ہوئے ''نثر الازھار'' کے نام سے وہ معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو رہتی دنیا تک مولانا کی محدثانہ اور فقیہانہ بصیرت پر شاہد عدل رہے گی۔

حضرت الاستاذؒ کے تذکرہ کے ساتھ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحبؒ کا ذکر لازمی آئے گا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی بھی کچھ یادیں ذکر کر دی جائیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب جیسے گوشہ نشین، عزلت پسند، شہرت اور ناموری سے کوسوں دور بھاگنے والوں سے دنیا واقف نہیں ہو پاتی۔ ان کا علم وتقویٰ، زہد واستغنا، عبادت وریاضت، خوف وخشیت، تواضع وانکسار، جہاد ومجاہدہ، خدمت خلق اور غریب پروری پر ایک ردائے خفا تن جاتی ہے اور خلق خدا کو اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنی بڑی خیر وبرکت سے محروم ہو گئے ہیں۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب سے پہلا تعارف اس حیثیت سے ہوا کہ وہ ہمارے استاذ سید الاتقیاء حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے۔ حضرت الاستاذ شہید کو ہر معاملے میں مولانا عبداللہ صاحب سے مشورہ کرتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کی اقامت گاہیں قریب قریب تھیں۔ جب بھی کوئی اجتماعی قومی یا دینی مسئلہ درپیش ہوتا تو حضرت الاستاذ فوراً فرماتے: 'استاذ صاحب سے مشورہ کرتے ہیں' اور مولانا عبداللہ صاحب کی مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔

وچ بازار میں واقع مولانا عبداللہ صاحب کی چھوٹی سی مسجد پورے علاقے کا مرکز تھی۔ تمام اجتماعی، قومی، ملی، دینی اور سیاسی فیصلے اسی مسجد میں مولانا کے چھوٹے سے کمرے میں ہوتے تھے۔ مولانا کا کمرہ جس میں ان کی زندگی کے ۴۸ سال گزرے، فقر ودرویشی کا عجیب نمونہ تھا۔ اس میں سوائے ان کی ذاتی کتابوں اور مہمانوں کے اکرام کے سامان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سخاوت ومہمان نوازی اس علاقے کی دیرینہ روایت ہے مگر اس کے جو مظاہرے ان دو بزرگوں کے ہاں دیکھے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اپنی مشیخیت اور پیرانہ سالی کے باوجود خود ہی کمرے میں موجود چولہے پر اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاتے تھے۔

مولانا کی سب سے غیر معمولی صفت ان کی انتہا درجے کی دینی حمیت وغیرت اور شجاعت تھی۔ ہنگو ایک حساس علاقہ ہے، جہاں اہل سنت والجماعت کے علاوہ دیگر لوگ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جس غیر معمولی والہانہ عشق کا ذوق بخشا تھا وہ دیکھنے کی چیز تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان میں تنقیص کے کسی مذموم واقعہ سے باخبر ہو جاتے تو بے چین وبے کل ہو جاتے۔ محرم کے جلوسوں میں جب دل آزار نعرے حد سے بڑھ گئے تو مولانا نے اپنے علاقے میں جلوس کی برآمدگی پر پابندی عائد کر دی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی مقبولیت ومحبوبیت اور اتنا اثر ورسوخ عطا کیا تھا کہ پھر ان کی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنے کی کوئی اس علاقے میں جرأت نہ کر سکا۔

طبیعت میں سادگی تھی، جمعہ کی تقریروں میں حکمرانوں کو مخاطب کر کے خوب کلمۂ حق کہتے اور پھر یہ سمجھتے تھے کہ

میری بات ان تک حرف بحرف پہنچ گئی ہے۔ایک جمعہ میں پرویز مشرف کوخوب سنائیں اور پھر اگلے جمعہ اس کی نالائقی پر خاصے تعجب کا اظہار کیا کہ میں نے پچھلے جمعے تمہیں کتنا سمجھایا مگر تم کو پھر بھی سمجھ نہیں آئی۔

ان کے دینی تعلیم کی طرف آنے کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں کسی سرکاری ملازمت غالباً فوج میں بھرتی ہونے کے لئے گئے مگر قامت مطلوبہ معیار میں پوری نہیں اُتری تو بھرتی نہ ہوسکے۔غیور طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ مسترد کئے جانے کا داغ لے کر گھر لوٹیں، وہیں دینی تعلیم کا فیصلہ کیا اور سالہا سال علم دین کی طلب میں پاکستان وافغانستان کی اونچی درسگاہوں سے کسب فیض کیا۔فراغت جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک سے ہوئی جس کی مسند حدیث پر اس وقت ولی کامل مولانا عبدالرحمن کاملپوریؒ رونق افروز تھے۔حضرت کاملپوریؒ سے بہت گہری عقیدت تھی اور ان کی بہت سی باتیں تھیں جو اکثر سنایا کرتے تھے۔

اصلاح وارشاد کے حوالے سے اس زمانے میں اولیں زمانہ مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا۔مولانا ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔مگر اس کا پتا نہیں چل سکا کہ بیعت بھی کی تھی یا نہیں؟ پہلی معلوم بیعت سوات مشہور باخدا بزرگ، مرشد العلماء والصلحاء حضرت مولانا سراج الیوم صاحبؒ (المعروف گڑھئی بابا جی) سے کی اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔دوسری بیعت مرجع خاص وعام حضرت اقدس مولانا سید محمود دامت برکاتہم (المعروف صندل بابا جی) سے کی اور ان سے بھی اجازت وخلافت ملی۔اس کے علاوہ حضرت لاہوری رحمہ اللہ کے معروف خلیفہ مولانا خلیفہ غلام رسولؒ صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لے کر گئے تو انہوں نے بھی پہلی ملاقات میں خلافت سے نوازا۔ان کی ساری زندگی اللہ اللہ کرتے گزری تھی۔ہم نے ان کے آخری دس سالوں میں ان کو جس طرح صبح وشام ذکر اللہ میں مشغول دیکھا اور تمام تر معروفیات کے باوجود جس طرح وہ روزانہ گھنٹوں اللہ اللہ کرتے تھے، اس کی تفصیلات ناقابل یقین ہیں۔وچ بازار کی مسجد میں حضرت کی امامت کی مدت تقریباً ۴۸ سال ہے۔اتنا ہی زمانہ مفتاح العلوم ہنگو میں تدریس بھی فرمائی اور چونکہ وچ بازار میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تھی۔اس لئے شہر کی تاریخی ''پوخ جمات'' (پکی مسجد) میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔اس پورے ۴۸ سالہ امامت خطابت اور تدریسی خدمات کے طویل دور میں ایک پائی تنخواہ کی وصول نہیں فرمائی۔تمام عمر ''حسبۃ للہ'' پڑھایا۔اسی اخلاص وللٰہیت نے ان کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت اور بلا کی کشش رکھ دی تھی کہ پورے علاقے کے قلوب گویا ان کی مٹھی میں تھے جس طرف اشارہ فرمادیتے، پورا علاقہ نکل کھڑا ہوتا۔

ایک دفعہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ ہنگو تشریف لائے۔گڑھئی بابا جی رحمہ کا انتقال ہو چکا تھا اور مولانا عبداللہ صاحب مرشد کی تلاش میں تھے۔مولانا فضل محمد سواتیؒ سے بیعت کی درخواست کی تو

حضرت نے حسب عادت جھاڑ پلادی اور بعد میں حضرت الاستاذ مولانا محمد امین شہیدؒ سے خلوت میں بہت تعجب سے فرمایا: انہوں نے بیعت کا کہا۔ اتنے پاکباز انسان کو میں کیسے بیعت کرتا؟ اور ویسے ان کو بیعت کی ضرورت کیا ہے ؟ یہ ایک بہت بڑے ولی کامل کی شہادت ہے جو معمولی بات نہیں۔

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین شہیدؒ اور عبداللہ صاحبؒ کی باہم محبت والفت اور تعلق کو دیکھنے والے ہزاروں لوگ ہیں۔ ہر معاملے میں دونوں اکٹھے ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے نظر آتے۔ دونوں بزرگ دیکھنے میں انتہائی خوبصورت وحسین انوارات سے چمک دمک کرتے روشن چہرے، شب بیداری وعشق الٰہی کے اثر سے مخمور آنکھیں، جب دونوں کسی مجلس میں قریب قریب بیٹھے ہوتے تھے تو آفتاب وماہتاب کی جوڑی معلوم ہوتی تھی، ہر بات میں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر دوسرے کی رائے اور دوسرے کی منشا کو فوقیت دینے کی کوشش کرتے۔

حضرت الاستاذ مولانا امین شہیدؒ کی مظلومانہ شہادت نے مولانا عبداللہ صاحبؒ کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا، اس کے بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ اہل تعلق کو وہ دل خراش منظر یاد ہوگا جب حضرت الاستاذ مولانا امین شہیدؒ کا خون آلود جسد مبارک جنازے کے لئے رکھا ہوا تھا اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کو چار خادموں نے گاڑی سے سہارا دے کر اتارا۔ اپنے عزیز ومحبوب شاگرد کے سرہانے آئے۔ جس کی ناموری ومقبولیت ان کے لئے بڑا اعزاز تھا اور جو تمام عمر ان کے جانثار دوست راست کی حیثیت سے دل وجان سے خدمت گزار رہا۔ خون آلود کفن اور نورانی چہرے پر نظر ڈالی اور یک عجیب انداز میں آسمان کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی متواتر لڑی تھی، جو ڈاڑھی میں جذب ہورہی تھی، اس منظر کو دیکھنے والا کوئی بھی شخص اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا۔

مخدوم زادہ مولانا محمد یوسف اورکزئی کو بلا کر فرمایا: تمہارا باپ کامیاب ہوگیا۔ ہم رہ گئے۔ آج وہ خود بھی ان کامیاب لوگوں سے جاملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکتوں سے ہمیں محروم نہ فرمائے اور ہنگو میں ان دونوں حضرات کے جانشین مولانا عبدالستار صاحب کی حفاظت فرمائے۔ اہل سنت والجماعت کو ہنگو جیسے حساس علاقے میں ان بزرگوں کے بعد بھی اپنا مثالی اتحاد واتفاق قائم دائم رکھنے کی توفیق نصیب فرمائے اور ان کے پسماندگان کو ان کی روایات آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

قافلہ اسلاف کا راہی

مولانا محمد فاروق، سوات

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو انتہائی کم عمر میں صدیوں کا کام کر جاتے ہیں اور مخلوق خدا ہزاروں سال اس سے مستفید ہوتی رہتی ہے۔ اس کی ان گنت مثالیں اسلاف امت کے تذکروں میں محفوظ ہیں۔ سیدی و سندی، مرشدی و مولائی حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد امین قدس سرہ کی ذات والا صفات بھی اسلاف کے اسی قافلے سے تعلق رکھتی تھی، آپ نے اپنی تریسٹھ سالہ زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور جو علمی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی خدمات سرانجام دیں، بندہ اپنی معلومات کے مطابق کسی شخصیت کی اتنی جامع خدمات کا علم نہیں رکھتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاد رحمہ اللہ کو مثالی جامعیت بخشی تھی، آپ ہر علم وفن کے ماہر تھے۔ تفسیر، حدیث، علم الکلام، علم منطق وفلسفہ، فقہ واصول فقہ اور نحو میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ خصوصاً نحو اور حدیث میں اجتہادی شان حاصل تھی۔ صرف فقہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں اس میں حضرت امام اعظمؒ کا مقلد ہوں اور بقیہ علوم و فنون کے ائمہ کے بارے میں یہی خیال تھا کہ ھم رجال ونحن رجال۔

'تقلید' کو تمام علمی و عملی فتنوں سے حفاظت کی ڈھال فرماتے تھے۔ ایک بار میں مولانا عبدالسلام رستمی صاحب کے درس قرآن میں شرکت کے لئے گیا۔ جب حضرت الاستادؒ سے ملنے کے لئے حاضر ہوتو مزاحاً فرمایا: برخوردار! کہیں پر تو نہیں لگے؟ (مطلب یہ تھا کہ تقلید سے آزادی کا سبق تو پڑھ کر نہیں آئے۔ کیونکہ مولانا رستمی صاحب ان دنوں تقلید سے بیزاری کی باتیں بولتے تھے) پھر ارشاد فرمایا کہ ایک بار مولانا عبدالسلام صاحب نے مجھ سے کہا کہ تقلید کی وجہ سے ہم پر بہت اعتراضات ہوتے ہیں، اب صاحب ہدایہ کچھ لکھتے ہیں اور نور الایضاح والا کچھ، ہم کس کی بات مانیں؟ میں نے عرض کیا کہ مولانا! یہ بھی کوئی اعتراض ہے؟ آپ صرف امام صاحبؒ کی تقلید کریں، بھلے اس میں آپ کو صاحب ہدایہ سے اختلاف کرنا پڑے یا کرخی وجصاص کو رد کرنا پڑے۔ آپ صرف امام اعظمؒ کی تقلید پر قائم رہیں، پھر دیکھیں کہ آپ پر کون اشکال کرتا ہے، لیکن وہ اس بات پر نہ آسکے اور بالآخر غیر مقلد ہو گئے۔

بندہ نے بخاری پڑھانے والے بہترین مدرس تو کئی حضرات دیکھے ہیں اور آج کل شیخ الحدیث کے منصب کے لئے عموماً ایسے ہی حضرات کا چناؤ ہوتا ہے، جس کی اہمیت ظاہر ہے، لیکن بجز استاد صاحبؒ کے کسی محدث کی زیارت کا موقع نہ مل سکا۔ فن حدیث اور فن رجال پر آپ کو مثالی عبور حاصل تھا، علوم الحدیث میں سے کوئی ایسا علم نہ ہوگا جس میں آپ کو کامل مہارت اور بھرپور بصیرت حاصل نہ ہو۔ اور کیوں نہ ہو کہ آپ نے حصول علم کے زمانے میں مثالی محنت فرمائی تھی۔ ایک بار ارشاد فرمایا کہ بحمد للہ میں زمانہ طالب علمی میں اتنا مطالعہ کرتا کہ میرے استاد کو میرے اوپر ترس آجاتا اور عموماً وہ تہجد کے وقت آکر میرے ہاتھ سے کتاب چھین لیتے تھے کہ اب تو ساری رات بیت گئی ہے، کچھ دیر کے لئے تو سو جاؤ۔ آپ ایسے واقعات کبھی کبھار طلبہ میں شوق وذوق پیدا کرنے کے لئے سنایا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کتاب کھولنا چاہے ایک منٹ کے لئے کیوں نہ ہو کبھی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔

چونکہ نرا علم ایسی بصیرت عطا نہیں کرتا جو حضرت الاستاذؒ کو حاصل تھی بلکہ اس کے لئے تو نفس کا خون کرنا پڑتا ہے اور استاذ صاحب کو اس میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ اتباع سنت کا نمونہ تھے۔ خود ایک بار فرمایا کہ اگر ایک لحہ کے لئے بھی میرا قلبی دھیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ جائے تو خود کو مرتد محسوس کرتا ہوں۔ جب کسی کے استحضار ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم ہوگا تو وہ کیونکر ترک سنت کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ ایک بار بندہ نلکے سے وضو کر رہا تھا، میں اپنے من میں انتہائی محتاط بن کر دونوں ہاتھوں میں پانی لیتا اور انگوٹھے سے نلکا گھما کر بند کر دیتا، جب حضرت الاستاد کی نظر پڑی تو فرمایا کہ چلو سے پانی لے کر لپ میں ڈالنا اور عضو پر بہانا سنت ہے۔

حضرت سے ہم نے وضو سیکھا اب تک اس کے مطابق کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ ایک بار میں رائے ونڈ مرکز میں وضو بنا رہا تھا، ایک صاحب میرے پیچھے کھڑے مجھے وضو کرتے بغور دیکھ رہے تھے۔ جب میں فارغ ہوا تو میرے پاس آکر کہنے لگے کہ ماشاء اللہ میں نے ایسا وضو کرتے کسی کو نہیں دیکھا اور میں نے آپ سے آج مسنون وضو سیکھا، یہ حضرت کی برکت تھی کہ بچپن میں جو عادت ڈالی وہ بفضل اللہ اب تک قائم ہے۔

حضرت اقدس وقتاً فوقتاً جو باتیں ارشاد فرماتے تھے، بندہ انہیں قلم بند کر لیتا تھا، ایسے چند ارشادات غیر مرتب طور پر پیش خدمت ہیں۔ پھول گلدستے میں جیسے کیسے رکھیں ہوں، اپنی مہک سے ماحول کو معطر کرتے ہی رہتے ہیں۔ امید ہے ان غیر مرتب ملفوظات کی بھی اہمیت محسوس کی جائے گی۔

فرمایا: علمائے کرام! رضائے خداوندی صرف اسی میں منحصر نہیں کہ مدرسہ بنائیں، بلکہ دیگر دینی خدمات اور ذکر و فکر سے بھی رضائے الٰہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

فرمایا: ہمارے پٹھانوں کا سب سے بڑا عیب نظم وضبط کا فقدان ہے۔

فرمایا: کثرت تنقید سے اکثر اوقات اداروں میں کام بگڑ جاتا ہے۔ اگر بندہ اپنا کام درست طریقے سے کرے اور دوسروں پر تنقید چھوڑ دے تو اس کا معتدبہ فائدہ مرتب ہوتا ہے۔

فرمایا: ایک وقت میں ایک کام کرو، جب اس کی تکمیل ہوجائے تو دوسرا شروع کرو، بیک وقت کئی کام شروع کرنے سے ذہنی بوجھ بڑھتا ہے اور کام بھی بخوبی نہیں ہو پاتا۔

فرمایا: ہر صحابی کے دل میں اللہ تعالیٰ نے فیض نبوت کا کچھ نہ کچھ حصہ محفوظ فرمایا ہے۔ کسی صحابی کی توہین وتحقیر دراصل نبوت کی توہین وتحقیر ہے اور نبوت کی توہین کفر ہے۔ 'الصحابة کلهم عدول' کی یہی وجہ ارشاد فرماتے۔

فرمایا کہ دنیوی کام تو درکنار دینی کاموں میں بھی اپنے بس سے زیادہ بوجھ اٹھانا ممنوع ہے۔ لا یکلف الله نفسا الا وسعها۔

فرمایا کہ انسان معمولی ہمت سے کام لے تو دنیاوی ضرورتیں پوری کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے، وہ پوری ہوتی رہیں گی، دراصل خواہشات ہی انسان کو ذلیل ورسوا کرتی ہیں۔

فرمایا: حضرت بنوری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دن میں ایک بار قضائے حاجت کی عادت ڈالیں اور اسی حساب سے اپنی غذا کی مقدار رکھیں، جب انسان میں اس حوالے سے بے قاعدگی ہو تو سفر میں یا کسی کے ہاں مہمان ہوجانے کے وقت کافی دقت ومشقت ہوتی ہے۔

فرمایا کہ بدعت کا ظاہر آغاز میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس کے مرتکبین اسے اچھی نیت سے شروع کرتے ہیں لیکن اس کے اندر غلاظت بھری ہوتی ہے، جو رفتہ رفتہ ظاہر ہوتی چلی جاتی ہے۔

فرمایا: جو کام رضائے الٰہی کی نیت سے شروع کیا جائے اور پھر اس میں کسی دنیاوی غرض کی آمیزش کر لی جائے تو اس کا انتہائی خراب نتیجہ مرتب ہوتا ہے، یہ میرا مشاہدہ ہے۔

فرمایا کہ جب دینی مسئلہ یا حکم معلوم ہو تو اسے فوراً عمل میں لاؤ اور پھر اس کی حفاظت کا اہتمام کرو کیونکہ عمل کے بغیر علم محض وبال ہے۔

ویسے تو حضرت الاستاذ کی ہر ہر بات آب زر سے لکھنے کی ہوتی تھی، تاہم جو باتیں مجھے یاد رہ سکیں ان کو اجمالاً ذکر کر دیا۔ استاذ صاحب کے اقوال کی طرح آپ کے عمل سے بھی ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ کئی بار خاص معاملہ کے تحت بڑی عجیب باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی کچھ مشاہدات کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

حضرت الاستاذ مدرسہ کے قواعد وضوابط کو بہر حال ترجیح دیتے تھے، بعض اوقات طبعاً آپ کو تکلیف بھی ہوتی، لیکن مدرسہ کے مجموعی مفاد کی خاطر اسے گوارا فرماتے۔ حضرت کے ہاں چھٹیاں ختم ہونے کے بعد پہلے دن کی

حاضری فرض کے درجہ میں تھی، اگر کوئی طالب علم اس میں کوتاہی کرتا تو سخت سزا دیتے اور اگر تاخیر زیادہ ہوتی تو اخراج بھی فرما دیتے۔ اسی طرح چھٹیوں کے اختتام پر ایک طالب علم بلا عذر بڑی تاخیر سے آئے تو آپ نے اخراج فرما دیا۔ بندہ بھی اس وقت جامعہ یوسفیہ میں مدرس تھا۔ ہم چند مدرسین نے حضرت سے سفارش کی تو فرمایا: مولوی صاحبان! آپ چاہیں تو اپنے طور پر اس کو دوبارہ داخلہ دے دیں، لیکن قیامت کے روز جواب دہ آپ ہی ہوں گے میں نہیں۔ میں نے اسے مدرسہ کی مصلحت اور اس کے فائدے اور اصلاح کو پیش نظر رکھ کر خارج کیا ہے، طبعی طور پر مجھے بھی اس طرح کے فیصلوں سے سخت کوفت ہوتی ہے لیکن مجھے مجبوراً اور اضطراراً یہ تلخ گھونٹ پینا پڑتا ہے، حالانکہ یہ فیصلے میرے لئے اتنے مشکل ہوتے ہیں جیسے مضطر کے لئے خنزیر کا گوشت کھانا۔

زمانہ تدریس میں اگر ہماری دلچسپیوں میں کمی محسوس کرتے تو فرماتے: طلبہ کرام کے فائدے کے لئے اپنے اندر دل سوزی پیدا کرو اور محض ملازم کی طرح ڈیوٹی پوری کرنے کی عادت نہ ڈالو۔ کار تدریس میں حد درجہ دلچسپی اور طلبہ کے لئے دل میں تڑپ اور درد نہ ہو تو اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں نکلتا۔

حضرت الاستاذ کو ہم نے انتہائی قانع پایا۔ خصوصاً پانی اور کاغذ کے استعمال میں اتنی قناعت فرماتے کہ حیرت ہوتی، آپ اتنا ہی کاغذ لکھنے کے لئے لیتے جتنی ضرورت ہوتی، عموماً کاغذ کے حواشی اور اطراف بھی لکھنے سے بھر دیتے اور انگشت برابر جگہ بھی خالی نہ چھوڑتے، خود میرے نام حضرت کا اہم مکتوب کاغذ کے آدھے صفحے پر اسے پوری طرح گھیر کر دونوں جانب لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاک کے لفافے آتے یا ردی کاغذات ہوتے انہیں بھی ضائع نہیں فرماتے تھے اور رف لکھائیوں کے لئے استعمال کرتے۔

پانی انتہائی کم پیتے تھے اور زیادہ پانی پینا بلغم میں اضافے اور نتیجۃً حافظہ کی کمزوری کا سبب بتلاتے تھے۔ اسی طرح وضو و غسل کے لئے انتہائی کم مقدار استعمال کرتے تھے۔ اگر کسی کو پانی میں اسراف کرتے دیکھتے تو سخت ناراض ہوتے اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ ایک بار کسی آدمی نے پینے کا صاف پانی وضو کے لئے مٹکوں سے لوٹے میں بھرنا چاہا تو آپ نے فرمایا: یہ پانی محض پینے کے لئے وقف ہے، اسے وضو کے لئے استعمال کرنا مکروہ ہی نہیں بلکہ صریح حرام ہے۔ اسی طرح مسجد کے پانی، بجلی اور دیگر اشیا میں بھی احتیاط کی تلقین فرماتے۔

طلبہ کرام کی خوب نگرانی رکھتے اور معمولی معمولی باتوں پر روک ٹوک کر کے تربیت کرتے۔ ایک بار مسجد میں طلبہ کے آنے سے پہلے سبق پڑھانے تشریف فرما تھے۔ جب سارے طالب علم حاضر ہوئے تو فرمایا: آپ میں سے ایک آدمی نے بھی سلام نہیں کیا، حالانکہ آنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے گا، یہ کوتاہی کیوں کی؟ سارے طلبہ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے، پھر آپ نے سلام کی اہمیت، مواقع اور اس کی عادت ڈالنے کی ترغیب دی۔

مدرسہ کے امور میں تمام اساتذہ سے مشورہ لیتے۔ بعض ساتھی اظہار کرتے ہوئے شرماتے کہ کہیں حضرت کو ہماری بات سے کوفت نہ ہو۔ اس پر آپ فرماتے کہ رائے ہر شخص دے، رائے نام ہے زیر مشورہ کام سے متعلق اظہار مافی الضمیر کا، اور یہ آپ میں سے ہر ایک کا حق ہے۔ ہاں! اعجاب بالرائے برا ہے کہ اپنی رائے منوانے پر اصرار ہو اور اس پر اعجاب ہو۔ اظہار رائے جدا چیز ہے، اعجاب رائے جدا چیز ہے۔

جس طالب علم میں جیسی صلاحیت ہوتی اسی کے مطابق کام سپرد کرتے۔ ہمیں بھی اس کی تاکید کرتے کہ طلبا کی ان کی صلاحیتیں جانچ کر تربیت کریں۔ فرماتے کہ دارالعلوم دیوبند سے اس وجہ سے رجال کار پیدا ہوئے کہ وہاں اساتذہ کرام طلبہ پر نظر رکھتے اور جس طالب علم میں تدریس کی استعداد پاتے اس کی تربیت تدریس کے لئے کرتے، جس میں دعوت وخطابت کا ذوق دیکھتے اسے اس میدان کے لئے تیار کرتے۔ اگر کوئی جہاد وسیاست کے قابل ہوتا تو اس کی تربیت اسی منہج پر کرتے۔ اور یہ تربیت اس انداز سے ہوتی کہ کسی کو اندازہ بھی نہ ہوتا کہ میں کیا بن رہا ہوں، جب ثمرہ برآمد ہوا تو کوئی امام انور شاہؒ تھا، کوئی حسین احمد مدنیؒ تھا اور کوئی مفتی کفایت اللہ دہلویؒ۔

طلبہ سے فرماتے کہ جو طالب علم اپنے کام میں مشغول ہو کبھی پریشان نہ ہوگا۔ پریشانی اور بے چینی اسے ہوتی ہے جو کام سے جی چرائے کیونکہ شیاطین جنات خالی گھروں میں ٹھکانا بناتے ہیں۔ فرماتے: اپنے آپ کو کسی بامقصد کام میں مشغول رکھو، چاہے وہ کام دین کا ہو، چاہے دنیا کا۔ بامقصد کاموں میں مشغول آدمی کو اللہ تعالی پسند فرماتے ہیں۔

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالی کی نعمتوں کا جتنا قدردان پایا، اس قدر اہتمام اپنی زندگی میں کہیں نہ دیکھ سکا۔ ایک بار تیز بارش ہوئی، مدرسہ کے دفتر کے سامنے ایک ترپال کا شامیانہ بندھا رہتا تھا، اس ترپال پر بارش کا کافی سارا پانی جمع ہو گیا تھا جو کچھ اطراف سے گر رہا تھا، حضرت نے فرمایا کہ صاف وشفاف پانی ہے، اس کو ضائع ہونے سے بچاؤ اور جہاں سے گر رہا ہے وہاں بالٹی، کولر، ڈرم وغیرہ برتن رکھو اور ٹینکی میں ڈالتے جاؤ، پھر اپنا مٹی کا گھڑا منگوایا اور اسے بارش کے پانی سے بھر لیا۔

آپ کی عادت تھی کہ فون پر انتہائی مختصر بات فرمایا کرتے تھے، صرف مقصد سے متعلق بات ہوتی تو وہ کرتے سنتے۔ ورنہ فضول یا غیر مقصود باتوں سے سخت کوفت ہوتی۔ طبیعت کے سخت حساس تھے، تمام قویٰ حسیہ عام افراد سے بڑھی ہوئی تھیں حتی کہ زندہ سانپ کی بو تک محسوس کر لیتے تھے، ایسی آواز سن لیتے جو عام آدمی نہ سن سکتا۔

حضرت الاستاذ مہمانوں کا انتہائی قدر واحترام فرماتے تھے۔ ایک بار بندہ اور مولانا محمد رفیق سواتی مدظلہ حضرت کے ہاں مہمان ہوئے، آپ نے ایسا کھانا کھلایا جیسے وفاقی وزیر کی دعوت کی جاتی ہے۔ مہمانوں کے لئے طرح طرح کے کھانے تیار کرواتے تھے۔ اتنا کھلاتے کہ ہم کھانے سے عاجز آجاتے اور درخواست کرتے کہ حضرت مزید نہیں

کھایا جاسکتا، فرماتے کہ پھلوں کو شہد میں ملا کر کھاؤ، یہ اس طرح کھائے جاسکتے ہیں۔ اتنے اکرام کے باوجود فرماتے کہ وسعت نہیں ورنہ آپ دیکھتے کہ مہمان کا اکرام کیسے کیا جاتا ہے؟ کبھی فرماتے کہ چونکہ خاص اہتمام ہوتا نہیں اس لئے مہمان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھنے میں شرم آتی ہے۔

جس دن آپ کے چچا کا انتقال ہوا تھا، اس دن کا میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جب گھر سے جنازہ قبرستان کی طرف نکلا اور ہم سب لوگ مدرسہ سے نکل کر جنازے میں شامل ہونے لگے تو ایک مہمان جسے غالباً کوئی جلدی تھی، رخصت لینے کے لئے حضرت الاستاذ کی طرف بڑھا اور کہا: جی! اجازت دیں، میں نے واپس جانا ہے۔ اب ایک تو ایسے صدمے کے وقت میں اس بے ڈھنگے طریقے سے جانے کی کوئی تک ہی نہیں بنتی، کیونکہ استاذ صاحب کے چچا نے ہی ان کی پرورش کی تھی اور بمنزلہ والد اور خاندان کے سب سے بڑے بزرگ تھے، جن کا سانحہ ارتحال حضرت استاذ صاحب کے لئے ایک عظیم حادثہ وصدمہ تھا۔ لہٰذا جنازہ کے لئے آٹھ دس منٹ رکنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ پھر اگر ان صاحب نے جانا ہی تھا تو کسی دوسرے سے اجازت لے کر یا استاذ صاحب کے نام پیغام چھوڑ کر چلے جاتے۔ لیکن حضرت الاستاذ کے ماتھے پر مہمان کی اس بات سے ذرا بھی تکدر پیدا نہ ہوا۔ بلکہ یہ عجیب بات میں نے دیکھی کہ جنازہ آگے جا چکا ہے اور استاذ صاحب اس مہمان کے لئے پریشان ہیں اور اس سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ایسے کیسے جائیں گے، ٹھہریں! میں حاجی عین الدین (حضرت کے بھائی) کو بلاتا ہوں تاکہ آپ کو گاڑی تک رخصت کریں۔ پھر آپ نے غالباً کسی کو ان کے ساتھ کر دیا اور خود جنازے کی مشایعت کرنے لگے، میں حیران وسرگردان تھا کہ خدایا! مہمان کا اس درجہ بھی لحاظ ہوتا ہے کہ اس پریشانی اور صدمہ کے وقت جب ''صنو اب'' چچا کا جنازہ سامنے ہے، مہمان کی راحت کا خیال ستا رہا ہے۔

حضرت کے ان چچا کی اولاد نہ تھی، بڑے اللہ والے بزرگ تھے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ''طمع'' کو تو جانتے ہی نہیں کہ وہ بھی کوئی چیز ہے۔ فرماتے کہ حماد بن سلمہؒ کے حالات میں ہے کہ ''ابدال'' کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کی اولاد نہیں ہوتی۔ چچا صاحب اچھے تندرست آدمی تھے، دو شادیاں کی تھیں، لیکن اولاد نہ ہوئی، کبھی خیال اس طرف چلا جاتا کہ شاید ''ابدال'' ہوں۔ اب جس شخص کے بارے میں حضرت استاذ جیسی محتاط شخصیت ابدال کا گمان رکھتی ہو اس کے تقویٰ وورع کا کیا عالم ہوگا؟

اگر کوئی استاذ یا طالب علم اپنی کسی ایسی خوبی کا بتکلف اظہار کرتا جو اس میں حقیقتاً موجود نہ ہوتی تو اس پر فرماتے کہ ''اندھی آنکھیں کھول کر ادھر ادھر پھیرنا سخت عیب ہی''۔ مقصد یہ ہوتا کہ کوئی بزرگ نہ ہو اور لوگوں کے سامنے بزرگ بنتا پھرے، یا ہو نا سمجھ لیکن اپنے آپ کو سمجھدار ظاہر کرتا پھرے تو یہ بدترین عیب ہے۔

آپ اپنے اساتذہ کرام کے بہت زیادہ عقیدت مند تھے، اکثر ترغیب کے لئے اپنے اساتذہ کرام کے مجاہدات اور تذکرے سنایا کرتے تھے۔ایک بار فرمایا کہ مولانا فضل محمد سواتیؒ جس زمانہ میں بنوری ٹاؤن میں مدرس تھے تو مدرسہ کی طرف سے ان کو گھر میسر نہیں تھا۔رکشہ میں آتے جاتے تھے اور اگر رہائش کی جگہ دیکھ لیتے تو ترس آ جاتا، ایک جھونپڑا تھا، جس میں حضرت رہائش پذیر تھے۔فرماتے: جب میرا جامعہ بنوری ٹاؤن میں تخصص فی الحدیث کے لئے داخلہ ہوا تو مجھے دارالاقامہ میں جگہ نہ مل سکی۔میری رہائش ''بینات'' کے دفتر میں تھی۔اپنے لئے کھانا وغیرہ وہیں لاتا۔ایک بار فرمایا کہ میری حیثیت تو کچھ نہ تھی لیکن لوگوں نے کچھ سمجھ رکھا تھا۔اس لئے اساتذہ کرام کا بھی منظور نظر تھا اور بہت توجہ دیتے تھے، لیکن میں اس کی ہمیشہ یہی توجیہ کرتا تھا کہ جس طرح والدین کمزور اولاد کو زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ڈاکٹر وحکیم خطرناک مریض کو زیادہ قابل نگہداشت سمجھتے ہیں، اسی طرح میرے اساتذہ بھی میری نالائقیوں اور کمزوریوں سے واقف ہیں اور میری تربیت واصلاح کے لئے مجھے زیادہ محتاج توجہ سمجھتے ہیں۔

ایک بار زمانہ طالب علمی میں تبلیغی جماعت کے کچھ احباب تشریف لائے اور ہم طلبہ کو اجتماع پر جانے کی دعوت دی، چونکہ میری دلچسپیاں بھی تبلیغی کام سے متعلق تھیں، اس لئے میں نے حضرت سے اجتماع پر جانے کی اجازت مانگی۔حضرت نے فرمایا کہ جانے کی کوئی معقول وجہ بتادیں، پھر چلے جائیں۔میں نے عرض کیا کہ حضرت! اللہ کے راستے کا غبار جس بدن پر لگ جائے اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔فرمایا کہ کبھی مدرسہ آتے وقت یہ خیال آپ کو آیا ہے کہ یہ بھی اللہ کا راستہ ہے اور اس پر بھی یہی فضیلت ہے؟ اس پر ہم خاموش ہو گئے اور اجتماع پر جانے کے لئے مطمئن نہ کر سکے۔

ایک دفعہ بندہ نے مستورات کی تبلیغ سے متعلق کچھ بات کی، تو آپ نے ایسی گفتگو فرمائی جس سے اندازہ ہوا کہ آپ مستورات کا جماعتوں میں نکلنا پسند نہیں فرماتے۔فرمایا کہ خواتین کو جتنے بھی نیک مقصد کے تحت گھر سے نکالیں یہ فتنہ سے خالی نہیں۔چاہیے کہ مرد حضرات اپنی محرم خواتین کی دینی تربیت کریں اور پھر خواتین دوسری خواتین کو گھر و محلے میں سکھائیں۔

بندہ کو حضرت کی شفقتوں سے سال ہا سال فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ایک بار بندہ مہمانوں کے لئے چائے ڈال رہا تھا تو کسی صاحب نے استاذ صاحبؒ سے کہا کہ حضرت یہ آپ کے بیٹے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں! اصل اولاد (روحانی) تو یہی ہے۔بندہ اپنی ذاتی زندگی اور مسائل میں مشورہ اور راہنمائی کے لئے آپ ہی سے رجوع کرتا۔ میرے والد صاحب ہوٹل چلاتے تھے، مجھے ہوٹل کا کام پسند نہیں تھا، اس میں کئی قباحتیں تھیں۔میں نے حضرت سے والد صاحب کے لئے کام کی تبدیلی کا مشورہ کیا کہ ہوٹل ختم کر دیں تو فرمایا کہ جب تک کوئی دوسرا حلال ذریعہ کمانے کا

نہ ہو موجودہ کام ختم کرنا مناسب نہیں۔

جب سوات میں حالات سخت خراب ہوئے اور لوگوں کو مسلح تحریکوں کے حضرات زبردستی اپنے ساتھ شامل کرنے لگے تو میں نے مشورہ کرنے کے لئے حضرت کو خط لکھا کہ کیا کریں، یہاں حکومت کی کسی درست بات کی حمایت پر طالبان گولی مارتے ہیں اور طالبان کے کسی ٹھیک کام پر ان کے ساتھ ہمدردی پر حکومت زندہ نہیں چھوڑتی۔ حضرت نے مجھے علاقہ چھوڑنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اہل وعیال سمیت فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔

حضرت الاستاذ کو میں نے ہمیشہ خادمانہ زندگی بسر کرتے دیکھا، اساتذہ کرام کے لئے گھر سے چائے وغیرہ خود لاتے تھے۔ مدرسے کے کاموں میں بھی ہمارے ساتھ خود شریک ہوتے تھے۔ ایک دفعہ تعمیر کے لئے اینٹیں آئی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ قطار بنا کر ایک دوسرے کو اینٹیں تھماتے اور چند ساتھی انہیں ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ حضرت استاذ بھی اس قطار میں شامل تھے، اس کام کے دوران آپ کے ہاتھ پر اینٹیں گر گئیں، جس سے انگلی زخمی ہوگئی، اس کا خون نیچے ریت پر گرا تو میں نے چپکے سے خون ریت سمیت اٹھا کر چاٹ لیا۔ پتہ نہیں یہ عمل عشق ومحبت میں درست ہوگا یا نہیں، بہرحال اپنی عقیدت تو بحمد اللہ اس درجہ تک پہنچی تھی کہ بدن کے ٹکڑے کاٹ کر حضرت کو پیش کرنا پڑتے تو ان شاء اللہ سوچنے کی نوبت نہ آتی۔

حضرت الاستاذ وقت کے انتہائی پابند تھے۔ اس کے ساتھ علمی مشغلے میں بے جا در آنے والوں سے سخت تکلیف ہوتی۔ اگر کوئی دوران درس غیر ضروری کام کے سلسلے میں آکر مسلط ہوتا تو مروتاً کچھ نہ کہتے لیکن طبیعت پر اس سے سخت بوجھ آتا۔ ایک بار ایک صاحب اساتذہ کرام کے لئے چار عدد انڈے لے کر آئے۔ حضرت الاستاذ اس وقت سبق پڑھا رہے تھے۔ وہ صاحب درسگاہ کے دروازے پر تقریباً چیختے ہوئے کہنے لگے کہ استاذ جی! میں انڈے لایا ہوں، گھر میں بھجوا دیئے کہ مدرسہ کے اساتذہ کے لئے ہیں۔ وہ صاحب چلے گئے لیکن حضرت کی طبیعت مکدر کر گئے۔ فرمایا: اب اس کو یہاں آکر اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر صدقہ کے آداب بتلائے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ اخفا کی کوشش ہونی چاہیے، اگر اخلاص ہو تو جس ذات کے لئے صدقہ دیا جا رہا ہے، بس صرف اسی کے علم میں لانا کافی ہوتا ہے اور وہ ذات علیم وخبیر ہے۔ یہ حضرت الاستاد سے متعلق چند منتشر ومتفرق یادیں تھیں جو جلدی میں قلم بند کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے نافع بنائے۔ حضرت اقدس کی شہادت سے ہم سب یتیم ہوگئے، دکھ درد میں اپنا قوی سہارا چھن گیا، آپ کی رحلت سے جو گہرا گھاؤ آپ کے متعلقین وتلامذہ کو لگا ہے اس کا درد وہی جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت الاستاذ کے درجات بلند فرمائے۔ اور ہمارے جن دوستوں نے حضرت کی زندگی پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا ہے، ان کی دنیا وآخرت سنوار دے۔ آمین ثم آمین

استاذ الکل

مولانا رشید احمد سواتی، اکوڑہ خٹک

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ان اوتاد وابدال میں سے تھے، جن کی مثالیں گزشتہ صدی میں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں، وہ ایک نابغہ روزگار انسان تھے۔ علم، عمل، تقویٰ، خودداری، اور غیرت وحمیت آپ کے رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھے۔ میں حضرت کے حوالے سے اپنی قلبی کیفیات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے سے قاصر ہوں۔ میرے دل میں حضرت الاستاذؒ کی جو تصویر رچی بسی ہے، اس سراپے کو الفاظ وقلم کی دنیا میں لانا میرے لئے ممکن نہیں، یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صدہا اصحاب علم وفن اور صاحبان مسند ولایت کی زیارت و ملاقات کا شرف بخشا ہے، لیکن میری آنکھوں نے آج تک حضرت الاستاذ جیسی شخصیت نہیں دیکھی۔

بندہ پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل وکرم ہے کہ بچپن سے نابغہ عصر اساتذہ سے علمی استفادے اور تعلق کی سعادت ملتی رہی۔ میرے ماموں جان حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ دارالعلوم دیوبند کے نامور فاضل اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے ممتاز اساتذہ حدیث میں سے تھے۔ ماموں جان کی نسبت کی برکت سے بندہ درجہ ثالثہ کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن حاضر ہوا، اس وقت محدث العصر حضرت سید بنوری قدس سرہ بقید حیات تھے، اور جامعہ میں کبار اہل علم وعمل کی پرنور روحانی جماعت بفضل اللہ جمع تھی۔ حضرت مولانا ادریس میرٹھی، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی، حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ اور مفتی احمد الرحمن رحمہم اللہ جیسے افاضل کے ارد گرد طلبہ کے انبوہ در انبوہ جمع رہتے۔

چونکہ درجہ ثالثہ میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا کوئی سبق ہمارے پاس نہ تھا، اس لئے مجھے شناسائی بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس وقت آپ عنفوان وشباب میں تھے اور جامعہ کے انتظامی کاموں میں انتہائی سرگرم رہتے تھے۔ بندہ کی بحمد اللہ بچپن سے درسی مطالعہ کی خوب عادت تھی، میں روزانہ رات ایک دو بجے تک مطالعہ میں مشغول رہتا۔ امتحان کے قریبی ایام میں مطالعہ کا یہ سلسلہ فجر کی اذانوں تک دراز رہتا۔ حضرت الاستاذ کی محنتی طلبہ پر جو شفقت وتوجہ ہوا کرتی تھی، وہ آپ کے سارے تلامذہ کو معلوم ہے۔ حضرت الاستاذ ذہین ومحنتی طلبہ کے کھوج میں رہتے اور پھر بڑے

ہی مشفقانہ انداز میں ان کی تربیت اور حوصلہ افزائی کرتے، میری محنت دیکھ کر حضرت الاستاذ اکثر میری طرف متوجہ رہتے، شاید انہیں تلاش تھی کہ یہ طالب علم کون ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ آپ کے محبوب استاذ حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ میرے ماموں ہیں، تو آپ کی شفقت و توجہ دو چند ہوگئی، اور پھر یہ سلسلہ تا دم مرگ نہیں ٹوٹا۔ بس یہی حضرت الاستاذ سے تعارف و تعلق کی ابتدا تھی۔

درجہ ثالثہ کے سال میں شدید بیمار ہوا۔ معدہ کی کوئی ایسی تکلیف شروع ہوئی کہ میرے لئے جامعہ میں مزید رکنا ممکن نہ رہا، میرے ماموں جناب حسین احمد صاحب کراچی میں مقیم تھے۔ وہ اس ادارے سے جامعہ تشریف لائے کہ اساتذہ سے اجازت لے کر مجھے مستقل اپنے علاقے سوات بھیج دیں۔ جب حضرت الاستاذ سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ میں نے رشید احمد کا کافی علاج کروایا اسے افاقہ نہیں ہو رہا، اس لئے میں اسے واپس بھیجنا چاہتا ہوں، حضرت الاستاذ اسے کبھی گوارا نہیں فرماتے تھے کہ ایک محنتی طالب علم مدرسہ سے چلا جائے۔ آپ کی انتہائی کوشش یہی ہوتی تھی کہ طالب علم کا اخراج نہ ہو اور معمولی اعذار کی وجہ سے کسی کی پڑھائی نہ چھوٹے۔ اس کے لئے حتی الوسع اپنے اوپر مالی بوجھ برداشت کرتے، علاج وغیرہ کرواتے، لیکن طالب علم کو بہر حال علم سے جوڑے رکھتے۔ آپ نے فرمایا: رشید احمد گھر نہیں جائے، میں خود اس کا علاج کروں گا۔ اگر بالفرض یہ ٹھیک نہ ہوا تو بذریعہ طیارہ اسے گھر بھیج دوں گا۔ اس درجہ شفقت و محبت سے میرے اندر ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا اور عزم کیا کہ کچھ بھی ہو جائے ان شاء اللہ کہیں آپ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت الاستاذ نے اپنی نگرانی میں بندہ کا علاج کروایا۔ حکیمی و ڈاکٹری دونوں کی دواؤں کا استعمال کرایا۔ علاج کے سارے اخراجات خود برداشت کیے۔ بفضل اللہ صحت بھی ٹھیک ہوگئی اور حضرت الاستاذ کی صحبت اور جامعہ کے نورانی ماحول سے محرومی بھی نہ ہوئی۔

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کا خاص ذوق و شوق عطا فرمایا تھا۔ آپ کی جوانی کے دور میں جب بندہ امتحان کے ایام میں جامعہ کی مسجد میں رات دیر تک مطالعہ کرتا تھا، آپ بارہ بجے کے بعد تشریف لے آتے اور ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر فجر تک نوافل میں مشغول رہتے، یہ بندہ کا بار ہا کا مشاہدہ ہے۔ اس نماز اور ذکر و عبادت کا جو کیف و سرور ہم دیکھنے والوں پر طاری ہوتا، وہ حیطہ تحریر میں نہیں آسکتا، آپ اندازہ کریں کہ جو خود اس میں مشغول ہو اس کی کیفیات و سرشاری کا کیا عالم ہوگا۔

جامعہ میں ایک بار چند شریر مزاج طلبہ نے حضرت الاستاذ کے خلاف یہ تحریک چلائی کہ چونکہ آپ انتظامی امور میں انتہائی سختی کرتے تھے، اس لئے آپ کو نظامت سے ہٹا دیا جائے۔ یہ بڑا تفصیلی واقعہ ہے، بہر حال میں نے جس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے، وہ یہ کہ اس واقعہ کے نتیجے میں کئی طلبہ کا اخراج عمل میں آیا، حضرت الاستاذ اس وجہ سے

سخت پریشان رہتے تھے کہ میری وجہ سے اتنے طلبہ جامعہ کے ماحول اور حضرت بنوری قدس سرہ کے تلمذ وصحبت سے محروم ہو گئے۔ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ اسی پریشانی کے عالم میں تھا،ایک رات کمرے میں مکمل اندھیرا تھا،میں نارچ کی روشنی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا،ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یا اللہ! کہیں میرا ان طلبہ کی وجہ سے مواخذہ نہ ہو۔جب میں اس آیت ''نوریسعی بینھم الخ'' پر پہنچا۔تو کمرے میں ایک عجیب روشنی پھیل گئی۔اس سے قلب کو تسلی ہوئی کہ ان شاء اللہ،اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا وہ روشنی حسا آپ نے محسوس فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ ہاں! بالکل حسا سارا کمرہ روشن ہو گیا تھا۔

میرے ماموں حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ نے ایک بار فرمایا کہ مولانا محمد امین صاحب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ہماری مثال چاندی کی ہے اور ان کی مثال سونے کی ہے۔ایک استاذ کا اپنے شاگرد کے بارے میں یہ اظہار خیال ان کے لئے بہت بڑی سند اور اعزاز ہے۔

آپ اپنے اکابر کے پکے عاشق تھے،ایک بار زمانہ طالب علمی میں میں نے ایک نورانی صورت بزرگ کو دیکھا کہ حضرت بنوری کے قبر پر مراقب ہیں اور حضرت الاستاد ان کی خدمت کے لیے بچوں کی طرح آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں،میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور آپ لوگوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ ایسی بزرگ ہستی کی زیارت سے ہمیں مشرف فرمایا۔ آپ کا چہرہ کھلکھلا رہا تھا اور اس موقع پر از حد خوش تھے۔

طالب علم کے اندر اگر پڑھنے کا شوق اور مادہ ہوتا تو اتنی شفقت اور محبت سے نوازتے کہ وہ شفقت والدین کے ہاں بھی نہ ملتی،مختلف حیلوں بہانوں سے طلبہ کو پڑھنے کی طرف مائل کرتے۔ایسے طلبہ جو پڑھنے لکھنے کا نام تک نہ لیتے تھے،حضرت الاستاد کی محنت وصحبت کی برکت سے ان میں کتاب بینی کا شوق پیدا ہوا اور بعد میں بڑے اچھے اداروں میں تدریس وتعلیم کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

فقیر پر آپ کا ایک بہت بڑا احسان یہ بھی تھا کہ اخص تلامذہ کو بعض اہم کتب کی تعلیم کے لئے میرے پاس بھیجتے، اس اعتماد پر رب تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ہمارے لئے تو آپ کا نام ہی کافی تھا،اگر کوئی آپ سے معمولی نسبت کا اظہار کرتا تو ہم اس کی خدمت کو اپنی بڑی سعادت سمجھتے۔لیکن آپ کی اصاغر نوازی تھی کہ باقاعدہ اہتمام سے خط لکھ کر داخلہ کی سفارش فرماتے۔مولانا عدنان کاکاخیل کے داخلہ کے لیے لکھتے ہیں:

''امید ہے،مزاج گرامی بعافیت ہوگی،خدا کرے کہ والدہ ماجدہ اور دیگر اہل تعلق بعافیت ہوں،فقیر کافی مدت سے حاضری کا خواہشمند ہے مگر تقدیر ہر چیز پر غالب ہے،فی الحال یہ چند سطور اپنے عزیز برادرم سید

عدنان صاحب کے بارے میں لکھ رہا ہوں، امید ہے آپ جتنا زیادہ ممکن ہو، اسے پڑھانے کے لئے وقت عنایت فرمائیں گے، ان کے تعارف کی ضرورت نہیں، دعوات صالحہ میں یاد فرمائیں۔ والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین سے سلام و درخواست دعا عرض ہے۔''

ایک اور طالب علم کے داخلے کے لئے لکھتے ہیں:

''حامل مکتوب ہمارے قبیلہ سے ہے، اچھے خوش اخلاق طالب علم ہیں، مجھ سے امسال داخلہ کے لئے مدرسہ کا مشورہ لیا۔ میں نے جناب والا کا مشورہ دیا، امید ہے اپنے ہاں داخلہ عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے، دعوات میں یاد فرمانے کی درخواست ہے، حضرت والدہ ماجدہ سے بھی سلام و درخواست دعا عرض کیجئے، احباب کرام اور جملہ اعزہ سے سلام عرض ہے۔ والسلام''

حضرت الاستاذ تو ویسے سراپا کمال تھے، لیکن بندہ سب سے زیادہ آپ کے علمی رسوخ اور خصوصاً معقولات میں مجتہدانہ بصیرت سے متاثر تھا۔ بندہ کو بحمد اللہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی برکت سے معقولات میں کچھ تھوڑی بہت شد بد حاصل ہے، اور اس وقت بھی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں درجہ تکمیل معقولات کی جملہ منتہی کتب بندہ کے زیر تدریس ہیں۔ زندگی میں بڑے بڑے ائمہ منطق وفلسفہ دیکھے لیکن حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے معقولات میں جو شان عطا فرمائی تھی وہ بہت کم دیکھنے میں آئی۔ آپ حقائق کی تہہ تک پہنچ کر انہیں سہل اور مرتب انداز میں پیش فرماتے تھے۔

ایک بار درجہ ثالثہ میں شرح تہذیب کا ایک مقام حل نہیں ہو رہا تھا۔ متعلقہ استاذ صاحب نے تین دن اس پر زور صرف کیا لیکن طلبہ نہ سمجھ سکے۔ بندہ حضرت الاستاذ کی خدمت میں کتاب لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے اس مقام کی تقریر کی کہ کوئی اشکال واغلاق باقی نہ رہا۔ وہ مقام مفرد کی تقسیم میں علامہ تفتازانی کی یہ عبارت ''ان اتحد معناہ فمع تشخصہ وضعا علم الخ ہے۔'' اس مقام سے کچھ آگے ایک اشکال یہ بھی وارد ہوتا ہے۔ کہ مصنف نے لفظ سے حقیقی معنی مراد لے کر جب اس کی طرف ضمیر لوٹائی ہے، تو اس وقت مجازی معنی مراد لیا ہے۔ اس کا ایک مشہور جواب تو یہ ہے کہ یہاں مصنف نے صنعت استخدام سے کام لیا ہے۔ لیکن حضرت الاستاذ نے ایک دوسرا جواب بھی ارشاد فرمایا۔ وہ یہ کہ ''مجازات کی وضع نوعی بھی درحقیقت من وجہ معنی موضوع لہ ہوتی ہے۔ لہٰذا وضع نوعی کا اعتبار کرتے ہوئے مجازی معنی بھی گویا معنی موضوع لہ ہی ہوا۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجازات کی وضع نوعی یہ ہے کہ جب واضع کسی لفظ کو معنی حقیقی کے لئے وضع کرتا ہے تو اس وقت اس کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اگر اس حقیقی معنی سے عدول پر کوئی قرینہ صارفہ پایا جائے، تو

اس وقت اس لفظ سے یہ حقیقی معنی مراد نہ ہوگا، بلکہ قرینہ صارفہ کی روشنی میں معنی مناسب مراد ہوگا، یہ معنی مناسب' مجازی' بھی واضع ہی کا منشا ہے۔ اس لئے یہ بھی ایک طرح کا معنی موضوع لہ ہے۔ لہٰذا مصنف نے ضمیر لوناتے وقت معنی مجازی کی وضع نوعی مراد لی ہے، جو ایک جہت سے معنی حقیقی ہی ہے، تو اشکال وارد نہ ہوا۔

منطق و فلسفہ کے حقائق کو اس آسانی و خوبی سے سمجھانا آپ ہی کا ملکہ تھا، حضرت الاستاذ خود بھی محقق عالم تھے اور تحقیق و علم کے قدر دان بھی تھے۔ بندہ نے جب کافیہ اور شرح ملا جامی کا حل' معارف الکافیہ و عوارف الجامی'' کے نام سے لکھا۔ تو ازراہ شفقت مندرجہ ذیل تقریظ سے نوازا۔ اس کی ایک ایک سطر سے آپ کی تواضع و شفقت واضح ٹپکتی نظر آتی ہے:

''وبعد!

فقد وصلتني نسخة من تاليفكم الماتع النفيس "معارف الكافية و عوارف الجامي'' و تصفحته حيث اطلعت على بعض مباحثه المهمة فسر لي أيما مسرة۔

لقد اعتذرت الى فضيلتكم في الكلمة التي جرت بيننا هاتفيا فلا أراني أهلا للتعليق فضلا عن التقريظ على أمثال هذه الدراسات التحقيقية العلمية، وبالتالي فان هذا العبد الضعيف يتوحش عن هذه الأمور، ذلك ان بضاعتي مزجاة وأوطابي صفر ولكم سعي مشكور وفضل مبرور حيث ألفتم هذا السفر العظيم الذي في الحقيقة يعرف مكانته عباقرة هذه العلوم و أفذاذها، وفي العصر الحاضر اذا نحلل تحليلا شاملا أو نستعرض استعراضا منطقيا فلانرى أحدا من العلماء يخطر على بالهم مكانة هذه المباحث المهمة فضلا عن دراستها وقراءتها اللهم الا من ندر منهم ويليتني لو خرج هذا الكتاب قبل هذا القرن فكم من مستفيد عن هذه المباحث، وفي الختام يدعو العبد الفقير أن يتقبل الله تعالى عن المؤلف العلام ذلك السعي المشكور وينفع به حملة الكتاب والسنة والطلبة الكرام نفعا كثيرا كثيرا۔''

آپ کی شہادت سے علمی حلقوں میں ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے، جو کہیں صدیوں میں پر ہو تو غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو قبول فرما کر آپ کو جنت الفردوس میں عالی مقام نصیب فرمائے اور ہمیں آپ کے فیوض و برکات سے مستفید فرمائے۔ (آمین)

وفا کی تصویر

قاری نذیر احمد، مینگورہ سوات

ہمارے شعور کی آنکھ کھلی تو گھر میں علم وتقویٰ کی حسین بہاروں میں ایک مہکتا نام بار بار سننے میں آتا، والد گرامی حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہ (فاضل دار العلوم دیوبند و مہتمم مظہر العلوم مینگورہ سوات) استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ کا جس عقیدت واحترام اور عشق ومحبت سے لبریز لہجے میں ذکر کرتے، اندازہ ہوتا تھا کہ یہ آپ کے انتہائی قابل قدر معاصرین یا بزرگوں میں سے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو آپ کے ضابطے کے شاگرد ہیں، لیکن اپنے ظاہری اور باطنی کمالات میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ والد صاحب کے لئے بھی قابل رشک بن گئے ہیں۔ ہمارے لوح دماغ پر اس نابغۂ روزگار ہستی کے یہ اولین نقوش تھے جو ثبت ہوئے، پھر تو اُن کی زیارت وملاقات اور ان کی شفقت ومحبت سے فیض یاب ہونے کا ایسا تانتا بندھا کہ آج اس کی تشنگی میں بدن کا رواں رواں سسکتا محسوس ہوتا ہے اور اُس ہستی کے فراق سے ہماری ساری بہاریں خزاں ہیں۔

مولانا محمد امین شہیدؒ نے جب دورۂ حدیث کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا تو اُس وقت والد صاحب وہاں کے بڑے اساتذہ میں سے تھے، والد صاحب ہی نے ان کا داخلہ امتحان لیا تھا، یہ واحد طالب علم تھے جن کو والد صاحب کسی کتاب میں پھنسا نہ سکے، تمام کتابوں کے مشکل مقامات ازبر تھے، ان کے اس امتحان کا جامعہ میں اتنا چرچا ہوا کہ حضرت اقدس سید بنوری رحمہ اللہ تک خبر پہنچ گئی کہ کوہاٹ سے ایک طالب علم آیا ہے جو فنون میں کسی ماہر ومشاق مدرس سے بڑھ کر استعداد رکھتا ہے اور اُسے ساری کتابیں یاد ہیں، یہیں سے حضرت الاستاذ اورکزئی رحمہ اللہ اکابر کی نظر شفقت میں آئے اور پھر مسلسل ترقی کرتے چلے گئے۔

حضرت والد گرامی جب اپنے علاقہ واپس آئے تو اُن کی خواہش تھی کہ حضرت الاستاذ بھی یہیں آ کر اُن کے ساتھ کار تدریس میں شریک ہو جائیں، لیکن آپ نے کئی وجوہات کی بنا پر کراچی سے واپس آ کر اپنے علاقہ میں

'جامعہ یوسفیہ' کی بنیاد رکھی۔ والد صاحب نے چند سال بعد مجھے اور برادر گرامی قاری بشیر احمد صاحب کو حضرت الاستاذ کی نگرانی میں تعلیم وتربیت کے واسطے ہنگو بھیجا۔ جامعہ یوسفیہ ہر اعتبار سے علم وعمل کا ایک منفرد مرکز تھا۔ صرف تعلیم نہ تھی بلکہ حضرت کی مسلسل نگرانی، تربیت اور صحبت سے طلبہ کی باطنی دُنیا بھی تعمیر ہوتی۔ بندہ اپنی نااہلی اور فطری ذہنی کمزوری کے باعث کسی ایک جماعت میں ٹک کر نہ پڑھتا تھا، ناظرہ مکمل کیا تو حفظ شروع کرلیا۔ حفظ میں دماغ نہ چلا تو کتابیں پڑھنا شروع کردیں، کتابیں سمجھ نہ آئیں تو دوبارہ حفظ کرنے کی سوجھی۔ غرض کوئی ایک رُخ نہیں تھا لیکن اس لااُبالی پن کے باوجود حضرت خلاف طبع مجھے برداشت کرتے رہے اور اُن کی یہی کوشش رہی کہ یہ کسی نہ کسی طرح پڑھ لے۔ آج جو دو لفظ سیکھ کر دین کی معمولی خدمت کی توفیق نصیب ہے، یہ حضرت ہی کا فیض ہے۔ اگر آپ کی مسلسل نگرانی اور توجہات نہ ہوتیں تو شاید بچپن ہی میں ہمت ٹوٹ جاتی اور یہ سب کچھ نصیب نہ ہوتا۔

حضرت کو مجھ سے بڑی محبت تھی اور اس محبت کا سبب وہ ایک واقعہ بتلایا کرتے تھے، وہ یہ کہ میرا اُولیٰ کا سال تھا اور نحو میر کا تقریری امتحان حضرت الاستاذ کے پاس تھا، دو دو تین تین طلبہ کو بلا کر امتحان لیا جاتا، میری باری آئی تو حضرت نے ساتھ والے طالب علم سے ایک مقام پوچھا، اُسے نہ آیا تو مجھ سے پوچھ لیا، افسوس کہ میں بھی نہ بتا سکا۔ اس پر حضرت کو اتنا غصہ آیا کہ رنگ متغیر ہوگیا اور چہرہ پر ناگواری اور پریشانی کے آثار واضح دکھلائی دینے لگے، آنکھیں بالکل لال ہوگئیں، اسی غصہ کے عالم میں کتاب بند کر کے امتحان لینا بھی چھوڑ دیا اور کمرۂ امتحان سے باہر تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد مجھے بلایا، وہاں قریب میں بان کی رسی پڑی تھی آپ نے اُٹھا کر اُسے چند بل دیئے اور اس سے میری خوب پٹائی لگائی، ایسی مرمت فرمائی کہ سستی اور کاہلی سے توبہ کروا کے چھوڑا۔ اسی اثنا میں کسی لڑکے نے بھاگتے ہوئے آکر خبر دی کہ مولانا فضل محمد سواتی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ حضرت مجھے چھوڑ کر جلدی سے دروازے کی طرف لپکے، مجھے دوہرا خوف لاحق ہوا کہ اب کہیں والد صاحب کے سامنے شکایت نہ لگ جائے، میں جلدی جلدی مسجد گیا اور ٹونٹیوں پر ہاتھ منہ دھو کر آنکھیں خشک کر کے اپنا حال درست کیا اور تھوڑی دیر بعد والد صاحب سے ملنے حاضر ہوگیا، حضرت الاستاذ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں کہیں اپنے چال ڈھال یا حلیے اور گفتگو سے ایسا تو ظاہر نہیں کررہا کہ میری ابھی ابھی سخت پٹائی لگی ہے، لیکن الحمدللہ یہ تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا اُلٹا مجھے خوف تھا۔ بہر حال والد صاحب رخصت ہوئے تو حضرت الاستاذ نے بڑی شفقت اور محبت سے سمجھا کر پڑھنے کی ترغیب دی، بعد میں اس واقعہ پر فرماتے تھے کہ اس دن آپ کی رویے سے آپ پر اعتماد قائم ہوا اور آپ سے محبت میں اضافہ بھی ہوا۔

جس زمانہ میں ہم جامعہ یوسفیہ میں پڑھتے تھے وہ کافی عسرت اور تنگی کا دور تھا، حضرت الاستاذ صاحب تو مجھے

عام طلبہ کی طرح رکھتے لیکن بعض اساتذہ چھپ چھپا کر صاحبزادگی کا خیال رکھتے اور اساتذہ کے لئے صبح استاذ صاحب کے گھر سے جو چائے آتی ،مولانا محمد جمیل صاحب ذیروی اکثر مجھے پس خوردہ نوش کرنے کے لئے بلا لیتے ، چائے کے ساتھ پراٹھا بھی ملتا تھا اس لئے مجھے اس کا انتظار رہتا تھا لیکن بحمد اللہ استاذ صاحب کی برکت تھی کہ کبھی ایسی خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ اپنے آپ کو امتیازی سلوک کا مستحق سمجھا ہو۔

حضرت الاستاذ ہمیں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھاتے تھے اور ایسی پڑھائی کہ گویا دور نبوی علی صاحبھا الف الف تحیۃ وسلام بالکل سامنے ہے،آپ پر تذکرۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خاص عاشقانہ اور والہانہ کیفیت طاری ہوجاتی ،جس سے ہمارے معصوم ذہنوں میں عشق رسول کا جذبہ موجزن ہوتا ،الحمدللہ محبت رسول کی جو آبیاری حضرت نے بچپن میں کی ہے اس کا اثر آج بھی اپنی زندگی پر محسوس ہوتا ہے ،اللہ تعالیٰ اسے تاوقت مرگ قائم و دائم رکھے ۔آمین

استاذ صاحب کو میری اتنی فکر رہتی تھی کہ ایک بار چھٹی نہ ملنے کے باعث میں مدرسہ سے بھاگ گیا ،پشاور پہنچ کر ہنگورو کی گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ حضرت نے پیچھا کرتے ہوئے پکڑ لیا ،غصہ تو بہت ہونے ،لیکن اس موقع پر مارا نہیں بلکہ گاڑی سے اُتار کر چائے پلائی اور واپس لے جانے کے بجائے گھر لے آئے ،تاکہ میری چاہت پوری ہو۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کا جو تعلق حضرت کے ساتھ ہم نے دیکھا ،اُس سے قطعاً یہ انداز ہ نہیں ہوتا تھا کہ والد صاحب اُنہیں شاگرد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ، بلکہ ان سے اتنی عقیدت و محبت تھی کہ دیکھنے والوں کو رشک آجاتا۔

ایک بار حضرت الاستاذؒ اور مولانا عبداللہ صاحبؒ (صدر مدرس مفتاح العلوم ہنگو) اپنے چند رفقا سمیت تشریف لائے ،اُن دنوں والد صاحب چلنے پھرنے سے معذور تھے ،پاؤں میں سخت سوجھن تھی ،نماز کے لئے تیمم کیا کرتے تھے اور بڑے تکلیف سے بیٹھتے تھے۔والد صاحب کو پتہ چلا تو فرمایا: کتنے آدمی ہیں؟ ہم نے تعداد بتائی تو کہنے لگے کہ یہ تو زیادہ لوگ ہیں ،اگر اندر گھر میں بلائیں گے تو کمرہ میں جگہ تنگ ہونے کے باعث اُنہیں دقت ہوگی ،لہذا میں ہی باہر حجرے میں چلا جاتا ہوں۔پھر مجھے کہا کہ مولانا بشیر صاحب (میرے بڑے بھائی) کو بلا لاؤ ،میں نے جلدی سے بھائی کو بلایا آپ نے اُن سے فرمایا کہ مجھے کندھے پر اُٹھا کر باہر لے جاؤ۔بھائی نے عرض کیا کہ ابا جان! باہر بارش ہورہی ہے ،آپ سخت تکلیف میں ہیں ،وہ حضرات کچھ دیر کے لئے آئے ہیں ،گھر میں پردہ کروا کر میں اُنہیں لے آتا ہوں ،ان شاء اللہ یہاں کمرہ میں سب کی جگہ بن جائے گی ،آپ نکلنے کی تکلیف نہ کریں ،اس پر والد صاحب کو جو غصہ آیا وہ میں آج بھی نہیں بھول پاتا۔آپ نے فرمایا: مولوی صاحب! آپ نے ان لوگوں کو مذاق سمجھ رکھا ہے ، آپ ان کا مقام جانتے ہیں یا ویسے ہی ہانک رہے ہیں؟ یہ مذاق اور ٹھٹھوں کے لوگ نہیں ،آپ اپنی ٹھٹھے بازی

چھوڑیں اور مجھے باہر لے چلیں۔اس ڈانٹ کے بعد بھائی نے والد صاحب کو کندھے پر اٹھایا چونکہ باہر بارش تھی اس لئے میں نے ایک گرم کمبل اوڑھا کر دونوں پاؤں اُٹھائے، کیونکہ پاؤں پر سخت ورم کے باعث لٹکے رہنے میں تکلیف کا اندیشہ تھا، اس حال میں جب ہم آپ کو حضرت الاستاذ کے پاس لے گئے تو وہ دم بخود رہ گئے گویا بالکل سکتہ طاری ہوگیا۔فرمایا: حضرت! اتنی تکلیف!!! یہ کیا کردیا، پھر بڑی معذرت فرمائی کہ ہماری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اُٹھانا پڑی، والد صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ تکلیف کیا؟ اب تو طبیعت کھل جائے گی اور یہ حقیقت تھی کہ حضرت الاستاذ کی آمد پر والد صاحب کی تازگی اور نشاط دیکھنے کا ہوتا تھا، طبیعت پر سے سارا بوجھ زائل ہوجاتا اور ساری پریشانیاں بھول جاتے۔

حضرت الاستاذ والد صاحب کے ایسے وفاداروں میں سے تھے کہ اُنہیں آپ کا انتظار رہتا، ہر عید کے تیسرے دن آنے کا معمول تھا اور یہ صرف حضرت والد صاحب کی زندگی تک نہ تھا بلکہ اُن کی وفات کے بعد بھی وقتِ شہادت تک یہ سلسلہ جاری رکھا، جب بھی تشریف لاتے، قبر پر حاضری اور فاتحہ پڑھنے کے بعد حضرت کی نشست گاہ کی زیارت کے لئے تشریف لاتے۔مجھ سے فرماتے کہ میں اپنے استاذ کی جگہ کی زیارت کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔

حضرت الاستاذ جب ہنگو سے روانہ ہوتے اور گھر میں اس کا علم ہوجاتا تو والدہ صاحبہ ایمرجنسی نافذ کردیتی، ایسی تیاریاں شروع ہوجاتیں جیسے کوئی انتہائی قریبی عزیز عرصہ دراز کے بعد تشریف لارہا ہو۔ایک بار حضرت الاستاذ کی طرف سے آنے کی کوئی اطلاع نہ تھی، لیکن علی الصباح والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے عرض کیا کہ آج مولانا محمد امین صاحب آرہے ہیں اور گھر میں کھانے پینے کا خاص انتظام نہیں ہے، اس لئے اس کی فکر کریں، والد صاحب نے فرمایا کہ کوئی اطلاع تو ہے نہیں یہ آپ کو کب سے کشف ہونے لگا ہے اور کب سے بزرگ بن گئی ہے؟ اس پر والدہ صاحبہ خاموش ہوگئیں، ٹھیک نماز ظہر کے بعد حضرت الاستاذؒ تشریف لے آئے، بڑا ہی عجیب منظر تھا، ہمیں والدہ صاحبہ کی بات پر رہ رہ کر ہنسی آرہی تھی، حضرت والد صاحب نے یہ واقعہ حضرت الاستاذ کو سنایا اور مجلس کشتِ زعفران بنادی۔ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اب شرم کے باعث گھر کے اندر نہیں جاسکتا۔

حضرت کی ہماری اُوپر جتنی شفقت تھی اس سے کہیں بڑھ کر والد صاحب سے ادب کا معاملہ تھا، جب بیٹھک میں تشریف رکھتے اور گھر کی طرف سے والد صاحب کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے تو فوراً اپنی جگہ کھڑے ہوجاتے، بندہ نے اپنی زندگی میں والد صاحب کے ساتھ ادب واحترام کے اس درجہ تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو نہیں دیکھا۔

جب آخری بار تشریف لائے تو بندہ اُن کے ساتھ حضرت مولانا سراج الیوم صاحبؒ (گڑھئی باباجی) کی قبر پر حاضر ہوا، اس سفر میں مجھے ایک واقعہ سنایا، فرمایا: سلسلہ قادریہ میں میرا آخری سبق باقی تھا، میں نے حضرت مہتمم

صاحب (مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمہ اللہ) سے عرض کیا تو اُنہوں نے مولانا اکرم جنگی خیل کا مشورہ دیا کہ اُن سے رجوع کرکے پوچھیں، میں حضرت جنگی خیلؒ بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنہوں نے ارشاد فرمایا کہ اس خطے کی مسند ولایت گڑھئی باباجی کو عطا ہوئی ہے، آپ کا مقصود اُن کے پاس ہے، فوراً پہنچیں، پھر بحمد اللہ گڑھئی باباجیؒ سے اس سبق کی تکمیل ہوئی۔ حضرت الاستاذؒ کو حضرت مولانا سراج الیوم صاحبؒ سے سلسلہ قادریہ میں خلافت بھی حاصل تھی، حضرت ہمارے سوات میں واقعتاً امام الاولیاء تھے اور کبار مشائخ علم کا مرجع تھے، ۸۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

حضرت الاستاذ کی عنایات تو اتنی ہیں کہ کہاں تک اُن کا ذکر کیا جائے لیکن ایک واقعہ ایسا ہے کہ آج بھی ذہن پر نقش ہے، اسے قارئین کی خدمت میں ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک بار بندہ کو کاروبار کی سوجھی۔ والد صاحب سے خوف اور ڈر کے باعث براہِ راست عرض کرنے کی ہمت نہ تھی، سوچتا رہا کہ حضرت الاستاذ تشریف لائیں گے تو اُن کے ذریعے سے اجازت کی درخواست کروں گا۔ جب استاذ صاحب تشریف لائے تو بندہ نے عرض کیا کہ حضرت جی! والد صاحب کے پاس تو جو کچھ آتا ہے، وہ تقسیم کر لیتے ہیں، بڑے بھائی کے مزاج پر عدم توجہ اور لااُبالی پن کا غلبہ ہے، وہ معاشی فکر یا کاروبار کے اہل معلوم نہیں ہوتے والد صاحب کی وفات کے بعد خاندان کی معاشی کفالت کا کوئی ذریعہ ہونا چاہیے، اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کرلوں۔ حضرت میری بات سن کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور فرمایا کہ حضرت والد صاحب کی اتنی خدمات وبرکات ہیں کہ ان شاء اللہ اُن کے بعد بھی اہل خاندان کو کسی قسم کے معاشی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے غیبی خزانوں سے یونہی عطا کرتا رہے گا، باقی آپ نے بڑے بھائی کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے، یہ درست نہیں، ان شاء اللہ وہ قطعاً ایسا ثابت نہیں ہوگا، اگر بالفرض اُس نے کوئی توجہ نہ دی تو پھر میں تو موجود ہوں، میری ساری جائیداد اور مال آپ کا ہے، ان شاء اللہ اہل خاندان کی کفالت کا میں ذمہ دار ہوں اور اُن پر کوئی کڑا وقت نہیں آئے گا۔ لیکن آپ یہ معاشی فکر حضرت مہتمم صاحب کو بالکل نہ بتائیں اس سے اُنہیں تکلیف ہوگی۔

محبت اور شفقت کی ایسی مثال بندہ نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، اپنے استاذ کا دکھ اور تکلیف تو برداشت نہ ہوئی لیکن اپنے نااہل استاذ زادے اور شاگرد کو اپنے مال کا شریک بنالیا، حضرت الاستاذؒ نے اس بات کو صرف کہا نہیں بلکہ نبھایا بھی۔ حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد ہر حوالے سے ہماری خبر گیری رکھی اور ہمیں کبھی پریشان ہونے نہیں دیا۔ مصائب زمانہ تو آتے رہے، لیکن والدین سے بڑھ کر ہمارا سہارا حضرت الاستاذؒ بنتے رہے اور ہمیں کبھی تنہائی کے احساس میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔

حضرت کی رحلت سے صرف برادرم مولانا محمد یوسف اور اُن کے بہن بھائی ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم سب یتیم ہو گئے، ہمارے دُکھ سکھ کا ماویٰ وملجا ہم سے چھن گیا، کوئی معمولی تکلیف ہوتی تو آپ ہنگو سے مینگورہ پہنچ جاتے، اس میں نہ آپ کی مصروفیات رکاوٹ بنتی، نہ آپ کا ضعف اور بیماری۔ ہمیں ہمیشہ حقیقی اولاد سے بڑھ کر رکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمیں آپ کی برکات سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین

مردِ قلندر

مولانا حمید اللہ، سوات

اورکزئی ایجنسی کے بدویانہ سماج میں جنم لینے والے 'مردِ قلندر' کے بارے میں کسے معلوم تھا کہ یہ چہار دانگ عالم اپنے فہم و فراست، علم و عمل، تقویٰ و تدین اور حکمت و بصیرت کے چرچے باقی چھوڑے گا۔ کہاں وہ فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں آباد بستیاں جن میں زندگی کی جدید دستیاب ضرورتیں ناپید ہی نہیں اُن کا تصور ہی نہ تھا اور کہاں حضرت بنوریؒ اور حضرت میرکیؒ جیسے جبالِ علم کے حلقہ ہائے درس۔ بس یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی انتخاب تھا کہ قلّلِ جبال سے ایک یتیم اور بے سہارا بچے کو اُٹھا کر وقت کے اماموں کے صف میں لا کھڑا کیا۔ حضرت الاستاذ، بقیۃ السلف، قدوۃ الخلف، شہید مظلوم مولانا محمد امین اورکزئیؒ کی شخصیت کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا کہ یہ بنے نہیں بنائے گئے ہیں اور قدرت کی خاص دستگیری سے ہی انہوں نے علم و عمل کے وہ لق و دق صحرا بسرعت عبور کر لیے ہیں جن میں لوگ سالوں آبلہ پائی کر کے بھی منزل نہیں پاتے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میرے احباب نے مجھے بھی یہ سعادت بخشی کہ ''المظاہر'' کی خصوصی اشاعت کے لئے حضرت الاستاذؒ کی کچھ یادیں قلم بند کروں، یہ حقیقت ہے کہ حضرت الاستاذ کی زندگی کے احوال کما حقہ نقل کرنا ہم جیسوں کے بس سے باہر

ہے۔اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ میں ناتمام تمنا کر چکا کہ استاذ گرامی قدر پر کچھ لکھوں، لیکن جب حضرت کی عظیم الشان صفات سامنے آتیں اور اپنے دامن کو لائق بشانہ الفاظ سے خالی پاتا تو ناچار قلم واپس رکھ کر اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔آج کوشش کروں گا کہ سعادت مندوں کے ٹولے میں اپنا حصہ ڈالنے کی کچھ نہ کچھ سعی کراوں ،اللہ تعالیٰ میرا حامی و ناصر ہو۔

حضرت استاذ صاحبؒ نے تحصیل علم کا زمانہ قدیم اسلاف کی طرح مجاہدات وریاضات سے بھرپور گزارا۔یقیناً اس طریقے سے علم کے حصول کی برکتیں ناقابل انکار ہیں۔وسائل کی قلت کے باوجود اسلاف کے فیض کے پھیلنے کی بڑی وجہ تحصیل علم میں مصائب وتکالیف برداشت کرنے کی برکت تھی۔ایک بار ہماری تربیت کے لئے حضرت استاذ صاحبؒ نے طالب علمی دور کا ایک واقعہ سنایا۔فرمایا: میں کوہاٹ میں پڑھتا تھا، وہاں ہمارا قیام کوہاٹ شہر کے چشموں کے قریب ایک مسجد میں تھا۔ مجھے ایک دن بھوک لگی، کھانے کے لئے روٹی کے خشک ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ تھا، میں وہ ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا رہا تھا کہ اسی اثنا میں اورکزئی ایجنسی سے میرا چچا آیا، اُس نے یہ منظر دیکھا تو رو کر کہنے لگا کہ آپ اس حال میں یہاں وقت گزارتے ہیں؟ میں نے کہا کہ الحمدللہ میرے پاس اتنی رقم ہے کہ میں اپنی ذات کے لئے سالن روٹی کا بندوبست کر سکتا ہوں، لیکن میرے شریک ساتھی غریب ہیں، اُن کے پاس انتظام کی قدرت نہیں، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہوں اس لئے اُن کے ساتھ مساوات اور برابری کے واسطے میں خشک ٹکڑے کھاتا ہوں۔

حضرت الاستاذؒ پر خود بھی ایسے حالات آئے کہ اُنہیں اضطراراً یہ مجاہدات برداشت کرنا پڑے، لیکن یہ واقعہ اس پہلو سے عجیب ہے کہ اس میں اختیاری فقر کی شان واضح نظر آتی ہے، انہی مجاہدات کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ کو تمام علوم وفنون میں ایک عالی مقام عطا فرمایا۔

حضرت الاستاذ نے دورۂ حدیث کے لئے پہلے جامعہ اشرفیہ میں داخلہ لیا لیکن کچھ دن بعد چند وجوہات کی بنا پر مدرسہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت بنوریؒ کے نام خط لکھا کہ وہ جامعہ بنوری ٹاؤن میں دورۂ حدیث کے لئے آنا چاہتے ہیں، حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی تو آپ تشریف لے گئے۔حضرت مولانا فضل محمد سواتی کے بارے میں ہم نے سنا ہے کہ حضرت بنوریؒ نے اُنہیں حضرت استاذ صاحبؒ سے سخت امتحان لینے کی تاکید کی۔کیونکہ عموماً ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے مدرسہ میں جانے والے طالب علم لاابالی قسم کے اور پڑھنے لکھنے سے بیزار ہوتے ہیں اور وہ ہر جگہ آسانیوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذ صاحب نے تو مجبوراً جامعہ اشرفیہ کو خیرباد کہا تھا، بہرحال امتحان کی تکمیل پر حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ نے حضرت بنوریؒ سے فرمایا کہ میں نے سوالات کرتے

کرتے اپنا علم تمام کر دیا لیکن اس طالب علم کو لاجواب نہ کر سکا، اس پر آپ کو جامعہ میں داخلہ دیا گیا۔

حضرت الاستاذ صاحبؒ علوم وفنون کے محض مدرس نہ تھے، بلکہ بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے۔ طلبہ کی نفسیات سے خوب واقف تھے، اس بات کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ عصر حاضر میں طلبہ کی ذہنی سطح کے موافق کس طرح کا نصاب ہونا چاہیے، اس لئے جامعہ بنوری ٹاؤن میں تدریس کے زمانے سے آپ فنون، فقہ، تفسیر اور کلام کے حوالے سے بعض کتابوں میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ بنوری ٹاؤن میں نصاب کے حوالے سے اساتذہ کرام کے مابین مکالمہ ہوا، میں نے شرح ابن عقیل کی جگہ اوضح المسالک کو نصاب میں شامل کرنے کی تجویز دی۔ اساتذہ میں سے ایک صاحب فرمانے لگے کہ توبہ توبہ شرح ابن عقیل پر اوضح المسالک کو کیسے ترجیح دے رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اوضح میں جو کچھ ہے وہ شرح ابن عقیل میں کہاں؟ وہ پوچھنے لگے کہ اوضح میں ایسا کیا رکھا ہے جو شرح ابن عقیل میں نہیں؟ میں نے اُن سے پوچھا کہ اچھا یہ بتائیں کہ حروف مشبہ بالفعل کتنے ہیں ؟ تو کہنے لگے کہ یہ تو نحومیر والے طلبہ کو بھی معلوم ہے کہ چھ ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ چھ نہیں بلکہ آٹھ ہیں۔ وہ چونکے اور کہنے لگے کہ اچھا کچھ اور بتائیں میں نے عرض کیا کہ حروف مشابہ بلیس کتنے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ دو۔ میں نے کہا کہ دو نہیں بلکہ چار ہیں۔ اسی طرح کچھ دیگر مزایا اور خصوصیات بھی گنوائیں۔ اس پر اساتذہ کرام نے میری تجویز سے اتفاق کیا کہ واقعتا اوضح کو شامل نصاب ہونا چاہیے، لیکن اس کے نسخے مہیا کرنا آپ کے ذمے ہوگا ۔افسوس کہ میں مطلوبہ تعداد میں نسخوں کا بندوبست اُس وقت نہ کر سکا اور وہ با آسانی ممکن بھی نہ تھا اس لئے جامعہ کے نصاب میں اوضح المسالک داخل نہ ہوسکی۔

حضرت الاستاذ طلبہ کرام میں تساہل اور کاہلی پر سخت ناراض ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ جب کوئی نامناسب کام پہلی بار دیکھا جاتا ہے تو اُس کی کراہت زیادہ ہوتی ہے، رفتہ رفتہ اُس کی طبعی کراہت نگاہوں میں کم ہوتی جاتی ہے، بالآخر اُس کا احساس باقی نہیں رہتا، پھر اس کی مثال میں پینٹ شرٹ، ٹائی وغیرہ لباس کی مثال دیتے کہ جب پہلی بار یہ لباس شروع ہوا تو طبعاً اس سے تکدر ہوتا لیکن ابتلا کے باعث طبعی تکدر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن ایک چیز ایسی ہے کہ عرصہ سے اُس کا مشاہدہ کرنے کے باوجود میری طبعی کراہت کم نہیں ہو پاتی اور وہ علما وطلبہ میں ذوق مطالعہ کا فقدان ہے۔

ایک دن بعد از ظہر اسباق میں ہمارے ایک ابراہیم نامی ہم جماعت ساتھی کو نیند کے جھٹکے لگنا شروع ہوئے، وہ بہت ہی نیک اور متبع سنت طالب علم تھے۔ حضرت الاستاذ کی نظر پڑی تو فرمایا: ارے ابراہیم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابراہیم نے جواب دیا کہ حضرت آج قیلولہ نہیں کیا، اس لئے نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ آپ نے صرف

قیلولہ نہیں کیا اور میں چھوٹے بچے (ظہیرالدین) کی بیماری اور رونے کی وجہ سے ساری رات سو نہ سکا، لیکن اس کے باجود بحمد اللہ صبح تین گھنٹے آٹھ سو صفحات کا مطالعہ کیا ہے اور اُس کے ساتھ ضروری حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور اُس کے بعد سے اب تک پڑھا بھی رہا ہوں، افسوس کہ علم کا ذوق وشوق رخصت ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عزیزو! اگر علم کے ساتھ عشق درجہ کا تعلق ہو تو بھوک، پیاس اور نیند کسی شے کا احساس باقی نہیں رہتا۔

۱۹۹۱ء کی بات ہے میں نے حضرت استاذ محترم کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ میں چھٹیوں میں آپ کے ہاں قیام کر کے اوضح المسالک مکمل پڑھنا چاہتا ہوں۔ حضرت الاستاذ صاحبؒ بہت خوش ہوئے اور بڑے ذوق و شوق سے مجھے کتاب مکمل کروائی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کی وجہ سے میں نے بھی کتاب ختم کر لی۔ میرے لئے آپ کے یہ کلمات جس مسرت وخوشی کا باعث تھے، اُس کا اظہار میں الفاظ میں کرنے سے قاصر ہوں۔

اس قیام کے دوران جب ماہِ رمضان آیا تو آپ نے انواع واقسام کے عطر کی شیشیاں لا کر رکھ دیں اور فرمایا کہ جو بھی مہمان آئے، اس کو ایک ایک دیتے جائیں۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ہم جب بھی سوات سے آتے یا مدرسہ سے گھر جاتے تو دو طرفہ کرایہ عنایت فرماتے۔ اگر ساتھیوں کی کثرت کی وجہ سے ہمیں گاڑی بک کروانی ہوتی تو گاڑی کا مکمل خرچہ حضرت خود اُٹھاتے۔ ایک مرتبہ مدرسہ یوسفیہ کے حفظ کے مدرس جناب قاری نذیر احمد صاحب کو ہاٹی نے مجھے بتایا کہ میں بیمار تھا تو حضرت سے بغرض علاج کچھ چھٹی مانگی، حضرت نے چھٹی دیتے وقت چالیس ہزار روپے عنایت فرمائے جب میں واپس آیا تو اس میں سے میرے پاس چھتیس ہزار روپے باقی تھے۔ میں نے حضرت الاستاذ کو لوٹانے چاہے کہ یہ رقم بچ گئی ہے، لیکن حضرت نے واپس لینے سے انکار فرمایا کہ اسے رکھ لیں یہ آپ کو ہدیہ ہیں۔

حضرت الاستاذؒ کو اللہ تعالیٰ نے عبادت اور انابت الی اللہ کا عجیب حال عطا فرمایا تھا۔ دن بھر کی سخت مصروفیات کے باوجود لمبے نوافل اور رات کو تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوتی۔ ایک بار امتحان کے ایام میں بندہ جامعہ یوسفیہ کی مسجد میں مطالعہ کر رہا تھا کہ رات دو بجے حضرت تشریف لائے اور ایک ستون کے پاس نوافل اور پھر ذکر میں مشغول رہے۔ اکثر رات کو دو ڈھائی بجے گھر تشریف لے جاتے اور فجر سے پہلے پھر مسجد میں ذکر وعبادت میں مشغول دکھائی دیتے۔ ہمیں سفر شروع کرنے سے پہلے تاکید کرتے کہ نوافل پڑھ کر اور اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگ کر سفر شروع کریں۔

اللہ تعالیٰ نے تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ ہزاروں تلامذہ کی صورت میں آپ کا فیض ہر طرف پھیلایا۔ وادی

سوات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ کوئی گاؤں یا علاقہ ایسا نہ ہوگا جس میں حضرت کے فیض یافتہ حضرات موجود نہ ہوں۔ آپ پر اہل علم کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اپنی اولاد آپ کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت کے لیے بھیجتے، حتیٰ کہ آپ کے استاذ حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ اور روحانی شیخ حضرت مولانا سراج الیوم صاحبؒ نے بھی اپنے بچے آپ کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے۔

حضرت الاستاذ کی لامتناہی شفقتوں اور دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آپ کے اکثر تلامذہ اخلاص وللہیت سے تعلیم و تدریس کے کاموں میں مشغول ہیں اور کئی بڑے جامعات قائم کر کے مصروف خدمت ہیں۔

دوران درس حضرت بعض اوقات انتہائی دلچسپ علمی نکات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ افسوس کہ اکثر اوقات یہ جواہر پارے ہم سے یونہی چھوٹ جاتے اور انہیں قلم بند کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ایک بار درس میں فرمایا کہ جہاں پر لفظ ''اللہ'' بدل الکل کے مقام پر واقع ہو تو اس کو ''بدل الکل'' نہیں کہیں گے بلکہ اس کو ''بدل مطابق'' کہیں گے کیونکہ کل ذی اجزاء شے کو کہتے ہیں اور خدا کی ذات اجزاء سے پاک اور منزہ ہے۔

''حقوق'' کی ادائیگی کا خاص خیال رکھتے تھے، چاہے حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔ اسی طرح گفتگو میں انتہائی محتاط تعبیر استعمال کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ لوگ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود بھیجتے وقت صرف 'صلی اللہ علیہ وسلم' کہہ دیتے ہیں اور ''اللہ'' کے نام مبارک کے ساتھ ''تعالیٰ'' کی صفت ذکر نہیں کرتے ، حالانکہ جس طرح درود پاک کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تعظیمی صفات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

ایک بار دوران درس بطور مزاح فرمایا کہ علماء کرام پر تعجب کرتا ہوں، کہ حقوق کی ادائیگی کی بات تو کرتے ہیں، لیکن ''غلامی'' کے باب میں کہتے ہیں، کہ ''میم'' پر عامل کی وجہ سے رفع، نصب نہیں آئے گا بلکہ یاء کی مناسبت کی وجہ سے اسے کسرہ دیا جائے گا۔ ارے بھائی! ''یاء'' تو عامل کے بعد آرہا ہے، اس کے حق کا خیال ہے اور عامل کے حق کا کوئی خیال نہیں جو کہ مقدم ہے۔ یہ تو انصاف نہ ہوا، ہم حیران ہو گئے کہ حضرت نے یہ کیا اشکال کر دیا اور اب اس کیا جواب ارشاد فرمائیں گے۔ تو اس کے جواب میں فرمایا کہ عامل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ''غلامی'' پر رفع ونصب گو لفظی نہیں لیکن تقدیری ضرور ہیں۔

تحقیق اور تدقیق میں فرق کرتے ہوئے فرمایا کہ تحقیق بیان کردہ مسئلہ کے لئے دلیل پیش کرنے کو کہتے ہیں اور تدقیق اپنی پیش کردہ دلیل کے لئے دلیل بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

ایک بار اسمائے ستہ مکبرہ کے اعراب میں ایک واقعہ سنایا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ایک قتل خطا کے بارے میں

پوچھا گیا۔ آپ نے وہ صورت سن کر ارشاد فرمایا کہ یہ قتل خطا ہی ہے، ولو رماہ بابا قبیس، (اگر چہ کہ اسے ابا قبیس سے مارا گیا ہو) اس پر غیر مقلدین حضرات امام صاحب کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ تم امام صاحب کو بڑا ہی ذی عقل اور ذی علم مانتے ہو لیکن امام صاحب کا یہ قول ان کی کم عقلی اور کم علمی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ''ابا قبیس'' تو مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے اس سے بندہ کو کیسے مارا جا سکتا ہے؟ اس سے اُنہوں نے امام صاحبؒ کے عقل پر جرح کی ہے اور دوسری خرابی یہ ہے کہ یہاں 'با' حرف جر 'اب' پر داخل ہے جو اسمائے ستہ مکبرہ میں سے ہے اور اسمائے ستہ مکبرہ کی حالت جری ''یا'' کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ الف کے ساتھ۔ اس سے اُنہوں نے امام صاحب کی کم علمی پر استدلال کیا ہے۔ اس پر حضرت الاستاذ فرماتے کہ علم کھوکھلا ہو تو ایسی آفتیں پیش آتی ہیں کہ ائمہ دین کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ دونوں اشکال کم علمی کی وجہ سے پیش آئے ہیں۔ ''ابو قبیس'' صرف پہاڑ کا نام نہیں بلکہ قصائی کے اس ''ٹھوکے'' کو بھی کہا جاتا ہے، جس سے وہ گوشت کی بوٹیاں بناتا ہے، اس طرح اسمائے ستہ مکبرہ کی حالت جری صرف ''یا'' کے ساتھ نہیں آتی بلکہ ''الف'' کے ساتھ بھی آتی ہے۔

حضرت اقدسؒ کے ہم پر انتہائی بے پایاں احسانات ہیں۔ آپ کی شفقتیں، عنایتیں اور توجہات ہمارا بہترین متاع زیست ہے۔ آپ کی شہادت پر ہم اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتے ہیں۔ آپ کا سایہ ہمارے لئے ایک ٹھنڈی چھاؤں کی مانند تھا، ہنگامہ ہائے حیات میں شاہو وام کی بستی ہمارے سکون واطمینان اور چین وراحت کا واحد ٹھکانہ ہوتا تھا، جہاں حضرت الاستاذؒ کی ایک مسکراہٹ غم والم بھلا دیتی۔ آہ ثم آہ! کہ وہ ہستی اب ''وام'' کے ایک خستہ حال سڑک کے کنارے ویرانے میں آسودہ خاک ہے۔

میرے پیارے استاذ جی بہت تھک چکے تھے۔ عبادت وریاضت کی مشقت، کثرت مطالعہ کا مجاہدہ، درس وتدریس کی مشغولیت، سینکڑوں لوگوں کے نجی مسائل کے حل کے لئے دوڑ دھوپ، علاقہ میں امن وامان کی بحالی کے لئے انتھک محنتیں اور دن رات مہمانوں کے ہجوم، تب پیارے رب کو اُن پر رحم آیا اور اُنہیں اپنی جنتوں میں دائمی آرام کے لئے بلا لیا، اب میری استاذ جی زندگی کے ہنگاموں سے بالکل پرسکون ہو گئے، بالکل مطمئن، وہ وہاں چلے گئے جہاں ہر طرف راحت ہی راحت ہے، مزے ہی مزے، عیش ہی عیش ...... اس کے بدخواہ بھی وہاں اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ وہ وہاں تک رسائی نہیں پاتے، اب وہ اپنے پیارے رب کی مہمانی میں ہے۔ یا اللہ! ہمیں بھی اپنے پیارے استاذؒ سے محبت کے صدقے اُنہیں کے ساتھ جمع فرما کہ یہ تیرے فضل وکرم سے کچھ بعید نہیں۔ (آمین ثم آمین)

پیکرِ علم وعبادت

مولانا سیف اللہ، کراچی

عقل سراپا محو حیرت واستعجاب ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے عاجز ودرماندہ ہے کہ نابغۂ روزگار شخصیت امین الملۃ والدین شہید مظلوم مولانا محمد امین اورکزئیؒ کے بارے میں آغاز سخن کیسے کروں، کیا کہوں، کیا چھوڑ وں؟ کہ وہ سرتا پا مجسم فضل وکمال، علم وہنر تھے اور اس سے بھی بڑھ کر جس امر نے راقم الحروف کے دل ودماغ کو پژمردہ کیا ہوا ہے ، وہ یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی جن کا قلب خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کی دولت سے مالا مال ہو، جن کی تقریباً تمام زندگی قرآن وسنت اور صلحائے امت کے عمل وکردار کی جامع تشریح وتعبیر ہو، جن کا دل ودماغ علوم نبوت سے روشناس ہو، اس لئے نہیں کہ محض ذہنی تعیش کا سامان ہو، یا علم برائے علم کا چسکا ہو، یا معلومات پر معلومات کے انبار فقط اس لئے ہوں کہ دنیائے علم ودانش میں اپنا قد بلند تر پیش کیا جائے، بلکہ تحصیل علم سے ان کی ابتداء وانتہاء صرف یہی ایک غرض رہی ہو کہ رب تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم ہو اور اسی کے عین مطابق یہ بندہ اپنی

بندگی بجالائے، جن کی فکرِ آخرت کچھ ایسی ہو کہ وہ عمر کے ہر ہر لحظہ میں مکمل قانت وخاشع، مصروفِ عبادت رہا ہو، جن کا فانی دنیا سے معاملہ ایسا ہی رہا ہو جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رہا تھا کہ فکرِ آخرت میں دنیا کو غیر آباد رکھا، نہ اپنے آرام وراحت، تن پروری، عیش کوشی کے لئے کچھ کیا اور نہ ہی دنیا سے اپنی اولاد کے لئے کچھ لینا گوارا کیا۔ ایسی پاکباز اولوالعزم ہستی کے شمائل وخصائل سے نقاب کشائی کرنے سے پہلے ازبس ضروری ہے کہ ان کے علمی کمالات وعملی محاسن سے آگاہی ہو، پھر کچھ عرض کرنا قرین قیاس ہے، جب کہ ہم علم وعمل کے کورے، کوتاہ فہم وکوتاہ بینوں کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ مولانا اورکزئی شہیدؒ کے مقامِ رفیع وبلند احوال کو اُجاگر کریں کہ ان جیسا نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل بلکہ اس سے مناسبت بھی نہیں رکھتے۔ ع: چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

راقم الحروف اس ناخوشگوار حقیقت کا اظہار بھی ضروری تصور کرتا ہے کہ بندہ حضرت سے براہِ راست تلمذ کا رشتہ رکھنے کی سعادت سے بھی یکسر محروم ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی خدمتِ عالیہ میں حاضری اور ان سے استفادہ کے مواقع بھی بہت کم کم میسر ہوئے ہیں، تاہم جب بھی ان کی ملاقات وزیارت سے بہرہ مند ہوئے تو ان کے علم وعمل، گہرائی وگیرائی، ورع وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، بےنفسی وفنائیت، زہد واستغنا کے گہرے نقوش دل کے صفحات پر ثبت ہوئے اور ان سے والہانہ عقیدت قائم ہوتی گئی۔ ذیل کی سطور میں بندہ کی اُن سے ہونے والی چند ملاقاتوں اور اس میں کچھ سوال وجوابات اور خانۂ یادداشت میں ان کی بعض یادوں کو چند بےربط جملوں میں لکھنا چاہتا ہے، مقصد صرف اتنا ہے کہ بضاعتِ مزجاۃ کے بدلے بندہ کا نام بھی خریدارانِ یوسف میں شامل ہو جائے۔

بندے کو یاد آتا ہے کہ درجہ خامسہ سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لئے شہر کراچی میں جامعہ بنوری ٹاون کا جب انتخاب کیا تو کسی نے جامعہ بنوری ٹاون میں جانے سے پہلے مولانا محمد امین اورکزئی سے ملنے اور ان سے رہنمائی لینے کا مشورہ دیا۔ بندہ جب ملاقات کے لئے حاضر ہوا، یہی ان سے پہلی ملاقات تھی، تعارف کے بعد ملاقات کا مدعا عرض کیا تو بہت مسرور ہوئے۔ ملاقات ہی میں راقم کو معلوم ہوا کہ حضرتؒ کو ہمارے خاندان کے بڑوں سے نہ صرف تعارف ہے، بلکہ ان کا آپس میں گہرا ربط وتعلق بھی ہے۔ دورانِ گفتگو راقم الحروف کے والد صاحبؒ کی مصروفیات کے بارے میں استفسار کیا تو بندہ نے عرض کیا: والد صاحبؒ نے تبلیغ کے کام کو ہی کام سمجھا ہوا ہے، اسی میں مصروف رہتے ہیں اور تبلیغ کی دعوت وتلقین کرتے رہتے ہیں اور بس! میرے اس جواب پر سنجیدہ ہو کر فرمانے لگے کہ میری نظر میں تبلیغ کی حقانیت پر دو دلیلیں ایسی ہیں جن کا رد وتقریباً ناممکن ہے۔

پہلی دلیل: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک کام کے لئے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کا چناؤ کیا جن کا اخلاص وللّٰہیت، تقویٰ وطہارت، تحفظ واحیائے دین کی تڑپ وکرب ایسی حقیقت ہے جس کے موافق

ومخالف سب یکساں قائل ہیں۔

دوسری دلیل: کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ لوگوں کی جو دینی خدمت یا شانِ عبدیت عرش پر محبوب ہو جاتی ہے تو عرش والا اسے فرش پر بھی مقبول بنا کر رہتی نسلوں میں اسی دینی خدمت اور شانِ عبدیت کو برقرار رکھتا ہے اور اسی سلسلے میں یہ دو آیتیں ارشاد فرمائیں:

(۱) اَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، "یعنی جو جھاگ ہے وہ ختم ہو جاتا ہے، سوکھ کر اور وہ کام جو لوگوں کو نفع دے تو وہ کام باقی رہ جاتا ہے زمین پر" فرمایا: تبلیغی کام سے عوام الناس کو فائدہ ہو رہا ہے اور یہ فائدہ عند اللہ مقبول ہے تو اللہ نے تبلیغ کی مبارک محنت کو لوگوں میں برقرار رکھا ہے۔

(۲) وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ، "یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر بعد میں آنے والے لوگوں میں چھوڑا" اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلا چوں و چرا اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر رہتی دنیا تک برقرار رکھا، بلکہ بیٹے کی قربانی میں انہوں نے جس شان سے عبدیت کا اظہار کیا وہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اللہ نے قربانی کے حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری وساری رکھا، فرمایا کہ دعوت وتبلیغ کی محنت میں بھی یہی سنت الٰہی کارفرما ہے۔

ایک دفعہ میرے چھوٹے بھائی شبیر احمد صاحب نے مولانا اورکزئی شہیدؒ سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار کیا، فون پر دن اور وقت طے کر کے جب ہم خدمت میں حاضر ہوئے تو دوران گفتگو میرے بھائی نے کہا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف احیاء العلوم کا مطالعہ فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوگا کیونکہ اس میں ضعیف وموضوع احادیث موجود ہیں، اسی بنا پر امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بعض تصانیف میں احیاء العلوم کی احادیث پر نقد کرتے رہتے ہیں۔ اس پر حضرت شہیدؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اگر دو توانا مست مرغوں کی لڑائی ہو اور اس میں بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے چند دنوں کا نومولود چوزہ درمیان میں آجاتا ہے اور اسے نقصان ہو جاتا ہے تو چوزہ اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا کہ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اصلاح کی کوشش کی۔ فرمایا: ایسے ہی اسلاف کا آپس میں علمی اختلاف ہو تو یہ انہی کو زیب دیتا ہے جو علم میں کامل رسوخ رکھتے تھے۔ ہمیں بڑوں کے اختلاف میں دخل در معقولات رائے زنی یا ایک پہلو کو خطا کا اور دوسرے پہلو کو صواب کا پروانہ جاری نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان علوم کی نسبت ہمارے علوم کی اتنی بھی حیثیت نہیں جو نسبت چراغ کو سورج سے ہے۔

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ پر ہمہ وقت عبادت کا غلبہ رہتا تھا۔ دن رات کے مختلف اوقات میں مسنون و مستحب اعمال ہوں یا مخصوص دنوں میں مستحب روزے ہوں، حضرتؒ ان پر "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" کا مظہر

بن کر ایسے پابندی سے عمل پیرا رہتے کہ ہم جیسے کوتاہ ہمت اس کا تصور کرنے سے بھی عاری ہیں۔ایک دفعہ ماہ رمضان کے پہلے عشرے میں ملاقات اور کچھ رہنمائی لینے کی غرض سے حاضر خدمت ہوا، تو حضرتؒ مسجد میں معتکف تھے۔راقم الحروف نے جرأت کر کے عرض کیا کہ حضرت! جناب کی مدت العمر معمولات کو دیکھنے سے احساس ہوجاتا ہے کہ جناب پر بجائے علم کے عبادت کا پہلو غالب تر ہے حالانکہ آنجناب کی ساری زندگی علم کی تحصیل اور اس کے نشرو اشاعت میں گزری اور اسی شناخت کے ساتھ جناب کا شہرہ ہے۔فوراً فرمایا: نہ علم ہے، نہ عبادت، بعض احباب کا حسن ظن ہے۔ بندہ نے اعتکاف کا ذکر کیا تو اس پر فرمایا: ہمارا کیا اعتکاف ہے، ویسے ہی اپنے آپ کو مسجد میں بند کیا ہوا ہے، اہل نظر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عبدیت وعبادت کی اصل معراج ہی یہی ہے کہ بندے کو اپنی کسی عبادت پر گھمنڈ کی کیفیت پیدا نہ ہو بلکہ عبادت کے ساتھ ساتھ شانِ عبدیت وفروتنی میں اضافہ ہی ہوتا ہو۔حضرت شہیدؒ کی عبادت ایسے ہی شانِ عبدیت والی تھی، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اسی عبادت کا کچھ حصہ نصیب فرمائیں۔

ایک مرتبہ مولانا اورکزئی شہیدؒ علاقہ دیر کی بزرگ شخصیت صندل بابا جی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لائے تھے، بندہ نے حضرت شہیدؒ کو کھانے کی دعوت دی، انہوں نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: آپ لوگ طالب علم ہیں، وقت اور پڑھائی کا حرج ہوگا، یہ مناسب نہیں۔ بندہ نے حضرتؒ کو معقول جواب دے کر مطمئن کرالیا اور دعوت قبول کرلی۔ بندہ جیسے ہی مجلس سے اُٹھ کر دعوت کی تیاری میں مصروف ہوا تو ایک طالب علم کو بھیج کر مجھے واپس بلالیا۔فرمایا: آپ دعوت کی زحمت نہ کریں، میں کہیں جارہا ہوں، واپسی میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ بندہ نے قدرے لجاجت سے کہا: شام میں کچھ ہی وقت ہے، اس وقت کہاں کا ارادہ ہے، آج ہمارے ساتھ یہیں ٹھہریں۔ مسکرا کر فرمایا: ''ملکِ خدا تنگ نیست پائے فقیر لنگ نیست'' پھر ایک دو بندوں کے ساتھ مکتبوں کی طرف پیدل روانہ ہوئے، بندہ کو اس وقت ان کے نرم طرز گفتگو اور شریں گفتاری نے گھائل کردیا۔

راقم الحروف جب کراچی آتا تھا تو بعض دفعہ کراچی جاتے ہوئے حضرت شہیدؒ کی زیارت کی خاطر ان کے علاقے شاہو دام کا رخ کرتا تھا، حضرتؒ سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقات کر کے کراچی کے لئے پابہ رکاب ہوجاتا تھا، ایسا ہی ایک دفعہ حاضر خدمت ہوا تو حضرتؒ کچھ دیگر ملاقاتیوں کے ساتھ اپنے دولت خانے میں جلوہ افروز تھے، بندہ بھی مجلس کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔حضرتؒ ملاقاتیوں کے ساتھ تقریباً پون گھنٹہ محو گفتگو رہے، پھر بندہ کی طرف متوجہ ہوئے، حال احوال پوچھے، دعائیں دیں، راقم الحروف نے رخصت چاہتے ہوئے عرض کیا کہ کراچی کا سفر ہے اور ائیر پورٹ میں وقت کم رہ گیا ہے، اس لئے جانا چاہتا ہوں۔میری اس بات پر یک لخت متوجہ ہو کر بڑے پرملال لہجے میں فرمایا: اللہ کے بندے! آپ نے اول وہلہ میں بتایا نہیں اور مجھے علم نہیں تھا کہ آپ مسافر ہیں، ورنہ میں

آپ کے کھانے کا انتظام کرتا یا ماحضر پیش کرتا۔ بندہ نے شکریے کے چند لفظ کہے جس پر فرمایا: مہمان نوازی واکرام مہمان کا اپنا حق ہوتا ہے، یہ میزبان کا مہمان پر کوئی احسان نہیں ہوتا، پھر دائیں جانب جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور راقم کی جیب میں ڈالنے لگ گئے۔ بندہ نے ہر چند انکار کیا مگر حضرتؒ کا اتنا ہی اصرار رہا بالآخر وہ رقم میری جیب میں ڈال دی پھر رخصت کرنے کے لئے حضرتؒ اپنے مدرسے کی آخری حدود تک آئے۔ آج بھی وہ منظر جب یاد آتا ہے تو دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ساری زندگی ایسی گزاری جس کا مشورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" یعنی دنیا میں ایسے رہو، جیسے آپ مسافر ہیں یا آپ کسی راہ پر سے گزرنے والے۔ حضرت شہیدؒ جس منزل کے مسافر تھے، یعنی رب تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول، یقیناً یہ مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر بامراد ہو چکے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین ثم آمین

علم وعمل کے بے تاج بادشاہ

مولانا عطاء الرحمن بٹل

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جامعیت کی ایسی شان عطا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو تابناک اور کامل ومکمل ہوتا ہے۔ حضرت اقدس مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہمارے علمی حلقوں کی ایک جامع شخصیت تھی۔ آپ سراپا علم تھے، سراپا جہد واخلاص تھے۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو اتنا کامل ومکمل تھا کہ اس پر مستقل تصانیف مرتب ہو سکتی ہیں۔

بندہ ۲۰۰۲ء میں مادر علمی جامعہ عربیہ بٹل میں مدرس تھا، عید الاضحیٰ کی چھٹیاں تھیں اور میں مدرسہ ہی میں مقیم تھا کہ ایک معصوم اور نورانی صورت، سفید ریش بزرگ حضرت استاذی الکریم شیخ الحدیث مولانا معز الحق صاحبؒ (فاضل دار العلوم دیوبند وتلمیذ رشید شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ) سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ بندہ ہی کو اولاً ملاقات کا شرف حاصل ہوا، تعارف پر پتہ چلا کہ یہ تو محقق کبیر تلمیذ حضرت سید بنوریؒ مولانا محمد امین

اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ آپ کے علمی وعملی کمالات کا چرچا اہل علم اور طلبہ میں اس کثرت سے تھا کہ کوئی طالب علم آپ سے ناواقف نہ تھا۔ بندہ بھی اپنے احباب اور اساتذہ سے آپ کا ذکر خیر اور علمی وعملی کمالات کے تذکرے سنتا رہتا تھا لیکن زیارت وملاقات کا شرف حاصل نہ تھا، پہلی بار اس سراپا عجز وانکسار، روشن جبین اور نورانی ومعصوم صورت کی پرکشش شخصیت کی زیارت اسی وقت ہی نصیب ہوئی۔

آپ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا معز الحق صاحبؒ سے ملاقات کی اور اپنی شہرہ آفاق شرح ''نثر الازہار شرح شرح معانی الآثار'' ہدیۃً پیش کی، حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا کہ مولانا: ایک ہوتا ہے علامہ اور ایک ہوتا ہے محقق۔ علامہ کے علم کی مثال اس کہنہ مشق تیراک کی ہے جو سمندری موجوں سے کھیل کر اس کی سطح پر چکر لگائے اور جو کچھ ہاتھ لگے اسے سامنے پیش کردے اور محقق کے علم وتحقیق کی مثال اس باکمال تیراک کی ہے جو سمندر کی تہہ میں اتر کر موتی چن لائے۔ آپ کے کام میں محض وسعت وگیرائی نہیں بلکہ عمق وگہرائی ہے۔ آپ نے علم حدیث کے سمندر میں تہہ تک اتر کر غواصی کی ہے اور اہل علم کے لئے بیش قیمت موتی چن چن کر پیش کردیے ہیں، آپ کا کمال یہ ہے کہ ''شرح معانی الآثار'' کی ان اغلاط کو جو میری معلومات کے مطابق قریبا دو صدیوں سے اس میں چلی آرہی تھیں درست کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کام پر آپ کو شایانِ شان اجر سے نوازے۔ پھر حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ تعالیٰ نے سات ہزار روپے ہدیہ مولانا محمد امین صاحبؒ کو پیش کیے اور فرمایا کہ یہ رقم کتاب کی اشاعت کے خرچے اور مصارف میں شامل کردیں۔ یہ حضرت شیخ الحدیثؒ کی طرف سے اس اہم کام کی قدردانی اور صدقہ جاریہ تھا۔ مولانا محمد امین صاحبؒ نے بڑے عجز ونیاز سے ہدیہ قبول فرمایا اور کہا کہ حضرت! آپ جیسی ہستیوں کا اس کام کے لئے ہدیہ پیش کرنا میری لئے تسلی کا باعث ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کام مقبول ہے۔ اس لئے کہ کسی کام میں اللہ والوں کی کمائی کا لگنا کام کی قبولیت عنداللہ کی دلیل ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس ملاقات میں مولانا محمد امین صاحبؒ نے ایک عقابی نگاہ میرے اوپر ڈالی اور ارشاد فرمایا: ''مولانا! کبھی کبھار ہمارے مدرسے بھی آجایا کرو۔'' اس جملے نے ایسا اسیر بنایا کہ تدریسی مصروفیات سے چھٹیاں ہوتیں تو سال میں دو تین حاضریاں ضرور لگواتا۔ حضرت اورکزئی بلا کے ذہین اور زیرک انسان تھے، ہر شخص کو اتنی توجہ دیتے کہ ایک بار ملاقات کرنے والا برسوں یاد رہتا۔ اس ملاقات کے ایک عرصہ بعد میں نے حضرت کو فون کیا تو فوراً آواز سے پہچان لیا کہ آپ ٹل والے مولانا صاحب بات کررہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جی! میں وہی ہوں۔ ہمارے ایک مدرس ساتھی مولانا لطف اللہ صاحب کو بیضاوی کے کچھ مقامات پر اشکالات ہیں، شروح وحواشی کی مراجعت اور تتبع اور کئی اہل علم سے مذاکرے کے باوجود ان کی تشفی نہیں ہوپارہی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر

شفقت فرما کر کچھ وقت عنایت فرمادیں، ہم استفادہ کے لئے حاضر ہونا چاہتے ہیں اور کتاب کے ان مقامات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے بڑی بشاشت سے اجازت دی کہ بڑی خوشی سے تشریف لائیں۔

اگلے دن بندہ اور برادرم مولانا لطف اللہ صاحب آپ کے مدرسہ جامعہ یوسفیہ پہنچ گئے تو دیکھا کہ حضرت مدرسہ کے مرکزی دروازہ پر کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت استقبال کے لئے دروازے پر کھڑے ہیں۔ بڑے پرتپاک انداز سے ملے۔ فرمایا کہ مولوی صاحب! پشاور سے ایک شیخ الحدیث صاحب اپنے دورۂ حدیث کے تمام طلبہ کو لائے تھے کہ انہیں اجازت حدیث دے دیں۔ مجھے فکر تھی کہ آپ حضرات کو بھی آنے کا کہا ہے، اگر شیخ الحدیث صاحب رات کے لئے رک گئے تو آپ حضرات کا حرج ہوگا اور میں کما حقہ وقت نہ دے سکوں گا۔ لیکن وہ لوگ ابھی چائے پی کر رخصت ہوئے ہیں اور میں انہیں باہر چھوڑنے گیا تھا، اسی وجہ سے دروازے پر کھڑا تھا کہ اسی اثنا آپ حضرات تشریف لے آئے۔

بندہ ان کی متواضعانہ اداؤں پر غور کرتا رہا تو حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی حیثیت کے عالم دین خود مہمانوں کو چھوڑنے باہر تک جائیں، آنے والے مہمانوں کی اپنی ہاتھ سے خدمت کریں، بات بات پر عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کریں، ہمارے اکابر کی زندگیوں کا یہی وہ تابناک پہلو ہے جس نے ان کا مقام واحترام لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح راسخ کر رکھا تھا اور ان کی بات اور دعوت کا اثر معاشرے پر خوب پڑتا تھا، اس میں ہمارے نئے علما کے لئے بہت بڑا سبق ہے، ہم سے دو لفظ علم کے برداشت نہیں ہوسکتے اور معمولی معلومات حاصل ہو جانے پر ہمارے رویے بدل جاتے ہیں، جب کہ ہمارے اکابر علم کے پورے پورے سمندر پی کر تواضع کا پیکر رہے اور ان کے رویوں سے کبھی تکبر یا بڑائی کا شائبہ تک پیدا نہ ہوتا تھا۔

مولانا لطف اللہ صاحبؒ نے بیضاوی کے متعلقہ مقامات حضرت سے حل کروائے۔ وہ خود بڑے قابل مدرس تھے بعد میں مجھے کہا کہ میں نے کئی علما سے ان مقامات کی وضاحت چاہی لیکن میری اتنی تشفی نہ ہوئی جتنی حضرت نے فرمائی۔ ان میں سے ایک اہم اشکال مشاجرات صحابہؓ اور دوسرا مسئلہ تشبہ کے متعلق تھا۔ حضرت نے دونوں باتوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ مشاجرات صحابہؓ کے ضمن میں فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دونوں گروہ حق اور صواب پر تھے اس پر قرآن کریم سے نظیر پیش فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قضیہ میں خصمین ہو کر بھی دونوں فریق اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے برحق ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل جدید طرز استدلال تھا اس مسئلے پر فریقین کے حق وصواب کا نظریہ یوں مبرہن کرنا آسان نہیں، بلکہ عموماً ایک فریق کے لئے خطاء اجتہادی کی تعبیر استعمال ہوتی چلی آئی ہے۔ لیکن مولانا محمد امین اورکزئیؒ نے اس

مسئلے پر اپنے خاص اجتہادی شان سے روشنی ڈالی تو دونوں فریق کا بیک وقت حق پر ہونا کوئی بعید معلوم نہ ہوا۔

تشبہ کے مسئلہ کے ضمن میں مولانا لطف اللہ صاحب نے ''ٹائی'' کو ''زنار'' کی جدید صورت بتلا کر استفسار کیا کہ کیا عیسائی زنار اپنی خوشی اور رضامندی سے لٹکانا کفر نہیں؟ حضرتؒ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ٹائی کو اگر زنار تسلیم کرلیا جائے تو محض عملاً لٹکانا کفر نہ ہوگا۔ جب تک اس کے بارے وہی اعتقاد نہ ہو جو نصاریٰ کا ہے۔ اس پر مولانا لطف اللہ صاحب نے حدیث "من تشبہ بقوم فھو منھم" کے بارے استفسار کیا کہ نصاریٰ سے تشبہ کی صورت تو ہوگئی پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ حدیث میں تشبہ سے مراد ایسی تشبہ ہے جس کی وجہ سے کافر و مسلم کا امتیاز باقی نہ رہے۔ اب تو ان چیزوں میں مسلمان بھی اس کثرت سے بتلا ہیں کہ یہ کفار کا امتیازی شعار ہی نہ رہیں۔ لہٰذا ان کی بنا پر حدیث میں مذکور تشبہ کا حکم نہیں لگے گا۔ اس پر آپ نے حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''اسلامی تہذیب وتمدن'' سے حوالے پیش فرمائے اور اس کتاب کو مسئلہ تشبہ کی وضاحت میں اساسی قرار دیا۔

حضرتؒ کی صحبت مبارکہ کا ایک واضح اثر جو میں نے ہر ملاقات میں محسوس کیا کہ ان کے پاس بیٹھتے ہی مجھ پر علمی حرص کا غلبہ ہو جاتا۔ یہ آپ کی وہ حقیقی کیفیات تھیں جو ہم جیسے طلبہ پر بے پناہ عکس چھوڑتیں، کیونکہ علم وتحقیق، مطالعہ و مذاکرہ آپ کے شب و روز کا وظیفہ تھا۔ اہل علم کے قدردان تھے، ہم جیسے طلبہ تو ان سے یہی علمی گفتگو سننے جاتے تھے، میری کوشش یہ ہوتی کہ مجلس میں خود باتیں نہ کروں، بلکہ زیادہ سے زیادہ حضرت کی گفتگو سنوں اور ان سے استفادہ کروں، بحمد اللہ اس سے بیسیوں علمی نکات کھلے، کئی مسائل کی نئی جہات سامنے آئیں، علم وتحقیق کی چاشنی نصیب ہوئی، اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کے جواہر پارے سنے، اکابر واسلاف کے محیر العقول کارناموں کے احوال معلوم ہوئے اور علمی وفنی کتابوں کے رموز واسرار سے واقفیت ملی۔ سچ ہے کہ ایسے باکمال علما کی ایک ساعت کی صحبت سو سال کے ذاتی مطالعے سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔ ان کی محافل ومجالس میں علم وتحقیق کے جن مدارک تک لمحوں میں رسائی ہوتی ہے وہ سالہا سال کی ورق گردانی سے نہیں ہو پاتی۔

طلبۂ علم سے بھی بڑا ہی مشفقانہ رویہ رکھتے تھے، جن طلبہ کی مالی حالت کمزور ہوتی تھی ان کی کفالت اپنے ذمے لے لیتے، اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ حضرت کے ہاں پڑھنے والے ایک طالبعلم کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، جس کے معاشی حالات بڑے ہی دگرگوں تھے اور قریب تھا کہ وہ پڑھنا چھوڑ دیں۔ حضرت کا کسی سے قرض لینے کا معمول نہ تھا لیکن ایسے مواقع پر اپنے مزاج کی قربانی دے کر طلبہ کے لئے قرض لینے سے بھی نہ کتراتے تھے، آپ نے اس طالب علم کے لئے آٹھ ہزار روپے کسی سے قرض لے کر اس کی ضروریات پوری کیں۔ پھر یہ قرض ادا

کرنا بھی اپنے ہی ذمہ ہوتا تھا یہ نہیں کہ وہ طالب علم ادا کرتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہمارے ہاں قابل مدرس کا مشاہرہ بھی تقریباً دو ہزار روپے ہوا کرتا تھا۔

علم وعمل کی بے تاج بادشاہی نصیب ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو کبار علما کی سرپرستی میں رکھا، مجھے یاد ہے کہ جب مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ کا انتقال ہوا تو آپ حضرت شیخ الحدیث مولانا معز الحق صاحبؒ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ حضرت! مولانا فضل محمد صاحب میرے ہر معاملے میں سرپرستی فرماتے تھے، اور میں کوئی کام ان کی اجازت وتوثیق کے بغیر نہ کرتا تھا، ان کے انتقال کے بعد بڑی فکر ہے، اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ میری سرپرستی فرمائیں۔

گہرے علم، مثالی تحقیق، اونچی فہم وفراست، طویل تجربات اور نور بصیرت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بزرگوں کی سرپرستی کا محتاج سمجھنا عصر حاضر میں ہم لوگوں کے لئے بہت بڑا پیغام رکھتا ہے۔ دین کے معمولی کاموں کی توفیق ہوجائے تو ہم ایسی خودرائی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ اپنے آپ کو کسی کا تابع بنانا ممکن ہی نہیں رہتا، نہ ہی اپنے کو کسی کا محتاج سمجھتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سرپرستی یا توثیق کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خودرائی کا مرض عام ہورہا ہے اور فضلا میں اکابر پر عدم اعتماد کی فضا بنتی جارہی ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

اپنے سرپرست مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ کا ایک واقعہ بندہ کو سنایا کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب (صدر مدرس مفتاح العلوم ہنگو، جو مولانا محمد امین صاحبؒ کے بھی استاذ تھے اور دونوں کا تعلق مولانا فضل محمد صاحب سے تھا) نے حج پر جانے کا ارادہ کیا، ہم دعا وتوثیق کے لئے مولانا فضل محمد صاحب کے پاس حاضر ہوئے، بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! مولانا عبداللہ صاحب کا حج پر جانے کا ارادہ ہے۔ دعا کے لئے حاضر ہوئے ہیں، اس پر مولانا عبد اللہ صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ مولانا! آپ تو تدریس کی تنخواہ نہیں لیتے، پیسے کہاں سے آگئے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ قرض لے کر جاؤ گے؟ اس پر جلال میں آئے اور ارشاد فرمایا کہ پھر لوگوں کے ہدیوں پر نظر رکھ کر وصول کرو گے کہ میں مقروض ہوں، اس کے ساتھ ہی ایک زوردار ہاتھ جلال میں مولانا عبداللہ صاحب کے سینے پر مارا، اس لمحے ہم پر ایسا رعب طاری ہوا کہ آیت کریمہ "ﷲ خزائن السموات والارض" کی تجلی کا فیض قلوب میں اترتا ہوا محسوس ہونے لگا اور مخلوق سے تعلق طمع کی گندگی اور بدبو مشاہد ہونے لگی۔ یہ فرماکر مولانا فضل محمد صاحب اٹھے اور گھر تشریف لے گئے، آخر تک کوئی بات نہ فرمائی، ہم بھی خاموش تھے، بوقت رخصت جیب سے خطیر رقم نکال کر مولانا عبداللہ صاحب کو تھمائی کہ یہ لو، حج پر جاؤ اور خبردار! قرض نہیں لینا۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شہادت سے علمی حلقے یتیم ہوگئے، اب ہماری آنکھیں ایسے

علما کو دیکھنے کے لئے ترستی ہیں، جن کے علمی کمالات کے جلوے محافل کو آباد رکھتے تھے اور طلبہ کی تسکین کا سامان کرتے تھے۔ اے کاش! کہ اس چشمۂ صافی سے اتنی سیرابی تو ہو پاتی، کہ احساس محرومی نہ ستاتا، اہل کمال اٹھتے جارہے ہیں اور علم وتحقیق کے میدان پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ المظاہر کے احباب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے علم وتحقیق کے اس ماہتاب کی کرنوں کو بکھیرنے کا انتظام کردیا، امید ہے کہ اس سے علمی حلقوں میں علم وعمل کے جذبات کو تازگی اور مہمیز ملے گی اور اہل علم کے سیرابی کا انتظام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبولیت عامہ وتامہ عطا فرمائے اور اس کا نفع چہار سو پھیلادے۔ آمین بجاہ سید المرسلین

العالم الرحلة

مفتی سراج محمد القاسمی، وزیرستان

احقر نے دنیا کے عظیم درسگاہِ علم ودانش اور روحانی تربیت گاہ "الجامعة الاسلامية المعروفة بدار العلوم دیوبند الھند" سے فراغت کے بعد اپنے آبائی وطن شمالی وزیرستان (تناسی، رزمک) میں ایک سال درس دیا، اس کے بعد العالم الرحلة ای ما یرتحل الیہ یعنی ایسا عالم جس کے پاس لوگ دور دراز سے سفر کرکے جائیں، کی خدمت عالیہ میں حاضری کا شرف ملا۔

میرے نزدیک العالم الرحلة میں الف ولام مجاز الجنس کے لئے ہے جیسا کہ زید الرجل ای المعتدبہ یعنی عالمیت جس حیثیت وکیفیت اور کمیت سے لے لیں، وہ حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں بالکنہ وبکلہ اور بالوجہ وبوجہہ موجود تھی، بایں طور کہ علوم نقلیہ ہوں یا عقلیہ، اخلاق فاضلہ ہوں یا ذکر وگریہ وزاری، حب فی اللہ وبغض فی اللہ ہو یا دلیری وشجاعت، جود وسخا ہو یا مہمان نوازی، تواضع وانکساری ہو یا علمی بحث ومناظرہ،

تفسیر قرآن کریم ہو یا حدیث وفقہ، یا دیگر علمی شہ پارے، آپ کا پایہ ان سب میں انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ فن اسماء الرجال تو آپ کا ایک امتیازی اور اختصاصی فن تھا، الغرض مدح کی ہر جہت حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں آپ مقصور ومنحصر پائیں گے، جیسا کہ قصر المسند علی المسند الیہ میں ہوتا ہے۔ قصہ مختصر حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس شعر کے من وعن مصداق تھے:

ولیس بمستنکر علی اللہ

أن یجمع العالم فی واحد

بندہ آپ کی زیارت وملاقات کے لئے حاضر ہوا، اونچے اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک درہ "شاہو وام" میں ایک چھوٹا سا مدرسہ جو کہ عربی کے اس مقولہ "صغر حجمہ و کبر علمہ" کا مجسم مصداق تھا۔ یعنی بظاہر چھوٹا اور نہایت بوسیدہ وخستہ حال...... لیکن للہیت واخلاص اور فیض رسانی وروحانیت میں اپنی مثال آپ...... میری یادداشت کے مطابق یہ ۱۹۹۴ء کی بات ہے۔ بہر حال زیارت وملاقات سے مشرف ہوگئے۔ حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا، علیک سلیک اور تعارف ودیگر احوال کے بعد احقر نے کچھ تدریسی خدمت کے لئے گزارش کی تو حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے درسمند میں ایک مدرسہ میں درس وتدریس کے لئے فرمایا۔ میں نے اپنی مادر علمی دار العلوم دیو بند میں تخصص فی الفقہ کے نصاب کا ذکر کیا۔ حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ الدر المختار کا نصاب میں رکھنا اس لئے نہایت اہم اور مفید ہے تاکہ رد المحتار سے (جو کہ الدر المختار کا حاشیہ ہے) مناسبت پیدا ہو جائے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ مفتی صاحب یہاں تخصص فی الفقہ کی اشد ضرورت ہے اس لئے تخصص ضرور شروع فرمائیں۔ درس وتدریس کے لحاظ سے یہ میرا دوسرا سال تھا اس لئے مجھے خوف لگ گیا کہ تخصص میں سامنے بیٹھے علما وفضلا کو کس طرح مطمئن کر سکوں گا۔ بندہ کا خیال تو یہ تھا کہ صرف بہائی اور نحو میر سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کروں گا، لیکن حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ارشاد کی برکت سے احقر نے دوسرے تدریسی سال سے ہی تخصص فی الفقہ شروع کیا ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ حضرت کے ایما پر شروع کردہ تخصص فی الفقہ تا ہنوز کامیابی سے جاری وساری ہے، اللہ تعالیٰ کی درگاہِ عالیہ میں دست بہ دعا ہوں کہ تا قیامت یہ سلسلہ جاری وساری رکھے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ بقول کسے "انتہا کے مقابلے میں ابتدا مشکل ہے"۔

آمدم برسر مطلب! پشاور سے حضرت الممدوح کی قبر پر حاضری کے لیے آنے کی سعادت ملی تو مولانا یوسف صاحب نے حکم دیا کہ حضرت کے متعلق اپنی یادداشتیں رقم کردیں، ان کے حکم پر اپنے تاثرات اور قلبی حرارت کو اپنے

اشکبار آنکھوں کے ساتھ تحریر کے سانچے میں ڈالنا چاہتا ہوں، اور یہ تأثرات واحوال بالکل عیاں اور مشاہدہ ہی کے ہیں، اور اگر اس پر قسم باللہ تعالیٰ کھائی جائے تو ہرگز حنث نہ ہوگا۔

۱..... جب بھی حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا تھا تو حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجھے چارپائی کے سرہانے بٹھاتے اور خود چارپائی کے پائنتی تشریف فرما ہوتے تھے، اور کبھی بھی مجھے یاد نہیں آتا کہ مجھ جیسے حقیر کو چارپائی کے پائنتی بٹھلایا ہو اور خود چارپائی کے سرہانے تشریف فرما ہوں۔

۲..... اور جب بھی میں حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے در پر حاضر ہوتا تھا تو مجھے اپنے خاص درسگاہ، مطالعہ گاہ اور آرام گاہ میں قیام کے لئے فرماتے تھے، پھر میں حضرت والا شہیدؒ کے مطالعہ شدہ کتابوں میں مصروف ہو کر اس کے صفحہ اول پر تقریباً پورے کے پورے مطالعہ کا محصولہ وحاصلہ کو دیکھتا تھا، خدا جانے میں اس سے کتنے علمی شہ پارے سمیٹ لیا کرتا تھا۔

۳..... جب بھی میں حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا تھا، اگر کہیں ڈاٹسن یا سوزوکی میں جانا ہوتا، تو خود ڈرائیور کی طرف آدھی سیٹ نمبر ۲ پر تشریف فرما ہوتے اور احقر کو شیشے کی طرف سیٹ نمبر ایک پر بٹھلاتے۔

۴..... جب بھی میں نے حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کوئی علمی اشکال کیا تو حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نہایت ادب وسلیقہ اور نرم وخوش مزاج لہجے میں جواب عنایت فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار دلائل الخیرات میں ایک جگہ لفظ ''یوم'' کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہاں زیر آنا چاہئے تھا، پھر حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے استفسار کرنے پر حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا کہ اس میں افصح فتحہ (زبر) ہے۔

۵..... حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک گرانقدر اور غریب وعجیب اور نصیحت آموز گفتگو ملاحظہ فرمائیے، جو کہ میرے لئے مشاہدہ اور عیان را چہ بیان اور حق الیقین ہے، اور شاید آپ حضرات کے لئے ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' ہوگی۔

وہ نصیحت آموز گفتگو یہ ہے کہ احقر نے حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک بار ''نثر الازھار فی شرح شرح معانی الآثار'' کے متعلق گفتگو کی تو میں نے جرأت کر کے کہا کہ حضرت! اگر آپ اس شرح کے شروع یعنی ٹائٹل پر یوں اضافہ فرماتے ۔۔۔ ''ھذا الشرح فی ضوء افادات العلامۃ محمد یوسف البنوری نور

اللہ تعالیٰ مرقدہ" تو نور علیٰ نور اور سونے پہ سہاگہ ہوتا، اس پر حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نہایت خوش مزاج لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت بنوریؒ کی شان میری شرح سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔ میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔

۶...... نیز اسی مجلس میں ایک اور عجیب بات کا انکشاف فرمایا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مکتوب ارسال فرمایا کہ آپ "نثر الازھار" کو جلد از جلد طباعت کے زیور سے مزین فرمائے۔

آپ حضرات پر مولانا محمد زکریاؒ کی شخصیت مخفی نہیں ہے جس کو ہمارے اکابر امام مالکؒ ثانی کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس جیسی ہستی کا خط اشاعت شرح کے سلسلے میں ہو اور وہ عام نہ کیا جائے یہ بظاہر عام ماحول میں تو ناممکن ہے، بلکہ لوگ اس کو راتوں رات اخبارات، مجلات میں سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے شائع کر دیتے لیکن حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر اخفا کا اتنا غلبہ تھا کہ شاید قریبی احباب کے علاوہ کسی اور کو نہ علم ہو۔

۷...... احقر کی حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ ایک گونہ بے تکلفی تھی، ایک بار میں نے عرض کیا کہ حضرت والا اگر آپ بنوری ٹاؤن میں ہوتے تو آپ بہت سی تصنیفات اور تالیفات فرما چکے ہوتے، تو حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نہایت پر خلوص جملہ ارشاد فرمایا جو کہ آب زر سے لکھنے اور محفوظ کرنے کے قابل ہے کہ" اللہ تعالیٰ مجھے یہاں قاعدہ بغدادی پڑھانے پر جو اجر وثواب عنایت فرماتے ہیں اُتنا اجر وثواب بنوری ٹاؤن کراچی میں بخاری شریف پڑھانے پر عطا نہ ہوتا۔" یہ کتنا وقیع اور معنی خیز جملہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں، جو نہیں جانتے اس کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

۸...... میں ایک انتہائی اہم واقعہ آپ لوگوں کے علم میں لانا چاہتا ہوں، جس سے حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان عالی کسی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ ایک بار سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ دار العلوم سرحد پشاور کے بانی و مہتمم حضرت مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ نے مجھ سے دار العلوم سرحد میں بخاری شریف پڑھانے کی استدعا کی، میں نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں معذرت کر لی لیکن میری اس معذرت پر حضرت کی جو حالت ہوئی اس کو دیکھ کر دل میں خوف زدہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت بنوریؒ کی حرکتِ قلب بند ہو جائے۔ آج کل کسی کو اتنے بڑے ادارے میں محض درس ملنا مشکل ہے چہ جائیکہ بخاری شریف جیسی کتاب کا درس مل جائے، تو اس کا کیا کہنا بلکہ شاید انتہائی فرطِ مسرت سے خود اس کی حرکت قلب بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

۹...... حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی غایت شفقت اور رحماء بینہم کا جیتا جاگتا نمونہ کہ

وہ میری تدریس کی تقرری کی سفارش کے سلسلے میں انتہائی شدید بخار کی حالت میں تشریف لے گئے تھے۔

۱۰......آپ باوجود اس کے کہ وفور علم وعمل اور کامل فی الزہد والتقوی اور رشد وہدایت کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے، اگر کوئی آپ سے بیعت یا بالفاظ دیگر روحانی تربیت کے سلسلے میں عرض کرتا تو بجائے اس کے کہ اپنے آپ سے بیعت کرتے، اسے سیدھا حضرت شیخ الحدیث مولانا معز الحق صاحبؒ فاضل دارالعلوم دیوبند (جو کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے تلمیذ تھے) سے بیعت ہونے کا مشورہ دے کر روانہ فرمایا کرتے تھے۔ آج کوئی ایسا کردار دکھلائے۔

ودونہ خرط القتاد......تلک عشرۃ کاملۃ

۱۱......حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیساتھ میرا تعلق خاص دیکھئے کہ مجھ ناچیز کو میرے شیخ مخدوم ومطاع محترم حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی نور اللہ تعالیٰ مرقدہ (جو کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے آخری خلیفہ تھے) کے حادثہ فاجعہ اور دنیا سے کوچ کرنے پر مکتوب ارسال فرمایا، اور مجھے تعزیتی کلمات تحریر فرمائے۔ یہ گیارہواں نمبر "انی رأیت احد عشر کوکبا" کے زمرے میں ہوا۔

یہ بالا چند امور ایسے تھے کہ میرے قلیل عرصہ کی وابستگی سے ایسی قیمتی علمی شہ پارے بندہ کے علم میں آگئے، نہ معلوم جن حضرات کی سالہا سال ان کے ساتھ وابستگی اور ہمنشینی رہی ہو ان کے علم میں کتنا علمی مواد جمع ہوگا۔ اللہ کرے کہ منصۂ شہود پر آجائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

التنبیہ: مضمون بالا میں میں نے حضرت والا کا نام نامی بار بار ذکر کیا، یہ بلاغت کی اصطلاح پر مبنی ہے، یعنی اپنے محبوب کے نام سے استلذاذ حاصل کرنا......نحوی ضابطہ یہی ہے کہ ایک چیز جب ایک بار اسم علم سے ذکر کی جائے تو دوسری بار راجع ضمیر سے یاد کی جاتی ہے، لیکن کبھی کبھار محب اپنے محبوب کے نام کو ایہام استلذاذ کے لئے اسم محض کے ساتھ بار بار لاتا ہے جس کی مثال اور شاہد مختصر المعانی میں یہ شعر دیا گیا ہے: ؎

باللہ یاظبیات القاع قلن لنا

لیلای منکن ام لیلی من البشر

دوسرے مصرعے میں عربی قواعد کے مطابق یوں کہنا چاہئے تھا کہ "ام ھی من البشر" (مختصر المعانی ص: ۲۰۷، دار الاشاعت کوئٹہ)

اسی طرح کتب تواریخ میں یہ قصہ آیا ہے کہ کوئی راہ گیر ایک بیاباں اور صحرا میں محو سفر تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑ گئی کہ وہ زمین پر بیٹھا ہوا ہے اور بار بار زمین پر لیلیٰ کا نام لکھ رہا ہے، پھر مٹا دیتا ہے۔ راہگیر حیرت سے

دیکھتا ہے کہ اس نام کے محو واثبات سے کیا مقصد ہے؟ بالآخر راہگیر نے جرأت کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کا مطلب وغرض اس مٹانے اور لکھنے سے کیا ہے؟ انہوں نے کہا: بھائی! جاؤ، اپنی منزل کو طے کرو، اس سے آپ کا کیا واسطہ۔ لیکن راہ گیر نے وجہ بتلانے پر بڑا ہی مجبور کیا۔ وہ تو تھا ہی مجنون، اس نے منظوماً فارسی اشعار میں یہ جواب دیا: ؎

گفت نام مشق لیلیٰ میکنم

خاطر خود را تسلی میدہم

یعنی لیلیٰ کے ساتھ ملاقات نہ سہی، لیکن ان کے بار بار نام لکھنے سے شاید دل کو تسلی ہو جائے، اس طرح مضمون بالا میں بندہ کی حالت ہے۔ واللہ یعلم المفسد من المصلح، واللہ علی مانقول وکیل۔

نیز تکرار اسم علم کے بارے میں عام لوگ جو بھی رائے رکھتے ہوں، لیکن میرا ذوق تو اس میں یہ شعر پیش نظر ہے:

ومن عادتی حب الدیار لأھلھا

وللناس فیما یعشقون مذاھب

لطیفہ: منطقی اصول کی رو سے حضرت الممدوح کا نام ''محمد امین'' میرے نزدیک از قبیل قضایا قیاساتھا معھا سے ہے جس کا اہل منطق ''الاربعۃ زوج'' مثال دیا کرتے ہیں۔

آخر میں قارئین کرام سے اور اخص الخصوص عزیزم مکرم ابن الشہید مولانا محمد یوسف سے عرض ہے کہ مضمون بالا نے کافی طول پکڑ لیا جس کے لئے بندہ معذرت خواہ ہے اور بقول کسے: طول زلف یار کبھی بار خاطر نہیں ہوتا۔ نیز میری زندگی میں پہلی بار کسی ایسی عبقری شخصیت پر اتنی دلسوزی کے ساتھ مضمون لکھنا ہے۔ احقر اس کو حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کرامت بعد الموت گردانتا ہے جو کہ اہل السنت والجماعت کے ہاں حق ہے اور میں نے ماتحت الطاقۃ البشریۃ کے اپنے محسن عظیم کے قرض اتارنے کی مقدور بر سعی کوشش کی۔ تقبل اللہ منا ومنکم۔

آخر میں احقر دست بہ دعا ہے کہ حضرت الممدوح مولانا محمد امین شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فرزندان ارجمند ہر ایک حضرت مولانا محمد یوسف اور ظہیر الدین دونوں کو اللہ تعالیٰ خلف (بفتح اللام) بنائے نہ کہ (بسکون اللام) اور اس مضمون کی برکت سے ہم سب کو اللہ تعالیٰ دنیاوی واخروی سرخروئی اور کامیابی کے تمام کے تمام منازل طے کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

نیز ان قدسی نفوس اور ملکوتی صفات حضرات اکابر کی جوتیوں کے سائے تلے جنت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

ایں جملہ از من واز جملہ جہاں امین آباد۔

برحمتک یاارحم الراحمین وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا محمد والہ وصحبہ اجمعین۔

فردِ فرید

مولانا محمد حارث، کراچی

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم امابعد!

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم

وبقی الذین حیاتھم لاتنفع

حضرت الاستاذ سیدی وسندی ومکرمی رحمہ اللہ کی جامع الکمالات اور عبقری شخصیت پر لکھنا ایک ضعیف القویٰ کا سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں کو عبور کرنے کے مترادف ہے۔ امین علوم الشیخ البنوری رحمہ اللہ تعالی الاستاذ الامام القدوۃ العبقری لم نر قبلہ ولا بعدہ مثلہ۔

ولا ظھر لی مماثل لفضلہ مذ ذھب

ولا صدیق جمع فی نفسہ مثل صفاتہ

فکیف الوصول الی سعاد و دونھا

قلل من الجبال و دونهن حتوف

حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو فنا ہونا ہے اور یہی خالق ومخلوق کے درمیان ما بہ الامتیاز اور فرق بین ہے۔ ''کل نفس ذائقة الموت'' اور ''کل من علیها فان ویبقی وجه ربک ذو الجلال والاکرام'' رب تعالیٰ کا ازل لم یزل فیصلہ ہے جس سے کسی بھی ذی روح کو مفر ومخلص نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باوجود غایت درجہ عشق کے جام فراق پینا پڑا، یہ ایک مسلم امر ہے کہ جب انتہائی بیش قیمت، نادر النظیر، کمیاب، نایاب، انمول نعمت یا خزینہ کسی حامل نعمت و مالک خزینہ سے جو اس کا قدر شناس بھی ہو، گم ہو جائے تو اس کے درد وکرب کا کیا حال ہوگا وہ تو اس کے دل سے پوچھئے جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ جوہر کی قدر جوہری سے پوچھو، پس حضرت استاذ صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کی اچانک خبر ان کے عشاق اور قدر دانوں کے دل پر سخت بجلی کی مانند کچھ اس طرح سے گری کہ پل بھر میں تمام سرسبز وشاداب، ہرا بھرا زرخیز گلشن جس کے ہر ہر پھول سے عشق بنوری کی داستانیں سنائی دیتی تھیں، ایک دم تصویر حسرت اور حسین یادوں کا فقط آشیانہ بن گیا اور راقم سمیت سینکڑوں قلوب میں جو حضرت الاستاذ سے علمی اور روحانی استفادے کی سیرابی کی امنگ، آرزو اور خواہش تھی وہ تشنہ ہی رہ گئی اور بندہ عاجز ان اشعار کا مصداق ہو گیا:

ما کل ما یتمنی المرء یدرکه
تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

پس راقم الحروف کے صید الخاطر کو سپرد قلم کرنے سے پیشتر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی وہ منفرد، دل آویز اور بحر حقائق میں مستغرق عجیب وغریب تعبیرات کے ذیل میں امت کو دیا گیا پیغام قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا جس کا مستفاد یہ ہے کہ اس کائنات کا وجود بمنزلہ ایک مکان اور حجرے کے ہیں، جس میں بہت سے قمقمے روشن ہیں جو اپنی تابانی اور ضیا پاشی میں مختلف ہیں، اگر ان کو یکے بعد دیگرے گل کر دیا جائے تو تدریجا روشنی مدہم ہوتے ہوتے یکسر ختم ہو جائے گی اور ماحول پر مہیب سائے منڈلانے لگیں گے، اس طرح اہل اللہ کا وجود کائنات کیلئے رشد وہدایت کی قندیل ہے جس سے اس کارخانۂ عالم میں سورج کی سی روشنی واجالا ہے اور جس جس طرح اللہ والوں کا سایہ عاطفت اس دنیا سے رخصت ہوتا جاتا ہے اس حجرے کے قمقمے بجھتے جارہے ہیں اور کمرے میں موجود روشنی ماند پڑتی جارہی ہے۔

جامعیت کیلئے جن فطری ووہبی اوصاف وکمالات کے عناصر ناگزیر ہیں قسام اجل نے بتمامہ اس بزرگ ہستی میں بدرجہ اتم ودیعت کر رکھے تھے، پھر بعض پہلو ایسے نمایاں تھے جو فی زمانہ نادر الوقوع ہی نہیں بلکہ عدیم النظیر اور

فقید المثال تھے اور حضرت الاستاذ اس میں یگانہ روزگار اور فرد فرید تھے جنہیں دیکھتے ہی آدمی ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا، مثلا ایک طرف ان کا اخلاص وللہیت جو الا للہ الدین الخالص کا مصداق، قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کا ترجمان اور والذین آمنوا اشد حبا للہ جیسی آیات میں مضمر روح کی عملی تصویر وتمثال تھا تو دوسری جانب ان کی غایت درجہ کی تواضع وخاکساری جو مدنیت کی روح کو اپنے اندر لیے ہوئے تھی اپنے لئے خادم کی جگہ ہمیشہ خویدمکم کا لفظ استعمال فرماتے، ان کی عامی وادنی درجہ وطبقے کے نابلد دیہاتی مہمانوں کے ساتھ مشائخ کا سا حسن سلوک ومعاملہ اور ان کی خاطر مدارات میں بچھ جانا عجیب تر تھا۔

پہلی مرتبہ استاذ گرامی مولانا یٰسین صاحب حفظہ اللہ (استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی) کے ساتھ حضرت الاستاذ صاحبؒ کی خدمت اقدس پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی، جب سفر شروع کیا تو دوران سفر تمام راستہ حضرت الاستاذ صاحبؒ کے متعلق سوچتا رہا اور اپنی خوش قسمتی وسعادت پر محو حیرت تھا کہ مجھ جیسا اب سے کچھ وقت بعد ایک عظیم قدوۃ الانام ایک نہایت پاکیزہ ہستی سے شرف ملاقات کرنے والا ہے اور ان کی زیارت باسعادت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے والا ہے بہر حال قصہ مختصر عرض مدعٰی وغرض یہ ہے کہ انسان عام طور پر جب کسی بڑے بزرگ کے غیر معمولی احوال وحالات ومعمولات سنتا ہے تو اپنے ذہن میں ان کے متعلق ایک عظیم واونچا تخیل قائم کرلیتا ہے لیکن عموما اکثر اوقات ہوتا یوں ہی ہے کہ ملاقات کے بعد متخیل ومتصور کردہ شئی سے قدرے انحطاط کے ساتھ ہی اس کی حقیقت رونما ہوتی ہے (یا یوں تعبیر کیا جائے کہ تصور کردہ خاکے سے اس کی حقیقت بہت کم ہی نظر آتی ہے اور مفروضہ بہت عالی بنایا گیا ہوتا ہے) مگر واللہ العظیم یہاں معاملہ بالکل برعکس ہوا کہ بندہ نے حضرت استاذ جی سے حضرت الاستاذ صاحبؒ کے تذکرے اور خطوط کو دیکھ کر جو ایک عظیم تخیل قائم کیا تھا حقیقت اس سے کئی گنا اونچی وبلند تھی، ان فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں جو بزرگ ہستی اپنی للہیت وروحانیت کو اخفا کیے بیٹھی تھی، تاریخ کے اوراق دہائیوں تک ان صفات کی حامل ہستی کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہیں گے۔

عند اللقاء حضرت الاستاذ کا وہ طویل پر شفقت معانقہ کہ جیسے ایک حقیقی والد نے اپنے گمشدہ بچے کو ایک طویل عرصے کے بعد سینے سے لگایا ہو: کیف ابین ذاک المنظر البھیج منی التحریر والتسطیر

اس رات یا اگلی رات بعد از مغرب کافی علاقائی زائرین جن میں اکثر علماء کرام تھے استاذ کے قدیم مہمان خانے میں تشریف فرما تھے جگہ بالکل نہ تھی، لہٰذا درجہ ثالثہ کا طالبعلم کمرے سے باہر کھڑا اس کشمکش میں تھا کہ جاؤں تو سوء ادب کا احتمال غالب ہے کہ جگہ نہیں اور معزز مکرمین کی نشست ہے اور نہ جاؤں تو حضرت الاستاذ کے قیمتی نایاب انمول موتیوں سے بھرے کلام کو سننے سے اور ان کے دیدار سے محرومی ہوتی ہے، پس حضرت الاستاذ صاحب کسی

وجہ سے کمرے سے باہر تشریف لائے اور محسوس فرمایا لہٰذا ہاتھ سے پکڑ کر کمرے میں مسکراتے ہوئے ساتھ لائے اور ایک نظر دوڑائی جب دیکھا کہ جگہ بالکل نہیں ہے تو بندے کو لاکر اپنی نشست پر بٹھا دیا، اب کیا تھا! سارا مجمع سمٹ کر بیٹھ گیا اور پھر حضرت الاستاذ تشریف فرما ہوئے۔ اس وقت جو دل کی گہرائیوں میں استاذ کی عظمت وقدر پیدا ہوئی وھو فیما بینہ وبین اللہ اس کا ادراک ممکن ہے۔

استاذ صاحبؒ کو جب ثالثہ کے نام نہاد طالب علم نے اپنا خسیس وردی ورکیک قسم کا عطر جو کہ نہایت ہی چھوٹی سی شیشی میں تھا، جس کی خوشبو، حضرت الاستاذ صاحبؒ کی الماری میں موجود قطر وبیروت وسعودیہ کی عطر کے مقابلے میں بلا مبالغہ رائحہ کریھۃ ہی کی حیثیت رکھتی تھی، اس کی اس قدر تعریف اور بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ عقل حیران رہ گئی اور بڑی رغبت سے اس کو سونگھنے لگے، شم فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت الاستاذ صاحب کی نفاست طبع کے باعث اس سے زکام ہو گیا تھا۔ دراصل سچ تو یہ ہے کہ حضرت الاستاذ ان ہی مثالی اور دلنواز اداؤں کا مجموعہ ومنبع تھے جس نے قلوب کو مسحور وگرفتار کر رکھا تھا۔

اگر کسی معاصر ومعاند کو ہماری کسی بات سے اختلاف ہو تو بندہ اس پر ہرگز معافی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

نحن بما عندنا وانت بما

عندک راض والرأی مختلف

واقعہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذ صاحب غایۃ درجہ کے متقی پارسا، راسخ العلم اور زہد وتوکل کے پیکر تھے، پس ان کے کس وصف وکمال کو ذکر کیا جائے اور کسے نہیں؟ یہ انتخاب انتہائی مشکل مرحلہ ہے، بندہ تو ان کی ایک ایک ادا جو سنتِ نبوی کی عکاس ہوا کرتی تھی جس سے اسلام کی عملی تصویر، حقیقی منظرکشی ومزاجِ شریعت کا صحیح رُخ ملتا تھا، اُسے شمائل میں تلاش کرتا رہتا اور یوں راہیں متعین ہو جاتیں۔ سعدی کا یہ شعر دل کا صحیح ترجمان ہے:

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تو اس پر علمی اشکال تک رفع فرما دیا جو مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کو پیش آیا تھا کہ صحبتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ 'صد' کی جگہ 'لکھ' کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کی فقط زیارت ہی سے مریضانِ قلوب کو شفا ملتی تھی اور ملنے والا پیغامِ وفاشعاری، دیانت، صداقت، دینی حمیت وغیرت، ترحم علی الخلق اور تعلق مع اللہ کا پیام وجذبات لے کر اٹھتا تھا بلکہ قصہ مختصر ایک ہی ملاقات ونشست میں دل کی کایا پلٹ جایا کرتی تھی اور بعد ازاں استاذ صاحب کو ایک نظر وجھلک دیکھنے کے لئے

قلوب بے چین و بے تاب رہتے اور ملاقات پر حضرت استاذ صاحب کے وہ پُر شفقت، دھیمے و مدہم لہجے میں ملائمت سے بھرپور میٹھے جملے، جس کی مٹھاس شاید شہد سے زیادہ شیریں اور مرغوب مشروب سے زیادہ روح پرور ہوا کرتی، پھر اس پر مستزاد اُن کی دل آفرین تبسم و مسکراہٹ.....

فكنت به اجلو همومي واجتلي
زماني طلق الوجه ملتمع الضيا
ارى قربه قربى ومغناه غنية
ورويته ريا و محياه لى حي □ ا

واللہ العظیم یہ اوراق اپنے محدود دامن میں ان کیفیات کا احاطہ تو درکنار، اظہار بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتے نہ کوئی تحریر اسے با آسانی قلمبند کر سکتی ہے اور نہ زبان اس کی کما حقہ ترجمانی کر سکتی ہے، بس خلاصہ یہ ہے کہ اس کا تعلق روایت سے نہیں بلکہ رویت سے تھا۔

جب استاذ محترم مجلس میں ساکت وصامت ہوتے تو اس وقت محفل اور مجلس کی رونق ہوتے اور ان کا پرنور چہرہ چودھویں رات کی چاند کی مانند چمکتا اور پوری مجلس پر ان کے وقار و متانت اور مسکنت کا رعب و جلال ہوتا اور جب کلام فرماتے تو تمام اہل مجلس سرتا پا گوش ہو کر استاذ صاحب کا پرمغز و جیز اور نپا تلا کلام نہایت عظمت وادب سے سماع نہیں بلکہ استماع فرمایا کرتے وللہ در من قال:

اذا سكتوا رأيت لهم جمالا
و ان نطقوا سمعت لهم عقولا

حضرت الاستاذ صاحب کا حضرت بنوریؒ کی تصنیف معارف السنن کے زمانے میں ۱۸ گھنٹے مسلسل پے در پے مطالعہ ہوتا تھا فیا حسرتاہ لم نمتع من علومہ و فیوضہ شیئا اور اپنے وطن مألوف شاہو وام ہنگو میں جامعہ یوسفیہ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں جب اساتذہ زیادہ نہ تھے حضرت استاذ صاحبؒ ۱۶، ۱۶ اسباق پڑھایا کرتے تھے جو علاوہ اس پختہ کار عالم سے متصور و ممکن نہیں ہو سکتا ہے کہ جس سے تمام علوم پر مکمل دسترس واستحضار نہ ہو، اسی کے مؤید مولانا یوسف صاحب کے استاذ محترم مولانا اسد اللہ صاحب حفظہ اللہ نے 'اپنے ایک سفر کا جو انہوں نے استاذ صاحب کی رفاقت میں کیا تھا' یہ واقعہ بیان کیا کہ تمام سفر میں حضرت استاذ صاحب سے مختلف النوع علوم وفنون پر اشکالات کرتا رہا اور استاذ صاحب اس کا اطمینان بخش جواب اس طرح سے دے دیتے تھے جیسے کہ کتاب سامنے کھول کر بیان فرماتے ہوں، بلاشبہ انہیں تمام علوم کا استحضار تھا ورنہ یہ بات ممکن نہیں ہے۔

استاذ صاحبؒ کا تبصرہ روایات کی صحت وسقم پر اور رجال کے احوال واتقان پر بلیغ النظر ہوتا، ایک مرتبہ 'التذکرہ فی احوال القرطبی' کے بارے میں فرمایا کہ آپ نے ان کی کتاب کو خرید لیا لیکن اگر مشورہ فرما لیتے کیونکہ اس میں اکثر سند کے اعتبار سے ضعیف روایات ہیں، اسی طرح ہم مکتبہ پشاور سے جو دیگر کتب خرید کرلاتے تھے تقریباً ہر ایک پر نہایت جامع پر مغز وجیز تبصرہ فرمایا، قاضی عیاضؒ کی عدیم النظیر تالیف "الشفا بتعریف حقوق المصطفی" (جو کہ حضرت الاستاذ صاحب کو باوجہ کمال عشق نبوی (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلاما) اور بوجہ اس کے مؤلف کے بڑی پسند تھی، کیونکہ مؤلف نے اپنے موضوع کا استقصا فرمایا ہے اور تمام گوشوں اور زاویوں سے سیر حاصل بحث کی ہے، رمضان میں گویا استاذ صاحب اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے،) کی شرح 'شرح الشفاء لملا علی القاری' کے نام سے بندے نے خریدی تھی، تو اس پر فرمایا کہ "نسیم الریاض للعلامہ خفاجی" کی اس سے فائق ہے۔

حضرت الاستاذ کا بزبان حال اس بات کا تقاضہ رہتا کہ رات جلدی سوئیں اور علی الصباح تہجد کیلئے بیدار ہو جائیں، اس سلسلے میں راقم الحروف اپنا اور برادرم مکرم مولوی انظار صاحب کا ایک عجیب واقعہ نقل کرتا ہے کہ ایک رات ہم مہمان خانے والے کمرے سے ہٹ کر جہاں حفظ کی کلاس لگتی ہے، چار پائی پر سو رہے تھے، کافی تھکاوٹ کی کیفیت تھی، پس حسب معمول حضرت استاذ صاحبؒ تقریباً دو یا تین بجے کے قریب بیدار ہوئے اور اپنے وظائف ومعمولات میں مصروف ہو گئے، بعد فراغ تہجد مسجد کے صحن میں بحالت احتباء بیٹھے ہوئے ہاتھ میں تسبیح ہے، دور ہی سے راقم پر توجہ فرمائی (تقریباً وقت فجر میں پون گھنٹہ باقی تھا) تو یکایک دل پر یوں اثر ہوا جیسے کہ بجلی کا کرنٹ لگا ہو جب بندے کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ حضرت استاذ صاحبؒ مستقل ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں کا مطالبہ وہی امام احمدؒ کا مشہور مقولہ ہے جو بسا اوقات حضرت الاستاذؒ دہرایا کرتے تھے: "سبحان اللہ رجل یطلب العلم ولیس لہ ورد باللیل، پس بندہ نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے ساتھی کو اٹھایا لیکن جب وہ بوجہ غنودگی اور تھکاوٹ کے پس وپیش کرنے لگے تو اب حضرت الاستاذ صاحبؒ اپنے مخصوص انداز سے مسجد کے برآمدہ سے اٹھتے ہوئے ان کے بستر کے سرہانے تشریف لائے، واللہ باللہ تاللہ استاذ صاحب کی ایک ایک ادا بلکہ لمحہ ولحظہ، شمائل وسیرت واتباع سنت کا عکاس وحسین مرقع ومنبع ہوتا تھا، نہایت متوسط قدموں کے ساتھ قدم رکھتے ہوئے "کانہ ینحط من صبب" کا مصداق، نہایت تواضع وعاجزی سے ان کا سر دبانے لگے اور فرمانے لگے، انظار صاحب! اٹھ جائیے، نماز کا وقت ہو چکا ہے، انظار صاحب! اٹھ جائیے نماز کا وقت ہو چکا ہے، (مراد تہجد کا وقت تھا)، پس جیسے ہی اس نے ہوش سنبھالا پھر کیا کہنا تھا کہ بے حد گھبرائے ہوئے چار پائی سے گویا اچھل پڑے۔ تہجد میں مسجد آباد ہو جاتی، میرے ساتھ ایک معصوم، بہت چھوٹی عمر کا طالب علم تہجد میں کھڑا مسلسل رو رہا تھا، اس کی کیفیت ایسی تھی کہ میرے اندر بجلی دوڑ گئی، اللہ

اکبر! غرض یہ نرالی ومثالی ادائیں ان کی سیرت وحسن کردار کا نہایت وقیع وجلی باب ہے جس نے تمام واردین و متعلقین کو اپنا عاشق ودیوانہ بنایا ہوا تھا:

فمارافنی من لاقنی بعد بعده

و ما شافنی من سافنی لوصاله

ولا لاح لی مذ نذ بنذلفضله

ولا ذو خلال حاذ مثل خلاله

ایک مرتبہ سفر میں چند ایک عجیب باتیں پیش آئیں، جن کا تذکرہ نذر قارئین کرتا ہوں:

اول: اس سفر میں حضرت الاستاذ صاحبؒ سے شرف تلمذ نصیب ہوا، شرح النقایہ کے ۱۵ یا ۱۶ اسباق پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت الاستاذ صاحبؒ کا سبق اگرچہ پشتو میں تھا، کتاب الزکوۃ کی بحث چل رہی تھی مگر انزلوا الناس منازلهم کا مصداق تھی، ان کی فصیح وبلیغ زبان (فانه فصیح اللسان وبليغ البيان' اور جس طرح شمائل کی روایات میں الفاظ آتے ہیں، کلامه فصل) کی وجہ سے بہت آسانی پیدا ہوگئی تھی، آپ قیمتی موتیوں کو مخاطب وطالب کے سامنے نہایت اسہل وجامع انداز میں پیش کردیتے، لہٰذا حضرت کی کرامت سے سبق کا اکثر حصہ اس کوتاہ فہم کو باوجود پشتون نہ ہونے کے سمجھ آجاتا۔

دوم: حضرت الاستاذ سیدی وسندی سے حزب البحر کی اجازت اور سماع حاصل ہوئی۔ اس دن صبح کو قریب ۹ بجے کافی تیز دھوپ تھی اور اچھی خاصی گرمی تھی، بندے نے اس وقت حضرتؒ سے اس کی اجازت وسماع کی درخواست کی تھی، مسکراتے ہوئے قبول فرمایا، ہاتھ میں اخبار تھا اور آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر ۳ مرتبہ اللهم اسقنا اللهم اسقنا فرمایا، راقم کو تو ان کے مستجاب الدعوات ہوئے کا اعتقاد تھا۔ پس چند گھنٹے بعد جب صحن مسجد میں حضرت استاذ صاحبؒ حزب البحر کا سماع کروا رہے تھے اور قرآت جاری تھی کہ گھنے بادلوں نے فضا کا احاطہ کیا اور انتہائی موسلا دھار بارش ہوئی، صحن مسجد میں بیٹھنا مشکل ہوگیا، حضرت استاذ صاحبؒ نے پھر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہوئے تبسم فرمایا اور چہرے پر خوشی کے آثار تھے، کیا ناز برداری کیا راز ونیاز 'اسمعت من ناجيت' جس کا ورد ہوا اور رگ رگ میں ذکر اللہ جاری ہو، اس کی ادائیں ایسی دل نواز نہ ہوں تو کس کی ہوں...... بندے کو وہ لحظات آپ کی تمام اداؤں سمیت اس طرح یاد ہیں، کانی انظر الیہ۔

سوم: جس دن مدرسہ پہنچے تھے غالباً اس دن بندے نے حقیر سے (unisail) کے دو قلم استاذ صاحبؒ کو پیش فرمائے تھے، حضرت نے ذرہ نوازی اور ادخال السرور فی قلب المؤمن عبادة کے پیش نظر اسی دن

''غیلانیات'' نامی کتاب پر اپنی یاداشت وتذکار وحوالہ جات کے لئے استعمال فرمایا تھا۔حضرت الاستاذ صاحبؒ تقریباً اسے ایک ہی نشست میں ظہر وعصر کے مابین پوری کتاب کا استیعابا مطالعہ فرمایا تھا۔

چہارم: اگلے دن واپسی کراچی کا سفر تھا اُس رات خلاف معمول رات دیر تک بندے اور محترم رفیق وبرادر مولوی انظار صاحب کے ساتھ طویل نشست فرمائی، تقریباً ۱۲ بجے کے قریب تک اپنے ہاتھ سے پھل کاٹ کاٹ کر عنایت فرماتے رہے اور عجیب وغریب مضامین ارشاد فرماتے رہے۔اس سلسلے گفتگو میں چند باتیں جو بندے کے حافظے میں محفوظ رہیں وہ یہ تھیں۔

اول: جامعہ بنوری ٹاؤن کے احباب تک میرا یہ پیغام پہنچائیں کہ حضرت شیخ بنوریؒ کی چاہت تھی کہ شرح وقایہ کی جگہ شرح النقایہ داخل نصاب ہوجائے۔اس نفیس کتاب کی شان اُس سے فائق ہے۔

دوم: اگر کوئی میرے دل سے پوچھے کہ آپ کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور دلعزیز کتاب کون سی ہے، تو میں صیدالخاطر لابن الجوزیؒ کہوں گا۔اس میں بہت نفیس مضامین ہیں۔

یقیناً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنی ذات بابرکات میں اکیلے فرد فرید، یکتا وانمول موتی تھے جن کی نظیر دہائیوں تک تاریخ پیش کرنے عاجز رہے گی اور یہ امر تو طے شدہ ہے کہ اقدم ہمیشہ عہد نبوی سے زمانا اقرب ہی ہوا کرتا ہے اور خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم کی برکات کا زیادہ حامل ہوتا ہے پس مشائخ کا یہ جملہ (ہمارے) بڑوں نے (اپنے) بڑوں کو دیکھا ہے بلاشبہ ان کی زیادتی خیر پر دال ہے، پھر ان کے بڑے بھی جب حضرت بنوری رحمہ اللہ اور شیخ فضل محمد صاحب سواتی جیسے ہوں، ولی کامل اور قطب وقت ہوں تو پھر نور علی نور کا مصداق ہوا اور اس پر حضرت الاستاذ صاحب کی فطری فہم وذکا اور جبلی صلاحیتیں تو اپنی جگہ ان کا جود وسخا، ان کی فیاضی ومہمان نوازی، ان کا ہر زائر وآتی' اگرچہ عامی ہی کیوں نہ ہوئے اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اکرام کا پرلطف، شفقت سے بھر پور معاملہ فرمانا اور اس کے طعام وقیام کا خاص خیال رکھنا جس میں اخلاص کی اعلیٰ قدریں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجزن ہوتیں۔حضرت الاستاذ فرمایا کرتے تھے کہ آنے والا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہے لہٰذا اس کی دل جوئی واکرام ضروری ہے ورنہ تو نگاہ عشق میں یہ بہت بڑی جفا واحسان فراموشی ہوگی، پھر مہمان نوازی کے نصوص میں جو فضائل وارد ہیں اُس کا استحضار اس پر مستزاد تھا، یہی وجہ ہے کہ اُس آنے والے کے جذبات یہ ہوجایا کرتے کہ شاید حضرت کو سب سے زیادہ مجھ ہی سے تعلق وشفقت ہے، یہی ہے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کے نتائج وثمرات ...... یہ وہی سیرت پیغمبر علیہ السلام کا درخشاں پہلو ہے کہ ہر صحابی بھی حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ایسا ہی تعلق خیال کرتا۔

اولئک آبائی فجئنا بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

حضرت الاستاذ کی رحلت اس حدیث کا مصداق ہے، پیغمبر عربی، فخر الرسل کا یہ پاکیزہ ارشاد :یذهب الصالحون الاول فالاول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر او التمر لایبالیهم الله بالة (او کما قال علیه السلام)

انہیں چند سطور پر اکتفا کرتے ہوئے اس شعر پر اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

فما اباونا بامن منه علینا

اللاتی قد مهدوا الحجور

مولانا محمد امین اورکزئیؒ کا جرم کیا تھا؟

مولانا محمد شفیع چترالی، کراچی

خیبر پختونخوا کی عظیم علمی روحانی شخصیت، محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے شاگرد خاص جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے سابق استاذ اور جامعہ یوسفیہ شاہو وام ضلع ہنگو کے بانی ومہتمم شیخ الحدیث مولانا محمد امین اورکزئیؒ کی مظلومانہ شہادت کو کئی سال ہو گئے ہیں مگر مولانا کے شاگردوں، متعلقین اور ان کے علاقے کے عوام کو تاحال اس سوال کا جواب کہیں سے نہیں مل سکا کہ آخر وہ کون سا جرم تھا جس کی بنا پر مولانا جیسی عظیم شخصیت کو وحشیانہ بمباری کر کے شہید کیا گیا تھا؟ آج مبینہ طور پر طالبان کی کارروائیوں اور خودکش حملوں کا نشانہ بننے والے افراد کا تو قومی سطح پر ماتم کیا جاتا ہے۔ حکمرانوں سے لے کر میڈیا، یہاں تک کہ سیکولر تنظیموں تک ہر کوئی ان واقعات کی مذمت کرتا ہے اور مساجد ومدارس پر خودکش حملوں سے نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے، یہ احتجاج اپنی جگہ بالکل درست اور بجا ہے اور ہمیں دہشت گردی وتخریب کاری اور ظلم وزیادتی کے ہر واقعے کی مذمت کرنی چاہیے لیکن دوسری جانب یہ امر افسوسناک ہے کہ آپریشنز کے دوران گرائی جانے والی مسجدوں، مدارس اور علما کی شہادت پر کہیں سے کوئی صدائے

احتجاج بلند نہیں ہورہی اور ہنگو میں مولانا محمد امین اورکزئی کی مظلومانہ شہادت کے واقعے کو اس انداز سے نظر انداز کیا گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، حالانکہ مولانا محمد امین شہیدؒ کا علمی وروحانی مقام کچھ کم نہ تھا اور نہ ان کو شہید کرنے کے واقعے کی سنگینی سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی راقم کے" دادا استاذ" تھے"۔ میرے اساتذہ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ (ناظم تعلیمات جامعہ بنوری ٹاؤن) مولانا محب اللہ، مولانا سعید اللہ، مولانا سید محمد رزین شاہ اور مولانا محمد یاسین صاحبان مولانا کے نہ صرف قریبی شاگرد رہے، بلکہ ان حضرات کا مولانا سے آخری لمحات تک گہرا تعلق اور رابطہ قائم تھا۔ ان حضرات کے توسط سے بندہ کو بھی مولانا سے نیازمندی حاصل تھی۔ اس لحاظ سے بندہ کو مولانا کی زندگی میں ہی ان کے افکار و خیالات سے بہت حد تک آگاہی تھی۔ مولانا اورکزئی کی شخصیت سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا سرحد وفاٹا میں امریکی حملوں کے ردعمل میں پیدا ہونے والی عسکریت پسندی سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ مولانا نے اس مسئلے کے حل کے حوالے سے کئی بار اپنا مثبت کردار ادا کیا۔ سابق گورنر علی محمد جان اورکزئی مولانا کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دور میں کئی بار خود مولانا کے پاس گئے اور ان سے مدد طلب کی تو مولانا نے ہر بار ان سے تعاون کیا اور امن معاہدے کروانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ مولانا کی یہ سوچی سمجھی رائے تھی کہ پاکستانی فوج اور عوام کو لڑانا اغیار کے دیرینہ منصوبے کا حصہ ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: کہ فوج اور عوام کی لڑائی دشمن قوتوں امریکا اور بھارت کو خوش کرنے کا باعث ہے، اس لئے میں اس کی حمایت نہیں کرسکتا۔ مولانا کے یہ خیالات فوج کے علاقائی کمانڈروں کو بخوبی معلوم تھے اور یہی وجہ ہے کہ اطلاعات کے مطابق وہ مولانا کے مدرسے اور مسجد کو نشانہ بنانے کی کارروائی پر حیرت اور لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ فوج کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس کے اس بیان پر بھی سب کو حیرت تھی، جس میں انہوں نے مولانا کو عسکریت پسندوں کا کمانڈر اور ان کے مدرسے کو دہشت گردی کی تربیت گاہ قرار دیا تھا۔ ہمارے بعض اخبارات نے بھی انتہائی جانبدارانہ سرخیاں لگائی تھیں۔ فوجی ترجمان کے اس بیان اور میڈیا کے رویے پر اس وقت دینی حلقوں میں زبردست غم وغصہ کی لہر دوڑی تھی اور مذہبی قیادت اور عوام نے زبردست احتجاج کیا تھا۔

مولانا کی شہادت کے بعد جب کراچی سے کئی حضرات اور مولانا کے تلامذہ تعزیت کے لئے ہنگو گئے اور مولانا کی فوج کے ہاتھوں شہادت کے اسباب جاننے کی کوشش کی تو علاقے کے عام لوگوں کی طرح انہیں بھی اس واقعے کی کوئی توجیہ معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ ان کے بقول علاقے کے بعض لوگ اس واقعہ کو اورکزئی ایجنسی میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے تناظر میں دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاید سیکورٹی اداروں میں موجود فرقہ پرست عناصر نے "عسکریت

پسندوں کے خلاف آپریشن' کی آڑ میں اپنے بغض کی تسکین کرتے ہوئے مولانا کو شہید کروایا ہو یا پھر علاقے میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی آگ بھڑکانے کی کسی سازش کا حصہ ہو۔

یہاں بھی واضح رہے کہ مولانا کوہاٹ میں اہل السنت والجماعت کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے لیکن علاقے میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام کے حوالے سے دونوں فریق ان پر اعتماد کرتے تھے، مخالف فریق کے عمائدین مولانا سے ان کے مدرسے میں آکر بلا جھجک ملتے تھے اور حکومتی افسران بھی سب سے پہلے مولانا ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مولانا نے کئی بار اشتعالی فضا کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس کے علاقے کے لوگ گواہ ہیں۔ مولانا جیسی معتدل شخصیت کو نشانہ بنانا خود پاک فوج کے خلاف سازش ہے، کیونکہ مولانا فوجی کارروائیوں کی زبردست مخالفت کے باوجود فوج اور پاکستان کے خلاف عسکریت پسندوں کی کارروائیوں کے بھی مخالف تھے۔

ہمارے حکمرانوں، میڈیا کے سقراطوں اور مسجدوں پر بمباری کرنے والے عسکری کمانڈروں کو شاید اندازہ نہ ہو کہ مولانا اورکزئی جیسے بزرگوں کا وجود اس ملک وملت کی فلاح وصلاح کے لئے کس قدر اہم ہوتا ہے اور ان بزرگوں کو شہید کرنے، انہیں ذہنی اذیتیں دینے اور ان کی بددعائیں لینے کا انجام کس قدر خطرناک ہوسکتا ہے۔ مولانا محمد امین اورکزئی کے روحانی مقام ومرتبے سے واقفیت کے لئے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے کہ انہوں نے شہادت سے صرف ایک روز قبل ہی نہ صرف اپنے صاحبزادے کو اپنی تجہیز وتکفین سے متعلق وصیت کی تھی بلکہ مسجد ومدرسے سے متعلق امانتیں بھی ان کے حوالے کردی تھیں۔ جس وقت مولانا کی شہادت کا واقعہ ہوا، اس وقت وہ روزے سے تھے اور آخری سحری میں انہوں نے پانچ عدد عجوہ کھجوریں اور آب زمزم استعمال کیا تھا۔ اس وقت ان کے صاحبزادے مولانا کے حکم پر "دو چادریں" لینے ہنگو بازار گئے ہوئے تھے۔ مولانا کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف صاحب کے بیان کے مطابق جب فون پر مولانا کی شہادت کی اطلاع ملی تو ان کے سمجھ میں آیا کہ اباجان کو کس قسم کی "چادریں" درکار تھیں، ورنہ گھر سے نکلتے وقت اس کے بارے میں سوال کرنے پر مولانا نے صرف "سمجھا کرو" کہنے پر اکتفا کرلیا تھا اور جاتے ہوئے وہ اسی الجھن میں تھے کہ اس گرمی کے موسم میں اباجان کو کس قسم کی 'دو چادریں' درکار ہوں گی۔

مولانا شہیدؒ کا علمی مقام بھی ملک کے علمی حلقوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ ان کے علمی رسوخ کی گواہی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ مولانا محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے مایہ ناز تلامذہ میں سے تھے، تاہم مولانا نے اپنی بلند پایہ تصنیف نثر الازہار (شرح طحاوی شریف) کے ذریعے حضرت بنوری سے نسبت تلمذ کا حق بھی ادا کردیا

تھا۔ استاذ محترم مولانا محمد یاسین صاحب کی روایت کے مطابق مولانا فرمایا کرتے تھے: کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میری غذا بن چکی ہے، میں اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اتباع سنت کا جذبہ اس قدر تھا کہ اسی سال زندگی کے ۶۳ سال برس پورے ہونے پر فرمایا کہ مسنون عمر پوری ہوگئی اب مزید دنیا میں رہنا بے جمیتی ہوگی ۔ پھر اسی مسنون عمر میں شہادت سے سرفراز بھی ہوئے۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

محبوب نظر

مولانا کامران اجمل، کراچی

دنیا میں کسی انسان کی پیدائش سے پہلے ایسے لوگ بھی گزرے ہوتے ہیں جن کی محبت بن دیکھے دل میں پیوستہ ہوتی ہے، کچھ لوگ ایک ہی زمانہ میں موجود ہونے کے باوجود آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، کسی بھی وجہ سے آپ ان تک نہیں پہنچ پاتے لیکن ان کی محبت دل میں رچی بسی ہوتی ہے، ان کے تذکرے سن کر ان کے بارے میں معلومات پا کر آپ کی چاہت دیدبڑھتے چلی جاتی ہے لیکن آپ ان کی زیارت تب کرتے ہیں جب رب تعالیٰ کی مرضی ہو۔ کچھ نفوس سے محبت انہیں دیکھ کر، ان کی مجالس میں بیٹھ کر، ان کے عادات واطوار اچھی طرح ملاحظہ کر کے ہوتی ہے، کچھ لوگوں سے محبت ان کی گفتار سے ہوجایا کرتی ہے، شاعر نے کیا خوب کہا:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

کبھی کبھار دوسروں سے ان کے تذکرے سن کر ان کی محبت دل میں گھر کر جاتی ہے۔ تذکرے بسا اوقات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ تعریف کرنے والا کہیں یہ نہ کہہ بیٹھے جو غالب نے کہا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اور کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ مادح ممدوح کے بارے میں گویا یہ کہتا ہے:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرے محبوب نظر کو دیکھو

اسی طرح کا حال مولانا امین اورکزئی صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ حقیر کا تھا، درجہ رابعہ سے پہلے مولانا امین اورکزئی صاحب کو دیکھا نہیں تھا، لیکن اپنے بعض اساتذہ سے فدایانہ انداز سے ان کا تذکرہ، اور بعض طلبہ ساتھیوں سے سنے ہوئے ان کے واقعات نے ان کی محبت دل میں خوب پیدا کر دی تھی، لیکن ان کی سب سے پہلے زیارت درجہ رابعہ میں نصیب ہوئی، جب استاد محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ ہمیں درجہ رابعہ میں پڑھاتے تھے، اور مولانا محمود صندلی رحمہ اللہ (المعروف بہ صندل باباجی) تشریف لائے تھے اور ان کے ساتھ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ بھی تشریف لائے تھے، استاد محترم نے فرمایا: میری خواہش ہے کہ اپنے استاد سے درس گاہ میں آنے کی درخواست کروں اور شرح جامی کا سبق پڑھواؤں، لیکن شاید مصروفیات کی وجہ سے حضرت درس گاہ تشریف نہ لا سکے، لیکن جامعہ میں آنے کی وجہ سے ان کی بارہا زیارت نصیب ہوئی، البتہ ان کے پاس بیٹھنے، ان کے الفاظ کی شیرینی، ان کے اخلاق کی لطافت، ان کی ذرہ نوازی، ان کی دریادلی، ان کی متانت، ان کی فنائیت، ان کے اخلاق حسنہ سے واقفیت حاصل نہ کر سکے تھے، بس کم عقل شوقین کی طرح دیوانہ وار جا کر صرف مصافحہ پر اکتفا کر کے خوش ہو جاتے تھے۔

مولانا رحمہ اللہ کا تذکرہ اساتذہ سے بارہا سنا اور یہ بھی سنا کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے میرے دو بازو ہیں: ۱۔ مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ۔ ۲۔ مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ

عجیب قدرت کا نظام ہے کہ ان دونوں بازؤوں کو بہت ساری جگہوں میں یکجا، بہت سارے کاموں میں یکساں پایا، تصنیف وتالیف کی لائن ہو، تصوف وسلوک کا میدان ہو، اہتمام وانصرام کا کام ہو، یا اصلاح وتدریس کا دونوں بازو قریب قریب نظر آئے:

1۔ اہتمام کی ذمہ داری ہوتو دونوں حضرات ہی شہادت کے وقت منصب اہتمام پر فائز تھے۔

2۔ تصنیف وتالیف کو دیکھیں تو دونوں ہی بازوعلم حدیث کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔

3۔ دونوں حضرات کا کام پورا نہ ہو پایا بلکہ کام پورا ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

4۔ تصوف وسلوک کے میدان پر نظر دوڑائیں تو دونوں ہی بزرگ قادری سلسلے سے منسلک نظر آئیں گے۔

5۔ دونوں حضرات کا اصلاحی تعلق رائے پور کے اکابر سے رہا۔

6۔ دونوں ہی خلوت پسند تھے، ایک دارالتصنیف کے گوشے سے چپکے ہوئے تو دوسرے جامعہ یوسفیہ کے دارالمطالعہ سے چمٹے ہوئے۔

7۔ دنیا سے رخصتی کو دیکھیں تو دونوں ہی طبعی موت کے بجائے شہادت کے رتبے پر فائز۔

8۔ ایک بازو کو جامعہ بنوری ٹاؤن کے قریب گرنیڈ بم کے ذریعے شہید کیا گیا تو دوسرے کو بھی فضائی بم حملہ میں شہید کیا گیا۔

9۔ ایک بھی ظلما مارے گئے دوسرے بھی ظلما راستے سے ہٹائے گئے۔

10۔ مسند احمد کا نسخہ جو المکتب الاسلامی سے طبع شدہ ہے اس میں اطراف حدیث کے اعتبار سے فہارس موجود ہیں، لیکن صحابہ کرام کی ترتیب سے اس میں حدیث تلاش کرنے کے لئے فہارس موجود نہیں تھیں، جس کی وجہ سے حدیث کا باعتبار صحابی تلاش کرنا مشکل تھا، مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ اور مولانا امین اورکزئی رحمہ اللہ نے اس کی فہرست تیار کی جو جامعہ میں موجود ہے اور دونوں حضرات کا نام اس پر درج ہے۔

بندہ درجہ رابعہ کے بعد مولانا اورکزئی صاحبؒ کو دوبارہ نہ دیکھ پایا یہاں تک کے دورہ حدیث سے فراغت ہوئی اور خوش قسمتی سے ان کمالات وفیوضات کے متوالی شخصیت سے اللہ تبارک وتعالی نے ایک پھر ملاقات کروادی۔

خوب یاد ہے جب کوہاٹ تبلیغی مرکز کے گیٹ پر رات گیارہ بجے کے بعد بندہ اور برادر محترم مولانا یاسر عبداللہ صاحب پہنچے اور مرکز کا دروازہ بند ہو چکا تھا، ہنگو جانے والی کوئی گاڑی موجود نہیں، جاننے والا کوئی ایسا ساتھی نہیں جس سے رابطہ کرکے رات کو ٹھہریں، چارو ناچار کوہاٹ مرکز پہنچے اور دربان سے ذکر کیا کہ مولانا امین اورکزئی صاحب سے ملاقات کے لئے آئے ہیں، رات مرکز میں گزاریں گے صبح ان سے ملاقات کرنے جانا ہے، وہ سفید ریش بزرگ اپنے ساتھی کی طرف مشورہ کے لئے متوجہ ہوئے اور روانی کے ساتھ مولانا امین اورکزئی رحمہ اللہ کے بارے میں "مولانا صاحب" اس اپنائیت سے کہا جیسے کوہاٹ کے اس علاقے میں لفظ "مولانا" کا بس ایک ہی محمل مولانا امین اورکزئی صاحب ہی ہوں ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پر صادق ہی نہ آتا ہو۔

خیر ملاقات کے لئے صبح روانہ ہوئے اور ملاقات کے لئے در دولت پر حاضر ہوئے، مولانا کی شان کے کراچی سے آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا لیکن شاگرد آج بھی گرم جوشی سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں، علاقے میں شہرت ایسی کہ ہنگو سے میلوں دور کوہاٹ شہر میں بھی لوگ انہیں ایسے پہچانیں کہ راہ گزر کو ان کی راہ بتانے میں نہ چوکیں، اور ان کا ان دو مسکین طلبہ سے ملنا، ان کے لئے کمال توجہ، شاگردوں کے شاگردوں کے ساتھ اس معاملے کو دیکھ کر سوچ میں محو تھا کہ یارب جب ہم مسکینوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو علما کے ساتھ کیا رویہ ہوگا، پھر دنیوی حیثیت رکھنے والے دوسرے مہمانوں کو ان کی اجازت کے ساتھ چھوڑ کر فقط ان دو مہمانوں کی طرف توجہ کرنا ایک عجیب سا امر تھا جس پر حیرت زدہ بھی تھا اور شرمندہ بھی، کچھ لمحات گزارنے کے بعد جب واپسی ہونے لگی تو لجاجت کے ساتھ ٹھہرنے کی خواہش اس انداز سے کرنا جیسے اپنے شاگردوں کے شاگرد نہیں بلکہ اپنے کسی استاد سے کر رہے ہوں، جاتے جاتے ہدیہ کا دینا، اور روانگی کے وقت مشایعت کے لئے سنت نبوی کی اتباع میں مدرسہ کے دروازے تک جانا، اور پھر اپنے شفقت بھرے سینہ سے چمٹا کر روانہ کر دینا، وہ انمٹ نقوش تھے جو مرتے دم تک قلب سے مٹ نہیں سکیں گے، ان کے معانقے کی گرم جوشی، ان کے استقبال کا پرتپاک انداز، ان کی نگاہوں کی وہ معصومیت، ان کے اصرار سے چھلکتا خلوص، ان کی مشایعت میں اتباع سنت، ان کے روانہ کرتے وقت تدبیر امور وہ چیزیں تھیں جو بھلائے نہیں بھولتی، مٹائے نہیں مٹتی۔

ملاقات نہیں تھی گویا ایک حیران وششدرہ کر دینے والے چند لمحات تھے جو اس فرشتہ صفت انسان کے ساتھ بتانے مقدر تھے، جسے درجہ رابعہ میں نیم خوابی کی حالت میں دیکھا، جس کے تذکرے فدا ہو جانے والے شاگردوں سے سنے، اور سچ تو یہ ہے کہ جیسا سنا اس سے کئی گنا زیادہ پایا، انہیں جب اپنی نگاہوں سے دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے یہ تردد ہوا کہ اس دنیا میں اس جیسے اخلاق والے اشخاص کو ہم اپنی بیداری کی حالت میں دیکھ رہے ہیں یا یہ کوئی خواب ہے، جس سے ہمیں جلد بیدار ہونا ہے، یا یہ کوئی قصہ ہے جو مواعظ کی کسی کتاب میں مطالعہ کر رہے ہیں جس کے انتہا سے پہلے کوئی فرد آ کر اس دنیا سے علیحدہ کر دے گا، یا آخر تک پہنچ کر ہمیں احساس ہوگا کہ یہ کتابی دنیا ہے اصل دنیا یہ نہیں، بلکہ اوراق کی الٹ پھیر ہے، ماضی کے چند قصۂ پارینہ ہیں جنہیں ہم دانستہ سینہ کو تازہ کرنے کے لئے پڑھ رہے ہیں، کبھی ذہن میں آتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ عقیدت کے حسین پردے ہماری نگاہوں پر پڑ کر ہمیں مبالغہ میں مصروف کر رہے ہوں۔

لیکن یہ ایک حقیقت تھی جس کا انکار کرنا مشکل تھا، جسے نگاہوں نے دیکھا، حواس نے محسوس کیا، دل ودماغ نے محفوظ کیا، اور بالآخر قلب وجان نے قبول کیا، ان کی اس ایک ملاقات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جس مادی دنیا کے

ہم باسی ہیں، جسے فتنوں کی آماجگاہ ہم سمجھتے ہیں، جس کے ہر فرد کو مادی نظروں سے پرکھتے ہیں، یہ آج بھی رجال کار سے خالی نہیں بلکہ ابھی بہت سے لوگ ایسے بھی جی رہے ہیں جن کا جینا صرف سانس لینے کی حد تک نہیں، صرف گھاس پوس سے اپنا پیٹ بھرنے کی حد تک نہیں، بلکہ وہ خلق خدا کو نفع پہنچانے والے ہیں، یہ ہی نہیں بلکہ ان جیسے اور بہت سارے ہمارے اکابر ایسے اب بھی موجود ہیں جو مادیت کے جذبات سے بے نیاز، خلوص وللہیت سے بھر پور خلق خدا کو نفع پہنچانے میں مصروف ہیں، اور ہر وہ شخص جو ان کی صورت کو دیکھے ان کی سیرت کو پڑھے، ان کے اخلاق وعادات سے واقف ہو، ان کے قرب سے استفادہ کر سکے وہ اس مادی دور میں بھی ان صفات کا حامل ہو سکتا ہے جسے میڈیا کے اس دور میں عنقا، یا ڈائنا سور جیسا ناپید سمجھا جاتا ہے، شرط یہ ہے کہ کور چشم نہ ہو، یا نگاہوں پر عصبیت کے دبیز پردے نہ پڑے ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے موجودہ اکابر سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں اور جو دنیا سے جا چکے اللہ ان کی مغفرت فرمائے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق نصیب فرمائے۔

اخلاص کا پیکر

مفتی محمد اسماعیل طورو، راولپنڈی

حضرت مولانا مفتی امین شہیدؒ کی شخصیت اس وقت ہمارے ذہن میں موجود اور نقش تھی جب ۱۹۸۵ء میں ہم بنوری ٹاؤن میں پڑھتے تھے، اور ہمارے اساتذۂ کرام خصوصا مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ نہایت ہی شوق وذوق کے ساتھ ان کا نام نامی اور اسم گرامی لیتے، ان کی تعریف کرتے، مدح بیان فرماتے اور اس کے بعد حضرت مولانا فضل محمد صاحب یوسفزئی ان کا تذکرہ کرتے، ہم ہمیشہ سوچتے تھے کہ یہ کونسی شخصیت ہوگی؟ ان کی شخصیت اس وقت ہمارے دماغ میں اور بھی گہری ہوئی، جب ہم نے دیکھا کہ طحاوی شریف جو فقہ حنفی کی احادیث وآثار کے حوالہ سے ایک مستند، مدلل کتاب ہے انہوں نے اس کی شرح لکھی اور چار دانگ عالم میں وہ نہایت ہی مشہور ہوئی۔

اسی شرح کے نسخے پر حضرت نے میرا اور اپنا نام لکھ کر مجھے بطور تحفہ دی۔ اس کا ایک الگ قصہ ہے جو بیان کروں گا۔ ۱۹۹۱ء میں میری فراغت ہوئی اور اس کے چند سال بعد حضرت سے ملاقات ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں حضرت مولانا مفتی مختار الدین شاہ صاحب زید مجدہم کے پاس حاضر خدمت ہوا اور کہا کہ مولانا امین صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو میں بھی چلا جاؤں گا، لہٰذا حضرت مفتی صاحب بھی ساتھ ہوئے اور ہم حاضر خدمت ہو گئے۔ دعا سلام کے بعد جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو حضرت دوبارہ ملے اور بہت مسرت کا اظہار فرمایا۔ میری جو کتابیں چھپ چکی تھیں، خصوصاً الہدیٰ انٹرنیشنل پر بہت خوش ہوئے۔ فرمایا! کہ آپ نے سب سے پہلے ان لوگوں کا مقابلہ کیا ہے۔ پھر حضرت نے ایسی عظیم الشان دعوت کی کہ میں نے اپنے زندگی میں ایسی دعوت نہیں دیکھی تھی۔ جیسا کہ پٹھانوں کا مقولہ ہے: سب کچھ تھا لیکن چڑیا کا دودھ نہیں تھا۔ اس سے آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کتنی بڑی دعوت تھی۔ اگر آپ ہزار چیزوں کا نام لیں تو وہ چیزیں موجود تھیں۔ ہم دسترخوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اور قسم قسم کے کھانے آ رہے تھے اور جب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو پھر بھی کھانا آ رہا تھا۔

پھر حضرت نے اپنی کتابیں مجھے دیں وہ کتابیں جن میں حضرت نے غلطیوں کی تصحیح کی تھی۔ یعنی طحاوی شریف میں جو حاشیہ لگا ہوا تھا کہ یہ غلطیاں ٹھیک کرنی تھیں وہ کتاب دی۔ بہر حال حضرت پورے علاقہ میں مہمان نواز مشہور تھے، اللہ تعالیٰ نے صرف کوہاٹ، ہنگو یا پاکستان میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں عزت عطا فرمائی تھی۔ کیوں؟ درس وتدریس کی وجہ سے۔ میرے والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اصل عالم وہ ہے جو مدرس ہو، اگر وہ تدریس نہ کرے تو علم دس سال بعد بھول جائے گا۔ حضرت بہترین مدرس، مفسر، محدث اور جرح وتعدیل میں خاص مقام رکھتے تھے۔ حضرت تشریف لے گئے۔ ع

مضت الدهور وما اتين بمثله

ولقد اتي [ ] فعجزنا عن نظرائه

حضرت کے بعد ان کے شاگرد، ان کا نظریہ اور ان کی کتب جو ان کا علمی سرمایہ ہے، وہ باقی ہیں۔ اگر عالم عالم ہو یعنی باعمل اور مدرس۔ تو وہ مرتا نہیں، ہمیشہ دلوں میں زندہ وتابندہ رہتا ہے۔ چاہے اس کی قبر معلوم نہ ہو لیکن اس کی علم کی روشنی زندہ وتابندہ رہتی ہے۔ ع

و ليس على الله بمستنكر

على ان يجمع العالم في واحد

حضرت اسی شعر کے مصداق تھے اور اس صف کے آدمی تھے جس صف اور مجمع کے بارے میں شاعر یہ کہتا ہے۔

اولئک اٰبائی فجئنی بمثلھم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

حضرت کی شخصیت متفق علیہ تھی، جتنے بھی علماء حق، علماء دیوبند کی جماعتیں ہیں۔ حضرت کو اپنا سرپرست شمار کرتی تھیں اور حضرت سے دعائیں لیتی تھیں۔

آپ کی شہادت ظلماً ہوئی، اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ حضرت علی حیدر کرار اہل بیت کے سردار فرماتے ہیں:

الملک یبقی بالکفر ولا یبقی بالظلم۔

ایک ملک کفر پر تو زندہ رہ سکتا ہے، لیکن اگر اس میں ظلم ہو تو وہ قائم اور دائم نہیں رہ سکتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ ہم سب کو ظلم سے محفوظ فرمائے اور اللہ تعالیٰ پاکستان کو جس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ 'پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'۔ اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہماری اس ایٹمی قوت کی حفاظت فرمائے اور اس کے خلاف جتنی اندرونی و بیرونی سازشیں ہو رہی ہیں اللہ ان کو ناکام بنادے۔ آمین

علم و تحقیق کی تابندہ روایت

مولانا محمد رفیق، کوہاٹ

جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ عزیزم مولوی محمد طفیل سلمہ حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی حیات و خدمات جلیلہ پر ''المظاہر'' کا خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں، اسی وقت سے دل میں بہت بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں اور دل سے موصوف کے لئے اور ان کے محنت کش معاونین کے لئے دعائیں نکل رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی کوششوں کو قبول فرمائے اور مزید علمی اور عملی ترقی عطا فرمائے اور اللہ کریم مزید ہمت عطا فرمائے کہ حضرت اقدس امین الامۃ والدین جیسی عظیم شخصیت کی خدمات اور کارنامے پوری امت کے سامنے آئیں اور خصوصاً علمائے کرام ان کی علمی اور عملی محنت وجدوجہد سے آگاہی حاصل کر کے ان کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

یوں تو کوہاٹ اور ہنگو کی سرزمین پر بہت سے نامور علما ہو گزرے ہیں لیکن حضرت کی شخصیت کچھ عجیب وغریب اور آپ کی علمی ذوق والی زندگی ایسی تھی کہ آپ کے تمام شاگرد اپنے دوست واحباب کو اپنے استاذ کی ملاقات اور ان سے استفادہ کرنے کی پر اصرار ترغیب دیتے کیونکہ انہوں نے اپنے استاذ میں بہت کچھ علمی اور عملی کمالات دیکھے ہوتے۔ مجھے بھی ایسے دوست واحباب سے واسطہ پڑا اور ان ہی احباب کی دوستی ہی حضرت اقدس کی ملاقات کا ذریعہ بنی۔ میرے ایک دوست مفتی شمس الہادی کی محنت وکوشش سے حضرت کے ساتھ گہرا تعلق قائم ہوا یہاں تک کہ حضرت نے دلائل الخیرات کے وظیفے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس ملاقات میں جو بات خصوصیت سے سامنے آئی وہ حضرت کی عاجزی وانکساری تھی کہ اس موقع پر حضرت سے دلائل الخیرات کا وظیفہ لینا تھا تو ہماری نظروں میں حضرت کی قدر اور احترام بے انتہا درجے کا تھا اور دل کرتا تھا کہ ہم زمین پر بیٹھ کر حضرت سے یہ اجازت لیں لیکن حضرت نے عجیب معاملہ فرمایا، ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی کے سرہانے کی طرف بیٹھا دیا اور خود چارپائی کے پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور حضرت نے معمر ہونے کے باوجود اپنے گھر سے خود کھانا لایا۔ اللہ کریم ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت اقدس سے ایک اور ملاقات اس وقت ہوئی جب مفتی معین الدین رحمہ اللہ مجھے اور مولوی مختیار حسین بٹ خیلوی کو اپنے ساتھ بطور معاونین حضرت کے مدرسہ میں لے گئے کہ وہاں بہت بڑا کتب خانہ ہے اور میں نے ایک ضروری مسئلہ کی تحقیق کرنی ہے، آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔ مدرسہ یوسفیہ پہنچے تو ایک عجیب منظر یہ دیکھا کہ مدارس میں سالانہ تعطیلات کے باوجود حضرت مسجد کے صحن میں ایک طالب علم کو شرح النقایہ پڑھا رہے تھے۔ طالب علم کو دیوار کی طرف بیٹھا کر خود ان کے سامنے بیٹھے تھے اور جس طرف سے راستہ تھا ادھر کو پیٹھ کی ہوئی تھی کہ آنے والوں کی وجہ سے سبق میں حرج نہ ہو۔ سبق سے فراغت پر دفتر کے سامنے تشریف لائے، ملاقات ہوئی، مفتی صاحب نے بے تکلفانہ انداز میں کہا کہ مہمانوں کی طرف پیٹھ کی ہوئی تھی؟ تو فرمایا: ایسا نہ کروں تو کوئی پڑھانے نہیں دیتا۔

سالانہ تعطیلات اور سبق، پھر ایک طالب علم کو شرح النقایہ پڑھانا اور اس اہتمام سے کہ سبق کے درمیان کوئی آ بھی جائے تو سبق کا حرج نہ ہو، یہ حضرت کی وہ نمایاں خصوصیات تھیں جنہوں نے طلبا کو اتنا متوجہ کیا ہوا تھا کہ افریقہ سے طلبا آپ کے پاس تخصص فی الحدیث کے لئے آتے اور استفادہ کرتے۔ ایسا ہی ایک طالب علم میں نے خود دیکھا اس نے بتایا کہ بنوری ٹاؤن سے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔

دوسری بات اس ملاقات میں یہ سامنے آئی کہ جب حضرت نے اجازت دی کہ دونوں کتب خانوں میں جا سکتے ہو، آپ مطالعہ کرو، میں تمہاری خدمت کروں گا اور جب کتب خانہ میں گئے تو جو کتاب بھی کھولتے اس میں حضرت کا

کسی نہ کسی درجے میں کوئی کام ہو چکا ہوتا جس سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت نے اس پورے کتب خانہ کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ میں درجہ خامسہ دارالعلوم سراج العلوم کاہی میں پڑھ رہا تھا کہ مدرسہ میں کوہاٹ اور ہنگو کے نامور علما جمع ہوئے اور سننے میں آیا کہ افغانستان سے امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد رحمہ اللہ نے پاکستان کے ارباب مدارس سے تعاون کی اپیل کی ہے اور آج کے دن علما کا جمع ہونا اس سلسلہ میں ہے۔ وہاں مولانا محمد امین صاحبؒ بھی تشریف لائے۔ ہم طالب علم تھے خود حضرت کا مؤقف نہیں سن سکے لیکن طلبا سے سنا کہ حضرت اب تک طالبان حکومت کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں، کیونکہ طالبان نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے لیکن اب چونکہ افغانستان کے اکثر علاقے اور خصوصاً کابل پر طالبان کی حکومت آگئی ہے لہٰذا اب وہ بات نہیں رہی تو حضرت بھی اجلاس میں شریک ہوئے ہیں، یہ تو طلبا سے سنی ہوئی بات تھی لیکن اس بات سے اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت کسی بھی مسئلہ میں بغیر تحقیق کے کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔ پھر جب دارالعلوم کراچی میں دورۂ حدیث پڑھنے گئے تو وہاں بھی کابل کی فتح تک حضرت کا یہی مؤقف سننے کو ملا۔

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ ویسے تو ہر میدان کے شہسوار تھے لیکن ردِ بدعات اور اشاعت سنت اور تصنیف و تالیف آپ کا بہت ہی نمایاں میدان جہد و عمل تھا۔ ایک مرتبہ چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر طحاوی شریف کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ حضرت کی نثر الازہار کی قدر و قیمت کا اندازہ یوں ہوا کہ جہاں امام طحاوی اپنی وجہ النظر کو احناف کے مسلک کے خلاف پیش کرتے تو ہم یہ سمجھتے کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا لیکن اسی مقام پر جب نثر الازہار دیکھتے تو اندازہ ہوتا کہ احناف کے پاس تو دلائل کے انبار ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں۔ کاش! حضرت کی یہ علمی تحقیق مکمل ہو کر اُمت کے سامنے آجائے اور اُمت کے علما و عوام اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

ایک اور موقع پر مجھے اپنے دوستوں نے کہا کہ حضرت الاستاذ مشکوٰۃ شریف کے حاشیۂ مولانا نصیر الدین غورغشتوی پر کام کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو چند معاونین کی ضرورت ہے۔ ہم نے حضرت سے آپ کی بات کی ہے اور آپ کے اعذار کا حل بھی لے کر آئے ہیں کہ استاذ صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ تعطیلات میں اپنے دورۂ صرف ونحو کے طلبا کو بھی یہاں لے آؤ اور یہاں حاشیۂ مشکوٰۃ پر کام بھی کرو۔ میں نے اپنی علمی کم مائیگی پیش کی کہ یہ بہت اہم کام ہے، ہم سے کہاں ہوسکتا ہے لیکن اس عذر سے زیادہ یہ میری بدقسمتی تھی کہ استاذ صاحبؒ کی صحبت سے محروم رہا، اس واقعہ سے حضرت کے علمی ذوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمام طلبا کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام بھی کرنے کے لئے تیار تھے لیکن خواہش تھی کہ کسی طرح کام ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ حضرت کو جزائے خیر عطا فرمائے، حضرت اس طرح کی دعوتیں دے کر ہم جیسے کم علموں کو علمی تحقیق کی

راہ دکھانا چاہتے تھے، کاش! اس بات کو ہم بروقت سمجھتے۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

یکتائے زمانہ

مفتی محمد یوسف، ٹانک

۲۰۰۹ء کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس گناہگار کو اپنے دربار میں بلایا یعنی میرا حج فارم منظور ہوا اس وقت کسی کتاب میں میری نظر سے یہ مضمون گزرا تھا کہ اس مبارک سفر میں جانے سے پہلے اکابر سے ملاقاتیں کرنی چاہئیں، ان کے مفید مشورے اور دعائیں معاون ثابت ہوتی ہیں، اُن دنوں میرے محسن اور کرم فرما مولانا محمد ہاشم صاحب گلیشائی نے مجھے کہا کہ میرا اپنے استاذ محترم مولانا محمد امین صاحبؒ سے ملاقات کرنے کے واسطے ہنگو جانے کا ارادہ ہے، اس نے جب اپنے ارادے کا اظہار کیا تو میں نے فوراً اس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی اور یہ اس کا احسان تھا کہ اس نے مجھے بتایا، ہم فوراً تیار ہوئے اور ہنگو شاہوwام پہنچ گئے۔

بندہ کی امین القوم مولانا محمد امین صاحب شہیدؒ کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی ،ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر پہلی ہی نظر نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا، ایسا مہمان نواز میں نے کسی اور کونہیں دیکھا ،دوران ملاقات ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔مولانا محمد ہاشم نے میرے بارے میں استاذ جی کو یہ بتایا کہ اس سال یہ ساتھی حج پر جارہا ہے کچھ مشورے اور دعائیں لینے کے لئے حاضر ہوا ہے۔

اس وقت انہوں کئی قیمتی نصائح فرمائیں جن میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ ایام حج میں ایک دن پہلے اگلے دن کے اعمال کا مذاکرہ ہونا چاہیے پھر آئندہ کل ادائیگی میں آسانی ہوگی۔

حضرت سے ایک سوال میں نے یہ کیا کہ حضرت' تاریخ المکۃ المکرمہ' نامی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے:''رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ستر قبریں ہیں اور حطیم کے اندر میزاب کعبہ کے نیچے سیدنا اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ سیدہ ہاجرہ کی قبریں ہیں ،اس طرح ایک روایت کے مطابق رکن یمانی اور مقام ابراہیم کے درمیان ۹۹ انبیا کی قبریں ہیں۔(ص:۶۲)

اس طرح میں نے یہ بھی عرض کیا کہ مرقاۃ شرح مشکاۃ میں بھی یہ مضمون اسی طرح ہے،اب پوچھنا یہ ہے کہ مسجد کے اندر قبریں کیسے بنائی گئیں پھر اتنی تعداد اس چھوٹی سی جگہ میں کیسے آئی ،تو استاذ جی نے لمبے چوڑے جواب دینے کی بجائے دریا کو کوزے میں بند کر کے فرمایا: یہ کسی مستند روایت سے ثابت نہیں سب اسرائیلیات ہیں۔

اس طرح علوم کی نہریں جاری دیکھ کر میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی کتاب میں حضرت الاستاذ سے پڑھوں گا لیکن'' تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ'' مجھے معلوم نہیں تھا کہ حضرت سے یہ صرف پہلی نہیں بلکہ آخری ملاقات بھی یہی ہے،رات کو جب میری آنکھیں کھلیں تو حضرت کو مسجد میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔

صبح کو پھر پر تکلف ناشتہ کھلایا پھر جانے کے وقت مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہم جیسے طلبہ کے ساتھ سڑک تک پیدل گئے،رخصت کرتے وقت باصرار ہاتھ میں کچھ تھما دیا جب دیکھا تو اپنے گھر تک کا کرایہ بھی نقد دیا تھا۔

دوران ملاقات ایک بات یہ ہوئی کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت اگر'نثر الازھار'مکمل ہوجائے تو بہتر ہوگا ،استاذ جی نے جواب میں فرمایا: ہمارا علاقہ پسماندہ ہے،کام کرنے والے لوگ مل نہیں رہے ،اکیلا کام کرنا مشکل ہوتا ہے،ایسے کاموں میں معاون کی ضرورت ہوتی ہے۔حضرت بنوریؒ جب معارف السنن لکھتے تھے تو میں اور حبیب اللہ مختارؒ حضرت کے معاون تھے،حضرت بنوریؒ ہمارے متعلق فرماتے تھے کہ یہ میرے یمین اور یسار یعنی دایاں اور بایاں ہاتھ ہیں۔وجہ یہ تھی کہ حضرت کے آنے سے پہلے متعلقہ باب کے سب حوالے ہم نکالتے اور حضرت کے سامنے رکھ دیتے ،حضرت جب تشریف لاتے تو صرف ترتیب دیتے اور عبارت خود لکھتے۔

حضرت کی علمی گفتگو سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت بنوریؒ رجال ساز آدمی تھے، کیسے رجال کاران کی مجلس سے اُٹھے ہیں اور دنیا جہاں کے مختلف گوشوں کو ان کے فیض سے منور فرما رہے ہیں۔ حضرت کے اندر ایک خاص اور ممتاز وصف اس حقیر نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کتابوں کے صرف قاری نہیں تھے بلکہ کتاب سے عشق کا تعلق تھا، جامعہ یوسفیہ کا کتب خانہ اس پر شاہد ہے۔ کوئی اہم کتاب ایسی نہ ہوگی کہ حضرت کے کتب خانہ میں موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان حضرات کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

محقق، محدث اور زہد وتقوی کے پیکر مجسم

مولانا اسد اللہ خان، پشاور

۲۰۰۳ء میں مدرسہ عربیہ تبلیغی مرکز رائے ونڈ لاہور میں میرے مشکوٰۃ کا سال تھا کہ مجھے تخصص فی الحدیث کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی، امام ابوحنیفہؒ کی اسانید کے بارے میں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوا، اس بارے میں مولانا ساجد احمد صدوی صاحب کو (جو اس وقت جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں تخصص فی الحدیث کر رہے تھے) خط لکھا، انہوں نے اس بارے میں جواب لکھنے کے بجائے مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ کی کتاب ''مسانید الامام ابی حنیفہ وعدد مروياته'' سے متعلقہ بحث کے صفحوں کا فوٹو اسٹیٹ کرا کر بھیجا، اپنے سوال کے جواب پر خوشی سے زیادہ اس پر حیرت ہوئی کہ اس موضوع پر اتنی خوبصورت کتاب موجود ہے، کتاب اور صاحب

کتاب کا یہ اولین نقش تھا جو ذہن میں بیٹھا۔

اس کے بعد مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی کتاب ''شخصیات وتاثرات'' کا مطالعہ کیا، حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ کے حالات میں مصنف نے حضرت بنوریؒ کے زندگی کے دو اہم کارناموں کا ذکر کیا ہے، ایک ''سنن ترمذی'' سے متعلق ''مافی الباب'' کی احادیث کی تخریج اور دوسرا امام طحاویؒ کی مایہ ناز کتاب ''شرح معانی الآثار'' پر کام کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت بنوریؒ نے ان دونوں تحقیقی کاموں کا ابتدائی ڈھانچہ وخاکہ تیار کرنے کے بعد اول الذکر کے لئے مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ اور ثانی الذکر کے لئے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ اس بات نے ان دونوں شخصیات کا دل میں بہت اثر ڈالا تھا۔

پھر اللہ کے فضل وکرم سے وہ دن بھی نصیب ہوئے جب جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاون کے پرنور فضاؤں میں ان مبارک ہستیوں کے ان تمام علمی کام اور تاریخی زندگی کے حیرت انگیز پہلوؤں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاون کراچی میں 'مجلس دعوت وتحقیق اسلامی' جیسے نادر اور علمی مکتبہ میں چار سال مطالعہ وتحقیق کرنے کا موقع ملا، اس مکتبہ میں مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ کی کئی باقیات تھیں۔ یہاں کی کتابوں پر متعدد شخصیات کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں، حضرت بنوریؒ، مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ اور مولانا محمد امین اورکزئیؒ سب کے سب نہایت خوش نویس تھے، کتابوں پر ان کے نوٹ ان کی شخصیات کی طرح مزین اور آئینہ دار تھے۔ خاص طور پر ''تاریخ بغداد'' کے نسخہ پر مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ کے بہت نوٹ تھے۔

تخصص فی الحدیث اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاون سے وابستگی کے بعد ان دونوں سے وابستہ شخصیات سے دل ودماغ میں ایک خاص تعلق خود بخود پیدا ہو گیا تھا، مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ سے پیدا ہونے والا تعلق کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اس تعلق اور عقیدت کے باوجود ان سے براہ راست ملاقات واستفادہ نہیں کر سکا، کیونکہ موصوف نے عرصہ سے ہنگو میں اپنا مدرسہ بنایا تھا اور اپنی تمام تر توجہ وہاں کے علمی اور عملی مسائل کی طرف مرکوز فرمائی تھی، ہماری طالب علمی کے دوران ان کا کبھی کراچی آنا نہیں ہوا، کچھ موصوف کی عمر بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ البتہ اتنا تھا کہ چونکہ میرا اٹھنا بیٹھنا حضرت مولانا ساجد صدوی صاحب حفظہ اللہ تعالی کے ساتھ تھا، تو مولانا محمد امین اورکزئی صاحب کی زندگی کی تازہ ترین صورت حال سے واقفیت ملتی تھی، ہمارے استاذ محترم مولانا محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہ العالی بھی ان کے بارے میں مولانا ساجد صدوی صاحب سے صورت احوال پوچھتے تھے۔ اس موقع پر ہمارے استاذ محترم اکثر یہ فرماتے تھے کہ ''افسوس حضرت بنوریؒ کے جاری کردہ تین عظیم تصنیفی خدمات میں سے ایک بھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا، معارف السنن، کشف النقاب اور نثر الازہار کوئی بھی مکمل نہیں ہوا۔ حضرت مولانا

بنوریؒ کو چاہیے تھا کہ ایک کام آخر تک مکمل فرماتے اور ان حضرات کو بھی اپنے ساتھ ملا کر مکمل فرماتے''۔

مولانا محمد امین صاحبؒ کے ساتھ ایک یادگار ملاقات کی روداد

پھر اللہ تعالیٰ نے فضل وکرم فرمایا اور موصوف کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا، جس کی تفصیلی روداد بندہ نے اپنی ڈائری میں لکھی ہے، جو درج ذیل ہے:

''پیر کے دن ۱۲ مئی ۲۰۰۹ء کو جناب مولانا اسامہ صاحب (حال طالب علم ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ) اور مولانا احسن احمد صاحب (بہاولپور) کے ساتھ شیخ العلامہ المحدث الفقیہ النظار مولانا محمد امین اورکزئی مدظلہ العالی کے پاس ہنگو جانے کا موقع ملا، بہت عرصہ سے بندہ کا ارادہ تھا، البتہ آج جب اچانک ہی یہ پروگرام بنا تو دل خوشی سے بے تاب ہوا، اور منزل مقصود کی طرف دوپہر ۱۲ بجے روانہ ہوئے۔ جناب اسامہ صاحب نہایت قیمتی اور ذوقی شخصیت کے مالک ہیں، وہ پاکستانی ہے لیکن مستقل طور پر جدہ میں رہتے ہیں، ایک سال قبل انہوں نے ''جامعہ فاروقیہ کراچی'' سے دورہ حدیث کیا ہے، اور اب چھٹیوں میں پاکستان آئے ہوئے ہیں، وہ دو مہینوں سے مولانا محمد امین اورکزئی صاحب سے اخذ واستفادہ کی خاطر یہاں تشریف لائے تھے، انہوں نے ان سے اصول حدیث، جرح وتعدیل کے حوالے سے بہت استفادہ کیا، آج اسامہ صاحب ان سے آخری ملاقات کے لئے جانا چاہ رہے تھے، تو پہلے احسن صاحب اور پھر بندہ بھی ساتھ ہوا۔ عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے منزل مقصود جا پہنچے۔ مولانا محمد امین اورکزئی صاحب سے طویل تین ملاقاتیں ہوئیں، جن میں ان سے کئی امور پر تبادلہ خیال اور استفادہ کا موقع ملا۔ آپ کی عمر کافی ہے تاہم اب بھی چست اور صحت مند ہیں۔ عاجزی اور تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ان سے ملاقات کے وقت دیگر صفات کی بنسبت یہ صفت زیادہ محسوس کی تھی، جو ان کے علوِ مرتبت کی دلیل تھی۔ تاہم ایسے موقعوں پر ہم جیسے نہایت چھوٹوں کے لئے کافی سبکی کا منظر ہوتا ہے اور نہایت شرم آتی ہے کہ اتنے بڑے بزرگ ہمارے سامنے تواضع کر رہے ہیں، ایسے موقع پر بندہ کا دل چاہتا ہے کہ وہ بلا تکلف اپنے علوم وافکار سے مستفید فرمائیں۔

ہم رات کو بھی وہیں رہے، اگلے دن صبح کو دس بجے کے قریب وہاں سے روانہ ہوئے، مولانا محمد امین صاحب نے ہمیں منظورِ نظر رکھا، ہمارا خیال کیا، اور آخر میں بندہ نے شدید اصرار کیا تو ''حزب البحر'' اور ''الحزب الاعظم'' کی اجازت دی اور فرمایا کہ: ''مولانا یوسف بنوریؒ نے مجھے خاص اجازت دی تھی اور ان الفاظ کے ساتھ دی تھی: ''اجزتکما واجزت من اجزتما'' اور اس مجلس میں میرے ساتھ مولانا حبیب اللہ مختار صاحب بھی تھے''۔

اجازت حدیث کے بارے میں آپ نہایت سخت ہیں، آپ کسی کو اجازت نہیں دیتے، اور اس کی وجہ بھی زیادہ تر تواضع ہے، بندہ کو جناب اسامہ صاحب نے پیشگی بتایا تھا کہ اس کی آپ کوشش نہ کریں کیونکہ مولانا کسی کو اجازت نہیں دیتے۔ لیکن میں نے طے کیا تھا کہ ان سے ضرور اجازت حدیث لوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ جی بندہ کا اسانید واجازات کے ساتھ خاص تعلق رہا ہے، بندہ اس وقت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب ''ذکر اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث'' پر تحقیق کر رہا تھا، تو اس فن کی اکثر کتابیں نظر سے گذری تھیں، اس لئے مجھے کافی شوق ہو رہا ہے کہ آپ سے اجازت حدیث لوں۔ لیکن آپ نے عاجزی کی داستان ایک خاص انداز سے شروع کی اور فرمایا کہ:
''اصل میں حدیث کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور اس کے لئے پاک نسبت ہونی چاہیے، جبکہ میرے اندر ظلمتیں ہیں۔ اس لئے میں پرہیز کرتا ہوں کہیں حدیث رسول کی بے ادبی نہ ہو جائے''۔ اور فرمایا: ''اس لئے جس کو بھی اجازت حدیث دیتا ہوں تو کئی ہفتوں تک تکلیف ہوتی ہے، بنوری ٹاون کراچی میں ڈاکٹر بشار عواد نے زبردستی اجازت حدیث لی تھی تو کئی ہفتوں تک تکلیف تھی۔

پھر میں نے تیسری مرتبہ عرض کیا کہ دراصل بندہ چاہتا ہے کہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نسبت حاصل کروں، اور اس کے لئے آپ مجھے سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، اس لئے کہ علم حدیث کے ساتھ من حیث الفن ان کا جو لگاؤ تھا، ان کے بعد ان کے تلامذہ میں آپ سے زیادہ آج اس فن میں ماہر کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ان کی نسبت کے حصول میں اس نکتے کا بھی لحاظ ہو جائے گا۔

جب آپ نے میرا اس قدر اصرار دیکھا تو فرمایا کہ: زبانی اجازت حدیث تو میں دیتا ہوں البتہ لکھ کر نہیں دیتا، تو میں نے عرض کیا کہ جی میرے لئے یہ بھی سعادت ہے، لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں۔ درمیان میں انہوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کہاں سے فارغ ہے؟ تو بندہ نے بتایا کہ مدرسہ عربیہ رائے ونڈ سے، تو آپ نے سر ہلایا کہ ٹھیک ہے۔

مولانا محمد امین صاحب نے اپنی تصانیف بھی ہمیں ہدیہ کیں: (۱) مسانید الامام ابی حنیفہ وعدد مرویاتہ (۲) نثر الازہار دو جلدیں۔ مسانید پر یہ عبارت لکھی: ''ہدیہ مودت از فقیر محمد امین عفا اللہ تعالی عنہ برائے برادرم مکرم جناب مولانا اسداللہ صاحب زیدت محاسنہم'' (بحوالہ ذاتی ڈائری ۲۰۰۹ء، اسداللہ خان)

مولانا سجاد حجابی صاحب سلمہ تعالی (مردان) کو مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب ''السعی المشکور'' چاہیے تھی، جو نایاب ہے اور کہیں نہیں مل رہی تھی، جو مولانا محمد امین صاحبؒ کے مکتبہ میں تھی، مولانا امین صاحبؒ نے مجھے دیدی اور فرمایا کہ فوٹو اسٹیٹ کرا کر مجھے پہنچا دو، پشاور میں تم مولانا سعید اللہ شاہ صاحب کے حوالے کر دو۔ نیز مولانا امین صاحبؒ کے پاس ملا علی قاریؒ کی ''حصن حصین'' کی شرح ''الحرز الثمین'' کا نایاب مطبوعہ نسخہ تھا، مجھے مولانا نے وہ

نسخہ دیا کہ پشاور میں کسی اچھے جلد ساز سے جلد کروالیں، بندہ نے اس کو چمڑے کی خوبصورت جلد کروادی۔

بندہ ان دنوں اپنی کتاب ''قبر پر سورۃ بقرہ اول وآخر کی تلاوت ،ایک تحقیقی جائزہ'' پر کام کررہا تھا، کتاب کا مسودہ ساتھ لے کر گیا تھا، اس کتاب کے مختلف عنوانات پر حضرتؒ کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی۔ ملا علی قاریؒ کے ایک حوالے سے متعلق مجھے اشکال تھا، میں نے حضرتؒ سے اس بارے میں پوچھا،تو حضرت نے بہت غور سے وہ مقام مطالعہ کیا اور پھر اس اشکال کا حل بیان فرمایا۔ بعد میں بندہ کی یہ کتاب چھپ گئی، بندہ اس مقام پر اس کا ذکر کیا ہے۔(ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ نمبر ۴۸ طبع دوم)

اس واقعہ سے مجھے بہت بڑا سبق ملا کہ متقدمین علما کی عبارتوں کے لئے حل کی صورت نکالنی چاہیے نہ کہ جلدی اس پر رد کیا جائے۔

مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ کا مکتبہ نہایت علمی وتحقیقی کتابوں اور مصادر ومراجع کا خزانہ تھا، رات دیر تک مطالعہ کا موقع ملتا تھا۔اب یہ علمی محفلیں سونی ہیں،ان کو آباد رکھنے والے ہمارے اکابر ایک ایک کر کے دنیا سے کوچ کر رہے ہیں۔حضرت مولانا امین صاحبؒ جیسے نایاب ہیرے تو ڈھونڈے نہیں ملتے،اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے،اوران کے اس مبارک تذکرے کو اہل علم وطلبہ علم دین کے لیے مشعل راہ بنائے۔آمین

ہوتا ہے کوہ ودشت میں پیدا کبھی کبھی!!!

مولانا یاسر عبداللہ کراچی

چوتھی صدی کے نامور لغوی،ادیب اور مورخ علامہ ابوطیب عبدالواحد بن علی رحمہ اللہ (۳۵۱ھ) نے علمائے نحو کے طبقات میں "مراتب النحویین" کے نام سے ''بقامت کہتر وبقیمت بہتر'' کی مصداق ایک کتاب ترتیب دی ہے،موصوف اپنی اس تصنیف لطیف میں ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ (۲۹۶ھ) کے تذکرہ میں کسی شخصیت کے علمی قد کاٹھ کا اندازہ لگانے کے لیے ایک زریں اصول رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انما شهرة العالم بمصنفاته والرواية عنه۔"(ص: ۱۰۱، المکتبۃ العصریۃ بیروت ۱۴۲۳ھ)

یعنی ''کسی عالم کی شہرت کی کسوٹی ان کی تصانیف اوران کے تلامذہ ہوا کرتے ہیں''۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی حیات مستعار کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے تو "معارف السنن شرح سنن الترمذی"، "بغیة الاریب فی مسئلة القبلة والمحاریب"، "یتیمة البیان فی شئی من علوم القرآن"، نفحة العنبر فی حیاة الشیخ الانور"، القصائد البنوریة"، اور ''بصائر وعبر'' جیسی علمی وتصنیفی کاوشوں اور دسیوں علمی مقالات ومقدمات کے پہلو بہ پہلو، مفتی احمد الرحمن، مولانا حبیب اللہ مختار، مولانا بدیع الزمان، اور مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر جیسے سینکڑوں ستارے ان کے افق علم پر چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ بھی حضرت بنوری رحمہ اللہ کے سلسلہ علمیہ کے اسی دوسرے طبقے کے ایک فرد اور ان کے خاص تربیت یافتہ شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، وہ اپنی تحقیقی کاوشوں کی بنا پر بجا طور حضرت بنوری کے علمی وارث اور حضرت کے عاشق زار تھے، حضرت سے ان کی جو والہانہ شیفتگی اور محبت والفت کا تعلق تھا، اس کا اندازہ ماہنامہ ''بینات'' کے ''محدث العصر نمبر'' میں شامل ان کے تاثراتی مضمون سے ہوتا ہے، جس میں انہوں نے منفرد اسلوب میں اپنے محبوب شیخ کی شخصیت وکردار اور علمی پائے کا بیان کیا ہے، یہی تحریر حضرت شہید رحمہ اللہ سے پہلے تعارف کا ذریعہ بنی، پھر جامعہ کے سائے تلے آنے کے بعد وقتاً فوقتاً جامعہ کے اساتذہ خصوصاً استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ اور مولانا امداد اللہ مدظلہ سے ان کی بہت سی باتیں سننے کو ملیں، لیکن رسمی طالب علمی کے دوران دورہ حدیث (۱۴۲۸ھ بمطابق ۲۰۰۷ء) کے بعد تک زیارت وملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا تھا، پھر جو ایک ہی ملاقات ہوئی تو اس نے دل پر ان کی عظمت کے ان مٹ نقوش ثبت کردیئے، اور یہی نقش اول، نقش آخر ثابت ہوا۔

ایک یادگار سفر اور اکابر علما ومشائخ کی زیارت

ہمارے دورہ حدیث کے سالانہ امتحان کے بعد ''دورہ تدریبیہ'' سے قبل بعض وجوہ کی بنا پر جامعہ میں خلاف معمول دس روزہ تعطیلات کا اعلان ہوا تو بندہ اور صدیق حمیم مولانا کامران اجمل (استاذ جامعہ) نے ملک کے اکابر اہل علم کی زیارت وملاقات کا پروگرام بنایا، چنانچہ اس سفر میں سب سے پہلے لاہور میں حضرت سید نفیس الحسینی رحمہ اللہ کی زیارت ہوئی، جو ان دنوں علیل تھے اور کچھ عرصہ بعد ہی شعبان میں انتقال فرماگئے، بعد ازاں ضلع مانسہرہ میں ''اوگی'' نامی گاؤں میں حضرت مولانا جلال خالق رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو غالباً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے فاضل، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے شاگرد اور ہمارے استاذ محترم مولانا فضل محمد مدظلہ کے استاذ تھے،

اور ان کے دادا مولانا فضل خالق رحمہ اللہ، حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے تھے، مولانا جلال خالق رحمہ اللہ کو اپنے دادا سے بھی اجازت حاصل تھی، یوں ان کے اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے درمیان محض ایک واسطہ ہونے کی بنا ان کی سند حدیث عالی تھی، زیارت وملاقات کے ساتھ ان سے اجازت حدیث حاصل ہوئی، والحمد للہ علی ذلک!

پھر مانسہرہ سے پشاور اور پشاور سے ہنگو (کوہاٹ) کا سفر طے کر کے حضرت مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ سے مختصر سی ملاقات کی، جس کی کچھ تفصیل آگے پیش کی جائے گی، بعد ازاں حضرت مولانا سید محمود المعروف ''صندل بابا'' رحمہ اللہ کی خدمت میں ان کے گاؤں ''صندل، دیر بالا'' جانا ہوا، اور حضرت سے اجازت حدیث حاصل کی، ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، اور اسی موقع پر ان کے پوتے نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے ان کے تلمذ کی نسبت کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ صندل بابا رحمہ اللہ اس سوال پر بھی ناراضی کا اظہار فرماتے ہیں، دیر سے لوٹ کر ضلع ''صوابی'' کے قصبے ''زروبی'' میں مفتی فرید صاحب رحمہ اللہ کے در دولت پر حاضری ہوئی، مفتی صاحب اس وقت فالج کے مرض میں مبتلا تھے، ان سے بھی سند اجازت حاصل ہوئی، بعد ازاں ''قرآنیات'' کی خدمت کے حوالے سے صوبہ ''خیبر پختون خواہ'' کی ایک معروف بستی ''شاہ منصور'' (صوابی) پہنچے اور حضرت مولانا شمس الہادی شاہ منصوری رحمہ اللہ (والد محترم مفتی رضاء الحق دامت برکاتہم سابق استاذ جامعہ وحال شیخ الحدیث دارالعلوم زکریا جوہانس برگ، جنوبی افریقہ) کی زیارت اور ان سے اجازت حدیث کے حصول کی سعادت حاصل ہوئی، وہاں سے براستہ راولپنڈی، میانوالی پہنچے، اور حضرت مولانا خواجہ خان محمد رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا، پھر گوجرانوالہ میں حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی دست بوسی اور ان سے اجازت حدیث حاصل کرنے بعد لاہور سے کراچی کے لیے واپسی کا سفر شروع کیا۔ یہ ایک طالب علمانہ سفر تھا، جس میں ان بزرگ ہستیوں کی زیارت وملاقات اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھانا پیش نظر تھا، ناتجربہ کاری اور جغرافیائی ناواقفیت کی بنا پر سفری صعوبتیں بھی سہنی پڑیں، لیکن اس پہلو سے یہ ایک یادگار سفر رہا کہ اس میں جن ہستیوں کی خدمت میں حاضری ہوئی وہ سبھی آج اس فانی دنیا سے منہ موڑ کر پروردگار کے دربار میں حاضر ہو چکیں، قضا وقدر کے فیصلے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، لیکن ظاہری اسباب کے دائرے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس موقع پر حاضری نہ ہوتی تو شاید ان کی دید سے یہ آنکھیں محروم ہی رہتیں، اور یوں دیگر بہت سے بزرگوں کی طرح ان اکابر کی زیارت نہ ہونے کا بھی قلق رہتا۔

مولانا شہید رحمہ اللہ سے اکلوتی ملاقات کی روداد

وہ نو شعبان ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۳ اگست ۲۰۰۷ء کی ایک چمکیلی صبح تھی، جب ہم حضرت مولانا شہید رحمہ اللہ کے ہاں" جامعہ یوسفیہ شاہو وام، ہنگو" میں لگ بھگ دس بجے پہنچے تو حضرت مدرسے کے احاطے میں چند مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما اخبارات پر نگاہ ڈال رہے تھے، چند اور مہمان بھی ارد گرد بیٹھے تھے، ہم طالب علموں کی آمد پر حضرت اٹھ کھڑے ہوئے، اور معانقہ فرما کر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم نے اپنا تعارف کرایا اور آمد کی غرض بتائی تو خوشی کا اظہار فرمایا، اس دوران علاقے کے بعض سرکردہ افراد بھی ملاقات کے لیے آئے، لیکن حضرت ان کے بجائے ہم طلبائے علم کی جانب متوجہ رہے، کوئی آدھ گھنٹے کے حسین لمحات ان کی دل کش مجلس میں بتا کر بادل ناخواستہ اجازت چاہی کہ آگے دیر بالا کا طویل سفر درپیش تھا، جہاں رات کی تاریکی چھا جانے سے قبل پہنچنے کا عزم تھا، حضرت نے فرمایا: "آپ لوگ یہیں ٹھہر جائیں، اور کم از کم دوپہر کا کھانا کھا کر جائیں، جامعہ کے استاذ مولانا یاسین صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں، ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی" لیکن کیا خبر تھی کہ ان سے یہی پہلی ملاقات، آخری بھی ثابت ہوگی:

شب وصال بہت کم ہے، آسمان سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا

ان کے اصرار کے باوجود ہم اپنے اعذار کی بنا پر ناوانی دکھا گئے، روانہ ہوتے ہوئے ان کا کہا ہوا ایک جملہ دل چیر گیا اور آج بھی یہ جملہ قلم کے سپرد کرتے ہوئے ان کی صورت دماغ کے کینوس پر ابھر آتی ہے: "آپ لوگ میرے (رکنے کے لیے) اصرار پر ناراض تو نہیں ہوئے؟!" ۔ کہاں ان کی عظیم ہستی اور کجا ہمارے جیسے ان کے شاگردوں کے شاگرد!!! لیکن بایں ہمہ عظمت ان کا اس قدر متواضع لہجہ دل پر چھا گیا، پھر مدرسے کے دروازے تک ہمیں رخصت کرنے آئے، کچھ رقم عنایت فرمائی (جس سے بعد میں ہم نے انہی کی کتاب **"مسانید الامام ابی حنیفة وعدد مروياته وآثاره"** خریدی اور ان کی یادگار کے طور اپنے محدود کتابی ذخیرے کی زینت بنالی) اور صاحب زادے برادرم مولانا یوسف صاحب کو حکم فرمایا کہ ہمیں "ہنگو" شہر تک پہنچا کر آگے کی گاڑی میں سوار کرا کے آئیں، حضرت رحمہ اللہ کی علمی عظمت تو پہلے ہی دل میں تھی، اس مختصر سی ملاقات میں حضرت شہید رحمہ اللہ کے بلند پایہ اخلاق اور کمالات کے باوصف ان کی تواضع نے ان سے محبت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

کیا چیز ہے یہ جلوۂ گل؟ میرے دل سے پوچھ

میری نگاہ میں ہے حقیقت بہار کی

علمی مقام ومرتبہ

حضرت مولانا رحمہ اللہ اس آخری عہد میں ''علوم حدیث'' کے حوالے سے ملک بھر کی ان چند گنی چنی شخصیات میں سے تھے، جن کی طرف سے اس میدان کی مشکلات کے حل کے لیے نگاہیں اٹھتی تھیں، ''علم رجال احادیث'' میں ان کی مہارت مسلّم تھی، اکابر علما ومشائخ حدیث بھی ان علوم کے دقیق مباحث میں ان کی جانب رجوع کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی عقابی نگاہوں نے جس ہیرے کو صیقل کر کے اپنی نگرانی میں اعلیٰ پائے کی ''حدیثی خدمات'' کے لیے منتخب کر لیا ہو تو وہ ہیرا کس قدر نایاب ہوگا؟! عالم عرب کے نامور محقق شیخ بشار عواد معروف حفظہ اللہ (جنہوں نے تین سو سے زائد مجلدات پر تحقیقی کام سرانجام دیا ہے، اور تحقیق کے میدان میں نہایت اونچا مقام رکھتے ہیں، احوال زمانہ کے ستم کے مارے یہ بلند پایہ ''عراقی'' محقق ان دنوں ''اردن'' کے دارالخلافہ ''عمان'' میں رہائش پذیر ہیں) جب پاکستان آئے تو جامعہ میں کچھ عرصہ ٹھہرے رہے، اس دوران مختلف علمی مجلسوں میں حضرت مولانا رحمہ اللہ سے بھی گفتگو ہوئی تو شیخ بشار، مولانا کے علمی وفور اور ''علوم حدیث'' میں مہارت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، انہوں نے مولانا رحمہ اللہ سے اجازت حدیث بھی حاصل کی، جو ان کے دل ودماغ میں نقش عظمت کا کھلا اظہار تھا، اور یہ عرب علما کا ایک امتیاز ہے کہ وہ کمال کے اعتراف میں ''معاصرانہ نفسانی جذبات'' کو آڑ آنے نہیں دیتے، ان کے برعکس ہمارے برصغیر کی عام طبائع میں یہ وصف کم یاب دکھائی دیتا ہے۔ اعاذنا اللہ من شرور انفسنا ومن سیآت اعمالنا۔

باقیات صالحات

علامہ ابوطیب لغوی رحمہ اللہ کے ذکر کردہ مذکورہ اصول کی روشنی میں حضرت مولانا شہید رحمہ اللہ کی حیات مستعار کا جائزہ لیں تو ان کے علمی ترکے میں "نثر الازهار" اور "مسانيد الامام ابى حنيفة" جیسی دو اہم خدمات نگاہوں کے سامنے آتی ہیں، "مسانيد" ان کا ''تخصص فی علوم الحدیث'' کا مقالہ ہے، جو اول جامعہ کے اشاعتی شعبے ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی'' سے اور بار دگر مولانا رحمہ اللہ کے ادارے ''جامعہ یوسفیہ، شاہو وام، ہنگو'' سے اشاعت پذیر ہوا ہے، کتاب کا جدید ایڈیشن ان شاء اللہ جامعہ سے چھپے گا، جبکہ امام طحاوی رحمہ اللہ کی "شرح معانی الآثار" کی عالمانہ شرح "نثر الازهار" کی دو جلدیں خود ان کی زندگی میں دو بار طبع ہو کر عام ہوگئی تھیں، بقیہ جلدوں کا مسودہ بھی اب مولانا رحمہ اللہ کے صاحب زادے برادرم مولانا یوسف اورکزئی نے جامعہ کے سپرد کر دیا ہے، یوں اس کتاب کا

تیسرا ایڈیشن ان شاء اللہ جامعہ سے ہی طبع ہوگا۔ ان دو اہم کاموں کے علاوہ مولانا رحمہ اللہ کے قلم سے متنوع علمی مقالات ومضامین صادر ہوئے ہیں، جو جامعہ کے ترجمان ماہنامہ ''بینات''، ''جمعیت علمائے اسلام کے آرگن ماہنامہ ''ترجمان اسلام'' لاہور اور دیگر مختلف رسائل ومجلات کی جلدوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اللہ کرے کہ کوئی جواں ہمت اس منتشر ذخیرے کو یکجا کر کے اہل علم کے استفادے کے لیے سامنے لائے، اس قیمتی علمی سرمائے کے علاوہ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن اور جامعہ یوسفیہ کے طویل تدریسی دور میں ان سے بلاشبہ ہزاروں طلبائے علم نے استفادہ کیا، ہمارے شیخین استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ واستاذ محترم مولانا امداد اللہ یوسف زئی مدظلہ (ناظم تعلیمات جامعہ)، صاحبین کریمین مولانا محب اللہ ومولانا یسین دامت برکاتہم اور مولانا رزین شاہ صاحب مدظلہ (نگران شاخ جامعہ مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر، سہراب گوٹھ) ان کے نامور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، جو آج بھی اپنی مجلسیں اپنے محبوب استاذ کے تذکروں سے معمور رکھتے اور ان سے حاصل کردہ فیض نئی نسل تک پہنچانے میں شب روز کوشاں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا شہید رحمہ اللہ کی تربت کو سدا ٹھنڈا رکھے، ان کے علمی ذخیرے اور تلامذہ کی صورت میں باقیات صالحات سے تا ابد ان کے نامۂ اعمال میں حسنات کی افزودگی فرمائے اور رہتی دنیا تلک ان کے نقوش حیات سے شاہراہ زندگی میں روشنی حاصل کرتے رہنے کی توفیق ارزاں فرمائے۔

ہائے وہ میر کارواں نہ رہا

مولانا محمد یونس، پشاور

۱۱ جون ۲۰۰۹ء بمطابق ۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ کو، جامعہ عثمانیہ پشاور میں جمعرات کے دن سارے طلبہ اپنے گھروں کی تیاری میں مصروف تھے، ابھی تیسرا گھنٹہ ''شرح تہذیب'' کا ختم ہونے کو تھا کہ ہنگو کے ایک ہم جماعت ساتھی نے بتایا کہ جامعہ یوسفیہ شاہو وام، ہنگو پر فضائی حملہ ہوا ہے، جس میں حضرت استاذ الاساتذہ مولانا محمد امین صاحب سمیت کئی بچے بھی شہید ہوگئے ہیں۔ ہم جماعت ساتھی کی اس اطلاع نے ناقابل تحمل صدمہ سے دوچار کیا۔

صرف ہم جیسے طلبہ نہیں، بلکہ حضرت استاذ کو ایک نظر دیکھنے والے اس الم ناک صدمے سے اتنے متاثر ہوئے کہ چھ یا سات سال گزرنے کے بعد بھی اس سانحہ کا زخم دلوں میں تازہ ہے۔ راقم الحروف بعض اعذار کی بنا پر جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کرسکا جس کا آج تک قلق وافسوس ہے۔

جیو تو یوں جیو زندگی کو بھی رشک آئے
مرو تو یوں کہ موت بھی کہے ہائے کون مرگیا

حضرت استاذ الاساتذہ، فقیہ النفس، عالم باعمل، شہید ابن شہید مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے تلامذہ اور متعلقین میں 'استاذ صاحب' کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ استاذ صاحبؒ سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب میں ۲۰۰۵ء میں درجہ حفظ کا طالب علم تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی استاذ صاحب کی محبت اور شفقت نے دل موہ لیا، اور پھر ہر عید الفطر اور عید الاضحیٰ حاضری ہوتی رہتی۔

۲۰۰۶ء میں راقم الحروف کو شعبہ تجوید میں داخلہ لینے کے لیے راولپنڈی جانا پڑا، جہاں اقراء تجوید الحسن اکیڈمی (جامع مسجد ابوحنیفہ، ڈھوک کشمیریاں) میں داخلہ لیا۔ اس تعلیمی سفر کے دوران مختلف مسالک کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ وہ اشکالات کرتے اور ہم جماعت طلبہ جواب دینے سے عاجز ہوتے۔ بہرحال اُن کے اشکالات نے پریشان کردیا، شعبہ حفظ یا تجوید کا طالب علم عقائد کے مسائل کیا جان سکتا ہے، تعطیلات میں جب گاؤں آتے تو استاذ صاحب ان اشکالات کے تسلی بخش جوابات دیا کرتے۔ استاذ صاحب کی ایک عجیب خوبی یہ تھی کہ ہر مہمان سے یوں ملتے جیسے برسوں کا تعلق ہے، اور ایک ادنیٰ طالب علم کو بھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقت دیتے اور اگر کوئی شرعی مسئلہ پوچھتا تو تفصیلی جواب دیتے اور اگر کوئی مشورہ لینے آتا تو اس کو اپنے مفید مشوروں سے بہرہ ور فرماتے۔

۲۰۰۶ء میں، راقم الحروف اپنے ماموں زاد بھائی مولوی محمد زبیر خان شہید کے ساتھ استاذ صاحب کی ملاقات کے لیے گئے، اسی دوران استاذ صاحب سے ایک سوال عرض کیا سوال کا ایک جواب بھی ہم جیسے ناقص علم والوں کے لیے کافی تھا، لیکن حضرت استاذ صاحب نے کئی جوابات دیے۔ سوال یہ تھا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ نماز میں آپ ہر رکعت میں "أیھا النبی" کہتے ہیں، یہ الفاظ تب کہے جاتے ہیں جب مخاطب سامنے حاضر ہو، ورنہ یہ الفاظ کہنا درست نہیں۔ حضرت استاذ صاحب نے فرمایا: ''یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کے لیے دلیل نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل کے کلام کی حکایت ہے اور حکایت کا ہمیں حکم دیا ہے کہ نماز میں پڑھی جائے۔ لہٰذا "أیھا النبی" سے حاضر و ناظر کے لیے استدلال کرنا درست نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ”یموسی، یعیسی، یبحیی، یادم“ بھی آیا ہے۔ تو کیا تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو حاضر و ناظر مان کر ان کو بھی ندا کے ساتھ پکاریں؟

تیسرا یہ کہ اگر کوئی عاشق اپنے معشوق کو تصور میں لا کر یوں کہے تب بھی جائز ہے، جیسے: شعراء اپنے محبوب کو اشعار میں پکار کر یاد کرتے ہیں اور کیسی تعریفیں کرتے ہیں۔

ان جوابات سے حضرت استاذ کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، کیونکہ اس وقت بندہ شعبہ تجوید کا طالب علم تھا اور دس سال گزرنے کے بعد بھی حضرت استاذ رحمہ اللہ کے جوابات اب تک یاد ہیں۔

استاذ صاحبؒ اوصاف حمیدہ کا عملی نمونہ تھے، لیکن مہمان نوازی میں آپؒ اپنی مثال آپ تھے۔ جو بھی ”جامعہ یوسفیہ وام“ آتا، تو کھڑے ہو کر استقبال فرماتے، اور پھر چارپائی کے سرہانے مہمان کو بٹھاتے اور خود پائنتی کی طرف بیٹھ جاتے۔ سادہ مٹھائی اور میٹھے قہوہ، یا چائے کا دور تو ہر وقت چلتا رہتا، اور ہر مہمان کی عموماً اسی سے تواضع فرماتے، البتہ اگر کوئی خاص مہمان تشریف لاتے تو مزید اکرام بھی فرماتے اور رخصت کرتے وقت جامعہ کے دروازے تک مہمان کے ساتھ ضرور تشریف لے جاتے، اور مہمان کو بہت ساری دعاؤں سے نوازتے۔

حضرت استاذ بہت کم بولتے، گویا ”من حسن اسلام المرأ تر که مالا یعنیه“ کے عملی نمونہ تھے، چنانچہ آپؒ کے اسی مزاج کا اثر تھا کہ تقاریر و بیانات بالکل نہیں فرماتے تھے، البتہ اگر کسی مسئلہ پر بحث فرماتے تو مجلس میں موجود علماء کرام انگشت بدنداں رہ جاتے۔

شورِ دریا سے یہ کہتا ہے، سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

راقم الحروف نے استاذ صاحبؒ کے شاگردوں سے بارہا سنا کہ ”نثر الازهار علی شرح معانی الآثار“ کی تصنیف کے وقت ایک حدیث کی تحقیق کے لیے ایک ہی کتاب کے پانچ سو صفحات تک مطالعہ فرمایا، تب جا کر کہیں اس حدیث کی تحقیق مکمل ہوئی۔ یہ صرف ایک حدیث کی تحقیق کا حال ہے، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ سینکڑوں احادیث اور آثار کی تخریج اور تحقیق کے لیے آپؒ نے کتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔

استاذ صاحبؒ مدرسہ کے لیے عام مروجہ طریقہ سے چندہ کرنے کے قائل نہیں تھے، بلکہ آپؒ کے شاگردوں سے بارہا سنا کہ ایک مرتبہ جامعہ میں طلبہ کے لیے خوراک کی قلت ہوگئی، تو فرمایا کہ جس دن خورونوش کی اشیا جامعہ میں ختم ہوجائیں، اس دن سے چھٹیاں ہوں گی، جب کہ ابھی سالانہ امتحان کے لیے صرف دو مہینے باقی تھے۔ کہتے ہیں کہ ابھی خوراک ختم ہونے ہی کو تھی کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد و نصرت فرمائی اور یوں تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور طلبہ کرام

وفاق المدارس کے سالانہ امتحان تک جامعہ میں رہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت استاذ صاحبؒ کی قبر پر کروڑ ہا رحمتیں نازل فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، اور آپؒ کے برخوردار حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو علمی وعملی ترقی سے نوازے۔ آمین۔

باغ باقی ہے باغبان نہ رہا   اپنے پھولوں کا پاسباں نہ رہا

کارواں تو رواں رہے گا مگر   ہائے وہ میر کارواں نہ رہا

بزم بنوری کا امین

مولانا ضیاء الدین پیرزادہ، کراچی

اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کو زمین کی مٹی سے وجود عطا فرمایا ہے، اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، ابوالبشر آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے: خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون۔ اور قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں تخلیق آدم کا ذکر ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی زمین اس کی جائے ولادت ہے یہی مدفن ہے اور یہیں سے حشر ہونا ہے، شاعر مشرق علامہ اقبال رحمہ اللہ نے صحیح فرمایا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

کسی انسان کی نیک نامی، عظمت، مقبولیت ومحبوبیت کا سبب اُس کی ذات نہیں بلکہ اُس کے اوصاف وخصائلِ حمیدہ، اخلاق پسندیدہ، خدماتِ جلیلہ، اعمالِ نبیلہ اور کارہائے نمایاں ہوتے ہیں۔ بلند رتبہ ومقام ذاتی، نسبی، خاندانی یا مالی حیثیت ومنصب سے نہیں بلکہ یہ رتبہ ومقام تو کام سے ملتا ہے۔ جتنا بڑا کام اتنا بڑا مقام وانعام، ویسے بھی کامیابی میں اوّل کام ہے، یابی بعد ازاں ہے۔ چنانچہ تمام بڑے مشہور ومعروف اور قابلِ ذکر حضرات اپنے اعمال و کردار سے متعارف ومشہور ہوئے اور عظمت ومحبوبیت پائی، تاریخ مثالوں سے بھری ہے۔ قرنِ اوّل سے آج تک ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ یہی چیزیں انسانی عظمت کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔

جس طرح قیمتی پتھر کی صحیح پہچان وشناخت ہر ایک کو نہیں ہوتی، نہ ہر کوئی لے سکتا ہے، اسی طرح قیمتی انسان کو ہر کوئی نہیں پہچان سکتا بالخصوص اس کی حیات میں، اس وجہ سے ناقدری ہوتی ہے۔

جس طرح ہر درخت پھلدار نہیں ہوتا، نہ ہر پھل خوشگوار ہوتا ہے، نہ ہر درخت سایہ دار ہوتا ہے، اسی طرح علوم کی بے شمار اقسام ہیں لیکن ہر علم نافع نہیں ہوتا، بعینہٖ اسی طرح علما کی تعداد بے شمار ہے مگر ہر عالم مرشد وراہنما وقابلِ اقتدا ونمونہ تقلید نہیں ہوتا، بلکہ صحیح طور پر اپنے علم کی زکوٰۃ نکالنے والے (یعنی اپنے علم پر کسی درجہ میں عمل کرنے والے) بہت کم ہوتے ہیں، اسی طرح حاملین علوم نبوت میں سے صحیح اور کامل جانشین ووارثین نبوت تو بہت ہی کم بلکہ شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں، جو اخلاق واوصاف نبوی کے حامل وعامل ہوں، بڑوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا ہوتا ہے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصی عنایات کے مورد ہوتے ہیں۔

دینِ اسلام چونکہ کامل، مکمل، جامع ومانع ضابطۂ حیات ونظامِ زندگی ہے اور یہ آخری وابدی ہے، اس لیے اس دین وشریعت پر کامل ومکمل طور پر عمل کرنے والے خوش نصیب بھی ہر دور میں کم یا زیادہ باقی رہیں گے، جب تک مشیتِ الٰہی کا تقاضہ ہوگا وہ بطور اسوہ ونمونہ برائے اقامت واتمامِ حجت رہیں گے، جنہیں دیکھ کر لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت وسیرت اپنانے کی توفیق ہوگی، کیونکہ عملی نمونہ ومثال سامنے نہ ہونے کی صورت میں عذر کی گنجائش رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں نمونے کے لئے کچھ ایسے افراد واشخاص کو اس عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ انہی منتخب، باتوفیق اور سعادتمند شخصیات میں ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید بھی تھے جو انتہائی بیش قیمت گرانقدر کمیاب پتھر یا اعلیٰ قیمتی درخت ولکڑی کی مانند ہوتے ہیں کہ وہ جس سے جڑ گئے یا جو ان سے جڑ گیا وہ بھی قیمتی ومنفرد ہوگیا، پتھر ولکڑی کی قیمت ہوتی ہے جبکہ یہ ہیرے انمول ہوتے ہیں، ان

کا خریدار پہلے ہی سودا کر چکا ہے، یہ ایسے قیمتی ہوتے ہیں کہ پروردگار کے علاوہ کوئی انہیں لے نہیں سکتا، ہمارے استاذ محترم تو ان خوش بخت مردانِ خدا میں تھے جو اس آیت کا مصداق ہیں: من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه... الخ اسی طرح وہ ان اشخاص وافراد میں سے تھے جن پر یہ آیت منطبق ہوتی ہے: ان اللہ اشتری من المؤمنین أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ ہم بھی صحیح پہچان نہ ہونے کی بنا پر ایسے قیمتی انسانوں کی قدر ومنزلت ان کی حیات میں نہیں کر پاتے، بعد میں پچھتاتے ہیں۔

عن الحسن البصری أنه قال: کانوا یقولون: موت العالم ثلمة فی الاسلام لا یسدها شیٔ ما اختلف اللیل والنهار۔

وقال القائل: مقیاس الخیر فی الأمة وجوذ المصلحین وینقص الخیر بنقصانهم

ما أکثر الأشجار ولیس کلها بمثمر

وما أکثر الأثمار ولیس کلها بطیب

ما أکثر العلوم ولیس کلها بنافع

وما أکثر العلماء ولیس کلهم بمرشد

ذهب الذین یعاش فی أکنافهم

وبقی الذین حیاتهم لا تنفع

مضت الدهور وما أتین بمثله

ولقد أتی فعجزن عن نظرائه

ما عاش من عاش مذموماً خصائله

ولم یمت من یکن بالخیر مذکورا

المرء ما دام حیاً یستهان به

ویعظم الرزء فیه حین یفتقد

الکریم یوذ الکریم علی لقیة واحدة ومعرفة یوم فقط، واللئیم لا یصل أحداً الا عن رغبة أو رهبة

سأمضی وما بالموت عار علی الفتی

إذا ما نوی حقًا وجاهد مسلماً

أری الدهر ساد به الأرذلون

کالسیل یطفو علیه الغثاء

ومات الکرام وفات المدیح

فلم یبق للقول إلا رثا

من الناس رجال للبیع والإیجار

وفی الناس رجال للتضحیة والإیثار

سئل الشافعی رحمه الله: کیف نعرف أهل الحق فی زمن الفتنة؟ فقال: اتبع سهام العدو فهی ترشدک إلیهم۔

لقد سار مسیر السلف ونهج منهجهم مع کمال الإستقامة، وکان سعیداً۔ والسعادة معاونة الأمور الإلهیة للإنسان علی نیل الخیر، وکان مصداقاً لما قال فیهم ابن فارس:

یموت قوم فیحی العلم ذکرهم

والجهل یلحق أمواتاً بأموات

وکان کما قال القائل:

سار مسیر الشمس فی کل موطن

وهب هبوب الریح فی الشرق والغرب

سعی إلیه علی قرب ومن بعد

من کان ذا رغبة فی العلم والسنن

لولا عجائب صنع الله ما نبتت

تلک الفضائل فی لحم ولا عصب

بڑے حضرات کے حالات پر کچھ لکھنا یا بات کرنا چھوٹوں کے لیے مشکل بھی ہے اور نامناسب بھی، اُن کے متعلق اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں، نہ ہر ایک کو زیب دیتا ہے، تاہم محسنین کے احسانات کو یاد رکھنا اور اُن کا تذکرہ ضروری ہے، بڑوں کی خوبیاں بیان کرنے سے ان کی شان نہیں بلکہ اپنی شان میں قدرے اضافے کی امید کی جاسکتی ہے، جیسے شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا:

ما إن مدحت محمداً بمقالتی

ولکن مدحت مقالتی بمحمد

ہمیں بھی اللہ والوں سے محبت ہے اگرچہ خود کورے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین صلحا کی محبت کا صلہ نصیب فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے ہر دور میں دین کے ہر شعبہ کے لیے مناسب وموزوں افراد واشخاص کا انتخاب فرمایا

ہے۔ جیسے محدثین، مفسرین، فقہا، متکلمین، قراء، مجودین، مصلحین، مبلغین واعظین اور مجاہدین۔ غرض یہ کہ جس کام و مقصد کے لیے جو افراد زیادہ اہل وموزوں تھے اللہ پاک نے وہ کام اُن کے ذمہ وحوالہ کیا۔ ایک جماعت کے متعلق بطور پیشن گوئی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ حق پر قائم اور حق کے لئے لڑتی رہے گی، کسی کی مخالفت یا علیحدگی انہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی، وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت وطعنہ زنی کی پرواہ نہیں کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کی افزائش عمر وعمل کی حدوانتہا مقرر کردی ہے۔ مگر کمی کی کوئی حد نہیں ہے، ایک اجل مُعین ہے، جو آگے پیچھے نہیں ہوسکتی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی سے انتہائی قلیل ومختصر مدت میں بہت زیادہ اور عظیم الشان کام کرادیتے ہیں، کوئی بڑی طویل عمر میں بہت تھوڑا کام انجام دیتا ہے، وہ بھی کسی ایک شعبہ و لائن میں، اور کوئی زندگی بھر خیر کا کوئی کام نہیں کرپاتا۔ پھر جس کا مقررہ وقت مکمل ہوجاتا ہے، مدت مہلت پوری ہو جاتی ہے تو اُس کو اُٹھالیتے ہیں، کچھ کو اپنے پاس بلالیتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النصر کے مفہوم سے یہ امر مترشح ہوتا ہے جس میں تکمیلِ مقصد کے بعد سفر آخرت کی تیاری کی طرف اشارہ موجود ہے۔

ہمارے معہد علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے قابل ذکر وفخر استاذ محترم ومکرم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لائق ترین، مایہ ناز وخاص شاگرد رشید اور بطل جلیل تھے۔ تفسیر ودرس قرآن کے دوران ہر باطل اور ضال ومضل کی نشاندہی اور اس کی بھرپور تردید فرماتے، گویا کہ ہر فتنہ وباطل کیخلاف شمشیر بے نیام تھے، غیرت حق سے بھرپور حصہ پایا تھا، کسی زمانہ میں ناظم دارالاقامہ بھی رہے، طبیعت میں سنجیدگی زیادہ غالب تھی، بلکہ ضرورت سے زیادہ حساس تھے، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ طلبا کی اخلاقی تربیت کے شدید حریص تھے، اس لئے گہری اور کڑی نگاہ رکھتے تھے، اسی لئے وہ انتہائی حساس طبیعت کے مالک تھے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کے معتمد تھے، معارف السنن کے کام میں حضرت بنوری رحمہ اللہ کے معین تھے، عمیق علم اور عمل والے تھے، سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت پائی، حق تعالیٰ غریق رحمت فرمائے، بہترین کردار وخدمات کی وجہ سے اپنے علاقہ میں بڑے بااثر تھے، ہمیشہ حق واہل حق کی کھل کر تائید وتصویب کرتے رہے اور انہیں تقویت پہنچاتے رہے۔ بظاہر تو یہاں کا موسم ان کی طبیعت کے موافق نہ تھا، خرابی صحت کی وجہ سے انہیں مجبوراً واپس جانا پڑا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وارث علوم نبوی کے اس امین سے ان کی آبائی سرزمین اور وہاں کی آبادی کو سیراب وشاداب اور فیضیاب کرنا مقصود تھا۔

یوں تو استاذ محترم مختلف علوم وفنون پر کامل دسترس رکھتے تھے، تاہم اُن کا پسندیدہ ترین موضوع تفسیر قرآن تھا، اور پڑھانے کا انداز سادہ مگر منفرد تھا، اُن کی علمی بصیرت اور حق گوئی کے سبب سبق میں ناغہ مشکل تھا، ہم نے درجہ

ثالثہ میں آخری دس پارے کی تفسیر حضرت سے پڑھی ہے، اُس سال کراچی میں شدید موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے سیلابی صورتحال کے باجود احقر نے حضرت کے سبق کا ناغہ نہیں کیا، رہائش مدرسہ میں نہیں تھی اڑھائی میل پیدل سیلابی ریلے کا سامنا کرتے ہوئے مدرسہ پہنچا، صرف حضرت کے سبق میں حاضری کے شوق نے یہ آسان کیا، حضرت اُستاذ محترم حضرت بنوری رحمہ اللہ کے علوم وافادات کے وارث وامین تھے، اپنی کم عمری اور حضرت کا وقار و دبدبہ اور جلالت علمی زیادہ قربت کے حصول میں مانع وحائل رہا، تاہم ہمارے لئے اُن سے تلمذ کا تعلق باعث شرف وافتخار ہے۔

تدریس کے علاوہ حضرت کا تقریباً کل وقت تصنیف وتالیف کتب میں گزرتا، اُس دور میں اس کام کے لیے حضرت استاذ محترم اور حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید مخصوص تھے، دونوں حضرت کے لائق ترین شاگرد اور انتہائی معتمد تھے، اللہ تعالیٰ نے ظاہری وجاہت وخوبصورتی کے ساتھ باطنی ومعنوی حسنِ سیرت سے بھی نوازا تھا۔

طویل عرصہ بعد چند سال قبل معروف ومعمر بزرگ صندل بابا رحمہ اللہ کے ساتھ کراچی تشریف لائے تو الکبریاء مسجد دھوراجی میں قاری محمد قاسم صاحب کے ہاں ملاقات ہوئی، انہی دنوں استاذ العلماء حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم العالیہ سے ملنے جامعہ فاروقیہ کراچی بھی تشریف لائے وہاں بھی ملاقات ہوئی، کسے معلوم تھا کہ استاذ محترم سے زندگی کی آخری ملاقات ہے۔

حق تعالیٰ جل شانہ نے قرآن مجید کی سورۃ انعام میں اپنے محبوبین ومحبین کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں: **یحبهم ویحبونه أذلة علی المؤمنین أعزة علی الکافرین یجاهدون فی سبیل الله ولا یخافون لومة لائم۔** ہمارے استاذ مکرم ہمارے ممدوح ومحبوب، ایسے ہی تھے، انہی اوصاف کے مصداق تھے۔ اسی طرح سورۃ الفتح کے آخر میں صحابہ کرام کی جو صفات بیان فرمائی گئی ہیں: **أشداء علی الکفار رحماء بینهم۔** ہمارے حضرت اس کے صحیح وسچے مصداق تھے۔ وہ ایسی ہی صفات کے حامل اوران کے عامل تھے۔ وہ پورے دین پر پوری طرح سے عامل تھے، افراط وتفریط سے ہٹ کر ہر شعبۂ دین سے عملی تعلق ووابستگی ان کا طرۂ امتیاز تھا، یہی وجہ ہے کہ دین کے تمام شعبوں سے متعلق حضرات کو حضرت کا قرب حاصل رہا۔ وہ العلماء ورثة الانبیاء کے مصداقِ کامل تھے۔

حمایت واعانتِ حق ان کی زندگی کا اہم وعظیم ترمشن تھا جوانہوں نے بہرصورت بخوبی نبھایا، اپنے سفید اُجلے لباس کی مانند بے داغ کردار کے مالک تھے، دنیائے دُنی سے اپنے کو بچا کر چلے گئے، اورشہادت نے توان کی حقانیت پر مہر تصدیق ہی ثبت کردی، وہ اپنا پاکیزہ کردار وعمل بطور نمونہ عمل بعد والوں کے لیے چھوڑ گئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی شہادت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ وہ یقیناً ایسے موحد حقیقی تھے جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اُس کے پاؤں

میں سونا ڈال دو، یا اُس کے سر پر تلوار کھینچ دو، اُس کو نہ کوئی طاقت طمع سے پھسلا سکتی ہے، نہ خوف سے مغلوب کر سکتی ہے۔ یہی توحید کی بنیاد ہے۔ گویا وہ بزبان حال کہہ رہے تھے:

جس دیئے میں جلے تیل خیرات کا
مجھ کو اُس کا اُجالا نہیں چاہیے
سونے چاندی کے لقمے مبارک تمہیں
جو کی خشک روٹی کافی ہے مجھے
زہر بن جائے جو زندگی کے لئے
مجھ کو ایسا نوالہ نہیں چاہیے
اُٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے ارباب نظر
گھٹتے جاتے ہیں میرے دل کے بڑھانے والے

اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں مقربین ومحبوبین میں جگہ عطا فرمائے اور ان ہی میں محشور فرمائے۔ یا اللہ! اُن کی شہادت کو اپنی قربت وتقرب مزید کا باعث بنا اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلا۔ آمین بجاہ سید المرسلین

آہ! حضرت استاذ شہیدؒ

مفتی محمد ندیم، ہنگو

بقیۃ السلف، استاذ العلماء، شیخ المشائخ، حضرت علامہ محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی دلنواز، ایسی حیات افروز اور ایسی باغ وبہار تھی کہ ان کی خصوصیات ومناقب کا ایک مختصر مضمون میں احاطہ کرنا ہم جیسے طفل مکتب کے لئے اگر ناممکن نہ ہو تو مشکل ضرور ہے۔ ان کی شخصیت اپنے شیخ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ کی مجسم یادگار تھی۔ علم حدیث تو حضرت استاذ شہید رحمۃ اللہ علیہ کا خاص میدان تھا۔ جس میں اس وقت ان کا ثانی ملنا مشکل

ہے۔علم حدیث کے وہ حقیقی شہسوار تھے۔لیکن حضرت بنوریؒ کی طرح وہ ہر علم وفن میں معلومات کا خزانہ تھے۔استاذ شہیدؒ کی قوت حافظہ،وسعت مطالعہ،ذوق کتب بینی،اکابر وسلف کے منور تذکروں سے ان کا شغف،علماء دیوبند کے مسلک پر تصلب وپختگی،دین اسلام کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت،ان کا جذبہ اخلاص ولِلّٰہیت،زندگی میں نفاست،سادگی اور بے تکلفی،ان کا ذوق مہمان نوازی،سخاوت وشجاعت اور باوقار علمی وروحانی مجلسیں بڑی خصوصیات تھیں۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ نری کتابیں پڑھنے سے معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں لیکن علم کے حقیقی ثمرات وفوائد تب حاصل ہوتے ہیں جب اللہ والوں کی مجلسوں میں بیٹھا جائے اور ان کے سامنے اپنے آپ کو پامال کر دیا جائے۔حضرت استاذ شہیدؒ اکابر کے سامنے اتنے باادب ہوتے کہ ہم جیسے آداب سے ناواقف اپنے آپ کو ملامت کرتے۔شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یوں بیٹھتے جیسے طفل مکتب۔مجھ جیسے کم علم طالب علم نے حضرت استاذ شہیدؒ کی زندگی میں جن دو اوصاف کا ہر آن ہر گھڑی مشاہدہ کیا وہ حیا اور ادب تھے۔مشہور روحانی بزرگ حضرت صندل باباجی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے۔ہم نے بھی سعادت سمجھ کر حاضری دی،جب وہاں پہنچے تو استاذ شہیدؒ کو باباجیؒ کے سامنے دوزانوں بیٹھے دیکھا آپ کو اس طرح پیکر ادب دیکھ کر اپنی بے باکی پر شرم محسوس ہوئی۔

حضرت استاذ شہیدؒ کو حق کے معاملے میں غیرت وشدت کا خاص وصف حضرت بنوریؒ سے ورثہ میں ملا تھا،وہ اپنے شیخ کی طرح باطل نظریات کے لئے شمشیر برہنہ تھے،اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت یا نرم گوشے کے روادار تھے اور نہ مصالح کو اہمیت دیتے تھے۔اس باب میں بالکل "لایخافون لومۃ لائم" کی عملی تصویر تھے۔

غالباً ۱۹۹۸ء کی بات ہے حضرت استاذ شہیدؒ علما کے ایک وفد سمیت مفتاح العلوم ہنگو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبداللہؒ کے ساتھ ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔اس ملاقات کا بنیادی ایجنڈا خیبر ایجنسی باڑہ میں پیر سیف الرحمن کے گمراہ کن نظریات کا تعاقب اور تردید کے لئے لائحہ عمل تھا۔حضرت استاذ شہیدؒ کا سب سے بڑا کام فتنہ رفض کا علمی تعاقب تھا۔شاید اسی کے لئے تکوینی طور پر آپ نے کراچی کو خیرباد کہا۔ایک وہ زمانہ تھا کہ ہنگو میں اہل سنت اور اہل رفض کے ازدواجی رشتے تک ہوتے تھے اور یا آج وہ دور ہے کہ ہنگو اہل سنت کا بچہ بچہ رفض کی حقیقت سے آشنا ہے اور یہ کام شاید کراچی میں بیٹھ کر حضرت استاذ رحمۃ اللہ نہ کر پاتے۔فجزاھم اللہ احسن الجزاء

ہمارے خطے میں مودودی فکر کا علمی محاسبہ جس ہستی نے کیا وہ حضرت امین شہیدؒ کی ہی ہستی تھی۔حضرت کے مساعی اور علمی مکالموں کے سامنے کسی گمراہ فکر کو کھل کر پنپنے کا موقعہ نہ مل سکا۔کسی نے علاقہ چھوڑا اور کسی نے در پردہ جانے میں عافیت سمجھی۔

مولانا امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ نے ۱۹۹۴ء میں مشہور غیر مقلد طالب الرحمن اور علامہ نورستانی سے 'تقلید شخصی' کے موضوع پر کوہاٹ میں مناظرہ کیا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۷۵ء میں مولانا اوکاڑویؒ کوہاٹ سے علماء اہل السنۃ کے رویے سے کچھ مایوس لوٹے تھے، اس مناظرہ کے لئے وہ دیوبندی علما کے ساتھ اس شرط پر آنے کے لیے راضی ہوئے کہ مولانا محمد امین اورکزئی میرے معاون ہوں گے۔ جب مناظرہ منتظمین نے استاذ صاحب سے بات کی تو آپ فوراً تیار ہو کر پہنچے، دونوں حضرات نے کتب کی ایک فہرست تیار کر کے منتظمین کو مہیا کرنے کے لئے حوالے کی اور رات دیر تک تیاری کرتے رہے۔ اس تاریخی مناظرہ میں جہاں مولانا اوکاڑویؒ نے مناظرانہ جوہر دکھائے وہاں نورستانی صاحب کے معقولات کا بھرم استاذ صاحب نے توڑ کر رکھا اور چند ہی ساعت بعد غیر مقلدین نے میدان چھوڑ دیا۔ مناظرہ منتظم حاجی سعید مرحوم غیر مقلد تھے، اس مناظرہ کے نتیجے میں توبہ تائب ہوئے اور حنفی مسلک اختیار کرلیا۔

بندہ درجہ رابعہ جامعہ فاروقیہ کراچی میں پڑھنے کی خواہش لے کر حضرت استاذ شہیدؒ کے پاس جامعہ یوسفیہ حاضر ہوا، جب اپنی خواہش کا اظہار کیا اور ساتھ میں سفارش لکھنے کی درخواست کی تو حضرت استاذؒ نے مسکرا کر فرمایا کہ جامعہ فاروقیہ پنڈی میں پڑھو، میں سفارش کردوں گا۔ میں نے گھر میں مشورہ کا عذر پیش کیا تو بخوشی اجازت دی کہ مشورہ کر کے پھر آجانا۔ گھر میں مشورہ کراچی ہی کا بنا۔ اگلے دن میں حاضر ہوا کہ استاذ شہیدؒ کو اپنی رائے سے آگاہ کروں اور دعا وسفارش بھی لیتا جاؤں۔ میں ظہر کی نماز میں آپ کے ہاں پہنچا۔ دل ہی دل میں تدبیریں بناتا رہا کہ کس طرح بتاؤں گا کہ گھر والوں کا مشورہ کراچی کا ہے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نماز سے فارغ ہو کر حضرت استاذ شہیدؒ نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر اپنے فرزند ارجمند میرے انتہائی قابل قدر بھائی مولوی یوسف صاحب کو آواز دی "یوسف! میرا پیڈ لے آؤ" مولوی یوسف صاحب نے پیڈ لا کر دیا۔ حضرت استاذ شہیدؒ نے خط لکھا۔ میں دل ہی دل میں پریشان کہ حضرت نے پنڈی کا خط لکھا ہوگا۔ جب کہ ہماری رائے تو کراچی کی ہے۔ ہائے میرے اللہ! کرامات اولیا واقعی برحق ہیں، سنا بار ہا تھا لیکن دیکھا پہلی بار کہ حضرت استاذؒ نے خط وسفارش استاذ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی مولانا محمد انور صاحب مدظلہم العالیہ کے نام تحریر کیا تھا اور مجھے دعا دے کر رخصت کیا۔ بقول شاعر:

؎ اب ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر

اور ؎

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں

ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

اور ۔۔۔

جہاں جہاں نظر آئے لہو کے چراغ

مسافران محبت ہمیں دعا دینا

آہ! استاذ صاحبؒ کتنے عظیم انسان تھے، ہزاروں علما کے استاذ، شیخ اور مربی مگر تواضع کی انتہا دیکھیں کہ مجھ جیسے ناکارہ پر کتنے شفیق ومہربان تھے۔ ایک بار حاضری ہوئی، شیخ الاسلام استاذ مکرم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا آسان ترجمہ قرآن ہاتھ میں تھا۔ فرمایا کہ ''مولوی صاحب! آپ کے استاذ نے میری دیرینہ خواہش پوری کر دی کہ جدید اسلوب میں اردو کا معیاری ترجمہ قرآن لکھا۔ اپنے اندر اہلیت وصلاحیت ناپید ہے اور حضرت شیخ الاسلام کی مصروفیات دیکھ کر اس تمنا کے اظہار سے شرماتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال کر یہ عظیم خدمت ان سے لے لی۔''

حضرت استاذ شہیدؒ صفائے باطنی کے ساتھ حسن ظاہری کے بھی پیکر مجسم تھے۔ لیکن مجال کہ رعب وہیبت کی وجہ سے کوئی شخص آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے۔ حضرت استاذؒ کو دیکھ اکابر کے علم وتقویٰ کا یقین ہو جاتا تھا۔ اللہ والوں کی شان بڑی ہوتی ہے، انہیں دیکھ کر خدا یاد آ جاتا ہے۔ حضرت استاذ شہیدؒ فنافی اللہ تھے۔ آقائے نامدار محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق زار اور صحابہ کرامؓ کے محب حقیقی تھے۔

حضرت استاذ شہیدؒ کا علمی مقام ومرتبہ بہت بلند تھا، معقولات ومنقولات پر گہری واقفیت ودسترس حاصل تھی، ہزاروں تلامذہ نے آپ سے کسب فیض کیا۔ بڑے بڑے اساطین علم آپ کے علم کے معترف تھے، وسعت مطالعہ اور سرعت مطالعہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت کی جو بھی کتاب اٹھا کر دیکھو صفحہ صفحہ، ورق ورق پر تصحیحات اس کے شاہد عدل ہیں۔ علم حدیث میں آپ کے تلامذہ برصغیر سے لے کر افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مسانید ابی حنیفہؒ حضرت کی فن اسناد میں عمق وفضل کی گواہ ہے۔ ورق ورق پر علم کے دریا موج زن ہیں، جنہیں دیکھ کر سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے درک حدیث کا پتہ چلتا ہے اور قاری اگر منصف مزاج ہو تو وہ حنفیت پر شرح صدر حاصل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت استاذ شہیدؒ کو اس پرفتن دور میں دینی وعلمی خدمات کے لئے نہ صرف چن لیا تھا، بلکہ ان کے کاموں میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی۔ حضرت استاذ شہیدؒ کے علم وفضل کا سب سے بڑا شاہکار ان کی طحاوی شریف یعنی شرح معانی الآثار کی شرح ''نثر الازہار'' ہے جو عنقریب کئی جلدوں میں چھپ کر آ جائے گی۔ حقیقت میں

یہ شرح علوم بنوریؒ کی امین ہے بلکہ حضرت کشمیریؒ کے محدثانہ مذاق کی جھلک ہے۔ کاش! یہ شرح پایہ تکمیل تک پہنچ پاتی۔ جس طرح معارف السنن ادھوری رہ گئی، بعینہ اسی طرح نثر الازہار کی تکمیل کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا: لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا" اب اگر کوئی تکمیل بھی کرنا چاہے تو وہ حضرت کے پایے کا ذوق عربیت و ادبیت، تقویٰ اور فہم حدیث کہاں سے لائے؟! اللہ تعالیٰ نے حضرت شہیدؒ کو عربی ادب و تحریر کا وہ بہترین ملکہ عطا فرمایا تھا جو عجم میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوا ہے، حضرت کی عربی اتنی سلیس، بے ساختہ، رواں اور شگفتہ ہے کہ لفظ لفظ پر ذوق سلیم کو حظ و سرور ملتا ہے۔ طحاوی شریف پر جو کام حضرت شہیدؒ نے کیا ہے شاید اس کی مثال پچھلی صدی میں نہ ملے۔ شاید حضرت استاذ شہید کی تخلیق ہی اس مقصد کے لئے ہو!

شہادت سے تقریباً تین ماہ قبل میں نے خواب دیکھا کہ لوگ بے تحاشا دوڑ رہے ہیں، کسی نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما شہید ہو گئے۔ میں بھی اس بدحواسی کے عالم میں پریشان حال دوڑا۔ جب نیند سے بیدار ہوا تو غم سے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ صبح خواب کی تعبیر پوچھنے حضرت استاذ شہیدؒ کے در پر حاضری دی، حضرت مسجد میں بیٹھے غالباً رسائل ابن ابی دنیا کا مطالعہ کر رہے تھے۔ بہت اطمینان سے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا خیر تو ہے؟ میں نے خواب سنایا۔ حضرت استاذؒ نے عادت کے مطابق کچھ دیر سکوت فرمایا، پھر جواب دیا کہ لگتا ہے کہ ہنگو سے کوئی بڑا متبع سنت اور ماہر قرآن شہید ہونے والا ہے۔ پھر خود وضاحت کی کہ حضرت ابن عمرؓ پر اتباع سنت کا بہت غلبہ تھا اور حضرت ابن عباسؓ اس امت کے سب سے بڑے مفسر قرآن اور حبر الامۃ تھے۔

آج جب بھی سوچتا ہوں کہ اس خواب کی تعبیر حضرت استاذ شہیدؒ ہی تھے اور شاید وہ سمجھ بھی گئے تھے۔ پھر شامت اعمال سے وہ گھڑی بھی آ پہنچی کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا حادثہ فاجعہ ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہمیں ان کی برکات سے محروم نہ فرمائیں۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
آتے ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

عقل کار نه د ◘ چه و
خیجی أسمان ته
دا خو عشق وو چه په عرش ° ¥ قدم

کیخو

عاشقان دجنون هر

میدان ¢ % ¢ ¤

عقلمند وبه نصیب کړے دا ¢ ' ند نشته

آخر میں استاذ شہیدؒ کے اس پسندیدہ شعر کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں:

وہ درد ملا مجھے جس سے نا آشنا ہے سبھی
کہوں تو کس سے کہوں سہوں تو کیسے سہوں

حیات امینؒ کے چند درخشاں پہلو

مولانا عنایت اللہ، کرک

اللہ تعالیٰ کی بیش بہا انعامات میں سے ایک گراں مایہ انعام اس پُرتقصیر بندے پر یہ رہا کہ اپنے خطے کے ممتاز عالم دین، عارف باللہ، محقق العصر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ سے شرف تلمذ کے لئے قبول فرمایا۔ بندہ اپنی علمی کم مائیگی کے باعث حضرت الاستاذ سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکا لیکن اس ماہتاب علم وعمل کی ضو فشانیوں سے جس قدر ملا وہ بھی انمول سرمایۂ زیست ہے، اس پر رب کریم کا جتنا شکر بجالاؤں کم ہے۔ ہمارے احباب کو اللہ تعالیٰ شایان شان اجر عظیم سے نوازے کہ انہوں نے حضرت استاذ صاحبؒ کی حیات پر اہل علم سے معلومات اور تاثرات جمع کیں، ان شاء اللہ یہ ہم سب کے لئے فیض وبرکات کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔ حضرت الاستاذؒ کی چند خصوصیات کا تذکرہ پیش خدمت ہے، تاکہ اس عظیم کام میں میرا بھی حصہ پڑ جائے۔ بندہ حضرت اقدس استاذ محترم رحمہ اللہ کے جس وصف سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ حضرت الاستاذ کی جامعیت تھی، موجودہ دور میں ماشاء اللہ علمی شخصیات کی چنداں کمی نہیں، مگر ہر علم وفن میں مہارت تامہ رکھنے والے ضرور ناپید ہیں اگر ایسی شخصیات مل بھی جائیں تو علم وعمل میں کامل مطابقت والی ہستیاں تو اب عنقا ہی ہیں۔ حضرت الاستاذ جہاں تمام علوم وفنون کے ایک متبحر اور راسخ عالم تھے تو دوسری طرف زہد وتقویٰ، شجاعت وبہادری، فہم وفراست اور سیاسی بصیرت بھی کمال درجہ کی تھی۔

حضرت اقدس سے استفادہ کرنے والے ضرور اس بات کی گواہی دیں گے کہ اگر آپ درس گاہ میں ایک مشاق اور کہنہ مشق مدرس کی شان رکھتے تھے، تو ذوق عبادت کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، علم وتحقیق میں اگر آپ کا قلم اشہب سوار اپنے زوروں پر ہوتا تو ملی وسماجی مسائل میں آپ کے پر حکمت فیصلے اور عوامی رہنمائی گہری سیاسی بصیرت کا پتہ دیتی۔

لومۃ لائم سے بے خوفی:

حضرت الاستاذؒ بدعات ورسومات اور منکرات کے مٹانے کے لئے شمشیر بے نیام تھے اور اس سلسلے میں آپ نے حکمت ومصلحت کے نام پر کبھی مداہنت کو قریب آنے نہیں دیا، اسی وجہ سے انتہائی سخت حالات سے بھی گزرنا پڑا اور بدعت پرست حلقوں کی طرف سے مخالفت بھی ہوئی، بعض لوگوں نے انتشار پھیلانے کی بھی کوشش کی، لیکن آپ نے جہاں ایک طرف اپنی محنت کو تشدد سے پاک رکھا تو دوسری طرف علمی وعملی جدوجہد میں استقامت واستقلال کا ایسا مظاہرہ کیا کہ بدعت پرست خود ہی بے اثر ہوتے گئے۔ چونکہ بدعات ورسومات قومی ثقافت کا حصہ بن جاتی ہیں ،لہٰذا ان کے خاتمہ کے لئے جدوجہد میں جو جاں گسل حالات پیش آتے ہیں اُن کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں،

جنہوں نے بدعات کو مٹانے کے لئے کام کیا ہو۔

پھر حضرت استاذ صاحبؒ نے جس معاشرے میں یہ محنت شروع کی ، وہاں نسلی وقومی تعصبات عروج پر تھیں۔ اورکزئی قبائل کا ایک مخصوص مزاج تھا اور وہ جس چیز کو بطور دین بلکہ شعائر دین کے قبول کر چکے تھے اور نسلاً بعد نسل اس کو دین کے واحد اساس کے طور پر انجام دیتے ہوئے چلے آرہے تھے، انہیں ان رسومات و بدعات سے پھیرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر بدعت پرست حلقوں میں جو خود ساختہ پیشوا ہوتے ہیں، اُن کی معیشت اور مالی مفادات کا ایک بڑا ذریعہ یہی رسومات و بدعات ہوتی ہیں، وہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ اُن کی سونے کی چڑیا کا اس آسانی سے شکار ہو، لہٰذا وہ بھی مقاومت میں پوری قوت صرف کرتے رہے۔ پھر علاقہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے بدعت و رسم کی ذلت کو اصل سرپرستی 'روافض' کی طرف سے میسر تھی اور وہ اس ہتھیار کے بل بوتے اہل السنۃ کے عقائد واعمال سے کھیل رہے تھے اور علاقہ پر مکمل نظریاتی رسوخ حاصل کرنے کے لئے اس راستہ سے سرگرم تھے۔ آپؒ نے ان حالات کا مؤمنانہ بصیرت سے جائزہ لیا اور صدیقی عزم کے ساتھ بزبان حال "أ ینقص الدین و أنا حی" کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے بے خطر میدان میں کود پڑے۔

جہالت کا یہ حال تھا کہ اہل السنۃ واہل تشیع میں تناکح تک کا سلسلہ چل رہا تھا۔ آپؒ کی پیہم محنت سے علمی میدان میں ان طبقات نے شکست کھائی، یہ پیچھے ہٹے اور سکڑتے گئے۔ اگر کل تناکح کے افسوسناک حالات تھے تو پھر آج یہ ایمان افروز منظر بھی دیکھے گئے کہ لوگوں نے اپنی بہنوں بیٹیوں کو طلاقیں دلوا کر ان رشتوں سے آزاد کروایا۔ چونکہ آپ کی قوت '' دلیل '' کی تھی اور دلیل کے میدان میں لوگوں کے ایمان سے کھیلنے والے آپ کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے، اس لئے انہوں نے آپ کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیوں کا جال پھیلانا شروع کیا اور علاقہ میں وقتاً فوقتاً ایسے حالات پیدا کرنے شروع کردیئے، جس سے امن تاراج ہوا اور آپ کا علمی مشن تنازعات وفسادات کے بھینٹ چڑھ جائے۔ ان حالات میں محض '' رفض '' ہی آپ کے درپے آزار نہ تھی بلکہ پیسوں کے پجاری وہ سنی بھی اس صف میں کھڑے تھے جن کے مفادات پر حضرت کی مثالی جدوجہد سے زد پڑی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ آپ کے مشن وکام سے کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ دین کے نام پر ایمان کے لٹیروں کو تکلیف تھی اور یہ عناصر جن جن مسالک میں موجود تھے سب ہی آپ کے مخالف تھے اور انہی کی ملی بھگت سے حضرت کے لئے رکاوٹیں کھڑی ہوتی رہیں جو بالآخر آپ کی شہادت پر منتج ہوئیں۔

مجھے یہ بات بھی افسوس کے ساتھ نقل کرنی پڑ رہی ہے کہ ہنگو کے گردوپیش میں بعض بے بصیرت اور کور باطن حضرات نے کئی بار حضرت الاستاذؒ کی محنتوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی، یہی وہ لوگ تھے جو دیوبندیت کے نام پر

غیر اعلانیہ طور پر بریلویت اور بدعت کا پرچار کر رہے تھے۔ دلیل سے تہی دست طبقات کا ایک وطیرہ یہ بھی ہے کہ وہ اہل حق کے خلاف پروپیگنڈہ کے ذریعے اپنی باطنی سوزش کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس روش پر چلتے ہوئے ان لوگوں نے حضرت الاستاذ صاحبؒ کے بارے میں منفی پروپیگنڈے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ پر اتہامات اور الزامات کی بارش کردی اور دیوبندیت کے اس حقیقی ترجمان کو غیر مقلدیت، مجہریت اور وہابیت کے طعنے دے کر لوگوں کو آپ سے دور کرنے اور عوام کو بدظن کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مار ہائے آستین کی یہ سازشیں نہ ہوتیں تو یقیناً آج پوری پشتون پٹی سنت کے نور سے جگمگا رہی ہوتی۔

مجھے اس پر بھی شدید افسوس ہے کہ علمی اختلاف میں ان لوگوں کا اخلاص مفقود تھا، وگرنہ حقیقت حال کھلنے پر انہیں پشیمانی اور ندامت ہوتی، لیکن نہ حضرت کی حیات میں انہیں کوئی ندامت ہوئی اور نہ ہی شہادت کے بعد ان کے رویے میں تبدیلی آئی، فالی اللہ المشتکیٰ۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ بامن آں کرد آں آشنا کرد

تاہم ان تمام تر ناموافق حالات کے باوجود بحمد اللہ آج بھی ہنگو اور کوہاٹ سمیت اردگرد کے شہروں میں حضرت الاستاذؒ کے اثرات اور محنت کا رنگ کھلی آنکھوں سے نظر آتا ہے اور یہ اس بات کا واضح اعلان ہے کہ اہل حق کو حق کے پرچار میں کبھی لومۃ لائم کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور اپنی پرواز اور سفر بدستور جاری رکھنا چاہیے۔ حضرت الاستاذؒ کی ان کاوشوں کے باعث آپ علمی وتحقیقی مسائل میں روز اول سے اہل حق کے متفقہ مرجع رہے اور آپ کی یہ مرجعیت اتنی مسلّم تھی کہ آپ کے بغیر کسی اور طرف نگاہ اُٹھی ہی نہ تھی۔

اختلافی مسائل میں آپ کا طرز عمل:

اختلافی مسائل میں آپؒ کا طرز عمل ہمیشہ نہایت شائستہ اور متوازن رہا، مختلف فیہ فقہی مسائل میں اقرب الی السنۃ کو اختیار فرمایا کرتے تھے۔ فقہ، اُصول فقہ اور حدیث و اُصول حدیث میں اپنے عظیم اساتذہ کے فیض صحبت سے مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ فقہی مسائل میں آپ ایک بات بطور اُصول ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اس پر ہرگز اکتفا نہ کریں کہ فلاں مسئلہ چونکہ ہمارے مذہب حنفی میں مشہور ہے، اس لئے یہ واقعی فقہائے احناف کا مذہب ہے، بلکہ ہر مسئلہ کی تحقیق کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس مسئلہ میں فقہائے احناف کی واقعی رائے کیا ہے؟

آپؒ متاخرین کی کتابوں کے بارے میں بکثرت فرماتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ متاخرین کی بہت سی کتابوں میں رطب و یابس ہر قسم کے مسائل جمع ہو گئے ہیں۔ نقل در نقل اغلاط کا سلسلہ بھی

چلا ہے۔ بعض مسائل حسن ظن کی بنیاد پر تسلیم کر کے نقل کیے گئے ہیں۔ ایک عالم ربانی کی یہ ذمہ داری ہے کہ درست مسئلے اور درست دلیل کی نشاندہی کرے اور یہ تب ہوسکتا ہے جب بلا تحقیق کوئی بات قبول نہ کی جائے اور ہر حوالے کی تحقیق کی جائے، گو حوالہ دینے والی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، کیونکہ گزشتہ زمانے میں حافظہ کے اعتماد پر بھی حوالے دینے کا معمول تھا، جس میں بہرحال انسانی فروگذاشت سے مفر نہیں۔ اسی سلسلے میں بندہ کے استفسار پر آپؒ نے ایک بار فرمایا کہ عالمگیری متاخرین کی کتاب ہے، اسے معتمدات مذہب کا درجہ نہ دیا جائے، اس میں بہت سے مسائل تنقیح طلب ہیں۔

رمضان وعیدین میں آپ کا عمل حجاز مقدس کے ساتھ توافق کا تھا، آپؒ فرماتے تھے کہ حجاز مقدس سے مستند و اطمینان بخش اطلاعات پہنچنے کے بعد مزید کسی اعلان کی ضرورت باقی نہیں رہتی، فرماتے: اگر ایسا اتفاق ہو کہ حجاز مقدس میں عید ہو اور یہاں نہ ہو تو اس صورت میں لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے احتراز کرنا چاہیے۔

مسائل میاہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان میں طہارت ونجاست کے مسائل حد درجہ مختلف فیہ ہیں اور ان میں فقہا کے بہت سے متعارض اقوال ہیں، کسی جانب ایسی ٹھوس بنیاد نظر نہیں آتی، جس کی بنا پر ایک جانب واضح طور پر راجح ہو، لہٰذا ان مسائل میں فتویٰ عامۃ الناس کے لئے زیادہ تیسیر اور آسانی والی صورت پر دینا چاہیے، تاکہ عموم بلویٰ کے باعث لوگ مشقت میں نہ پڑیں اور حرج واقع نہ ہو۔

خلاصہ کیدانی کے مؤلف نے تشہد میں اُنگلی اُٹھانے کو ناجائز لکھا ہے، اس پر فرمایا کہ ہمارا حسن ظن ہے کہ ان تک رفع سبابہ کی احادیث نہ پہنچ سکیں، اس پر بندہ نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم جیسوں کو تو یہ معلوم ہوں اور ان جلیل القدر حضرات کو معلوم نہ ہوں۔ فرمایا: وہ زمانہ اس دور کی طرح طباعت کا تو تھا نہیں، بہت کم کتابیں دستیاب ہوتیں، لوگ ہاتھوں سے لکھا کرتے تھے، اس لئے ایسا ہونا کچھ زیادہ بعید نہیں۔

الغرض حضرت الاستاذ کامل علم وعمل کی ایک نادر و نایاب شخصیت تھے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ آپ کے اس تذکرہ کو ہر خاص وعام کے لئے نافع بنائے اور ہمیں آپ کے فیوض سے محروم نہ فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

زخم فراق

مولانا محمد اسلام، کراچی

قبائے نور سے سج کر لہو سے باوضو ہو کر
وہ پہنچے بارگاہ حق میں سرخرو ہو کر

حضرت الاستاد مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ محقق عالم، صاحب نسبت ولی، بے مثال مربی اور بے حد شفیق انسان تھے۔ آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ کی گراں قدر مساعی نصف النہار کی طرح روشن ہیں جن کی تابانی کسی پر مخفی نہیں۔ اہل علم کے لئے آپ کی مثال اس ٹھنڈے میٹھے پانی کے مانند تھی جو ایک لق ودق صحرا میں سراب زدہ پیاسے کو سخت گرمی کے موسم میں میسر آ جائے۔

حضرت الاستاد رحمہ اللہ علیہ عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وعشق صحابہؓ میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے جامعہ یوسفیہ کا پورا اجر وثواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بخش دیا تھا۔ حالت جذب میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اے محمد امین! مدرسہ کے ثواب کی وجہ سے آپ جنت میں جا سکتے ہیں تو میں قبول نہیں کروں گا۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" کے اور "الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم" کے مصداق تھے۔ یہ ناچیز جب بھی حضرت کے ساتھ نماز میں کھڑا ہوا تو امام کی تلاوت قرآن شروع ہوتے ہی آپ کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ ذکر کرتے وقت بھی یہی حالت ہوتی تھی۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ امن، خیر خواہی، تقویٰ اور ذوق علم کے حوالے سے ایک خاص نظریے کے آدمی تھے، جسے میں 'صلاح وخیر کے حامل' کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ آپ کے اس نظریے کا عکس صرف جامعہ ہی میں نہیں بلکہ ملک وبیرون تمام اجل تلامذہ میں بھی نظر آتا ہے۔ آپ کے شاگرد جہاں کہیں بھی ہیں تمام مصلحانہ وخیر خواہانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ مفسد نہیں تھے، یہ ناچیز حضرت کے ساتھ چھ سال طالب علم کی حیثیت سے رہا ہے، اس عرصہ میں کوئی ایسی بات آپ کی زبان سے نہیں سنی جو فساد پھیلانے والی ہو اور نہ ہی ہمیں کوئی ایسی تربیت دی کہ ہم کوئی فساد پھیلائیں یا فساد پھیلانے والوں کا ساتھ دیں۔ اس کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ ایک موقع پر میں نے حضرت سے جہادی ٹریننگ حاصل کرنے کی اجازت چاہی۔ تو اجازت نہیں دی، کیونکہ حضرت بصیرت والے تھے وہ جانتے تھے کہ ناسمجھ اور نوجوان ہے، کہیں یہ جنگی استعداد حاصل کر کے ملک وملت اور اپنی ذات کے لئے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔

نہ ہی کسی طالب علم کو جلسہ جلوسوں، ہڑتالوں اور احتجاجوں میں شرکت کی اجازت دیتے تھے۔ ملک بھر میں امن کے داعی و متمنی تھے۔ جہاں بھی فساد شروع ہو جاتا، تو پریشان ہو جاتے اور اکثر رو رو کر فرماتے کہ" آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دل سے خون"۔

حضرت دشمن کے لئے بھی خیر خواہ تھے اور دوستوں کے لئے بھی۔ اپنے تو اپنے لیکن اگر دشمن آجاتا تو اسے اس طرح سینے سے لگا کر ملتے کہ ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ یہ تو میرا کوئی پرانا دوست تھا، ایک مرتبہ ایک آدمی آیا تو حضرت کو میں نے دیکھا کہ ہنستے ہوئے پرانے دوست کی طرح ملے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آدمی شیعہ تھا۔ اس طرح جس مکتب فکر کے لوگ آتے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ ان سے بہت ہی پیار و محبت اور شفقت والا رویہ اختیار فرماتے، ہر شریک مجلس کی بات نہایت توجہ کے ساتھ سنتے، ہر ایک کو بولنے اور اظہار خیال کا موقع دیتے اور اگر کسی کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تو انتہائی محبت و شفقت کا اسلوب اختیار کرتے۔

حضرت الاستاد صاحب رحمہ اللہ دنیا سے بے تعلق تھے، سادگی کو پسند فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی دنیا سے بے تعلقی اور سادگی اختیار کرنے کی ترغیب اپنے عمل سے دیتے تھے۔ بندہ نے جب دورۂ حدیث مکمل کر لیا تو میرے والد صاحب کا اصرار تھا کہ آپ تبلیغی جماعت میں سال لگا لیں۔ میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے مشورہ لینے حاضر ہوا۔ حضرت نے استخارہ کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ میں بھی استخارہ کرتا ہوں۔ صبح جب گھر سے تشریف لائے تو میرا نام لے کر فرمایا کہ اسلام! استخارہ کیا ہے؟ بندہ نے جواب دیا کہ جی ہاں اور میں نے اپنا خواب بھی بیان کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ کے لئے سال میں جانا بہتر ہے، آپ چلے جائیں۔

پھر رخصت ہونے سے پہلے دو نصیحت فرمائیں: ایک یہ کہ تبلیغ میں سال کس نیت سے لگاؤ گے؟ میں خاموش ہو گیا تو فرمایا کہ اپنی اصلاح کی نیت سے جاؤ، من جانب اللہ آپ کی اصلاح بھی ہو جائے گی اور آپ کے ذریعہ سے اور لوگوں کا بھی فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ آپ کے دل میں دنیا کی محبت ہے، اس کے ساتھ ہی ہاتھ اٹھا کر اس ناچیز کو پیشانی پر ایک تھپڑ رسید کیا اور فرمایا کہ دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دو اور فرمایا: جہاں بھی تدریس یا امامت کا موقع ملے تو تنخواہ کی شرط نہیں لگانا۔ یقین جانیے کہ نامعلوم اس تھپڑ میں کیا اثر تھا، حضرت کی بات سنتے ہی میرے دل سے دنیا کی محبت ختم ہوتی محسوس ہوئی اور ابھی تک اس نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے کہ بغیر تعیین تنخواہ کے کام کی توفیق ملتی ہے۔ حضرت خود بھی دنیا سے بے نیاز تھے اور دوسرں کو بھی دنیا سے بے نیازی کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرتؒ خود بھی کثرت سے عبادات الٰہی کے پابند تھے۔ تہجد، اوابین، اشراق اور درود شریف کی کثرت کا معمول

تھا۔ تدریسی مشاغل، تصنیفی کام، مدرسہ کی ذمہ داری، عوامی، ملکی اور علاقائی مسائل کی کثیر مصروفیات کے باوجود انفرادی اعمال کی پابندی فرماتے تھے۔ الغرض حضرت الاستاذ العلماء ورثۃ الانبیاء کے صحیح اور سچے مصداق تھے۔

لیکن ایسی باکمال شخصیت، ملک وملت کے خیرخواہ اور علمی دنیا کے مایہ ناز رہنما کو ملک وملت اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے ہم سے الگ اور جدا کر دیا۔ جب حضرت شہید ہو گئے تو یہ ناچیز کراچی میں تھا، پتہ چلا کہ یہ جانکاہ حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میری بدقسمتی تھی کہ بعد بعید کی وجہ سے جنازے پر حاضری ممکن نہ تھی۔ میں اپنے بھائی حضرت مولانا یوسف حفظہ اللہ کے ساتھ اس غم کے موقع پر شریک نہ ہو سکا۔ بہرحال پریشانی اور غم کی فضا تھی سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس غم وفکر میں مبتلا تھا کہ حضرت الاستاذؒ کیسے شہید ہوئے ہوں گے؟ جسم مبارک پر کہاں کہاں زخم لگے ہوں گے؟ آپ کی پرنور پیشانی کیسے خون آلود ہوئی ہوگی؟ کئی دن گزرنے کے بعد حضرتؒ سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ قبر مبارک سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ دیکھو! میں بالکل ٹھیک ہوں اور واپس قبر میں تشریف لے گئے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر خواب میں ملاقات ہوئی کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور ہر شخص پر خوف وگھبراہٹ طاری ہے۔ یہ ناچیز بھی گھبراہٹ وخوف میں مبتلا ہے کہ اچانک استاد محترم تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے اس کے ساتھ ہی سارا خوف ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے حقیقت بنا دے۔ آمین

حضرتؒ کی شہادت کو اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اور پوری دنیا کے انسانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنا دیں اور پوری دین کی سربلندی کا سبب بنا دیں۔ تصنیف وتحقیق کے حوالے سے حضرتؒ کے افکار وعزائم اور بلند ارادے آپ کی زندگی میں پورے نہ ہو سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے التجا ہے کہ حضرت کے تمام شاگردوں اور لواحقین کو اتنی استعداد عطا فرمائے کہ انہیں پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔ آمین

صدق ووفا کی دو تصویریں

مولانا رضوان اللہ قریشی، ٹانک

بندہ کے والد گرامی حضرت مولانا نور سید شاہ صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کے ہم سبق تھے۔ والد گرامی اور استاذ صاحب کا تعلق محض دوستی یا رفاقت کا نہ تھا، بلکہ دونوں کے تعلق اور باہمی رویے دیکھنے والے کو سگے بھائیوں کا گمان ہوتا۔ حضرت الاستاذ گویا ہمارے گھر کے فرد تھے اور والد گرامی کا بھی اُن کے ہاں یہی مرتبہ تھا۔ ۴۰ سالہ رفاقت میں دونوں حضرات کے مابین کبھی اختلاف یا ناراضگی کی نوبت نہیں آئی۔ جنوبی وزیرستان وغیرہ کے اسفار میں حضرت الاستاذ کا مستقل ٹھکانہ ہمارا غریب خانہ ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہم دونوں نے چالیس سالہ رفاقت نبھالی، آپ اور یوسف کا امتحان ہے کہ کتنا عرصہ نبھاتے ہو۔ شہادت سے ایک ہفتہ قبل مجھ سے فرمایا کہ دل چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے آپ کے ہاں آجاؤں اور ان ہنگامہ ہائے حیات سے سکون حاصل کراوں۔

ایک بار ہم جماعت طلبہ ساتھیوں نے مجھ سے ''قریشی'' کی نسبت پر کافی بحث کی، ان کا مدعا یہ تھا کہ آپ قریشی نہیں، یہ نسبت آپ نے مروجہ طرز سے متاثر ہو کر لگائی ہے، انہوں نے کچھ اور دلائل بھی دیئے جس پر میں کچھ متردد ہوا۔ اسی رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص ایک معروف بزرگ کی شکل میں دکھائی دیئے۔ میں ان سے ملا تو کسی نے بتایا کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ میں نے حضرت الاستاذ سے اس خواب کا ذکر کیا تو دفعتاً فرمایا کہ کیا آپ کو اپنے قریشی النسب ہونے میں شک ہے؟ میں حضرت کے فن تعبیر سے ممارست اور اس کشف پر حیران ہو گیا۔

اس قریبی تعلق کے ناطے بچپن ہی سے حضرت اُستاذ صاحب کی شفقتوں اور محبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ میرے چچا محترم مولانا محمد جمیل قریشی صاحب دامت برکاتہم کو والد گرامی نے درجہ رابعہ سے حضرت الاستاذ کی نگرانی اور ترتیب میں داخل کرایا، اُنہوں نے درس نظامی کی تکمیل اور بعد ازاں تدریس حضرت ہی کی نگرانی اور رہنمائی میں کی۔ اسی طرح میرے چچا زاد بھائی مولانا معراج الدین شہید (سابق ایم، این، اے جنوبی وزیرستان) بھی حضرت الاستاذ کے قریبی اور معتمد تلامذہ میں سے تھے اور قبائل میں بدامنی کے خاتمے کے لئے مولانا شہیدؒ کی گراں قدر کوششوں اور کاوشوں کی پشت پر حضرت الاستاذ کی رہنمائی اور مشوروں کا بھی بڑا دخل تھا۔ ان خاندانی قربتوں کے باعث فقیر کو بھی والد صاحب نے تعلیم وتربیت کے لئے حضرت الاستاذ کے حوالے کیا جو میری بہت بڑی سعادت اور خوش قسمتی تھی۔

حضرت الاستاذ کی زندگی اوصاف اور کمالات کا مجموعہ تھی، کوئی ایسی صفت مادحہ بندہ نہیں پاتا جو آپ میں موجود نہ ہو، مروت ایسی تھی کہ بندہ نے اپنی زندگی میں کہیں اور نہیں دیکھی۔ پانچ سال آپ کی صحبت میں گزارے لیکن کبھی ڈانٹ ڈپٹ یا سخت کلمہ ارشاد نہیں فرمایا، ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ وفاداری اور مہمان نوازی تو گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ علم اور تقویٰ کے بارے ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں کہ بات کرسکیں۔

چونکہ حضرت الاستاذ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بہت سارے اہل قلم لکھ رہے ہیں۔ اس لئے انہی باتوں کے تکرار کے بجائے میں حضرت والد صاحبؒ اور حضرت الاستاذؒ کے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں پیش کروں گا، جو بندہ نے حضرت والد گرامیؒ سے مختلف مواقع پر سنیں۔

ایک بار فرمایا کہ ہم دونوں مولانا عبدالحلیم دیروی دامت برکاتہم (استاذ الحدیث جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک) کے ترجمۂ قرآن کی مجلس درس میں بیٹھے تھے جو کوہاٹ شہر کی ایک مسجد میں ہر سال سالانہ چھٹیوں کے موقع پر منعقد ہوتی تھی۔ حضرت الاستاذ کی حذاقت اور ذہانت کا یہ عالم تھا کہ استاذ جو کچھ بیان کرتے وہاں یہ مختلف مفسرین کی آرا ساتھ ساتھ ازخود لکھتے جاتے کہ یہاں بیان القرآن میں یہ لکھا ہے، ابن کثیرؒ میں یہ ہے اور قرطبی میں یہ ہے اور کبھی کبھار مجھے بھی آہستہ آواز سے بتلاتے جاتے۔ اس پر ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بڑا سخت غصہ چڑھتا تھا۔ ایک بار انہوں نے استاذ سے ہماری شکایت بھی لگائی کہ یہ دونوں دوران درس اپنی ہانکتے رہتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔

والد گرامی نے بتایا کہ حضرت الاستاذ بچپن سے حاذق اور حد درجہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی پاک طینت اور پارسا بھی تھے۔ گناہوں سے اللہ تعالیٰ نے طبعی نفرت نصیب فرمائی تھی اور اس تقویٰ کا ایک نور آپ کے چہرہ پر نظر آتا تھا۔

فرمایا کہ حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ ایک بار کوہاٹ تشریف لائے، حضرت الاستاذؒ نے شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحبؒ کو سفارشی بنا کر بیعت کی درخواست کی تو آپ کو بیعت فرمالیا، وگرنہ حضرت طلبہ کو بیعت نہیں فرماتے تھے کیونکہ اس سے قبل ایک بار ہم دونوں حضرت غورغشتوی صاحبؒ کے ہاں بیعت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے تو آپ نے انکار فرمایا تھا اس واقعہ کی تفصیلات والد گرامی نے ایک دفعہ پنڈی میں بیان کیں۔ اس مجلس میں برادرم مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا عدنان کاکاخیل صاحب بھی موجود تھے۔ فرمایا کہ ایک بار حضرت الاستاذؒ نے مجھ سے حضرت غورغشتویؒ کے ہاں حاضری کا کہا، ہم دونوں تیار ہوئے، اُس وقت حضرت الاستاذ کی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، تھوڑی پر چند بال تھے، جب ہم حضرت غورغشتویؒ کے ہاں پہنچے تو دوپہر کا وقت تھا اور حضرت مسجد کے باہر تختے کے ایک تھڑے پر لیٹے آرام کررہے تھے۔ ہم ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد حضرت

بیدار ہو کر مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت الاستاذ اور میں بھی پیچھے چلے گئے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ دیکھیں وہ وضو مشاہدہ کریں جو ہم نے قدوری میں پڑھا تھا۔ حضرت نے وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر آنے کی غرض پوچھی۔ ہم نے عرض کیا کہ طلبہ ہیں اور بیعت ہونے کی غرض سے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دورۂ حدیث کرنے کے بعد بیعت ہونا۔ فی الوقت درود پاک، استغفار اور تیسرے کلمے کا ورد کر لیا کریں۔

جب ہم دونوں نے اوراد شروع کیں تو چند دن بعد حضرت الاستاذؒ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی، آپ رفتہ رفتہ کمزور ہوتے جارہے تھے، ہر وقت بجھے بجھے اور پریشان سے رہتے، مجھے تشویش تھی کہ نا معلوم انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایک دن میں نے بٹھلا کر پوچھا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے، چلو حکیم صاحب کے پاس چلتے ہیں، پھر میں ان کو حکیم کے پاس لے گیا، انہوں نے دوا تجویز کی لیکن اس سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔ میں نے ایک بار بہت اصرار کر کے پوچھا کہ آخر کوئی تکلیف تو ہوگی، وہ بتادو۔ اس پر فرمایا کہ بتا تو دیتا ہوں، لیکن میری زندگی میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے، یہ راز اور امانت ہوگا۔

والد گرامی فرماتے تھے کہ میں نے زندگی بھر آپ کی اس امانت کا پاس رکھا۔ آج اُن کی شہادت کے بعد پہلی بار بتا رہا ہوں، فرمایا کہ حضرت غورغشتویؒ نے جو اوراد تلقین کیے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد مجھ پر کچھ عجیب سی کیفیات طاری ہو رہی ہیں اور ایک شدید کیفیت یہ ہے کہ مجھے جھوٹ، غیبت اور مختلف گناہ کبیرہ کی مختلف بدبوئیں آتی ہیں جو بندہ جھوٹ بولتا ہے، اُس کے منہ سے پاخانے کی بو آنا شروع ہو جاتی ہے، جو غیبت کرتا ہے اُس سے سڑی ہوئی چیز کی بو آتی ہے۔ اس چیز سے اتنی سخت کوفت ہوتی ہے کہ بس یہی میری بیماری کا سبب ہے۔ والد گرامی فرماتے تھے کہ یہ سن کر میرے تو رونگھٹے کھڑے ہو گئے، یہ باتیں تو ہم نے اساتذہ سے امام صاحبؒ کے بارے میں سنی تھیں کہ انہیں کبائر کا اثر محسوس ہوتا تھا اور گناہوں کے اثرات وضو کے پانی سے دھلتے نظر آتے تھے۔

حضرت والد صاحب سے حضرت الاستاذؒ کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک بار مجھے فرمانے لگے کہ رضوان! اللہ کرے میری موت تیرے والد سے پہلے آئے، ورنہ میں ان کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر پاؤں گا، حالانکہ حضرت نے پہاڑوں جیسے صدمے سہے تھے۔ خود حضرت والد گرامیؒ کی حالت بھی حضرت الاستاذ صاحبؒ کی شہادت پر ہمارے لئے نا قابل برداشت تھی۔ صدمے کا اثر طبیعت پر اس قدر زیادہ تھا کہ پوری طرح مضمحل ہو گئے تھے اور کئی دن تک طبیعت بحال نہ ہو سکی تھی۔

آپ نے زمانہ طالب علمی میں مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے بعض مصنفین کی تحریرات کا رد لکھا، اس

وقت آپ سخت بیمار تھے، جب گھر جارہے تھے تو والد صاحب کے نام ایک وصیت نما خط لکھا، جس میں اس تحریر کی اشاعت کے بارے استدعا تھی، اس تحریر کو نصف صدی سے زیادہ بیت گئی، اس سے محبت باہمی کا رنگ آج بھی چھلکتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''محترم المقام صدیقی العزیز مولانا نور سید شاہ صاحب قریشی سلمہ اللہ تعالی کی خدمت گرامی میں التماس ہے کہ بندہ نے ''جائزہ'' نامی کتاب پر جوابی اور تحقیقی کلام کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر مولائے کریم کو کچھ اور ہی منظور تھا، چنانچہ کتاب مذکور کے بعض مضامین پر تبصرہ کرنے کی توفیق اپنے حقیقی محسن نے عطا فرمائی، اگرچہ یہ تبصرہ میں نے حالت مرض میں لکھا مگر بفضل خدا غور وفکر کے ساتھ لکھا، اس لئے امید ہے کہ لفظی لغزشوں کے علاوہ مضامین میں زیادہ اختلال واقع نہ ہوگا لیکن انسان خطا کا پتلا ہے ممکن ہے کہ بعض مقامات میں بندہ سے غلطی ہوگئی ہو یا کچھ الفاظ نازیبا مستعمل کئے گئے ہوں اس لئے میں بالحاح عرض کرتا ہوں کہ آپ میری تحریر پر غور وتأمل کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی نگاہ ڈالیں اور جو خامیاں ہوں ان کو وضاحت کے ساتھ رفع فرمادیں اور چونکہ یہ تحریر ناقص رہ گئی میرے وطن جانے کی وجہ سے، اس لئے اگر سلامتی کے ساتھ وطن سے واپس ہوا تو خود اس کی تکمیل کی کوشش کروں گا مگر مجھے اپنی علالت کچھ اور قسم کی محسوس ہوتی ہے، نیز ویسے بھی ''کل نفس ذائقة الموت'' اور ''کل من علیها فان'' کی گھنٹی ہمارے سروں پر بج رہی ہے، اس لئے وصیۃً عرض کرتا ہوں کہ میری اس تحریر کا تکملہ لکھ کر اور اسے زیور تکمیل سے آراستہ فرما کر طباعت اور اشاعت کی کوشش کریں، ان شاء اللہ آپ کا یہ کارنامہ میرے لئے صدقہ جاریہ بن کر تقصیرات کی کمی کا باعث بنے گا اور موجب خوشنودیٔ مولیٰ ہوگا، اشاعت کے اخراجات کا تحمل دشوار ہے مگر میرے اہل خانہ سے اس کی اطلاع دے کر کچھ سہولت میسر ہوجائے گی، چونکہ یہ صریح نصرت ہے دین حقہ کی، اور حمایت ہے اہل حق کی، اس لئے میرے معروضات کو قبولیت کا حلیہ پہنائیں گے، فقط آداب وتسلیمات

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

العبد المهین محمد امین کان اللہ لہ

۱۵ر صفر المظفر ۱۳۸۴ھ یوم الجمعۃ المبارکۃ بوقت ۱۰ بج کر ۸ منٹ''

غالباً یہ ان دونوں حضرات کے خامسہ کا سال تھا، اس عمر میں علم وتحقیق سے اس درجہ شناسائی کہ ایک بہت بڑے مصنف کی کتاب کا رد لکھا جارہا ہے، وہ بھی بیماری کے ایام میں۔ پھر اس کی اشاعت کی تگ ودو کی جارہی ہے، نیز باہم محبت ومؤدت کا ایسا لازوال تعلق ہے کہ زندگی سے مایوسی پر اپنے تراث کا وارث ووصی دوسرے کو بنایا جارہا ہے۔ ایسی بے لوث محبت اور دوستی اس دور میں کہاں سے مل سکتی ہے؟

اُستاذ صاحب کی شہادت کے بعد جب پہلا رمضان تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ میں نے رمضان اور عید حضرت الاستاذؒ کے بچوں کے ساتھ گزارنی ہے تا کہ اُن کی تسلی کا سامان ہو، اس پیرانہ سالی میں ہنگو تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ استاذ صاحب کے بچوں کی تطیب خاطر کے لئے جامعہ یوسفیہ میں مقیم رہے۔

اس سے ان دونوں اکابر کی باہمی محبت ومودت اور تعلق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، افسوس کہ ہم بہت جلد دونوں حضرات کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے، اب بس اُن کی یادیں اور تذکرے ہی باقی رہ گئے۔ وہ صدق وصفا اور اخلاص وللٰہیت والے لوگ تھے۔ اُن کے تعلقات میں سچائی تھی، بے غرضی تھی، مفاد اور غرض کے بندے نہیں تھے، اس لئے ان کا تعلق طمانیت، راحت اور سکون کا باعث ہوتا۔ اب ایسی صدق وصفا کی مثالیں ڈھونڈیں تو کہاں ڈھونڈیں۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو

حافظ محمد قاسم، ہنگو

یہ ستر کی دہائی کی بات ہے ہم چھوٹے بچے تھے، ہمارے خاندان میں دینی رجحانات اور مزاج کے باعث علما اور اولیا کی محبت اور تعلق بہت بڑی سعادت سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے علاقہ کے ایک نوجوان خوب صورت عالم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ دورۂ حدیث کر کے آئے، علما سے محبت کے ناطے ہمیں اُسی زمانے میں اُن سے اُنس اور محبت ہو گئی، پھر وہ کراچی تدریس کے لئے واپس چلے گئے لیکن ہر سال سالانہ چھٹیوں میں تشریف لاتے، چھٹیوں میں اُن کا معمول تھا کہ اپنے گھر کے پاس چھوٹی سی مسجد میں ناظرہ کی کلاس شروع کر لیتے، بچوں کو نماز اور دُعائیں سکھاتے اور جو بچے ناظرہ پڑھ چکے ہوتے، انہیں حسب استعداد کوئی کتاب پڑھاتے۔ بندہ کو خوب یاد ہے کہ میں نے اُسی زمانے میں جب میری عمر آٹھ نو سال تھی حضرت سے احادیث یاد کرنا شروع کی تھیں۔ ان میں سے ایک حدیث مبارک کا مفہوم آج بھی ذہن میں تازہ ہے کہ ''اگر کوئی چاہتا ہے کہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے باتیں کرے تو وہ وضو کر کے قرآن کی تلاوت کرے، یہ ایسا ہے گویا یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام میں مشغول ہے۔''

جب حضرت کراچی سے مستقل تشریف لائے اور جامعہ قائم ہوا تو ہمیں اولین طلبہ میں شمولیت کا شرف ملا۔ میں نے حفظ شروع کیا اور حفظ کی تکمیل کے بعد حضرت نے بطور مدرس حفظ میری جامعہ ہی میں تقرری فرمائی، پھر حضرت کی صحبت اور نگرانی میں بحمد اللہ سولہ سال مسلسل قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا، اس زمانے کی کچھ یادیں اور باتیں پیش خدمت ہیں، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے۔ آمین

حضرت کا جو سب سے بڑا احسان ہمارے علاقے پر مجھے محسوس ہوتا ہے، وہ علاقے میں قرآن کی شمع روشن کرنا ہے۔ ہمارے علاقوں میں حفاظ کی اتنی قلت تھی کہ لوگ ماہ رمضان میں تراویح میں ختم قرآن کے واسطے دور دور سے حفاظ کو بلاتے تھے۔ حضرت کی محنت سے چند سالوں میں ہمارے علاقے میں کوئی گھر ایسا مجھے نہیں ملتا تھا جس میں حافظِ قرآن نہ ہو۔ ایک دفعہ میں حضرت کے ساتھ پیدل جا رہا تھا تو چلتے چلتے کئی حفاظ سامنے آتے ہوئے ملے۔ اس پر حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ ماشاء اللہ حفاظ کی کتنی کثرت ہوگئی ہے، اب تو دل کرتا ہے کہ اس علاقے کا نام 'حافظ آباد' رکھ دیں یہ حقیقت تھی کہ جامعہ یوسفیہ کی برکت سے ہر محلے میں حفظ و ناظرہ کے مکاتب بن گئے تھے اور اب تو الحمد للہ یہ تعداد یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک شخص کی اولاد میں کئی کئی لوگ حفظ قرآن کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔

علاقہ پر حضرت کا جو دوسرا بڑا احسان میری سمجھ میں آتا ہے، وہ توہمات، بدعات اور رسومات کا خاتمہ ہے۔ حضرت کی آمد سے قبل ہمارے ہاں سنت و بدعت میں کچھ امتیاز نہیں تھا بلکہ بعض رسوم و رواج اور بدعات فرائض سے زیادہ التزام سے کی جاتی تھیں۔ اللہ کرے کہ یہ گستاخی نہ ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہمارے خطے کے دیوبند کی طرف منسوب علما بھی ان رسوم و بدعات میں عام طور پر شریک ہوتے۔

حضرت نے بڑے ہی حوصلے، حکمت اور تدبر سے ان رسوم و رواج کا مقابلہ شروع کیا اور اس انداز سے کیا کہ ہمیں اس کی مثال اپنے علاقے میں کہیں اور نہیں ملتی۔ نہ تو پر تشدد مناظرے ہوئے، نہ تصادم کی نوبت آئی، نہ نعرے بازی اور اشتہار بازی ہوئی، ہم دیکھتے رہے کہ ہمارے سامنے رفتہ رفتہ ایک خاموش انقلاب برپا ہو گیا۔ مخالفت کی بجائے معاونت بڑھتی رہی اور دن بدن حضرت کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

سولہ سالہ تدریسی زمانے میں میں نے تین چیزوں کے علاوہ حضرت سے کسی اور چیز کے بارے میں نفرت کے رویے کا مشاہدہ نہیں کیا، بس تین چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ (۱) شرک (۲) بدعت (۳) اور ظلم۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ معاشرے سے تفرقہ بازی اور اختلاف تب ختم ہو سکتا ہے اور امن و سکون تب آ سکتا ہے، جب عقیدہ کو شرک سے، عمل کو بدعت سے اور رویوں کو ظلم سے پاک کر دیا جائے۔ حضرت کی برکت سے شرک، بدعت اور ظلم تینوں کی جڑیں بحمد اللہ کھوکھلی ہوئیں اور تینوں کے حاملین کا ناطقہ بند ہوا۔

ہمارے خاندان کو یہ سعادت حاصل رہی کہ یہ رسوم و رواج اور بدعات کے خلاف روزِ اول سے حضرت کا حامی خاندان و مددگار رہا اور حضرت کی تعلیمات اور نظریے سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا۔ حضرت بھی ساری زندگی اس کے قدر دان رہے، اپنی زندگی میں ہمارے ساتھ شفقت و محبت اور توجہ و عنایت کا جو معاملہ رکھا اُس کا احسان ہماری رہتی نسلیں نہیں چکا سکتیں۔ پھر آپ کی عنایات آپ کی زندگی کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوئیں بلکہ ہمارے خاندان کے بارے میں اپنے اہل خانہ کو بطورِ خاص وصیت کی کہ ان کا ہمیشہ خیال رکھنا اور ان کے ساتھ تعلق داری میں کبھی کوتاہی نہ برتنا۔

حضرت کا توکل بھی مثالی تھا، مجھے حضرت کے ساتھ بیسیوں اسفار میں رفاقت کا شرف ملا۔ بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں سے ملاقاتیں رہتیں، لیکن اس پورے عرصے میں مجھے کبھی محسوس نہ ہوا کہ حضرت نے مدرسے کے واسطے کسی سے کوئی طمع رکھی ہو۔ جامعہ میں زمانہ طالب علمی اور پھر سولہ سالہ تدریس کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت نے ہمیں مدرسے کے واسطے گھروں یا خاندان میں چندے کی ترغیب دینے کا فرمایا ہو یا ہمارے سامنے کبھی مدرسہ کی مشکلات رکھی ہوں، حتیٰ کہ عید الاضحیٰ میں قربانی کی کھالیں یا گندم کٹائی کے موسم میں عشر کے بارے میں بھی

کبھی اشارے کنایے سے ہمیں یہ تاثر نہیں دیا کہ مدرسہ کے لئے جمع کرلیں۔ مجھے تو باجود تجسس کے کبھی اس کا علم نہ ہوسکا کہ مدرسہ کیسے چل رہا ہے؟ اور اخراجات کہاں سے پورے ہورہے ہیں؟ حضرت کا ایسا عجیب مزاج تھا کہ کبھی رتی بھر آپ کی توجہ مخلوق کی طرف نہیں گئی، ہمیشہ اسی ذات کی طرف متوجہ رہتے اور متوجہ رہنے کا فرماتے جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کے سارے خزانے ہیں۔

ہم نے جب بھی حضرت سے نصیحت کا کوئی مطالبہ کیا تو عموماً اللہ کی ذات پر توکل اور اپنے مسائل کو اعمال کی طاقت پر حل کرنے کی ترغیب دیتے، فرماتے: اعمال کی مستقل تاثیر ہے، آج اغیار کی محنت سے ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہیں کہ پونسٹان کی گولی کس چیز سے بنی ہے، لیکن ایک ڈاکٹر کے قول پر اعتماد ہے اور اس اعتماد اور بھروسے پر ایک عام ان پڑھ دیہاتی خاتون بھی اس بات کو جانتی ہے کہ یہ گولی سردرد میں کام کرتی ہے، جب کہ اعمال کی تاثیر کے بارے میں صحیح احادیث وارد ہیں، خاص خاص اعمال کی خاص خاص تاثیرات بتائی گئی ہیں اور بتانے والے صدیقین اور سچوں کے سردار حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے، لیکن ہماری توجہ اس طرف نہیں جاتی۔ کبھی کبھار ہنسی میں فرماتے کہ ہمارے بعض دوست اعمال اور عملیات کی تاثیرات کے خلاف لگے ہوئے ہیں لیکن ان کی تاثیر ثابت بھی ہے اور مجرب بھی ہے۔ مجھے عملیات سے کسی قدر لگاؤ تھا، ایک بار میں نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ حضرت آپ کی تصنیفی، علمی اور سماجی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ میں باقی کاموں میں تو معاونت سے رہا، لیکن اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ عملیات کی ذمہ داری میں سنبھال لوں، اس پر بڑے ہی خوش ہوئے اور دُعا سے نوازا، پھر فرمایا: قاری صاحب! مجھے عملیات سے کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہیں، لیکن میں نے یہ خدمت اس لئے سنبھالی کہ لوگ بدعقیدہ لوگوں کے پاس جاکر ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اپنے مال کے ساتھ ایمان کی دولت بھی ضائع کردیتے ہیں۔ حضرت کو اس درجہ لوگوں کے ایمان واسلام کی فکر تھی۔

بہت سے حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر حضرت کراچی سے نہ آتے تو بڑا علمی کام کرجاتے، لیکن میں تو کہتا ہوں کہ اگر حضرت اپنے علاقہ تشریف نہ لاتے تو پتہ نہیں آج ہم کس عقیدے پر مرتے، کیونکہ شرک وبدعت اور رسوم ورواج کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ حضرت جیسی ہمت واستقلال کے بغیر ہمارے لوگوں کا شفاف عقیدے پر آنا بظاہر ناممکن لگتا تھا، لہٰذا حضرت کا کراچی سے تشریف لانا ہمارے اُوپر اللہ کا بہت بڑا احسان تھا اور حضرت نے اپنے علاقے میں جتنی ہمہ جہت خدمات سرانجام دیں، کراچی میں اُن کا تصور نہ ہو پاتا۔

حضرت کی اساتذہ اور طلبہ پر شفقت اور اُن کے ساتھ محبت کا برتاؤ ایسا تھا کہ آپ پر جان چھڑکنے کو دل کرتا۔ آپ فرماتے کہ ہر استاذ وطالب علم مجھے اتنا عزیز ہے جتنا مجھے ''یوسف'' عزیز ہے۔ کبھی کبھار ہم ساتھی آپس میں اس پر بحث

کرتے کہ ایک کہتا کہ استاذ صاحب کی محبت مجھ سے زیادہ ہے اور اس پر شواہد پیش کرتا اور دوسرا کہتا کہ نہیں مجھ زیادہ ہے اور اُس پر دلائل دیتا۔ اس محبت کا اثر تھا کہ مدرسہ تو چھوڑیں ہم گھر میں بھی غلطی کرنے سے ڈرتے کہ کہیں استاذ صاحب کو اس کا علم نہ ہو جائے۔ حضرت نے اس شفقت ومحبت کے ساتھ ہماری تربیت کے لئے ڈانٹ ڈپٹ بھی قائم رکھی، لیکن اُس میں بھی بندہ نے تو عجیب شفقت دیکھی، آپ کی ڈانٹ میں اس کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ آپ کسی کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں یا اُسے ذلیل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ عتاب میں بھی مخاطب کی عزت نفس کا پورا خیال رکھتے، سب کے سامنے نہیں ڈانٹتے تھے، بلکہ تنہائی میں بلا کر تنبیہ فرماتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں جب ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو بعض اوقات ہماری اصلاح کے لئے معانقہ چھوڑ کر مصافحہ پر آجاتے، جب غلطی شدید ہوتی تو تین دن تک بات چیت بند کردیتے۔ یہ سزا ہمارے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہ ہوتی، اپنے محبوب کی یہ ناراضگی دل چیر دیتی ایسی پریشانی اور تکلیف ہوتی کہ آئندہ کے لئے توبہ کر لیتے، دل چاہتا کہ کاش جسمانی سزا دیتے لیکن یہ سزا نہ دیتے۔

ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار میرے بارے میں کچھ تشویش ناک خبر آپ کو ملی۔ آپ نے اس سے مجھے فوری طور پر آگاہ کرنا ضروری سمجھا اور آگاہ نہ کرنے اور ہدایات نہ دینے میں میری شدید تکلیف اور مصیبت کا خطرہ تھا۔ اس کے لئے ایک بندہ میرے پاس بھیجا کہ انہیں مدرسہ بلالیں، وہ شخص میرے پاس آیا، ابھی میں اُس کی چائے پانی سے بھی فارغ نہیں ہو پایا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ حضرت خود تشریف لا چکے ہیں اور گھر کے باہر کھڑے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا نکلا، حیرانی کے عالم میں آگے بڑھ کر عرض کیا: حضرت! میں حاضر ہونے والا تھا، آپ نے کیسے زحمت فرمائی۔ فرمایا: قاری صاحب! آنے کا پیغام تو آپ کے پاس بھیج دیا تھا لیکن پھر دفعۃً خیال آیا کہ پیغام موصول ہونے اور آپ کے آنے میں تاخیر نہ ہو جائے اور اس سے آپ کے حرج اور تکلیف کا اندیشہ تھا، اس لئے خود ہی تفصیلات عرض کرنے حاضر ہو گیا، میں نے اپنے ساتھ اس ہمدردی کے مظاہر پھر کسی اور کے نہ دیکھے۔

زمانہ طالب علمی میں مدرسہ میں آنے والے مہمانوں کو چائے ڈالنے کی ذمہ داری میری تھی۔ حضرت کا مہمانوں سے انتہائی احترام واکرام کا رویہ ہوتا۔ بڑوں سے معانقہ کرتے اور چھوٹوں سے مصافحہ۔ کوئی عام آدمی یا شاگرد بھی مہمان ہوتا تو اس کو چارپائی کے سرہانے بٹھاتے اور خود پائنتی کی جانب بیٹھتے۔ اس خدمت کے عرصہ میں مجھے یاد نہیں کہ کوئی مہمان بلا اکرام وضیافت رخصت ہوا ہو، کم از کم چائے تو ضرور پلاتے، اگر کسی کی چائے سے پرہیز ہوتی، تو حضرت کے کمرے میں عموماً ایسے مہمانوں کے لئے پھل رکھے ہوتے۔ حضرت مجھے آہستہ سے فرمادیتے یا اشارہ کردیتے۔ میں ایسے مہمانوں کے لئے پھل کاٹ لاتا، اگر کسی مہمان کو بہت ہی عجلت ہوتی تو حضرت کچھ میوہ یا کھانے پینے کی چیز یا نقد رقم ساتھ کردیتے کہ اس سے کھا پی لینا۔

اہل علاقہ پر حضرت کے علمی و روحانی احسانات کے علاوہ مادی و سماجی احسانات بھی کم نہیں۔شاہو وام کی بجلی، پختہ روڈ، پانی کی پائپ لائن اور ٹیلی فون سروس سب حضرت کی کوششوں سے ممکن ہوئے۔اسی طرح اہل السنۃ کے لئے علیحدہ روڈوں کی تعمیر کا کارنامہ سرانجام دیا۔تاکہ تصادم کے خدشات وامکانات ختم ہوں، بندہ اس پورے عمل میں آپ کا معاون وشریک رہا۔آپ نے دن رات اس کے لئے محنت کی، رکاوٹیں دور کیں، اسباب مہیا کیے اور اس ناممکن کام کو ممکن بنا کر چھوڑا۔

حضرت خود تو سراپا زہد وفقر تھے لیکن عوام کے لئے ہمیشہ آسانیاں تلاش کرتے دیکھا۔سب سے بڑھ کر علاقہ میں امن قائم کرنے کے لئے جو خدمات سرانجام دیں، آپ کے بعد یا آپ سے پہلے ہنگو نے اتنی خدمات کسی مائی کے لال کی نہیں دیکھیں۔حضرت اسباق کی اتنی پابندی کرتے تھے کہ بیماری واشد گھریلو ضروریات میں ناغہ نہیں فرماتے تھے لیکن قیام امن کی کوششوں کے لئے میں نے بارہا انہیں اسباق کا ناغہ گوارا کرتے دیکھا۔امن کے حددرجہ حریص تھے اور چاہتے تھے کہ ہنگو کے تمام طبقات چین وسکون سے رہیں۔آپ نے ہمیں بارہا نصیحت کی کہ قاری صاحب! فرق باطلہ کا مقابلہ جذباتی نعروں کے بجائے عمل کی قوت سے کریں، اپنے بچوں کے نام صحابہ کے نام پر رکھیں، اپنی مسجدوں اور علاقوں کو صحابہ کے ناموں سے موسوم کریں اور اپنی زندگی کے روزمرہ معمولات اور شادی غمی کو سنت سے آراستہ کریں، اس طرح رسوم ورواج اور شرک وبدعت کے اثرات خود بخود مٹتے جائیں گے اور لوگوں میں صحابہ سے محبت وعقیدت بڑھے گی، اس طرز سے کسی کی ایذارسانی کا شائبہ بھی پیدا نہ ہوگا اور نہ کسی کو اس پر اعتراض ہوگا۔آج کل جو تفرقہ پھیلتا ہے اور ''فتنہ'' مضبوط ہوتا ہے اس کی ایک وجہ فتنہ کے مقابلہ کی حکمت عملی کا جذباتی اور کمزور ہونا بھی ہے۔

آپ کبھی کبھی اپنے خاص انداز میں گویا ہوتے کہ قاری صاحب! مخالف کو فریق بنانے کے بجائے ''رفیق'' بنانے کی فکر کرو۔فرماتے کہ مجھے پشتو کے اس مقولہ میں بڑی خوبی دکھائی دیتی ہے کہ ''اول یے پڑکہ بیا یے مڑکہ'' کہ پہلے کسی کے دل کو قابو کرلو پھر جس طرح سے چاہو اس کے شر کو ختم کردو۔

جب ہمارے ہاں شیعہ سنی سطح پر قومی جنگیں شروع ہوئیں تو بارہا مجھ سے فرمایا کہ قاری صاحب! جہاں تک ہوسکے اہل السنۃ تک یہ پیغام پہنچا دو کہ خبردار! کسی سے ظلم وزیادتی نہ ہونے پائے۔شرپسندوں کو نہ دیکھیں بلکہ ان کی شرپسندی کے اسباب ڈھونڈیں۔شرپسندی، شرپسندوں کے خاتمے سے ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کے اسباب کے ختم کرنے سے ختم ہوتی ہے۔آج افسوس یہ ہے کہ شرپسندی کے اسباب کی نشان دہی پر لوگ ناراض ہوجاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شرپسندی کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑے بغیر امن قائم نہیں ہوسکتا۔آپ حکومتی افسران کو بھی

علاقہ میں قیام امن کے لئے عموماً یہی تجویز دیتے کہ شرپسندی کے اسباب کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ شریر مزاج لوگوں کو شرپسندی کا موقع ہی نہ مل سکے۔

حضرت کو "ظلم" سے طبعی نفرت تھی اور ظلم کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار ہم اسباق کے وقفہ میں باہر کھیتوں سے چوہے پکڑنے چلے گئے۔ میں نے چوہا پکڑا اور ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر چوہے کو اس میں بند کر کے اُوپر گڑھے کو کسی چیز سے مضبوط ڈھانک دیا اور پھر مٹی ڈال دی تاکہ محسوس نہ ہو۔ ارادہ یہ تھا کہ اسباق ختم ہونے کے بعد اسے پکڑیں گے اور ماریں گے، اسی اثنا میں حضرت پیچھے سے آئے۔ فرمایا کہ تم سبق میں نہیں گئے، جلدی سبق میں پہنچو۔ ہم اُٹھے تو حضرت نے وہ جگہ دیکھ لی جہاں ہم نے چوہے کو بند کیا تھا۔ بظاہر تو اُس کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا، لیکن حضرت طبیعت کے ایسے حساس اور معاملہ فہم تھے کہ آپ نے اندازہ فرمالیا کہ اس نے یہاں کچھ کیا ضرور ہے۔ آپ نے آہستہ سے اُس جگہ کو ٹھوکر ماری تو میری ڈالی ہوئی مٹی اور ڈھکن اُٹھ گیا اور اندر سے چوہا نکل کر باہر کو بھاگا۔ آپ یہ دیکھ کر جلال میں آئے اور فرمایا: احمق، بے وقوف! اتنا ظلم؟ فرمایا: ظلم انتہائی قبیح چیز ہے، مخلوق پر ظلم سے بچو، روایات میں آتا ہے کہ ظالم کا معاون بھی ظالم ہوتا ہے۔

حضرت کی طبیعت میں اتنی رقت اور شفقت تھی کہ جب مدرسہ میں صدقہ کے بکرے آتے تو آپ طلبہ کے ساتھ کھال اُتارنے اور گوشت کی بوٹیاں بنانے میں شریک ہوتے لیکن بوقت ذبح وہاں سے چلے جاتے۔ فرماتے : قاری صاحب! ذبح انبیا کی سنت اور جائز عمل ہے لیکن میں اپنی طبعی کمزوری کے باعث جانور کے اس وقت کی بے بسی نہیں دیکھ پاتا، اس لئے میں نے اپنے ہاتھ سے کبھی "چڑیا" بھی ذبح نہیں کی۔ جب قبائل میں ظلم کا تاریک دور شروع ہوا، جانور تو چھوڑیں لوگوں کے گلے کاٹے جانے لگے، تو آپ کی بے چینی حد سے بڑھ گئی تھی۔ ایک بار مجھ سے فرمایا: ان لوگوں کے سینوں میں پتھر کے سل ہیں یا دل، ان کے ہاں انسانیت کا ذرا بھی احترام باقی نہیں رہا کہ یہ لوگوں کو ذبح تک کر دیتے ہیں، یہ لوگ اس کی جرأت کیسے کر لیتے ہیں۔

جس شخص سے کبھی بکری ذبح ہوتی ہوئی نہ دیکھی گئی ہو اور زندگی بھر اُس نے کسی ذی روح پر چھری نہ پھیری ہو ایسے رقیق طبیعت انسان پر دہشت گردی یا دہشت گردوں کی معاونت کا الزام ایک بدترین مذاق کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا۔ سچ ہے کہ جب جھوٹ کے نمائندے اتنی کثرت سے جھوٹ بولیں کہ معاشرے کے رجحانات اور تربیت کے اجزا میں جھوٹ کا بنیادی کردار بن جائے تو سچ کہیں دور صحراؤں میں بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے اور اُس کی پہچان کرنے والے بہت ہی کم اور غیر مؤثر رہ جاتے ہیں۔

استاذ صاحب کی ایک دائمی عادت بندہ نے یہ بھی دیکھی کہ جب عالم اسلام میں کہیں بھی کسی اہل علم یا اللہ والے کا

انتقال ہوتا تو آپ ظہر کے بعد طلبہ کرام کو جمع فرماتے، مختصر الفاظ میں فوت ہونے والے کا تعارف کرواتے اور پھر اُن کے لئے ایصال ثواب کے واسطے قرآن پاک پڑھواتے، ایسے مواقع پر اکابر کی عزت وعظمت کا خیال رکھنے کی ترغیب دیتے اور اُن کے کارنامے بتاتے کہ ہر صدی اور ہر دور میں ان اکابر نے اپنی دینی ذمہ داریوں کا بھر پور خیال رکھا ہے، اُنہیں نبھایا ہے اور لوگوں کے عقیدہ وایمان کی حفاظت کے لئے سخت سے سخت مجاہدے برداشت کیے ہیں۔

حضرت کا کتاب کے ساتھ تعلق جنون کی حد تک تھا، میں اسفار میں ساتھ جاتا تو کتابیں ضرور لیتے۔ ایک بار رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع پر کسی کتاب کی تلاش میں نکلے، میں بھی ساتھ تھا، پہلے وہ کتاب سٹالوں پر تلاش کرتے رہے، وہاں نہ ملی تو لاہور کتب خانوں پر تلاش کرنے چلے آئے، اتنی زیادہ ڈھونڈی کہ ہم پھر پھر کر نڈھال ہو گئے۔ حضرت کو ہمارا احساس ہوا تو فرمانے لگے: قاری صاحب! مجھے کتابوں کے معاملے میں معذور سمجھیں، مجھے شوق وجنون میں ساتھیوں کا خیال بھی نہیں رہ پاتا۔ فرمایا کہ زمانہ طالب علمی میں ایک کتاب کی ضرورت تھی، پھر اچانک وہ مکتبہ پر آ گئی لیکن میرے پاس لینے کی رقم نہ تھی، میں نے سوچا کہ کل رقم کا بندوبست کر کے لے لوں گا، لیکن جب کل آیا تو وہ کتاب کوئی صاحب لے چکا تھا، اُس کا دوسرا نسخہ بھی نہیں تھا وہ واحد نسخہ کہیں سے اتفاقاً آیا تھا۔ اس پر مجھے سخت قلق ہوا اور اس کے بعد سے اپنی طبیعت کے خلاف کتاب لینے کے لئے قرض بھی گوارا کر لیتا ہوں۔ آج تک اپنی ذاتی ضرورت کے لئے قرض نہیں لیا لیکن کتاب اور مہمان کے اکرام کے لئے اس کی بارہا نوبت آئی۔

اگر دوستوں میں سے کوئی صاحب کتاب کا ہدیہ پیش کرتے تو بڑے خوش ہوتے، ایک بار میں حضرت کے ساتھ کراچی گیا ہوا تھا، مولانا زرولی خان صاحب نے صبح ناشتہ پر حضرت کو بلایا تھا، ہم بھی ساتھ حاضر ہوئے، اُس وقت میں مولانا زرولی خان صاحب سے واقف نہیں تھا۔ اُنہوں نے بہت ہی پُر تکلف ناشتہ کا اہتمام کیا تھا، بڑا وسیع دسترخوان اور انواع واقسام کی چیزیں اس پر چنیں۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً کوئی پینتیس قسم کے ماکولات ومشروبات میں نے گنے۔ مولانا زرولی خان صاحب حضرت کے سامنے بڑے ہی مؤدب بیٹھے تھے۔ بعد میں میں نے حضرت سے پوچھا کہ کیا مولانا زرولی خان صاحب آپ کے شاگرد ہیں؟ فرمایا: ہمارے ساتھی ہیں۔ (حضرت شاگرد کے لئے بھی ساتھی کا لفظ استعمال کرتے) اور اچھے ساتھی ہیں، کتابوں کا شوق وذوق رکھتے ہیں۔ دعوت کے آخر میں مولانا زرولی خان صاحب نے حضرت کو سات جلدوں پر مشتمل کوئی ایسی کتاب پیش کی جو حضرت کے پاس موجود نہیں تھی، حضرت اس پر بڑے خوش ہوئے، بڑی بشاشت سے قبول فرمایا اور دعائیں دیں۔

حضرت کو اگر میں نے کہیں خلوت میں دیکھا ہے تو یا ذکر وعبادت کرتے دیکھا ہے یا مطالعہ، اس کے علاوہ کبھی

دوسرے کام پر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ فرماتے تھے کہ مطالعہ میری غذا بن چکا ہے۔ مطالعہ کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ باجود طبعی حساسیت کے کتاب کے مطالعہ میں محو ہوتے تو اردگرد کی مطلقاً خبر نہ رہتی۔ بعض اوقات آپ کچھ پڑھ رہے ہوتے اور ہم ساتھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ شرارت کر رہے ہوتے، تو آپ کو اندازہ تک نہ ہو پاتا ورنہ عام حالات میں تو آپ دور سے سب کچھ بھانپ لیتے۔

حضرت سے قریبی تعلق کے باوجود اپنی نااہلی اور گنوار پن کے باعث آپ کی علمیت اور روحانیت کا ہمیں صحیح اندازہ نہ تھا، لیکن کبھی کبھار جب بڑے علما سے آپ کے بارے میں اُونچے کلمات سنتے تو تب اندازہ ہوتا کہ علمائے کرام کے ہاں آپ کا کتنا اونچا مقام ہے اور در حقیقت وہی آپ کا صحیح مقام سمجھنے والے تھے، آپ کی عادت تھی کہ اصلاح احوال کے لئے اپنے چھوٹوں کو علما اور اولیا کے پاس لے جایا کرتے تھے اور بعض اوقات اللہ والوں کے بیانات بھی مدرسہ میں کرواتے تھے۔ ایک بار حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتیؒ بیان کے لئے تشریف لائے تھے، آپ نے فرمایا کہ مولانا محمد امین صاحبؒ کے علمی و روحانی مقام کا یہ عالم ہے کہ آپ سے پڑھنے والے آپ کے شاگرد محض الفاظ کے عالم نہیں ہوتے بلکہ ان پر عامل بھی ہوتے ہیں اور روحانی تربیت بھی پائی ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا اعظم طارق شہیدؒ جیل سے رہا ہوئے تو ہم نے حضرت سے اجازت چاہی کہ ملاقات کے لئے چلتے ہیں۔ حضرت نے اجازت عنایت فرمادی، پھر ایک آدھ صفحہ کا مختصر خط بھی مولانا کے نام لکھ کر ہمیں دیا کہ انہیں دے دیں۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت اگر ایک عدد ''نثر الازہار'' کا نسخہ بھی ہدیہ میں لے جائیں تو کیسے رہے گا؟ آپ نے بخوشی عنایت فرمایا کہ ضرور لے جائیں۔ جب مولانا اعظم طارق شہیدؒ کو ہم نے خط اور کتاب پیش کی اور اُنہوں نے اسی مجلس میں خط پڑھا تو رنگ متغیر ہو گیا اور بار بار پڑھتے رہے۔ پھر کتاب کھول کر کچھ دیر غور سے پڑھتے رہے، پھر ہمیں مخاطب کر کے فرمایا کہ آج تک مجھے حضرت کی علمی شان کا اندازہ نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ حضرت بہت بڑے عارف باللہ اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن آپ کی تحریر کی جامعیت اور گہرائی نے تو مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ آپ لوگ نہیں جانتے کہ اس آدھ صفحہ تحریر میں اُنہوں نے کیا دریا کوزہ میں بند کیا ہوا ہے۔ یہ تحریر اتنی گہری اور جامع ہے کہ آج کل کے متوسط علما بھی شاید پوری طرح اس کو نہ سمجھ سکیں۔ پھر کتاب کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہر ایک کو سمجھ آئے گی۔ اس کتاب کی ترتیب اور علمی شان جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اُس کو تعبیر کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں تو جو اہل فن ہیں اُن کے تأثر کا کیا عالم ہوگا۔ فرمایا: میں نے ابھی اُردو اور عربی دونوں تحریروں پر غور کیا اُردو تحریر میں جامعیت کے باعث گہرائی اور ایجاز ایسا ہے کہ سمجھنے کے لئے بار بار پڑھنی پڑتی ہے اور عربی تحریر میں تسہیل ہے اس سے آپ حضرت کی علمیت کا اندازہ کریں۔

پھر مولانا اعظم طارق شہیدؒ نے ڈاکٹر خالد نواز فاروقی شہید کو دو تین بار تاکید سے کہا کہ حضرت کے وجود کو غنیمت سمجھیں اور وہاں خود بھی استفادے کے لئے متواتر حاضری دیا کریں اور ساتھیوں کو بھی مائل کریں۔

حضرت کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ خود ہمیشہ جلسوں وغیرہ میں عام مجمع کے اندر بیٹھنے کو ترجیح دیتے، لوگ اگر جلسوں پر بلا لیتے اور خلاف مزاج نمود و نمائش زیادہ ہوتی تو جلد اجازت لے کر اٹھ آتے۔ مجالس میں اپنے سے علمی لحاظ سے کم لوگوں بلکہ اپنے شاگردوں کو اختتامی دعا کے لئے آگے کر دیتے، زمانہ تدریس میں ہم نے دیکھا کہ مدرسہ اور گھر کے کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے، یہ عادت نہ تھی کہ خود سے کسی کو کام کا کہہ دیں بلکہ پہلے خود کام کے لئے بڑھتے جب طلبہ واساتذہ دیکھتے تو وہ دیوانہ وار سارے ساتھ شامل ہو جاتے، مدرسہ کی تعمیر، گندم کی کٹائی وغیرہ میں یہ منظر ہم نے کئی بار دیکھا۔

دعوت وغیرہ میں عام دسترخوان پر بیٹھنا پسند کرتے، اگر مخصوص جگہ بنائی جاتی تو ناراض ہوتے، میزبان کی کوشش ہوتی کہ اچھی چیزیں آپ کے سامنے رکھے لیکن آپ شرکاء دسترخوان کا خیال رکھتے اور چیزیں اٹھا اٹھا کر ان پر تقسیم کرتے۔ علاقے کا عام مزدور اور غریب بھی دعوت کرتا تو بڑے شوق سے قبول کرتے اور ضرور جاتے۔

مدرسہ کے کنویں کی کھدائی اور صفائی کا کام میرے ذمے تھا کیونکہ میں اس کام میں ماہر تھا، ایک دفعہ کنویں کی صفائی کر رہے تھے، میں نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے، حضرت نے مسکرا کر فرمایا: قاری صاحب! اس علاقہ میں تو کالا لباس بالکل نہیں پہننا چاہیے، یہ تو یہاں دُنیا میں اہل تشیع کا لباس ہے اور آخرت میں جہنمیوں کا لباس ہوگا۔

حضرت افغانستان میں امارت اسلامی کے قیام پر بڑے خوش تھے اور افغان طالبان کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے تھے، جب افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو حضرت کے متعلقین نے اُن کے واسطے کافی سارا چندہ اور سامان تعاون آپ کے پاس اکٹھا کیا، حضرت نے چند مخصوص ساتھیوں کا اجلاس بلایا جس میں بندہ بھی شامل تھا، آپ نے فرمایا کہ عوام نے ہم پر اعتماد کرتے ہوئے یہ تعاون کیا ہے لیکن اسے کسی واسطے کے بغیر براہ راست افغان حکومت کے ذمہ داروں تک پہنچانا ضروری ہے تاکہ درست مصرف پر لگ سکے۔ ہماری رائے بھی آپ کی موافقت میں تھی۔ یہ چندہ حوالے کرنے کے لئے آپ نے خود افغانستان کا سفر فرمایا، بندہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا، کابل میں امارت اسلامی کے بڑے ذمہ دار وزیر کو وہ رقم حوالے کی اور تاکید کی کہ اگر ملا عمر صاحب کی مصروفیت آڑے نہ آتی تو میں خود قندھار حاضری دے کر یہ رقم براہ راست ان کو پیش کرنے کی کوشش کرتا، لیکن آپ ایک ذمہ دار عالم دین اور امارت کے اہم وزیر ہیں، اس لئے ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ اموال آپ کے ہاتھ پر ایسے مصارف تک پہنچیں گے کہ ہمیں روز قیامت مؤاخذہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اتنی صاف گوئی سے بات فرمائی کہ ہمیں اجتماعی اموال

میں آپ کے احتیاط پر رشک آیا۔

جب یہ مجلس ختم ہوئی تو وزیر صاحب سمیت ہم سب اُن کے دفتر سے باہر نکلے، باہر غلطی سے وزیر صاحب کی جوتی کوئی پہن کر چلا گیا تھا، ہم نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ خود ادھر اُدھر جوتا تلاش کرتے رہے، جب نہ ملا تو طالبان نے اصرار کر کے اپنے جوتے پہننے کے لئے پیش کیے لیکن وہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے گاڑی تک گئے اور سوار ہو کر چلے گئے، اُن کے انداز اور چہرے پر ذرا برابر کوئی اثر دکھائی نہ دیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگئی ہے، حضرت یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے، پھر شرکاء سے فرمایا: جب تک ہمارے حکمرانوں میں ایسی سادگی رہی، ہم دُنیا پر حکمرانی کرتے رہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہماری بے سروسامانی کے باوجود ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکی، جب ہمارے حکمران عیش وعشرت کے متمنی ہوئے تو اپنی ذات، مسلمانوں اور اسلام کا نقصان کرنے والے بن گئے۔فرمایا کہ یہ چودھویں صدی کے کامل الایمان گورنر کی حالت ہے تو آج سے چودہ سو سال قبل صحابہ کے زہد وفقر کا کیا عالم ہوگا۔

افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد کچھ عرب مجاہدین افغان سرحد پار کر کے آتے ہوئے کرم ایجنسی میں مظلومانہ شہید کیے گئے تھے، کرم ایجنسی میں بنوری ٹاؤن کے فاضل اور مدرسہ یوسفیہ وام کے قدیم مدرس مولانا شیر محمد صاحب کا انتقال ہوا تھا، بندہ حضرت استاذ صاحبؒ اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کے ساتھ تعزیت کے لئے گیا تھا۔واپسی پر حضرت نے فرمایا کہ قاری صاحب! اگر آپ کا حرج نہ ہو تو اُن عرب شہداء کی قبروں پر فاتحہ کے لئے حاضری دیتے جائیں۔میں نے عرض کیا: حضرت! یہ تو سعادت ہے، ضرور چلیں گے۔واپسی پر اُن قبور پر حاضری دی، قبروں پر کسی نے اشعار کے کتبے نصب کیے تھے، بڑے ہی پرسوز اشعار تھے، مجھے تو اب بھول گئے، ایک عرصہ تک یاد تھے، ہاں ایک شعر اب بھی یاد ہے۔

زنکدن سلگی وھم خپل خپلوان مے نشتہ

چے داستا پہ لارہ کی شہید شم بل ارمان مے نشتہ

(حالت نزع کی ہچکیاں لے رہا ہوں لیکن اس دیارِ غیر میں کوئی اپنا پاس نہیں ہے، بس اللہ! تیری راہ میں شہادت کی موت پالوں اس کے علاوہ کوئی ارمان دل میں نہیں ہے۔)

حضرت نے آہستہ سے فرمایا: قاری صاحب! میرے اندر تو یہ اشعار سنانے کی سکت نہیں، آپ مولانا عبداللہ صاحبؒ کو سنادیں، میں نے سنانا شروع کیے تو دونوں اکابر کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں لگ گئیں۔واپسی پر فرمایا قاری صاحب! کس تلخ حقیقت کو آشکارا کرنے کے ساتھ اپنی مظلومانہ حالت کو پیش کیا ہے۔

ہمیں تو حضرت سے اپنے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر محبت وعقیدت تھی اور یہ طبعی تھی لیکن ایک دو مواقع میرے

مشاہدے میں ایسے آئے کہ اندازہ ہوا کہ ہمارے علاقے کا بچہ بچہ آپ کی محبت وعقیدت میں دیوانہ ہے، ان دو واقعات کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں۔

۹۸ء میں شیعہ سنی فسادات کی بدترین لہر چلی، حضرت کی کوششوں سے بحمد اللہ صلح کی راہ ہموار ہوئی لیکن مذاکرات سے قبل حکومت نے شیعہ سنی دونوں گروہوں کے چھ چھ افراد نظر بندی کے بہانے گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے، اہل السنۃ کے چار قومی مشران کے ساتھ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شامل تھے۔

ہم جیل ملاقات کے لئے گئے تو دونوں اکابر کو صابر وشاکر پایا بلکہ ہمیں حوصلہ دیا۔ ادھر قومی سطح پر ہمارے حکومت سے مذاکرات چل رہے تھے لیکن حکومت رہائی میں ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی، جس سے امن کی صورت حال مزید مخدوش ہونے کا خطرہ تھا کیونکہ دونوں طرف سے مشران جیلوں میں جانے کے باعث نچلی سطح پر عوام کو قابو رکھنا مشکل کام تھا۔

بالآخر ہنگو تبلیغی مرکز میں اورکزئی ایجنسی اور ہنگو کے تمام اکابر علما کی مشاورت ہوئی اور طے ہوا کہ حکومت کے روایتی ہتھکنڈوں اور رہائی میں عدم دلچسپی کے خلاف دونوں اکابر کی رہائی کے لئے احتجاجی تحریک شروع کرنی چاہیے اور اس تحریک کا دائرہ ساتوں ایجنسیز اور سرحد کے جنوبی اضلاع تک پھیلانا چاہیے۔ اس کے لئے ہم نے سرحد (موجودہ، کے، پی، کے) کے جنوبی اضلاع اور ایجنسیز کا ایک طوفانی دورہ کیا، جہاں بھی گئے ہر عالم کو حضرات شیخینؒ کی گرفتاری پر سیخ پا اور رہائی کے لئے تحریک کی ہمہ قسم معاونت پر تیار پایا۔ اس دورے کے بعد ان تمام علاقوں کا ایک نمائندہ اجتماع اورکزئی ایجنسی کے مرکزی مقام ''ڈبوری'' میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں علما، سیاسی وسماجی رہنما اور قومی مشران شامل تھے، اس اجلاس میں حکومت کو رہائی کے لئے ڈیڈ لائن دینے اور تحریک شروع کرنے کا اعلان ہونا تھا کہ ہمیں حضرات شیخینؒ کا پیغام جیل سے موصول ہوا، ان تک ہماری سرگرمیوں کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں، دونوں اکابر کا مشترکہ پیغام یہ تھا کہ بحمد اللہ ہمیں جیل میں کوئی تکلیف نہیں بلکہ باہر سے زیادہ سکون ہے، یہ ہمارے انبیا کی سنت اور اسلاف کا طریق ہے، ہماری طرف سے آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کی تحریک یا حکومت کے ساتھ تصادم کی قطعاً اجازت نہیں ہے، آپ حضرات دعا کریں اور اپنی قومی وعلاقائی ذمہ داریوں پر توجہ دیں، ان شاء اللہ اللہ ہمیں باعزت رہائی نصیب فرمائیں گے۔ بہر حال اس اجلاس میں حکومت کو رہائی کے لئے ایک ہفتے کا الٹی میٹم دیا گیا، بفضل اللہ حکومت کو ہمارے مطالبے پر آنا پڑا اور ایک ہفتے کے اندر اندر مذاکرات کامیاب ہونے اور دونوں اکابر باقی ساتھیوں سمیت باعزت سوا مہینے کے بعد رہا کردیئے گئے، جمعرات کو ہری پور جیل سے رہائی عمل میں آئی، شام کو شاہو وام ہنگو پہنچے، اگلی صبح قبائلی عوام کی طرف سے دونوں اکابر کے اعزاز میں اورکزئی ایجنسی کے اندر

استقبالی جلسہ تھا، اس جلسہ کے لئے جاتے ہوئے جو دونوں اکابر کی محبت لوگوں کے دلوں میں دیکھی اُس کی مثال ہنگو تاریخ میں نہ ملے گی، سینکڑوں گاڑیوں کے قافلے اورکزئی ایجنسی پہنچے، کئی کلومیٹر دور تک استقبالی قطاریں لگی تھیں ،لاکھوں عوام کا اجتماع تھا، ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔محبت و وارفتگی کا ایک عجیب عالم تھا، دونوں حضرات اپنے تلامذہ کے ہالے میں سٹیج تک پہنچے، لوگ ایک نظر زیارت کے لئے دیوانہ وار لپک رہے تھے، حالانکہ یہ وہ دور تھا جب بدعات ورسومات کی مخالفت کی وجہ سے اکثر قبائلی عوام میں حضرات شیخینؒ کے بارے میں مختلف غلط فہمیاں موجود تھیں لیکن اس کے باوجود عقیدت ومحبت کا ایسا منظر پیش ہوا کہ نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا نہ اس کا تصور کیا تھا۔

دوسری بار ۲۰۰۵ء میں جب حضرت حج سے واپس آرہے تھے تو عقیدت ومحبت کا عجیب منظر دیکھنے میں آیا، اگرچہ حضرت نے اپنے آنے کی تاریخ خفیہ رکھی تھی اور کسی کو بھی نہیں بتلایا تھا حتی کہ اہل خانہ سے ہمارے مسلسل رابطے کے باوجود ان کی طرف سے ہمیں تاریخ بتلانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ ہورہا تھا، ادھر ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ استاذ صاحب کب آئیں گے؟ ہمیں کسی طرح اتنا علم ہوا کہ جہاز فلاں دن ہوائی اڈے پر اترے گا لیکن متعین وقت کا علم نہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ پشاور میں حضرت کے بھائی حاجی مسلم الدین کے اینٹوں کے بھٹے پر ساری گاڑیاں جمع ہوجائیں وہاں سے وقت کا بھی پتہ چل جائے گا۔ درجنوں گاڑیوں کا ہمارا یہ قافلہ پشاور پہنچا، اس قافلے کی قیادت حضرت کے استاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کررہے تھے، جب حضرت کو ہم نے ائیر پورٹ سے وصول کیا تو ہمراہ پچیس گاڑیاں بھری ہوئی تھیں اور جب پشاور سے نکلے تو گاڑیوں کی تعداد پچھتر ہوگئی تھی، جب ان پچھتر گاڑیوں کی جلو میں حضرت علاقہ میں داخل ہوئے تو ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔فرط مسرت میں ہر شخص کے آنکھوں سے آنسو رواں تھے، بچے، بوڑھے اور جوان گھروں سے نکل کر راستوں میں دست بستہ کھڑے ہوگئے، گلیاں بھر گئیں، میں نے اوپر دیکھا تو دور دور تک مکانوں کی چھتوں پر سینکڑوں خواتین پلو اوڑھے اس منظر کا نظارہ کررہی تھیں۔ مدرسہ تک پہنچتے پہنچتے یہی منظر تھا، لوگوں کا ہجوم گاڑیوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلا جارہا تھا اور محبت و وارفتگی کے عجیب نظارے سامنے آرہے تھے۔ حضرت سے مصافحہ وزیارت کے لئے قطاریں بن گئیں۔اس دن میں نے اندازہ کرلیا اور مجھے حق الیقین ہوگیا کہ یہ دونوں حضرات شیخینؒ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں اور واقعتاً ہمارے علاقے کے لوگ ان پر جان چھڑکتے ہیں۔

عیدین کے موقع پر عمرہ سے واپسی پر بھی میں نے دیکھا کہ لوگوں کی قطاریں ملنے کے لئے لگ جاتیں، واقعتاً یہ فقراء اور درویش مخلوقِ خدا کے دل جیت کر جیتے ہیں، جب یہ دنیا کے ہر چیز سے بے نیاز ہوکر دل میں محض اللہ کی محبت بسالیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی غیرتی ذات ان کی محبت سے اپنے بندوں کے دل بھر دیتی ہے۔

حضرت کی شہادت کے دن میں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ آسمان صاف تھا لیکن بارش کی مثل قطرے کچھ لمحے گرتے رہے، کچھ اور حضرات نے بھی اسے دیکھا، اس دن پتہ چلا کہ بزرگوں کی وفات پر جو آسمان کے رونے کی بات کی جاتی ہے وہ کیا ہے؟

آج دونوں شیخینؒ ہم میں موجود نہیں لیکن بحمد اللہ اُن کا مشن، اُن کا نظریہ، اُن کا پیغام ہمارے دلوں اور زندگیوں میں زندہ ہے، اب اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ مرتے دم تک اُسی مشن اور نظریے پر قائم رکھے جس پر یہ دونوں اکابر ہمیں چھوڑ کر گئے اور ان کے اعتماد کی لاج رکھنے کی ہمیں ہمت و توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین

آخر میں اپنے چھوٹے بھائیوں مولانا محمد یوسف مدظلہ اور مولانا محمد طفیل سلمہ کو خراج عقیدت و تحسین کہ ان دونوں کے عزم و ہمت سے حضرت کا تذکرہ و تاریخ محفوظ ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ہم سب کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

حضرت الاستاذؒ کی تربیت کا فیض

مفتی انعام اللہ، پشاور

بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایسے افراد کی کمی نہیں، جنہوں نے اپنی زندگیاں آفاقی دین کی ترویج، توحید وسنت کی اشاعت اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مسلمان کی صورت وسیرت کی تعمیر کے لیے وقف کیں۔ انہوں نے معاشرے کی اصلاح وتربیت کو اپنی زندگیوں کا عظیم مقصد بنایا اور علم وعمل کے فروغ کو اپنے شب وروز کا مشغلہ سمجھا۔

ان داعیانِ دین اور مصلحین امت کے سلسلۃ الذہب میں ہمیں ایک نام شہید اسلام، مفسر قرآن، محدث عصر، مشفق ومکرم استاد حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ کا نظر آتا ہے۔ حضرت الاستاذؒ ربانی عالم تھے اور علمائے ربانیین کی نظر میں عقیدت واحترام کے بلند وبالا مقام پر فائز تھے۔ آپ اپنی سیرت وصورت میں اسلاف کا کامل عکس تھے، آپ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کے افق سے ابر رحمت بن کر اٹھے اور ہنگو کے ''غیر ذی زرع وادی'' پر انوارات وفیوضات کا بارش لے کر برسے۔

ضلع ہنگو دینی لحاظ سے ایک پسماندہ ضلع مشہور تھا۔ یہاں بدعات ورسومات کا دور دورہ تھا، توہمات پر دین کی بنیادیں استوار تھیں۔ حق وباطل میں امتیاز کی علامات مٹ چکی تھیں اور اس حوالے سے کسی قسم کا کوئی اقدام اپنے آپ کو معاشرے میں تنہا کردینے کے مترادف تھا۔ حضرت الاستاذ وہ واحد شخصیت تھے، جنہوں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تحدیات سے نبرد آزما ہونے کی ٹھانی۔ آپ نے ملک کے ایک بڑے جامعہ میں اونچے منصب کو چھوڑ کر ہنگو کے عوام کی دینی حالات کا احساس رکھا اور ۱۹۸۰ء میں جامعہ یوسفیہ کے نام سے ایک مقدس مشن کا قلعہ تشکیل دیا۔ پھر بلا تاخیر دوٹوک مؤقف اختیار کرکے ہنگو کے لوگوں میں حق وباطل کے مابین امتیاز کا شعور بیدار کیا اور حکمت وموعظت حسنہ سے ترغیبی منہج پر ایک منظم عمل کے تحت بدعات ورسومات کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بدعات ورسومات کے اندھیرے چھٹ گئے اور ہر سو سنت نبوی علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلاما کا نور جگمگانے لگا۔

آپ نے اپنے بلند پایہ انتظامی صلاحیتوں، بہترین تدریسی طرز، ٹھوس علمی استعداد اور اخلاص وللہیت سے بہت

جلد جامعہ یوسفیہ کو علاقے کے ممتاز مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مجھے بھی اس شمع کی روشن شعاعوں نے مثل فرزانہ کے کھینچ لیا۔ یہ ۱۹۹۴ء کا زمانہ تھا کہ جب بندہ حضرت الاستاذ کے آغوش شفقت میں پہنچا۔

اللہ کی قسم! زندگی میں اس سے بڑا انعام کوئی اور تصور نہیں کرتا۔ اس احسان عظیم پر رب تعالیٰ کا یہ گناہ گار بندہ جتنا شکر کرے اتنا ہی کم ہے۔ میں حضرت کی شفقت اور آپ سے رشتہ تلمذ کو اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے ایک عظیم اعزاز سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس نسبت کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت الاستاذ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جامعہ یوسفیہ کا ہر استاذ اور طالب علم یہی تصور کرتا تھا کہ حضرت الاستاذ کی قربت سب سے زیادہ مجھے نصیب ہے، کوئی طالب علم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ حضرت کی نظروں سے اوجھل رہ جائے گا۔ حضرت الاستاذ ہر نماز کے بعد دونوں جانب اور پیچھے ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی سے آپ کو غیر حاضر طلبہ کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ ایک نگاہ میں حاضرین وغائبین کا پتہ لگانا تبھی ممکن ہے، جب طلبہ پر حد درجہ شفقت ومحبت ہو اور یہ محبت دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہو اور ہر طالب علم کی ہر ہر نقل وحرکت کا پوری طرح اندازہ ہو اور ہر ایک پر مساوی نظر ہو، احقر اس بلا امتیاز شفقت ومحبت کا عرصہ چار سال تک نظارہ کرتا رہا۔ جامعہ یوسفیہ میں بیتے ہوئے ان ایام میں بھی کسی ایک دن بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

یہ تو حضرت کی عمومی شفقت کا عالم تھا۔ اس فقیر کو اللہ تعالیٰ نے کچھ آگے بڑھنے کے مواقع عطا فرمائے۔ اور الحمدللہ ثم الحمدللہ حضرت الاستاذ کے حسن ظن سے شاگرد خاص سی قربت نصیب ہوئی اور آپ نے اپنی محبت کا اور سرپرستی کا خاص دست شفقت میرے سر پر رکھا، حضرت الاستاذ کی اس خاص شفقت کے بارے اپنے اساتذہ اور بڑوں سے یہی سنا تھا کہ یہ مستقبل میں تعلیمات قرآنیہ کے تدریس وترویج اور اہل حق سے وابستگی کے تسلسل کا راز ہے، اللہ تعالیٰ اس حقیر کے حق میں اسے حقیقت بنادے۔ یقیناً جسے بڑی ذمہ داری دینے کا ارادہ ہو اور زیادہ کام لینا ہو، اس کی نگہداشت کی بھی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے اور اساتذہ کی طرف سے قربت ملنا اسی تربیت ونگہداشت کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ ذیل میں حضرت الاستاذ کی حیات طیبہ سے حاصل ہونے والی متاع گراں مایہ اور آپ کے انداز تربیت کے چند پہلو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ حضرت الاستاذ شریعت مطہرہ کے چلتے پھرتے نمونہ تھے۔ آپ کی چال ڈھال، گفتار، رہن سہن، نقل وحرکت، ایک باکردار، باکمال، بااخلاق اور کامل شخصیت والے تھے۔ اپنے ماتحتوں اور طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی خوب توجہ دیتے تھے، اپنی جلالی طبیعت کے ناطے تربیت کے واسطے مناسب سختی سے بھی گریز نہ فرماتے تھے، نہ ہی اپنے عالی اوصاف کے انتقال میں کبھی بخل کا مظاہرہ کرتے تھے، طلبہ کی تربیت کی ایک طرح سے

تڑپ تھی، لیکن اس کے لئے لمبی چوڑی تقریروں اور وعظ ونصیحت کے قائل نہیں تھے، بلکہ عملی انداز سے تربیت فرماتے تھے۔ جو طلبہ قریب سمجھے جاتے جن میں احقر بھی داخل تھا، ان کی معمولی غلطی بھی آپ کے لئے بڑے صدمے کا باعث بنتی، اس لئے ہمیں زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا، الغرض حضرت الاستاذ کے معمولات یومیہ تربیت کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ آپ کے ذاتی افعال واعمال سے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ آپ نے جو کچھ عمل سے سکھایا، اس کے ذریعے آج ہمیں معاشرے میں جتنی وقعت اور عزت ملی اور دین کی خدمت کے جو مواقع میسر آئے، وہ شاید اس تربیت کے بغیر ممکن نہ ہوتے۔

۲۔ حضرت الاستاذؒ کی صحبت اور تربیت سے ہم نے اساتذہ کرام کی خدمت اور ان کے ادب کا سلیقہ پایا، ہمارے مشاہدے کے مطابق حضرت الاستاذ اپنے اساتذہ کے انتہائی قدردان اور خادم تھے، ان کے طرز خدمت کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جب حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ تشریف لاتے تھے، تو آپ کی مسرت اور جذبہ خدمت دیدنی ہوتا تھا، آپ کی خوشی کی وجہ سے مدرسہ میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی، ایک ہفتہ قبل ہی صفائی ستھرائی کی مہم شروع ہوجاتی۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب جنہیں ہم ''بیتکورہ استاذ'' اور ''مہتمم صاحب'' کہا کرتے تھے، جب مسجد میں نوافل ادا کرتے تو حضرت الاستاذ مسجد کے دروازے پر دوزانوں بیٹھ کر انتہائی مؤدب انتظار کررہے ہوتے، جب کراچی سے حضرت کے بڑے تلامذہ اور مہمان تشریف لاتے، تو تب بھی حضرت شایان شان خدمت فرماتے، ہم نے ایک سارق کی طرح ایسے مواقع پر حضرت کی ادائیں چوری کیں اور انہیں اپنی زندگی میں شامل کیا، یقیناً آپ کی عادات واطوار ہی تربیت کے لیے کافی اور وافی تھیں اور کسی معاملے میں تربیت کے لئے آپ کو 'قول' کی ضرورت کم ہی پیش آتی۔

۳۔ حضرت الاستاذ نے اپنے عمل مبارک سے ہم میں علمی ذوق وشوق پروان چڑھایا، آپ کو کتاب سے فراغ نہ تھا، مطالعہ ایک طرح کی غذا تھی، ایک کتاب کو کئی کئی بار پڑھا، سرعت مطالعہ میں آپ کا کوئی ثانی نہیں دیکھا، کتاب کا ادب ہم نے حضرت الاستاذ ہی سے سیکھا، احقر نے کئی بار رات کی تنہائیوں میں گھنٹوں حضرت کو کتاب بینی کے شغل میں مصروف دیکھا، یہ ممکن نہ تھا کہ کسی کے اندر معمولی ذوق ہو اور اسے حضرت کی صحبت سے مطالعہ کا جنون نصیب نہ ہوا ہو۔

۴۔ حضرت الاستاذ کی تربیت اور صحبت کی ایک برکت حق پرستی وحق گوئی کا فیض تھا، آپ احقاق حق وابطال باطل میں ذرا بھر تساہل کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، اور اس بارے میں نظریہ ضرورت کے ہرگز قائل نہ تھے، ضرورت اور مصلحت کے نام پر مذہبی وقومی مسائل میں عام طور پر جو مداہنت ہوتی ہے، ہم نے آپ کے ہاں یہ چیز قطعاً نہیں

دیکھی۔ دینی مسئلہ کو کھل کر بیان کرتے اور حق واضح کرتے، چاہے سیاسی نقصان ہو۔ آپ نے کبھی مذہبی مفادات پر سیاسی مفادات کو ترجیح نہیں دی۔ اسی طرح قومی سطح پر مسائل میں حق گوئی آپ کا شیوہ تھا، گو کتنا بڑا مفاد کیوں ضائع نہ ہو۔ الحمدللہ آپ کے عمل کا یہ درخشاں پہلو طلبہ کے اندر اس مزاج کو راسخ کرتا اور ان کی بھی اسی منہج پر تربیت ہوتی۔

۵۔ حضرت الاستاذ کی صحبت سے اللہ تعالیٰ نے ہماری مہمان نوازی کی تربیت فرمائی۔ حدیث شریف میں ہے:
من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ "الحدیث"۔ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تو چاہیے کہ وہ مہمان کا اکرام کرے، حضرت الاستاذ صاحب اس حدیث شریف کا ایک واضح مصداق اور عملی نمونہ تھے۔ مہمان نوازی حضرت صاحب کی امتیازی صفت تھی، علاقہ کا ہر خاص و عام حضرت کی اس امتیازی صفت سے انتہائی متاثر تھا، حضرت کے مصافحہ اور رخصت کرنے کا طریقہ اتنا پرسرور و دلکش ہوتا کہ جو کسی بھی مہمان کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتا دور دور سے خواہشمند لوگ صرف حضرت الاستاذ کی اس ادا کو دیکھنے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ حضرت کی طرف سے یہ اعزاز خاص لوگوں کے لئے نہیں تھا بلکہ احقر نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ حضرت کے اس طریقہ مہمان نوازی سے ہر خاص و عام، طالب علم وغیر طالب علم، اجنبی اور غیر اجنبی لطف اندوز ہوتا تھا۔ حضرت مہمانوں کی تواضع خود فرماتے تھے، ہر مہمان کو مکمل توجہ دیتے تھے، ہر کوئی یہ محسوس کرتا تھا گویا میں حضرت کا کوئی قدیم رفیق ہوں۔

حضرت الاستاذ نے زبان حال سے کبھی مہمان نوازی کا نہیں کہا ہے، لیکن وہ اپنے کردار سے ہماری تربیت فرماتے تھے اور ہماری غلطیوں پر ناراضگی کا اظہار بھی فرماتے تھے اور یہی حال تھا کہ حضرت نے ہماری تربیت کے لئے ایک ایسی درسگاہ قائم کی، کہ ہم کسی بھی لمحہ کے لئے تربیتی درس سے محروم نہ رہتے تھے، کیونکہ حضرت الاستاذ کی رفتار و گفتار اور کردار ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

۶۔ حضرت الاستاذ کی صحبت سے ہمیں استغنا کا سبق ملا، آپ باوجود اس کے کہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر استغنا کی صفت میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ حدیث شریف الید العلیا خیر من ید السفلی الخ کے واضح مصداق تھے، چار سال کے دورانیہ میں اور صحبت خاص میں آپ کے احتیاج کو ہماری چھٹی حس نے بھی محسوس نہیں کیا اور نہ آپ کو کسی سے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر دیکھا اور نہ کبھی نجی محفلوں اور مجالس میں دنیاوی معاملات پر بحث کرتے ہوئے دیکھا۔ احقر نے خود ان سے سنا ہے کہ رقم کم ہے سال کے درمیان میں مدرسے کی چھٹی کرالوں گا۔ تعمیر کا کام شروع تھا، دن کے درمیان میں مزدوروں کی چھٹی کرائی کہ یہاں تک میرے پاس مزدوری ہے، آگے کچھ نہیں ہے، مگر کسی سے امداد کی اپیل نہ کی۔ اللہ کی قسم! تعمیر بھی پوری ہوگئی، سال بھی پورا ہوا، مگر بحیثیت شاگرد خاص ہمیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ کیسے؟ مگر حضرت کی خودداری کی انتہا سمجھ میں ضرور آگئی۔

۷۔ حضرت الاستاذ کی صحبت سے ہمیں بندگی کا ایک شوق ملا، حضرت انتہائی درجہ کے عبادت گزار تھے، ویسے بھی واضح کر چکا ہوں کہ حضرت شرعی اصولوں کا ایک عملی نمونہ تھے، ان کے کردار پر بندگی کا عنصر غالب تھا۔ حضرت الاستاذ کی صحبت سے ہم نے عاجزی اور انکساری سیکھی، درس وتدریس میں لگن کی تربیت دی۔ الغرض حضرت اپنے ماتحتوں کی اعلیٰ تربیت کے خواہش مند رہتے تھے، مگر پہلے خود عملی نمونہ بن کر دوسروں کو سکھاتے، اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ سیکھنے کا موقع دیا ہے اور سکھایا ہے تو یہ اس عظیم محسن کے مرہون منت ہے۔

بہرکیف ان کے ایک ایک وصف اور کردار پر کتابیں لکھ دی جائیں تب بھی کم ہے، مختصراً ان کے اوصاف کا ذکر کر کے ان کی توہین ضرور ہوئی گی، اس پر ان کی اولاد، متعلقین اور مبارک مٹی سے معذرت خواہ ہوں۔ پھر اپنے محسن جناب مولانا طفیل صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں، جنہوں نے ہمارے اوپر بھروسہ کر کے ہمیں اس عظیم ہستی کے یاد میں کچھ تحریر کرنے کا موقع دیا۔

محاسن وکمالات کا پیکر

مولانا عبدالمالک، ہنگو

من از پیر مغاں دیدم کرامتہائے مردانہ
کہ این دلق ریائی را بجائے برنمی گیرد

سیدی وسندی، مرجع خلائق حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں، میں بار بار کوشش کے باوجود چند نا تمام نقوش یکجا کرنے میں بمشکل کامیاب ہوا۔ دراصل حضرت الاستاذؒ کی زندگی کا ہر پہلو اتنا کامل واکمل ہے کہ جب اُسے بیان کرنے کا ارادہ کرتا ہوں، تو اسے تعبیر کرنے کے لئے موزوں الفاظ سے اپنے آپ کو مکمل طور پر تہی دامن پاتا ہوں، آپ کے علم کا رسوخ اور گہرائی جس تک ہم جیسوں کی رسائی ہی نہ ہو سکی تو اسے بیان کیسے کریں؟ آپ کا اخلاص وللہیت، آپ کی استقامت، آپ کا حب فی اللہ وبغض فی اللہ، آپ کا تقویٰ اور آپ کا زہد واستغناد دیکھ کر قرون اولیٰ کی ہستیاں یاد آجاتیں۔ مزاج میں سراسر سادگی وفقیری تھی۔ ولایت کے اونچے مقامات پر فائز تھے لیکن اسے اپنی زندہ دلی، خوش مزاجی اور عاجزی وانکساری کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ اہل حق کو جہاں کہیں تکلیف ہوتی، آپ فوراً وہاں پہنچ جاتے۔ مصائب وآلام کے ہجوم میں مسکرانا آپ کی فطرت ثانیہ تھی، ہر قسم کے حوادث وطوفانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے۔ دین واہل دین کی نصرت وحمایت میں کبھی جسمانی کمزوری، ضعف، بڑھاپا اور بیماری آڑ نہیں بن سکی۔ آپ کی محنت وجد وجہد دیکھ کر نوجوان شرما جاتے۔ میدان میں ایک پُرعزم مجاہد کی شان رکھنے والا یہ مردِ مجاہد مصلیٰ پر اس سے زیادہ تازہ دم دکھائی دیتا۔ طویل نوافل اور ذکر واذکار دیکھ کر گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ سارا دن غموم حیات سے نبرد آزما رہا ہے۔ فہم وفراست اور باطنی بصیرت اللہ تعالیٰ نے ایسی عطا فرمائی تھی کہ ہواؤں کے رُخ سے معاملات کی تہہ تک رسائی پا لیتے تھے۔ بندہ اپنی زندگی کے وہ لمحات جو آپ کی نگرانی اور صحبت میں بسر کیے اپنے لئے سرمایۂ حیات تصور کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس مقبول بندے سے تعلق کے یہی لمحے ذخیرۂ آخرت جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت کی سختیوں میں بھی ہمیں آپ کی معیت سے محروم نہ

رکھے۔ آمین

میرے عزیز تلمیذ مولانا محمد طفیل صاحب کا اصرار تھا کہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ سے متعلق میں اپنے تاثرات قلم بند کروں، میرے تاثرات کی کیا اہمیت ہے، حضرت الاستاذ کے مقام پر مجھ جیسا قلاش لکھے تو کیا لکھے؟ کوشش کروں گا کہ چند متفرق واقعات لکھ سکوں کیونکہ اللہ والوں کے واقعات اور حالات سنتے سناتے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت اترتی ہے اوران کے حالات پڑھ، سن کر عمل کی توفیق ہوتی ہے۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا روحانی مقام عطا فرمایا تھا کہ آپ کی صحبت میں آکر دماغی مریض بھی سکون محسوس کرتا مجھے جب بھی کوئی ذہنی کوفت یا دباؤ کا سامنا ہوتا یا کسی مسئلے میں دل ودماغ پریشان ہوجاتے تو فوراً حضرت کی مجلس میں آنے کا اہتمام کرتا اور بلا مبالغہ ملاقات کرتے ہی سارا بوجھ اتر جاتا۔ آپ کی صحبت میں ایک برکت یہ بھی دیکھی کہ ایک گھنٹہ بیٹھنے سے مہینوں علم کا جنون سوار رہتا، کتاب کی طرف رغبت ہوجاتی اور مطالعہ میں خوب دل لگتا، یہ آپ کی علمی توجہات کا فیض تھا جسے ہر طالب محسوس کرتا۔

بندہ نے حضرت الاستاذؒ کو کئی بار رمضان المبارک میں ختم قرآن سنایا، آپ کو سنانے کی جو واضح برکت میں نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ جس مقام پر آپ غلطی کی تصحیح فرماتے اور لقمہ دیتے، پھر زندگی بھر وہاں اٹکن یا غلطی نہیں آئی، بلکہ اس مقام پر پہنچ کر آپ کا بتلانا بالکل سامنے آجاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی بتلا رہے ہوں۔

جب حضرت سے کوئی مدرسہ جانے کے لئے مشورہ طلب کرتا تو فرماتے استخارہ کرکے جواب دوں گا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی نسبت کو بہت زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ اگر کہیں حضرت مدنیؒ کے شاگرد پڑھا رہے ہوتے تو بڑی خوشی سے وہاں کی اجازت عنایت فرماتے۔ بندہ آپ کے مشورہ سے درجہ خامسہ میں دارالعلوم کراچی چلا گیا تھا، ایک بار حضرت کو کسی نے مفتی تقی عثمانی مدظلہم کی ''تکفیر'' کے حوالے سے ایک تقریر دی تھی جو غالباً بخاری شریف کے کتاب الایمان کا ایک درس تھا، اس میں شیعہ کی عمومی تکفیر کے حوالے سے حضرت مفتی صاحب نے اپنا نکتہ نظر پیش فرمایا تھا، آپ نے مجھ سے ایک کاغذ منگوایا اور قلم نکال کر ٹیپ ریکارڈر پر وہ کیسٹ چلائی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی تقریر کو بغور سنا، صرف ایک مقام پر کچھ اشکال نوٹ کیا۔ پھر فرمایا کہ یہ ایک بات کھٹکی ہے، اس کے علاوہ کوئی خاص قابلِ اشکال بات نہیں۔ وہ یہ کہ حضرت مفتی صاحب نے امامیہ کے علی الاطلاق تکفیر نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ اگر ان میں سے ایک فرد بھی ایسا ہو جو کفریہ عقائد نہ رکھتا ہو، تو علی الاطلاق فتویٰ کی زد میں وہ بھی آئے گا اور اس کا وبال مفتی پر پڑے گا۔ اس پر حضرت استاذ صاحبؒ نے مفتی صاحب کو ایک خط لکھا، جس کا پہلا جملہ اب بھی مجھے یاد ہے کہ ''اُمید ہے کہ بارگاہِ سلیمانی میں نالہ ہدہد کی شنوائی ہوگی''۔ بندہ نے وہ خط حضرت مفتی صاحب کو پہنچایا تو

بڑے خوش ہوئے، مجھے فرمایا کہ جب آپ نے گاؤں واپس جانا ہو تو مجھے مل کر جانا۔ میں واپسی پر حضرت مفتی صاحب سے عین موقع پر ملا، غالباً اُس وقت آپ کو کوئی سفر یا اور مصروفیت درپیش تھی، جس کی وجہ سے جواب نہ دے سکے۔

حضرت الاستاذؒ کا مطالعہ متقدمین کی یاد دلاتا تھا، جب کتاب میں مگن ہو جاتے تو گرد و پیش کی بالکل خبر نہ رہتی، نہ ہی وقت گزرنے کا اندازہ ہوتا۔ ایک بار عشا کی نماز کے بعد آپ مجھے ساتھ لے کر کتب خانہ تشریف لے گئے۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کرنی تھی، مسئلہ تو یاد تھا لیکن حوالہ یاد نہ تھا۔ آپ نے الماری کے پاس کھڑے ہو کر مطالعہ شروع کیا۔ کتاب نکالتے، دیکھتے اور رکھتے۔ اس میں ایسے مستغرق ہوئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا، جب گھڑی پر نظر پڑی تو دیکھا کہ فجر کی اذان میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ فرمایا: توبہ توبہ یہ تو رات بیت گئی ہے۔ پھر مجھے فوراً چلے جانے اور آرام کرنے کا فرمایا اور خود مکتبہ میں رُک گئے۔ میرا گمان تھا کہ وہ وقت یا تو آپ نے تہجد و ذکر میں گزارا ہوگا یا مطالعہ کا تسلسل جاری رکھا ہوگا۔ میں جب اپنے بستر پر آیا تو ابھی لیٹے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ مطالعے کا ایسا استغراق میں نے زندگی بھر کسی کا نہیں دیکھا۔

ایک دفعہ میں پشاور کے سفر میں ساتھ تھا، آپ نے علامہ ذہبیؒ کی تاریخ اسلام کا باون جلدوں پر مشتمل نسخہ خریدا، ان دنوں حضرت بیمار بھی تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی کتاب کا بیماری میں کیا کریں گے؟ شاید مکتبہ میں رکھنے کے لئے خریدی ہو۔ آپ نے دو جلدیں اپنے کمرے میں رکھوائیں اور بقیہ جلدیں مکتبہ میں رکھ دیں۔ اگلے دن عصر سے کچھ دیر قبل مطالعہ شروع فرمایا، عصر کے بعد باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے اور مغرب کے بعد تک پوری جلد مکمل کر لیتے۔ مطالعہ کی سرعت دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے کہ ورق اُلٹتے تو بس چند لمحوں میں دوبارہ اُنگلی زبان سے لگا کر ورق اُلٹ دیتے، بظاہر لگتا تھا کہ ورق گردانی کر رہے ہیں لیکن مطالعہ اتنی گہرائی سے ہوتا تھا کہ ہر اہم بات اور واقعہ کو کتاب کے اُسترا اور سب ٹائٹل پر عنوان اور صفحہ نمبر سے نوٹ کرتے جاتے اور جہاں کہیں مصنف کتاب کی بات میں سقم محسوس کرتے، کتاب کے حاشیہ پر اُس کا جواب یا اپنا تبصرہ لکھتے جاتے۔ تاریخ اسلام کا یہ نسخہ آج بھی جامعہ یوسفیہ کی لائبریری میں محفوظ ہے، کوئی بھی آکر دیکھ سکتا ہے کہ اُس پر لکھے گئے نوٹ کتنے گہرے مطالعے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ باون جلدیں آپ نے دو ماہ سے کچھ کم عرصے میں پڑھ لی تھیں۔ جامعہ یوسفیہ کی وسیع لائبریری میں تمام اہم کتابوں پر آپ کے اسی طرح کے قلمی ملحوظے رقم ہیں، جن سے آپ کے وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اپنے علاقہ میں تو حضرت الاستاذ کی سیاسی اور سماجی حوالے سے مصروفیات انتہائی بڑھ گئی تھیں، جامعہ بنوری

ٹاؤن میں جب آپ کی کوئی خارجی مصروفیت نہ تھی اور تدریس بھی محض ایک دو گھنٹے ہوا کرتی تھی، آپ نے اسی سرعت اور تسلسل سے کامل بارہ سال مطالعہ کیا تھا اور کوئی فن ایسا نہیں چھوڑا تھا، جس پر کتب کی معتد بہ تعداد آپ کے مطالعے میں نہ آئی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت حافظہ سے نوازا تھا کہ سال ہا سال پہلے پڑھی ہوئی باتیں من وعن از بر ہوتی تھیں۔ آپ کا مطالعہ اور حافظہ دیکھ کر بلاشبہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

اختلافی مسائل میں اُلجھنا پسند نہیں فرماتے تھے اور بعض اوقات مسائل کی غیر ضروری تفصیلات سے احتراز کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ ایک بار کچھ دوست تشریف لائے اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ بس اس قدر ماننا ضروری ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق ہے، باقی تعلق کی کیفیت مجہول ہے، اس میں نہیں پڑنا چاہیے، اسی قدر کافی ہے۔

ملک کے نامور اہل علم آپ کے علمی رسوخ اور حدیث میں مہارت کے بڑے معترف تھے۔ مجھے جن اہل علم کی خدمت میں جانے کا موقع ملا اور وہاں حضرت کے حوالے سے اپنا تعارف کیا تو انہوں نے بہت ہی شفقت اور محبت سے نوازا۔

یہ ۱۹۹۶ء کی بات ہے، میں شیخ الصرف والنحو حضرت مولانا نصر اللہ خان صاحبؒ کے پاس دورۂ صرف ونحو پڑھنے کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہنگو سے۔ فرمایا: مولانا محمد امین صاحب کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت کا رشتہ دار ہوں۔ اس پر انہوں نے فوراً ایک طالب علم کو بلایا اور اُسے کہا کہ اسے کھانا کھلاؤ اور میرے کمرے میں اس کا بستر بچھاؤ تاکہ یہ آرام کر لیں۔ اسی نسبت کی وجہ سے کبھی کبھار مجھے اپنے پاس بلاتے اور دسترخوان پر کھانے میں شریک فرماتے۔

حضرت استاذ صاحبؒ سے دورۂ حدیث کے بعد شرح النقایہ پڑھنے کی توفیق ملی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ حدیث استاذ صاحبؒ سے پڑھوں، ہم چند ساتھیوں نے موقوف علیہ کے بعد بہت زیادہ اصرار کیا کہ حدیث ہمیں آپ پڑھائیں، حتیٰ کہ ہم نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ نہیں پڑھائیں گے تو ہم دورۂ حدیث نہیں کریں گے لیکن آپ کسی طرح نہ مانے بلکہ فرمایا کہ میں دورۂ حدیث شروع کروں اور حدیث پڑھاؤں؟ یہ تو علامات قیامت میں سے ہوگا۔

پھر حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کا درس مشکوٰۃ ختم ہونے پر اپنی زندگی کے آخری سالوں میں مشکوٰۃ شریف شروع فرمائی۔ میں نے ایک سال تدریس ترک کر کے آپ سے پڑھنے کا ارادہ کیا، لیکن افسوس کہ اگلے سال تک آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

آپ سے اللہ تعالیٰ نے مرقاۃ، المختار اور شرح النقایہ پڑھنے کی سعادت دی۔ انتہائی سہل، سادہ اور جامع انداز میں پڑھاتے تھے۔ تحریر میں جتنی تحقیق وتدقیق تھی، تدریس میں اس سے بڑھ کر تسہیل تھی۔ دوران تدریس حضرت نے ہمیں تخصص فی الحدیث بھی شروع کروایا لیکن افسوس کہ آپ کے نہج پر ہم مطالعہ کی تکمیل نہ کر سکے اور اُس سال آپ کی مصروفیات بھی اتنی تھیں کہ موقع نہ مل سکا۔

حضرت انتہائی اصاغر نواز تھے، جب ہماری دستار بندی تھی تو کراچی تشریف لا کر آپ اور حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ دستار بندی میں شریک ہوئے۔ مفتی تقی صاحب نے آخری حدیث شریف کا درس دیا، آپ سر پر چادر ڈال کر عام مجمع میں بیٹھ کر سنتے رہے۔

حضرت الاستاذ کی شہادت علمی حلقوں کے لئے ایک سانحۂ کبریٰ ہے۔ یقیناً ہمارے علاقے علمی اعتبار سے یتیم ہو گئے، آپ کی ذات اپنے علاقہ میں علمی حوالے سے آخری مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، جب بھی کسی کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا یا علمی وتحقیقی کام میں رہنمائی درکار ہوتی، تو آپ ہی سے معاونت طلب کرتے۔ آپ اصلاً علم اور کتاب کے آدمی تھے، تقویٰ وصلاح تو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے علاقوں کے کشیدہ حالات اور لوگوں کے جاہلی رویوں کے باعث آپ کا قیمتی وقت سماجی کاموں میں صرف ہوا اور آپ کو علم وتحقیق کے فروغ کے لئے ویسا موقع میسر نہ آسکا جس طرح کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں آپ نے کام کیا، اللہ تعالیٰ آپ کی شہادت قبول ومنظور فرمائے آپ کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں آپ کے فیوضات سے مستفیض فرمائے۔ (آمین)

مخلصِ ملت

مفتی محمد کریم، ہنگو

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئی کی حیثیت اور کارنامے ہمارے علاقے میں تجدیدی نوعیت کے تھے۔ مذہبی معاملے میں بدعت ورفض کا غلبہ تھا، جب کے سیاسی وسماجی سطح پر خان ازم کا راج تھا، لوگوں کے لئے ان دونوں میدانوں میں مروجہ مسلک ونظام سے انحراف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس وقت نوائے حق بلند کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی مذہبی یا سیاسی حوالے سے ان غالب قوتوں کی مخالف کی جرأت کرتا تو جمعہ کے دن تمام اقوام کے اجتماع میں اسے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس دن ایسے لوگوں کے خلاف ایسے ظالمانہ اور جابرانہ قبائلی فیصلے ہوتے تھے کہ کسی کو بھی خطرہ مول لینے کی ہمت نہ ہوتی۔ خان ازم کی مخالفت پر تمام اقوام کو پوری یک جہتی کے ساتھ جبراً مقابلے کیلئے تیار کیا جاتا، ایسے لوگوں کی جلاوطنی اور خانہ سوختی روز کا معمول تھا، بھاری مالی جرمانے اور سوشل بائیکاٹ اس پر مستزاد تھا۔ ایسے حالات میں حضرت الاستاذ نے مظلوم عوام کا ہاتھ تھاما اور انہیں اس مذہبی اور سیاسی بھنور سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

کچھ عرصے بعد حضرت الاستاذؒ نے اپنی دانش مندانہ پالیسیوں کے ذریعے اپنے ساتھ عداوت کو مرافقت، بدعت کو سنت، نفرت کو محبت اور دشمنی کو دوستی میں تبدیل کر دیا جو بظاہر بالکل ناممکن تھا۔ جن مزاجوں میں مخالفت و بغاوت کا مادہ ہو انہیں اپنا ہم نوا بنانا نبوی عزم وہمت کا متقاضی ہوتا ہے۔ حضرت الاستاذ نے وارث نبی ہونے کے ناطے اسی عزم سے کام لیا۔ بحمد اللہ ہمارے خاندان کا ہر فرد ان دگرگوں حالات میں حضرت کا معاون رہا۔ اس وجہ سے ہمارے خاندان سے آپ کی بڑی محبت تھی۔

غربت کے باوجود ہمارے والد صاحب نے ہم تین بھائیوں کو تعلیم وتربیت کے لئے حضرت کے سپرد کیا۔ الحمد للہ حضرت الاستاذ نے ہماری تعلیم وتربیت میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی۔ بڑے بھائی کے استاذ کے ساتھ تعلق

کے بارے میں بندہ تبصرہ نہیں کرسکتا، ان کے اور استاذ صاحب کے مابین جو محبت تھی وہ خارج از بیان ہے۔ نہایت رازدارانہ اور مشفقانہ تعلق تھا۔ میرے دوسرے بھائی نے درجہ حفظ سے دورۂ حدیث تک تمام زندگی حضرت کی تعلیمات و ہدایات کے مطابق گزاری۔ بندہ ناچیز تو ویسے بھی حضرت کے زیر اثر تھا، حضرت سے مشورہ کے بعد درجہ اعدادیہ میں داخلہ لیا، اسی سال حضرت سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ اعدادیہ میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم استاذ صاحب پڑھاتے تھے۔ استاذ صاحب کا درس وتدریس میں جو غلغلہ تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ بڑے درجوں میں اہم کتابیں حضرت خود پڑھاتے تھے، شہرت کا عروج تھا، اس کے باوجود انتہائی شوق اور اہتمام سے ہم بچوں کو سیرت رسول صلی اللہ عیہ وسلم پڑھائی۔ پابندی سے درجہ اعدادیہ کی درسگاہ میں آتے اور معصوم ذہنوں میں بڑے دل آویز، دلچسپ اور آسان انداز میں مقام رسالت اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ بٹھاتے۔ بندہ اس ابتدائی اور کم عمری کے زمانہ میں حضرت کی شفقتوں سے بہرہ ور تھا۔ میں واحد مقامی طالب علم تھا جس پر حضرت کی طرف مدرسہ میں رات کا قیام ضروری تھا۔ جمعرات کے علاوہ کسی بھی وقت کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی، مسلسل اپنی نگرانی میں رکھتے تھے۔

محبت وشفقت کے ساتھ ساتھ استاذ صاحب کا رعب بھی اس قدر تھا کہ کوئی طالب علم ان کی غیر موجودگی میں ان کے اصول کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ ہر ایک سے خیرخواہی استاذ صاحب کی طبیعت ثانیہ تھی۔ ان جیسا محسن وخیرخواہ انسان کم از کم ہمارے خطے میں ہم نے نہیں دیکھا۔ اپنوں اور بیگانوں کا یکساں خیال رکھنا، ہر ایک کی سرپرستی ونگرانی کرنا حضرت الاستاذ کا شیوہ تھا۔

طلبہ کی نگرانی کا طریقہ بڑا عجیب تھا، چاہے مدرسہ میں طلبہ کی تعداد جتنی بھی ہو مجھے یاد نہیں کہ حضرت نے کبھی رجسٹر میں حاضری لی ہو، نماز کے بعد ایک نگاہ ڈالتے تھے، اسی سے اندازہ لگالیتے کہ کون حاضر ہے اور کون غائب۔ جن درجات میں سبق نہ بھی ہوتا ان طلبہ کا بھی پتہ ہوتا اور ان سے پوچھتے کہ بھائی کل کہاں تھے؟ اسی طرح نماز میں غیر موجود لوگوں کے بارے بھی اسی ایک نظر میں معلوم کرلیتے۔ یہ بات بڑی ہی عجیب تھی۔

مدارس میں عموماً انتظامی حوالے سے سخت مزاج استاذ سے طلبا کا رویہ تنفر کا ہوتا ہے اور وہ ان کے قرب سے دور بھاگتے ہیں۔ استاذ صاحب گوکہ انتظامی حوالے سے سخت مزاج تھے اور تعلیم وتربیت میں کسی کی رعایت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باجود ہم استاذ صاحب کے قرب کے متمنی رہتے تھے، ان مواقع کی تلاش رہتی کہ حضرت سے یکسوئی میں ملاقات ہوجائے، آپ کی مار پٹائی اور ڈانٹ ڈپٹ پر معاذ اللہ نفرت یا دل میں تکدر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت اقدس کی ذات گرامی میں جو کشش تھی، وہ پھر ماں باپ کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔

مدرسہ سے آتے جاتے وقت استاذ صاحب سے ملاقات ورخصت ضروری تھی، ورنہ ناراض ہوتے۔ موقع کی مناسبت سے ہر کسی کے ساتھ معاونت عادت مبارکہ تھی۔ طالب علمی کے دور میں بھی حضرت نے ہمیشہ مالی معاونت فرمائی ہے اور فراغت کے بعد بھی موقع بہ موقع خیال رکھتے تھے۔

فراغت کے بعد آپ نے چند نصیحتیں فرمائیں، وہ باتیں اب بھی ذہن پر نقش ہیں۔ فرمایا: آپ اپنی پہلی والی زندگی اور اب کی زندگی میں ضرور فرق کریں کیونکہ لوگ پہلے آپ کو ایک طالب علم سمجھتے تھے، اب آپ کو ایک مولوی سمجھیں گے، اس سے قبل آپ پر سوائے اپنے سبق کے کوئی بوجھ نہیں تھا، اب آپ پر اپنے گھر، خاندان اور معاشرے کی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ میرے نزدیک کامیاب عالم دین وہ ہے جس کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو اور ساتھ اپنے اساتذہ کرام کے نقش قدم کا پابند ہو۔ دستار فضیلت کا مقصد یہ ہے کہ بندے کے سر پر ذمہ داری کی پگڑی رکھ دی گئی لہٰذا بیٹا! اپنی ذمہ داریوں کو معلوم کرنے کے بعد ان کی ادائیگی کی کوشش کریں۔

حضرت بعض امور کی تعلیم قولاً فرماتے بعض امور کو عملاً تلقین فرماتے۔ حضرت الاستاذ کے ہر عمل میں ذی عقل انسان کیلئے بہت سارے اشارے مضمر ہوتے تھے۔ میرا نکاح پڑھانے کے لئے خاندان کے سب بڑے حاضر خدمت ہوئے۔ میرے بڑے بھائی سے پوچھا کہ خیریت تو ہے، آج سب تشریف لائے ہو۔ عرض کیا کہ حضرت! محمد کریم کے نکاح کا ارادہ ہے۔ حضرت فوراً کھڑے ہوئے اور اپنے کمرہ سے باہر نکل گئے، ہم حیران ہوگئے کہ حضرت کیوں نکل گئے۔ میں فوراً اُٹھ کر پیچھے نکلا تو حضرت نے فرمایا کہ وچ بازار جائیں گے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کا نکاح حضرت اقدس مولانا عبداللہ صاحبؒ پڑھائیں، کیونکہ حضرت ہم سب کے استاذ ہیں۔ قابل قدر شخصیت ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت! ہم تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، باقی جیسے آپ حکم فرمائیں گے، ہم تیار ہیں۔ پھر حضرت میرے رشتہ داروں کے طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''وہ امور جن میں بڑوں کے لئے مشقت نہ ہو وہ خیر و برکت کے ارادے سے اپنے بزرگوں سے کروانا چاہئیں۔ میرا مشورہ ہے کہ اس بچے کا نکاح حضرت شیخ صاحبؒ سے پڑھوائیں تو بہتر ہوگا۔''

اس مختصر جملے اور عمل میں کتنے اسباق پوشیدہ ہیں:

(۱) تواضع وانکساری۔ (۲) اپنے استاذ کا احترام۔ (۳) اپنے متعلقین کو اللہ والوں سے جوڑنے کی فکر۔ (۴) اپنے اوپر دوسرے اہل علم کو ترجیح۔ (۵) بزرگوں سے خیر و برکت کے حصول کی تعلیم۔ (۶) بزرگوں کا خیال رکھنے کی طرف اشارہ۔ کہ مشقت والے کام میں حصول برکت کے نیک ارادے کے باوجود ان کو تکلیف دینا نامناسب ہے۔ (۷) اپنی بات کو مشورہ سے تعبیر کرنا جس میں متعلقین کی رعایت تھی گویا اپنی بات مسلط نہیں کی۔ (۸) مروت

کہ خود ساتھ چل دیئے صرف ہمیں نہ بھیجا۔

جب وہاں پہنچے تو شیخ صاحبؒ نے استاذ صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ پڑھتے تو بہتر ہوتا۔حضرت الاستاذؒ نے فرمایا کہ نہیں حضرت! اس نوجوان کا نکاح آپ ہی پڑھائیں گے۔حاضرین مجلس کے لئے اس محفل میں کئی عجیب باتیں سننے کو ملیں۔خاص کر استاذ وشاگرد کے مابین جو نیازمندانہ گفتگو ہوئی اور ایک دوسرے کا جو احترام دیکھا وہ قابل دید نظارہ تھا۔

ایک مرتبہ استاذ محترم وفاق المدارس کے ڈپٹی جنرل سیکرٹری حضرت مولانا قاضی عبدالرشید صاحب راولپنڈی سے تشریف لائے تھے۔بندہ نے ناشتے کا انتظام کیا تھا۔قاضی صاحب جب ناشتے کیلئے ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ،تو فرمایا کہ اگر استاذ صاحب ہوتے تو بہت بہتر ہوتا۔میں استاذ صاحب کو لانے مدرسہ حاضر ہوا تو حضرت مطالعہ میں مصروف تھے۔میں مکتبہ میں اودھر ادھر گھومنے لگا مگر حضرت کے مطالعہ میں اتنا استغراق وانہماک تھا کہ میری آمد اور گھومنے کا انہیں کوئی پتہ نہ چلا۔تقریباً پون گھنٹہ بعد کوئی دوسری کتاب الماری سے نکالنے کے لئے اٹھے تو مجھ پر نظر پڑ گئی۔میں نے عرض کیا کہ قاضی صاحب آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔فوراً روانہ ہو گئے۔اس دن احساس ہوا کہ حقیقی مطالعہ تو اس طرح ہوتا ہے۔ہمارے مطالعہ کا تو یہ حال ہے کہ اگر کمرے میں مچھر بھی داخل ہو جائے تو پتہ چل جاتا ہے۔حالانکہ عام زندگی میں حضرت الاستاذ کی حساسیت ضرب المثل تھی ،قوت سامعہ اور شامہ تو انتہائی غیر معمولی تھی ،ذرا سی آواز کا بھی ادراک ہو جاتا۔

جب ۲۰۰۷ء میں میری فراغت ہوئی ،تو ہمارا علاقہ طالبان کے زیر اثر تھا۔تمام محکموں میں سرکاری اہلکاروں نے اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ دی تھیں۔ایک صاحب نے مجھے کہا کہ اگر آپ ہمارے ساتھ سکول میں پڑھانے آجایا کریں تو ممنون ہوں گے کیونکہ آج کل اساتذہ طالبان کے خوف کی وجہ سے سکول نہیں آتے۔بندہ نے کہا کہ میں استاذ صاحب سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔مدرسہ میں شعبان رمضان کی تعطیلات تھیں۔بندہ مشورے کے لئے حاضر ہوا تو استاذ صاحب وضو فرما رہے تھے۔میں مسجد کے برآمدے میں انتظار کرتا رہا جب تشریف لائے تو فرمایا: بیٹا! خیریت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک مشورہ کے لئے حاضر ہوا ہوں ،فوراً ہی وہاں تشریف فرما ہو گئے ،نہایت توجہ سے میری بات سن کر فرمایا: بیٹا! آپ میرے مزاج سے واقف نہیں؟ اس بات سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوئی کہ اللہ خیر فرمائے کہیں ڈانٹ تو نہیں پڑے گی۔فرمایا: میں سکول کا مخالف نہیں ،صرف ان کے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔باقی سکول اور مدرسہ میں جو بچے پڑھتے ہیں یہ ہمارے بچے ہیں۔ان کی تعلیمی واخلاقی پرورش ہمارے ذمہ لازمی ہے۔آج کل اصلاح ماحول اور تعلیم وتربیت کے لئے علما کا سکولوں کالجوں میں جانا بھی ضروری ہے۔لیکن یہ

بات بھی یاد رکھیں! کہ وہاں ان سے تأثر لینا بڑی کم بختی ہے۔ وہاں اس انداز سے رہنا چاہیے کہ ان کو اپنے آپ سے متأثر کریں۔ یہ ہماری کامیابی ہوگی اور اپنے اکابر کے خواب کی تعبیر بھی ہوگی۔ پھر مجھے سکول میں عارضی طور پر پڑھانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

وہ دن کبھی نہیں بھولتا کہ میں نماز فجر کے بعد مدرسے آیا۔ دیکھا کہ استاذ صاحبؒ اپنے کمرے کے سامنے پریشانی کے عالم میں کھڑے ہیں اور نہایت متفکر ومغموم ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ظالم لوگ میرے جسم کے اعضاء کاٹتے ہیں؟ میرے خیال میں یہ آگ ہمارے گھروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ الفاظ ایسے دردمندانہ لہجے میں فرمائے کہ میں پریشان ہوگیا کہ آخر کیا ہوا ہے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ ان ظالموں نے ہمارے دوست ماسٹر شریف صاحب کو شہید کر دیا ہے۔ ماسٹر صاحب کا نام لیتے ہی حضرت کی حالت غیر ہوگئی اور ہم بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت اس خانہ جنگی کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ مجھے اس دن حضرت کی حب الوطنی، اپنے احباب سے محبت اور ان حالات میں آپ کے فکر ونظر کا پتہ چلا۔

۲۰۰۹ء میں مجھے تدریس کی خدمت سپرد ہوئی، آپ نے شہادت سے چند دن قبل مجھے اپنے کمرے میں بلایا، کچھ رقم دینی چاہی، میں نے لینے سے انکار کیا لیکن استاذ صاحب نے اصرار سے حوالہ کی کہ اپنی ضروریات میں استعمال کریں۔ یقین جانیے اس وقت مجھے اتنی ہی رقم کی شدید ضرورت تھی۔ نہ جانے حضرت کو کشف ہوا تھا یا یہ اتفاق تھا۔

حضرت استاذ صاحبؒ کی ہستی ہم سب کے لئے ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ صرف دوست نہیں بلکہ آج دشمن بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ رب العالمین آپ کے فیوضات وبرکات سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین

چند منتشر یادیں

مولانا حبیب الرحمن، کوہاٹ

ہمارے استاذ محدث جلیل مولانا محمد امین صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ہمارے کچھ دوستوں نے خصوصی نمبر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی سعی قبول فرمائیں اور اسے آخرت کا ذخیرہ بنا دیں۔

حضرت استاذ صاحبؒ کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، بڑے بڑے اولیا اور نامور علما ہمارے اس پسماندہ علاقہ میں قائم مدرسہ جامعہ یوسفیہ کا رخ کرتے تھے اور مختلف حوالوں سے حضرت الاستاذ سے کسب فیض فرماتے۔ سالانہ چھٹیوں میں دور دور سے آپ کے تلامذہ اور دیگر علما کی آمد کا تانتا بندھا رہتا۔ استاذ صاحبؒ ویسے تو جامع الصفات شخصیت تھے، لیکن بعض اوصاف انتہائی نمایاں تھیں اور ان میں آپ کا ثانی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مثلاً اخلاص وللہیت اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

مدرسہ یوسفیہ کی بنیاد اخلاص وتوکل پر تھی۔ عموماً بڑی حیثیت کے علما کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے حلقہ ہائے درس ایسی جگہ پر قائم ہوں جہاں ضروریات زندگی اور سہولیات کی فراوانی ہو، اس میں دیہی علاقے اکثر وبیشتر فیوض وبرکات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے خطوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم واحسان رہا ہے کہ ان کے کوہ ودمن ہمیشہ اہل اللہ کے سوز وساز سے آباد رہے ہیں اور انتہائی تہی دستی اور قلاشی میں رہروان علم وفن نے یہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائے بازگشت قائم ودائم رکھی ہے۔ حضرت الاستاذ انہی مخلصین کے کاروان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب آپ کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن جیسے ادارے میں مشیخت حدیث کا منصب سنبھالنا ممکن تھا آپ نے اس پر ''دام'' کے جنگل میں نورانی قاعدہ پڑھانے کو ترجیح دی۔

استاذ صاحب کے ہر قول و فعل اور عمل میں اخلاص نمایاں نظر آتا تھا۔ اکثر جب روزہ رکھتے تھے، اور کوئی مہمان نہ ہوتا تو عصر تا مغرب کا وقت مسجد میں گزارتے تھے اور چادر اس طرح سے سر پر ڈال کر رکھتے کہ چہرہ کھلا رہتا لیکن دیکھنے والے کو اطراف سے نظر نہ آتا تھا۔ اسی حالت میں ایک کھجور کھا لیتے، کبھی کلی کرنے اٹھ جاتے اور ساتھ پانی کا ایک گھونٹ پی لیتے، الغرض افطار ایسے طریقہ سے کرتے کہ کسی کو علم نہ ہو پاتا۔ آپ اکثر روزہ سے رہتے لیکن کسی کو علم نہ تھا۔ آپ کے تمام اعمال خیر میں اخفا کی یہی شان پائی جاتی۔ اس لئے آپ کی زندگی کے تمام پہلو کسی کے سامنے بھی پوری طرح واضح نہیں ہو سکے۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اگر میں کہوں کہ اپنے ہمعصروں میں سر فہرست تھے، تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ ہر وقت ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور درود شریف سے رطب اللسان ہوتے۔ طلبا کو بھی درود شریف کے ورد کی تاکید فرماتے اور امتحان میں ہمیں بتاتے کہ اگر کسی سوال کا جواب بھول گئے ہوں یا ذہن میں نہ آ رہا ہو، تو درود شریف پڑھیں، ذہن میں آجائے گا۔ ہم ایسا ہی کرتے تھے اور اس عمل کو انتہائی مجرب پایا۔ استاذ صاحبؒ ہر طالب علم کو دلائل الخیرات کا وظیفہ دیتے تھے، ویسے تو استاذ صاحبؒ کسی کو بیعت نہیں فرماتے لیکن دلائل الخیرات کا وظیفہ خود بھی معمول تھا، بلا ناغہ کرتے اور طالب علموں کو بھی تاکید کرتے۔

ایک دن مولانا محمد یوسف صاحب' جو اس وقت طالب علم تھے' نے ہم سے کہا کہ استاذ صاحب جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو فارسی، عربی اور اردو کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے ہیں۔ لیکن حضرت مروجہ غیر سنجیدہ نعت خوانی سے منع فرماتے تھے اور اس پر سخت ناراض ہوتے تھے۔ جب ہم بزم ادب میں کسی طالب علم سے نعت سنتے تو کھڑکیاں دروازے بند کر دیتے تاکہ استاذ صاحب نہ سن لیں، ایک دفعہ اچانک آپ دوسری منزل پر تشریف لائے ہماری نعت خوانی جاری تھی، آپ نے ہمیں سختی سے ڈانٹا کہ اس طریقہ سے تو قرآن مجید کی تلاوت بھی جائز نہیں جس طرح تم نعت پڑھتے ہو۔ گویا نعت شریف پڑھنے کے لئے آپ کا معیار قرآن مجید پڑھنے کی طرح ادب و آداب والا تھا۔

استاذ صاحب مروت کے پیکر تھے، ایک دفعہ درس میں واقعہ سنایا کہ میں کوہاٹ میں پڑھتا تھا، ایک مسجد میں ہماری اقامت تھی۔ میرے ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ جب تازہ روٹی میسر نہ ہوتی تو ہم روٹی کے سوکھے ٹکڑے اٹھا کر مسجد کے قریب پانی کے چشمے پر بیٹھ جاتے اور پانی میں اُن ٹکڑوں کو بھگو کر کھاتے تھے۔ ایک دفعہ میرے چچا جان ملنے آئے، میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا، وہ آکر ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے، جب میری یہ حالت دیکھی تو رو پڑے۔ میری نظر ان پر پڑی تو ملنے کے لئے اٹھا، وہ بدستور رو رہے تھے کہ آپ اس حالت میں یہاں وقت گزارتے ہیں۔ میں نے کہا کہ چچا جان! میرے پاس تو اتنی مقدار میں رقم موجود ہے کہ تازہ روٹی خرید کر کھا سکوں

لیکن میرے ساتھیوں کے پاس اتنی رقم نہیں۔ مجھے گوارا نہیں کہ میں تازہ روٹی کھاؤں اور میرے دوست سوکھے ٹکڑے کھاتے رہیں۔

استاذ صاحب بہت مہمان نواز اور ملنسار شخصیت تھے، دور دور سے مہمان آتے تھے اور بہت صاحب نسبت لوگ آیا کرتے تھے، ایک دفعہ استاذ صاحب گھر تشریف لے گئے تھے، دوپہر کا وقت تھا، کراچی سے مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہم تن تنہا تشریف لے آئے۔ طلبہ سو رہے تھے، ہم چند بچے درخت سے شہتوت توڑ کر کھا رہے تھے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ بہت بڑی شخصیت ہے، انہیں حجرے میں عام سی چارپائی پر بغیر گدا، چادر ڈالے بٹھادیا اور استاذ صاحب کے بھتیجے نے جا کر گھر سے ماحضر اٹھا کر پیش کردیا، غالباً دال وغیرہ کا سالن اور تندور کی دوپہر سے بچی ہوئی روٹی تھی۔ حضرت نے ہمارے ساتھ بہت بے تکلف باتیں کیں اور مجھ سے فرمایا کہ تمہارا استاذ تمہیں روٹی نہیں دیتا جو تم شہتوت کھاتے ہو۔ ہم نے جواب دیا کہ جی! روٹی بھی کھاتے ہیں، لیکن اس وقت یہ جواب نہ دے سکے کہ یہ تو ہم بطور تلذذ اور تفکہ کے کھاتے ہیں، بطور غذا نہیں کھاتے۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ چھوٹا پیشاب کہاں کرتے ہیں؟ ہم انہیں باہر جنگل میں لے گئے کہ یہاں قضائے حاجت کرلیں۔ پھر برآمدے ہی میں ان کے لئے پنکھا چلا کر خالی چارپائی پر سرہانے تکیہ ڈال کر لٹادیا، ہم تو سمجھے تھے کہ کوئی تبلیغی بابا جی ہیں، دم تعویذ کے لئے آئے ہوں گے۔ استاذ صاحب ظہر کی نماز میں تشریف لائے اور یہ سارا منظر دیکھا تو سخت غصے ہوئے کہ اتنے معزز مہمان سے پوچھا تک نہیں کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ آپ کو اتنا صدمہ ہوا جب یہ پتہ چلا کہ ان کو عام کھانا کھلایا گیا ہے اور قضائے حاجت کے لئے بیت الخلاء کی بجائے جنگل لے جایا گیا ہے، اس صدمہ کا اثر کئی دن تک آپ پر محسوس ہوتا رہا۔

ایک دفعہ استاذ صاحبؒ نے ہمیں اثناء درس ایک اللہ والے بزرگ کا واقعہ سنایا کہ وہ میرے دوست ہیں، پنجاب سے آتے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب کبھی میں یہاں آتا تھا، تو وچ بازار (مدرسہ سے چار کلومیٹر دور ایک مقام) سے مجھے آپ کے مدرسہ پر انوارات کی بارش نظر آتی تھی، لیکن عجیب بات ہے اس دفعہ مجھے انوارات نظر آئیں لیکن بہت تھوڑی مقدار میں۔ کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی۔ تو اس نے جواب دیا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اساتذہ کا آپس میں کوئی اختلاف ہوا ہوگا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ہدف تو بالکل وسط پہ لگا ہے، لیکن ان کو خبر نہیں دی کہ واقعتاً اساتذہ میں کچھ اختلاف ہوا ہے۔

استاذ صاحبؒ کے پاس اس طرح کے بڑے بڑے صاحب نسبت لوگ تشریف لاتے تھے جن کی عجیب

کرامات اور انوکھے واقعات ہوتے تھے، خصوصاً جب استاذ صاحب رمضان میں اعتکاف میں بیٹھتے تو اولیا کا آنا جانا بہت ہوتا تھا، لیکن استاذ صاحب اپنے کشف و کرامات اور اپنے تصرفات انتہائی خفیہ رکھتے تھے، کسی رازدار دوست پر بھی ظاہر نہیں فرماتے۔

استاذ صاحب کا عام معمول زندگی یہ تھا کہ تقریباً نصف شب گزرنے کے بعد تہجد پڑھتے تھے۔ اکثر مدرسے کی مسجد میں آتے۔ اگر کسی طالبعلم نے تہجد کے لئے جگانے کا کہا ہوتا تو اس کو آخر شب میں جگا لیتے تھے، سب کو نہیں جگاتے تھے۔ البتہ تہجد پڑھنے کی کافی تاکید کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ استاذ صاحب از خود کچھ محسوس کرتے ہوئے جلال سے طالب علم کا نام لے کر پکارتے اور اسے تہجد کے لئے اٹھا دیتے اور فرماتے کہ طالبعلم ہو اور تہجد نہ پڑھے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک دفعہ مجھے بھی نام سے پکارا کہ حبیب الرحمن! اٹھو اور تہجد پڑھو۔

استاذ صاحب علماء کرام کے بہت قدردان تھے۔ ایک دفعہ مولانا طارق جمیل صاحب ہمارے مدرسہ میں تشریف لائے تھے، رمضان کا مہینہ تھا، افطاری کے وقت استاذ صاحب کا معمول تھا کہ مغرب کی اذان شروع ہوتے ہی افطار نہیں کرتے تھے بلکہ تھوڑی دیر غروب کے یقین کے لئے انتظار کرتے۔ اس دن اذان شروع ہوتے ہی مولانا طارق جمیل صاحب نے استاذ صاحبؒ سے فرمایا کہ حضرت اذان ہو رہی ہے۔ تو حضرت نے ان کی دلجوئی کے لئے اپنے معمول کو چھوڑ کر فوراً بلا تامل افطار کر لیا۔

تہجد کے بعد ذکر میں مشغول رہتے تھے، اذان کے بعد نماز سے تھوڑی دیر قبل تک آرام فرماتے۔ نماز فجر کے بعد اجتماعی طور پر سارے طلبہ کے ساتھ مل کر سورۃ یٰسین پڑھتے، اشراق کی نماز مسجد میں ادا فرماتے، اس کے بعد گھر میں اپنی مستورات کو تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے۔ ناشتہ کرتے اور پھر فوراً ہی مدرسہ آتے تھے۔ اسباق پڑھنے کے بعد مہمان وغیرہ آئے ہوتے تو ان کے ساتھ بیٹھتے، ورنہ تسبیح تو ہر وقت ہاتھ میں ہوتی تھی، درود شریف پڑھتے رہتے۔ قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے۔ ہمارے ابتدائی دور میں ظہر کے بعد بھی اسباق ہوتے تھے، اسباق پڑھاتے، ورنہ مطالعہ و تصنیف کے کام میں مصروفیت ہوتی تھی۔ عصر کے بعد اکثر مہمانوں کے ساتھ بیٹھتے تھے، ورنہ ذکر و شغل میں مصروف رہتے تھے۔ پھر مغرب کے بعد اوابین پڑھ کر گھر چلے جاتے۔ عشا کے بعد ہم طلبا تکرار و مطالعہ سے فارغ ہو کر سو جاتے تھے لیکن استاذ صاحبؒ دار المطالعہ میں بیٹھے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے اور صبح تہجد کے لئے بھی طلبا سے پہلے مسجد میں موجود ہوتے تھے۔ میں نے حضرت کی صحبت میں پانچ سال گزارے، ان میں پانچ منٹ کے لئے بھی استاذ صاحب کو فضول بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دفعہ فرمانے لگے کہ تبلیغی حضرات روتے ہیں کہ لوگ تبلیغ نہیں کرتے۔ مجاہدین جہاد کا رونا رو رہے ہیں۔

مرشدین اپنے سالکین سے خوش نہیں ہیں۔لیکن میں اس پر روتا ہوں کہ رسوخ فی العلم ختم ہوگیا۔اللہ تعالی حضرت الاستاذؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان کے علمی و روحانی انوارات سے پورے عالم کو منور فرمائے۔آمین

نایاب شخصیت

مولانا محمد شاہ،کوہاٹ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد:

استاذ محترم حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت جامع الکمالات تھی ،جس نے بھی قریب سے دیکھا،یہی سمجھا کہ یہ تو اس زمانے کا فرد نہیں ہے، بلکہ یہ تو اسلاف کے کاروان کا کوئی بچھڑا ہوا مسافر ہے، اسلاف کی خوبیوں کے مالک تھے اور ہر خوبی کمال درجے کی تھی۔بندہ نے درجہ اعدادیہ سے لےکر درجہ خامسہ تک مسلسل چھ سال آپ کے زیر تربیت وقت گزارا۔الحمدللہ بہت قریب سے آپ کی صفات وخصائل دیکھنے کا موقعہ ملا، اکثر چیزوں کا تذکرہ ہمارے بہت سے احباب نے کردیا ہے، میں تکرار سے بچتے ہوئے چند واقعات اور مشاہدات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

حضرت الاستاذؒ کے توکل علی اللہ کا یہ حال تھا کہ ہم نے اس طویل عرصے میں کہیں بھی استاذ محترم کو مدرسے کے لئے چندہ کرتے نہیں دیکھا اور نہ اس قسم کی کوئی بات سنی، حالانکہ مدرسے کی ابتدا ایک جنگل میں ہوئی، جہاں اس وقت خاص آبادی نہیں تھی، گنے چنے چند گھر تھے اور ہمیں بھی اکثر توکل علی اللہ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

استغنا بھی استاذ محترم میں کمال درجہ کی پائی جاتی تھی،آپ کے پاس مہمانوں کی آمدورفت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، دوردراز کے مہمانوں کے لئے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیتے تھے،لیکن مقامی لوگ جو وقت بے وقت اپنے معمولی معمولی کاموں کے لئے آتے تھے آپ کا کافی سارا وقت ضائع کردیتے تھے،آپ پر مروت کا غلبہ تھا اس لئے بظاہر

کچھ نہ کہتے تھے لیکن ایسی تدبیر کی کوشش کرتے کہ تعلیم ومطالعہ کا حرج کم سے کم ہو۔ظہر کے بعد ہمارے ساتھ حضرت کے دو اسباق تھے۔آپ نے ہمیں پہلے سے بتایا تھا کہ جب سبق کا وقت ہوجائے تو آپ آجایا کریں، مہمان آپ کو دیکھیں گے تو میں کہہ سکوں گا کہ طلبا سبق کے لئے آئے ہیں،اس طرح سبق کا حرج نہ ہوگا۔از خود کہنے میں آپ عار محسوس کرتے۔

ایک مرتبہ کوہاٹ سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے،حضرت کے پاس کمرے میں بیٹھے تھے،ہم سبق پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے اور کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر اندر اجازت لینے کے لئے جھانکا۔مہمانوں میں سے ایک صاحب حضرت استاذ محترم کو کچھ دے رہے تھے اور حضرت اسے واپس کررہے تھے۔خیر! ہم پیچھے ہٹ گئے اور مہمانوں کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے،کچھ دیر بعد مہمان باہر نکل گئے،ہم حضرتؒ کے پاس اندر چلے گئے،تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کوہاٹ شیخان کے میرے دوست ہیں،(وہ مہمان باپ بیٹے تھے) کچھ عرصہ پہلے اس نے مجھے دودھ کے لئے ایک گائے ہدیہ کی تھی۔میں سوچتا تھا کہ اس کے اس احسان کا میں کس طرح بدلہ دوں۔اب اس پر مزید ایک اور احسان مجھ پر کررہا تھا کہ مجھے کچھ رقم 'جو اندازے کے مطابق پچیس یا تیس ہزار کی معلوم ہورہی تھی' دے رہا تھا۔میں نے اس سے کہا کہ آپ یہ رقم مجھے اس لئے دے رہے ہیں تاکہ مجھے راحت ہو۔مجھے اس سے ہرگز راحت نہیں ہوگی۔یہ رقم میں نے ہاتھ میں پکڑی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ میں نے آگ کے انگارے ہاتھ میں پکڑے ہوں،لہٰذا اگر مجھے راحت دینی ہے تو یہ آپ واپس لے لیں،تب اس نے واپس لے لی۔حضرت نے فرمایا کہ یہ میں آپ کے سامنے اس لئے بیان کررہا ہوں تاکہ آپ لوگوں سے استغنا اختیار کرلیں۔آپ تو مجھ سے بہت اچھے ہیں،اگر آپ استغنا اختیار کریں گے تو دنیا ذلیل ہوکر آپ کے قدموں میں آئے گی۔غرض دیر تک ہمیں اس طرح کے واقعات سنا کر استغنا وتوکل کی ترغیب دیتے رہے۔

اپنا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں پشاور کسی کام سے گیا ہوا تھا،وہاں میرا ایک دوست تھا،اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر بھی چلا گیا۔جب اس سے رخصت لینے لگا تو اس نے اپنے خادم سے انگریزی زبان میں کچھ کہہ دیا،وہ اندر چلا گیا اور ہاتھ میں ایک تھیلی لے کر آیا،رخصتی کے وقت اس نے وہ تھیلی مجھے دیدی۔میں سمجھا کوئی معمولی سا تحفہ ہوگا،میں نے لے لی۔باہر نکل کر جب میں نے دیکھا تو یہ تھیلی پیسوں سے بھری ہوئی تھی،اس میں پچاس ہزار روپے تھے،اس وقت پچاس ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔میں اس کے پاس واپس چلا گیا اور میں نے اتنی بھاری رقم قبول کرنے سے انکار کیا اور وہ اصرار کررہے تھے اور اپنی ذات کے لئے قبول کرنے پر مصر تھے۔بالآخر میں نے اس سے کہا: اگر آپ نے یہ رقم کسی طرح واپس نہیں لینی تو میں مدرسے کے لئے قبول کرسکتا ہوں۔

بڑی مشکل سے وہ اس پر راضی ہوا اور کہا: چلو مدرسے کے لئے قبول کرلو لیکن واپس نہ لوٹاؤ۔ جامعہ یوسفیہ میں جنوب کی جانب کونے میں دو کمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دو کمرے میں نے اسی رقم سے تعمیر کرائے ہیں۔

حضرت کی ساری زندگی حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق تھی۔ میں اس حوالے ایک چشم دید واقعہ قارئین کے نذر کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت ہمارے ہاں گاؤں میں مہمان تھے۔ رات کو میں اور برادرم مولانا طاہر احمد مدظلہ ساتھ تھے، سردی کا موسم تھا، حضرت رات کو سردی کی وجہ سے سخت تکلیف محسوس کررہے تھے، اس لئے دو کمبل اوڑھے ہوئے تھے، لیکن اس کے باوجود جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت گرم بستر چھوڑ کر اُٹھے۔ میں بھی حضرت کے پیچھے اُٹھا۔ گرم پانی کا لوٹا دیا، بیت الخلاء سے فارغ ہوکر وضو بنانے کے لئے بیٹھ گئے۔ میں اندر کمرہ میں آ گیا تو حضرت میرے پیچھے اندر آ گئے۔ مجھے بلا کر فرمایا کہ آپ کے پاس مسواک ہے، میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: میرا مسواک کہیں کھو گیا ہے اگر آپ دے دیں۔ میں نے مسواک پیش کیا۔ آپ نے استعمال کر کے مجھے واپس دے دیا۔ آپ نے بغیر مسواک کے وضو گوارا نہیں فرمایا۔ تہجد کی نماز پڑھی تو سحری کا انتظام پہلے سے ہو چکا تھا کیونکہ اس دن آپ کے نفلی روزہ کی ترتیب تھی۔

مدرسہ اور طلبا کی خدمت سعادت سمجھ کر کرتے تھے، جب تعمیر وغیرہ کا کام ہوتا تھا، اس میں طلبا کے ساتھ خود بھی شریک ہوتے تھے، بارہا ہمارے ساتھ اینٹ کے ٹرک خالی کیے۔ مہمانوں کی خدمت کے علاوہ تمام طلبا کا سالن روزانہ دو وقت حضرت کے گھر میں پکتا تھا۔ تا حال یہی سلسلہ چل رہا ہے۔

سادگی کا یہ حال تھا کہ مظاہر جدیدیت کی بالکل خبر نہ تھی، حتی کہ ٹیپ ریکارڈ کا استعمال بھی نہ جانتے تھے، ایک بار کسی نے بیرون ملک سے کوئی کیسٹ بھیجا، ٹیلیفون اور موبائل کے دور سے پہلے لوگ کیسٹوں میں گفتگو ریکارڈ کر کے بھیجا کرتے تھے۔ اب حضرت کو کسی نے کمرے میں وہ کیسٹ چلا کر دی تھی، حضرت کو کہیں باہر نکلنا تھا، اب ٹیپ بند کرنا آئے نہیں اور سخت تنگ ہورہے ہیں، اسی اثنا کیسٹ ختم ہوئی اور بٹن اُٹھ گیا۔ حضرت کو پریشانی ہونے لگی کہ یہ کیوں خود بخود بند ہو گیا، آپ نے کمرے سے نکل کر ایک ساتھی کو بلایا کہ ارے بھئی! ادھر آؤ یہ چیز اچانک خود بخود بند ہو گئی، پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت! یہ ایک جانب سے ختم ہو گئی ہے، میں دوسری طرف سے چلا دیتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ نہیں، بعد میں سن لیں گے۔

آج حضرت الاستاذ کی صرف یادیں رہ گئی ہیں، وہ ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا دیا ہوا مشن، نظریہ اور کام پہلے کی طرح تر وتازہ ہے اور آپ کا لگایا ہوا چمن جامعہ یوسفیہ، آپ کے ہزاروں تلامذہ اور جاری کردہ دینی کام پوری

آب وتاب سے رواں دواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان صدقات جاریہ کو یوں ہی جاری وساری رکھے۔ آمین

یادگار اسلاف

مولانا عطاء اللہ، ہنگو

وطن خداداد کے جلیل القدر عالم دین، محدث عصر، عاشق رسول، عارف باللہ، یادگار اسلاف، شہید مظلوم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی ان بزرگ ہستیوں میں سے تھے جن کے علم وفضل اور کمالات پر لکھنا مجھ جیسے نالائق کے بس میں نہیں، لیکن اظہار عقیدت ومحبت کی بنیاد پر یہ چند سطور اپنے لیے سعادت سمجھ کر سپرد قلم کر رہا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ استاذ صاحب جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کا ظہور کہیں صدیوں میں جا کر ہوتا ہے، حضرت استاذ شہیدؒ اور فقیہ اسلام، شیخ القرآن حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کے ملی، سیاسی اور مذہبی کارنامے ناقابل فراموش اور زندہ جاوید ہیں، اس سے نہ کوئی انکار کر سکتا ہے اور نہ ان کی مثال پیش کر سکتا ہے۔

حضرت استاذ شہیدؒ کا علمی وعرفانی مقام بہت بلند تھا، آپ نے اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت سے زندگی بسر کی، اپنے اور بیگانے ہر کوئی آپؒ کی علمی مہارت کے قائل تھے، لیکن آپؒ کی علمی شان کا اندازہ لگانا آپ کی تواضع وانکساری کی وجہ سے بہت مشکل تھا۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ کے شاگرد بھی آتے تو ان کے لئے بذات خود اپنے ہاتھ سے کھانا لے کر آتے۔ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے جن صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ کسی سے مخفی نہیں، اس کی باوجود جب بھی کوئی معمولی بات درپیش ہوتی، تو فرمایا کرتے کہ اس کے بارے میں استاذ مولانا عبداللہ صاحب سے مشاورت ضروری ہے۔ جب حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ بولتے تھے تو اس وقت استاذ صاحب کی حالت قابل دید

ہوتی۔ایسی عاجزی وملنساری اختیار کرتے کہ اس کی مثال کبھی نہیں دیکھی ۔ ایک دفعہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحبؒ کے ساتھ اپنے گاؤں وچ بازار میں قبرستان کی طرف جنازہ پڑھنے جا رہا تھا۔ حضرت استاذ صاحب دور بیٹھے تھے، جیسے ہی مولانا عبداللہ صاحبؒ کو دیکھا اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔جگہ کافی دور بھی تھی اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کمزوری کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلتے تھے،اس لئے ہمیں استاذ صاحب تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگ گیا لیکن آپ بدستور کھڑے تھے، جب مولانا عبداللہ صاحب پہنچ گئے تو ان کے لئے زمین پر اپنی چادر بچھائی اور خود ان کے سامنے دوزانوں مٹی پر بیٹھنے لگے، میں نے جلدی سے اپنا رومال بچھادیا،اس پر ایسے مؤدب بیٹھے رہے جیسے طالب علم درسگاہ میں بیٹھتا ہے اور ایسے مؤدب لہجے میں دھیمی دھیمی گفتگو کرتے رہے کہ مجھے رشک آ گیا کیونکہ ہم تو مولانا عبداللہ صاحبؒ کے پوتوں کی جگہ ہو کر بھی اتنا ادب کبھی نہ کر سکے تھے۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ کے ساتھ احترام کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ جب تک حضرت مشکوۃ پڑھاتے رہے،آپ نے مدرسہ یوسفیہ میں مشکوۃ شروع نہیں فرمائی۔آپ کے اس درجہ تواضع ،فقیرانہ انداز اور طالب علمانہ ادب واحترام نے مجھ جیسے کئی لوگوں کو استاذ شہیدؒ کے علمی مقام کی معرفت کے بارے میں غلط فہمی میں ڈالا تھا۔آپ کے کارنامے اتنے مخفی ہوتے تھے کہ شہادت کے بعد ہم پر واضح ہوا کہ درحقیقت ہر میدان کے فاتح تو حضرت الاستاذ تھے۔

استاذ صاحب کی تربیت کا انداز بڑا نرالا تھا، بالکل غیر محسوس طریقے سے تربیت فرماتے ،ایک دفعہ ایک حاجی صاحب نے استاذ صاحب کو ایک عالم دین کے بارے میں شکایت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ جب تفسیر پڑھانے کے لئے تشریف لاتے ہیں تو اشراق کا وقت ہوتا ہے لیکن اشراق نہیں پڑھتے۔حضرت الاستاذ نے ان کی بدگمانی زائل کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی کبھی اللہ والے اپنی ولایت چھپانے کی وجہ سے نفلی عبادت چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھیں! کس خوبصورتی سے ان کے خیال کو بھی زائل کر دیا اور ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عوام کو علما کے بارے میں کیسا گمان رکھنا چاہیے۔

استاذ صاحب ایک محقق ،محدث ومفسر اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر عالم دین تھے،آپ نے زندگی بھر علوم دینیہ کی خدمت کی، ہر علم وفن پڑھایا اور فراغت کے بعد کوئی ایسا سال نہیں گزرا جس میں تدریس کی خدمت چھوٹی ہو۔ ہزاروں علما نے آپ سے علمی ،اخلاقی وروحانی استفادہ کیا۔اس کے ساتھ ساتھ آپ نے شرک وبدعت کی تردید، ناموس رسالتؐ وناموس صحابہؓ واہل بیتؓ کے تحفظ اور اہل سنت والجماعت کے عقائد ونظریات کے تحفظ اور اشاعت میں بھی پوری ہمت صرف فرمائی ،لیکن اپنے آپ کو شہرت ونمود سے مکمل بچا کر رکھا۔

اللہ جل شانہ نے حضرت شہیدؒ کو عبادت کا ذوق ، جرأت مندانہ مزاج اور اسلام کے مقابل ہر قسم کی باطل

قوتوں کے استیصال وتعاقب کی خاص توفیق سے نوازا تھا۔ ہنگو کی حد تک حضرت کی خدمات اتنی مؤثر اور متنوع ہیں کہ ایک گونہ تجدیدی رنگ رکھتی ہیں، خصوصاً ہر شعبۂ دین سے وابستہ حضرات کی نصرت وحمایت، ان کی ترجمانی اور وقتاً فوقتاً ان کی رہنمائی آپ کا شیوہ تھا۔

حضرتؒ کو کتابوں کا ایسا عمدہ ذوق عطا ہوا تھا کہ آخر وقت تک اہم کتب خانوں سے چن چن کر کتابیں جمع فرماتے رہے اور ایک نہایت عمدہ اور نایاب کتب پر مشتمل لائبریری اپنے آثار میں چھوڑ گئے۔

حضرتؒ صاف دل اور صاف گو انسان تھے، کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھتے تھے۔ اگر دینی معاملہ میں کسی سے اختلاف ہو جاتا تو بلاخوف لومۃ لائم پورا پورا اظہار کرتے۔ حکومت کی غلط پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتے ہمیں یاد نہیں کہ کبھی حاکم وقت سے مرعوب ہوئے ہوں۔ سرکاری افسران سے ملتے وقت انتہائی انکساری وتواضع کا برتاؤ کرتے تھے اور گفتگو کا لہجہ بھی بہت نرم تھا لیکن اپنے مؤقف پر بڑے سخت تھے اور جس بات کو حق سمجھتے اور اس میں دین اسلام اور مملکت خداداد کا فائدہ دیکھتے اس پر پوری طرح جم جاتے اور کسی دباؤ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ طبیعت میں تحمل وبرداشت مثالی تھا لیکن اگر کسی دینی حکم پر کوئی حرف آتا تو چٹان کی طرح سامنے آجاتے تھے۔

آہ! کبھی وہ وقت ہوتا تھا کہ ضلع ہنگو میں واقع پختہ مسجد کے محراب میں ایک طرف عالم باعمل، امیر سنی سپریم کونسل استاذ العلماء، شیر ہنگو حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ نظر آرہے ہوتے اور دوسری جانب حضرت علامہ بنوریؒ کے تلمیذ رشید، محب وطن، محدث شہیر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ رونق افروز ہوتے تھے۔ اب یہ محراب و مصلے ان ہستیوں سے ویران ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر ان دنوں کی یاد آتی ہے جب ان محرابوں سے حق کی للکار بلند ہوتی تھی اور شیخین کی آمد پر تکبیر کے نعرے اٹھتے تھے۔ علاقہ میں سنیت کو وحدت فکر کے دائرہ میں رکھنے کے لیے آپ نے ہمیشہ عمدہ حکمت عملی اختیار کی، جب تحریک ناموس صحابہؓ کی عملی کاوشیں سپاہ صحابہ سے وابستہ ہو گئیں، تو آپ نے سنی مفادات کے تحفظ کو محض ایک تنظیمی خول میں بند سمجھنا وحدت فکر کے قیام کے تسلسل کے لیے مفید نہ سمجھا، اسی لیے تمام سنی سیاسی، مذہبی اور سماجی تنظیموں کو مولانا عبداللہ صاحبؒ کے زیر سایہ ایک پلیٹ فارم 'سنی سپریم کونسل' پر اکٹھا کیا۔

اپنے ہر شاگرد اور متعلق کے ساتھ باوجود مصروفیات کے غمی خوشی میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ دونوں حضرات شیخینؒ ہمارے خاندان میں ایک فوتگی پر تعزیت کے لئے اورکزئی ایجنسی تشریف لائے۔ برف باری ہو رہی تھی اور پیدل کافی فاصلہ تھا لیکن پیرانہ سالی میں یہ تکلیف برداشت کی۔

حضرت الاستاذ کی سرپرستی اور دعا اہل اسلام کے لئے بہت بڑا سرمایہ تھی، آپ اہل یقین میں سے تھے اور عجیب

وغریب صفات وکرامات کے مالک تھے، وہ اس زمانے میں فقر ودرویشی کی آبرو اور توکل کی علامت تھے، آپ کی جدائی نے علماء ربانیین کی تعداد میں ایک فرد کی کمی کردی۔ ایسے حضرات کے حق میں کسی شاعر نے بہت خوب کہا ہے:

خوش مزاجی خندہ پیشانی تبسم تھا شعار
تھی لبوں کی مسکراہٹ جس کے چہرے کی بہار
جو دلائل کی زبان تھا حجتوں کا سینہ تھا
سیرت وکردار میں اسلاف کا آئینہ تھا

مشعل راہ

مولانا محمد جواد بنوری، پشاور

کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے انسان کو ذہنی غور وفکر کے ساتھ ساتھ عملی جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے اور اگر مقصد دین میں سرفرازی کا ہو تو مقصد کے عظیم ہونے کی وجہ سے محنت کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف توجہ اور اس کے عظیم بندوں سے آشنائی حاصل کرنا اور ان کے عملی آئینہ میں اپنی کمیوں اور کوتاہیوں پر آگاہ ہونا کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ اسی سلسلے میں اپنی کوشش کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف علما اور صلحا سے واقفیت بھی ہوئی اور ان کی صفات کے سایہ میں رہ کر کچھ وقت اپنی خواہشات اور نفس کی گرمی سے افاقہ بھی ہوا، اسی مقصد سے ایک سفر اپنے خالہ زاد بھائی مولانا محمد یاسر حبیب صاحب سلمہ کی خواہش پر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی ؒ کی ملاقات کے لئے پشاور سے ہنگو کی طرف ہوا، پہنچنے کا وقت غالباً دوپہر کا تھا، ہنگو شہر سے کچھ فاصلے پر شاہو روڈ پر واقع ایک ادارہ میں داخل ہوئے تو دائیں جانب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس میں مولانا خالق حقیقی کے سامنے حاضری دیتے ہوئے ادب سے کھڑے تھے، اتنے میں جب نماز ختم ہوئی تو ہم نے ملاقات کی، تعارف ہونے پر ملاقات کا منظر بڑا دلنشیں تھا ایسا لگا جیسا کہ ان کو اپنے بچھڑے ہوئے بچے مل گئے ہوں، حضرت کا مولانا یاسر حبیب صاحب سلمہ کے والد محترم (میرے خالو جان) حضرت مولانا حبیب اللہ مختارؒ سے جو محبت اور رفاقت تھی اس سے تو سب ہی متعلقین اچھی طرح واقف ہیں

اور دوسری طرف اپنے استاد محترم اور ہمارے نانا حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی وفات کے بعد میرے دادا حضور حضرت مولانا ایوب بنوریؒ سے تعلق بہت گہرا تھا، حضرت کا ہمارے دادا حضور کے پاس آنا جانا، ہمارے حجرے میں رات گزارنا، اپنے علمی وعملی مشاغل میں میرے دادا حضور سے مشورہ لینا حضرت کا عام معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا امین اورکزئی سے ایک مرتبہ کراچی کی ایک مسجد میں ملاقات ہوئی تو حضرت سے میں نے عرض کیا کہ آپ کا ہمارے ہاں آنا اب رہا ہی نہیں حالانکہ میں تو آپ کی سرپرستی کا محتاج ہوں، تو حضرت نے افسوس بھرے لہجے میں کہا کہ جب تک آپ کے دادا حضور حیات تھے تو میرا آنا جانا لگا رہتا تھا اب تو مشکل لگتا ہے پھر بھی ان شاء اللہ کوشش کروں گا کہ حاضری دوں، یہی وہ تعلق تھا جس کی وجہ سے ہمیں حضرت کی جانب سے خوب پذیرائی ملی اور انہوں نے انتہائی شفقت واحترام کا معاملہ کیا اور خوب مہمان نوازی کی اور ہمارے بچپنے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے صاحب زادے مولانا محمد یوسف سلمہ کو ہمارا رفیق بنا کر ہمیں ان کے حوالہ کر دیا جن کی رفاقت سے ہم خوب لطف اندوز ہوئے۔ ان کی رفاقت میں ہم نے مدرسہ دیکھا اور وہاں کی لائبریری دیکھی جو کہ جیروت کی کتب کا خزانہ تھی، جو حضرت کے علمی ذوق وشوق کا آئینہ تھا، ان کے مال ومتاع کا اندازہ ان کے رہن سہن سے لگایا جاسکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ منظر حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ قابل رشک بھی تھا کہ وسائل کے اتنے محدود اور مختصر ہونے کے باوجود حضرت نے اپنی علمی پیاس کو بجھانے کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور اس میں قابل ذکر بات جو اہم تھی وہ ان کے مطالعہ کی ترتیب تھی، کتب خانہ میں موجود جو بھی کتاب اٹھائی اس کے ابتدائی نہ چھپے ہوئے حصے میں خودنوشتہ حاشیے تھے، میں نے صاحب زادے سے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت والد صاحب کا معمول ہے کہ جو کتاب بھی والد صاحب خریدتے ہیں پہلے اسے پڑھ لیتے ہیں، پھر اہم باتوں کو حاشیہ کے ذریعہ سے متعین کر دیتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر والد صاحب کو کسی بات کے لئے کتاب ٹٹولنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ خودنوشتہ حاشیہ کی طرف رجوع کرنے سے بات مل جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہاں پر موجود جتنی بھی کتابیں آپ کو نظر آ رہی ہیں یہ سب حضرت والد صاحب باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہ سننے کے بعد میں نے اس وقت ماشاء اللہ اور الحمدللہ کہہ کر خوشی اور تعجب کا روایتی اظہار تو کیا لیکن بعد میں عمومی علما کے رویوں پر نظر ہوئی تو کمی کا احساس ہوا لیکن حضرت کے معمول پر حیرانی نہیں ہوئی اور حیرانی حضرت پر ہوتی بھی کیوں؟ جس کو خود اپنے استاد محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے منتخب کیا ہو، جو اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے معارف السنن لکھتے ہوئے ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مسئلہ کے لئے دو دو ہزار صفحات کا مطالعہ کیا تو وہ اگر کسی پر اعتماد کریں گے تو یقیناً ان کے اعتماد کے ثمرہ میں ان جیسی شخصیت کا ہی ظہور ہوگا، بہرحال ہم نے وہاں رات گزاری اور صبح سویرے جانے کا ارادہ ظاہر کیا

تو حضرت ہی نے گاڑی کا انتظام کیا ہوا تھا اور تحائف دے کر ہمیں رخصت کیا۔

یہ وہ سفر تھا جس میں حضرتؒ کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ایک باکمال انسان تھے، زندگی کے سادہ ہونے کے باوجود ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کسی قسم کی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ تالیف تصنیف کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد کے ماحول کو سدھارنے کے لئے ہمہ تن مصروف رہے اور اپنی زندگی کو اپنے علاقہ کے لئے وقف کردی اور پوری زندگی ان کی تعلیم وتربیت کے لئے کوشاں رہے، ان کا اپنے علاقہ کے لیے فکرمند ہونے کا اندازہ ان دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے، جن میں سے ایک کے راوی میرے والد محترم صاحبزادہ خالد احمد بنوری صاحب مدظلہ العالی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے ساتھ بنوری ناؤن کے دار التصنیف میں تھا، وہاں حضرت مولانا امین اورکزئی بھی تشریف فرما تھے والد صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ نے مولانا امین اورکزئی پر کافی اصرار کیا کہ وہ بنوری ناؤن واپس آجائیں۔ ان کی یہاں بہت ضرورت ہے لیکن وہ اپنے علاقہ والوں کے بارے میں فکرمند رہے اور مولانا حبیب اللہ مختارؒ انہیں راضی نہ کر سکے۔

دوسرا واقعہ مولانا امینؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب سلمہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے والد صاحب نے خود ایک واقعہ اسی (۸۰) کی دہائی کا ذکر کیا کہ مولانا محمد ایوب بنوری (بانی دار العلوم سرحد پشاور) پشاور سے ہمارے ہاں ہنگو تشریف لائے حضرت کا فرمانا ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں سڑکیں وغیرہ نہیں تھیں۔ اس کے باوجود مولانا ایوب بنوریؒ سخت مشقت کے ساتھ ہمارے ہاں پہنچے۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ اتنا عظیم انسان جو میرے لئے اپنے استاد جیسا محترم ہے وہ میرے غریب خانہ پہ، پھر بعد میں فکرمند ہوا کہ اتنے بڑے آدمی نے اتنی مشقت کیوں اٹھائی، بہرحال جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے دار العلوم سرحد میں تدریس کے لئے مطالبہ کیا۔ اب ایک طرف مولانا ایوب بنوریؒ کا رتبہ، ان کی خواہش اور دین کے لئے اتنی مشقت کا اٹھانا اور دوسری طرف اپنے علاقہ میں دین کی خدمت، لوگوں کی دین مخالف رسم ورواج سے آلودہ معاشرے کا سدھار اور اپنے لوگوں کا میرے اوپر حق، بڑی مشکل سے مولانا ایوب بنوریؒ کو منایا۔

یہ تو وہ مشکلات تھیں جو مجھے حضرت کے بارے میں معلوم ہوئیں، ورنہ کتنی مشکلات اور رکاوٹیں جو میری معلومات میں نہیں آئی ہوں گی، اور کتنی ایسی بھی ہوں گی جو انہوں نے صرف اپنے تک محدود رکھیں لیکن ان سب کے باوجود حضرت کی استقامت لوگوں کے لئے روشن چراغوں میں سے ایک چراغ ہے، اللہ تعالی ہم سب کو ایسے روشن چراغوں سے اپنی راہ متعین کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کے فیض کو ان کی آل واولاد میں قیامت تک جاری وساری رکھے، اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

آہ! استاذنا الشہید

مولانا سعید علی شاہ، ہنگو

کتنے بابرکت اور محترم تھے وہ لوگ جن کے دم سے زندگی کے مرجھائے ہوئے پودے دوبارہ پنپتے تھے۔ جن سے تاریکی کو روشنی، جہل کو علم کا نور اور روح کو معرفت رب حاصل ہوتی تھی، جو گرتوں کو سنبھالتے تھے، بہکوں اور بھٹکوں کو راستہ دکھاتے تھے اور سوتوں کو جگاتے تھے۔ ظلم وعدوان اور تمرد وطغیان جب ان حق پرست لوگوں کے مقابلے پر آتا تو یہ اس کا جم کر مقابلہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

حضرت استاذ مولانا محمد امین اورکزئیؒ بھی انہی پاک باز ہستیوں میں سے ایک تھے۔ یہ تو وہی اندازہ کرسکتا ہے جو حضرت الاستاذؒ سے بہت قریب رہا ہو اور جو حضرت الاستاذؒ کے علم کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوا ہو۔ مجھ جیسا نااہل وناتواں حضرت الاستاذؒ کی یاد میں ان کی زندگی کے بابرکت پہلوؤں پر کیا لکھے گا؟ لیکن اپنی سعادت سمجھ کر حضرت الاستاذؒ کے چند اوصاف کا تذکرہ پیش خدمت ہے:

اس امت مرحومہ میں لاکھوں علما وفضلا پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دنیا کے لئے چھوڑ گئے، لیکن ایسی ہستیاں بہت کم ہیں جن کا فیض اور محبوبیت عام دلوں کی امانت ہو اور جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی اُمت نے استفادہ کیا ہو۔ حضرت الاستاذؒ کی ہستی انہیں مبارک اور چند گنی چنی ہستیوں میں سے ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور صدیوں کو علم وفضل سے رنگین کرتی ہے۔ حضرت الاستاذؒ کا علم اگر متقدمین کی یاد دلاتا تھا تو ان کا عمل سلف

صالحین کی زندگی کا عکس تھا۔علمی حیثیت سے علما وطلبا خصوصا تلامذہ اور اہل علم حضرات حضرت الاستاذؒ کو چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے اور عملی حیثیت سے آپ اتباع سنت کے نور میں منور تھے،آپ کے روشن چہرے پر ایمان کی چمک بدر کامل کی طرح ظاہر تھی۔

حضرت الاستاذؒ صرف عالم نہ تھے بلکہ سراپا علم تھے۔علم آپ کی ذات میں ایسا بسا ہوا تھا جیسے پھول کے اندر رنگ اور خوشبو، یا ہیرے وجواہرات کے اندر چمک دمک۔علم آپ کی ہر ہر ادا اور ہر ہر نقل وحرکت سے ظاہر ہوتا تھا، آپ کا علم ایک بلند وبالا پہاڑ اور ایک بحر ناپیدا کنار تھا۔ایک سلیم العقل اور دور اندیش شخصیت کے مالک تھے۔ اجنبی جب آپ کو دیکھتا تو اس کے دل وزبان پر یہی بول ہوتا کہ یہ ضرور عالم دین ہیں۔

درسگاہ میں انتہائی وقار اور سنجیدگی سے بیٹھتے۔حضرت الاستاذؒ کا کلام نہایت متین، سلجھا اور علمی مواد سے لبریز ہوتا۔ چاہے گھر ہو یا مدرسہ ہر وقت کتابوں خصوصا کتب حدیث کی بڑی مقدار سامنے رکھی ہوتی تھی۔درس حدیث فقط شرح حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ جمیع علوم وفنون پر مشتمل ہوتا تھا۔تصنیفی صلاحیت اور تحقیقی مزاج کا آئینہ دار آپ کی کتاب ''نثر الازہار علی شرح معانی الآثار'' ہے،آپ درایت وروایت کا ایک گنجینہ امت مسلمہ کو دے گئے،ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کا یہ عمل ان کے آخرت کے لئے عظیم ذخیرہ ثابت ہوگا جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

واذا افتقرت الی الذخائر لم تجد

ذخرا یکون کصالح الاعمال

طرز تعلیم اور طریقہ تدریس ایسا وضع کیا تھا جس سے ملکی وغیر ملکی طلبہ نے برابر استفادہ کیا ہے اور اب بھی اندرون وبیرون ملک آپ کے مستند ونامور فاضل تلامذہ کی بڑی جماعت تدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعت دین میں مصروف ہے۔

حضرت الاستاذؒ کی طبیعت میں نظافت ونفاست بہت زیادہ تھی۔لباس،خوراک اور طرز زندگی سے نفاست و سلیقہ مندی معلوم ہوتی تھی،آپ کی ہر ادا اور ہر نقل وحرکت میں حسن وجمال کی چمک اور نظافت ونفاست کی دمک تھی۔گویا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک ''ان اللہ جمیل یحب الجمال'' کا نقش تھے اور آپ کا ماحول تہذیب وکردار اور سلیقہ مندی کی سبق آموزی میں ایک مستقل درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔آپ کی خدمت میں رہ کر غیر مہذب انسان بھی مہذب اور بے عقل، عقل مند بن جاتا تھا۔طبیعت میں ایسی نزاکت تھی کہ غلط چیز دیکھنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔

حضرت الاستاذؒ اخلاص وخلوص کے پیکر تھے اور آج بھی بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ یوسفیہ ان کے اخلاص کی برکت سے

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اصلها ثابت و فرعها فی السماء کا منظر پیش کر رہا ہے، لیکن حضرت الاستاذؒ نے زندگی کے آخری لمحے تک نہ اس کا کبھی کوئی اشتہار دیا، نہ کوئی سفیر بھیجا، نہ مدرسے کا کوئی بورڈ لگایا اور نہ کبھی اپنے طرز عمل سے ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس مدرسہ کے بانی یا شیخ الحدیث یا کوئی بڑے مولانا واستاذ ہیں۔ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے دین کے خادم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے جمع ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مل کر کام کرنا ہے اور اپنے استاذ محترم محدث العصر حضرت بنوریؒ کا یہ قول نقل کرتے تھے: کہ اگر اخلاص ہو تو نورانی قاعدہ پڑھانے والا اور بخاری شریف پڑھانے والا برابر ہے۔ اس مرد قلندر نے اپنی زبان سے اخلاص کے الفاظ کم استعمال کیے اور عمل سے اس کی تعلیم زیادہ دی۔

حضرت الاستاذؒ کو نام ونمود اور طلب شہرت سے طبعاً نفرت تھی۔ عزت، مال وجاہ کی طلب سے طبعی کوفت تھی۔ وہ جماعتوں کی صدارتوں سے بہت بلند و بالا تھے، وہ کسی عہدے کے خواستگار نہیں تھے بلکہ عہدے ان کے متلاشی تھے۔ یقیناً حضرت الاستاذؒ کے اخلاص وللّٰہیت اور بے لوثی و بے غرضی اور بے نفسی کا ثمرہ تھا کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے اور جب حضرت الاستاذؒ دنیا سے رخصت ہوئے پھر بھی ان کی شہرت کا چراغ جل رہا تھا اور جل رہا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت جلے گا۔

حضرت الاستاذؒ نے اپنے آپ کو جتنا مٹایا اللہ تعالیٰ نے اُتنا ہی اٹھایا، جس قدر بھی پستی کا اقرار کیا اللہ رب العزت نے اس قدر رفعت و بلندی سے نوازا، حتی کہ حدیث مبارک "من تواضع لله رفعه الله" کا مصداق تھے۔ تواضع ان کی فطرت تھی اور رفعت وعظمت تواضع کا خاصہ ہے۔

انسانیت اسی کا نام ہے کہ انسان اپنی طرف سے بڑائی کا اظہار نہ کرے اور نہ اس کی خواہش کرے بلکہ تواضع و عاجزی اختیار کرے جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

پستی سے سربلند، سربلندی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب وفراز ہیں

جو جتنا اونچے مرتبے کا ہوگا، اُتنا ہی عاجز ومتواضع ہوگا۔ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو اپنے لئے کسی امتیازی جگہ کو پسند نہ فرماتے۔ اسی طرح حضرت الاستاذؒ درس کے دوران بھی امتیازی جگہ سے اکثر احتراز فرماتے تھے بلکہ طلبا کے ساتھ سادہ فرش پر بیٹھتے تھے۔ اکثر حضرات نے یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ آپ چار پائی کے سرہانے کی طرف نہ بیٹھتے تھے بلکہ ہمیشہ پائنتی کی طرف تشریف فرماتے تھے، حتی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی چار پائی کے سرہانے بٹھاتے تھے۔

حضرت الاستاذؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی مجھے کوئی بے چینی یا پریشانی لاحق ہوتی ہے تو درس حدیث سے ایسا سکون ملتا ہے جیسا کہ پانی کے پیاسے کو سراب نظر آرہے ہوں اور وہ کسی نخلستان میں پہنچ جائے، یہ جملہ اس وقت فرمایا تھا جب ہنگو میں مولانا عمر حیات صاحبؒ شہید ہوئے تھے اور جمعہ کا دن تھا۔ بندہ سے فرمایا کہ چلو آؤ! ایک دو حدیث پڑھتے ہیں تا کہ پریشانی وملال کا کچھ حصہ اس سے ہلکا ہو جائے۔

شہادت سے چند دن پہلے غالباً بروز ہفتہ مشکوٰۃ شریف کے درس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کے عمر مبارک کا تذکرہ آیا تو سبق کے آخر میں فرمایا کہ اب میری عمر ۶۳ سال ہو چکی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو تو مجھے اپنے پاس بلالے کیونکہ اس کے بعد کی زندگی بڑی بے غیرتی اور بے ہمتی والی نظر آتی ہے۔ پھر بدھ کے دن ہمیں مشکوٰۃ شریف کا آخری درس دے کر فرمایا کہ باقی کتاب اگر اللہ تعالیٰ چاہے پھر کسی اور جگہ پڑھیں گے اور آخری درس بھی سید الاستغفار والی حدیث تھی۔ آپ نے سعادت کی زندگی گزاری اور شہادت کی موت پائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور ہمیں آپ کی فیوضات سے مالا مال فرمائے۔ آمین ثم آمین

لاریب موت ان کی ہے جہان کی موت
ہم سے چلے یہ چھوڑ کے تاریخ تابناک
کتنا حسین چمن ہے مگر کیا کروں کہ اب
کانٹے دکھائی دیتے ہیں تیرے بغیر
غنچہ، کلی و پھول کی بارش ہے سامنے
لگتی ہے جیسے آگ برستی تیرے بغیر

آہ! حضرت استاذ صاحب

مفتی فضل عظیم، ہنگو

۱۱ جون ۲۰۰۹ء جمعرات کا دن تھا، انتہائی کرب ناک اور اندوہ ناک ...... بندہ دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، جیسے ہی تیسرا گھنٹہ ختم ہوا، جامعہ بنوری ٹاؤن میں اساتذہ کا ہنگامی اجلاس طلب کرلیا گیا، اس دوران میرے موبائل کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں، جیسے ہی استاذ محترم درسگاہ سے باہر چلے گئے، میں نے جلدی سے فون اٹھایا، اطلاع ملی کہ حضرت الاستاذ صاحب شہید کردیئے گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس جاں گداز حادثہ کی خبر سنتے ہی بندہ پر سکتہ طاری ہوگیا، ہوش وحواس اُڑ گئے، یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہوگیا، دل ہی دل میں دُعا کرتا رہا کہ یا اللہ! اس خبر کو جھوٹا کردے، کبھی یہ خیال آتا کہ شاید حضرت زخمی ہوں، ساتھیوں نے غلط فہمی میں شہادت کا مشہور کردیا ہو، اس بے یقینی وغمزدگی میں بالآخر تصدیق ہوگئی کہ حضرت الاستاذؒ اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔ ذہن کو صدمات نے آلیا، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دامت برکاتہم کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ ہوکر حسرت کا سامان پیدا کرنے لگے کہ" دیکھو! حضرتؒ کا تقویٰ، علم اور عمل مجھے معلوم ہے۔ فراغت کے بعد حضرت کی صحبت میں ایک دو سال ضرور گزارنا۔ لیکن اب تو حضرت نے ہم سے پردہ فرمالیا، اب میرا کیا بنے گا؟ وہ لمحے رہ رہ کر یاد آرہے تھے۔ جب ہم کسی لاینحل مقام پر پھنس جاتے اور کسی شرح وحاشیہ یا ماہر فن سے

تشفی نہ پاتی تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی پیاس بجھاتے اور طرح طرح کے انوکھے علمی نکات سے محظوظ ہوتے۔

حضرت استاذ صاحبؒ علم وعمل، تقویٰ، اخلاص، راست گفتاری اور بے پناہ باطنی بصیرت میں اپنی مثال آپ تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام علوم پر کامل دسترس بخشی تھی۔ حدیث اور معقولات آپ کے اختصاصی میدان تھے، ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ آپ علوم وفنون میں اپنے شیخ حضرت مولانا بنوری نوراللہ مرقدہ کے سچے جانشین تھے۔ جب کسی علم وفن پر گفتگو فرماتے تو محسوس ہوتا کہ علم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہو چکا ہے۔ علوم نبویہ کے جس قدر حامل تھے اس قدر اُن پر عامل بھی تھے اور اس عمل کا نور آپ کے چہرۂ انور سے خوب چھلکتا تھا۔

آپ کا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی مثالی تھا۔ ہر کام میں سنت نبوی کا خاص اہتمام رہتا تھا۔ خوف خدا اور خشیت کا یہ عالم تھا کہ 'انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء' کی عملی تصویر دکھائی دیتے تھے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، اُس کی ہیبت اللہ تعالیٰ اپنے مخلوقات کے دلوں میں ڈال دیتا ہے، حضرت کی ہیبت اور رعب بھی اس قدر تھا کہ اول وہلہ میں بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہ ہیبت جنات پر بھی تھی، آپؒ کے گاؤں کے ایک صاحب نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک شخص پر جنات وآسیب کا اثر تھا، ہم اس کو گاڑی میں بٹھا کر حضرت استاذ صاحبؒ کے پاس دم کروانے کی غرض سے لے جانے لگے، جونہی ہم جامعہ یوسفیہ کے دروازے کے قریب پہنچے تو اُس جن نے چیخ وپکار شروع کردی کہ خدارا! مجھے استاذ صاحبؒ کے پاس نہ لے جائیں، میں آیندہ کبھی اس شخص کو تنگ نہیں کروں گا۔ الغرض آپ "من یخاف اللہ یخاف منہ کل شئ" کے مکمل مصداق تھے۔

آپ حد درجہ سخی اور مہمان نواز تھے، بندہ ایک مرتبہ دن دس بجے کے قریب آپ سے کسی کام کے سلسلے میں ملنے گیا۔ پندرہ بیس منٹ میں مقصود ملنے پر جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ کھانا کھا کر جانا ہے۔ بندہ نے معذرت کی کہ گھر بھی قریب ہے اور ابھی کھانے کا اشتہا بھی نہیں، لیکن حضرت نے اصرار کرکے روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد دسترخوان لگایا اور انواع واقسام کے کھانوں سے خوب خاطر مدارت کی، خود پرہیز کی وجہ سے کچھ نہ کھا سکے، میرے ساتھ کھانے پر شرکت کے لئے مدرسہ کے ایک استاذ کو طلب فرمایا کہ میں پرہیز کے باعث کھا نہیں سکتا لہٰذا آپ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ آپ کی شفقت اور توجہ سے بندہ کو جامعہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ ملا۔ آپ نے جاتے ہوئے سفارشی مکتوب عنایت فرمایا، آپ کی نسبت کی برکت تھی کہ حضرات اساتذۂ کرام خوب خیال رکھتے۔ میں جب بھی اپنے علاقہ واپس آتا مختلف اساتذۂ کرام میرے ہاتھ حضرت کے لئے تحائف ارسال فرماتے۔ اس سے پتہ چلتا کہ تمام اساتذہ کا آپ سے آخر تک نیازمندانہ تعلق قائم تھا۔

آپ کی شہادت کے دن جامعہ میں غم والم اور پریشانی کی ایسی کیفیت تھی گویا جامعہ کے اندر ہی کسی بزرگ استاذ کا انتقال ہو گیا ہو۔شہادت پر جامعہ میں قرآن خوانی ہوئی،نماز ظہر کے بعد استاذ گرامی حضرت مولانا عطاء الرحمان شہیدؒ نے تفصیلی تعارف کروایا اور طویل دعا ہوئی۔جامعہ میں بندہ نے اپنے اساتذہ کرام خصوصاً مولانا عطاء الرحمان شہیدؒ اور مولانا یٰسین صاحب مدظلہم کو دوران اسباق درسگاہ میں اس کثرت سے آپ کا ذکر خیر کرتے سنا ہے کہ اس سے طلبہ میں ایک طرح کا اشتیاق اور تڑپ پیدا ہو جاتی کہ کاش! ہم بھی اس ہستی کی زیارت کر لیتے۔

حضرت میں ایک بڑی خوبی یہ بھی مشاہدہ کی کہ آپ ہر طرح کے قومی عصبیت وقومیت سے پاک تھے۔ایسی جامع الکمالات اور منکسر المزاج شخصیات اب عنقا ہیں۔

سرمایہ زیست

مولانا لطف اللہ،وزیرستان

یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے جب حسن تقدیر نے مجھے جامعہ یوسفیہ کے آغوش میں پہنچایا۔حضرت الاستاد مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ سے شرف تلمذ نصیب ہوا،اور بہت بچپن میں آپ سے تعلیم الاسلام کا کچھ حصہ اور سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔حضرت کے ہاں تعلیم میں نرمی اور تربیت میں سختی تھی۔آپ کے تعلیم کی بڑی خوبی یہ تھی کہ سبق سے زیادہ زور طلبہ کو نظریاتی بنانے میں صرف کرتے،اور عصری فتن کے خلاف ایک نظریاتی سنی حنفی دیوبندی عالم تیار کرتے۔

آپ فرماتے:دنیا میں کسی کام کو مشکل نہ سمجھو،کوئی کام ناممکن نہیں،عسر کے بعد یسر کا وعدہ رحمانی ہے۔مرمؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ ناممکن کو ممکن بناتے ہیں۔مگر اس میں محنت شرط ہے۔آپ نہیں دیکھتے کہ جب کوئی بندہ دنیا کے کام میں محنت کرتا ہے تو اسے اس کا ثمرہ ملتا ہے۔اپنی ثقافت وتہذیب پر انتہائی زور دیتے۔اور اسے جڑے رہنے میں حفاظت اور کامیابی کا راز بتاتے۔

پھر ۲۰۰۱ء میں بندہ مدرس کی حیثیت سے جامعہ یوسفیہ حاضر ہوا اور کامل سات سال آپ کی صحبت میسر آئی۔

اکثر میری یہ خواہش رہتی کہ میں درس دینے کے بجائے حضرت استاذ صاحب کے ہاں درسگاہ میں بیٹھ کر طالب علم کی حیثیت سے استفادہ کروں مگر حضرت کے رعب اور جلال سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہ کرسکا، یوں میری یہ حسرت باقی رہی۔

حضرت استاذ اس بات بہت خوش ہوتے کہ کوئی استاذ اچھا سبق پڑھائے یا طالب علم محنت اور لگن سے سبق پڑھے، ایسے افراد کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے اور بے پناہ توجہ سے نوازتے۔

حضرت استاذ صاحب ویسے تو سراپا کمال تھے لیکن سبق پڑھانے اور بات سمجھانے کا نہایت منفرد طرز رکھتے تھے مشکل سے مشکل مقام کو ایسے آسانی سے حل فرماتے گویا یہ کتاب حضرت ہی کی لکھی ہو، ہر فن میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ بندہ کو رشک آنے لگتا۔ مجھے جہاں کہیں مشکل پیش آتی تو حضرت استاذ صاحب کی طرف رجوع کرتا، حضرت کی یہ عادت تھی کہ جب بھی کوئی استاذ ان سے کسی مشکل مقام کے بارے میں پوچھتا تو اولاً حضرت ان سے دریافت فرماتے کہ اس کے بارے میں کونسی کونسی کتب کا مطالعہ کیا ہے اگر جواب نفی میں ہوتا تو کتابوں کے نام بتلا کر مطالعہ کرنے کا حکم فرماتے، ورنہ خود مسئلہ سمجھانے کی کوشش کرتے۔

تحریر کندیا میں نے سید قریش باباؒ سے پڑھی ہے، جو خانوادۂ مارتونگ کے نامور منطقی اور معقولی عالم تھے۔ مگر اس کتاب میں بھی میں نے جو استفادہ حضرت استاذ صاحب سے کیا۔ وہ نکات سید قریش باباؒ سے حاصل نہ کرسکا تھا۔ فلسفہ میں صورت جسمیہ اور ہیولی وغیرہ کی بحثیں مجھے حضرت ہی کی برکت سے سمجھ میں آئی ہیں۔ حضرت کی عالمانہ شان سے میں اتنا متاثر تھا کہ زمانہ طالبعلمی میں حضرت استاذ کے مخالفین کو میں امام بخاریؒ کے مخالفین جیسا سمجھتا تھا جنہوں نے امام بخاریؒ سے صرف علمی شان پر حسد کرتے ہوئے مخالفت کی تھی اور اپنے علاقہ سے نکال باہر کیا تھا۔ ہنگو کے لوگ بڑے بدقسمت ہیں کہ جنہوں نے حضرت کی قدر نہیں کی، خصوصاً ہنگو کے علماء۔

تقوی کا یہ عالم تھا کہ مدرسے کا پانی استعمال نہ فرماتے، میں جب طالب علم تھا تو میں نے حضرت کے لئے بالٹی بھرنے کا ارادہ کیا تو حضرت نے منع فرمایا کہ یہ مدرسے کا حق ہے میں اس کو استعمال نہیں کرتا، چنانچہ میں نے ایک کلومیٹر دور چشمہ سے پانی لایا تو پھر حضرت نے اس کو استعمال کیا۔ یہ شاہو وام تو خشک جنگل تھا، یہ تو گیدڑوں کے رہنے کے قابل بھی نہ تھا چہ جائے کہ انسان۔ مگر حضرت کی برکت تھی کہ صرف شاہو وام نہیں بلکہ پورے ضلع ہنگو اور پورے اورکزئی قوم کو عزت ملی، مگر نہ اورکزئی قوم نے ان کی قدر کی اور نہ اہلیان ہنگو نے اور نہ ہی شاہو وام والوں نے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ڈرائیوروں کو یوسفیہ کے طلباء سے بھی بطور تشکر کرایہ نہیں لینا چاہئے کیونکہ ان کی کمائی کا سبب بھی حضرت ہی تو ہیں، یہ علاقہ تو انہی کی وجہ سے آباد ہوئی ہیں، متنبی نے کیا خوب کہا ہے:

مضت الدھور و ما اتین بمثلہ

و لقد اتی فعجزن عن نظراءہ

اسی طرح صاحب مقامات نے ایک شعر لکھا ہے:

فما راقنی من لاقنی بعد بعدہ

و لا شاقنی من ساقنی لو صالہ

و لا لاح لی مذ ندند لفضلہ

و لا ذو خلال حاز مثل خلالہ

میرا خیال یہ ہے کہ یہ اشعار بہت کمزور ہیں، حضرت استاذ صاحب کی شان اس سے بھی بڑھ کر تھی، جامعہ میں حضرت نے کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے کہیں اور نہیں مل سکتا، میں جب اکوڑہ خٹک میں پڑھتا تھا، تو ایک مرتبہ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ اکوڑہ کے مکتبوں میں ایک کتاب ڈھونڈ لو، کتاب کا نام ''تجرید'' ہے۔ اگر کتاب مل جائے تو رقم دیر باباجی سے لے لیں، میں اس کو واپس کروں گا۔ چنانچہ کتاب ڈھونڈتا رہا، ایک مکتبہ میں بھی نہیں ملی ، بلکہ مکتبوں والے اس کو جانتے تک نہیں تھے، میں نے جب دیر باباجی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

ایک دفعہ میں مغفور اللہ باباجی سے ملا تو انہوں نے سلام عرض کرنے کا کہا اور فرمایا کہ حضرت سے ملاقات کی شدید خواہش ہے، ان سے احادیث کی اجازت لینی ہے، اس کی نثر الازہار کو میں نے کچھ مقامات سے دیکھا ہے، بہت پسند آئی ہے، چنانچہ جب میں یہاں آیا حضرت کو موصوف کا سلام عرض کیا، حضرت نے نثر الازہار کا ایک نسخہ بھی ان کے لئے عطاء کیا۔ حضرت کے اندر محبت کی صفت بہت نرالی تھی، مہمانوں کو کھانا وغیرہ ایسے انداز سے پیش فرماتے جیسے کوئی باپ بچے کو پیش کرتا ہے، محسن اتنے تھے کہ مدرسہ کے گیٹ سے داخل ہونے والا ان کے احسان کا مزہ چکھے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔

ایک دفعہ ہم رمضان میں حضرت کی ملاقات کے لئے آئے، آپ اعتکاف کے لئے مسجد میں تشریف فرما تھے، ملاقات ہوئی، رخصتی پر تین ہزار روپے ہدیہ کئے، یہ ایک بار نہیں بلکہ جب بھی ضرورت پڑتی ہم حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کچھ کہے بغیر حضرت کچھ نہ کچھ رقم ضرور عنایت فرماتے۔

حضرت کی وجہ سے پورے علاقہ خصوصاً مدرسہ سے اتنی انسیت حاصل ہوگئی ہے کہ اب میں مدرسہ کو اپنے گھر جیسا سمجھتا ہوں، یہاں آکر دلی سکون واطمنان حاصل ہوتا ہے، حضرت کے رشتہ دار اپنے رشتہ داروں جیسے لگتے

ہیں۔

ہم نے دیگر مدارس کے شیوخ اور مہتممین کو بھی دیکھا ہے مگر کسی کو حضرت جیسا نہیں پایا حضرت جب ابتدائے سال میں مدرسین میں تقسیم کتب فرماتے تو یقین جانئے کہ حضرت کی جانب سے جس کتاب کا انتخاب ہوتا اسی پر دل مطمئن ہوتا حضرت کی توجہ کی برکت تھی کہ مشکل کتاب بھی آسانی سے پڑھائی جاتی۔ بات سمجھانے کا انداز بھی نہایت دلچسپ تھا، مسئلہ اور موقع کی مناسبت سے ایسی مثال ذکر کرتے کہ مزید کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی، میں اکثر وبیشتر آپ سے مسائل پوچھتا رہتا۔ چند نمونے ذکر کئے دیتا ہوں:

(۱) میں نے اپنے استاذوں سے سنا تھا کہ ''صدف'' موتیاں پیدا کرنے کا ایک جانور ہے، بعض کہتے تھے کہ یہ پردہ ہے۔ میں نے ''تاج العروس'' وغیرہ میں دیکھا تو اس میں بھی اس کا معنی پردے سے کیا گیا تھا، چنانچہ ایک مولانا سے اس بارے میں میری بحث ہوئی، فیصلہ اور تسلی کے لئے میں حضرت کے پاس حاضر ہوا، ساری صورتحال حضرت کے سامنے پیش کردی، اساتذہ اور تاج العروس وغیرہ کے حوالہ جات بھی سامنے رکھ دیئے تو حضرت فرمانے لگے کہ 'میں 'صدف' کو دیکھنے کے لئے خود ساحل سمندر گیا تھا، یہ جانور نہیں بلکہ پردہ نما خول سا ہے، جانور سے مشابہت رکھتا ہے، قدرتی طور پر اس کا منہ بند اور کھل جاتا ہے، اب جنہوں نے اس کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس کو پردہ سے تعبیر کرتے ہیں اور جنہوں نے دور سے دیکھا ہے وہ اس کو جانور سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت کا فیصلہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور اپنے دیگر دوستوں کو بھی یہ واقعہ سنایا۔

(۲) دیوان حماسہ میں ایک شعر ہے جس میں ''مَحَارِمْ'' کا لفظ آتا ہے محارم محرم کی جمع ہے، میں نے مدرسہ کے دیگر اساتذہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس کا معنی ہے ''دغرسوکہ'' یعنی ''پہاڑ کی چوٹی'' لیکن مجھے اس معنی پر تسلی نہ ہوئی کیونکہ ایک تو یہ معنی شعر میں فٹ نہیں ہورہا تھا، دوسرا یہ کہ 'پہاڑ کی چوٹی' تو 'رأس الجبل' کا معنی ہے، چنانچہ میں حضرت کے پاس آیا، حضرت نے جواب دیا کہ پہاڑ کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک بالائی کنارہ یعنی آسمان کی جانب والے حصے کو محرم کہتے ہیں، اس معنی کو سنا تو شعر پر بالکل فٹ ہوگیا اور میں بھی مطمئن ہوگیا۔

(۳) کنز الدقائق بیع سلم میں ایک لفظ ہے ''رقعہ''۔ میں جس مدرسہ میں پڑھاتا تھا وہاں کے استاذ اس کا معنی 'کپڑے کی چوڑائی' سے کرتے تھے، مجھے جب پتہ چلا تو میں نے کہا کہ یہ معنی تو درست نہیں مگر وہ نہیں مان رہا تھا، فیصلہ کے لئے استاذ صاحب کے پاس آیا تو حضرت نے جواب دیا کہ اس سے مراد کپڑے کی موٹائی اور باریکی ہے، میں نے اس مدرس کو حضرت استاذ کا حوالہ دیا مگر وہ پھر بھی نہ مانے۔

(۴) ایک مرتبہ میں بازار میں ایک حکیم کے دکان میں بیٹھا تھا، اہل تشیع کے ایک آدمی سے گفتگو ہوئی، دوران

گفتگو اس نے مجھ سے ایک سوال کیا کہ تم کہتے ہو کہ خدا قدیم ہے میرا سوال یہ ہے کہ کتنا قدیم ہے؟ کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ میں نے اس مسئلہ کے بارے میں حضرت سے پوچھا تو فرمایا کہ آپ نے ریڈیو وغیرہ چیزیں دیکھی ہیں، یہ چیزیں انسان نے تخلیق کی ہیں، یہ تمام اشیاء یہ بتانے سے قاصر ہیں میرا موجد کب پیدا ہوا ہے مگر بزبان حال یہ کہتی ہیں کہ میرا موجد قدیم ہے اسی طرح انسان بھی خدا کا مخلوق ہے اس کے لئے یہ ادراک ناممکن ہے کہ وہ خدا کی قِدم کی تحدید کر سکے۔

(۵) بعینہٖ اسی دکان میں ایک شیعہ نے سوال کیا کہ انسانوں کو ہدایت دینے والا اللہ ہے تو پھر وہ لوگ جو غیر ہدایت یافتہ ہیں ان کو جہنم میں کیوں ڈالا جاتا ہے یہ تو ان کے ساتھ ظلم ہے۔ میں نے اس سوال کا ذکر حضرت سے کیا تو فرمایا کہ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ مثلاً ایک آدمی ہے اس کی سو بکریاں ہیں، وہ آدمی ان میں سے ایک کو پکڑ کر ذبح کر کے قتل کرتا ہے، لیکن کوئی بھی اس کو ظالم قرار نہیں دیتا اور نہ ہی دیگر بھیڑ بکریوں کو اعتراض کرنے کا حق ہے، یہ سب اس لئے کہ بکریاں اس چرواہے کی مملوک ہیں چرواہا اس مالک ہے، مالک اپنے مملوک کے ساتھ جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے، یہی مثال اللہ اور انسان کی ہے کہ انسان خدا کی مخلوق اور مملوک ہے جیسے چاہے تصرف کرے اس کی مرضی۔

(۶) ایک دفعہ مجھ سے کسی نے حیض کی بندش والی گولیوں کے استعمال کے حکم کے بارے میں پوچھا۔ میں نے حضرت سے پوچھا تو جواب میں فرمایا کہ ان گولیوں کا استعمال ناجائز ہے، جس طرح مٹی پاک ہے مگر اس کا کھانا حرام ہے اس لئے کہ یہ مضر صحت ہے اور جو چیز مضر صحت ہو اس کا استعمال بھی ناجائز ہوتا ہے البتہ اگر کسی عورت نے گولی کھا کر حیض بند کر دی تو اس کے لئے روزہ رکھنا اور نماز وغیرہ پڑھنا جائز ہوگا۔

(۷) مجھ سے کسی نے پوچھا کہ قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات والے واقعہ میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر کیوں نہیں؟ حالانکہ اس موقع پر وہ بھی ساتھ تھے، تو حضرت نے جواب دیا کہ جب کسی ملک کا صدر یا وزیراعظم دوسرے ملک کے دورے پر جاتا ہے تو اس کے ساتھ دیگر وزراء بھی ساتھ جاتے ہیں لیکن جب میڈیا ذکر کرتا ہے تو صرف صدر اور اس کے ہم منصب کی ملاقات کا ذکر کرتا ہے، اس لئے کہ یہی دو مقصودی افراد ہیں اسی طرح قرآن مجید میں بھی مقصودی افراد یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہوا ہے لیکن یوشع علیہ السلام کا نہیں۔

(۸) ایک بندہ نے مجھ سے سوال کیا کہ حدیث میں کہ ام المؤمنین بی بی عائشہؓ صدیقہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برتن سے ایک ساتھ غسل کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں

نے حضرت کے سامنے اس شبہ کا ذکر کیا تو حضرت نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معلم بنا کر بھیجے گئے تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ بیبیوں سے شادی کی تا کہ گھریلو معاملات کی تعلیم کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کرنا قطعاً غیر مناسب نہیں بلکہ یہ عمل بھی تعلیم ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

(۹) مجھ سے سوال ہوا کہ شخصی گاڑی پر زکوۃ ہے یا نہیں؟ میں نے حضرت سے پوچھا تو فرمایا کہ فتویٰ تو یہ ہے کہ شخصی گاڑی پر زکوۃ نہیں، تاہم احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا ہے کہ شخصی گاڑی کی زکوۃ بھی ادا کردی جائے، پھر اپنے بھائی حاجی مسلم الدین کی مثال دی کہ ان کو بھی میں نے یہ تاکید کی ہے کہ شخصی گاڑیوں کی زکوۃ ادا کیا کریں، الحمد للہ اسی کی برکت ہے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے، اب تک کوئی بڑا نقصان رونما نہیں ہوا۔

(۱۰) ایک واقعہ ہنگو میں مجھ سے ایک شیعہ نے سوال کیا کہ گونگی، بہری، اندھی اور لنگڑی عورت کے ساتھ ایک صحیح سلامت شخص کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ میں حضرت کے پاس آ کر مسئلہ پوچھا مگر یہ نہ بتایا کہ سوال کسی شیعہ نے کیا ہے، حضرت کا کمال یہ تھا کہ وہ موقع اور محل اور مسئلہ کی مناسبت سے نہایت تسلی بخش اور مسکت جواب دیا کرتے تھے، چنانچہ فرمایا کہ ایسا کرو جس نے یہ مسئلہ پوچھا ہے اس کو بتاؤ کہ ایسی عورت اور مرد کو یہاں حاضر کرے، تب ہم جواب دیں گے، حضرت کا یہ جواب سن کر مجھے بھی سمجھ آ گئی کہ یہ آدمی ویسے تنگ کرتا ہے ایسی عورت کہاں ہے؟

حضرت استاذ صاحب علم کے سمندر تھے، ہر فن میں اتنی مہارت تھی کہ آدمی کو رشک آنے لگتا ہے، منطق جیسے مشکل فن کو ایسے آسانی سے حل فرماتے گویا کہ اس میں کچھ مشکل ہے نہیں۔ آج کل جب کسی مدرسہ سے کوئی استاذ دوسرے مدرسہ چلا جائے تو مہتممین ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں، لیکن حضرت استاذ صاحب ایسے نہیں تھے، میں جب بھی مفتاح العلوم سے ملاقات کے لئے حضرت کے پاس آیا ہوں معمول کے مطابق مجھ سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ جامعہ اور اس کے اساتذہ کے بارے میں دریافت فرماتے، میں نے کبھی ان سے جمعیت علماء یا دیگر جماعتوں سے متعلق تنفر محسوس نہیں کیا۔ سب کو ایک نظر سے دیکھا کرتے تھے، حضرت کی انہی عادات کی وجہ سے میں ان کا عقیدت مند تھا، میں نے حضرت سے کہا کہ حضرت! مجھے بیعت کرادیں، تو فرمایا کہ پہلے استخارہ کرو، میں نے استخارہ کیا، رات کو ایک خوبصورت خواب بھی دیکھا جس میں حضرت شیخ عبدالحق، حضرت مدنیؒ اور استاذ صاحب کو دیکھا۔ میں نے خواب حضرت کو بھی سنایا، استخارہ کے بعد میرا دل بھی مطمئن تھا اور حضرت نے بھی بیعت کرا کے چشتیہ کے اسباق عنایت فرمائے۔ پھر کچھ مدت بعد دلائل الخیرات کی اجازت بھی فرمائی۔ میں جب گاؤں جاتا تو حضرت سے رخصت لینے ضرور آتا، حضرت اکثر وہاں کے علماء کے نام پیغامات ارسال فرماتے تھے، جب وزیرستان میں طالبان کا دور آیا تو اس وقت بھی حضرت میری وساطت سے وہاں کے با اثر علماء کے نام یہ پیغام بھیجا

کرتے کہ حکومت سے ٹکراؤ اچھا اقدام نہیں، اسے باز رہنا چاہیے، بھر صلح میں حضرت نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اللہ پاک آپ کی تمام مساعی کو قبول فرمائے اور آپ کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے۔

آفتاب علم ومعرفت

مولانا فضل ودود صندلی، دیر

اسلام کے دور اول سے ہی اللہ جل جلالہ کا اُمت پر یہ عظیم احسان چلا آ رہا ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے دین اسلام کی سربلندی، حفاظت اور اشاعت کے لئے ایسے نامور علماء اور رجال کار پیدا کئے ہیں جنہوں نے اپنے علم و فضل، اعلیٰ اخلاق اور مجاہدانہ کاوشوں سے اسلام کے پرچم کو ہمیشہ سربلند رکھا اور مخالفت کے سخت طوفانوں میں بھی اسے سرنگوں ہونے نہیں دیا۔ ان خدارسیدہ ہستیوں نے چشمہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم وحکمت کا فیض یکے بعد دیگرے حاصل کیا اس کو جوں کا توں پوری انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے پیش کر دیا، جس کے نتیجے میں آج اسلام کا سورج اسی طرح چمکدار اور روشن ہے جیسے کہ وہ پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورمبارک میں تھا، آج اس دین کا کوئی پہلو نسل انسانی کے کسی فرد، جماعت قوم اور قبیلے سے دنیا کے کسی کونے گوشے میں مخفی و پوشیدہ نہیں ہے، انہیں وارثان نبوت اور یگانہ روزگار شخصیات میں سے ایک عہد ساز شخصیت مرد جری، صاحب عزیمت علم و معرفت کے امین خداداد صلاحیتوں کے مالک، امام اہلسنت حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی ذات بابرکات

بھی تھی۔

آپؒ نے اپنی مختصر حیات زندگی میں وہ کچھ کیا، جو شاید کئی جماعتیں مل کر بھی نہ کرسکتیں، قوموں کی تاریخ میں ہمہ گیر اور یگانہ روزگار ہستیاں صدیوں میں خال خال جنم لیتی ہیں اور اپنے کارہائے نمایاں سے دُنیا کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

آپ مسلم علمی حیثیت کے مالک تھے، آپؒ کی تصانیف اور تدریسی خدمات اس پر شاہد ہیں، کثیر تعداد میں طلبہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، بالالفاظ دیگر آپؒ مرجع خلائق تھے، آپؒ طلبہ کو صرف کتابی علم ہی نہیں دیتے بلکہ اقامت دین کے لئے ان کے اندر عملی، اخلاقی اور روحانی شعور بھی اجاگر کرتے، توحید وسنت کی ترویج اور شرک وبدعت کے خلاف مؤثر آواز بلند کرتے تھے، قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں گہری نگاہ رکھتے تھے، اُن کی مہارت کا ثبوت آپؒ کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے، آپؒ اپنی شخصی زندگی میں ملنسار ایک محبت کرنے والے، مہمان نواز شخصیت تھے، ملاقات سے خوش ہوتے تھے اور دوستوں کی ذاتی زندگی سے دلچسپی کا اظہار فرماتے، الغرض آپؒ بے شمار کمالات، اوصاف اور خصائص کے مالک تھے۔

سلسلہ بیعت وخلافت

آپؒ کا پہلا ملاقات حضرت صندل باباجی نور اللہ مرقدہ سے ۲۰۰۲ء سوات درخخیلہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا رشید احمد صاحب (حالاً مدرس جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک) کے مدرسہ میں ہوا۔ رفقائے سفر حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ اور قاری خالد محمود صاحب ہنگو والے ساتھ تھے، اس ملاقات کا منظر عجیب نورانی اور پُراثر تھا، ملاقات کرنے والے تمام رفقاء کو حضرتؒ نے طریقہ قادریہ میں باباجی نور اللہ مرقدہ سے بیعت کیا، آپؒ نے حضرت باباجیؒ کو ہنگو آنے کی دعوت دی، چونکہ حضرت باباجیؒ کی آپؒ کے ساتھ بے حد محبت اور بے مثال شفقت تھی، آپ کی علمیت کے مداح تھے، اکثر مسائل میں بھی ان کی طرف مراجعت فرماتے۔ حضرت شہیدؒ اور مولانا عبداللہؒ کے خلوص وللّٰہیت کا اکثر تذکرہ فرماتے، اس لئے باباجیؒ نے دعوت قبول فرمالی اور یوں آپ کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا، ہنگو کی تکلیف دہ سفر کے باوجود باباجیؒ نہایت مسرت اور خوشی سے حضرت شہیدؒ کے پاس جایا کرتے۔ باباجیؒ نے آپؒ کو طریقہ قادریہ میں خلافت سے نوازا تھا، آپؒ نے بار بار باباجیؒ سے کہا کہ میں بار خلافت کو نہیں اُٹھا سکتا ہوں لیکن باباجیؒ نے انہیں کامل دعاؤں اور بھرپور توجہات سے نوازا۔ پھر آپؒ کئی بار اپنے رفقائے سفر میں ہنگو کے کبار علماء کرام اپنے استاذ حضرت مولانا عبداللہ صاحب، مولانا محمد رفیق صاحب، کربوغہ شریف کے مفتی مختار الدین شاہ

صاحب کو شامل فرما کر تشریف آوری فرماتے۔حضرت کی وجہ سے حضرت مفتی نظام الدین شامزئی صاحب ،مولانا پیر عزیز الرحمن ہزاروی صاحب اور مفتی رضاء الحق صاحب (افریقہ) بھی صندل تشریف لاتے تھے۔

آپؒ کو اللہ نے علم مکاشفہ سے بھی نوازا تھا۔ایک بار آپؒ کے مدرسہ میں ہم بیٹھے تھے۔ساتھیوں کے درمیان ایک مسئلہ میں بحث مباحثہ شروع ہوا،تو آپؒ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں آگے مت جانا،اس مجلس میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو اللہ پاک نے علم مکاشفہ سے نوازا ہے،پھر آپؒ مجھے اپنے ساتھ مکتبہ لے گئے۔اپنے ساتھ بیٹھا کر فرمایا کہ ایک بار دو بے وقوف بندوں نے میرے قتل کی منصوبہ بندی کی تھی،مدرسہ میں ایک درخت پر بیٹھے تھے تاکہ مجھے قتل کر کے اپنے کے مذموم مقصد کو پورا کر سکیں،اللہ کے فضل وکرم سے ہوا یہ کہ وہ خود میرے سامنے آکر مقر ہوئے اور اپنے مذموم مقاصد کو خود آشکارا کیا کہ ہم تو تاک میں بیٹھے تھے لیکن آپ کے اردگرد بہت سے پگڑی والے لوگ تھے اس لئے ہمارے لئے وار کرنا مشکل ہوگیا اور ہماری آنکھوں پر تاریکی چھا گئی اور بدحواس ہوگئے،لہذا ہمیں معاف فرمایئے اور اپنی احتیاط کیجئے۔فرمایا: میں نے انہیں معاف کیا۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بیرون

محدث العصر شہید ملت مولانا محمد امین اورکزئیؒ دار فانی سے دار بقا کو سدھار گئے۔**فمنھم من قضی نحبه و منھم من ینتظر۔**

اورکزئی ایجنسی کی پہاڑیوں سے طلوع ہونے والا علم وعمل کا آفتاب عالم تاب قابل رشک مادر علمی جامعہ یوسفیہ شاہو دام میں غروب ہوگیا اور جام شہادت نوش کر گیا،اپنی علمی ضیاء پاشیوں کے بعد اپنی ریاست علمی کی وراثت اپنے اخلاف رشید اور ان اصحاب علم کے سپرد کر گئے جنہوں نے آپؒ کے ساتھ مل کر اپنی پسند سے اس علمستان کی آبیاری کی تھی اور پھر ملک بھر میں ان کے مشن کے لئے سرگرم عمل رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ان تمام افراد کو اور اہل خانہ کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی توفیق عطا فرمائے، آپؒ کی شہادت سے پاکستان کی علمی،دینی اور روحانی فضا میں ایک زبردست خلا رونما ہوگیا،معرکہ حق و باطل میں حق کا ساتھ دینے والی ایک مؤثر آواز ساکت ہوگئی،اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل خاص سے اس خلا کو پُر کردے اور آپؒ کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں ان کو بلند بالا مقام عطاء فرمائے آمین۔آپؒ کی زندگی بھر کے کارناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؒ کی زندگی بھی قابل رشک تھی۔انداز گفتگو،طرز ملاقات،نشست وبرخاست،عبادت و ریاضت،حتیٰ کہ آپؒ کی شہادت،تجہیز وتکفین بھی نہایت قابل رشک تھی،درحقیقت اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ وہ ہیں

جو اجسام پر نہیں بلکہ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ کریم ان کے لائق فائق صاحبزادوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ علماء کرام اور تلامذہ عظام کو اس خلا کے پر کرنے کی توفیق عطا فرما دیں۔ آمین یارب الشہداء والمجاہدین

زندگی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا
نور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو تیرا

استاذ صاحب رحمہ اللہ کا عشق قرآن

قاری رشید احمد، ہنگو

اللہ تعالیٰ نے استاذ صاحبؒ کو قرآن کریم کی تلاوت کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ بے پناہ مصروفیات کے باوجود بہت زیادہ تلاوت کرتے تھے۔ قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی پر بھی غور و تدبر کرتے تھے، اس لئے ان پر قرآن کریم کا عجیب اثر ہوتا تھا۔ مدرسہ کی مسجد میں امامت خصوصاً جہری نمازیں میرے سپرد تھیں، جب بندہ نماز میں تلاوت شروع کرتا تو بعض دفعہ آپ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ بندہ کو محراب میں محسوس ہوتا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھتا تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر نظر آتی۔

استاذ صاحبؒ کی قرآن کریم کے ساتھ محبت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھار نماز فجر کے لئے خود سورتوں کا انتخاب فرما کر ارشاد فرماتے کہ قاری صاحب! آج نماز میں فلاں سورت پڑھیں، الحمد للہ مجھے حضرتؒ کی خواہش کی تکمیل پر بہت خوشی محسوس ہوتی اور ماشاء اللہ حضرتؒ کی طرف سے حوصلہ افزائی کے کلمات کے ساتھ خوب داد بھی ملتی، اسی وجہ سے استاذ صاحبؒ کے سامنے تلاوت میں جو لذت و حلاوت محسوس ہوتی نہ وہ لذت اس سے پہلے

نہ بعد میں کبھی ملی۔

ایک دفعہ رمضان المبارک میں صاحبزادہ مولانا محمد یوسف صاحب نے فون کیا کہ استاد صاحبؒ کی خواہش ہے کہ مجھے تراویح میں قرآن مجید سنائیں چونکہ اسی رات گاؤں کی مسجد میں تراویح میں ختمِ قرآن کا آخری پارہ تھا، اس وجہ سے میں نے کہا کہ اگر استاد صاحبؒ کی ناراضگی کا اندیشہ نہ ہو تو آج میں اپنی مسجد میں ختم قرآن کا آخری پارہ سناؤں اور کل سے حاضر ہو جاؤں۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے کل آجائیں۔ جب میں آیا تو حفاظ کرام تین پارے پڑھ چکے تھے۔ استاد صاحبؒ حسبِ معمول معتکف تھے، اسی سال مولانا عدنان کا کاخیل بھی جامعہ یوسفیہ کی مسجد میں معتکف تھے۔ اس سال ہمیں حضرتؒ سے خوب استفادہ کا موقعہ ملا، حضرتؒ افطاری میں بہت کم کھانا تناول فرماتے، تراویح کے بعد حضرت کے لئے پھل اور چائے لائی جاتی۔ اس وقت ایک پر رونق مجلس منعقد ہو جاتی۔ مولانا کاکاخیل صاحب استاذ صاحبؒ سے مختلف قسم کے سوالات پوچھتے اور حضرت کی طرف سے عجیب علمی جوابات ملتے، یہ مجلس رات دیر تک جاری رہتی اور ہم اس سے خوب لطف اندوز ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہماری ساری تھکاوٹ ختم ہو جاتی، بدقسمتی سے اس وقت ریکارڈنگ کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا کہ ہم حضرتؒ کے وہ علمی نکات اور بصیرت افروز باتیں محفوظ کرتے، یقیناً حضرتؒ علوم ومعارف کا ایک عریض وعمیق سمندر تھے، جب بھی کسی موضوع پر گفتگو شروع فرماتے تو خالص موتی ہی برساتے۔ حضرتؒ کا اندازِ تکلم ویسے بھی دل آویز اور شیرین تھا، پھر حضرت کی جو تنہائی کی مجلسیں ہوتیں وہ بہت پُراثر اور پُر کیف تھیں جس کا مشاہدہ بہت سارے احباب کر چکے ہوں گے۔ میں نے بذاتِ خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس مجلس میں ایمان کی ترقی، اعمال کا شوق اور اپنے اکابر پر اعتماد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا۔ حضرتؒ کا کلام اتنا پُرحکمت ہوتا تھا کہ دل کی دنیا میں واضح تبدیلی محسوس ہوتی۔ اس وجہ سے حضرتؒ کے بہت سارے تلامذہ اعتکاف میں استاد صاحبؒ کی صحبت وعلم سے فائدہ اُٹھانے کے لئے دور دراز سے تشریف لاتے۔

میرے ساتھ ختم قرآن میں دوسرے حفاظ بھی شریک تھے، ہم روزانہ تین پارے سناتے، اگلے دن ان میں سے ایک پارہ ایک حافظ صاحب نے اور دوسرا پارہ دوسرے حافظ صاحب نے سنایا اور تیسرا پارہ میں نے بہت سکون واطمینان اور تجوید کے قواعد کے ساتھ عربی لہجہ میں سنایا، تراویح سے فارغ ہونے کے بعد مولانا حبیب اللہ صاحب نے فرمایا کہ آپ کی تلاوت سے استاد صاحبؒ پر عجیب کیفیت واثر طاری ہوا تھا، تلاوت کے دوران شروع سے آخر تک استاد صاحبؒ رو رہے تھے۔ اس کے بعد استاد صاحبؒ نے میرا ہاتھ پکڑ کر نہایت خوشی اور مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے زبان مبارک سے یہ کلمات کہے: "ختمہٗ مسک"۔

شاید اس بات کا علم کسی کو نہ ہو کہ حضرت صرف عاشق قرآن نہیں بلکہ خود ایک اچھے قاری بھی تھے اور کثرت تلاوت کی وجہ سے حافظ قرآن معلوم ہوتے۔ مجھے کئی بار حضرت کو تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت نصیب ہوئی، مجھ سے جہاں بھی غلطی سرزد ہوتی تو اکثر اوقات لقمہ حضرت استاذ صاحبؒ کی طرف سے ملتا۔ حضرتؒ نہایت تدبر اور توجہ کے ساتھ تلاوت سماعت فرماتے، الفاظ وکلمات کے علاوہ اعراب میں بھی کمی بیشی پر تنبیہ فرماتے اور کبھی کبھار مضمون کے بارے میں بھی وضاحت فرماتے۔

حضرتؒ کو حسن صوت کے ساتھ قرأت بہت پسند تھی، اسی ختم قرآن کا آخری پارہ بندہ نے سنایا، جس میں بہت سے اہل علاقہ کے علاوہ ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب اور جناب فخر عالم صاحب اور کچھ دیگر سرکاری لوگ خصوصی طور پر شریک ہوئے تھے اور خوش قسمتی سے اس رات صرف ایک پارہ تھا، میں نے حضرت کے مزاج کی پوری رعایت رکھ کر بہت آرام اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھا۔ حضرت نے اس پر بڑی دعا دی اور فرمایا کہ ''ہمیں تراویح میں جو تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ تلاوت کی تیز رفتاری ہے، اگر تلاوت کلام پاک میں ترتیل کا لحاظ رکھا جائے تو صاحب ایمان کبھی بھی تعب وتھکاوٹ کا شکار نہیں ہوگا کیونکہ کلام پاک میں قدرتی طور پر ایک تاثیر ہے، اس سے قلوب کو تسکین اور روح کو تازگی ملتی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو بہت ہی مشقت میں ڈالا ہے کہ روزانہ رات کو تراویح میں دس دس پارے پڑھتے ہیں، اس میں اعراب تو درکنار کلمات کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ قاری صاحب کیا اور کہاں سے پڑھتا ہے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تلاوت ہمارے لئے باعث رحمت ہونے کے بجائے باعث زحمت نہ بنے اور باعث برکت ہونے کے بجائے باعث ہلاکت نہ بنے۔''

علم تجوید وقرأت سے دلچسپی کی وجہ سے اپنے برخوردار حافظ ظہیر الدین کو میرے ساتھ مینگورہ سوات تجوید وقرأت کی تعلیم کے لئے بھیجا۔ ایک دور وہ تھا جب ہمارے علاقوں میں کوئی حافظ قرآن نہ ملتا تھا لوگ دور دور سے تراویح کے لئے حفاظ بلاتے تھے۔ لیکن حضرت نے اپنے ورود کے ساتھ ہی مکاتب قرآن کے قیام پر توجہ دی، تھوڑے ہی عرصہ میں الحمدللہ حفاظ کی بہار ہوگئی، صرف چند سالوں میں سینکڑوں حفاظ ہوگئے۔ ہر مسجد میں حفظ وناظرہ کے مکتب بن گئے۔ یہ استاذ صاحبؒ کا عظیم کارنامہ تھا۔

۲۰۰۴ء کی بات ہے، بندہ تجوید کی غرض سے نمک منڈی پشاور استاذ القراء قاری فیاض صاحب کے ہاں داخلہ لینے گیا، وہاں داخلہ کیلئے میٹرک شرط تھی، اس وجہ سے مجھے داخلہ نہ مل سکا، جب گھر واپس آیا تو اس شش وپنج میں تھا کہ اب کیا کروں؟ اس دن اتفاقاً میرے چچا مولانا رفیع اللہ صاحب کسی ذاتی کام کے لئے حضرتؒ کے پاس گئے تھے۔ حضرت نے ان سے بندہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ آج کل کہاں ہے؟ مولانا رفیع اللہ صاحب نے کہا کہ

حافظ صاحب کو فنِ تجوید سے شوق پیدا ہوا ہے، اس کی حصول کے لئے دارالقراء نمک منڈی پشاور گیا تھا مگر وہاں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے فی الحال گھر میں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کل ان کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اگلے دن حاضری ہوئی تو استاذ صاحب نے فرمایا کہ حافظ صاحب! آپ ہمارے ہاں تدریس کی خدمات سرانجام دیں، میں نے اپنی تجوید وقرأت کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا: ان شاء اللہ عنقریب جنوبی افریقہ سے ہمارے ایک ساتھی شیخ محمد اسماعیل تخصص فی الحدیث کے لیے آرہے ہیں، وہ ماشاء اللہ سبعہ عشرہ کے ماہر قاری ہیں اور تجوید کے متخصص بھی ہیں۔ ان سے آپ استفادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے حضرت کی بات پر سخت تعجب تھا کیونکہ کم عمری کی بنا پر میں اپنے آپ میں درس کی اہلیت بالکل نہیں پاتا تھا۔ مدرسہ کے دیگر اساتذہ کرام بھی تعجب کا شکار تھے کہ استاذ صاحبؒ نے اس نوعمر لڑکے کو تدریسی گدی پر کیوں بٹھا دیا؟ حضرت نے مجھے تدریس کی ذمہ داری دیتے ہوئے فرمایا کہ قاری صاحب! یہ آج کے بعد آپ کے بچے ہیں، ان سے اپنے بچوں جیسا سلوک کرنا، یہ خدائی امانت ہے۔

بہرحال استاذ صاحبؒ کے مشورے پر عمل کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ حضرت کے فرمان کی وجہ سے شیخ اسماعیل صاحب نے میرے ساتھ محنت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مگر بدقسمتی سے وہ اپنے تخصص سے بہت جلد فارغ ہو کر واپس افریقہ چلے گئے اور بندہ کے لیے شیخ صاحب نے جو نصاب تجویز کیا تھا وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اگلے سال دل میں پھر سے داعیہ پیدا ہوا تو دوبارہ حضرتؒ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اگر مجھے ایک سال کے لئے چھٹی مل جائے تو میں تجوید کا بقیہ نصاب مکمل کرلوں۔ استاذ صاحبؒ نے فرمایا کہ جو کتابیں آپ پڑھ چکے ہیں، میرے خیال میں وہ کافی ہیں۔ بس آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اب اس کی عملی مشق کی کوشش کریں۔

پھر مینگورہ سوات میں حضرت کو ایک قاری صاحب کے طرزِ تدریس اور تجوید وقرأت کی صلاحیت نے کافی متاثر کیا، آپ نے کچھ عرصہ کے لئے مجھے ان کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجا تاکہ جامعہ یوسفیہ کے شعبہ حفظ وتجوید کو اسی طرز پر استوار کیا جاسکے۔ الحمدللہ وہاں بندہ نے کافی استفادہ کیا اور اپنے ہاں مکاتب کے نظم کو مزید بہتر بنانے کے لئے کافی گر ہاتھ آئے۔ بندہ کو اپنی تجوید وقرأت میں جو تشنگی محسوس ہوتی تھی الحمدللہ مینگورہ میں وہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ استاذ صاحب وہ عبقری شخصیت تھے کہ اگر کوئی شخص کسی کام کے بارے میں پوچھتا تو اس کام کے متعلق پورا نقشہ بیان کر کے عملی ڈھانچہ پیش فرماتے اور ہر انسان کو اس کی استعداد کے مطابق تیار کر کے کام لیتے۔

مدرسہ یوسفیہ میں تجوید کا وہ کام شروع ہوا جو استاذ صاحب کی ایک دیرینہ خواہش تھی، جب درجہ حفظ کی کلاسوں سے خوبصورت آوازوں کے ساتھ تجوید میں پڑھنے کی گونج اٹھتی تو استاذ صاحب کے چہرے پر مسرت کے اثرات

نمایاں ہوتے ،حضرت کی توجہ سے چند سالوں میں اس کا فیض پورے علاقے میں پھیل گیا اور تجوید سے محبت کی وہ فضا بنی جو استاذ صاحب کی دیرینہ آرزو تھی۔

حضرتؒ سرپرستی کے علاوہ بہت شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے اور معمولی سے کام پر بھی اتنی دل جوئی فرماتے کہ میرے پاس وہ کلمات نہیں جن کے ذریعے میں اسے بیان کرسکوں۔ جب بندہ نے اپنے علاقے کے چھوٹے بچوں کی خاطر پشتو زبان میں ایک قاعدہ مرتب کیا تو حضرت اقدسؒ کی خدمت میں نام تجویز کرنے کے لئے پیش کیا، حضرت شہیدؒ نے فرمایا کہ اگر آپ خود کسی نام کو پسند فرماتے تو بہتر ہوتا۔ میں نے چار نام پیش کیے۔ حضرت نے ان میں سے تیسیر القرآن کو منتخب کر کے فرمایا کہ قاری صاحب! اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی امور میں یسر کی تلقین فرمائی ہے، جناب سیدنا حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی دینی امور میں آسانی کے بارے میں بے شمار روایات منقول ہیں، اسی مناسبت سے میری خواہش ہے کہ اگر تیسیر القران کا نام رکھا جائے تو بہتر ہے۔ پھر حضرتؒ نے اپنے مفید مشوروں کے علاوہ بار بار مبارکباد پیش فرمائی اور ان دعائیہ کلمات سے نوازا کہ اللہ تعالیٰ مزید مقبولیت ومحبوبیت نصیب فرمائے۔ فرمایا کہ قاری صاحب! آپ نے ہمارے بچوں کے ساتھ بہت بڑا احسان کیا۔ ان مبارک کلمات سے میری ہمت اور محنت میں مزید اضافہ ہوا اور ذوق وشوق بھی بڑھا۔

حضرت تمام مدارس کی طلبا سے جو شفقت اور محبت کا معاملہ فرماتے شاید ایسی محبت وشفقت ان کو اپنے گھروں میں بھی میسر نہ ہو، حضرت بذات خود طلبہ کو بہت کم نصیحت فرماتے، حضرت کی نصیحت وتربیت کا طریقہ کار زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر ہوتا تھا، ہر عمل کو ایسی شان سے ادا کرتے کہ طلبہ میں خود بخود کرنے کا جوش وجذبہ پیدا ہوتا، پورے سال میں بمشکل دو یا تین اصلاحی بیان کیے ہوں گے، مگر انتہائی اختصار کے ساتھ۔ انداز گفتگو میں اپنائیت ومحبت ہوتی، لب ولہجہ میں ترحم کے ساتھ خلوص وہمدردی بالکل نمایاں ہوتی، طرز کلام اتنا پر تاثیر کہ دل ودماغ پر براہ راست اثر کرتا۔ خاص کر استاذ صاحب کے وہ جملے آج بھی ذہن میں گونج رہے ہیں کہ ”ایک دن مسجد میں طلبہ سے وجد کے حالت میں فرمایا کہ عزیز طلبہ! میری آپ سے جو محبت ہے وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات کو معلوم ہے، میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں جو دعائیں اپنی اولاد کیلئے مانگتا ہوں وہی دعائیں آپ کے لئے بھی مانگتا ہوں۔ یہ بھی یاد رکھیں! میرے دل میں یوسف اور آپ کے لئے اختیاری محبت میں مساوات ہے اور غیر اختیاری محبت انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔“

حضرت الاستاذؒ ایک جامع الکمالات شخصیت تھے، آپ نے قرآن مجید کی تعلیم کے جو باغ اپنے علاقہ میں لگائے ہیں ان شاء اللہ یہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہیں، صرف جامعہ یوسفیہ میں اس وقت حفظ کی پانچ کلاسیں جاری ہیں،

اردگرد کے درجنوں مکاتب اس کے علاوہ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائیں اور ہمیں آپ کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق بخشیں۔ آمین

امین الملۃ: سیرت وافکار کے چند پہلو

مولانا حفیظ الرحمن، کوہاٹ

ادارہ المظاہر نے شہید اسلام امین الملۃ محدث عصر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی پر ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بندہ بھی قارئین المظاہر کے سامنے حضرت استاد صاحب کی سیرت سے متعلق چند گزارشات پیش کر رہا ہے، ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت استاد صاحب کی سیرت کے یہ گوشے منظر عام پر آجائیں۔

حضرت کے متعلقین ومتوسلین سے گزارش ہے کہ حضرت استاد صاحب کے نظریات وافکار کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طویل اور مضبوط بنیادوں پر منصوبہ بندی کریں، اس کے لیے مناسب افراد کار تلاش کر کے ان کو اسباب مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں، بہت دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ استاد صاحب نے جو خصوصی افکار ونظریات اپنے متعلقین، تلامذہ، متوسلین کے سامنے پیش فرمائے تھے جن کی ایک جھلک قارئین کو اس نمبر میں مل سکتی ہے اور جن

میدانوں میں کام کرنے کیلئے حضرت استاد صاحب نے زندگی وقف فرمائی تھی وہ میدان افراد کار سے خالی نظر آرہے ہیں، ذیل میں حضرت کے چند افکار اور کاوشیں پیش خدمت ہیں:

نصب امام:

حضرت استاد صاحبؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے تمام مسائل، مشکلات، مظلومیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو شرعی امام میسر نہیں، اگر مسلمانوں کو شرعی امام مل جائے اور امت مسلمہ ایک امیر پر متفق ہو جائے تو امت مسلمہ کے تمام مسائل حل ہو جائیں، اس بات کا تذکرہ حضرت استاد صاحب بہت درد کے ساتھ اپنی مجالس میں فرماتے بلکہ ملک پاکستان میں تمام مذہبی جماعتوں کے اتحاد کیلئے استاد صاحب نے عملی طور پر قدم بھی اٹھایا تھا اور بعض اکابر علماء کرام جیسے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحبؒ وغیرہ حضرات سے اس بارے میں ملاقاتیں بھی کی تھیں، استاد صاحب کی خواہش تھی کہ پاکستان کی تمام مذہبی جماعتیں اگر حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحبؒ کی قیادت وامارت میں ایک ہو جائیں، اس کے بعد ہر جماعت اور تنظیم اپنے اپنے شعبے میں کام کرے، سیاسی میدان میں جمعیت علماء اسلام، ناموس صحابہؓ کی تحریک میں سپاہ صحابہ، عوامی تذکیر واصلاح کیلئے تبلیغی جماعت، ختم نبوت کے میدان عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور انٹرنیشنل ختم نبوت مومنٹ کام کرے۔ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے ساتھ مکمل تعاون کریں اور عام حالات میں ایک دوسرے سے دعا وحمایت کا تعلق رکھیں تو یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا۔

جب افغانستان میں امیر المؤمنین ملا عمرؒ کی امارت اسلامی معرض وجود میں آئی تو استاد صاحب نے کئی موقعوں پر اس کا تذکرہ کیا کہ اگر علماء کرام اس مسئلہ کی طرف توجہ دیں کہ ہمارے اور پوری امت مسلمہ کیلئے ملا عمرؒ کی امارت کی کیا حیثیت ہے؟ حضرت کی بیعت ہمارے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ ایک مرتبہ جب بنوں میں مولانا نصیب علی شاہ صاحبؒ نے ایک بہت بڑی فقہی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اور ملک کے مختلف حضرات کے پاس اس کے دعوت نامے پہنچے تو اس میں دیگر عنوانات کے ساتھ ایک عنوان یہ بھی تھا کہ 'امارت اسلامیہ افغانستان' تو اس موقع پر حضرت استاد صاحب نے فرمایا تھا کہ علما کو اس نقطہ پر بحث وتحقیق کرنی چاہئے کہ امیر المؤمنین کی بیعت ہم مسلمانان پاکستان کیلئے ضروری ہے یا نہیں اور اس کی شرعی حیثیت واضح کی جائے۔ مولانا فیض الرحمان صاحب مدرس جامعہ یوسفیہ راوی ہے کہ ایک مرتبہ کچھ حضرات نے یہ بات چھیڑ دی کہ جب تک مسلمان ایک امیر منتخب نہیں کرتے تو اس وقت تک ہمارے ملک میں نماز جمعہ وعیدین شرعا درست نہیں تو اس پر استاد صاحب نے فرمایا کہ اگر چہ ہمارے نزدیک

ہمارے ملک میں نماز جمعہ وعیدین درست ہیں اور اگر چہ ہم اس مسئلہ میں فقہ میں مذکور عبارات کی تاویل کرتے ہیں لیکن ہمارے اصل مذہب کے رو سے بات یہی ہے کہ جب تک مسلمان کسی ایک امیر پر متفق نہ ہوجائیں تو یہاں جمعہ وعیدین کا انعقاد درست نہیں۔ لیکن افسوس کہ حضرت کی یہ دیرینہ آرزو پوری نہیں ہوئی اور امت مسلمہ خصوصاً پاکستان کے مسلمان اب تک مختلف جماعتوں، تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد واتفاق دن بدن کم ہوتا جارہا ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

آج حضرت استاد صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے لیکن جو فکر اور درد حضرت کے سینہ میں تھا پہلے سے زیادہ اس کی ضرورت ہے، اگر زعماء ملت اس مسئلے کی طرف توجہ دیں اور باہمی مشاورت سے اس کی صورت نکل آئے تو شاید ہمارے اجتماعی دینی معاملات میں کافی بہتری پیدا ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے درمیان اجتماعی شورائی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سارے دینی کام بکھرے ہوئے ہیں، ایک دوسرے پر فوقیت وترجیح حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم کی محنتیں ہورہی ہیں، ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ مسجد کی چاردیواری میں محدود ومصروف ہے، افتراق اور انتشار کی نحوست پوری طرح ہماری فضا پر چھائی ہوئی ہے، خدا کرے کہ مسلمانان پاکستان میں ایسے افراد پیدا ہوجائیں جو قوم کی سوئی ہوئی تقدیر کو جگادیں، نوجوانان امت کو بیدار کریں، باہمی اتفاق ومحبت کے اسباب پیدا کریں اور مسلمانان مملکت پاکستان متفق ومتحد ہوکر مملکت خداداد کے حقیقی مقصد کے حصول کی طرف پیش رفت شروع کریں اور ہمارے اکابر جنہوں نے اس مقصد کے لیے بیش بہا قربانیاں دی تھیں اور جو اپنے سینوں میں یہ ارمان لے کر دنیا سے رخصت ہوئے ان کی روحوں کو چین اور سکون نصیب ہو۔

رؤیت ہلال:

مملکت پاکستان میں رؤیت ہلال کا مسئلہ ایک گھمبیر شکل اختیار کر چکا ہے، خصوصاً k.p.k میں عام مسلمانوں کے لیے صوم وعیدین کے ایام انتہائی مشکل ہوجاتے ہیں بعض اکابر علماء کرام کی رائے ہے کہ عام لوگوں کو مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلے کے مطابق روزے اور عیدین کا اہتمام کرنا چاہیے لیکن خیبر پختونخوا کے اکثر شہروں پشاور، کوہاٹ، مردان، چارسدہ، ہنگو وغیرہ میں غیر سرکاری کمیٹیاں مقامی علماء کرام کی نگرانی میں خود ہی شہادتیں لے کر صوم وعیدین کا اعلان کرتی ہیں اور اکثر عوام ان غیر سرکاری کمیٹیوں کے اعلان پر ہی صوم وعیدین کا اہتمام کرتے ہیں۔

حضرت استاد صاحب اس مسئلہ میں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی سے قطعاً مطمئن نہیں تھے بلکہ غیر سرکاری مقامی کمیٹیوں کے فیصلوں کو ترجیح دیتے تھے اور خود بھی عملاً ضلع ہنگو میں جو غیر سرکاری کمیٹی علماء کرام کی زیر نگرانی فیصلہ کرتی

،اسی پر عمل کرتے ،صاحبزادہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کے بقول ضلع ہنگو میں کافی عرصہ پہلے مولانا محمد کریم کا کا خیلؒ کے زیر نگرانی علما کی غیر سرکاری کمیٹی قائم کی گئی تھی جو لوگوں سے شہادتیں لے کر صوم وعیدین کا اعلان کرتی ،استاذ صاحبؒ بھی اسی کے مطابق عمل کرتے۔

بقول حضرت صاحبزادہ ایک مرتبہ کچھ علماء کرام حضرت استاذ صاحبؒ کے پاس تشریف لائے اور ان غیر سرکاری کمیٹیوں پر کچھ اعتراضات کیے،اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال وجواب اور حضرت استاذ صاحبؒ کا علم وتقویٰ بصیرت وفراست اور صفاء باطنی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں بقول صاحبزادہ:

ان علماء کرام نے عرض کیا کہ حضرت عوام جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں اور علما ان پر اعتماد کرتے ہیں۔استاذ صاحب نے فرمایا کہ اچھا عوام تو جھوٹ بولتے ہیں،میرے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا میں کذاب ہوں؟ تو ان علما نے کہا: ہرگز نہیں۔پھر فرمایا کہ تین مرتبہ تو میں نے خود بھی اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے مگر اس دن بھی مرکزی کمیٹی نے لوگوں کی گواہی نہیں لی تھی اور اس کے برعکس فیصلہ کیا تھا اور مزید فرمایا کہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے دین کی کچھ سمجھ عطا کی ہے،فقہ حنفی کے ساتھ چاروں فقہی مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور ان پر نظر بھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اتنی فہم ضرور نصیب فرمائی ہے کہ تم ایک کاغذ پر قرآن پاک کی آیت لکھ کر دو،اس کے ساتھ ایک حدیث شریف لکھ دو،پھر صحابی کا قول لکھ دو،پھر عام عربی کے الفاظ لکھ دو،پھر میری آنکھیں بند کر دو تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہاں سے یہاں تک قرآن پاک کی آیت ہے،پھر یہاں سے یہاں تک حدیث شریف ہے پھر کسی کا قول ہے اور فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک عام عربی کے الفاظ ہیں،پھر مزید فرمایا کہ الحمد للہ (اپنی باطنی فراست وبصیرت سے) رمضان اور غیر رمضان کے دنوں اور راتوں کو جانتا ہوں اور ان میں فرق کو سمجھتا ہوں۔

بقول جاوید ابراہیم پراچہ صاحب اس سلسلے میں ایک یادگار علمی مباحثہ بھی پراچگان کے پرانے مدرسے میں ستر کی دہائی میں ہوا جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مرحوم بھی شریک تھے جو تقریباً تین دن تک جاری رہا جس میں بالآخر استاذ صاحب کی رائے یعنی غیر سرکاری کمیٹیوں پر علماء کرام نے اعتماد کیا تھا اور اسی پر اس مجلس کا فیصلہ بھی ہوا تھا،حضرت استاذ صاحب اس سلسلے میں سرکاری مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی سے بالکل مطمئن نہیں تھے بلکہ بقول صاحبزادہ صاحب استاد صاحبؒ فرماتے تھے کہ حکومت اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی جو ان کے ذمہ کام ہیں ان میں غفلت کرتی ہیں،ہمارے روزے وعیدین کا کیا اہتمام کرے گی؟ واضح رہے کہ اس سلسلے میں استاد صاحب نے مرکزی کمیٹی کی اصلاح کیلئے کچھ فکر بھی فرمائی تھی لیکن حضرت مولانا عبد اللہ شہیدؒ جو اس وقت اس کمیٹی کے رکن تھےؒ نے استاد صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اس بارے میں

اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالیں، حکومت کا اس بارے میں کوئی ارادہ نہیں، اس کے بعد استاد صاحب نے یہ کوشش ترک کر دی تھی۔ بقول حضرت صاحبزادہ صاحب ایک مرتبہ ہنگو کی ایک غیر سرکاری کمیٹی میں ایک مقامی مفتی نے شہادتیں لیتے وقت گواہوں سے یمین کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر کیا تھا کہ اگر میری گواہی صحیح نہیں تو میری بیوی کو طلاق ہو، تو اس پر استاد صاحب بہت غصہ ہوئے تھے اور مفتی صاحب سے اسی وقت فرمایا تھا کہ اس طرح کی گواہی لینا مجھے کسی کتاب سے ثابت کر دو۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں استاد صاحب کی کچھ تحریرات بھی تھیں جو افسوس کہ فی الحال دستیاب نہ ہو سکیں۔

ایرانی عزائم اور آپ کا نقطہ نظر

کافی عرصہ ہوا کہ بندہ نے حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی کسی کتاب میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کا یہ ملفوظ پڑھا تھا کہ "لوگ ہماری وفات کے بعد ہماری قبروں پر کھڑے ہو کر کہیں گے کہ یہ لوگ سچ کہتے تھے۔"

بالکل اسی طرح حضرت استاذ صاحبؒ کی شہادت کے کافی عرصہ بعد استاد صاحبؒ کے ملفوظات ایک ایک ہو کر سچ ثابت ہو رہے ہیں، اس وقت مشرق وسطی میں شیعہ سنی تصادم کے خوفناک بادل چھائے ہوئے ہیں، عرب ممالک اور ترکی واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ عرب ممالک میں ایران سیاسی و فرقہ ورانہ بنیاد پر مداخلت کر رہا ہے، گزشتہ سال حج کے موقع پر ایرانیوں کا فتنہ برپا کرنا ذرائع ابلاغ میں آ چکا ہے، یمن میں حوثیوں کی کارستانیاں اور منصوبے سب کے سامنے ہیں، شام میں فوجی مداخلت کا ایران خود اعتراف کر رہا ہے۔

ان امور کی پیش گوئی اور ان خطرات کا احساس استاذ صاحب کو آج سے نصف صدی قبل تھا، آج سے تقریباً ۴۳ سال پہلے استاذ صاحب نے بنوری ٹاؤن سے وطن خداداد پاکستان کے حوالے سے ان کے منفی کردار کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:

> "تاریخ اسلام کا ہر ورق گواہ ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کو سب سے زیادہ نقصان بعض رافضیوں نے پہنچایا ہے، یہ لوگ ہر موقع پر اسلامی دنیا سے غداری کر چکے ہیں اور دوست کے لبادہ میں ہمیشہ امت مسلمہ پر ضرب کاری لگاتے رہے ہیں، اسلامی ہند سے مسلم اقتدار کا خاتمہ انہی کا کارنامہ ہے اور انتہائی غیر معقول طریقہ پر تقسیم ہند کا المیہ انہی کی سازش کا نتیجہ ہے، بنگلہ دیش کا قیام اور اس سلسلہ میں لاکھوں سنی مسلمانوں کی تباہی اسی مار آستین کے ڈسنے کے آثار ہیں، میرا یہ نظریہ ہے کہ ان کا فتنہ دنیائے اسلام کے لیے صیہونیت سے زیادہ خطرناک ہے۔"

حالات پر نظر ڈالیں اور حضرت استاذ صاحبؒ کے ایک ایک لفظ کو بغور پڑھیں، دل خود گواہی دے گا: قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

خود حضرت کی شہادت بھی اسی مخصوص طبقے کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

انہی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن

حاجی سید رضا

سیدی و مرشدی، محدث العصر، محقق کبیر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ان یگانۂ روزگار اور عبقری صفت شخصیات میں سے تھے جنہیں زمانہ مدتوں یاد رکھتا ہے۔ آپ نے اپنی مختصر لیکن مصروف ترین زندگی میں ایک محقق عالم و مصنف، باعمل و صاحب دل صوفی، مدبر و منتظم سیاست دان اور جری و بے باک رہنما کے حصے کا سارا کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غیبی خزانوں سے آپ پر خوب فیاضی فرمائی تھی اور آپ کو ئی گوناگوں صفات سے نوازا تھا۔ میرے لئے یہ سعادت تھی کہ آپ کے غیر علما احباب میں مجھے سب سے زیادہ آپ کی قربت و صحبت نصیب رہی اور الحمدللہ سفر و حضر میں آپ کا ساتھ رہا۔

مجھے بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا، طبیعت میں انفعالیت بھی تھی لیکن الحمدللہ علمائے حق سے شروع سے محبت تھی۔

اس لئے آزادانہ مطالعے میں پیش آنے والے حوادث کے اثرات سے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے غلام احمد پرویز کی تحریرات پڑھنا شروع کیں۔ طلوع اسلام مستقل طور پر میرے مطالعے میں رہتا اور ایک طرح سے اس کا اسیر ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دست گیری فرمائی اور اس فتنے سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ پھر میری دلچسپیوں کا محور مولانا مودودی کی تحاریر بن گئیں۔ ایک عرصہ دراز تک ان کے مطالعے میں مشغول رہا، لیکن مولانا مودودی پر لاہور کے ایک عالم دین کے ساتھ مکالمے کے بعد ان کی تحریروں میں تشفی کا سامان ختم ہو گیا۔ اس دوران کچھ اہل حدیث احباب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔ ان سے مختلف فروعی مسائل پر بحث ومباحثہ بھی چلتا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ نام تو بخاری کا لیتے تھے لیکن مسائل کے لئے ہدایہ کے ترجمے پاس رکھے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے شیخ القرآن مولانا طاہر پنج پیری مرحوم کی بعض تحریرات بھی پڑھیں۔ ان میں دلائل کے اعتبار سے ایسی کشش محسوس ہوئی کہ دیوبندی فکر پر اعتماد بن گیا۔ اس زمانے میں، میں متحدہ عرب امارات میں مقیم تھا۔ وہاں ہمارے علاقہ کے ایک صاحب حاجی صدیق نے مجھ سے سیدی مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تعارف کروایا کہ اہل السنۃ والجماعۃ علمائے دیوبند کے ایک بڑے عالم ہیں اور شرک وبدعت کے سخت خلاف ہیں، لیکن یاد رکھیں کہ پنج پیری نہیں ہیں۔ بندہ کے دل میں اسی وقت سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور پھر ۱۹۸۴ء میں حضرت سے ان کے مدرسہ میں پہلی ملاقات کا شرف ملا، میں تین ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا تھا، حضرت سے پہلی ملاقات میں ایسی وابستگی ہو گئی کہ روزانہ صبح حاضر ہو کر عصر تک خدمت میں رہتا، میں نے حضرت سے پہلی چیز ''تصحیح عقائد'' حاصل کی۔ آپ کی برکت سے فکر وعمل کا اعتدال جو علمائے دیوبند کا خاصہ اور ورثہ ہے، نصیب ہوا اور سابقہ جتنے لوگوں کو پڑھا تھا، ان کی فکری بے اعتدالیاں بحمد اللہ پوری طرح واضح ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سے حفاظت کا احسان فرمایا۔ میں روزانہ حضرت کے لئے اخبار لے کر جاتا، آپ اخبار ضرور پڑھتے اور حالات حاضرہ سے باخبر رہتے، ایک گوشہ نشین عالم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے عجیب سیاسی بصیرت سے نوازا تھا، عالمی حالات اور پاکستانی سیاست پر مختصر الفاظ میں ایسا جامع تبصرہ فرماتے کہ وہ حرف آخر ثابت ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے معاشرتی وخاندانی معاملات کو سلجھانے کا ملکہ بھی خوب بخشا تھا۔ بارہا میں کسی خاندانی مسئلہ میں بالکل بے بس ہو کر انتہائی پریشانی کے ساتھ حاضر ہوتا۔ تو آپ تحمل سے سارا مسئلہ سنتے اور پھر چند جملوں میں اس کا ایسا حل ارشاد فرماتے کہ میری ساری پریشانی دور ہو جاتی اور بوجھ ختم ہو جاتا۔ اس وجہ سے ہمیشہ کے لئے یہ معمول بن گیا کہ کوئی ذاتی کام یا خاندانی معاملہ حضرت کے مشورے اور ہدایت کے بغیر کبھی نہیں کیا اور الحمد للہ ہمارے دین کے ساتھ ساتھ آپ کی ہدایات پر عمل سے ہماری دنیا بھی سنوری اور بہت ہی خوب سنوری۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حضرت اقدس کی پوری زندگی اخلاق حمیدہ کا مرقع تھی۔ عادات وخصائل اتنے اونچے تھے کہ ان کی مدح و توصیف کے لائق میری زبان ہی نہیں، تاہم حضرت کی حیات طیبہ میں بندہ نے جن چیزوں کو کھل کر دیکھا ہے اور آپ کی جن عادات واخلاق کا ہم نے اپنی زندگیوں پر اثر محسوس کیا ہے اس کا مختصر سا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

حضرت اقدس کا نمایاں وصف استغنا تھا، آپ مخلوقِ خدا سے ایسے مستغنی نظر آنے اور اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر ایسا توکل واعتماد تھا کہ اس کی مثال میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ ایک بار جب مدرسہ میں روشنی کے انتظام میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے سخت تکلیف تھی۔ کوہاٹ کے ایک سیاسی رہنما نے جنریٹر خریدنے کی پیشکش کی۔ آپ نے ضرورت کے تحت پہلے قبول فرمایا۔ لیکن بعد میں ان کے رویے میں شاید کوئی ایسا پہلو دیکھا کہ جس کے ہوتے ہوئے ان سے چندہ قبول کرنا استغنا کے منافی تھا۔ میں حاضر خدمت ہوا تو آپ ایک خط لکھ رہے تھے۔ وہ خط انہی صاحب کے نام تھا جس میں جنریٹر خریدنے کے لئے چندہ قبول کرنے سے معذرت تھی۔

میرے ساتھ حضرت کی بہت بے تکلفی تھی بلکہ میری حیثیت مدرسہ انتظامیہ کے ایک رکن کی سی تھی، اس لئے ہم مدرسہ کی ضروریات کا باہم کبھی کبھار مذاکرہ اور اس کے لئے دعا وفکر کی بات کرلیا کرتے تھے۔ ورنہ حضرت کے بارے میں تمام قریبی متعلقین کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ آپ کبھی مدرسہ کی ضروریات کا کسی کے سامنے چندہ وصول کرنے کے لئے یا وصول کرنے کی ترغیب دینے کے لئے ذکر نہیں فرماتے تھے۔ چونکہ جنریٹر ایک واقعی ضرورت تھی۔ اس لئے حضرت نے اس بارے مجھ سے کہا کہ ان صاحب کو تو معذرت لکھ دی ہے لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ خود کچھ بندوبست کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میں نے بہن سے قرض لینے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کی صورت نہ بن سکی، دعا فرمائیں کہ سبب بن جائے۔ اس کے بعد بندہ حضرت کے ساتھ بازار آیا، جنریٹر کی معلومات بھی کرنی تھیں اور سودا سلف بھی لینا تھا۔ ہم جن لوگوں سے سودا لیتے تھے وہ سارے قریبی دوست تھے۔ وہاں حاضر ہوئے تو دکان پر کئی دوستوں کا جمگھٹا تھا۔ سب حضرت کے ساتھ بڑے احترام سے ملے اور عرض کیا کہ حضرت! کیسے تشریف لائے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ گھر اور مدرسہ کا سودا خریدنا ہے اور آج کل جنریٹر کی ضرورت پڑی ہے اس کا پوچھنا ہے۔ اس پر تمام دوستوں نے گزارش کی کہ حضرت جنریٹر کتنے تک آجائے گا؟ فرمایا کہ اتنی قیمت کا تخمینہ ہے۔ یہ سن کر تمام احباب نے رقم جیبوں سے نکال نکال کر مجھے تھمانا شروع کردی اور اسی دکان میں اللہ تعالیٰ نے ساری رقم کا بندوبست فرمالیا۔ مجھے یہ سب دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس استغنا کا اثر نظر آیا جو آپ نے سیاسی رہنما کے رویے پر اختیار فرمایا تھا، یقیناً اگر علمائے کرام استغنا کا مظاہرہ فرمائیں تو یہ لوگ خود ٹوٹ کر مدارس کی خدمت کریں گے اور خود ہی ضروریات معلوم کر کے پوری کرنا اپنی سعادت سمجھیں گے۔

حضرت اقدس کا دوسرا وصف جس نے اس فقیر کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور آپ کی صحبت کی برکت سے اس کا عشر عشیر آپ کے چاہنے والے فقرا کو بھی ملا ہے، وہ آپ کا ''ذوقِ عبادت'' تھا۔ بندہ نے سفر و حضر میں کوئی ایسا موقع نہیں دیکھا کہ آپ رات بھر سوئے ہوں، بلکہ ہمیشہ رات کو مصلے پر پایا ہے۔ ایک بار ہم رات بارہ بجے سوات مظہر العلوم پہنچے۔ رات ایک بجے تک کھانا اور علماء کرام کی ملاقات سے حضرت نے فراغت پائی تو کوئی سوا ایک ڈیڑھ بجے مہمان خانے میں مجھ سے فرمایا کہ حاجی صاحب! آپ سو جائیں، طلبہ مسجد میں میرے منتظر ہیں، ذرا میں ان سے مل کر آتا ہوں۔ میں نے دل میں سوچا کہ حضرت آج تاخیر سے سوئیں گے اور تہجد کے لئے اٹھنا ممکن نہ رہے گا۔ میں ان شاء اللہ تعالیٰ آج ان سے بڑھ جاؤں گا۔ لیکن جب میں اٹھا تو آپ کو حسب سابق مصلے پر سربسجود پایا اور محسوس یہی ہوا کہ رات بھر نہیں سوئے۔ پھر آپ کی عبادت کا نظارہ کرنے والے بتا سکتے ہیں کہ کس سکون واطمینان اور خشوع وخضوع سے آپ ایک ایک رکن ادا فرماتے تھے۔

حضرت اپنے ساتھیوں کے مزاج کا خوب خیال رکھتے اور اگر کہیں احباب کے خلاف مزاج کوئی کام ہو جاتا تو ضرور اس کی تلافی فرماتے۔ ایک دفعہ خوست افغانستان کے سفر میں ہم حضرت کے جد امجد ''روحانی بابا'' کے قبر پر حاضر ہوئے۔ حضرت دیر تک مراقب رہے، نامعلوم کن انوارات کا مشاہدہ فرمایا کہ کچھ دیر بعد رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ واپسی پر قبر کے مجاور نے نمک اٹھا کر چکھنے کے لئے آگے کیا، میں نے لینے سے سختی سے انکار کیا، محترم قاری اقبال صاحب (ہشام) نے بھی نہیں لیا، جبکہ حضرت نے لے کر چکھ لیا۔ مجھے اس پر حیرت بھی ہوئی اور طبیعت پر اس کا اثر بھی ہوا۔ حضرت کے بعض تلامذہ مجھے ''پنج پیری'' کہہ کر چھیڑتے رہے۔ حضرت نے جب میری طبیعت پر اثر محسوس کیا تو مجھے بلا کر گلے سے لگایا اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا عمل درست تھا لیکن مروتاً مجھ سے انکار نہ ہو سکا اور میں نے مروت میں چکھ لیا تھا۔ غرض ہماری طبیعت کا اثر زائل فرمالیا تھا۔ حالانکہ وہ ہمارے مرشد تھے اگر چاہتے تو ہمارے رویے پر ہمیں ڈانٹ کر اپنی بات منوا سکتے تھے لیکن یہ باتیں تو حضرت کے مزاج سے بہت ہی دور تھیں۔

حضرت کی ایک نمایاں خصوصیت اپنے دوستوں اور متعلقین کی اصلاح کی فکر تھی۔ آپ اکثر اسفار میں اللہ والوں کے ہاں حاضری دیتے تھے اور ہمیں بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ میں بیسیوں بار حضرت مولانا فضل محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت کی معیت میں حاضر ہوا ہوں اور حضرت کی خدمت کا اللہ تعالیٰ نے موقع بھی دیا ہے۔ حضرت مولانا سراج الیوم صاحب (گڑھی سوات) کے پاس لے جا کر حضرت نے ہمیں بیعت کروایا۔ اس سفر میں بندہ نے حضرت سے یہ اشکال کیا کہ ''سبح للہ مافی السموات ومافی الارض'' کے عموم میں تو کفار بھی داخل ہوں

گئے؟ حضرت نے اس وقت اس کے بڑے علمی جوابات ارشاد فرمائے تھے لیکن افسوس عرصہ دراز گزرنے کے بعد وہ پوری طرح ذہن میں محفوظ نہیں۔ ہاں! جب گڑھئی باباجی کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ حضرت! ایک ساتھی نے یوں سوال کیا ہے؟ گڑھئی باباجی کا جواب مجھے اب بھی یاد ہے۔ فرمایا: کہ شاید کافروں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے انکار فرمایا تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ تم تسبیح کرو یا نہ کرو جو کچھ زمین وآسمان میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں۔

حضرت کو کتابوں سے جنون درجے کا عشق تھا، جب بھی ہم پشاور جاتے تو آپ ضرور کتابوں کی خریداری کرتے۔ ایک بار ایک کتاب ۳۳ ہزار میں خریدی، اس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ تھا، اس اثنا میں ایک تاجر وہاں آ گیا، اس نے مکتبہ والے سے کتاب مانگی، تو اس نے کہا کہ یہ تو مولوی صاحب خرید چکے ہیں۔ وہ حضرت کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ آپ جتنا چاہیں اس پر منافع لگا لیں، میں نے یہ کتاب اپنے مکتبہ کے لئے لینی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بھئی! میں نے یہ تجارت کے لئے نہیں اپنی لائبریری کے لئے لی ہے۔ آپ مجھے دوگنی قیمت دیں تب بھی میں بیچنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک بار مدرسہ میں دوسرے چھت پر کچھ تعمیر کرنے کا ارادہ ہوا، مجھ سے کہا کہ حاجی صاحب! طلبہ کی تعداد بڑھ گئی ہے، کچھ کمروں کی ضرورت ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ چھٹیوں میں تعمیر کریں گے۔ اب بظاہر اسباب بالکل میسر نہ تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ حضرت نے عزم تو کر لیا ہے لیکن رقم کہاں سے آئے گی؟ بظاہر تو کوئی امکان نہیں۔ پھر انہی دنوں ہم پشاور میں ایک تعزیت پر گئے، وہاں ایک صاحب نے آ کر حضرت کو ایک خطیر رقم حوالے کی کہ یہ مدرسہ کے لئے کئی دنوں سے علیحدہ کر رکھی ہے، شکر ہے آپ حضرات سے ملاقات ہو گئی، حضرت نے گنے تو پچاس ہزار روپے تھے۔ یہ ۱۹۸۶ء کا واقعہ ہے، اس وقت کے حساب سے یہ رقم اس تعمیر کے لئے کافی تھی۔ حضرت نے فرمایا: بھئی! یہ تو بہت زیادہ ہے، آپ اس میں سے کچھ لے کر دوسرے مدرسے کو دے دیں۔ انہوں نے باصرار عرض کیا کہ حضرت! دیگر مدارس کے لئے اپنا حصہ علیحدہ کر چکا ہوں اور یہ مدرسہ یوسفیہ کے لئے ہے۔ مدرسہ چلانے کے دوران کبھی خود چندہ کی اپیل نہیں کی لیکن نصرت خداوندی کے ایسے مناظر بندہ نے بار بار دیکھے۔

حضرت اقدس کی ایک اور نمایاں اور سب سے اہم خصوصیت آپ کی تمام علوم وفنون میں کامل مہارت تھی۔ بندہ عالم دین نہیں، لیکن بزرگوں کی صحبت سے جو کچھ سیکھنے کی توفیق ہوئی ہے اس کی روشنی میں حضرت کی علمی باتیں الحمد للہ مناسبت کی وجہ سے کبھی اوپری اور اجنبی معلوم نہیں ہوئیں۔ اگر حضرت تفسیر پر بولنا شروع کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ انہوں نے ساری زندگی تفسیر کے مطالعہ میں خرچ کی ہے۔ اگر حدیث پر بات کرتے تو ایسے لگتا کہ شب وروز کا اوڑھنا بچھونا حدیث کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کسی فقہی مسئلہ کی تشریح کرتے تو اندازہ ہوتا کہ ساری عمر فقہ کی خشک

وادیوں میں محو سفر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے طب پر گفتگو کرتے سنا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ فن بھی ان کی عمیق نگاہوں کا بار ہا شکار رہا ہے۔ آپ کی یہ علمی عبقریت دراصل مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی اس نسبت کا اثر ہے جو حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے آپ کو منتقل ہوئی۔

حضرت اقدس کا ایک اور نمایاں وصف کسی کا احسان اپنے ذمے نہ لینا تھا۔ مجھے اپنی طویل رفاقت میں کہیں یاد نہیں کہ آپ نے اپنے ذمے کسی کا احسان باقی چھوڑا ہو، بلکہ احسان کرنے والوں پر اتنے احسانات کر جاتے کہ وہ ساری عمر کے لئے زیر بار رہ جاتے۔ حضرت کے مجھ پر جتنے احسانات ہیں میں ان کی مکافات کے لئے ساری عمر ان کے پاؤں دھوتا تو بھی نہ کر پاتا۔ لیکن ایک ادنیٰ خدمت کی نیت سے ایک بار حضرت کے لئے گاڑی خرید کر ہدیہ میں دینے کی کوشش کی، تا کہ حضرت کے اسفار وغیرہ میں سہولت ہو۔ لیکن آپ نے اپنی ملکیت میں لینے سے انکار فرمایا۔ ہم اسفار کے لئے اسے استعمال کر لیتے تھے، لیکن میری چاہت یہ تھی کہ حضرت اسے اپنی تحویل میں لے کر مستقل قبول فرمالیں۔ لیکن حضرت نے یہ شرف نہ بخشا۔ میں نے عزیزم مفتی عدنان کاکاخیل سے بھی سفارش کروائی لیکن حضرت نے کچھ اعذار بیان کر کے بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال دیا۔ حالانکہ ہماری باہمی قربت اتنی تھی کہ اگر بلا اجازت بھی ایک دوسرے کی چیز استعمال کرتے تو یقین تھا کہ جانبین سے خوشی ہی ہوتی۔

حضرت اقدس کے مزاج میں خشکی بالکل نہ تھی۔ وقار اور سنجیدگی ضرور تھی اور اس کی وجہ سے ساتھیوں پر ان کا ایک رعب بھی رہتا تھا لیکن مزاح بھی فرماتے تھے۔ ایک بار ہم بشام کے سفر میں ایک پہاڑی پر چشمے کے پاس وضو کے لئے رکے۔ میں ذرا دور اوپر جنگل میں قضائے حاجت کے لئے چلا گیا، وہاں میں نے ایک بوٹی دیکھی جو گردے کی پتھری کے لئے بڑی مفید ہوتی ہے۔ انہی دنوں حضرت کو گردے کی تکلیف تھی، میں نے جلدی جلدی حضرت کے لئے وہ بوٹی توڑ کر اکھٹی کرنی شروع کردی۔ اس اثنا میں حضرت نے دو تین بار ''او حاجی صاحب'' کی آواز دی، لیکن میں اس لئے جواب نہیں دے رہا تھا کہ بوٹی ذرا زیادہ جمع ہو جائے ورنہ نیچے بلالیں گے۔ جب حضرت کو دو تین بار آواز پر جواب نہ ملا۔ تو زور سے آواز لگائی: ''او بے ہودہ'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''جی ہاں'' اس پر حضرت اور دیگر ساتھی دیر تک ہنستے رہے کہ ''حاجی'' پر تو کچھ نہیں بولا اور ''بے ہودہ'' پر فوراً بول پڑا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے زندگی میں کوئی کام حضرت کے مشورے کے بغیر کیا ہو، حتیٰ کہ بکری خریدنے کا مشورہ بھی حضرت سے کیا کرتا تھا۔ میری والدہ کو علماء سے بڑی عقیدت تھی جب حضرت ہمارے گھر تشریف لاتے تو والدہ بہت ضعیف تھی۔ لیکن اٹھ کر دیوانہ وار ہاتھ اٹھا لیتی اور خوشی سے گھر کا چکر کاٹ کر زور زور سے یہ دعا کرتی۔ یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے بچوں کا تعلق علما سے ہے اور میرے گھر میں اتنے بڑے عالم تشریف لائے ہیں، پھر آ کر

اوٹ سے حضرت کو سلام کرتی، دعا دیتی اور دعا کی درخواست کرتی۔ جب ان کے انتقال کا وقت قریب ہوا اور نیم بے ہوشی کی حالت تھی تو اچانک ہاتھ آگے کو بڑھا کر مٹھی بند کر لیتی، کبھی مسکرا دیتی، گھر کی خواتین افاقہ ہونے پر پوچھتیں کہ یہ کیا کرتی ہو؟ تو کہتی کہ دیکھو! کتنے خوبصورت پھول ہے انہیں توڑتی ہوں۔ یا کہتی کہ کتنا خوبصورت پانی اور سبزہ ہے اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ جب میں نے حضرت سے یہ سارے احوال ذکر کیے تو آپ نے فرمایا کہ یہ ان کے خاتمہ بالخیر کی نشانی ہے۔

میری طبیعت پر طبعی طور پر حضرت اقدس کی مسکراہٹ کا عجیب اثر پڑتا، آج ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ یاد آتا ہے اور تصور میں بستا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ آپ کی زندگی میں بھی آپ کی مسکراہٹ سے میرے دل کے اندر ایک عجیب کیفیت اور سرشاری پیدا ہوتی جسے میں الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔

میری عقیدت ومحبت کا محور تو حضرت اقدس کی ذات تھی، اس لئے قلبی رجحان اور جھکاؤ ہمیشہ آپ کی طرف رہا، اس لئے دلی تمنا بھی یہی رہی کہ اصلاحی تعلق بھی حضرت ہی سے قائم ہو، لیکن کبھی اس بارے میں عرض کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ حضرت نے جہاں بھی بیعت کا حکم دیا، میں بیعت تو کر لیتا لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا کہ گویا مجھے فیض حضرت ہی سے ہو رہا ہے۔ ایک بار مولانا ظفر احمد صاحب نے مجھے حوصلہ دیا کہ آپ حضرت سے بیعت کی درخواست کریں۔ میں نے عرض کیا: کیسے کروں؟ اتنے بڑے بڑے علما آتے ہیں حضرت ان کو بیعت نہیں فرماتے، تو ہماری کیا حیثیت ہے۔ لیکن ان کا پیہم اصرار جاری رہا، شاید راستہ کھولنے کی ساتھیوں کو حرص تھی۔ ایک سفر میں بندہ حضرت کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ ایک دو دفعہ میں نے درخواست کی نیت کی لیکن بات گلے میں آ کر اٹک جاتی اور زبان کانپنے لگتی، حضرت نے بھانپ لیا کہ یہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن سہار نہیں ہے۔ آپ اخبار پڑھ رہے تھے سر اٹھا کر فرمایا کہ حاجی صاحب! کچھ کہنا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! اگر آپ مجھے اصلاح کے لئے کچھ تعلیم فرما دیں اور اصلاحی تعلق کے لئے قبول فرما دیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ حضرت نے میری درخواست قبول فرمائی اور مندرجہ اوراد واذکار اور معمولات تعلیم فرمائے:

(۱)...... تہجد میں سورہ فتح اور سورہ نصر پڑھنا۔ (۲)...... فجر کے بعد سورہ یسین کی تلاوت۔

(۳) سورۂ فجر، زلزال اور چہار قل صبح وشام۔ (۴)...... ایک پارہ تلاوت یومیہ۔

(۵)...... تیسرا کلمہ ایک تسبیح صبح وشام۔ (۶)...... سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم ایک تسبیح صبح وشام۔

(۷)...... حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ ایک تسبیح یومیہ۔ (۸)...... درود پاک۔ ۳۰۰ بار یومیہ

(۹)...... استغفار۔ ۳۰۰ بار یومیہ۔ (۱۰)...... لا الہ الا اللہ۔ ۳۰۰ بار یومیہ۔ ہر ۱۰۰ پر "محمد رسول اللہ" ملانا۔

(۱۱) بعد از نماز مغرب سورۂ واقعہ۔(۱۲) بعد از نماز عشاء سورۂ ملک وسورۂ رحمن

بحمد اللہ اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو ان معمولات کی توفیق بخشی ہے۔ہم تو نااہل تھے نہ اتنا ظرف تھا اور نہ اتنی ذہنی سطح کہ حضرت سے کما حقہ مستفید ہوتے کیونکہ آپ کے علم وتقویٰ کا معیار بہت اونچا تھا۔

آپ کی شہادت ہمارے لئے قیامت کا منظر تھا،ہنگو کا ہر سنی آپ کی شہادت پر غمزدہ تھا۔گھروں میں ایسا صف ماتم بچھا ہوا تھا جیسے ہر گھر سے جنازہ اٹھا ہو،حضرت اقدس کے بعد اب زندگی پھیکی پڑ گئی ہے،بس اس انتظار میں ہیں کہ کب بلاوا آئے اور محبوب کے قدموں تک پہنچ جائیں ....کہ بس یہی ایک تمنا یہی آرزو ہے۔

اخلاص کا پیکر مجسم

مولانا بلال احمد،کراچی

یہ دل گداز خبر اب پرانی ہو چکی ہے کہ علماء سلف کا ایک اہم ستون اور بنوری صاحب کی یادگار مولانا محمد امین اورکزئیؒ ہمیں داغ مفارقت دے کر ایک سانحے میں شہید ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے،لیکن اس خبر کی تلخی آج بھی محسوس ہوتی ہے۔حضرت مولانا امین صاحب ان نفوس قدسیہ میں سے تھے،جن کا وجود بہت سے فتنوں کے لئے آڑ بنا رہتا تھا۔اس قحط الرجال کے زمانے میں آپ کے تصور سے ہی قلب کو تسکین ہوا کرتی تھی۔علمی حلقوں کے لئے حضرت کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔وہ ان علماء حقانی میں سے تھے کہ جن کو دیکھنے سے خدا یاد آئے۔ان کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ادراک ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے،لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت استاذ صاحب کے

پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، ان کے نقوش دل و دماغ سے محو نہیں ہوسکتے۔

حضرت استاد صاحب مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے اور اللہ نے حکمت دین کی جو معرفت حضرت بنوری صاحب کو عطا فرمائی تھی، اس دور میں حضرت ہی ان کے تنہا وارث تھے، اور بنوری صاحب کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج و مذاق میں جذب کر کے انہیں شرح وبسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا ان میں حضرت امین صاحب کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ پاکستان کے علما میں ان کی ذات اس وقت ایسی تھی کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے لوگ بھی ان کے علم وفضل، تقدس وتقویٰ، جہد وعزیمت اور خصوصاً حسن اخلاق، لوگوں کے ساتھ برتاؤ اور ادب کے نہ صرف معترف بلکہ اس کے آگے سر بہ خم تھے۔

ان کی مثال ایسے گھنے اور سایہ دار درخت کی سی تھی، جس کی چھاؤں میں امت کے تمام افراد اور خصوصاً اہل علم ودین کو آغوش مادر کا سا سکون وسرور میسر آتا تھا اور آج پوری علمی ودینی برادری اس عظیم سایہ سے محروم ہوگئی اور ملت کا یہ سہارا چھن گیا۔

چنانچہ وطن عزیز کے ممتاز علما ومشائخ سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل علمی مسئلے کے حل کے لئے حضرت ہی سے رجوع فرمایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب فرما رہے تھے کہ مجھے ایک نحوی مسئلے میں کوئی اشکال پیش آیا تو مختلف کتابوں اور متعدد علما کی طرف رجوع کرنے کے بعد بھی وہ اشکال حل نہیں ہوا، لیکن حضرت استاذ صاحب کی خدمت اقدس میں حاضری ہوئی تو تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ان اشکالات کے جوابات ایسی خوش اسلوبی اور صاف وواضح الفاظ میں دیے کہ تمام اشکالات پانی پانی ہوگئے۔

انہوں نے علم کی تحصیل اور دین کی تبلیغ میں جو مشقتیں اٹھائیں اور جن حضرات کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے اور جن کے کردار وعمل کو اپنی عملی زندگی میں جذب کیا، ان کے دل نشین تذکرے حضرت مولانا محمد یوسف جو ان کے لائق فرزند ارجمند ہیں، اکثر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی ہر بات اور ہر عمل ہمارے لئے عبرت اور موعظت کا سرمایہ معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو یوں تو سارے ہی علوم میں مہارت عطا فرمائی تھی، لیکن خاص طور پر علم حدیث کے ساتھ آپ کا تعلق اور اشتغال اس درجے تھا کہ تمام حلقوں میں جہاں بھی علم حدیث کے حوالے سے کوئی اشکال یا مسئلہ درپیش ہوتا تو اہل علم کی نگاہیں ان کی طرف اٹھتیں اور آپ کے سوا کسی اور کی طرف ذہن جاتا ہی نہ تھا۔

حضرت نے تصنیف وتالیف کے میدان میں متنوع خدمات سرانجام دیں، نثر الازھار علی شرح معانی الآثار اور

مسانید الامام ابی حنیفہ اس کا بین ثبوت ہیں۔ اہل علم کو ہی پتہ چل سکتا ہے کہ ان کتابوں میں حضرت نے کتنے موتی اور جواہر بکھیر دیے ہیں۔ ملک کے مایہ ناز اور ممتاز مدرسہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تحقیق حدیث کے حوالے سے آپ کی خدمات اور مساعی جلیلہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہیں اور دنیا ان کی خدمت کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھے گی۔ علم وفضل کے اس مقام بلند اور عظیم خدمات کے باوجود ان کی شخصیت ایسی تھی کہ تکبر اور عجب کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ سادگی، بے تکلفی، تواضع اور قنائیت کا ایسا پیکر جمیل کہ اللہ اکبر! اپنے سارے مقامات عالیہ کے باوصف چھوٹوں اور احباب کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے کہ کوئی شخص پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے، جن کی علمی خدمات کے احسان سے کئی اہل علم کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں، بسا اوقات لمبے اسفار اور مختلف شہروں میں چکر لگانے کے باوجود بھی وہ وہاں کے اپنے ساتھیوں اور معتقدین کو فون گوارا نہیں کرتے تھے تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور دنیا کو پتہ نہ چلے کہ کون آیا تھا اور کون گیا ہے۔

ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ جنہیں ''فنا فی العلم'' کہا جا سکے اور جن کی نشست و برخاست سے لے کر سوچ و بچار کا محور علم ہی علم ہو، مادہ پرستی کے اس دور میں علم محض ایک ذریعہ معاش ہو کر رہ گیا ہے، جس کا تعلق پیسہ کمانے سے ہے، ذاتی دلچسپی سے نہیں۔ اس علمی کساد بازاری کے دور میں اگر کوئی شخص ایسا نظر آتا ہے جو علم کی حقیقی اور واقعی تڑپ رکھتا ہو، تو وہ حضرت استاد صاحب ہی تھے، یہی ان کا خاصہ تھا کہ جو بھی ملاقات کے لئے آتا تو محض ملاقات ہی میں حضرت سے ایسے نایاب گوہر حاصل کرتا جو اس کے لئے مشعل راہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ایسی گہری نظر اور ذوق سلیم سے نوازا تھا کہ تدریس کرتے یا کتاب پڑھاتے وقت جب تک مسئلہ حل نہ ہوتا وہاں سے ایک لفظ بھی آگے نہ پڑھتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہدایہ پڑھانے کے دوران ایک اشکال پیش آ گیا، تو حضرت نے مختلف کتابوں کی طرف مراجعت کی، لیکن وہ حل نہیں ہوا پھر مزید تلاش وجستجو میں لگے رہے، یہاں تک کہ تین دن بعد وہ اشکال حل ہوا۔ پھر درسگاہ میں آنے کے بعد فرمانے لگے کہ اگر یہ اشکال حل نہ ہوتا تو زندگی بھر کے لئے ہدایہ کی تدریس چھوڑ دیتا، یہ ان کی غایت درجے کی احتیاط تھی، پھر فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل ہی نہیں سمجھتا۔ اتنی کوشش شاید اس دور میں ہم جیسے مدرسین کے لئے نایاب ہو گی۔

وقت کی قدر و قیمت نے آپ کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے، نہایت ہی مختصر عرصے میں آپ تن تنہا ایک پوری جماعت کا کام کر کے سینہ پر شہادت کا تمغہ سجانے اس دار فانی سے دار بقا کی جانب روانہ ہو گئے اور بعد والوں کے لئے نمونہ بن گئے۔ چنانچہ ایسے مشکل وقت اور مشکل حالات میں مدرسہ کی بنیاد ڈالی کہ اس کا حقیقی معنوں میں ادراک اور اندازہ تو وہاں کا رہائشی ہی کر سکتا ہے کہ ہنگو جیسے شہر میں اور پھر دیہات میں جو بالکل جنگل تھا، ایسے مدرسہ

کی بنیاد رکھنا کیسے ممکن ہوا ہوگا، جہاں رہائش کا تصور تو درکنار لوگوں کا آنا جانا بھی بہت کم ہوتا تھا، بلکہ وہاں تک جانا پہاڑوں کے ذریعے سے ہوتا تھا، چونکہ راستہ پر خطر ہوتا تھا تو حضرت نے علامت کے طور پر اپنے مدرسے پر سفید جھنڈی لگائی تھی، تاکہ کسی گزرنے والے کو اندازہ ہو جائے کہ یہاں ایک مدرسہ ہے اور اب اللہ کے فضل وکرم سے وہی جگہ مرجع الخلائق بن گئی، پاکستان بھر سے لوگ وہاں فیض حاصل کرنے جاتے ہیں، چنانچہ پچھلی مرتبہ جب مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب ہنگو میں جامعہ یوسفیہ تشریف لائے تو حضرت استاذ صاحب کی قبر پر حاضری کے بعد فرمانے لگے کہ میری نظر سے سے آج تک گیارہ قبریں گزری ہیں جو کہ پرنور تھیں، ان قبروں میں سے ایک یہ قبر بھی ہے، جن سے نور کی شعاعیں اٹھتی ہیں۔

کراچی سے تشریف آوری کے بعد جامعہ یوسفیہ جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام کی ذمہ داریاں کندھوں پر آ گئیں۔ ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل سے دور کر کے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں، لیکن حضرت استاد صاحب کا معاملہ اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھا، انتظامی مسائل میں مصروف رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور ان کی علمی استعداد سدا بہار رہی۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب جمعرات کو طلبہ گھروں کو جاتے تو حضرت استاد صاحب طلبہ کو بذات خود بازار تک چھوڑتے اور وہاں سے پھر اکیلے آتے تھے، راستے میں حضرت استاد صاحب کسی طالب علم سے کسی کتاب کے متعلق گفتگو شروع کرتے اور سارے راستے پر یہی علمی گفتگو جاری رہتی۔ ایسی مفید باتوں سے طلبہ کو آراستہ کرتے جو سال ہا سال کے مطالعوں سے دستیاب نہ ہوتیں۔ حضرت استاد صاحب طلبہ اور چھوٹے علما کی حوصلہ افزائی اس انداز سے فرماتے کہ جب کوئی ملنے آتا تو حضرت ان کی تحقیقات ایسے غور سے سنتے، بولنے والا یہ سمجھتا کہ شاید یہ مسئلہ حضرت کی نظر سے نہیں گزرا ہو گا، حالانکہ حضرت استاد صاحب اس مسئلے سے بخوبی آگاہ اور واقف ہوتے تھے۔

حضرت استاد صاحب کی شہادت کے بعد ان کے لائق فائق تربیت یافتہ خلف الرشید فرزند ارجمند، انتہائی متواضع سادہ مزاج، بے لوث خدمت گار مولانا محمد یوسف صاحب نے اپنی توجہات کا مرکز اسی مدرسے اور پورے ہنگو کے علما اور عوام کو بنایا، اپنی جدوجہد کے نتیجے میں ہنگو کی کئی مساجد اور مدارس ان کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں چل رہے ہیں، مجھے کئی بار دورہ عربیہ پڑھانے کی غرض سے وہاں جانا ہوا اور یہ دیکھ کر دل بہت متاثر ہوا کہ دین کے کام پھیلانے کی خاطر مولانا نے اس ویرانے میں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے اور مخالفین کی ہمہ جہتی سازشوں کا نشانہ ہونے کے باوجود پورے عزم اور استقامت کے ساتھ اپنے مرکز میں ڈٹے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی مخلصانہ کوششوں میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ آج ہنگو جیسے شہر میں وہی مدرسہ اپنے آب وتاب کے ساتھ اسی طرح قائم ہے

اور مرجع الخلائق بنا ہوا ہے جیسا حضرت الاستاذ کے دور میں تھا۔

حضرت استاد صاحب کی جگہ منصب اہتمام کوئی معمولی ذمہ داری نہ تھی، لیکن یوسف صاحب نے اس عرصے میں اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا، اس دوران نہ جانے مدرسے پر کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن مولانا نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا اور اپنی ساری زندگی مدرسہ کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ سخت سے سخت مرحلوں میں بھی انہیں پرسکون دیکھا۔ ورنہ حضرت کا سانحہ مدرسہ کے لئے اور منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن یوسف صاحب نے تمام طوفانی ہنگاموں کو مات کردیا اور مردانہ وار مقابلہ کیا، مجھے حضرت استاد صاحب کے تمام حالات وواقعات سے واقفیت تو نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور بتا سکتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹوں میں تواضع، حسن اخلاق اور عظیم صفات ودیعت رکھی ہیں تو حضرت استاد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کتنی اعلیٰ صفات سے نوازا ہوگا، ہم جیسے نالائق ان کا ادراک تو درکنار تصور بھی نہیں کرسکتے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی قبر کو نور سے بھردے اور ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

ایک بدعت شکن رہنما

حاجی عبدالمالک اورکزئی، ہنگو

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
ہمیں بھی یاد کرلینا چمن میں جب بہار آئے

مجھ بے علم اور سیہ کار کو ان مقدس ہستیوں پر لب کشائی کرنا زیب نہیں دیتا ہے۔ "کیا پدی کیا پدی کا شوربہ" کے مصداق کہاں میں اور کہاں ان مقدس ہستیوں کی عزت وعظمت، دبدبہ وحشمت، رشد وہدایت کے احوال تحریر کرنا۔ لیکن تعمیل ارشاد میں چند کلمات نذر قرطاس کرتا ہوں۔ ہمارے علاقے اورکزئی ایجنسی اور ہنگو کے دو درخشاں ستارے تھے، حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ۔ صلاح وفلاح اور اخوت و

الفت کے سرچشمے، دریائے علوم ومعارف، اشاعت وتحفظ دین کے علم بردار، بدعت شکن رہنما، رسم ورواج کے ماحی اور باغیچہ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشے ...... جہاں ایک کا ذکر خیر کیا جائے تو دوسرے کا ذکر خود بخود لب بام ہوتا ہے۔ جہاں حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ کے بحر ذخار علم وفراست کا ذکر ہو، وہاں حضرت مولانا شیخ الحدیث عبداللہؒ کی جرأت وقوت فیصلہ اور وحدت ملت کی مساعی کا ذکر لازمی سمجھتا ہوں۔ عرف عام میں لوگ ان مقدس ہستیوں کو شیخین مرحومین کہتے ہیں۔ چونکہ سردست شہید ملت ودین مولانا محمد امین کا ذکر مطلوب ہے۔ اس لیے ممدوح کے متعلق اپنی عدم اہلیت کی بنا پر اختصار کے ساتھ اپنے وہ مشاہدات تحریر کروں گا جو مجھ جیسے بے بصر، بے علم اور کم فہم کے دل ودماغ پر ثبت ہیں، اصل نقشہ حیات تو وہی حضرات پیش کر سکیں گے جو ہمیشہ طالب علم بن کر یا صحبت میں رہ کر فیوض اور برکات سے مالا مال ہوتے تھے اور آپ کی نورانیت کے چشمہ ہائے صافی سے سیراب ہوتے تھے۔

ابتدائی دنوں میں جب شہید ملت ودین مولانا مرحوم کراچی میں شعبہ تدریس سے وابستہ تھے تو لوگ ان کا صرف نام سنتے تھے، لیکن جب یہاں علاقے میں آ کر اقوام اور عوام کی دین سے لاپرواہی بلکہ استخفاف، فسق وفجور کا شیوع، ضلالت وجہالت، بے جا دشمنیاں اور بے معنی قتل وقتال دیکھ کر محسوس کیا کہ کراچی کے عوام سے زیادہ مجھ پر اپنی ان اقوام کا حق ہے جو دین کے پیاسے ہو کر بھی تشنہ لب ہیں تو ایک مخصوص انداز میں تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا سلسلہ جاری رکھنے کیلئے ایک دینی درسگاہ جامعہ یوسفیہ کی بنیاد رکھی۔ مرحوم شہید کا علم دین کے ساتھ خصوصی لگاؤ اور شغف، انہماک، اللہ کی ذات پر یقین محکم اور ایمان کامل کا اندازہ اس سے عیاں ہے کہ انتہائی افلاس وناداری، غربت ومسکنت، فقر وخواری میں مبتلا طلبہ اور عوام کو وظیفے کے چکر سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے پلنے کا درس دیا۔ ایک طرف مولانا کی کمزور معیشت اور دوسری طرف مدرسہ کے اخراجات اور مصارف دیکھ کر ناواقفیت کی بنا پر ہم جیسے ناسمجھ لوگ یاس وبراس میں گرے ہوئے نظر آتے تھے کہ یہ مدرسہ مالی انحطاط کے سبب آج نہیں تو کل ضرور بند ہوگا۔ مولانا کے پاس نہ افرادی قوت تھی، نہ زر ودولت، نہ شان شوکت تھی، نہ حکومت وسیاست، نہ دنیاوی تدابیر تھیں اور نہ شستہ تقاریر...... صرف اور صرف مالک ارض وسماء، خالق جل وعلا پر اعتماد رکھ کر علم دین کے دریا اور حفظ القرآن کے چشمے بہا دیئے۔

مولانا مرحوم نے اپنی مصروفیت صرف درس وتدریس تک محدود نہ رکھی، روزمرہ کے حالات پر گہری نظر رہتی، لوگوں کی معیشت ومعاشرت، تہذیب وتمدن اور گھریلو رسم ورواج سے واقف تھے، اس میں خرابیوں کی اصلاح کے لیے سرگرم رہتے تھے۔ صلہ رحمی اور علاقائی تعلقات قائم رکھنے میں بے نظیر تھے۔

ہمارے علاقہ میں بہت سے لوگ بدعات کو دین سمجھ کر اس کھائی میں گر چکے تھے، آپ نے ان سب باتوں کا

بنظرِ عمیق مشاہدہ کیا اور سمجھ گئے کہ ہمارے جگر گوشے نئی تہذیب کے دلدادے اسلام کے مقدس اصولوں کو چھوڑ کر رسم ورواج اور دین کے نام پر بدعات میں بری طرح پھنس چکے ہیں تو ایسے ماحول میں خاموش بیٹھنا اور عملی جدوجہد نہ کرنا علما کیلئے نا قابل تلافی جرم ہے۔ مولانا نے شیخ الحدیث عبداللہ صاحبؒ سے مشورہ کر کے عملی جدوجہد کے لیے کمر کس لی۔ ابتدائی دنوں میں بہت کم لوگوں نے رفاقت کی۔ ہم جیسے عمر بھر کی زندگی بدعات پر گزارنے والوں کو شیخین کی فرمودات عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں۔ بات بات پر لوگ تنقیدی نظر ڈالتے تھے۔ ان کے بتائے ہوئے شریعت مقدسہ کے اصولوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں کو عوام نا قابل عمل گردانتے تھے، ایجنسی کے بالائی علاقہ تیراہ میں شادیوں کو لغویات اور اموات کی تجہیز وتکفین کی رسومات پر جھگڑے ہونے لگے تھے جہاں بھی اختلافات سامنے آتے، لوگ بے خبری اور دین سے اجنبیت کی سبب ان دو ہستیوں کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ اختلافات کے سبب دین دار لوگ بھی ان حضرات کو اخفا (خاموشی) کے مشورے دیتے رہے۔ لیکن یہ مردِ حق اور مردِ میدان کہتے تھے کہ لوگوں کی واہ واہ سے کچھ بنتا نہیں اور لوگوں کے لعن طعن سے کچھ بگڑتا نہیں۔ اور کہا کہ جس نے اللہ کیلئے لوگوں کو ناراض کیا تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس شخص سے راضی بلکہ خوش کریں گے اور جس نے لوگوں کو خوش کرنے کیلئے اللہ کو ناراض کیا تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی اس شخص سے ناراض کریں گے۔ حضرت کی یہ بات اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن اب دیکھ رہا ہوں کہ وہ لوگ جو حضرت سے اختلاف رائے رکھتے تھے اب ان کے نام لیوا بن گئے ہیں، جو مخالفت پر اتر آئے تھے اب تعریف کر کے تھکتے نہیں ہیں۔

شہید ملت حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ جب مشتی میلہ (اورکزئی ایجنسی کا ایک علاقہ) قدم رنجہ فرماتے تھے تو طلبا اور عوام کا جم غفیر بن جاتا تھا۔ آپ ہر عام وخاص کی نظر میں عزت کے منتہا کو پہنچے ہوئے تھے، آپ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہر کسی سے فرداً فرداً ملتے تھے۔ مولانا شعلہ بیانی اور شستہ تقاریر اور خودنمائی سے انتہائی اجتناب کرتے تھے، لیکن جب بولتے تھے تو زبان سے موتی بکھیرتے تھے۔ میں کئی سال پہلے کے مخالفانہ حالات اور آپ سے لوگوں کی موجودہ محبت کو دیکھ کر سوچتا رہتا تھا کہ انسان کی سرفرازی اور سربلندی، عزت اور عظمت، شان و شوکت، برتری وخوبی انسان کی صفت ایمان کے ساتھ اللہ کی رضا میں مضمر ہے۔ چونکہ آپ ریا سے اجتناب کرتے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے متلاشی رہتے اور ایمان کامل کی اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے واسطے مخالفین تک کے قلوب مسخر کر دیئے تھے۔

مرحوم حضرت مولانا محمد امین صاحب کم گو اور خاموش طبع انسان تھے، ہر سوال کا جواب قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے عجیب قوت حافظہ دی تھی، سال پہلے پوچھے گئے سوال کا سال بعد بھی وہی

جواب دیتے، جس میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں ہوتا تھا۔ کلام میں نہایت نرمی تھی لیکن وزن اور حجم کے لحاظ سے بہت بھاری اور فطانت اور فہم کے لحاظ سے بہت گہرے جملے بولتے تھے۔ تکلفات کے عادی نہیں تھے، ملنے والے کو بغیر کہے خوشی محسوس ہوتی تھی، اگر سوال کا جواب نفی میں ہوتا تو اتنا مدلل جواب دیتے کہ پوچھنے والا تسکین قلب پا کر رخصت ہوتا۔

انتہائی صلہ رحم تھے، ہمیشہ قطع رحمی پر وعید سناتے تھے، جب بھی تدریس کے مشاغل سے فارغ ہوتے، یا عیدین کا موقع ہوتا تو اپنے رشتہ داروں اور خاندان والوں سے ملنے مشتی میلہ تشریف لاتے تھے۔ آپ مدرسہ صدیقیہ میں جلوہ افروز ہوتے، سینکڑوں لوگ زیارت کیلئے مجتمع ہوتے تھے، آپ کے مدرسہ سے فیض یافتہ علما، حفاظ اور عوام اظہار عقیدت کیلئے اپنے پاس قیام کی مؤدبانہ التجا کرتے تھے، آپ ہر کسی کو نہایت بشاشت کے ساتھ صلہ رحمی کا حق مقدم بنا کر خاندان والوں کو ترجیح دیتے تھے، کسی کیلئے بھی دل میں کدورت نہیں رکھتے تھے، اور عفوو درگزر ان کا شیوہ تھا۔

آپ کے اوصاف جلیلہ سے تو بندہ بخوبی واقف تھا لیکن آپ کے دریائے علم کا مجھے صحیح ادارک نہ تھا، میں آپ کو ایک عام عالم دین سمجھتا تھا۔ آپ کے بحر العلم ہونے کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا، جب اردن کے تبلیغی سفر میں مجھ سے کراچی کے مدارس سے فارغ التحصیل علما ملتے، ان کی زبان سے حضرت مولانا شہید ملت کا ذکر خیر سنا۔ وہ آپ کی تدریسی خدمات، تحقیقی کاوشوں اور منفرد درسی انداز کو بہت سراہتے تھے۔ بعض تو ان کی محبت میں ان کے گھر شاہووام تک بھی آئے تھے۔ انہوں نے اپنے استاذ محترم کے اعزاز میں ہمارا بہت اکرام کیا اور اکثر ہماری نصرت کرتے رہتے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ تو عالمی سطح کے عالم ہیں۔

اسرائیل کے شہر ایلات کے ساتھ بحیرہ احمر کے کنارے اردن کی بندرگاہ ہے۔ اسرائیل نے اب یہ بندرگاہ تقسیم کر کے اپنے بحری جہاز بھی کھڑے کیے ہیں، اس کے کنارے اردن کا بڑا شہر عقبہ ہے، اس عقبہ شہر میں بحیرہ احمر کے کنارے ایک عجائب گھر ہے جس میں صرف مچھلیاں اور سمندری جانور ہوتے ہیں۔ ایک مولانا ہمیں ادھر لے گئے تو راستے میں گاڑی میں استاذ محترم حضرت مولانا محمد امین کا تذکرہ شروع کیا اور عجیب انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ اس کو ہنگو کے ایک ایک مقام کا نام یاد تھا۔ وہ ہم سے مل کر خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا، صرف حضرت کے علاقہ کی نسبت کی وجہ سے انہوں نے ہمیں اتنا اعزاز دیا کہ ہم حیران رہ گئے۔ اس نے حضرت کے بارے میں ہمیں وہ کچھ بتایا جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ جیسے امام زین العابدین کی وفات کے بعد لوگوں کو ان کی غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور دادرسی کا پتہ چلا تھا، تو اسی طرح اس عالم کی مردم شناسی سے ہماری بھی شہید مرحوم کے ساتھ قلبی عقیدت

پیدا ہوئی۔ سفر سے واپسی پر ہم نے سب سے پہلے استاذ محترم کی زیارت کی اور اردن کے علما کے احوال سنائے اور ان کا سلام پہنچایا تو بہت خوش ہوئے۔

پھر ایک وہ دن بھی آیا کہ مشتی میلہ میں اعلان ہو گیا کہ مولانا محمد امین استاد شہید ہو گئے، ہر گھر ماتم کدہ بن گیا۔ بوڑھے جوان سب جنازے میں شرکت کیلئے تیراہ سے ہنگو روانہ ہوئے، قافلوں کی شکل میں لوگ شہید کی ایک جھلک دیکھنے امڈتے چلے آرہے تھے، لیکن جب ہمارے قافلے پہنچے، تو شہید ملت دفن ہو چکے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

محبوبیت کے مرتبہ پر فائز

ملک آصف اورکزئی، ہنگو

کروں ابتدا میں کہاں سے الٰہی
تمنائیں ہیں دل میں انتہا کی

بندہ ناکارہ حضرت شیخ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ کے بارے میں کچھ لکھنے سے حقیقتاً نا اہل ہے، اپنی جہالت اور بے مائیگی کا خوب یقین ہے۔ اور "یہ منہ اور مسور کی دال" کے مصداق کہاں ہماری عقل و سمجھ اور کہاں شیخ

صاحبؒ کی زندگی کے بے مثال پہلو۔ آپ کی زندگی پر قلم اٹھانا بالکل سورج کو چراغ دکھانے کی مترادف ہے۔ مگر شیخ صاحبؒ کی یاد اور محبت نے بندہ ناکارہ کو مجبور کیا کہ کچھ ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط جملوں میں اپنے احساسات کو قلم بند کروں، کیونکہ مدتوں سے شیخ صاحبؒ کی یاد نے دل کو بے چین کر رکھا ہے۔ ان کی باتیں، ادائیں اور ان کے جملے تصور میں رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ شاید یہی وہ محرکات ہیں جو میری اس کمزور سی کاوش کا سبب بن گئیں۔ یہ امر مشکل ضرور تھا مگر آپ کی محبت نے سہل کر دیا۔

ایک فسانہ درد کا اپنا سنانا ہے مجھے
برسر محفل تڑپنا بلبلانا ہے مجھے

حضرت الاستاذ عارف باللہ، عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ نے دین حق کی اشاعت وترویج اور شرک و بدعت کے خاتمے کیلئے اپنی زندگی وقف کی تھی۔ بقول شاعر:

بقائے دین کی خاطر میری جان بھی حاضر ہے
لیکن پرچم اسلام کبھی نہ جھکنے پائے

بالکل یہی کر کے دکھایا، اپنی جان نچھاور کر دی مگر دین پر سودا بازی نہ کی اور نہ کسی کو کرنے دی۔ شیخ صاحبؒ میں فنائیت اور اخفا اس قدر تھا کہ جس کی وجہ سے مشہور علمی مرکز اور بڑے شہر کے بجائے ایک پسماندہ گاؤں (شاہو وام ہنگو) میں علم وعمل کے دیپ جلاتے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ موصوف گمنام زندگی گزارنے کے عادی تھے اس لیے اکثر و بیشتر آپ کے حیرت انگیز حالات، واقعات اور کیفیات لوگوں سے مخفی رہیں۔ باوجود اخفا کے ان کی سیرت وکردار اور اخلاص و وفا کی داستانیں زبان زد عام وخاص ہیں۔ راقم نے بھی اگرچہ حضرت شیخ کے حالات وواقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ تو نہیں کیا ہے مگر اساتذہ سے کثرت کے ساتھ سنے ضرور ہیں اور آپ کے ساتھ والہانہ محبت اور عشق کی بنا پر ان سب باتوں کو عین آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہوں جیسے کہ وہ تمام مناظر میرے سامنے ہوں۔

شیخ صاحبؒ کا تعلق مع اللہ ورسول اور دنیا سے انقطاع ویکسوئی مثالی تھی۔ ان کی پوری زندگی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ آپؒ صرف سنت پر عامل ہی نہیں بلکہ اس کے حریص بھی تھے۔ عشق رسول کی وجہ سے ہر چیز میں سنت کو مقدم رکھتے تھے، جس کی درخشندہ مثال ان کا اپنا جامعہ ہے، جس کا قیام ہی اس نیت سے کیا تھا کہ اس میں جتنے بھی اعمال خیر ہوں گے، ان سب کا اجر میزان نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈالا جائے گا۔ حضرت اقدس کی زندگی کا لمحہ لمحہ عشق نبوی سے لبریز تھا اس لیے تو اپنے مدرسہ کے سارے اعمال خیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے لئے ایصال ثواب کی نیت کی تھی۔

آپؒ نے علاقہ بھر میں علم وفضل کے وہ چراغ روشن کیے تھے کہ جن کے نور سے آج بھی پورا خطہ بلکہ بیرون ملک تک کے اہل علم مستفیض ہیں اور چراغ سے چراغ جلتے ہوئے یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔اپنی پوری زندگی علم وعمل، زہد وتقوی اور صراط مستقیم پر چلتے ہوئے گزاری۔ یہاں تک کہ جب ان کا وقت موعود پیام اجل کی صورت میں آیا تو بھی تعلیم وتدریس میں مصروف پائے گئے۔شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہونا تقرب عنداللہ کی دلیل اور رضائے الٰہی کا ثبوت ہے۔

وہ دار فانی سے دارالبقاء کی طرف کوچ تو فرما گئے، مگر اپنے پیچھے علم وعمل کی ایک تاریخ چھوڑ گئے، جو رہتی دنیا تک انسانوں کی رشد وہدایت کیلئے کافی ہے۔قوم کو ایک درس دیا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جس راستے پر چل کر میں منزل مقصود تک پہنچ گیا وہی راستہ تمہارا بھی ہے۔اگر تم بھی اپنی منزل پانا چاہتے ہو تو اسی راستے کو پکڑنا کہیں بھٹک نہ جانا۔

وطن عزیز پاکستان کے موجودہ دور میں دو عظیم سانحوں نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ دن ملکی تاریخ میں سیاہ ترین دنوں میں شمار ہوں گے۔ایک سانحہ لال مسجد جس نے دل ودماغ ماؤف کر دیئے تھے اور دوسرا جامعہ یوسفیہ پر حملہ۔ مجموعی طور پر ان دو سانحات نے مجھے ظلم کے خلاف اور مظلوم کا ساتھ دینے اور علما اور مدارس کا قدردان بنایا۔دونوں بظاہر تاریخ پاکستان کے عظیم سانحے ہیں مگر میری طرح ہزاروں نوجوانوں کے راہ راست پر آنے کا سبب بھی بنے ہیں۔ کیونکہ شہادتیں رنگ ضرور لاتی ہیں اور ضعیف ایمان والوں کو جگانے اور بیدار کرنے کا باعث بنتی ہیں۔جس طرح حضرتؒ کی زندگی، ان کے اطوار وعادات، گفتار وکردار، رہن سہن حقانیت کی مکمل تصویر اور دینی دعوت تھی اسی طرح شہادت کی موت بھی سچائی اور حق پرستی کی دعوت ثابت ہوئی ہے۔بندہ ناکارہ اس کی واضح مثال ہے جس نے میرے دل کی دنیا تبدیل کر کے دین کی طرف میلان اور ایک قسم کی تڑپ اور دین پر مر مٹنے کا جذبہ عطا کیا۔ یہ سارا انقلاب ان شہادتوں کے مرہون منت ہے۔جب بھی جامعہ یوسفیہ پر گزر ہوتا تھا تو ایک آرزو سی پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی اس شہید جامعہ کا ایک فرد بنوں۔اللہ نے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔تبلیغ میں چار مہینے لگا کر علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ واپسی پر مدرسہ کے انتخاب کے لیے مشورہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ میری چاہتوں کا محور تو جامعہ یوسفیہ ہی تھا۔بالآخر حضرت شیخ صاحبؒ کی محبت نے مجھے ان کے لگائے ہوئے گلشن کی طرف کھینچ لیا۔

اگر ایک طرف میں اپنے آپ کو بدنصیب تصور کروں کہ اس عظیم ہستی کی صحبت کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا تو

دوسری طرف اپنے آپ کو خوش قسمت انسان بھی سمجھتا ہوں کہ میری دینی، روحانی زندگی کا آغاز حضرت شیخ صاحبؒ کے مدرسہ سے ہوا، میں بڑا فخر محسوس کرتا ہوں کہ اس گلشن سے متنفع ہو کر تابع خالق اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شیخ سے زندگی میں نہ سہی مگر شہادت کے بعد ایک واسطہ اور نسبت تو پیدا ہو ہی گئی:

جیتے جی میں نے نہ جانی قدر تیری ہائے ہائے

عمر بھر کرنی پڑے گی آہ وزاری ہائے ہائے

میں تو اپنے آپ کو ان پڑھ اور جاہل سمجھتا ہوں۔ اگر کہیں لوگ مجھے علم اور علما کی طرف منسوب کرتے بھی ہیں تو یہ نسبت حضرت شیخ صاحبؒ کی برکت سے ہے اور ہمارے اس علم اور عمل کی ساری کمائی حضرت شیخ صاحبؒ کے میزان عمل میں ڈالی جائے گی۔

میرے چچازاد بھائی نے بتایا کہ ایک دفعہ حضرت شیخ ایک مولوی صاحب کے جنازے میں شریک تھے۔ جہاں کثیر تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ویڈیو بنانے کیلئے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور ویڈیو بنانا شروع کی کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید ریش بزرگ میری طرف آرہے ہیں۔ میرے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مشفقانہ انداز میں تبسم کے ساتھ فرمانے لگے: بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو، یہ (ویڈیو بنانا) اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ شیخ صاحبؒ نے بات پوری نہیں کی تھی کہ میرے ہاتھ موبائل رکھنے کے لیے جیب میں چلے گئے۔ مگر شرم کے مارے میں ان سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ جوانی میں ایسی حرکتیں جوانوں کا معمول بن جاتی ہیں اور ان سے انہیں منع کیا جائے تو اسے اپنے اوپر بوجھ سمجھتے ہیں۔ مگر یہاں وہ کیفیت یکسر مختلف تھی بجائے اس کے کہ میرے ذہن میں سوال اٹھتا کہ صرف مجھے ہی کیوں منع کر رہے ہیں، میری آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں، ندامت کی وجہ سے پسینہ میں شرابور تھا کیونکہ حضرت کا انداز نصیحت ہی ایسا تھا کہ لگاتار اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔ فرماتے کہ اس وقت تو یہ مجھے ایک معمولی سا واقعہ لگا مگر شیخ صاحبؒ کے دار فانی کو الوداع کہنے کے بعد ان کے یاد رہنے کا ایک مستقل ذریعہ بن گیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اس واقعہ نے حضرتؒ کی بارہا یاد دلائی۔ جب بھی حضرت کی یاد آتی ہے یا کوئی اس کا ذکر کرتا ہے تو وہ منظر ضرور میرے سامنے آتا ہے۔ جیسے کہ ابھی شیخ صاحبؒ میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے سمجھا رہے ہیں، لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنا قیمتی منظر تھا۔ ایک تو میرا حضرت سے نصیحت پانے والوں میں شمار ہوا اور دوسرا ان کی یاد آنے پر میرے ذہن میں منقوش ان کا رخ انور میرے سامنے آجاتا ہے۔

حضرت شیخ صاحبؒ کی ساری زندگی ہم جیسوں کے لیے درس موعظت ہے، کاش ہم آپ کے علوم ومآثر سے

مستفید ہوں، اور آپ کے احوال وآثار کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہیں متعین کریں۔

سماجی رہنماؤں کے تاثرات

میرے مشفق، میرے رہنما

حافظ شیر زمان داوڑ، وزیرستان

زندگی فانی ہے، ہر ایک نے یہاں سے کوچ کر جانا ہے، موت کی اٹل حقیقت کے سامنے تو خداوند کریم کے منکروں کا بھی سرِ تسلیم خم ہے۔ کس کی کیا مجال کہ موت وحیات کے خدائی فیصلوں پر لب کشائی کی جسارت کرے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض لوگ یہ چند روزہ حیات اس طرز سے گزار لیتے ہیں کہ تاریخ کے اوراق اور زمانے کے

جینے میں ہمیشہ کے لئے امر ہو جاتے ہیں۔اُن کی ذات باقی نہیں رہتی لیکن اُن کا کام اور کارنامے صبح قیامت تک بولتے اور سکھاتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی موت محض اُن کی ذات اور فانی دُنیا کے مابین ایک پردہ ہوتا ہے۔باقی اُن کی آب وتاب اُن کے تذکروں اور کارناموں کے ضمن میں اور اُن کا فیض واثرات اُن کی علمی وروحانی کاوشوں کی شکل میں مخلوق خدا کو مسلسل مستفید فرماتے رہتے ہیں،کبھی اُن کی ذات کی یاد ستائے تو آہ وافسوس زبان پر آہی جاتے ہیں کہ انسان بہر حال ضعیف ہے۔استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی نوراللہ مرقدہ کی ذات گرامی کچھ اس قسم کی تھی ،استاذ صاحب تو شہید ہے،شہید کی حیات میں کسے شک ہو سکتا ہے۔وہ تو زندہ ہے،پھر جب ہم آج استاذ صاحب کی مختصر زندگی کے گراں قدر کارناموں کو دیکھتے ہیں اور اُن کے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان میں استاذ صاحب کے جلوے واضح نظر آتے ہیں،لہٰذا استاذ صاحب ہمارے ہاں اپنی کاوشوں کی شکل میں زندہ وجاوید ہیں اور ہم آج بھی اُن کی برکات سمیٹ رہے ہیں۔

مجھے استاذ صاحب سے شرف تلمذ تو حاصل نہیں لیکن محبت وارادت کا جو تعلق اللہ نے اُن سے نصیب فرمایا،میں سمجھتا ہوں کہ ویسا تعلق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔استاذ صاحب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ اُن کی محبت سب سے زیادہ تھی اور وہ یہ اپنی ذات کی حد تک کہنے میں بالکل بجا ہوتا ہے کیونکہ اُس نے اپنے ساتھ کبھی کسی کی اتنی شفقت اور محبت دیکھی نہیں ہوتی۔جب وہ اس قدر عنایات وتوجہات ملاحظہ کرتا ہے تو اس کا خیال ہو جاتا ہے کہ دُنیا میں اس شخص کی شفقت ورأفت کا واحد محور میں ہی ہوں۔میری حالت بھی یہی ہے اور مجھے اس پر اصرار ہے کہ اُستاذ صاحب کی سب سے زیادہ شفقت میں نے ہی سمیٹی ہے۔

حضرت استاذ صاحب کا تذکرہ پہلے پہل شمالی وزیرستان میں اپنے اساتذہ سے سنا۔قبائل میں آپ کے تلامذہ کا وسیع حلقہ تھا۔ہمارے اکثر اساتذہ بھی آپ سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔اُن کی زبانوں پر جب بھی استاذ صاحب کا تذکرہ آتا،تو لہجہ،انداز اور تعبیر ایسے مؤدب ہو جاتے کہ ہم حیران رہتے کہ آخر یہ کون سی شخصیت ہوگی ،جس کی غیر موجودگی میں محض اُس کا نام لینے میں اس درجہ ادب واحترام کا معاملہ ہوتا ہے۔اس کا ایک مظہر میں ذکر کرتا چلوں کہ ہمارے عرف میں بہت ہی مقدس اور قابل احترام شخصیت کا ذکر کرتے وقت اُس کے ساتھ''مبارک'' کا لاحقہ لگایا جاتا ہے۔ورنہ ہمارے وزیرستان کے عرف سے باخبر لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے قبائلی لوگ ادب سے نا آشنا ہوتے ہیں اور لاحقوں سابقوں کے بغیر محض نام لے کر بڑی بڑی شخصیات کا ذکر کرتے ہیں۔لیکن''مبارک'' کا لاحقہ اس عرف میں ادب واحترام کے انتہائی مقام پر دلالت کرتا ہے،میں نے اپنے علاقہ کے اہل علم سے حضرت استاذ صاحب کا ذکر''استاذ مبارک'' کے نام سے سنا،اس طرز کے تذکروں سے میرا اشتیاق بڑھا کہ اس شخصیت کی

زیارت وملاقات کا شرف ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

پھر ایک بار ہمارے ہاں ایک اہم قومی مسئلے پر اہل علم اور مفتیان کرام کا اجتماع ہوا لیکن مسئلہ کی علمی نوعیت ایسی ہمہ جہت تھی کہ ہمارے اہل علم کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ مسئلہ چونکہ حساس اور احتیاط کا متقاضی تھا اس لئے فیصلہ ہوا کہ استفتاء مرتب کر کے کسی بڑے عالم یا دارالافتاء سے رہنمائی لینی چاہیے۔ جب اس کے لئے مشورہ ہوا تو تمام حضرات بیک زبان اس پر متفق ہو گئے کہ 'استاذ مبارک' سے رجوع کرنا چاہیے۔ اتفاق سے حضرت الاستاذ صاحب کے پاس جس وفد کو بھیجنے کا فیصلہ ہوا اُس میں بندہ کا نام بھی شامل کر لیا گیا۔ میری سعادت اور خوش بختی تھی کہ اللہ تعالی نے اُس در پر پہنچا دیا جس پر حاضری کی دیرینہ تمنا تھی۔ میرا خیال تھا کہ حضرت الاستاذ صاحب کے اردگرد خدام اور متعلقین کا بڑا جمگھٹا ہوگا، بڑی کروفر ہوگی، مسلح باڈی گارڈ ہوں گے، آگے پیچھے گاڑیاں چلتی ہوں گی اور اُن سے ملنے کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہوگا۔ انہی تصورات میں جب میں ہنگو کے گاؤں ''وام'' پہنچا تو دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میرے سارے تصورات وخیالات کے برعکس اُونچے اُونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک کچا پکا مدرسہ ہے اور اُس میں ایک سفید ریش بزرگ، معمولی لباس میں ملبوس خادمانہ انداز میں تقریباً دوڑتے ہوئے ہمارے استقبال کے لئے لپکے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، اُن پر ہمیں اکرام واحترام سے بٹھایا گیا، پھر خود ہی وہ بزرگ خدمت میں لگ گئے۔ خیال تھا کہ یہ کوئی مخلص خادم عالم ہوں گے لیکن وفد کے علما کا عاجزانہ اور مؤدبانہ انداز اور اُستاذ جی استاذ جی کہنا میری حیرت بڑھا رہے تھے۔ گفتگو سے ہی اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ یہی ہیں۔ اللہ اکبر! میرے سارے تصورات دھڑام سے گر گئے، حضرت نے فوراً ہمارے آرام کا انتظام کیا کہ دور سے سفر کر کے آئے ہیں۔ چونکہ میں دونوں پاؤں سے معذور ہوں اور زمین پر گھسٹ کر چلتا ہوں، اس لئے میری طرف شفقت ومحبت بھری توجہ زیادہ تھی، اس پہلی ملاقات سے حضرت استاذ صاحب کی عظمت اور مقام کا جو نقش دل پر بیٹھا اُس کی رعنائی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہی گیا۔ پھر تو ہم حضرت کے در کے اسیر ہو گئے۔ اہم ملی وقومی مسائل میں مشورہ کے لئے رجوع ہمارے عادت سی بن گئی۔ کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو فوراً سب یہی کہتے کہ ''استاذ مبارک'' کے پاس چلتے ہیں اور مشورہ کرتے ہیں۔

حضرت الاستاذ صاحب کی مہمان نوازی ہمارے لئے قابل رشک تھی، ہم خود قبائلی تھے، قبائل مہمانوں کو اللہ کا انعام اور مہمان کی عزت اور اکرام کو ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بس چلے تو بدن کے ٹکڑے کاٹ کر مہمان کے سامنے رکھ دیں۔ مہمان کے راحت وآرام کا خیال اور اُس کی عزت افزائی کا جو منظر حضرت استاذ صاحب کے ہاں دیکھا اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اپنے بارے میں عرض کروں گا، حضرت الاستاذ صاحب استقبال

کے لئے میرے موٹر کار کے دروازے تک آتے ،الحمد للہ دونوں پاؤں معذور ہونے کے باوجود میں گاڑی خود چلاتا ہوں، مجھے کار سے اُتارتے اور مہمان خانے تک لے جاتے ۔ جب جگانے کا وقت ہوتا تو انتہائی دھیمے انداز میں کمرے کا دروازہ کھولتے ۔ مجھے اندازہ ہو جاتا کہ حضرت استاذ مبارک جگانے آگئے ہیں ، میں خود ہی اُٹھ کر بیٹھ جاتا ، پھر میرے ساتھ پانی کا بھرا ہوا لوٹا اُٹھاتے اور بیت الخلاء تک ساتھ جاتے ۔ میرے لئے کرسی منگواتے ، بیت الخلاء میں دیگر ضروری انتظامات کر کے میرے لئے پانی کا لوٹا رکھتے ۔ جب میں ضروریات سے فارغ ہوتا تو وضو کے لئے خود اپنے دست مبارک سے پانی ڈالتے ۔کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اتنا وسیع حلقہ رکھنے والی شخصیت ایک اجنبی کی یوں خدمت کرے ، میری نہ کوئی مذہبی یا دینی پہچان تھی ، نہ کوئی بڑی دنیاوی حیثیت تھی لیکن استاذ صاحب کی شفقت کا کمال تھا جو مجھ جیسے بے حیثیت شخص کو بھی اس قدر نصیب تھی ۔ ہمارا فہم وشعور تو اس درجہ نہیں تھا، استاذ صاحب کی ان عاجزانہ اداؤں سے بعض اوقات استاذ مبارک کا مقام ہم سے چھپ سا جاتا اور ہم حد سے زیادہ بے تکلف بھی ہو جاتے ،لیکن مجال ہے کہ ہماری جسارتوں پر کبھی آپ نے برا منایا ہو یا اس کا تاثر دیا ہو۔

حضرت الاستاذ میں ایک بات میں نے یہ بھی مشاہدہ کی کہ اتنی خدمت کے باوجود ہمیشہ ہمیں یہ تاثر دیتے گویا ہماری خدمت کا حق ادا نہیں ہوا حالانکہ آپ کی اتنی خدمت کی وجہ سے ہم شرماتے کہ ہماری حیثیت دیکھیں اور استاذ صاحب کا معاملہ دیکھیں ،لیکن اس کے باوجود ہمیشہ یہی رویہ دیکھا کہ خود معذرت کر رہے ہیں کہ آپ کی کما حقہ خدمت نہیں ہو سکی۔

حضرت الاستاذ صاحب کی خواہش ہوتی تھی کہ مہمان اُن کے ہاں کھانا کھائیں ،خود اپنے ہاتھ سے چیزیں پیش کر کر کے کھلاتے اور اتنا کھلاتے کہ ہم تو اتنے سیر ہو جاتے کہ بوجھ بننے لگتا۔خود بہت ہی کم کھاتے ،دسترخوان پر چند ہی لقمے لیتے ہوں گے ، باقی تو سارا وقت کھلانے میں ہی گزر جاتا۔اگر ہم کہیں باہر کھانا کھا لیتے تو ناراض ہوتے اور پھر تمام ساتھیوں کے حساب سے مجھے رقم دیتے کہ آپ لوگوں نے چونکہ کھانا ہمارے ہاں نہیں کھایا اس لئے یہ تمام ساتھیوں کے کھانے کی رقم ہے ،راستہ میں ایک وقت کا کھانا کھا لینا۔کھانے کے عنوان سے رقم اتنی ہوتی کہ ہم اچھے سے اچھا کھانا دوبار اُس سے کھا سکتے ۔میرے ساتھ شفقت کا یہ معاملہ بڑا ہی عجیب رہا کہ جب بھی حاضر خدمت ہوا، گاڑی کے پیٹرول کا سارا خرچہ عنایت فرمایا۔میرے ہزار انکار پر بھی عطا فرماتے اور اگر نہ لیتا تو ناراض ہوتے ۔ مجھے کبھی یاد نہیں کہ مجھے بغیر خرچہ دیئے بھیجا ہو۔اگر اس وقت جیب میں پاس کچھ نہ ہوتا تو آہستہ سے صاحبزادہ مخدوم مولانا محمد یوسف صاحب کو اشارہ کر کے گھر بھیج دیتے اور گھر سے منگوا کر عنایت فرماتے ۔

ہم نے ان شفقتوں کے ایسے مزے لوٹے ہیں کہ کہاں تک ان کا تذکرہ کیا جائے ،شاید پڑھنے والوں کو یہ

افسانے معلوم ہوں کہ اس دور میں ایسے لوگ کہاں؟ لیکن کیا کیجئے ہم سننے والے ہوتے تو شاید یقین نہ کرتے، ہم تو خود برتنے والے ہیں، اس لئے روتے ہیں اور خوب روتے ہیں کہ اب ان شفقتوں کو ڈھونڈیں تو کہاں ڈھونڈھیں؟

مجھے بحث ومباحثے کا شوق تھا، جب میں خدمت میں حاضر ہوتا تو مسکرا کر فرماتے، حافظ صاحب! راستے میں ساتھیوں سے جھگڑا تو نہیں ہوا، یہ تو طے تھا کہ کسی نہ کسی موضوع پر میں ساتھیوں سے ضرور بحث ومباحثہ اور پنگا کر کے آرہا ہوتا، تب میں شرکا سفر کی شکایتیں شروع کردیتا کہ جی یہ فلاں نے یہ بات مجھے کہی اور فلاں نے اس طرح زچ کیا۔ اس پر مسکراتے ہوئے میرا دفاع کرتے اور باقی ساتھی بھی اس کا لطف لیتے۔ آپ کی مجلس جس نوعیت کی بھی ہوتی، چاہے علما سے کوئی علمی گفتگو فرمارہے ہوتے، یا کسی اصلاحی وتربیتی بات میں مصروف ہوتے یا علاقہ کے کسی سیاسی وسماجی مسئلہ پر بات چیت کررہے ہوتے، خصوصیت یہ تھی کہ مجلس میں اُکتاہٹ نام کی کوئی چیز پیدا نہ ہوتی، بلکہ دل کرتا تھا کہ آپ مزید بات لمبی کریں اور ہم بیٹھ کر سنتے رہیں۔

استاذ مبارک کا بندہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ آپ کے ساتھ اسفار میں بندہ کو گاڑی چلانے کی سعادت ملتی رہی۔ بندہ کو خدمت کا یہ جو اعزاز حاصل ہے اس پر اللہ کا جتنا شکر کرے کم ہے۔ حضرت کے ساتھ مختلف اسفار میں جانے کی سعادت ملی۔ ایک معمول یہ دیکھا کہ جس علاقہ میں جانا ہوتا وہاں اگر کوئی زندہ بزرگ ہوتا تو اُس کی خدمت میں حاضری ضرور دیتے، اگر کسی بزرگ کی قبر ہوتی تو اس پر تشریف لے جاتے۔ بزرگوں کے ہاں آپ کا جو احترام اور اکرام ہم دیکھتے اور جو معرفت بھری گفتگو ان کی آپس میں ہوتی تو ہم پر استاذ صاحب کا مقام اور کھل جاتا۔ ایسی مجالس میں میری یہ کیفیت ہوجاتی کہ میں اپنے آپ کو استاذ صاحب کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے کا قابل بھی نہیں سمجھتا تھا اور سوچتا کہ اتنی بڑی ہستی کے سامنے تو میرا بولنا بھی شاید گناہ ہو یہ ہم کیا جسارت کرتے ہیں جو آپ کے ساتھ بے تکلف بھی ہوجاتے ہیں۔ میں حضرت الاستاذ صاحب کے ساتھ آپ کے کئی شاگردوں کے ہاں بھی گیا ہوں، یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ حضرت کے شاگردوں میں آپ کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ بھی حضرت کی طرح سراپا عجز وانکسار اور ضیافت واکرام والے ہیں۔

ہمارے علاقے میں حضرت کے ساتھ عقیدت ومحبت کا ایسا عجیب تعلق تھا کہ جب بھی ہماری حاضری ہوتی تو اتنے لوگ دُعا وسلام کا عرض کرتے اور اپنی حاجات کے لئے خصوصی دُعاؤں کا کہتے کہ ہمارے بعض احباب کو پوری فہرست بنانی پڑتی۔ کیونکہ نام اتنے زیادہ ہوتے کہ بھولنے کا خدشہ ہوتا۔ جب ہمارے شمالی وزیرستان پر سخت حالات آئے تو حضرت الاستاذ صاحب ہی ہمارا ماویٰ وملجا بنے۔ حضرت نے گورنر علی محمد جان اورکزئی صاحب کی وساطت سے ہمارے کئی مسائل حل کیے۔ ان معاملات میں مجھے حضرت کے ساتھ اسفار اور مجالس میں شرکت کا

مسلسل موقع ملا، بلکہ قبائلی سرداروں اور حضرت کے مابین سفارت کی سعادت مجھے ملی۔ حضرت کو قبائل سے بڑی محبت تھی، آپ نائن الیون کے بعد لگنے والی آگ کو بیرونی قوتوں کی سازش سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس عالمگیر سازش کے دو بڑے اہداف ہیں۔

(۱) قبائل میں موجود دین دار اور مجاہد محب وطن لوگوں کو کمزور کر کے ان کے جذبات کو وطن خداداد کے خلاف استعمال کرنا۔ جس کے نتیجے میں پورے ملک میں دینی طبقے کے لئے مسائل کھڑے ہوں گے اور دین متین کی احیا و بقا کے لئے جاری تحریکات اور ادارے کمزور تر ہوتے جائیں گے۔

(۲) دوسرا پاکستانی فوج کو اپنوں کے ساتھ جنگ میں الجھا کر کمزور کرنا اور اہل وطن کے دلوں سے ان کی محبت کو نکالنا۔

آپ ہمیں یہی تلقین فرماتے تھے کہ خبردار! کبھی اغیار کی اس سازش کو کامیاب کرنے کا حصہ نہ بننا۔ آپ کو قبائل کی خودمختاری بھی عزیز تھی لیکن یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم لوگ حکومت سے تصادم کی راہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں آپ نے ہمارے خطے کے کئی سفر کئے، وہاں کے مقامی لوگوں کو اس حوالے سے سمجھایا، علما کو قائل کیا اور بحمد اللہ آپ کی کوشش کامیاب ہوئی کہ ہمارے وزیر قبائل نے آپ کے منشا اور ایما پر حکومت کے ساتھ معاہدہ کیا۔ آپ خود اس امن معاہدہ کے روح رواں تھے، خود ہی اس کی شرائط طے فرمائیں اور اپنے ہاتھ سے سترہ نکات پر مشتمل معاہدہ لکھا۔ حکومتی ریکارڈ اور ملکی میڈیا پر اس معاہدے کی قابل افشا شقیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

ہمارے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ چیک پوسٹوں پر عوام کو درپیش مسائل تھے، آپ کی کوششوں سے ہمارے علاقہ کی ساری چیک پوسٹیں ختم کر دی گئیں۔ پھر خاصہ داروں کی تنخواہ کا مسئلہ درپیش تھا، حکومت نے اُن کی تنخواہیں لمبے عرصہ سے روک رکھی تھیں۔ حضرت الاستاذ کی کوشش سے شمالی وزیرستان کے تمام خاصہ داروں کی تنخواہیں بحال ہوئیں اور حکومت نے سابقہ کی تلافی کر دی۔ امن کے لئے آپ کی کوششیں تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ ہمیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، حضرت الاستاذ سے رجوع کرتے اور آپ اپنی وجاہت سے گورنر سے فوراً حل کروا دیتے۔

یہ معاہدہ بحمد اللہ ۲۰۱۴ء تک کامیابی سے چلا، اگر اسی نوعیت کا معاہدہ جنوبی وزیرستان کے قبائل حضرت استاذ صاحب کی تجویز پر حکومت سے کر لیتے اور وہاں کے لوگ غیر ملکی عناصر سمیت شمالی وزیرستان کا رخ نہ کرتے تو حکومت اور ہمارے قبائل کے مابین مفاہمت کبھی متاثر نہ ہوتی۔ لیکن ہمارے خطے میں معاہدہ شکن عناصر کے رسوخ سے بالآخر ہمارے وطن کو بھی آپریشن کے تلخ گھونٹ کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ بات بہرحال حقیقت ہے کہ وزیر قبائل نے حضرت استاذ مبارک کے قول کی لاج رکھی اور اپنے علاقے سے ہجرت قبول کر کے آخر دم تک حکومت سے

تصادم اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ہم آج بھی شعوری طور پر اس بات کو سمجھتے ہیں کہ وطن خداداد میں باہمی خانہ جنگی اور ٹکراؤ میں ہم سب کی تباہی ہے، یہ ہمارے دشمن کی مضبوطی کا باعث ہے۔ وطن میں رہنے والے باہم دست وگریبان ہوں تو وطن کا محافظ کوئی بھی نہ ہوا۔ وطن کے محافظ ہم سب تب ہوں گے جب باہمی خانہ جنگیوں کا خاتمہ کرکے امن وآشتی کو یقینی بنائیں۔ قبائل بحمد اللہ محب وطن ہیں اور ہماری خواہش وتمنا ہے کہ ان کی صلاحیتیں وطن اور قوم کے تحفظ کے لئے استعمال ہوں لیکن یہ سب ہماری خودمختاری کی قیمت پر نہ ہو۔ ہمیں آزاد وخودمختار رہنے دیا جائے کہ یہی ہماری ثقافت ہے، باقی ہمارے بدن کی ایک ایک رگ اور خون کا ایک ایک قطرہ اسلام اور پاکستان کی امانت ہے اور جہاں اور جب اس امانت کی پیشی کا مرحلہ آیا، ان شاء اللہ ہم دیگر اہل وطن کے شانہ بشانہ ہوں گے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے، لیکن بخدا! ہم بھی انسان ہیں، کچھ ہمارا بھی خیال رکھا جائے، ہمیں بالکل بندگلی میں نہ دھکیلا جائے۔

قبائل کے بارے میں حضرت الاستاذ کا یہی نظریہ تھا، آپ سمجھتے تھے کہ ٹکراؤ سے ملکی وملی نقصانات کے ساتھ قبائل کی عظیم قوت ضائع ہوگی، اس لئے آپ نے اپنی پوری قوت صرف کرکے کم از کم ہمیں ٹکراؤ سے بچائے رکھا۔

بندہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بخشی کہ حضرت کی شہادت سے ایک دن قبل آپ کا آخری مہمان میں ہی تھا۔ بندہ علاقائی قیام امن کے حوالے سے کچھ مسائل کے بارے میں مشورہ کے لئے حاضر ہوا تھا۔ ہم مغرب سے کچھ دیر قبل پہنچے، حضرت نے چائے وغیرہ کا انتظام کیا لیکن خلاف معمول حضرت کے انداز واطوار اس دن غیر معمولی طور پر تبدیل تھے۔ ایک استغراق کی سی کیفیت تھی، متفکر ومغموم سے تھے، جیسے دُنیا کی ہر چیز سے دل اُچاٹ ہو۔ پہلی بار خلاف معمول مغرب کے بعد کھانا بھی ہمارے ساتھ نہیں کھایا، بلکہ مولوی یوسف صاحب کو حکم دیا کہ مہمانوں کو سنبھالیں۔ عشاء کے فرض پڑھنے کے بعد مجھے مخاطب کرکے فرمایا: حافظ صاحب! میری طبیعت ٹھیک نہیں آپ بھی تھکے ہیں، آرام فرمائیں، کل ملیں گے۔ بعد میں مولانا یوسف صاحب نے فرمایا کہ استاذ صاحب فرمارہے تھے کہ کاش! آج یہ دوست مجھے اس آخری وقت میں معاف رکھتے، اب ان مسائل کے حل کے لئے ہم باقی نہیں رہیں گے، آج مجھے کچھ عبادت کا وقت دے دیتے لیکن چلیں مہمانوں کی خاطر مدارت بھی عبادت ہے، بس اتنا فرمایا۔ اس میں واضح اشارہ تھا کہ آپ کو اپنے کوچ کے اشارے بارگاہِ الٰہی سے مل چکے تھے اور آپ ملاقات کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ اس لئے تو دنیا کی ہر چیز اور تعلق سے بے رغبت سے ہوگئے تھے۔ صبح ہمیں رخصت فرمایا تو دوپہر کو اطلاع ملی کہ حضرت الاستاذ کو شہید کردیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ رب العزت آپ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں برسائے اور آپ کو کروٹ کروٹ جنت کی لذتوں سے محظوظ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ایک بے لوث اور خاموش کردار

ملک حاجی عزت گل، اورکزئی ایجنسی

اپنی طویل سیاسی اور سماجی زندگی میں سینکڑوں سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنماؤں سے واسطہ پڑا، سینکڑوں حکومتی افسران سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مختلف قوموں سے بارہا مذاکرات اور گفت وشنید کی مجلسیں کیں لیکن میں نے اپنی زندگی میں مولانا محمد امین صاحب اورکزئی جیسا مخلص، بے لوث، نڈر، مدبر، اور زیرک انسان نہیں دیکھا۔ ایک

معاملہ اگر آج سر اٹھاتا تو آپ اس سے دس سال بعد کے اثرات کا اپنے تجربے اور بصیرت سے ادراک کر لیتے تھے
۔

اورکزئی ایجنسی اور ہنگو میں حضرت کے ساتھ بندہ کو سینکڑوں سیاسی اور سماجی مسائل کے حل میں شرکت کا موقع ملا اس پورے سفر میں آپ کی گوناگوں خصوصیات کا علم ہوتا رہا۔ آپ کا تقویٰ، احتیاط، دنیا سے بے رغبتی، لالچ اور حرص سے پاک طبیعت، خیر خواہی، غمخواری، انسان دوستی، امن پسندی اور قومی وملی مفاد کی حرص ہمارے لئے قابل رشک صفات تھیں۔

چونکہ آپ پر اخفا کا غلبہ تھا اس لئے جو حضرات انتہائی قریب رہتے انہیں ہی آپ کے کارناموں کا پتہ چلتا، ورنہ عام لوگوں کو تو اس کی ہوا بھی نہ لگتی، پھر آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ بہت ہی اشد ضرورت اور انتہائی سنگین صورت حال نہ ہوتی تو خود آگے آنے کے بجائے ہم لوگوں کو استعمال کرتے۔ دماغ آپ کا چلتا، ہدایات اور مکمل رہنمائی آپ کی ہوتی، رکاوٹیں اور عوائق بھی آپ ہی دور کرتے صرف منظر عام پر ہم چل رہے ہوتے۔ کئی بار ایک کام کے لئے ہماری تشکیل کی، بظاہر وہ کام ناممکن نظر آتا اور اگر ہماری ہمت پر موقوف ہوتا تو ہم کبھی اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے، لیکن آپ کے حکم پر جب میدان سنبھالتے تو رفتہ رفتہ سارے راستے کھلتے جاتے اور اندازہ ہوتا کہ حضرت کی بصیرت اور نگاہ وہاں تک دیکھتی ہے جہاں تک ہماری رسائی نہیں۔ ذیل میں قیام امن کے حوالے سے آپ کی کوششوں کا مختصر تذکرہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

جب کرم ایجنسی میں شیعہ سنی فسادات شروع ہوئے تو گورنر علی محمد جان اورکزئی نے حضرت الاستاذ سے اپیل کی کہ میں سرکاری ہیلی کاپٹر مہیا کر دوں گا، آپ حضرات اپنی وجاہت استعمال کر کے اس خون ریزی کو روکنے کی کوشش کریں۔ حضرت کی تو ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ ملک سے فرقہ واریت کا خاتمہ ہو، مذہبی اختلافات کا دائرہ اور اپنا مسلکی تشخص ضرور قائم رکھا جائے لیکن اس بنیاد پر جنگ وجدال سے پرہیز کیا جائے۔ آپ نے بندہ کو طلب فرمایا اور کرم ایجنسی میں فریقین کے مابین جرگہ کے ذریعہ صلح کی راہ ہموار کرنے کی ہدایات دیں۔ معاملہ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اہل سنت کے لوگوں کو تریشروں میں ڈال کر مارا گیا تھا اور کسی طرح صلح کا امکان دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن حضرت کی ایما اور ہدایات پر ہم نے اس معاملے کو سلجھانے اور حل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ پہلی بار بندہ، حاجی فضل اکبر اور مفتی مختار الدین کربوغہ شریف والے کرم ایجنسی گئے اور صلح کی بات کا آغاز کیا۔ ہماری کوشش تھی کہ اس بار ہم ایسا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ آیندہ اسے توڑنے میں کوئی شرپسند قوت کامیاب نہ ہو سکے۔ اس معاہدے کے لئے کام کے دوران بڑی مشکلات آئیں اور بعض اوقات ہم حالات کے جبر اور مختلف پیچیدگیوں کے

باعث مایوسی کا بھی شکار ہوئے لیکن استاذ صاحب جب کسی کام کا عزم کرتے تو اس کی تکمیل کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ، اس لئے آپ حوصلہ دیتے رہے ، کئی کئی گھنٹے سوچ کر نئی حکمت عملی تجویز کرتے اور ایک نئے طرز سے محنت شروع کرواتے ۔ آپ کو علاقے کی تاریخ ، روایات ، نفسیات اور مزاجوں کا گہرا تجربہ اور درک تھا ۔ فوراً معلوم کرتے کہ معاملہ کہاں سے بگڑ رہا ہے اور بگاڑ کے اسباب کیا ہیں ، پھر ان اسباب کے خاتمہ کا لائحہ عمل کیا ہوسکتا ہے ، الغرض آپ نے ہمیں اس معاہدے سے پیچھے ہٹنے نہیں دیا ۔ فرمایا کہ کام چلاتے رہیں ، یہاں تک کہ امن وامان قائم ہوجائے ، پیچھے ہرگز نہ ہٹیں ۔ آپ کی حکمت عملی ، تجاویز ، ہدایات اور قدم قدم پر رہنمائی کی برکت تھی کہ تین سال کے عرصہ میں ہم فریقین کو ایک مضبوط امن معاہدے تک لانے میں کامیاب ہوگئے ۔ ہماری اپنی حیثیت کچھ نہیں تھی ، دراصل یہ حضرت استاذ صاحب ہی کی بصیرت کا ثمرہ تھا ، حضرت کی حیثیت روح اور ہم احباب کی حیثیت بدن کی تھی ، حضرت خود پس منظر میں رہتے لیکن ساری بصیرت آپ ہی کی کارفرما ہوتی ۔ الحمد للہ آپ کی بے لوث خدمت اور خلوص کی برکت سے تاحال وہ امن معاہدہ قائم ہے ، اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ قائم ودائم رکھے ۔

شیعہ سنی مسئلہ میں قیام امن کے حوالہ سے استاذ صاحب کا واضح فارمولا تھا کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے اور ظالم کا تعاون نہ کیا جائے خواہ وہ کسی فریق کا ہو ۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کا بنیادی مقصد اغیار کی سازشوں کے تحت ملک کو کمزور کرنا اور عوام کو باہم دست وگریبان کرنا ہے لہٰذا کسی بھی ناخوشگوار واقعے پر فریقین مکمل پر امن رہیں اور اشتعال سے بچیں کیونکہ اشتعال دشمن کے مقاصد کی تکمیل کا باعث بنتا ہے ۔

عوام ازخود اقدام کرنے کی بجائے فریقین کے متفقہ جرگہ کو مسئلہ کے حل کا موقع دیں ۔

جرم ثابت ہونے پر حکومت مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے تاکہ آئندہ کے لئے عبرت ہو ۔

آپ نے ہمیشہ ان باتوں کی دہائی دی ، اپنے متعلقین کو اپنا یہی موقف سمجھایا ، حکومت کو بھی یہی تجاویز دیں اور انہی اصولوں پر ہم نے کرم ایجنسی کا معاملہ بھی تکمیل تک پہنچایا ۔

شیعہ سنی فسادات کے حوالے سے خود ہنگو کے داخلی حالات بھی اکثر ابتر رہے ہیں ۔ حضرت کی کوششوں سے الحمد للہ ان فسادات کے بنیادی اسباب کی نشاندہی اور ان کے خاتمے کے لئے حکومت کو کئی بار آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آپ کی عموماً یہ شکایت رہتی کہ وطن خداداد کو ایسی مخلص قیادت کبھی نصیب نہ ہوسکی جو فرقہ وارانہ تصادم کے مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنے کے لئے بیٹھے ۔ ۲۰۰۶ء کے عاشورہ کے ماتمی جلوس میں جب ہنگو تباہ کن فسادات کی زد میں آیا ۔ اہل تشیع کے ماتمی جلوس میں دھماکہ ہوا ، جو قابل مذمت تھا لیکن اس کے انتقام میں اہل تشیع نے بے گناہ سنی عوام کی چھ سو سے زیادہ دکانیں جلا کر راکھ کر دیں ۔ ہنگو سے کوہاٹ تک پوری شیعہ پٹی میں اہل سنت کی گاڑیوں سے سوار

اتار کر قتل کیے اور گاڑیوں کو جلایا گیا، وزیرستان اور ٹل سے تعلق رکھنے والے حجاج کرام کا قتل عام کیا گیا۔ نہ کسی مسافر کو بخشا گیا اور نہ خواتین اور بچوں کو معاف کیا گیا۔

یوں باہمی جنگ کی فضا ہموار ہوئی، اس حوالہ سے ڈی سی آفس میں جو جرگہ ہوا، اُس میں مولانا عبداللہ صاحبؒ اور اُستاذ صاحبؒ بذات خود بھی شریک ہوئے اور حضرت نے ایک طویل تحریر حکومت کو تجاویز پر مشتمل حوالے کی۔ بلا شبہ اُس تحریر کو ہنگو میں قیام امن کا سب سے بہترین فارمولا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں اہل تشیع سے ہمدردانہ اپیل کی گئی تھی کہ اپنے خطے میں امن کی خاطر آپ حضرات اپنی رسومات عبادت گاہوں تک محدود کرلیں، اس میں آپ کی حفاظت بھی ہے اور ملک دشمن عناصر کی ناکامی بھی۔ یہ حالات اب اجازت نہیں دیتے کہ اجتماعی شکل میں رسومات باہر نکل کر منائے جائیں کیونکہ ملک کے ہر گلی کوچے میں خودکش حملے اور تباہی و بربادی کا بازار گرم ہے۔

بہر حال حضرت کی کوششوں سے امن کی کوششیں بڑی حد تک کامیاب ہوئیں اور حکومت نے اس کا اعتراف بھی کیا، اُس وقت کے کمشنر جناب عمر آفریدی صاحب، ڈی آئی جی جناب عبدالمجید صاحب اور ہنگو کے ایس پی جناب وقار صاحب نے خود بندہ سے درخواست کی کہ حضرت استاذ صاحب کے شکریہ کے لئے ہم اعزاز یہ دینا چاہتے ہیں اور اگر وہ تشریف نہ لا سکیں تو ہم مدرسہ حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت کی صحت اُن دنوں میں ٹھیک نہ تھی، آپ نے جانے سے معذرت کی تو میں حضرت کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب کو ساتھ لے گیا۔ تمام افسران موجود تھے، ملاقات کے بعد جب بیٹھے اور حضرت کا پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت کے بیٹے کو ساتھ لایا ہوں۔ اس پر تمام افسران اُٹھے اور مولانا محمد یوسف کو ایک بار پھر ملے اور پھر اونچے الفاظ میں حضرت کی خدمات کو سراہتے ہوئے اُنہیں خراج تحسین پیش کی کہ ہنگو میں امن کے حوالے سے اگر اُن کا اساسی کردار نہ ہوتا تو یہ مسائل حل نہ ہو پاتے۔ یہ نوشتہ دیوار ہے اگر کوئی اس کے خلاف کچھ کہتا ہے یا اس بات کا قائل ہے کہ استاذ صاحب نے زندگی بھر امن کے علاوہ بھی کوئی بات کی تھی تو وہ کذاب ہے کیونکہ وہ تواتر کے خلاف بول رہا ہے۔

۲۰۰۶ء میں حضرت نے امن کے لئے جو فارمولا پیش کیا تھا، اس پر معروف شیعہ رہنما سید زاہد حسین شاہ صاحب کے ساتھ آپ کی ملاقات اور مکالمہ بھی ہوا تھا اور اُنہوں نے ان تجاویز کی وقعت کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن اس کو باقاعدہ معاہدہ کی شکل دینے کے لئے قوموں کے مابین جرگہ کا انعقاد باقی تھا۔ اس کے لئے K.D.A کوہاٹ میں دونوں اقوام کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی۔ اجلاس میں دو دو نمائندوں کو اختیار دینے کا فیصلہ ہوا، شیعہ حضرات کی طرف سے اپنے دو نمائندوں کے نام اسی مجلس میں سامنے آئے۔ میں استاذ صاحب کی مشاورت کے بغیر نام نہیں دے سکتا تھا، میں نے وقت مانگا کہ قوم سے مشورہ کے بعد نام دوں گا۔ میں حضرت استاذ صاحب کے پاس آیا اور

عرض کیا کہ جرگہ کی صورت بن رہی ہے، ہماری طرف سے نمائندے کون ہونے چاہئیں؟ اس پر حضرت نے ایک نام میرا تجویز فرمایا اور دوسرے نام کا مجھے قوم سے مشاورت کے بعد اختیار دے دیا۔ میں نے مولانا نیاز برخان اورکزئی مرحوم کا نام پیش کیا۔ ہماری کوشش جاری رہی ۔ بالآخر ۲۰۰۹ء میں ہم اُس فارمولے کے مطابق جو ہماری رائے میں ہنگو کے اندر قیام امن کا ٹھوس فارمولا ہوسکتا ہے، جرگہ کر کے معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ اس معاہدہ پر تمام سرکاری افسران کے دستخط موجود ہیں ۔ ذیل میں اس معاہدہ کا متن پیش کیا جاتا ہے:

جرگہ سانحہ ہنگو محرم ۲۰۰۶ء

فریق اول: جماعت اہل السنۃ ہنگو

فریق دوم: جماعت اہل التشیع ہنگو

۱۰ محرم ۲۰۰۶ء کے جلوس میں خود کش دھماکے اور اس کے بعد املاک کو جلانے سے اہلیان ہنگو سمیت اردگرد کے عوام کو مصائب میں مبتلا کیا گیا، ان فسادات کو روکنے کے لئے اور امن کی فضا قائم کرنے کے لئے حکومت نے فریقین کی رضامندی سے اورکزئی ایجنسی کا ۱۲ رکنی ثالثی جرگہ مقرر کیا، لیکن وہ حتمی فیصلہ نہ کر سکا اور محرم، ۲۰۰۷ء، ۲۰۰۸ء اور جنوری ۲۰۰۹ء کے دوران پھر فسادات ہوئے ۔ اس لئے جناب کمشنر صاحب کوہاٹ نے ڈویژن کی سطح پر ۲۵ رکنی جرگہ مقرر کیا، جس میں کچھ سابقہ ممبران کے علاوہ ہنگو امن کمیٹی کے ارکان، متعلقہ ایم ۔این ۔اے، ایم پی ایز اور ناظمین کو بھی شامل کیا گیا۔

اس جرگہ کے مختلف اجلاس بمقام ہنگو، کوہاٹ منعقد ہوئے اور اس کے بعد اہل السنۃ کے جرگہ ممبران نے عزت گل اورکزئی، مولانا نیاز برخان اورکزئی اور اہل تشیع کے جرگہ ممبران نے جمال حسن اورکزئی اور سید زاہد حسین ابراہیم زئی کو''واک''(اختیار) دیا کہ وہ ہنگو امن کے حوالے سے مناسب فیصلہ کریں۔

چنانچہ اس کے بعد ہمارے جرگہ ممبران کے آپس میں، امن کمیٹی ہنگو اور انتظامیہ کے ساتھ کئی اجلاس ہوئے ۔ مورخہ ۱۵،۷،۲۰۰۹ کو جناب امیر حیدر خان ہوتی وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے بمقام اورکزئی ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہنگو میں اس تنازعہ کو حل کرنے کی ہدایت کی، جس میں سینئر وزیر بشیر بلور، رحیم داد خان، میاں افتخار حسین اور صوبہ کے اعلیٰ حکام موجود تھے، لہٰذا مورخہ ۲۳ جولائی سے ۳۰ جولائی تک مسلسل کوہاٹ اور ہنگو میں ہمارے اجلاس ہوتے رہے۔

آج تین اگست ۲۰۰۹ء کو ہم جرگہ ممبران موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں کہ

۱۔ آئندہ کیلئے اہل السنۃ واہل تشیع مذہبی رسومات اپنے اپنے علاقوں میں ادا کریں گے جس کے لئے مقامی انتظامیہ

متعلقہ مشران کی مشاورت سے وقت کا تعین اور اس کے لئے مناسب سہولیات فراہم کرے گا۔

۲۔ہم ہنگو مین روڈ پر مذہبی رسومات کی ادائیگی سے متعلق متفقہ فیصلہ دینے سے قاصر ہیں ،لہٰذا حکومت کو اختیار ہو گا کہ ہنگو کے وسیع تر مفاد میں گزشتہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب فیصلہ صادر کرے ،دونوں فریق اس کی پابندی کریں گے۔

۳۔خلاف ورزی کرنے والے فریق پر مبلغ دو کروڑ روپے جرمانہ ہوگا ،جس کی وصولی یہ جرگہ حکومت کے وساطت سے کرے گی ، نیز قانونی کارروائی بھی ہوگی۔

۴۔ہنگو امن کمیٹی بدستور اپنے فرائض سرانجام دے گی اور ضرورت کے مطابق اس جرگے سے رجوع کر سکے گی۔

۵۔کسی تنازع کے حل کے لئے ،متفقہ یا اکثریتی فیصلہ نہ آنے کی صورت میں ڈی سی او ہنگو کا فیصلہ آخری وقطعی ہوگا۔

اس معاہدہ پر فریقین سمیت تمام اعلیٰ افسران اور حکومتی اراکین کے دستخط موجود ہیں لیکن میں یہ افسوس سے نقل کر رہا ہوں کہ ہنگو میں پائیدار امن کے قیام کے لئے ہماری یہ کاوش جو بڑی حد تک حضرت کے فارمولے کے مطابق تھی ، جانبین سے قبول عام حاصل نہ کر سکی اور اس پر ایک دوسرے معاہدے کو لاکر اسے رد کر دیا گیا۔میری ذاتی رائے یہی ہے کہ ہنگو امن کے لئے یہی متفقہ تجاویز سنگ میل بن سکتے ہیں اور اس سے ہٹ کر کسی کوشش کو کامیاب کرانا ممکن نہ ہو سکے گا ، کیونکہ بڑی سوچ وبچار کے بعد جانبین کی امن پسند قوتیں اس فارمولے تک پہنچی تھیں ۔نامعلوم کن عناصر کی ایما اور کن وجوہات کی بنا پر اس متفقہ فیصلے کو متنازع بنانے کی کوشش کی گئی۔خود ذاتی طور پر مجھے اس معاہدے سے پیچھے ہٹنے اور نئے معاہدے پر دستخط کے لئے جس اذیت سے گزرا آگیا وہ ایک الگ داستان ہے ،قاتلانہ حملے ہوئے ،حکومت کی طرف سے سخت تکالیف پیش آئیں ،لیکن الحمدللہ تمام مصائب کے باوجود میں حضرت استاذ صاحب کے دیئے ہوئے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا اور کیوں ہٹوں کہ میں دیانت دارانہ طور پر ہنگو کے شیعہ سنی دونوں طبقات کی خیرخواہی اس معاہدے میں سمجھتا ہوں ۔ میں نے تمام قوتوں کو دوٹوک جواب دیا ہے کہ میری گردن کٹ سکتی ہے میں اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا ، نہ ہی کسی ایسی بات کی حمایت کر سکتا ہوں جو امن کی ضامن نہ ہو ،یہی میرے استاذ کی وصیت ہے۔

حضرت الاستاذ امن کے لئے ایسے بے لوث سپاہی تھے کہ صوبہ بھر میں جہاں حالات مخدوش ہوئے آپ نے اپنی وسعت کے مطابق کردار ادا کرنے کی کوشش کی کہ کسی طرح امن بحال ہو۔طالبانائزیشن کے دور میں شمالی وزیرستان کا امن معاہدہ آپ کی کوششوں سے پایہ تکمیل تک پہنچا ،جنوبی وزیرستان میں امن لانے کے لئے کوششیں کیں ،خیبر ایجنسی میں قیام امن کے لئے آپ نے کئی اسفار کیے ۔''ڈوگرنہ'' کے مقام پر منگل باغ سے مذاکرات کر

کے اسے حکومت کے ساتھ صلح اور امن معاہدوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، لیکن افسوس کہ ان طاقتوں کو امن کی ہر کوشش اغیار کی کاسہ لیسی نظر آتی تھی۔ ان بداندیشوں نے آپ کی پیرانہ سالی میں اتنے دور اسفار کو بھی اہمیت نہ دی اور قیام امن کی طرف اپنا رجحان تک ظاہر نہ کیا۔ حضرت نے یہ کوششیں جناب علی محمد جان اورکزئی (گورنر سرحد حالیہ، کے، پی، کے) کے اصرار پر کیں تھیں۔ آپ ان حالات پر فرمایا کرتے تھے کہ "یہ عجیب لوگ ہیں، اپنے ہی گھر کو جلانے کے درپے ہیں، پاکستان ہمارا گھر ہے، پاکستان کو نقصان پہنچانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا اور اپنی حیا کو تار تار کرنا ہے۔ اتنی بات تو جانور بھی سمجھتا ہے کہ جس جگہ رہتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اس جگہ کی رکھوالی کرتا ہے۔" استاذ صاحب ان قوتوں پر سخت افسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی مٹی کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔

اورکزئی ایجنسی میں پہلا واقعہ "جمالدار چوک غلجو" میں لیویز اہلکاروں پر حملے کی شکل میں پیش آیا۔ اُستاذ صاحب نے ہم سب کو طلب کر کے مشاورت کی اور فرمایا کہ "یہ اندھا فتنہ ہے، یہ فتنہ مزید پھیلے گا، آپ لوگوں نے اپنی زبانیں تک اس سے بچا کر رکھی ہیں، یہ لوگ ملک میں امن کو تاراج کرنے کے لئے اغیار کی منصوبہ بندیوں پر سامنے لائے گئے ہیں۔ حکومتی اداروں اور عوام میں ٹکراؤ اور نفرت پیدا کرنے کی پالیسی اُن کی تشکیل کردہ ہے جو پاکستان کے ایٹمی قوت ہونے سے خائف ہیں۔ بدفہم ارباب اقتدار سے کوئی توقع نہیں کہ وہ اس سازش کو سمجھ کر اس کا مفید حل نکال سکیں، نتیجۃً یہ خطہ جلے گا اور ملک کمزور ہوگا، لیکن خبردار! یہی میرا فتویٰ ہے اور یہی آپ کو نصیحت ہے کہ اغیار کی سازش کو تکمیل کا ذریعہ بننے والی قوتوں کو ہمیشہ دین اور پاکستان کا دشمن سمجھیں خواہ وہ کسی صف میں ہوں اور ان سے اپنا دامن بچائے رکھیں۔"

جب لوگوں کو ذبح کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے اسے 'خوارج' کا عمل قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ "بالفرض اگر کوئی کسی جرم کا مرتکب ہے تو اولاً تو اس کا احتساب حکومت کے ذمہ ہے، اگر یہ قوتیں اپنے اقتدار اور ان علاقوں کے کنٹرول کی وجہ سے مرتکب کبیرہ کو قتل کرتے ہیں تو یہ اہل السنۃ کا نہیں خوارج کا مسلک ہے اور خوارج کی گمراہی محتاج بیان نہیں۔" آپ کی ان باتوں سے ہمیں سخت پریشانی لاحق ہوتی کیونکہ مسلح قوتوں کی طرف سے آپ کو نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ تھا، ایک بار عرض کیا گیا کہ حضرت! یہ باتیں کھلے عام نہ کیا کریں، اس سے آپ کے سر کو خطرہ ہے۔ فرمایا کہ "اگر میں اس مسئلہ کو واضح نہیں کروں گا تو عنداللہ مسئول ہوں گا۔"

اس پر بعض قوتوں نے آپ کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا، اس کے لئے جو گہری سازشیں اور چال چلے گئے اُن کی تفصیل لاحاصل ہے، ہاں اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ امن کے اس بے لوث سپاہی کا راستہ بند کرنے کے لئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کے اعزہ واقارب میں سے کسی کو مسلح تحریکوں میں شامل کرنے کی کوشش کی

جائے، ایسے ناپختہ نوجوانوں کو بہکانے کی بہتیری کوششیں ہوئیں اور صرف ایک کوشش کامیاب رہی، لیکن اس کوشش کے بل بوتے امن دشمنوں کو اپنی کمائی مل گئی اور حضرت کو بدنام کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، جب حضرت نے علی الاعلان ایسے لوگوں سے برأت کا اظہار کیا اور دوٹوک انداز میں واضح کیا کہ اس ترتیب پر چلنے والوں کو قطعاً درست نہیں سمجھتا، چاہے، وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، تو سازش کی اگلی کڑی کا آغاز ہوا اور بوری بند لاشیں مدرسہ کے آس پاس کے علاقوں میں پھینکنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس سے یہ تأثر دینا مقصود تھا کہ علاقہ میں سب سے زیادہ اثر ورسوخ آپ کا ہے اور یہ سب کچھ آپ کے ایما کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ حضرت نے ایک بار واضح طور پر ہم سے فرمایا کہ یہ سب کچھ مجھے بدنام کرنے اور میرا گھیرا تنگ کرنے کی سازش ہے لیکن کیا کوئی رتی بھر عقل رکھنے والا یہ باور کر سکتا ہے کہ میں یہ کام کروا کے لاشیں اپنے گھر کے سامنے پھینکوں گا؟ ایسا تو دُنیا کا کوئی بے وقوف آدمی بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے خود حضرت کی شہادت پر اُن حلقوں کی طرف سے یہ پیغامات سنے جو حضرت کو راستے کی دیوار سمجھتے تھے کہ آج ہم آزاد ہو گئے، اب جو چاہیں گے کریں گے ہمارے راستہ کی بڑی رکاوٹ دور ہو گئی۔

حالانکہ جب ان قوتوں کا ظہور ہو رہا تھا تو اس وقت استاذ صاحب نے ہمیں ان کے اثرات بتلا دیئے تھے اور آپ حد درجہ متفکر تھے کہ اس فتنے کا راستہ آغاز میں روک دیا جائے، اس لئے گورنر افتخار حسین شاہ کے دور میں آپ نے دیگر اہل علم اور سیاسی وسماجی زعما سے مل کر اس بات کے لئے دوڑ دھوپ کی کہ حکومت اور کمانڈر نیک محمد کے درمیان صلح ہو۔ میں اس صلح میں خود شریک تھا، کور کمانڈر صفدر حسین اور نیک محمد کے درمیان شکئی مدرسہ میں ان حضرات کی محنتوں سے مذاکرات کا آخری مرحلہ تکمیل تک پہنچا۔ کمانڈر نیک محمد نے اپنی بندوق اُٹھا کر کمانڈر صفدر حسین کے ہاتھ میں تھمائی۔ ایک دوسرے کو ہار پہنانے اور گلے ملے۔ ہمیں توقع تھی کہ ان شاء اللہ یہ سلسلہ یہی تھم جائے گا لیکن حضرت استاذ صاحب اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکائے رکھنا عالمی طاقتوں کی اشد ضرورت ہے اور وہ ہم جیسے فقرا اور کمزوروں کی ان کوششوں کو بارآور ہونے نہیں دیں گے، تاہم حضرت نے کوشش کبھی نہیں چھوڑی اور نہ ہمیں حوصلہ ہارنے دیا۔

جب ہمارے علاقوں میں مسلح قوتوں کے اثرات آنا شروع ہوئے تو آپ نے عامۃ الناس کے نمائندوں کو بلا کر ایک کمیٹی بنائی کہ اپنے علاقوں میں حفاظتی چوکیاں قائم کر کے کسی بیرونی شخص کو داخل ہونے اور علاقہ کے نوجوانوں کو ورغلانے یا امن تاراج کرنے کی اجازت نہ دیں۔ اس سے بھی بعض علاقے بڑی حد محفوظ رہے لیکن بہر حال یہ ایک ایسا طوفان تھا جو کسی ایک فرد کے عزم وحوصلہ اور ہمت سے رُکنے والا نہ تھا۔ اس میں حکومت کے اخلاص کے ساتھ دلچسپی اور مفاد سے بالاتر ہو کر سیاسی وسماجی زعما کا کردار چاہیے تھا جو افسوس کہ تاحال ناپید ہے۔ ہمارے ہاں سنگین

سے سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لئے ارباب اقتدار سے لے کر ایک عام سیاسی رہنما تک کی یہی سوچ ہوتی ہے کہ اس میں میرا مفاد کتنا ہے؟ اگر ذاتی یا گروہی مفاد نہ ہو تو ملک وقوم جائیں بھاڑ میں کسی کو ذرا برابر فکر نہیں ہوتی، پھر خوف، بزدلی اور بیرونی دباؤ اس پر مستزاد ہے جو قوم جرأت وشجاعت سے محروم ہو، اخلاص سے تہی دست اور مفاد پرستی کی غلام ہو اور اپنے فیصلے آزادانہ طور پر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو وہ ''امن'' کا خواب شرمندۂ تعبیر کرلے کم ازکم میری رائے میں یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

حضرت استاذ صاحب علاقائی جھگڑوں کے خاتمہ کے لئے بھی ہمیشہ سے کوشاں رہے اور اس میں اپنا قیمتی وقت، وسائل اور صلاحیتیں باوجود ضعف وعلالت کے خرچ کرتے تھے۔ میں ایسے دو جھگڑوں میں آپ کے کردار کی طرف اشارہ کروں گا۔

اورکزئی ایجنسی لیڑہ میں ''انور یہ زیارت'' پر علاقہ کے شیعہ سنی حضرات کی چپقلش اتنی بڑھی کہ جنگ کی صورتحال پیدا ہونے لگی، یہ کسی بزرگ کا مقبرہ ہے، اہل تشیع اسے اپنا بزرگ بتلاتے ہیں اور اس کے قبر پر عرس وغیرہ کرتے ہیں جب کہ یہ اہل السنۃ کے علاقہ میں ہے۔ عرس کے ایام میں راستہ پر تصادم کی صورت بن جاتی۔ حضرت اقدس اس میں اہل السنۃ کے قومی ملکان کے پاس خود تشریف لے گئے اور انہیں سمجھایا کہ یہ جنگ کا مسئلہ نہیں، نہ جنگ سے حل ہوگا، اس پر گفت وشنید کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔ دوسری طرف اپنے معتمد ساتھیوں کو حکومت کے ذریعے اس مسئلے کے حل کی طرف متوجہ کیا، بحمد اللہ یہ مسئلہ آپ کی توجہات سے بلا جنگ وجدال حل ہوگیا۔

۲۰۰۴ء، ۲۰۰۵ء میں اورکزئی ایجنسی کی دو سنی اقوام ''شیخان'' اور ''مشتی'' کا کوئلے کی کانوں پر جھگڑا شروع ہوا اور تین سال تک متواتر دشمنی چلتی رہی۔ اتنا بھاری اور خطرناک اسلحہ جانبین سے استعمال ہوتا تھا کہ حکومتوں کے جنگ کا گمان ہوتا تھا۔ تقریباً اسی (۸۰) کلومیٹر کا علاقہ اس جنگ کی زد میں تھا اور سخت تکلیف دہ صورتحال تھی۔ اس جھگڑے کو ختم کرنے میں قبائلی رہنما، حکومت اور سیاسی حلقے پوری طرح ناکام تھے لیکن حضرت کی وجاہت، اخلاص اور سخت محنت سے دونوں اقوام میں تین سال بعد صلح کی فضا بن گئی۔ اس مرحلے پر حکومت نے بھی تعاون کیا، الحمد للہ ''وام'' میں دونوں اقوام کا اجتماع ہوا، تمام قبائلی رہنماؤں کی موجودگی میں صلح کا اعلان کیا گیا اور اس جنگ میں دس اموات اور اٹھارہ زخمی افراد کے نقصان کی تلافی کا لائحہ عمل طے کیا گیا۔

حضرت استاذ صاحبؒ جیسے امن پسند اور مخلص رہنما کو ہماری نسلیں مدتوں رویا کریں گی، صحیح بات ہے کہ میں ذاتی طور پر حضرت کی شہادت کے بعد مکمل طور پر ٹوٹ چکا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں یتیم ہوگیا ہوں اور حوادث زمانہ اور مصائب سے اپنے حفاظتی ڈھال اور سہارے کو کھو چکا ہوں، جتنے بھی سخت حالات آئے، حضرت الاستاذ کا

وجود ہماری پناہ گاہ اور سہارا ہوتا اور ہم اپنے آپ کو ایسا محفوظ سمجھتے جیسے قلعے کا طاقتور حصار چاروں طرف موجود ہو۔

ذاتی اور نجی زندگی میں بھی حضرت کے میرے اُوپر بے پناہ احسانات رہے۔میں نے آپ جیسا متقی اور محتاط انسان زندگی میں پھر نہیں دیکھا۔ایک بار پیر حیدر علی شاہ ایم۔این۔اے عوامی نیشنل پارٹی (نریاب ہنگو) آپ کے پاس حاضر ہوئے اور پانچ لاکھ روپے کا ہدیہ مدرسہ میں کنواں کھودنے کے لئے پیش کیا چونکہ مدرسہ میں پانی کی مستقل تکلیف تھی، اس لئے یہ رقم ضرورت بھی تھی لیکن استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس فنڈ میں قوم کا حصہ ہے، آپ اسے 'شاہوخیل' پائپ لائن کی مرمت وغیرہ پر لگادیں تا کہ ساری قوم کا فائدہ ہو۔ ہمارے مدرسہ کے لئے گاؤں کے ایک صاحب نے اپنے گھر کے کنویں سے پائپ لائن بچھائی ہے اور بحمد اللہ اُس سے پانی کی ضرورت پوری ہورہی ہے۔

جب ہماری قوم ''شیخان'' کے لئے کوئلہ کان سے رائیلٹی فنڈ ملنا شروع ہوا تو ہم سب نے مشورے سے کچھ فنڈ مدرسہ میں ٹیوب ویل کی کھدائی کے لئے قوم سے منظور کروا کر استاذ صاحب کو پیش کیا کہ چونکہ مدرسہ میں بھی قوم کے بچے پڑھتے ہیں اور یہاں پانی کا انتظام ایک طرح کی قومی ضرورت ہے اس لئے آپ یہ قبول فرمالیں تو حضرت نے انکار فرمادیا اور کہا کہ اس میں قوم کی بیواؤں اور بچوں کا حق ہے، میں اسے استعمال کرنے سے معذور ہوں، آپ اسے کسی اجتماعی قومی مفاد میں خرچ کردیں، ہم نے کافی اصرار کیا لیکن آپ کسی طرح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

میں ایک دفعہ بجلی کے بل کا مسئلہ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا کہ حضرت حکومت بڑے ناروا ٹیکس لاگو کرتی ہے، یہ جو لوگ بجلی کے کنڈے استعمال کرتے ہیں کیا یہ جائز ہوگا؟ تو آپ نے سختی سے اس کی تاکید فرمائی کہ بجلی کا بل ادا کرنا لازمی اور ضروری ہے، اگر کوئی واقعی مسئلہ ہے تو اُسے متعلقہ محکمے سے حل کرانا چاہیے، لیکن اس بنیاد پر بجلی چوری کرنا ہرگز جائز نہیں، یہ تو گناہ کبیرہ ہے اور حرام ہے۔ یہ پوری قوم کی امانت ہے، کسی ایک فرد کے حق کی تلافی تو آسان ہے لیکن پوری قوم کے حق کو ضائع کرنے کی صورت میں تلافی مشکل بلکہ ناممکن ہوتی ہے، اس حوالے سے آپ نے اہل علاقہ کو بھی ہدایات دیں۔

ایک دفعہ میں نے کچھ ہدیہ کی رقم ذاتی ضروریات کے لئے پیش کی، اُس وقت کچھ مہمانوں سے گفتگو میں مشغول تھے، دھیان پوری طرح میری طرف نہ رہا، میں جب مدرسہ کے دروازے سے باہر آنے لگا تو دوڑتے ہوئے میرے پیچھے آئے کہ حاجی صاحب! معذرت خواہ ہوں، مہمانوں کی وجہ سے آپ کی بات کی طرف توجہ نہ دے سکا، یہ رقم کس مد کی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! ذاتی استعمال کے لئے پیش کی ہے۔ اس لئے مدرسہ کی تصریح نہیں کی کیونکہ میری عادت تھی کہ اگر کسی خاص مد کے لئے پیش کرتا تو صراحت کردیتا، اس پر آپ نے قبول فرماکر رکھ لی۔

شہادت سے چند دن قبل مجھے بلا کر فرمایا، حاجی صاحب! ہر ذی روح نے اس دُنیا سے رخصت ہونا ہے، میں نے

بھی چلے جانا ہے، حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، علاقہ جنگ کی لپیٹ میں ہے، میں نے بڑی محنت سے کتابیں جمع کی ہیں اور ایک کتاب بھی لکھی ہے، دل چاہتا ہے کہ سارا ذخیرہ آپ محفوظ کرلیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میرا حجرہ حاضر ہے، وہاں ایک کمرہ کتابوں کے لئے مختص کردیں گے۔ فرمایا کہ یہ ٹرک میں آئیں گی۔ میں نے عرض کیا کہ ٹرک میں بھیج دوں گا، اس کی فکر نہ کریں۔ پھر کچھ سوچ کر آپ نے اساتذہ سے مشورہ کے بعد جواب دینے کا کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر کتابیں مدرسے سے نکالنے کی کیا وجہ ہے، لیکن اُستاذ صاحب کی بات اگر سمجھ میں نہ بھی آتی، تب بھی ہم لبیک کہنے کے عادی تھے، کبھی چوں چراں نہیں کی۔ بہرحال کتابیں منتقل نہ ہوسکیں اور پہلا بم اُنہیں پر آ کر گرا، تب اندازہ ہوا کہ یہ سارا منظر تو آپ پر پہلے سے منکشف کردیا گیا تھا اور اس کی پیش بندی کے طور پر فرمارہے تھے، لیکن اللہ والوں کو جب تقدیر کا الہام ہوتا ہے تو وہ تدبیر میں بھی زیادہ نہیں پڑتے، شاید اسی وجہ سے ارادہ ترک کردیا ہو۔

حضرت استاذ صاحب کی کس کس ادا کو یاد کروں، آپ کی عاجزی وتواضع ایسی تھی کہ کبھی مجھے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے نہیں دیا، ہمیشہ آگے بٹھاتے خود پیچھے بیٹھتے۔ ایک بار میں نے بڑی لجاجت اور منت سماجت سے آگے بٹھایا۔ بس ہنگو شہر تک گاؤں سے گئے، وہاں سے پھر پچھلی سیٹ پر آگئے۔ خودنمائی اور شہرت سے طبعی نفرت تھی، بلا کے مہمان نواز تھے، مجھے یاد نہیں کہ کبھی مہمان کو اپنی جگہ بیٹھ کر ہی رخصت کیا ہو، اُس کے ساتھ اُٹھ کر دروازے تک تو ضرور آتے۔ مروت کا غلبہ تھا، اپنی تکلیف کا اظہار بھی مروت میں نہیں کرتے تھے۔ میں نے زندگی میں ایسی درخشاں صفات والا شخص نہیں دیکھا۔ بلاشبہ آپ کی رحلت ہنگو عوام کے لئے عظیم سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے دیئے ہوئے نظریے اور مشن پر ہمیں قائم رکھے اور اس کی لاج رکھنے کی توفیق دے۔ (آمین ثم آمین)

کئی دماغوں کا ایک انسان

احمد عالم، پشاور

اس کائنات رنگ وبو کے حسن کا ایک پہلو خداوند کریم کے پیدا کردہ عجائب ہیں جنہیں دیکھ کر عقل کے گھوڑوں

کی سانسیں اُکھڑ جاتی ہیں۔فلسفہ وحکمت دم بخود رہ جاتے ہیں اور زبان وقلم کی تان ٹوٹ جاتی ہے۔ان کے حسن حقیقی کی تصویر پیش کرنا انسانی بس سے باہر اور اُن کے کمال ذاتی کا کامل ادراک عقل وشعور سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہ 'عجائب' مخلوق خداوندی کے ہر صنف میں بکھرے، خداوند قدوس کی کبریائی میں نغمہ سرا ہیں۔آپ نے غیر انسانی 'عجائب' کا ذکر ضرور سنا ہوگا لیکن خود انسانوں میں بعض شخصیات ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جن کی محیر العقول صلاحیتیں، استعدادوں کا تنوع، فکر ونظر کی وسعت، عقل وشعور کی گہرائی اور فہم وفراست کی بلندی عام انسانی سطح سے بہت اُونچی ہوتی ہے اور اُن کا اصل مقام اور کامل حقیقت انسانی ادراک سے باہر دکھائی دیتی ہے۔آپ نے کبھی ایسے انسان دیکھے ہوں یا نہیں، مجھے ایسے ہی ایک محیر العقول انسان کی سال ہا سال صحبت میسر آئی ہے اور میرے فکر ونظر اور نگاہ نے پھر آج تک ایسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی۔میری مراد حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ ہے۔

جی ہاں! لوگ بعض حضرات کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔یہ انجمن کا لفظ حضرت کے لئے مجھے اتنا تنگ دامن دکھائی دیتا ہے کہ میں نے حضرت میں جو کچھ دیکھا ہے اُس میں بالکل نہیں سمٹتا۔آپ پورا عالم کہہ دیں تو شاید میرے فکر ونظر کی کچھ تسکین ہو سکے لیکن بعض اوقات عالم بھر کی فکری وسعت سے میں آپ کی نظر وفکر اور عزم واستقلال کو بڑھ کر پاتا۔لہٰذا میں نے ایک انسان کی شکل میں کمالات کا ایک عالم نہیں بلکہ کئی عالم مشاہدہ کیے۔کوئی اسے مبالغہ سمجھے تو وہ معذور ہے کیونکہ

آنکھ والا تیرے جو بن کا تماشہ دیکھے
دیدہ کور کو کیا آئے نظر ،کیا دیکھے

ویسے بھی یہ بات حضرت کے تمام متعلقین جانتے ہیں کہ حضرت کے کمالات کا تذکرہ اُن سے اجنبی شخص مبالغہ تصور کرتا ہے اور واقف حال سمجھتا ہے کہ ان سطروں سے ہرگز اُن کی شان حقیقی کا تصور نہیں اُبھرتا۔حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ سے بندہ کا تعلق تلمذ یا مریدی کا نہیں بلکہ بالکل جُدا نوعیت کا ہے۔بندہ نہ تو عالم دین ہے نہ حافظ قرآن، نہ کسی دینی تحریک سے باقاعدہ تعلق ہے نہ شکل وصورت سے اس صف کا آدمی دکھائی دیتا ہوں۔ایک عام سا شہری اور حکومت کے ایک محکمے میں ملازم ہوں۔لیکن حضرت اُستاذ صاحبؒ کے ساتھ ملی وسماجی معاملات میں ایک طویل عرصہ تک معاونت اور حکومتی اداروں اور اُستاذ صاحبؒ کے مابین سفارت کی سعادت ضرور حاصل رہی ہے۔ یقین جانیے میں اُستاذ صاحبؒ کو عالم دین ہونے کی حیثیت سے بس اتنا ہی جانتا ہوں جتنا ایک عام مسلمان ایک عالم کے بارے میں تصور رکھ سکتا ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ لکھ سکتا ہوں کہ وہ ایک بڑے عالم تھے۔اب کس فن کے بڑے عالم تھے، اس کا مجھے کوئی ادراک نہیں۔میں نے حضرت اُستاذ صاحبؒ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ایک اور زاویہ سے ہے

اور ذیل کی سطور میں کوشش کروں گا کہ اس زاویہ کی کچھ تفصیل بیان کرسکوں۔

میں بچپن سے اُستاذ صاحبؒ سے واقف تھا، آپ کے ہاں آمدورفت بھی رہتی، آپ کی شخصیت ہمارے خاندان کے لئے ایک بزرگ کی تھی۔ ایسے بزرگ جن سے لوگ دُعا و توجہ کی درخواست کرتے ہیں اور اپنی مشکلات میں سہارا چاہتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عمدہ عصری تعلیم کی توفیق دی۔ میرے بھائی اور میں اچھے حکومتی عہدوں پر فائز ہوگئے، اس میں حضرت استاذ صاحبؒ کی دُعاؤں کا کردار تھا، کیونکہ ہم جو کچھ تھے اور جو کچھ ہیں یہ اُنہی کے دُعاؤں کا فیض اور نتیجہ ہے اور میرا یہ ایمان ہے کہ استاذ صاحب کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی دعا میرے حق میں رد نہیں ہوئی۔ بہر حال جب ہنگو کی سرزمین پر شوریدگی وفساد کے گہرے بادل چھانے لگے اور شیعہ سنی فسادات کے نام پر عام لوگوں کے استحصال اور مفادات پرست ٹولوں کے سونے کی چڑیا شکار کرنے کا کھیل شروع ہوا، تو اس ماحول میں کسی ایسے عبقری رہنما کی ضرورت تھی جو فسادات وتصادم کے عوامل کا گہرا جائزہ لیکر ممکنہ تباہی وافتراق کی پیش بندی کرے۔ اس وقت حضرت الاستاذ مسیحا بن کر اُٹھے اور علاقے میں سلگتے مسائل کے حل کے لئے ہمہ قسم قربانی کا عزم کر کے میدان عمل میں قدم رکھا۔ اُس وقت اگر ہم ہنگو اور گردوپیش کے سیاسی وسماجی ماحول کا تجزیہ کریں تو مختلف قسم کے منظرنامے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ شیعہ سنی تصادم کے پیچھے دونوں طرف کے کچھ ایسے عاقبت نااندیش عوام سازشوں کا نشانہ بنتے، جو ماحول کو حد درجہ خراب کرنے کے بعد حل کی تلاش کے لئے سرگرداں رہتے۔

۲۔ دونوں طرف انسانی جانوں کے ضیاع اور مالی نقصانات کو روکنے کے لئے سیاسی وسماجی رہنماؤں کی پالیسیاں یک طرفہ رُخ لئے ہوتی تھیں۔

۳۔ ان فسادات کو بعض عناصر اپنی سستی شہرت اور مالی مفادات کے حصول کے گھناؤنے کھیل کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔

۴۔ عمومی طور پر قومی سطح پر یہ ذہنیت پروان چڑھ چکی تھی کہ اس بحران کا واحد حل اقتداری غلبہ ہے۔ اس کے لئے جنگ واحد ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔

حضرت استاذ صاحبؒ اس سیاسی وسماجی منظرنامے کے اُفق پر ایک نئے ماہتاب کے طور پر طلوع ہوئے اور اس پورے منظرنامے کا رُخ بدلنے میں اساسی کردار ادا کیا، آپ نے مندرجہ ذیل پالیسیوں کا اجرا کیا:

۱۔ امن کو تہہ وبالا کرنے والے عناصر کی سرکوبی کے لئے حکومت اور ذمہ دار اداروں کو مفید عام تجاویز دیں۔

۲۔ امن شکنی کے جغرافیائی عوامل کا تجزیہ کر کے ہنگو میں نوآبادیاتی سسٹم کے ذریعے بعض علاقے سنیوں سے

آباد کروانے اور مخلوط روڈوں کی آمد ورفت ختم کر کے نئے روڈ تعمیر کروائے۔

۳۔امن شکنی کے سماجی وسیاسی عوامل کا تجزیہ کر کے سیاسی اداروں سے شیعہ سنی دونوں طبقات کے لئے آبادی کے تناسب سے وسائل کی تقسیم پر زور دیا۔

۴۔امن شکنی کے قومی عوامل کا تجزیہ کر کے قوم میں امن کی خاطر جرگہ اور گفت شنید اور حکومتی اداروں کے کردار کو فعال کرنے پر زور دیا تاکہ جنگ کی ثقافت ختم ہو اور باہمی قومی مسائل متفقہ قومی جرگوں کے ذریعے حل ہوں۔اس پر بطور شواہد میں ذیل میں کچھ واقعات ذکر کروں گا۔

۵۔مفاد پرست عناصر کو بے اثر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا حتی کہ اُن عناصر کی طرف سے آپ اور آپ کے متعلقین کو سخت نقصانات پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

۶۔آپ نے اس شعور کو اُجاگر کیا کہ برادران وطن میں کسی طبقہ کا استحصال نہ ہو بلکہ انصاف سب کے لئے یکساں ہو،اس لئے آپ کے امن فارمولے اہل سنت کے ساتھ اہل تشیع کے لئے بھی برابر کے مفید تھے اور اُن میں یک رُخے مفاد کی بو کبھی دکھائی نہ دی۔آپ کے ان مسائل پر بطور شاہد چند واقعات پیش کرنا چاہوں گا۔

۱۹۹۸ء کے فسادات میں آپ جنگ کے سخت مخالف تھے اور حکومت پر زور دیا کہ وہ کرفیو لگا دے۔کرفیو کی صورت میں اہل سنت سے زیادہ اہل تشیع کا فائدہ تھا۔ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کی اپنے حضرات کی طرف سے مخالفت بھی ہوتی تھی اور دو غلے عناصر کو آپ کے مثبت کردار سے تکلیف بھی ہوتی تھی۔لیکن چونکہ آپ کے پیش نظر جنگ کا خاتمہ ہوتا تھا چاہے کسی بھی صورت ممکن ہو۔اس لئے جزوی قومی فوائد پیش نظر رکھنے کے بجائے خطے کے وسیع تر مفاد میں کرفیو کی تجویز کا فیصلہ کیا۔مجھے خوب یاد ہے کہ خود ہمیں بھیج کر پہاڑوں سے مسلح سنی قوموں کو اُتارا کہ جنگ مسائل کا حل نہیں اور حکومت کے درمیان میں آنے کے بعد اپنے اُوپر حالات کی ذمہ داری لینے کا کوئی جواز نہیں،اب حالات کی ذمہ داری حکومت کی ہے اور اس میں حکومت کا تعاون لازمی وضروری ہے۔

اس وقت ان تمام تنازعات میں حکومت کے لئے لکھی ہوئی آپ کی تجاویز اور اُن کے نتیجے میں ہونے والے شیعہ سُنی معاہدات میرے پیش نظر ہیں،ان تمام معاہدات کی تحریریں حکومتی ریکارڈ پر موجود ہوں گی،کچھ تحریرات ہمارے احباب اس نمبر میں مہیا بھی کر دیں گے،عموماً یہ سارے معاہدات حضرت استاذ صاحبؒ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے ہیں۔ان کا ایک ایک لفظ،ایک ایک تعبیر اتنی نپی تلی اور قانونی ہوتی تھی کہ حکومت کی فعال اور ذہین بیوروکریسی دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔خود اہل تشیع کو اس بات کا ادراک ہوتا کہ آپ کے پیش کردہ تجاویز خطے کے مجموعی مفاد میں ہیں،لیکن جب ایک خطہ بیرونی سازشوں کی آماج گاہ ہو اور اُسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی

پوری آسانی دشمن کو میسر ہوتو وہاں ایک شخص کی صدا نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔ تاہم حضرت استاذ صاحبؒ باوجود سخت مشکلات کے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اپنی جدو جہد جاری رکھی۔

آپ کے فکر ونظر اور بصیرت کی گہرائی مجھ پر اس وقت بھی واضح ہوتی جب قومی وملی مسائل میں حکومت کی سینئر بیوروکریسی کے ساتھ ہماری میٹنگز ہوتیں اور وہ کسی مسئلے پر ہمارے ساتھ مشاورت سے روڈ میپ بنانا چاہتے یا کسی مرحلہ پر ان کی ترجیحات ہمارے ساتھ ٹکرا رہی ہوتیں تو عموماً ایسے موقعوں پر وہ انگریزی میں اس پر باہم ڈسکشن اور تبادلہ خیال کرتے، مجھے محسوس ہوتا کہ یہ آفیسرز تو اپنی دانشوری کے زعم میں اپنے لائحہ عمل اور تجاویز کے مقابلے میں دوسرے مؤقف کی معقولیت تسلیم کرنے میں لیت ولعل سے کام لیں گے۔ استاذ صاحبؒ بڑی توجہ سے یہ پوری گفتگو ملاحظہ کرتے جب وہ اپنی دانشوری بھگارنے سے فارغ ہوتے اور اپنے گمان میں اپنی بات اس انداز سے حتمی کر کے پیش کرتے گویا اب اس میں حذف واضافہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ،تو تب استاذ صاحب بولنا شروع کرتے اور ان کی گفتگو کا نمبر وار تجزیہ شروع فرماتے اور اپنی تجاویز بھی ساتھ ساتھ فراہم کررہے ہوتے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ہمارے بیوروکریسی اور اعلیٰ سطحی آفیسر دنگ رہ جاتے، وہ انگلیاں منہ میں پکڑ لیتے کہ یہ کس پایے کی بصیرت رکھنے والی شخصیت ہے۔ جس کی نگاہیں وہ سب دیکھ رہی ہیں جن کا ہمیں احساس وادراک بھی نہیں، انہیں اندازہ ہوتا کہ ہم نے کتابی دانشوری پیش کی ہے اور اپنا مشقی دماغ لڑایا ہے جب کہ یہ گفتگو باطن کی نظر کی روشنی میں دماغ سے نہیں دل کی طاقت سے ہورہی ہے۔ جن آفیسر کے ساتھ ایک دفعہ استاذ صاحبؒ کی میٹنگ ہوجاتی، اگر ان کے دل میں کچھ ذرا برابر ایمان ہوتا تو وہ ٹوٹ کر جھک جاتے اور پھر حضرت کے در پر نیاز مندانہ حاضری اور دعاؤں کی درخواست لے کر آنا سعادت سمجھتے تھے۔ یہ واقعات بالکل میرے سامنے کے ہیں، میرا موضوع دراصل یہ ہے کہ آپ نے حکومتی اداروں کو اس خطے میں تصادم و بدامنی کا بحران ختم کرنے کے لئے ایسی تجاویز مہیا کیں کہ اگر اس کا پاس رکھا جاتا تو یہ مسائل کب کے ختم ہوجاتے۔

اورکزئی ایجنسی کے علاقہ 'لیڑ' میں ایک مزار پر انگریز دور حکومت میں ۱۹۴۳ء سے شیعہ سنی تنازع چلا آرہا تھا۔ اس مزار کو 'میاں زیارت' یا 'انوریہ زیارت' کہا جاتا ہے۔ یہ اہل السنۃ کے علاقے میں واقع ہے لیکن اہل تشیع کا دعویٰ ہے کہ ان کے بزرگوں میں سے کسی کا مزار ہے، اس لئے اُن کا اس پر آنا جانا اور عرس میلے کرنے کا معمول رہا ہے۔ اس مزار کے لئے راستہ سنیوں کی اراضی سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس کی تعمیر نو پر علاقہ میں سخت اختلافات رونما ہوئے اور جنگ کی فضا بن گئی۔ عامۃ الناس کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کام سے پہلے حضرت کے پاس مشاورت کے لئے نہیں آتے تھے۔ بلکہ جب معاملات جانبین کے عناصر بگاڑ لیتے تھے تو پھر دوڑیں استاذ صاحبؒ اور مولانا عبداللہ

صاحبؒ کے پاس ہی آتیں کہ یہ مسئلہ حل کیا جائے۔اس سے حضرت کو سخت کوفت ہوتی کیونکہ مسئلہ کو ابتدائی مرحلے میں سادہ طریقے سے حل کرنا ممکن ہوتا تھا لیکن اتنا بگاڑ پیدا کرلیا جاتا کہ پھر سلجھانے کے لئے حضرت کو پوری پوری رات جاگ کر لائحہ عمل طے کرنا ہوتا۔حل کی ممکنہ صورتیں تلاشنا اور حکومتی اداروں کو اُن پر مطمئن کرنے کا مرحلہ اس سے زیادہ مشکل ہوتا۔دوسرا علاقے کی سماجی وجغرافیائی صورت حال ایسی تھی کہ اگر مسئلہ میں ایک دو دن تاخیر ہو جاتی تو جانوں کے ضیاع کا خطرہ حقیقت کا روپ دھار لیتا اور جنگ چھڑ جاتی۔اس لئے ان مراحل میں ہمیں فوری اور تندہی سے کام کرنا ہوتا تھا۔مجھے خوب یاد ہے کہ استاذ صاحبؒ نے مجھے عشاء کے وقت طلب کیا اور اس طرح کے ایک سنگین مسئلہ کے حل کی صورتیں لکھ کر حوالہ کیں کہ فوراً پشاور اعلیٰ سطحی حکومتی افسران تک پہنچا دیں۔اب یہ بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں اور ایک حکومتی افسر ہونے کے ناطے اس مشکل کا ادراک میں بخوبی کر سکتا ہوں کہ راتوں رات ایک مسئلے پر حکومتی اراکین کو اپنے موقف اور تجاویز سے آگاہ کرنا اور ممکنہ حل کے لئے آمادہ کر کے ماتحتوں کے نام احکامات جاری کروانا کتنا مشکل کام ہے۔میں اس رات یہ قضیہ نمٹا کر صبح فجر سے قبل ساڑھے چار بجے استاذ صاحبؒ کے پاس پہنچا، آپ بدستور جاگ رہے تھے اور مجھ سے پوری کارگزاری سُنی۔صرف چند گھنٹوں میں ہنگو سے پشاور، پشاور سے ہنگو معاملات کے مکمل حل کے ساتھ آنا جانا یہ ہمارے حضرت ہی کی کرامت تھی۔ایک بار رات ساڑھے بارہ بجے مجھے طلب فرمایا اور اس طرح کے حالات میں رات چار بجے تک لائحہ عمل اور تجاویز تیار کر کے روانہ کیا۔بحمداللہ میری حیثیت استاذ صاحبؒ کے لئے ایک سفیر کی تھی۔مجھے معلوم ہے کہ آپ کے سینے میں ملک وملت کا کتنا درد تھا اور وہ وطن خداداد کو بدامنی کے طوفان سے نکالنے کے لئے کس قدر کڑھتے تھے۔

بہرحال میں 'میاں زیارت' کے قضیہ کی بات کر رہا تھا، حضرت استاذ صاحبؒ نے اس قضیہ کے حل کا ٹاسک ہم چند دوستوں کو دیا اور پوری منصوبہ بندی کر کے ہدایات فراہم کیں، یہ مسئلہ اس لئے حساس تھا کہ ایک تو انگریز کے زمانے سے مختلف فیہ تھا۔دوسرا اہل السنۃ کی آبادی میں 'مقبرہ' کی وجہ سے ان کے مسائل بھی واقعی نوعیت کے تھے لیکن حضرت الاستاذ کی فکر کا مثبت پہلو اس وقت سامنے آیا جب آپ نے مسئلے کے یک رُخے حل کے بجائے دونوں فریقوں کے جذبات کا خیال رکھا۔آپ نے حکومت کو یہ تجویز دی کہ مزار کی تعمیر کا معاملہ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے اور اسے خود تعمیر کرے۔کسی ایک فریق کو بھی قریب نہ آنے دے۔اس طرح اہل تشیع کے جذبات کا استحصال بھی نہ ہوگا اور اہل السنۃ کو بھی مطمئن کرانا ممکن ہوگا۔

آپ کی تجویز یہ بھی تھی کی ایسے حساس مقامات کا کسی ایک فریق کی تولیت میں مستقل رہنا بدامنی کا بڑا سبب بنتا ہے۔لہٰذا حکومت براہ راست ایسے مقامات کا کنٹرول سنبھالے۔میں نے اس سے اندازہ کیا کہ اگر حضرت استاذ

صاحبؒ کو قوم، حکومت اور ملت کے مجموعی مفاد کے بجائے محض اپنے مسلکی جذبات کی تسکین مطلوب ہوتی تو وہ ضرور اس مسئلے کا یک رخا حل طلب کرتے اور اسی کے لئے زور صرف کرتے۔ آپ کی دعاؤں اور ہدایات کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے ہی پُر امن طریقے سے ہمیں یہ مسئلہ نمٹانے کی توفیق دی۔

حضرت الاستاذ صاحبؒ سیاسی نمائندوں پر اس حوالے سے زور دیتے تھے کہ علاقے میں شیعہ سنی دونوں طبقات کو اپنا پورا حق دیں لیکن آبادی کا تناسب ملحوظ رکھیں، ہم کسی کا استحصال نہیں چاہتے لیکن امن کی صورت حال اس وقت مخدوش ہوتی ہے جب ایک طبقہ اپنے حقوق کا استحصال کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ یقیناً اس مثبت سوچ اور فکر کی حامل شخصیت اب اس علاقے میں ناپید ہے۔

کاش! ہمارے ادارے اور ہماری قوم اس ہیرے کی قدر کر لیتی، اس کی باتوں اور درد کو سمجھتی اور اس کی فکر کو اپناتی تو آج بداعتمادی و بدامنی کے ہاتھوں اپنے سرسبز و شاداب و پُر رونق خطے کے اندھیر نگری بننے کا نظارہ نہ کرتی۔

حضرت استاذ صاحبؒ نے اس درجہ قومی و ملی درد اور قوم کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دینے کے باوجود کبھی ذاتی مفاد کے لئے ذرہ برابر کوشش نہیں کی۔ میں ایک دفعہ ایک، ایم، این، اے کے اُمیدوار کو آپ کے پاس لے کر گیا؟ اُس خدا کے بندے نے حضرت استاذ صاحبؒ کو نوٹوں کا ایک بنڈل مدرسے کے چندے میں دینا چاہا۔ استاذ صاحبؒ نے اس کو نہایت خوبصورت انداز سے ٹال دیا کہ وہ بھی حیران رہ گئے، ایسی استغنا کہیں اور نظر نہ آئی۔ ہاں! آپ کے استاذ گرامی حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ بھی اس طرز کے بزرگ تھے۔ حضرت کی ملاقات کے بعد میں اُن صاحب کو لے کر مولانا عبداللہ صاحبؒ کے خدمت میں حاضر ہوا، اُس صاحب نے وہاں بھی یہی حرکت کی اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کو آہستہ سے بنڈل پیش کر دیا، حضرت نے رکھ لیا، جب ہم واپس ہونے لگے تو چپکے سے حضرت نے وہ بنڈل مجھے تھما دیا کہ انہیں راستے میں واپس دے دینا۔ حضرت استاذ صاحبؒ اور مولانا عبداللہ صاحبؒ زمینی چٹائیوں پر بیٹھنے والے فقرا تھے، اُنہیں یہ شاہانہ چندے اور ہدیے کب گوارا ہو سکتے تھے۔ میں نے گاڑی میں اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا: لیجئے! صاحب اپنی رقم واپس لے لیں، اس بنڈل کا نہ کوئی نوٹ ہلا ہے نہ پن کھلا ہے۔ وہ بڑے حیران ہوئے کہ میں نے تو یہ ووٹ مانگنے کے لئے نہیں، بلکہ اپنی سعادت سمجھ کر دیئے تھے۔ میں نے کہا: آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کن فقرا کے دروازے پر آئے ہیں یہ فقر میں بادشاہی کر کے لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ بہرحال وہ آخر تک سر دھنتے رہے اور اُنہیں یہ بات سمجھ نہ آ سکی کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ ملی و قومی مسائل میں ان حضرات نے ہمیشہ اپنی ذاتی رقوم اور وسائل خرچ کیے، اس کا اعتراف حکومتی حلقوں کو بھی ہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ کی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ جب میں کسی حکومتی آفیسر خصوصاً ہنگو، کوہاٹ یا صوبے کی سطح پر

تعینات ہونے والے نئی حکومتی افسران کو" جو علاقائی مسائل کے حوالے سے ملنا ضروری سمجھتے تھے" کولاتا تھا، تو ہر آفیسر سے چند منٹ گفتگو کے بعد اس کی پوری شخصیت، ذہنی سطح اور فہم وفراست کا اندازہ لگا لیتے تھے اور اُس سے اُسی سطح کے مطابق بات چیت کرتے۔ چونکہ میرا تو ہر کسی کے ساتھ آنا جانا رہتا تھا۔ اس لئے مجھے حضرت استاذ صاحبؒ کی گفتگو میں واضح فرق محسوس ہوتا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں کہ ہر شخصیت سے اُس کی سطح مطابق ایک ہی مجلس میں ادراک کر کے گفتگو کی جائے۔

جو آفیسر ایک دفعہ وردی اور پروٹوکول کے ساتھ آپ کے ہاں جاتے اور ایک مجلس میں شرکت کر لیتے، مجھے یاد نہیں کہ آئندہ اُن کی حاضری اس کروفر سے ہوئی ہو بلکہ وہ اپنی وردی اور پروٹوکول ہنگو میں چھوڑ کر حاضر خدمت ہوتے اور حاضری بھی نیاز مندانہ ہوتی بلکہ بعض اوقات مجھے کہتے کہ ویسے حضرت سے حصول دُعا وزیارت کے لئے چلتے ہیں، چاہے کوئی حکومتی کام نہ بھی ہوتا۔

حضرت استاذ صاحبؒ مہمانوں کا اتنا خیال رکھتے کہ میرے ساتھ آنے والے حساس آفیسران کی حفاظت کی خاطر ایک گاڑی چپکے سے کہیں کھڑی کر کے اور اپنے ساتھی اُس میں بٹھا کر انہیں تاکید کرتے کہ ان کے پیچھے پیچھے فلاں جگہ تک جائیں۔ اس بات کی ہمیں خبر بھی نہ ہوتی۔ بعد میں احباب سے پتہ چلتا۔ خود محافظ رکھنے کا بالکل مزاج نہ تھا، آپ پر قاتلانہ حملوں کی کوشش ہوئی، اس کے باوجود کبھی گن مین نہیں رکھا۔ حضرت کی صحبت کا اثر تھا کہ میں انتہائی سخت حالات میں راتوں کا سفر بغیر محافظ اور حفاظتی اسلحہ کے ان راہوں پر کرتا لیکن اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا، نہ حضرتؒ کو کبھی حکومت کی سیکورٹی قبول کرنے کی حاجت ہوئی اور نہ ہمیں۔ الحمد للہ علی ذلک

انسپکٹر عابد علی کا نام حکومتی آفیسران میں ایک ممتاز نام ہے۔ ان کی جرأت بھی ضرب المثل تھی اور اپنا ایک دبدبہ بھی رکھتے تھے، ایک دفعہ وہ استاذ صاحبؒ کے پاس اپنے روایتی انداز سے گئے، مجھے اعتراف ہے کہ وہ ذہین ترین آفیسر تھے اور پاکستان کی بیوروکریسی میں ایسے نادر آفیسر کم آئے ہیں، لیکن واپسی پر مجھے کہا کہ دوست! یہ کیسی شخصیت ہے۔ اس درجہ کی فہم وفراست، اتنی گہری بصیرت...... یار! علما میں ایسے لوگ! میری تو سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے تو آج تک ایسا شخص نہیں دیکھا تھا۔ وہ تسلسل کے ساتھ حیرانگی میں بولتے رہے اور پھر مجھے یاد نہیں کہ عابد علی اس کروفر کے ساتھ حضرت کے ہاں گئے ہوں، عاجزانہ حاضر ہوتے تھے۔ چونکہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اس لئے اُن کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ اب بھی بہت سے حضرات حیات ہیں، جن کی کیفیت حضرت کے ہاں بدل جاتی۔

یہاں میں اس امر کی وضاحت کروں گا کہ ہمیں ان تمام حالات میں ایسے عناصر کا بھی سامنا کرنا پڑا جو حضرت

استاذ صاحبؒ کے بے لوث کردار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اپنے مفادات کی غرض سے ہر گھناؤنا کھیل کھیلنے کی کوشش کرتے تھے، میں ایک شخص کو جانتا ہوں کہ اُسے محض اس لئے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی کہ حضرت استاذ صاحبؒ اور حکومت کے مابین اعتماد کی فضا مجروح رکھیں، ان معاملات کے حل کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس کے نام پر مفادات سمیٹیں۔ اُس کو اغوا کر کے قتل کرنے کی کوشش کی گئی، یہ حضرت کی کرامت تھی کہ بقول اُس کے جب اغوا کار اُن پر وار کرتے تو وہ وار اُن سے خود بخود ہٹ کر خطا چلا جاتا۔ پچیس آدمی اُس پر پل پڑے تھے لیکن اُن کا بال بیکا نہ کر سکے، اُنہوں نے کلاشنکوفیں تان کر مارنا چاہا لیکن وہ نہ چلیں۔ اللہ اکبر! وہ آج بھی زندہ ہے اور اُس کی زندگی حضرت استاذ صاحبؒ کی زندہ کرامت ہے۔ حضرت کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی۔ یہ حضرت کا تصرف ہی تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر آپ کی دُعا و توجہ سے اغوا کرنے والے خود حضرت کے دروازے پر لاکر حاضر ہوئے اور معافی کے خواستگار ہوئے اور پھر میں اُس ساتھی کی وسعت ظرفی کو سلام کرتا ہوں کہ اُن اغوا کاروں کو اُستاذ صاحبؒ کے عتاب سے چھڑایا بھی اُس نے خود ہے اور حضرت سے خود درخواست کر کے اُن کے لئے معافی طلب کی ہے۔

وہ لوگ جن کے عزائم باطل کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ہوتے تھے، ہم نے اپنے خطے میں امن کی خاطر ان کی ایسی مثالی قربانیاں مشاہدہ کیں اور اپنوں سے باجود وسعت وقدرت کے کبھی انتقام لیتے نہیں دیکھا۔ کاش! ان عناصر کی آنکھیں کھلتیں کہ قوم کے ان بے لوث خادموں نے اُن کے امن اور سکون کے لئے اپنی نیندیں کس طرح سے حرام کیں اور یہ چند ٹکوں کی خاطر کیسے اُن کا راستہ روکتے رہے۔

مجھ سے ایک دوست نے استفسار کیا کہ آئی جی سید کمال شاہ حضرت استاذ صاحبؒ سے اس قدر کیسے متاثر تھے کہ لال مسجد کے قضیہ میں حضرت استاذ صاحبؒ کو مکمل اختیار سپرد کر کے مسئلہ حل کرنے کی درخواست کی۔ میں نے عرض کیا کہ شاید حضرتؒ سے ہم علاقہ ہونے کے ناطے قدیم مراسم بھی ہوں لیکن میرے علم میں ایک ایسا راز ہے، جس نے ان حضرات کو حضرت کا عقیدت مند بنا کر رکھا۔

میں نے اُن دوست سے کہا کہ آپ ۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۹۸ء کے اخبارات ملاحظہ کر لیں آپ کو یہ خبر ملی گی کہ آئی۔جی۔پی اور چیف سیکرٹری قاتلانہ حملہ میں بال بال بچ گئے۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ سید کمال شاہ، جاوید ابراہیم پراچہ اور رستم شاہ مہمند ۱۹۹۸ء کے فسادات میں قبائلی سرداروں سے مذکرات کی غرض سے شاہو وام جانا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے بکتر بند گاڑیوں میں حضرت استاذ صاحبؒ کو بھی ساتھ لیا اور آپ کے مدرسہ سے شاہو خیل جو قریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، تشریف لے گئے۔ یہ جیسے ہی گاڑیوں سے اُترے، ان پر بالکل سیدھی فائرنگ

ہوئی اور کئی زوردار برسٹ ایک ساتھ چلے، عین فائرنگ کے ساتھ ہی حضرت استاذ صاحبؒ نے عجیب جلال سے اپنی چادر ان کے سامنے ہوا میں لہرادی، وہ ساری گولیاں چادر پر آکر ایسی تڑتڑاہٹ کے ساتھ نیچے گر گئیں جیسے آہنی دیوار پر لگی ہوں اور سامنے کھڑے ان حضرات تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے ساتھ موجود لوگوں نے نظارہ کیا۔ بس یہی وہ واقعہ تھا جس سے حضرت کی ولایت اور عنداللہ مقام کا راز ان پر کھلا اور یہ ساری زندگی عقیدت ونیاز سے پیش آتے رہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ کی کس کس بات کو یاد کیا جائے؟ آپ کی ہر ادا نرالی تھی، انوکھی تھی، ہمارے فہم سے بالاتر تھی، آپ کا ہر وصف ایسا تھا کہ اُس کی وضاحت میں درجنوں واقعات سنائے جاسکتے ہیں۔ مجھے حضرت استاذ صاحبؒ کے چند اوصاف کا ثانی کہیں نظر نہیں آتا اور فی الوقت اُنہی کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

اُن میں اولین حضرت کا اپنے متعلقین کا حد درجہ خیال رکھنا تھا۔ آپ کو اپنے ساتھیوں کی ہر حوالے سے فکر رہتی، اُن کی تکلیف پر کڑھتے اور اپنی پوری کوشش کرتے کہ کسی طرح یہ تکلیف زائل ہو۔ میری چھوٹی بچی جو مجھے بہت ہی پیاری تھی، تھیلیسیما اور پھر کینسر کا شکار ہوگئی۔ گھر میں مستقل مریض ہو اور وہ بھی پیارے بچے ہوں تو انسان کی برداشت کام چھوڑ دیتی ہے۔ حضرت استاذ صاحبؒ کو میری پریشانی کا احساس تھا، وقتاً فوقتاً دریافت بھی کرتے، دعا بھی کرتے، بالآخر اس کی صحت اتنی خراب ہوئی کہ وہ کومہ میں چلی گئی، اُن دنوں میں سخت مضطرب تھا، حضرت استاذ صاحبؒ اور حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ تشریف لائے، استاذ صاحبؒ نے میری پریشانی دیکھی تو خود بھی پریشان ہوگئے۔ آپ نے بچی کو دم کرنا شروع کردیا، بچی کومہ میں تھی، ہماری اُمیدیں دم توڑ چکی تھیں، لیکن قدرت خداوندی کے کیا کہنے، حضرت استاذ صاحبؒ کا دم پورا ہوا تو بچی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اللہ اکبر! وہ بچی کئی سال اس کے بعد زندہ رہی، کھاتی پیتی، ہنستی مسکراتی رہی۔ لیکن میرے بھائی کے ناگہانی انتقال پر اُن کے غم میں پگھل کر جان دے گئی۔ کیونکہ اُنہیں بھائی سے بہت ہی زیادہ محبت تھی۔

بھائی کے انتقال پر حضرت استاذ صاحبؒ تشریف لائے، چونکہ حادثہ ناگہانی اور غم بہت بڑا تھا، اس لئے میرا ایک بھتیجا بہت ہی بری حالت میں تھا، اُس سے یہ حادثہ اور غم برداشت نہ ہوسکا تھا۔ حضرت استاذ صاحبؒ نے اُس کے لئے دُعا فرمائی، اُن پر توجہ ڈالی اور اپنا دست مبارک ان کے سینے پر پھیرا۔ خود اُن کا بیان ہے کہ میری حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی نے ایک وزنی چٹان سینے سے ہٹادی ہو اور مکمل سکون نصیب ہوگیا۔ یہ آپ کی کھلی کرامات تھیں جو ہم نے مشاہدہ کیں۔ آپ کی اصل کرامت تو آپ کی استقامت اور مضبوط ترین اعصاب تھے کہ حالات جتنے اور جیسے بھی نازک ہوتے، آپ کے اعصاب پوری طرح کام کررہے ہوتے اور ذہن مکمل فعال رہتا۔

دوسرا وصف حضرت استاذ صاحبؒ کا حد درجہ اعتدال تھا، آپ نے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی سے بغض اور کینہ رکھا ہو، انتہائی معتدل شخصیت تھے۔ اپنا کوئی حلقہ خاص کر کے نہیں بنایا، آپ سب کے تھے، سب کی خیر چاہتے تھے۔ جب سرکاری افسر محرم کے زمانے میں یا کسی تنازع کے وقت میٹنگ کے لئے حاضر ہوتے اور اپنے شکوک وشبہات اور خدشات کا اظہار کرتے تو آپ اس اعتدال سے اپنا موقف اور تجاویز رکھتے کہ اُن کے خدشات کا فور کر دیتے۔ آپ کے اعتدال ہی کے باعث یہ سارے آفیسر آپ کا حد درجہ احترام کرتے۔

تیسرا وصف حضرت استاذ صاحبؒ کی صحبت میں کچھ ایسی روحانیت کا اثر تھا کہ میں درجنوں پریشانیاں لے کر آپ کی خدمت میں ایسا سکون اور اطمینان محسوس کرتا کہ ساری مشکلیں اور پریشانیاں بھول جاتا، یہ سکون میرے علاوہ دیگر سرکاری آفیسر بھی محسوس کرتے اور اس کا اظہار کرتے۔ شاید یہ آپ کی حد درجہ شفقت اور محبت آمیز رویے کا اثر ہو لیکن یہ میرے بارہا کا مشاہدہ ہے۔

حضرت الاستاذ کا ایک وصف جس نے مجھے کئی مواقع پر حیرت میں ڈالا وہ آپ کی ایسی نور بصیرت تھی کہ آپ کے سامنے سچ اور جھوٹ بالکل واضح ہوتے، سچ بولنے والے کا بھی پتہ چل جاتا اور جھوٹا جتنی ملمع سازی سے جھوٹ گڑھ لیتا آپ اپنی فراست سے معلوم کر لیتے لیکن اُس وقت اظہار نہ فرماتے، بعد میں کسی مناسب موقع پر اشاروں کنایوں میں اس طرح اظہار کر لیتے کہ عقل والا ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ حقیقت حال تو آپ پر بالکل واضح تھی۔ میں نے طویل مصاحبت میں حضرت استاذ صاحبؒ کو نہ کبھی جھوٹ بولتے سنا، نہ ملمع سازی کرتے دیکھا۔ بالکل صاف صاف معاملہ فرماتے، کوئی چیز ایسی ڈھکی چھپی نہ رکھتے تھے جس سے معاملہ دوسرے فریق پر واضح نہ ہو اور نہ کسی سے دھوکہ کھاتے۔ آپ کو وہ مؤمنانہ فراست بدرجہ اتم نصیب تھی، کہ مؤمن نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ متوکل علی اللہ تھے، ظاہری اسباب سے پوری توقع نہ بھی ہوتی تو توکلاً بعض اُمور سرانجام دیتے اور اللہ تعالیٰ راستے کھول دیتا۔ امن کے داعی تھے، خود ساری عمر امن کے لئے لڑے اور بدامنی دیکھ کر بے چین ہوتے۔ جب نائن الیون کے بعد ہمارے خطے کے حالات ابتر سے ابتر ہونے لگے تو میری معلومات کے مطابق صوبے میں جہاں کہیں بھی بدامنی کی کوئی لہر اُٹھتی آپ وہاں پہنچ کر اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ میں نے تمام معاملات میں دیکھا کہ استاذ صاحبؒ ان حالات کی خرابی کے اولین مرحلے پر جن باتوں کی نشاندہی کرتے اور ممکنہ خدشات کی تصویر پیش کرتے وہ اُس وقت اداروں کے سمجھ میں نہ آتی لیکن برسوں بعد انہیں اس نکتے پر آنا پڑتا جس پر استاذ صاحبؒ پہلے دن ہمارے ساتھ بات کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جو مسئلہ پہلے مرحلے میں معمولی اقدامات سے کنٹرول ہو سکتا، وہ انتہائی مراحل میں آپریشنز سے بھی کنٹرول نہ ہو پاتا۔

اس کی ایک بڑی مثال میرے سامنے باڑہ خیبر ایجنسی کے حالات کی ہے۔ حضرت استاذ صاحبؒ اس میں ابتدا سے اس کے قائل تھے کہ پیر سیف الرحمن اور مفتی منیر شاکر دونوں کو علاقہ بدر کر کے حکومت علاقے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لے تو کسی کو حالات خراب کرنے کی جرأت نہ ہوگی، لیکن جب اولین مرحلہ میں اس تجویز کو نہ مانا گیا تو حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور آج تقریباً دس سال بعد بھی معمول پر نہیں آرہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ کی شہادت کے دن شہادت سے آدھا گھنٹہ قبل برادر عزیز مولانا محمد یوسف صاحب کا بندہ کے پاس فون آیا کہ والد صاحب کل رات سے کچھ عجیب وغریب قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے ساری امانتیں سپرد کر دی ہیں، مدرسہ کی رقوم بتلادی ہیں، بینک اکاونٹ کی تفصیلات دے دی ہیں اور ہر چیز سپرد کر رہے ہیں۔ کیفیت ایسی ہے جیسے کہیں لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ ہر چیز سمیٹ رہے ہیں اور معاملہ صاف کر رہے ہیں۔ میں تو بہت پریشان ہوں کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ کہاں ہیں؟ فرمایا کہ میں بازار میں ہوں، مجھے مسجد کی خراب ٹونٹیوں کو تبدیل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جیسے مدرسہ پہنچیں، میری حضرت سے بات کروائیں، شاید کہیں لمبا سفر درپیش ہو، اس لئے آپ کو ساری چیزیں سپرد کر رہے ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں، خاطر جمع رکھیے اور کچھ واقعتاً پریشانی ہو تو حضرت سے کہہ دیں کہ میری طرف نکل آئیں یا مجھے مطلع کر دیں میں انہیں لینے آجاؤں گا۔ ان سے بات ختم ہوئی تو آدھے گھنٹے بعد اطلاع ملی کہ حضرت استاذ صاحبؒ اس دار فانی کو چھوڑ گئے ہیں، آپ نے تریسٹھ سال کی مسنون عمر اللہ سے مانگی تھی، اُتنی ہی عمر پائی۔ مولانا یوسف صاحب کی باتیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں، اوہ! یہ تو حضرت اس سفر پر جانے والے تھے تب اس اہتمام سے ساری تیاری مکمل کی۔

ہماری تو کائنات اُجڑ گئی، نہ دل کو قرار تھا نہ آنکھیں ساتھ دے رہی تھیں۔ فوراً ہنگو پہنچے، غم سے زمین پھٹ جاتی، آسمان ماتم کر کے برستا اور فضائیں چیخ چیخ کر واویلا کرتیں، تو بھی ہمارے غم کا مداوا نہ ہوتا۔ میری ذہنی حالت اتنی متاثر ہوئی کہ ایک عرصہ بعد میں نارمل حالت میں واپس آیا۔ یہ حادثہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک نظریے کی موت تھی، ہم نے ایک شخص نہیں ایک عالم دفنایا تھا، ہم نے ایک مشفق باپ ہی نہیں، ملک وملت کا عظیم ترین سرمایہ کھویا تھا۔ کون کہتا ہے کہ مولانا محمد امین اورکزئی بس ایک تنہا انسان تھے۔ وہ گرے تو پوری قوم گری، وہ شہید ہوئے تو ہماری خودداری، امن، خودمختاری، وحدت فکر سب کچھ شہید ہو گئے۔ وہ امن کی آخری علامت تھی، وہ غم خواری وہمدردی کی آخری نشانی تھی۔ اے کاش! لوگ اسے سمجھتے، وہ اندازہ کر پاتے کہ انہوں نے وطن خداداد کے کس محب اور کس مجاہد کو ابدی نیند سُلا دیا ہے۔ ہے کوئی جو مردہ ضمیروں کو یہ احساس دلا سکے کہ اُن کے ہاتھ کس کے خون سے رنگین ہوئے، ہم ان کے رازوں کے امین تھے، ہم نے اُن سے بڑھ کر ملک وملت کا وفادار کسی کو نہ پایا تھا، پھر اسے

کس جرم کی سزا دی گئی۔ وہ کیوں مظلومانہ تڑپا دیے گئے۔

اے کاش! کوئی اس ملک کا حقیقی خیر خواہ ہوتا، کوئی اس کے لئے حقیقتاً کڑھتا، تو ایسے قیمتی ہیروں کا یوں استحصال نہ کرتا جن کو پیدا ہونے میں صدیاں لگتی ہیں۔ مولانا محمد امین شہیدؒ جیسے لوگ روزانہ پیدا نہیں ہوتے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتے ہیں جب قومیں ایسے لوگوں کی ناقدری کرتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو جاتی ہیں اور پھر دنیا کی طاقت اُن کے زوال وادبار کو نہیں روک سکتی۔ وماذلک علی اللہ بعزیز۔

میں تو اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتا ہوں اور حضرت استاذ صاحبؒ کی شہادت کے بعد اب ہنگو جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ جاتا ہوں تو دل لگتا نہیں، کیونکہ جن سے دل لگی تھی، وہ رہے نہیں، جنہوں نے خریدا تھا وہ خریدار رخصت ہو گئے، اب وہاں دل لگائیں تو کس سے اور کیونکر۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہے آستین نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے اُفق پہ مہر مبین نہیں ہے
تیری جدائی میں مرنے والے وہ کون ہے جو حزین نہیں ہے
مگر تیری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے
کئی دماغوں کا ایک انسان سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اُجڑ گئی ہے زبان سے زور بیاں گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے، اُمید کیا کارواں گیا ہے
مگر تیری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے

مولانا اورکزئیؒ کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت

جاوید ابراہیم پراچہ، کوہاٹ

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ پر سہ ماہی المظاہر کی خصوصی اشاعت ہمارے ضلع کوہاٹ کے لئے اعزاز ہے،

برخوردار مولانا محمد طفیل مدیر ''المظاہر'' میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا محمد امین اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا قدیم تعلق رہا ہے اور آپ کی بہت ساری یادیں ان سے وابستہ ہیں، لہٰذا ہمیں اس بارے میں ضرور کچھ بتائیں۔

مولانا محمد امین اورکزئی کے ساتھ چالیس سالہ رفاقت پر نظر ڈالتا ہوں تو یادوں کا ایک انبار ہے جو نظروں کے سامنے منڈلا رہا ہے۔ میرے والد محترم جناب ابراہیم پراچہ رحمہ اللہ کے زمانہ اہتمام میں وہ ہمارے مدرسہ انجمن تعلیم القرآن محلہ پراچگان کوہاٹ میں طالب علم تھے۔ یہ بڑا ہی عسرت کا زمانہ تھا، طلبہ محلوں میں روٹیاں اکٹھی کرتے تھے، دارالاقاموں کی آج کل کی طرح سہولتوں کا تصور ہی نہ تھا، میرے والد صاحب گندم کی کٹائی کے زمانے میں گدھا ریڑھی پر لاوڈ اسپیکر باندھ کر ہفتوں کوہاٹ کے مضافات میں عشر اکٹھا کرتے تھے۔ شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحبؒ کی تنخواہ بمشکل ۲۰ روپے تھی۔ آپ نے اس تنگی اور مجاہدے کے زمانے میں یہاں پڑھا اور اپنی ذہانت، محنت اور علم کے ساتھ یکسوئی میں تمام اساتذہ خصوصاً صدر مدرس مولانا عبدالغفارؒ کے چہیتے شاگردوں میں شمار ہوئے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا۔ شروع میں مجھے یہ ذمہ داری سنبھالنے میں تامل تھا لیکن اس کے لئے دیگر اکابر کے ساتھ مولانا محمد امینؒ نے بھی مجھ پر کافی دباؤ ڈالا۔ میرا اصرار تھا کہ میں مدرسے کے لئے عوامی چندہ نہیں کروں گا اور طلبہ کو وہی کچھ کھلاؤں اور ویسی رہائش دوں گا جو ہم اپنے گھر میں اپنے لئے رکھتے ہیں۔ مولانا محمد امینؒ نے چندے کے معاملے کو تو سراہا لیکن طلبہ کے ناشتے پر ان کا میرے ساتھ اختلاف رہتا تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ طلبہ کو قدرے مجاہدے میں رکھنا چاہیے، اس سے علم میں برکت آتی ہے اور جب ان کا کسی قدر اپنا مال خرچ ہوتا ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ مدرسہ اور اساتذہ میرے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

مولانا محمد امینؒ جب جامعہ بنوری ٹاؤن میں استاذ ہوئے تو ان سے میرا رابطہ مزید قوی ہوگیا۔ کئی مسلکی مسائل اور تحریکات میں ہماری رفاقت رہی، جب آپ کراچی سے واپس تشریف لائے تو اپنی ساری توجہ اس پر صرف کی کہ علاقہ میں سنی شیعہ کی قدیم کشیدگی کا مستقل بنیادوں پر کوئی حل نکلنا چاہیے۔ اس سلسلے میں دو دہائیوں پر مشتمل ہم نے ایک مشترکہ محنت کی، ہمارے کئی اہم معاہدات اہل تشیع کے ساتھ ہنگو میں امن وامان کے قیام کے حوالے سے ہوئے ان تمام معاملات میں آپ کی فہم وفراست، معاملہ فہمی، گہری نظر، حالات کا درست ادراک کرنے کی صلاحیت جیسی صفات ہم پر کھلیں۔ معاہدات ومطالبات کی تحریریں اہل السنۃ کی طرف سے عموماً آپ ہی لکھتے تھے۔ آپ کی تحریر انتہائی پختہ اور نپی تلی، قانونی زبان میں ہوتی تھی جس پر کسی کے لئے اعتراض کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔

آپ اپنے آپ کو اتنے سادہ اور بے تکلف رکھتے تھے کہ ہمیں آپ کی علمی شان کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ لیکن ایک

دو واقعات ایسے ہوئے کہ ہم پر آپ کی علمی شان کھلی اور ہمیں اندازہ ہوا کہ آپ کتنے بڑے عالم ہیں۔

ہمارے کوہاٹ میں ٹی وی وغیرہ کے رواج سے پہلے ہی یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ رمضان اور عید کا اعلان مقامی علما لوگوں کی شہادتیں وصول کر کے کرتے چلے آئے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق ایم این اے کوہاٹ) کمیٹی کے سربراہ ہوتے تھے اور تمام علاقوں سے سینکڑوں لوگ گاڑیاں لے کر مدرسہ آتے تھے کہ شیخ صاحب رؤیت کی شہادتوں کا اعلان کریں گے۔ گمکول شریف کوہاٹ سے بریلوی علما کا حلقہ بھی شیخ صاحب کا فیصلہ سننے کے لئے آتا تھا اور اس حوالے سے کوئی مسلکی تفریق نہیں تھی۔ بعد میں کچھ علما نے اختلاف شروع کر دیا کہ مرکزی کمیٹی جب تک اعلان نہ کرے مقامی علما کو عید یا روزے کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل تھے۔ اس پر ہمارے مدرسے میں اہل علم کا ایک اجتماع مقرر کیا گیا۔ مفتی محمود صاحب بھی تشریف لائے۔ اس مباحثہ کے لئے شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحب نے بالخصوص مولانا محمد امین اورکزئی صاحب کو بلایا تھا، اس وقت بالکل جوان سال تھے۔ شاید یہ الفاظ نقل کرنا اب مناسب نہ ہوں لیکن اس وقت شیخ صاحب نے چند بڑے علما سے بے تکلفی میں کہا تھا کہ" ¤ Ÿ Z ¢ Ÿ ¢ ' ۔
مخ' œ + & " یو (آپ مولانا امین کے سامنے طفل مکتب ہو) چونکہ آپ شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ کے شاگرد تھے، اس لئے یہ جملہ استاذ کی طرف سے آپ کیلئے اعتماد و سند کا درجہ رکھتا تھا۔

بہر حال تین دن یہ مباحثہ جاری رہا، اس میں مولانا محمد امین صاحب نے جو دلائل دیے۔ اور کتابوں کے حوالوں کے انبار لگائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی عالم نہیں بلکہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ تین دن بعد ہنگو، کرک کے سارے علما مولانا کے دلائل پر مطمئن ہو گئے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب آپ بنوری ٹاؤن سے مستقل ہنگو تشریف لے آئے تو بیرون ممالک سے میرے ساتھ رابطہ ہوتا کہ افریقہ و عرب سے فلاں علمائے کرام آئے ہیں۔ انہیں مولانا محمد امین صاحب تک پہنچانا ہے، میں ان علما کو لے کر ہنگو حاضر ہوا تو وہ راستے میں مجھ سے پوچھتے جاتے کہ حضرت الاستاذ کا کیا حال ہے؟ آپ اسی طرح پڑھاتے ہیں، اب علمی سرگرمیاں کیا ہیں؟ یہ بھی بارہا ان سے سنا کہ اتنے بڑے عالم اس جنگل میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں، یہ کسی بڑے ادارے میں کیوں نہیں جاتے؟ میں ان سے عرض کرتا کہ یہ سوال تو آپ براہ راست ان سے کریں بہر حال اس سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ آپ بین الاقوامی سطح کے عالم ہیں۔ جس کی زیارت و ملاقات کے لئے اتنے دور سے علما آتے ہیں۔

آپ اپنے علاقے کے مسائل کے لیے کافی بھاگ دوڑ کرتے تھے، جب میں ایم این اے بنا تو ہنگو تا کوہاٹ

ساری پایاں سے سنیوں کیلئے علیحدہ روڈ تعمیر کرنے کی بات کی۔ ہم نے علاقے میں سنی طبقہ کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی اور انہیں قیام امن کے لئے منظم کیا۔ اس سلسلے میں کوہاٹ سنی سپریم کونسل کی بنیاد رکھی، اس وقت مولانا محمد امین صاحب کا مجھ سے یہ مطالبہ تھا کہ آپ ووٹ، الیکشن کی انتخابی سیاست چھوڑ دیں، اس سیاست کے ساتھ آپ سنی قوم کے حقوق کی جنگ نہیں جیت سکتے، آپ غیر انتخابی رہ کر قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لائیں۔ مجھے اس وقت انتخابی سیاست سے دلچسپی تھی، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جب میں نے انتخابی سیاست کو خیر باد کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس خطے کے بہت سے مشکل مسائل حل کرنے کی توفیق دی۔ سنی سپریم کونسل نے جرگہ اور مصالحت کی قوت سے کوہاٹ میں سنی آبادی اور بازار کے اندر چہلم کا جلوس ختم کروایا اور سنی اکثریتی آبادی کے، ڈی، اے میں شیعہ امام بارگاہ کی تعمیر کے خلاف ہائی کورٹ سے قانونی جنگ لڑ کر اپنا کیس جیتا۔ حضرت مولانا محمد امینؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس خطے کے مسائل ہم پرامن طور پر حل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ آپ نے مجھے اس طرف بھی راغب کیا کہ سنی سپریم کونسل کے اہداف میں رفاہی وفلاحی کاموں کو بھی شامل کریں۔ لوگوں کے بجلی، گیس، پانی اور روزگار کے مسائل پر توجہ دیں، اس سے معاشرے میں کونسل پر لوگوں کا اعتماد بڑھے گا اور اجتماعی کاموں میں عوامی رائے عامہ کے حصول میں آسانی رہے گی۔

آپ نے تحریک ناموس صحابہؓ کے لئے بھی علاقہ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ لیکن اس سلسلے میں سنی قوم کو محض جذباتی بنیادوں پر اور ہنگامی ووقتی تقاضوں پر کھڑا کرنے کے آپ بالکل حق میں نہ تھے۔ ایک دفعہ کچھ لوگ میرے ہاں مہمان ہوئے، ان کو میں نے آپ کے پاس بھی بھیجا، بعد میں آپ نے مجھے منع کیا کہ اس طرح کے لوگ بالکل میرے پاس نہ بھیجیں، یہ تو سگریٹ پیتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، سنی فکر سے بے خبر ہیں۔ یہ لوگ اگر تحریکوں میں آگے بڑھیں گے تو اس سے جہالت وجذباتیت کو فروغ ملے گا۔ ناموس صحابہ کی تحریک کے لئے تو ضروری ہے کہ خود صحابہؓ کی تصویر بن کر زندگی گزاری جائے۔ عمل وکردار کو زندہ کیا جائے۔ اہل سنت کی علمی بنیادوں کو سمجھا جائے، اپنے آپ کو "حق" پر سمجھنا دلیل وبرہان کی قوت کے ساتھ ہو، محض تعصب اور جذباتیت کی بنیاد پر نہ ہو۔ اس سے اختلاف نظریاتی نہیں رہ پاتے۔ لہٰذا اس میں کوئی دورائے نہیں کہ سنی قوم میں علمی ونظریاتی طور پر "سنیت" کا فروغ آپ کا کارنامہ تھا۔

آپ نے قتل وغارت، اغوا اور لوٹ مار کی ثقافت کو ختم کیا اور شیعہ سنی کشیدگی کا پرامن حل احتجاج اور بائیکاٹ میں طے کیا، آپ جنگوں کے قائل نہیں تھے۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سنی قبائل کی جو جنگیں ہوئیں آپ کی ہمیشہ کوشش رہی کہ ان کا پوری طرح خاتمہ ہو اور یہ اختلاف علمی ونظریاتی سے آگے نہ بڑھے، اگر عمل پر اثر انداز ہو تو باہمی

بائیکاٹ اور احتجاج کی شکل سے تجاوز نہ کرے۔ آپ اس پر بھی زور دیتے تھے کہ قیادت باکمال اہل علم کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اگر قیادت غیر عالم لوگوں کے پاس ہو تو علما کا طبقہ ان پر اکٹھا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے تحریکیں اور تنظیمیں اہل علم کے اثر سے محروم ہو جاتی ہیں اور جب پختہ اہل علم کا تعاون اور سرپرستی نہ ہو تو عموماً تحریکوں میں منفی سوچ پیدا ہوتی ہے جس کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔

ہمارے خطے میں ۲۰۰۱ء کے بعد جو حالات پیدا کیے گئے، آپ اس پر بھی سخت دل گرفتہ تھے، بارہا میرے ساتھ بیٹھ کر ان حالات کا رونا رویا۔ ان حالات میں امن کے لئے اپنا کردار بھی حتی الوسع ادا کیا اور اس حوالے سے اپنے آپ کو خطرات میں بھی ڈالا۔ افسوس یہ ہے کہ آپ کی امن پسندی کی قدر نہیں کی گئی اور ظلماً آپ کو شہید کر دیا گیا۔

کوہاٹ اور ہنگو پر آپ کے علم وعمل کے جو اثرات تھے اور ہیں، میرے ناقص خیال میں ایسے اثرات کسی اور شخصیت کے نہیں پڑے۔ اپنی چالیس سالہ رفاقت میں آپ کو ہمیشہ تقویٰ، اخلاص، للّٰہیت، غم خواری، زہد، استغنا اور اچھے اخلاق کا مجسمہ پایا، مجھے ان چالیس سالوں میں یاد نہیں کہ آپ نے کسی سے مدرسہ کے لئے چندہ مانگا ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں آپ کے احوال وآثار سے سبق سیکھنے کی توفیق بخشے۔ اللھم آمین ٥

پیکر جہد وخلوص

حاجی گل جنان اورکزئی، پشاور

حضرت استاذ مولانا محمد امین اورکزئیؒ کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت کا مجموعہ تھی۔ آپ کا وجود ہمارے علاقے بلکہ پورے ملک پر اللہ رب العزت کا عظیم احسان تھا۔ میرے بیٹے مولوی محمد عارف نے جامعہ یوسفیہ میں حضرت کے ہاں تعلیم حاصل کی تھی، حضرت سے قرب اور تعلق اسی زمانے میں بڑھا اور پھر کئی قومی وملی مسائل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت کی رفاقت نصیب فرمائی۔

حضرت استاذ صاحب کا اخلاص بے مثال تھا، کسی مسئلے کے حل کے لئے جب بھی کوشش فرمائی، اس میں کبھی اپنی کوئی غرض نہیں رکھی۔ میرے چچا علی محمد جان اورکزئی جب خیبر پختونخوا کے گورنر بنے تو ان کو قبائل میں قیام امن سے ذاتی دلچسپی تھی۔ میرے پاس "آج" اخبار میں ان کے پریس کانفرنس کی رپورٹ آج بھی محفوظ ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان شاء اللہ وزیرستان کو گلستان بنائیں گے۔

انہیں قبائل میں ایک ایسی علمی شخصیت کی تلاش تھی، جس کی وجاہت اور اثر ورسوخ سے بدامنی کا راستہ روکا جا سکے۔ انہوں نے مجھے سرکاری گاڑی دے کر پشاور سے ہنگو بھیجا، کہ استاذ صاحب سے اس کے متعلق بات کریں۔ استاذ صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ قبائل میں امن قائم ہو اور حکومت اور مسلح تحریکوں کے مابین کسی طرح بھی تصادم کی راہ ہموار نہ ہو۔ آپ اسے ملک، قوم اور پختون بیلٹ کے لئے بہت بڑی تباہی سمجھتے تھے۔ الحمد للہ ہم نے گورنر صاحب کی ایما پر قیام امن کے لئے کام شروع کیا دوران کام اندازہ ہوا کہ یہ حالات محض اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کی پشت پر بہت ہی گہری سازشیں کارفرما ہیں، خصوصاً ہمارے خطہ میں ایرانی سرگرمیاں اور بدامنی کے حوالے سے اس کی سازشیں زوروں پر تھیں۔ بہر حال اخلاص کی قوت کے سوا تو ہمارے پاس کچھ نہ تھا ہمیں تو اس کا بھی پوری طرح اندازہ نہ تھا کہ حکومت اس حوالے سے کتنی مخلص ہے؟ اس لئے انتہائی حزم واحتیاط سے امن کی راہ ہموار کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس سلسلے میں استاذ صاحب نے حکومت کو جو تجاویز فراہم کیں وہ انتہائی ٹھوس اور قبائل کے مزاج اور حکومتی مفادات کی رعایت سے بھرپور تھیں، اس کے لئے استاذ صاحب نے کتنا سوچا ہوگا، اللہ تعالیٰ سے کتنی مدد مانگی ہوگی؟ کتنی دعائیں کی ہوں گی؟ اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے استاذ صاحب کا ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اخلاص دیکھا ہو۔

اس ساری جدوجہد میں مجھے استاذ صاحب کی جس ادا نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اہل حکومت اور اہل دولت سے آپ کا استغناء تھا، آپ گورنر ہاؤس میں مختلف اجلاسوں اور مشاورتوں میں شریک رہے لیکن اگر کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا کھا کر جاتے اور اگر اختتام پر کھانا ہوتا تو سیدھے میرے حجرے تشریف لاتے۔ میں استاذ صاحب سے

اکثر مزاحاً عرض کرتا کہ جی! گورنر ہاؤس کے دنبے چھوڑ کر آپ میرے گھر کے عام کھانے پر راضی ہو جاتے ہیں اور یہاں تشریف لے آتے ہیں، کچھ ہمارا خیال رکھ لیا کریں، ہم بھی آپ کی برکت سے وہاں اچھا کھانا کھا لیتے، تو آپ مسکرا کر فرماتے: حاجی صاحب! اپنے علاقے کے حالات یہاں تک لے آتے ہیں ورنہ ہم فقرا کا ان دروازوں پر کیا لینا دینا؟ میں ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے ان حالات میں صرف زبانی جمع خرچ کے عوض حکومت سے لاکھوں روپے امداد وصول کی ہے۔ لیکن ایک استاذ صاحب تھے کہ حکومت کا پانی پینا بھی گوارا نہ تھا۔

میرے چچا گورنر صاحب استاذ صاحب کی شخصیت سے بہت ہی متاثر تھے اور ان سے عقیدت و محبت کا تعلق بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ استاذ صاحب نے گورنر صاحب سے پوچھا کہ گورنر صاحب! آپ نے حج کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جی! ابھی تک تو حج نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ پر تو حج فرض ہے اس کو جلد ادا کرنے کی کوشش کریں، ایام حج بھی قریب تھے۔ میں چند دن بعد گورنر صاحب کے ہاں حاضر ہوا تو گھر میں سفر کی تیاریاں جاری تھیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ سارے حضرات کہاں کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ استاذ صاحب نے حج کی ادائیگی کا حکم دیا ہے، اس لئے گورنر صاحب نے بیوی و بچوں سمیت سب اہل خانہ کے ویزے لگوا دیئے اور حج پر جا رہے ہیں۔ اس سے مجھے جہاں استاذ صاحب سے اُن کی قلبی وابستگی کا اندازہ ہوا وہیں استاذ صاحب کے فکر اور مزاج کا بھی پتہ چلا کہ کس طرح لوگوں کی دینی حالت کے لئے آپ فکرمند رہتے ہیں۔

ایک دفعہ استاذ صاحب کے مدرسہ جامعہ یوسفیہ میں پانی کی سخت قلت ہو گئی تھی اور کنویں میں پانی کم پڑ گیا تھا۔ استاذ صاحب کنویں میں ''کاریز'' نکال رہے تھے اور اس پر کام جاری تھا، مجھے فکر تھی کہ مالی تعاون کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ میں نے اپنے طور پر گورنر صاحب سے کہا کہ آپ لوگوں کے ہاں اتنے ترقیاتی فنڈ ہوتے ہیں، لوگوں کے کام کرواتے رہتے ہیں، استاذ صاحب کے مدرسے میں پانی کی قلت ہے اس کے لئے کوئی بندوبست کیوں نہیں کر دیتے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ استاذ صاحب کے علاقے کے لئے تو میرے پاس اس وقت کوئی فنڈ نہیں۔ تاہم میری اپنی ذاتی مالی حالت الحمدللہ کوئی کمزور تو نہیں، میں اپنی ذاتی رقم سے پورا انتظام کر دوں گا۔ اس پر مجھے انہوں نے بند لفافے میں کچھ رقم دی جو غالباً ڈیڑھ لاکھ روپے تھے اور حکم دیا کہ یہ استاذ صاحب کو دے آئیں۔ میں پشاور سے استاذ صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور گورنر صاحب کی دی ہوئی رقم پیش کی، لیکن استاذ صاحب نے قبول کرنے سے انکار فرمایا اور کہا کہ میں حکومتی امداد کبھی مدرسہ کے لئے قبول نہیں کرتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ حکومتی امداد نہیں، گورنر صاحب کی ذاتی رقم ہے آپ جانتے ہیں کہ وہ دیانت دار آدمی ہیں، حلال کماتے ہیں، آپ سے عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں، پھر یہ رقم آپ کی ذات کے لئے نہیں بلکہ مدرسہ کے لئے ہے، اور ایک ضروری کام کے لئے ہے

جس میں طلبہ کا فائدہ ہے، تو اگر ایک بندہ اخلاص سے مدرسہ کے لئے از خود چندہ پیش کرنا چاہے تو قبول کرنے میں کیا حرج ہے؟! استاذ صاحب نے میرے تیور اور گفتگو دیکھی تو رقم رکھ لی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لفافہ کھولا تک نہیں اور مولانا عبد الستار اور مولانا محمد یوسف کو دے کر گورنر صاحب کے پاس معذرت کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ میرا دل رکھنے کے لئے رکھ لیا تھا، لیکن اپنے مزاج کی قربانی بھی نہیں دی اور رقم واپس کر دی، کیونکہ گورنر صاحب حکومتی عہدے پر تھے، اور آپ ایسے مالداروں کا مال قبول کرنا گوارا نہیں فرماتے تھے، اس استغنا کی شان اس دور میں کوئی دکھادے یہ ممکن نہیں۔

استاذ صاحب خود بھی حق گو آدمی تھے، جرأت مند تھے، بغیر لگی لپٹی کے سیدھی بات کرتے تھے، اور انہی صفات کے حامل لوگ انہیں پسند بھی تھے۔ میرے ساتھ خصوصی تعلق اور صحبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھ سے کبھی مداہنت نہ ہوسکی جس بات کو حق سمجھا، برملا کہہ دیا اور کسی ملامت کی کبھی کوئی پروانہ کی۔ میرا معمول تھا کہ پشاور سے اگر اپنے علاقہ اورکزئی ایجنسی مختصر وقت کے لئے بھی حاضری ہوئی تو استاذ صاحب کی زیارت وملاقات کے لئے ضرور حاضر ہوتا، ایک دفعہ میں مدرسہ حاضر ہوا تو کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور کوئی تیس چالیس آدمیوں اور معززین کا وفد جمع تھا جو کسی قومی مسئلے پر پولیٹیکل ایجنٹ سے مذاکرات کرنے کی ترتیب بنا رہے تھے، میں نے واپس جانا چاہا کہ استاذ صاحب مصروف ہے لیکن آپ نے جانے نہ دیا اور حکماً اس مشاورت میں شریک کرلیا۔ میں نے باتیں سنیں تو ذرا ڈھیلی ڈھالی تھیں، استاذ صاحب سے اجازت لے کر میں نے متعلقہ مسئلہ کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کیا اور کہا کہ حکومت کے سامنے اپنا مؤقف یوں رکھنا چاہیے۔ یہ سن کر استاذ صاحب بڑے ہی محظوظ ہوئے، مجلس کے شرکا میں سے اکثریت نے میری بات کو پسند کیا۔ بہر حال استاذ صاحب اور ایک دوسرے مولوی صاحب کو ''متکلم'' طے کرلیا گیا اور ہمارا یہ وفد شاہو میں پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے چلا گیا، گفتگو شروع ہوئی، پولیٹیکل ایجنٹ غالباً مردان کے تھے، دورانِ گفتگو مجھے محسوس ہوا کہ مجلس کے شرکا میں سے بعض حضرات کا جھکاؤ ہمارے طے شدہ مؤقف کے خلاف دانستہ پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف ہورہا ہے اور وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں، بندہ سے رہانہ گیا اور پولیٹیکل ایجنٹ کو خوب کھری کھری سنا دیں کہ میاں! تم شہری لوگ ہو، ہماری قبائلی روایات سے واقف نہیں ہو، یہاں اپنے من اور مزاج کے فیصلے مسلط کروگے تو قبائل میں انتشار کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا، الغرض جو منہ پر آیا کہتا چلا گیا، استاذ صاحب تو بڑے ہی خوش ہوئے کہ ان کا دماغ درست کر دیا لیکن وہ شرکا جو پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف داری میں نمبر بڑھا رہے تھے بڑے ہی سٹپٹائے کہ یہ کہاں سے مسلط ہوگیا اس نے تو سارا کھیل بگاڑ دیا، بہر حال ہم اپنی بات منوا کر آگئے لیکن استاذ صاحب سے معذرت کر دی کہ جی آئندہ میں کسی ایسی مجلس میں ہرگز نہیں جاؤں گا، جب کہ استاذ

صاحب کا اصرار تھا کہ اب تو آپ کا ملی وقومی جرگوں میں ہونا ضروری ہو گیا۔

الغرض حضرت استاذ صاحب کو بندہ نے تمام قومی امور میں اخلاص کا پیکر پایا، آپ کی کسی بات اور کام سے کبھی مفاد پرستی کا شبہ تک نہیں ہوتا تھا، اپنی جیب سے رقم خرچ کرتے، اپنے خرچ پر سفر کرتے، اور ملک وقوم کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے، آپ کی شہادت سے ملک وقوم ایک مخلص اور جرأت مند رہنما سے محروم ہو گئے، کاش کہ کوئی آپ کی قدر پہچانتا، آپ کے امن فارمولے کو بروئے کار لایا جاتا اور آپ کی بات کو غور سے سنا اور سمجھا جاتا تو اہل وطن خصوصاً ہمارے اہل علاقہ کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا، جن میں پھنس کر نسلوں کی تباہی کا سامان پیدا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریق رحمت فرمائے، اور ہمیں آپ کی برکات اور فیوضات سے محروم نہ فرمائے۔ آمین

امن کا داعی

شاہ حسین ایڈووکیٹ، ہنگو

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ ہنگو عوام کے محسن اعظم تھے، ہمارا علاقہ عرصہ دراز سے فرقہ وارانہ فسادات اور بدامنی کا شکار ہے۔ ہمارے عوام اگر کسی چیز کے لئے ترستے ہیں تو وہ صرف ''امن'' ہے۔ ہنگو میں امن کے لئے اگر کسی کو سو فیصد سے بڑھ کر مخلص دیکھا ہے تو وہ مولانا محمد امین صاحب کی ذات گرامی تھی۔ ہم جب بھی اس حوالے سے حاضر ہوئے، ہمارا تعاون فرمایا اور قیام امن کے لئے اپنی پوری قوت خرچ کی۔

۱۹۹۸ء میں جب ہنگو سخت فسادات کی زد میں آیا تو حکومت نے اہل سنت واہل تشیع کے چھ چھ نمائندوں کو گرفتار کرنے کا آرڈر جاری کیا۔ اہل السنۃ کی طرف سے حضرت مولانا عبداللہ استاذ جیؒ اور حضرت مولانا محمد امین شہیدؒ سمیت ہم چار دیگر ساتھی ہری پور جیل منتقل کیے گئے۔ سیاسی قیدی ہونے کے باعث ہمیں بی کلاس دی گئی۔ ڈیڑھ مہینہ ساتھ رہتے ہوئے بندہ نے دونوں حضرات اساتذہ کے عجیب وغریب حالات دیکھے۔ توکل واستغنا، صبر و استقامت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری کے ساتھ دعائیں بہت ہی پرکیف منظر پیش کرتی تھیں۔ ہماری کوشش ہوتی تھی کہ ان دونوں بزرگوں کی ہمیں زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع ملے، لیکن دونوں حضرات نے کبھی ہمیں ذاتی خدمت کا موقع نہیں دیا حتی کہ کولر سے پانی بھی خود پیتے تھے۔

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ نے دن دس بجے کے قریب ہمارے لئے درس قرآن شروع فرمایا تھا، رہائی تک ہم کافی حصہ پڑھ چکے تھے۔ آپ کے درس میں عموماً اصلاح ذات، معاشرہ میں دینی خدمت اور اخلاقیات سے متعلق باتیں ہوتی تھیں۔ حضرت نے ہمیشہ مثبت اور تعمیری سوچ دی۔ میں نے زندگی بھر ان کی گفتگو میں کبھی منفی یا تخریبی رنگ نہیں دیکھا۔

جیل میں حکومت نے دونوں اقوام کے درمیان صلح کے لئے درہ آدم خیل، کرم ایجنسی اور باجوڑ کے ملکان پر مشتمل جرگہ تشکیل دیا تھا۔ ہمارے دونوں اکابر نے قیام امن کے لئے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی۔ لیکن ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ امن کی تالی ایک ہاتھ سے کبھی نہیں بجتی، لہذا تمام فریقین کو متفقہ تجاویز پر عمل درآمد کے لئے آمادہ کرنا ہوگا جب ہمارا جرگہ کامیاب ہوا تو شیعہ سنی اراکین ایک ہی فلائنگ کوچ میں درہ آدم خیل آئے۔ یہاں قبائل کی طرف سے دونوں فریقوں کو جرگہ کی کامیابی پر مشترکہ دعوت دی گئی تھی۔ درہ میں دعوت کے بعد ڈی سی آفس میں مذاکرات کا آخری مرحلہ تھا جو کامیابی سے طے ہوا، یوں ۴۵ دن بعد مذاکرات کی کامیابی پر ہماری رہائی عمل میں آئی۔

۲۰۰۰ء کی بات ہے۔ ڈویژنل کوارڈینیشن آفیسر عمر آفریدی نے سرکٹ ہاؤس کوہاٹ میں مجھے کہا کہ ہنگو میں محرم کے جلوس پر حملے سے جو باہمی تنازعات پھوٹے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس قضیے کا مکمل خاتمہ ہو اور آئندہ کے لئے کوئی سیکورٹی رسک پیدا نہ ہو اور اس سلسلے میں میں چاہتا ہوں کہ اہل السنۃ میں سے مولانا محمد امین صاحب اور اہل

تشیع میں سے سید زاہد حسین صاحب کا باہم مکالمہ وگفتگو ہو کیونکہ یہ دونوں حضرات قیام امن کے حوالہ سے سنجیدہ ہیں۔ یہ طے ہوا کہ مولانا محمد امین صاحب سے ملک حاجی عزت گل اورکزئی (سماجی رہنما ضلع ہنگو) بات کریں گے اور انہیں بلائیں گے۔ ان حضرات کا ''جرما کو ہاٹ'' میں اس حوالے سے مکالمہ ہوا۔ مولانا امین صاحب نے اہل تشیع کے علما پر زور دیا کہ اس وقت حالات سخت ناساز گار ہیں، اہل السنۃ واہل تشیع دونوں طبقات میں معمولی واقعات پر باہمی اعتماد کی فضا مجروح ہو جاتی ہے اور اس سے امن دشمن عناصر فائدہ اٹھا کر جنگ کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک تو باہمی اعتماد کی بحالی اشد ضروری ہے۔ کوئی گروہ اپنے متفقہ رہنماؤں کے نوٹس میں لائے بغیر از خود کسی واقعہ پر اشتعال سے بچے اور دونوں جانب کے رہنما متفقہ جرگے کے صورت میں درپیش مسائل کا تصفیہ کریں۔ مولانا نے یہ بھی اپیل کی کہ محرم کا جلوس اہل تشیع کی مذہبی رسم ہے لیکن امن کی خاطر اگر وہ اسے اپنی عبادت گاہوں تک محدود کر لیں، تو یہ ملک وملت کے مفاد میں ہوگا۔ مولانا محمد امین صاحب کی اس بات سے سید زاہد حسین شاہ صاحب نے بھی اتفاق کیا۔ کوارڈنیشن آفیسر عمر آفریدی بھی اس گفتگو میں موجود تھے۔ اس گفتگو سے ۲۰۰۹ء میں ہونے والے ایک متفقہ فیصلہ کی راہ ہموار ہوئی لیکن افسوس کہ جانبین کے بعض عناصر نے اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کیا۔ اس کی وجہ سے آج تک امن کا مکمل قیام ایک خواب دکھائی دیتا ہے۔

مولانا محمد امین صاحب درویش صفت شخصیت تھے۔ خود کبھی بھی اپنے ذاتی مفاد کے لئے سرکاری اہلکاروں کے پاس یا سرکاری دفاتر نہیں جایا کرتے تھے، حکومت کے دفاتر میں خورد ونوش سے بھی احتراز کرتے تھے۔ جب حکومت والوں کو ضرورت ہوتی تو بڑے سے بڑے آفیسر حضرات خود ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور اگر افسران پیغام بھیجتے تو کوشش ہوتی کہ افسران سے ملاقات پرائیوٹ مقامات پر ہو۔ ۲۰۱۰ء میں نوروز کے جلوس کا مسئلہ تھا، ڈی سی او شہاب صاحب نے مجھے بھیجا کہ سیکورٹی کے حوالے سے مولانا محمد امین صاحب سے کچھ بات چیت کرنی ہے اگر آپ انہیں لے آئیں، حضرت کو افسران سے ملنے میں سخت انقباض ہوتا تھا لیکن امن کی خاطر آپ یہ تلخ گھونٹ برداشت کرتے تھے۔ مذکورہ ملاقات بھی حضرت کی خواہش پر ایک پرائیویٹ مقام پر ہوئی۔

بدقسمتی سے شیعہ سنی تنازع ہمارے عوامی وقومی اختلاف سے اٹھ کر جانبین کے مسلح گروہوں ٹی ٹی پی اور حیدری طالبان کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس سے دونوں اطراف کا جو نقصان ہوا اور ہمارے خطے میں بداعتمادی کی جو فضا بنی اب مشکل ہے کہ اس کا مداوا سالوں میں ہو۔ دونوں اطراف کے مسلح گروہ کسی قومی مفاد، جرگہ یا اصول کے پابند نہ تھے، اپنی آزادانہ رائے کے تحت انہوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا ایک ہولناک باب ہیں۔ حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ اس سارے عمل کو ہنگو کی تباہی وبربادی کا سبب سمجھتے تھے اور آپ نے خطرات کی پروا کیے بغیر ان لوگوں

کے موقف اور ارادوں کو رد کیا۔

۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ان دنوں شاہو خیل وغیرہ تک مقامی طالبان کا مکمل کنٹرول تھا اور وہ اس خطے میں شیعہ سنی جنگ بھڑکانے کی کوشش میں تھے۔ایک دن میں حضرت مولانا کے پاس محرم کے حوالے سے امن کمیٹیوں کے اجلاس کے لئے کچھ ہدایات لینے گیا تھا۔اس دوران تین رکنی وفد آکر بیٹھ گیا۔جب حضرت ان کی طرف متوجہ ہوئے، تو اس نمائندہ وفد نے بتایا کہ ہم کو طالبان نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ حضرت شاہو خیل آکر موجودہ شیعہ سنی جنگ کے حوالے سے ہمارا موقف سنیں تو حضرت نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ نہ میں ان کے پاس جا سکتا ہوں اور نہ مجھے ان کے موقف کو سننے کی ضرورت ہے۔پھر انہیں دوٹوک انداز میں مخاطب کر کے فرمایا:

''بھئی! جنگ ہمارے خطے کے مسائل کا حل نہیں۔نہ میں کل جنگ کا قائل تھا اور نہ آج قائل ہوں، میں اہل تشیع سے جنگ نہیں چاہتا۔جنگ وہ کرے، جس کے پاس دلیل کی قوت نہ ہو۔میرے پاس ایسے دلائل ہیں کہ کسی میں ان کا جواب دینے کی ہمت نہیں، لہٰذا میں دلیل کی بات کروں گا۔مجھ سے جنگ کی رتی بھر حمایت کی قطعاً توقع نہ رکھیں اور جہاں تک میرا بس ہے میں سنی قوم کو جنگ میں نہیں پڑنے دوں گا۔''

اس پر ان نمائندوں نے کچھ مزید چوں و چراں کی کوشش کی۔تو استاذ صاحبؒ نے غصہ ہو کر فرمایا کہ میرا پیغام ان کو پہنچا دو کہ ٹھیک ہے، تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو، آج کے بعد ہنگو تمہیں مبارک ہو، میں یہاں سے ہجرت کر کے چلا جاتا ہوں، تم لوگ پھر آزاد ہوں گے کہ سنی قوم کے مستقبل سے جو کھیل کھیلنا چاہو کھیلو۔اس پر وہ مجلس برخاست ہو گئی۔

انہی ایام میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، عموماً لوگوں کو قتل کر کے لاشیں ''وام'' کے گردونواح میں پھینک دی جاتیں۔حضرت فرماتے کہ یہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے، اسے رنگ یہ دیا جائے گا کہ اس علاقے میں یہ سب کچھ اس کی ایما پر ہوتا ہے، اگر یہ سب ہماری مرضی سے ہوتا تو کیا کوئی بے وقوف قتل کر کے لاش اپنے دروازے پر چھوڑتا ہے؟ یہ ساری کہانی حضرت کے خلاف اس سازش کی ایک کڑی تھی جو آپ کی شہادت پر بے نقاب ہوئی۔

حالانکہ حضرت مسلح تحریکوں کو تو چھوڑیں، کبھی شیعہ سنی مقامی تصادم کے حامی نہیں رہے۔آپ کو جب بھی موقع ملا، ان کو سمجھانے کی کوشش کی، اور ان کے پاس وفود بھی بھیجے کہ تم لوگ یہ جو کچھ کرتے ہو یہ نہ تو شریعت ہے اور نہ دین کی کوئی خدمت ہے، بدقسمتی سے ان لوگوں نے ہمیشہ حضرت کے پیغامات کو مسترد کر کے اپنی مرضیات پر عمل کیا۔

الغرض حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ نے اپنی بساط کی حد تک ان عناصر کو بے اثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔لیکن افسوس کہ جذباتیت عقلوں پر پردے ڈال دیتی ہے، اتنے بڑے مفکر اور دانشور کی باتیں لوگوں کو فضول دکھائی

دیں، انہوں نے ان کو قرآن وسنت کے مزاج سے بے بہرہ کہا جو شخص نصف صدی تک قرآن وحدیث کو پڑھاتا رہا ہو اگر وہ قرآن وسنت کا فہم نہیں رکھتا تو پھر قرآن کا علم اور درست تفسیر وتشریح کرنے والا کون ہوگا؟

استاذ صاحب کو شہرت سے سخت نفرت تھی، ان کی یہ کوشش ہوتی کہ اپنے آپ کو پس پردہ رکھے اور دوسروں کو منظر عام پر لے آئیں۔ امن کے علاوہ دیگر قومی مسائل کے حل میں بھی صرف آپ کی تجاویز نہیں بلکہ بہت ساری خدمات اور عملی اقدامات شامل حال ہوتے، لیکن ان کی نسبت ان احباب کی طرف کرتے جو اس کوشش میں سرگرم عمل ہوتے۔ الا یہ کہ ناگزیر صورت حال جب درپیش ہوتی تو پھر اس میں بذات خود شریک ہوتے۔

ہمارے خاندان کے ساتھ حضرت کے دیرینہ مراسم رہے ہیں، کئی بار ہمارے گھر تشریف لائے ہیں، ہر اہم قومی مسئلے میں ہم نے آپ سے مشاورت کو ضروری سمجھا ہے اور ان کی ہدایات وتجاویز پر عمل میں ہمیشہ فائدہ پایا ہے۔

حضرت کی شہادت کے پیچھے جو گہری سازشیں کارفرما تھیں، ان کا مقصد اس خطے میں بدامنی کی نشوونما کرنی تھی۔ میری اہل السنۃ واہل تشیع دونوں گروہوں سے اپیل ہے کہ وہ امن کے لئے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنا کردار ادا کریں۔ دونوں جانب کے فرنٹ لائن رہنما اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مولانا محمد امین صاحبؒ ہمیشہ امن کے داعی نظر آئے اور جب بھی نچلے طبقے میں جنگ کے حالات بنے، آپ نے ان کے خاتمے کے لئے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

میں بحیثیت رکن امن کمیٹی ہنگو مولانا کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور پوری سنی قوم کی طرف سے قیام امن کے لئے مولانا کی جدوجہد کا اعتراف کرتا ہوں۔ ہماری تمنا اور کوشش ہے کہ امن کے لئے حضرت نے جس راہ پر ہمیں چلایا، ہمارا سفر اسی رُخ پر جاری رہے اور ایک طویل عرصہ سے کشیدگی کا شکار رہنے والا ہمارا خطہ امن کی دولت سے ایک بار پھر مالا مال ہو۔ آمین

وسیع النظر مفکر

رفعت اللہ اورکزئی، نمائندہ بی بی سی پشاور

مولانا محمد امین صاحب مرحوم کا نام ویسے تو میں بچپن سے سنتا آیا ہوں لیکن ان سے بالمشافہ ملاقات ۲۰۰۱ء میں ایسے وقت میں ہوئی جب امریکہ افغانستان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

بچپن میں ہمارے گھر میں اکثر اوقات مولانا صاحب اور ان کے بھائی عین الدین صاحب کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں ہم چھوٹے تھے، اندازہ نہیں تھا کہ یہ افراد کون ہیں؟ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا محمد امین صاحب کا بچپن ہمارے گھر میں گزرا ہے اور انہوں نے اپنی دینی علم کا آغاز ایسے وقت میں کیا جب وہ ہنگو میں ہمارے گھر میں مقیم ہوا کرتے تھے۔

میرے اور میرے خاندان کے لیے یہ اس لحاظ بھی بڑے فخر کی بات ہے کہ ایسے عالم دین جن کا اس پورے خطے میں علم کے حوالے سے ایک بہت بڑا نام تھا اور ہے اور جن کے ہزاروں شاگرد پاکستان، افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک میں آج بھی علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں، انہوں نے زندگی کے ابتدائی ایام ہمارے ہی چھوٹے سے گھر میں گزارے۔ چونکہ مولانا صاحب اور ہم ایک ہی اورکزئی کے شیخان کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے ہمارا آپس میں ایک مضبوط رشتہ رہا ہے۔

۲۰۰۱ء میں جب نائن الیون کا واقعہ پیش آیا تو ان دنوں ایسی صورتحال بن رہی تھی کہ امریکہ جلد افغانستان پر حملہ کرنے والا ہے اور بعد میں اس طرح ہوا بھی۔ ان دنوں پشاور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فرنٹ لائن شہر ہونے کی وجہ سے پشاور میں سینکڑوں غیر ملکی صحافی موجود تھے۔ ان دنوں میں ایک انگریزی اخبار کے ساتھ منسلک تھا۔ مجھ سے دو فرانسیسی صحافیوں نے درخواست کی کہ ہمیں ایک عالم دین سے انٹرویو کرنا ہے جو ہمیں اس پورے خطے میں اسلامی تحریکوں کے بارے میں بتا سکے۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے مولانا صاحب کا نام آیا، اس وقت تک میرے مولانا محمد امین صاحب سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فوراً مولانا صاحب سے فون پر رابطہ کیا، وہ مان گئے اور دوسرے دن ہم شاہو خیل ہنگو ان کے مدرسے پہنچ گئے۔ میں نے جب اپنا تعارف کرایا، اپنے والد صاحب کا نام لیا جو مولانا صاحب کے کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے تو وہ میرے ساتھ بڑے تپاک اور پیار کے انداز میں ملے۔ انہوں نے فرانسیسی صحافیوں کا بھی بڑے زبردست انداز میں استقبال کیا، ہماری بڑی خاطر مدارت بھی کی گئی کیونکہ میرے ساتھ مہمان تھے اور وہ بھی غیر ملکی۔ ہمیں مدرسے کی تمام عمارات کا دورہ کرایا اور بالخصوص اس لائبریری میں لے گئے جہاں مولانا صاحب مطالعہ کیا کرتے تھے۔

انٹرویو جب شروع ہوا تو میں ترجمہ کر رہا تھا، مجھے اس وقت پہلی مرتبہ مولانا صاحب کے علم کے بارے میں معلوم

ہوا کہ ہمارے خطے میں اتنے بڑے بڑے عالم دین بھی موجود ہیں۔ مولانا محمد امین صاحب نے اس خطے میں اسلامی تحریکوں پر بڑے جامع انداز میں گفتگو کی۔ چونکہ وہ اس بارے میں بڑا علم اور گہری تاریخی واقفیت رکھتے تھے اسی وجہ سے وہ معلومات میرے لئے بھی نئی تھیں۔ باتوں باتوں میں انقلاب فرانس کی بات آئی تو اس پر امین صاحب نے اتنی سیر حاصل گفتگو کی کہ غیر ملکی صحافی بھی دنگ رہ گئے۔

میں مولانا صاحب کے لائبریری میں ایسے ہی کتابیں دیکھ رہا تھا، وہاں مختلف الماریوں میں سینکڑوں اسلامی اور دیگر مختلف موضوعات پر کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جتنی کتابیں دیکھیں ان میں سب پر مولانا صاحب کی طرف سے نوٹس لکھے گئے تھے یعنی وہ تمام کتابیں امین صاحب نے پڑھی تھیں۔ ان کے شاگردوں نے بتایا کہ یہاں پڑی یہ تمام کتابیں مولانا صاحب پڑھ چکے ہیں۔ میں دنگ رہ گیا کیونکہ ان کتابوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔

وہ یقینی طور پر علم کا ایک بہت بڑا خزانہ تھے۔ ہمارے علاقے میں کئی بڑے بڑے علما گزرے ہیں لیکن ان میں مولانا امین صاحب کی ایک الگ اور منفرد حیثیت تھی۔ وہ تمام مکاتب فکر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ بہت جلد ہمیں چھوڑ گئے، شاید یہی اللہ کو منظور تھا۔ تاہم مولانا صاحب کے مقصد کو ان کے صاحبزادے مولانا یوسف نے جاری رکھا ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چل ان کے اس مشن کو منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔

ادار یہ ماہنامہ بینات کراچی

مولانا محمد امین اورکزئی کی شہادت

مولانا سعید احمد جلال پوریؒ

الحمدللہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

گزشتہ دنوں شاہوخیل ہنگو کے مشہور عالم دین، عظیم مصنف، مایہ ناز محقق، فرشتہ صفت انسان شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے مدرسہ پر بمباری کردی گئی، چنانچہ مدرسہ، مسجد اور گھروں پر بمبارمنٹ کر کے، ان کو تباہ و برباد کردیا گیا اور دسیوں علماء و معصوم طلبا شہید ہوگئے۔ إنّا للہ و إنّا إلیہ راجعون، إنّ للہ ما أخذ و لہ ما أعطی وَ کلّ شيئٍ عندہ بأجلٍ مسمی۔

روز نامہ اسلام کی خبر ملاحظہ ہو:

''ہنگو/ اورکزئی (مانیٹرنگ ڈیسک) ضلع ہنگو میں حکام کا کہنا ہے کہ جیٹ طیاروں نے زرگیری اور شاہوخیل کے علاقوں میں جمعیت علماء اسلام (ف) کے ضلعی صدر کے گھر اور دو مدرسوں پر بمباری کی ہے، جس میں کم سے کم ۱۲ افراد شہید ہوگئے۔ شہید ہونے والوں میں ۵ خواتین اور بچے شامل ہیں۔ حملے میں ہنگو اور کزئی ایجنسی کے ایک سرکردہ اور ممتاز عالم دین مولانا محمد امین اورکزئی اپنے بھتیجے سمیت شہید ہوگئے۔ مولانا محمد امین اورکزئی ہنگو اور کزئی ایجنسی کے ایک سرکردہ عالم دین تھے۔ وہ سنی سپریم کونسل ضلع ہنگو کے سربراہ تھے۔ ان کا تعلق اورکزئی ایجنسی کے شیخان قبیلے سے بتایا جاتا ہے، جیٹ طیاروں نے شاہوخیل بازار میں بھی ایک مدرسے اور جامع مسجد کو نشانہ بنایا جس سے قریب واقع ایک گھر پر بم گرنے سے ۱۵ افراد جاں بحق ہوگئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ۳ خواتین اور ۲ بچے شامل ہیں۔ ہنگو سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق لڑاکا طیاروں نے جمعہ کی صبح ہنگو اور اورکزئی ایجنسی کے سرحدی علاقے زرگری میں واقع جمعیت علماء اسلام (ف) کے ضلعی امیر مفتی دین اصغر کے گھر پر بمباری کی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ حملے میں مفتی دین اصغر اور ان کے گھر سے ملحقہ دو گھر مکمل طور پر زمین بوس ہوگئے، جس میں ۵ افراد ہلاک اور ۸ افراد زخمی ہوئے، تاہم حملے کے وقت مفتی دین اصغر گھر میں موجود نہیں تھے، مرنے والوں میں ۲ خواتین اور بچے شامل ہیں، ہلاک ہونے والی خواتین جمعیت علماء اسلام کے ضلعی امیر کی رشتہ دار بتائی جاتی ہیں۔ یہ بھی اطلاعات ہیں کہ واقعہ میں مفتی دین اصغر کی اہلیہ شدید زخمی ہوگئیں۔ حکام کے مطابق جیٹ طیاروں نے ہنگو کے علاقے شاہوخیل میں ممتاز عالم دین مولانا محمد امین اورکزئی کے مدرسے کو نشانہ بنایا جس میں وہ اپنے بھتیجے سمیت شہید ہوگئے۔ یہ بھی اطلاعات ہیں کہ اس واقعہ کے بعد ضلع ہنگو کے تمام مدرسے احتجاجاً بند ہوگئے ہیں اور مولانا محمد امین اورکزئی کی شہادت کی خبر سننے کے بعد ہزاروں لوگ شاہوخیل پہنچنا شروع ہوگئے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ

مولانا محمد امین اورکزئی کی شہادت پر علاقے میں شدید غم وغصہ پایا جاتا ہے جب کہ مقامی انتظامیہ نے بھی ضلع بھر میں سیکورٹی سخت کردی۔ مرحوم مولانا محمد امین اورکزئی ایجنسی اور ہنگو کے ایک بااثر عالم سمجھے جاتے تھے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ بمباری کی وجہ سے مدرسے کی عمارت مکمل طور پر تباہ ہوگئی، انہوں نے کہا کہ شیلنگ کے وقت مدرسے میں کئی طالب علم موجود تھے جو عمارت گر جانے کی وجہ سے ملبے تلے دبے ہوئے ہیں اور جنہیں نکالنے کا کام جاری ہے۔''

(روزنامہ اسلام ۱۲/ جون ۲۰۰۹ء)

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ نہایت ہی امن پسند عالم دین، علاقہ بھر کی عظیم علمی شخصیت، خالص تحقیقی انسان تھے، ان کا کسی دہشت گردی یا فرقہ واریت کی سرگرمیوں کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ موصوف کی برکت سے علاقہ میں پائی جانے والی شیعہ سنی کشیدگی کا خاتمہ ہوا اور علاقہ امن وامان کا گہوارہ بنا۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی قدس سرہٗ کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی سے دورۂ حدیث کیا، فراغت کے بعد تخصص فی الحدیث یعنی علم حدیث میں ڈاکٹریٹ کی، بعدازاں ۱۳ رسال تک جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں استاد و ناظم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ کراچی کے کئی ایک مدارس کے اساتذہ حدیث ان کے شاگرد ہیں، انہوں نے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے بانی محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے خصوصی ایماء پر علم حدیث کی مشہور کتاب طحاوی شریف کی شرح لکھی، جس کی دو جلدیں ''نثر الازهار على شرح معاني الآثار'' کے نام سے طبع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ''مسانید امام اعظم'' پر تحقیقی کام بھی انہیں کا کارنامہ ہے، جامعہ علوم اسلامیہ کی تدریس کے بعد انہوں نے اپنے علاقہ میں حضرت بنوری قدس سرہ کے نام پر دینی ادارہ قائم کیا، وہاں شعبۂ تصنیف وتالیف قائم کیا، علاقہ میں امن وامان قائم کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا، اللہ کی مخلوق کو اللہ کے ساتھ جوڑا، غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ سے لولگائی، اے کاش! کہ جمعرات کو ہونے والی بمباری سے مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ساتھ وہ عظیم کتب خانہ اور علم وتحقیق کا خزانہ بھی مکمل طور پر تباہ ہوگیا، جس میں حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی ۴۰ سال کی محنت سے جمع شدہ کتابیں موجود تھیں۔ ان میں مولانا کے وہ تمام علمی وتحقیقی مسودات بھی شامل تھے، جو شائع ہونے والے تھے، حدیث شریف کی مشہور کتاب طحاوی شریف پر کیا گیا ان کا تحقیقی کام اور دیگر زیر طبع کتب بمباری میں ملیامیٹ ہوگئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنی شہادت اور سفر آخرت کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا، چنانچہ ہمارے دوست مولانا محب اللہ صاحب نے بتلایا کہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید نور

اللہ مرقدہٗ ایک روز قبل کسی عزیز کے جنازہ میں تشریف لے گئے، کسی وجہ سے جنازہ میں تاخیر کی گئی تو واپسی پر ہلاکت حادثے کی رات اپنے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کو بلا کر وصیت کی تھی، انہوں نے اپنی وصیت میں صاحبزادے کو ہدایت کی کہ میرے مرنے کے بعد موت کا اعلان نہ کیا جائے، جنازے کے مقررہ وقت اور تدفین میں تاخیر نہ کی جائے۔ ذرائع کے مطابق بعد ازں حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ نے اپنے صاحبزادے کو مدرسہ یوسفیہ اور دیگر لوگوں کی تمام امانتیں حوالہ کیں۔ بتلایا جائے کہ ایسے ولی اور اللہ والے کو مظلومانہ انداز میں شہید کرنا، اس کے مدرسہ، مسجد، کتب خانہ، معصوم علما و طلبہ کو ابدی نیند سلا دینا، کیا ملک وقوم کے حق میں مفید ثابت ہوگا؟

ایسا لگتا ہے کہ یہ ساری صورت حال مملکت خداداد پاکستان سے دین، دینی اقدار، مساجد اور مدارس اور علماء کو بدنام کرنے، مسلمانوں کو ان سے بدظن کرنے اور معاشرے سے ان کے کردار کو ختم کرنے کی خاطر پیدا کی جارہی ہے۔ خاکم بدھن کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آئندہ جس مسجد، مدرسہ، ملا، مولوی کو راستے سے ہٹانا ہو، اس پر بمباری کر کے یا ڈرون حملوں کی خدمات حاصل کر کے یہ بیان دے دیا جائے کہ یہ لوگ ملک دشمن تھے، دہشت گرد تھے، اغوا برائے تاوان کے مرتکب تھے، فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے، یہاں معصوم اور بے گناہ انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا، یہاں ملک وقوم اور حکومت کے خلاف منصوبہ بندی ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ، بتلایا جائے اس طرح کوئی مسجد، مدرسہ، دینی ادارہ اور عالم دین ان کی دست برد سے محفوظ رہ سکے گا؟

حکومت اور اس کے زرخرید میڈیا کے برخلاف ملک بھر کے اکابر علماء اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی شخصیت، مرتبہ، مقام، خدمات، ان کے دینی ادارہ، علماء اور طلبا پر بمباری کے نقصانات واثرات کے سلسلہ میں کیا کہتی ہے؟ روزنامہ اسلام کراچی کے حوالہ سے ملاحظہ ہو:

''اسلام آباد (نمائندہ خصوصی) اورکزئی ایجنسی میں دینی مدرسہ پر پاک فضائیہ کے جیٹ طیاروں کا حملہ اور شیخ الحدیث مولانا محمد امین اورکزئی کی شہادت ایک قومی سانحہ ہے، اس اشتعال انگیز کارروائی کے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے، حکمران ہوش کے ناخن لیں اور ایسی ظالمانہ کارروائیوں سے اجتناب کریں، ان خیالات کا اظہار وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے رہنماؤں شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی، شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، قاضی حسین احمد، علامہ ساجد میر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی محمد نعیم اور دیگر نے اورکزئی ایجنسی میں ایک مدرسہ پر پاک فضائیہ کے حملے اور اس کے نتیجے میں شہید ہونے والے شیخ الحدیث مولانا محمد امین اورکزئی کی شہادت پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا محمد امین اورکزئی بزرگ اور امن پسند عالم دین تھے اور دنیا بھر میں ان کے شاگردوں کا

وسیع حلقہ موجود ہے۔ان کی شہادت سے پاکستان میں قیام امن کی تمام امیدیں دم توڑ گئی ہیں۔اس اشتعال انگیز اور ظالمانہ کارروائی کے بہت بھیانک نتائج برآمد ہوں گے،وفاق المدارس العربیہ کے رہنماؤں نے کہا کہ ہمارے ناعاقبت اندیش حکمران ہوش کے ناخن لیں اور فوج کو امن پسند علما،طلبا اور بے گناہ عوام سے لڑانے اور بیک وقت بہت سے محاذ کھولنے سے اجتناب کریں۔'' (روزنامہ اسلام،کراچی ۱۲/ جون ۲۰۰۹ء)

اس صورت حال کا کسی قدر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوگا کہ اسلام دشمنوں اور ان کے ایجنٹوں نے اس واقعہ [illegible] بندی کی ہے۔

اس موقع پر ہم اہل علم،علما،طلبا اور دین دار مسلمانوں سے عرض کرنا چاہیں گے کہ اس گھمبیر اور پریشان کن صورت حال کا ادراک کریں،اپنے دشمن [illegible] اجتناب واحتراز کریں اور ملک وقوم کی حفاظت کے ساتھ دین،دینی مدارس،مساجد اور دینی اقدار کی حفاظت کے لئے کوئی مؤثر لائحہ عمل اختیار کریں اور سر جوڑ کر بیٹھیں کہ اس صورت حال کا تدارک کیونکر ہو،اور وہ لوگ جن کو طالبان کا نام دے کر ملکی مفادات کا دشمن باور کرایا جارہا ہے،اور ان کے کندھے پر رکھ کر اسلام،مسلمانوں، [illegible] دینی اداروں،علما اور طلبا کو مطعون کیا جارہا ہے،آخر وہ کون ہیں؟ کہیں ان کے ''اپنے لوگ'' طالبان کا روپ دھار کر یہ سب کچھ تو نہیں کر رہے؟ یا کوئی بیرونی عناصر آپ کو اور آپ کے دین ومذہب اور [illegible] ملک کو [illegible] ناپاک [illegible] مصروف تو نہیں؟؟

اللہ تعالیٰ ملک،قوم،دین،دینی اقدار،[illegible]،مدارس،[illegible] اور طلبا کی حفاظت فرمائے اور جو لوگ ملک وقوم اور دین وملت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں،اللہ تعالیٰ [illegible] نصیب فرمائے۔آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

(ماہنامہ بینات ترجمان جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی جولائی ۲۰۰۹ء)

ناشر

دارالتحقیق جامعہ یوسفیہ شاہووام ہنگو

اداریہ ماہنامہ البلاغ کراچی

ملک میں المناک قتل وغارت گری اور علماء کی شہادتیں

مولانا عزیز الرحمن

جمعرات ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۱ جون کو ایک المناک واقعہ پیش آیا کہ صوبہ سرحد کے نامور اور محقق عالم دین مولانا محمد امین اورکزئی صاحب اور ان کے دیگر متعلقین کو(شاہو خیل ضلع ہنگو میں واقع مرحوم کے مکان اور مدرسہ پر) پاکستانی جیٹ جہازوں نے بمباری کر کے شہید کر دیا۔ مولانا محمد امین صاحب اس صوبے میں اپنی علمی ساکھ اور دعوت دین کے مبارک کاموں میں سرگرم رہنے کی عمدہ شہرت رکھتے تھے، وہ محدث عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے تلمیذ رشید اور اپنے مدرسے کے شیخ الحدیث تھے۔ ان کا مدرسہ علاقے میں تعلیمی معیار اور اچھے نظم ونسق کے لئے مشہور تھا، ہماری معلومات کے مطابق کسی تنظیم سے ان کی وابستگی بھی نہیں تھی، وہ علاقے میں ہر طرح کے لوگوں کے لئے مرجعیت کا مقام رکھتے تھے، اس بمباری سے مسجد کو بھی شہید کر دیا گیا اور ملحقہ مدرسہ کے علاوہ زرگری کے مقام پر ایک دوسرے مدرسہ کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان جارحانہ واقعات پر وسیع علاقے میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور مقامی لوگوں نے اس ظالمانہ کارروائی پر احتجاج کیا۔ جب سے امریکہ افغانستان میں آیا ہے، پاکستان کے مدارس ومساجد اور علما ومشائخ دہشت گردی اور خوفناک جارحیت کا نشانہ بن رہے ہیں، اور آئے دن ایک سے ایک سانحہ قومی سطح پر شدید صدمہ لے کر آتا ہے، پچھلے دنوں امریکی صدر اوباما نے قاہرہ میں اپنی ایک تقریر میں اسلام اور عالم اسلام کے ساتھ قربت کا اظہار کیا ہے، لیکن امریکی قوم، فوج، تھنک ٹینکس، میڈیا اور یہودی لابی، سویت یونین کے زوال کے بعد پوری امت مسلمہ کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنا رکھا ہے، عراق، افغانستان کے بعد اب پاکستان کے عوام بھی اس جارحیت کے زخموں سے نڈھال ہیں، افغانستان اور عراق میں لاکھوں افراد امریکی قیادت میں عالمی دہشت گردی کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں، جبکہ پاکستان میں بھی ذرون حملوں کی تباہ کاری کا سلسلہ جاری ہے، خود امریکہ میں بھی آنے جانے والے بتلاتے ہیں کہ اسلامی تشخص یا اسلامی نام رکھنے والے ہر مسافر کو امیگریشن سے ہی چبھتی نگاہوں اور ناشائستہ رویے کا سامنا ہونے لگتا ہے، اس طرز عمل سے اس شدید نفرت کی غمازی ہوتی ہے، جو امریکیوں کے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک لاوے کی طرح ابل ابل رہی ہے۔ وماتخفی صدورھم اکبر۔

ایسے میں اوباما امریکی انتظامیہ کے کسی دوسرے عہدے دار کا امت مسلمہ کے ساتھ قربت کا اظہار تمسخر کے سوا

کیا حیثیت رکھتا ہے۔

موصوف کی شہادت کو دشمن قوتوں نے فرقہ وارانہ منافرت کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی لیکن اللہ کے فضل وکرم سے یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی، تاہم جن حالات سے یہ ملک گزر رہا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دشمنوں نے عراق اور افغانستان کو تباہ کرنے کے بعد اب اس وطن عزیز کو اپنا ہدف بنالیا ہے اور وہ ہر امکانی حربہ استعمال کرکے اپنے پنجے گاڑنا چاہتے ہیں، ان کو اپنے بے پناہ وسائل کی وجہ سے اندرون ملک بھی سرکاری اور غیر سرکاری ہر سطح پر بڑی تعداد میں ضمیر فروش دستیاب ہیں، ملکی سطح پر غلط فیصلوں، بیرونی دباؤ، قتل وغارت گری کے المناک واقعات کی وجہ سے آج یہ ملک تباہ کن سیاسی، معاشی، فکری اور عسکری بحران سے لرز رہا ہے۔

قال مولانا فضل محمد سواتی رحمه الله تعالى

سرکاری رپورٹوں اور دعووں کے مطابق ملک کے دو حصے [illegible] حکومت کی [illegible] ہوگئی ہے، وہاں بڑی تعداد میں باہر سے اسلحہ اور سرمایہ آتا ہے، لیکن اس کے خلاف یہ ناقابل فہم حکمت عملی اختیار کی گئی کہ ۳۵ لاکھ سے زیادہ لوگوں کو سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ گھروں سے نکالا گیا، آپریشن کے لئے توپ خانے سے لے کر جنگی جہاز استعمال کئے جارہے ہیں اور [illegible] ہونے والوں کی بڑی تعداد مناسب خوراک اور علاج معالجے کی ضروری سہولیات سے محروم، جگہ جگہ کیمپوں میں یا لوگوں کے گھروں میں کسمپرسی اور بے یقینی کے شب وروز گزار رہے ہیں۔

الا يا نسيم الصبح قل لاحبتي
تبيتون قالوا ح منى قولا اسفا قيد بلا لاجل
عليكم سلام الله ما ذر شارق
ولا تنسوا فضلا فدا منكم الامل

دوسال قبل شیخ الحدیث مولانا حسن جانؒ کی شہادت کا واقعہ ہو، ڈاکٹر سرفراز احمد صاحبؒ کی المناک جدائی ہو، مولانا محمد امین صاحبؒ اور ان کے مدرسہ، طلبہ اور متعلقین کے خلاف تباہ کن بمباری سے واقع ہونے والی المناک شہادتیں ہوں، مساجد، مدارس، آباد شہروں، پررونق بستیوں اور جنت نظیر باغات کی بربادی ہو، ملک میں آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات ہوں، یا لسانی اور علاقائی تعصبات، یہ سب فتنے عذاب الٰہی کی مختلف شکلیں ہیں، جن کا خمیازہ ہم آج اپنے اجتماعی گناہوں کی وجہ سے بھگت رہے ہیں۔

یہ ملک جس نظریہ کے تحت حاصل کیا گیا تھا وہ اکھاڑ پچھاڑ اور مفاد پرستی کے دلدل میں نگاہوں سے اوجھل کردیا گیا ہے، عدل وانصاف، اور امانت ودیانت کی جگہ ناانصافی اور خیانت کا دور دورہ ہے، خدمت ومحنت پر مفاد پرستی اور آرام طلبی غالب آگئی ہے، علم وآگہی کے اداروں میں آوارہ گردی اور جہالت کی فضا ہے، بالائی طبقے میں قومی وملی غیرت وحمیت کا فقدان ہے، فکر آخرت اور ملی تشخص کی جگہ دنیا پرستی اور نقالی میں مقابلہ ہے اور ہر طرف معاصی ومنکرات کے جھکڑ چل رہے ہیں، جن سے ٹھنڈی ہوا کی توقع کرنا اتنا ہی عبث ہے جتنا جھاؤ کے درخت سے انار اتار لینا۔

گندم از گندم بروید جوز جوز
از مکافات عمل غافل مشو

مولائے کریم ملک کے طول وعرض میں جاں بحق ہونے والے مظلوم علمائے کرام اور بے گناہ مسلمانوں کو اپنی جوار رحمت سے نوازے اور ان مرحومین کی قربانیوں کو ملک کے لئے امن وسلامتی اور دین وملت کے لئے سرفرازی وسربلندی کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ (ماہنامہ البلاغ ترجمان دارالعلوم کراچی جولائی ۲۰۰۹ء)

باب پنجم

مکاتیب امین

علمی، اصلاحی، سماجی اور تنقیدی خطوط کا گراں قدر ذخیرہ

مکاتیب مشاہیر بنام حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ

مکاتیب مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۱ شعبان ۱۳۹۷ھ، ۷۷-۴-۸

برادر محترم مولانا محمد امین صاحب وفقکم اللہ تعالیٰ لکل خیر وسعادۃ

تحیۃ وسلاماً! نامہ کاشف احوال ہو کر باعث مسرت ہوا کہ آپ مع الخیر پہنچ گئے اور سب کو مع الخیر پایا اور صحت بھی اچھی ہے۔ اللھم زد فزد

ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات کے نام خط لکھ دیا ہے جب موقع ملے جا کر دے دیجئے۔ اور زبانی سلام مسنون بھی پہنچا دیجئے۔ مدرسہ میں خزان کا موسم ہے البتہ ربیع رمضان المبارک پر جیدہ ہو جائے گا۔ میں بخیریت ہوں اور سب خیریت ہے ماہ برکات میں دعوات صالحہ میں یاد فرما کر ممنون فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فتنوں سے بچائیں۔ وقت کو ضیاع سے بچائیں اور صحیح مقبول خدمت حدیث کی توفیق نصیب ہو۔ ولکم بمثلہ علی لسان الملک

والسلام

محمد یوسف بنوری

(۲)

الخمیس ۶ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ، ۲-۹-۱۹۷۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گراں مکارم برادر محترم المقام مولانا محمد امین صاحب زادہم اللہ تعالی توفیقا الی کل خیر وسعادۃ

تحیۃ وسلاما! پہلا گراں نامہ یہ دوسرا گراں نامہ دونوں نے مشرف فرمایا۔ جذبات لطف وکرم سے محجوب ہوں۔ حق تعالی اس حفاظت کا اہل بنائیں اور مؤاخذہ نہ فرمائیں۔ آمین

میری صحت اچھی ہے لیکن ضعف بے انتہا، نہ سفر کے قابل نہ حضر میں عبادت ومجاہدے کا قابل، معلوم نہیں کہ سفر حرمین مقدر بھی ہے یا نہیں۔ ابھی تک عوائق موجود ہیں۔

مرکزی اسمبلی میں یہ بل پاس ہو گیا کہ مدارس ومساجد مرکزی حکومت کی تحویل میں لئے جائیں اور اس سلسلہ کی اندوہناک خبر ملی کہ کراچی سے شروع ہوگا۔ فہرستیں تیار ہوگئی ہیں اور ہماری مسجد ومدرسہ سرفہرست ہے۔ تقریبا ۱۲ دن سے یہ مسئلہ درد سر بنا ہوا ہے، قرائن متجاذب ہیں، انجام کار معلوم نہیں، اللہ تعالی رحم فرمائے، آیت کریمہ کا ختم بھی کیا گیا دعائیں بھی جاری ہیں، مسجد کمیٹی کا ستم اس پر مستزاد "انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ" دعا فرمائیں۔

دارالحدیث میں ختم تراویح شروع کیا ہے، ۶ راتوں میں ۱۸ پارے ہوگئے ہیں، نہ قیام کی اہلیت نہ سماع کی اہلیت صرف عادت کی خانہ پوری کی جارہی ہے، اللہ تعالی قبول فرمائے۔ یہاں پہلا روزہ شنبہ سے ہے، ماہ برکات میں دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ عزیزان محترم حبیب مختار اور مفتی احمد الرحمن سلمہما دونوں بخیر ہیں اور آخر شعبان میں واپس آگئے تھے۔

والسلام

محمد یوسف بنوری

(۳)

۸/رمضان ۱۳۹۷ھ، ۲۴/اگست ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گراں الطاف محترم ...... زادکم اللہ الی الخیرات توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

نامہ مکارم کاشف احوال ہوا۔ نخب الافکار کے سلسلہ میں آپ کو بڑی زحمت اٹھانی پڑی، اللہ تعالی قبول فرمائے۔ آپ نے پہلے خط میں حضرت مولانا عزیز صاحب کی ملاقات کے لئے سفر کا ذکر کیا تھا، اس خط سے معلوم نہ ہو سکا کہ آپ گئے تھے یا نہیں؟

الحمد للہ ماہ رمضان المبارک بعافیت گذر رہا ہے نہ پیاس نہ بھوک۔ دار الحدیث میں مؤقر قاری عطاء اللہ بنگالی کے پیچھے تراویح شروع کی ہے۔ ۲۴ پارے ہو گئے ہیں۔ بہت ہی عمدہ پڑھتا ہے اور خوب یاد ہے۔ شب جمعہ کو ان شاء اللہ تعالی ختم ہو گا۔

حرمین شریفین کا کافی تردد وتذبذب کے بعد ۱۴ رمضان المبارک ۳۰ اگست کو روانگی کا عزم ہو گیا ہے۔ اگر کوئی مانع پیش نہ آیا ان شاء اللہ تعالی جاتا ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو وہاں اپنی ناچیز دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ آپ بھی براہ کرم ماہ برکات میں اوقات اجابت میں دعوات صالحہ میں نوازتے رہیں۔ ولکم بمثلہ علی لسان الملک۔

عزیز گراں مولانا حبیب المختار بخیریت ہیں اور اپنے کاموں میں مشغول ہیں ان کے والد محترم ۱۵ رمضان کو عازم حجاز ہیں۔

ڈاکٹر رشید احمد کے بارے میں تحقیق کر لیا گیا بظاہر صحیح نہیں تخت نشینی والا خواب بظاہر عمدہ ہے پوری تعبیر ذہن میں نہیں آئی۔

والسلام

محمد یوسف بنوری

مکتوب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم ومکرم جناب الاخ مولانا محمد امین صاحب مدفیوضکم

سلام مسنون! آج کل بینات بہت اہتمام سے سن رہا ہوں، خدام الدین نمبر بھی باوجود طبیعت خراب ہونے کے بہت ذوق وشوق سے سنا، اس میں طحاوی پر جناب کے کارنامے کا ذکر بھی سنا بہت ہی جی خوش ہوا، اللہ تعالیٰ بہت ہی مدد فرمائے اور اس مبارک کام کو تکمیل کو پہنچائے، اس کے متعلق ایک آپ بیتی میری بھی سن لیجئے، میرے والد صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہ کو بھی اس کا بہت اہتمام تھا، ۱۳۰۷ھ میں انہوں نے اس کی تلخیص اُردو میں تالیف فرمانی شروع کی تھی، اور اس کا اشتہار بھی دے دیا تھا اور خیال یہ تھا چھوٹے چھوٹے اجزاء شائع کیے جائیں، تقریباً پہلی جلد کا مسودہ بھی ہو گیا تھا، میری عمر اس وقت چھ برس ہی کی تھی مگر میں نے وہ مسودہ اور اشتہار دیکھا تھا وہ تو نہیں لکھ سکے مگر اپنے حدیث پڑھنے کے زمانے میں میرے شیخ میرے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو بھی طحاوی کا اہتمام تھا، اس ناکارہ نے طحاوی انہی سے پڑھی ہے اور مولانا انور شاہ صاحب کا قصہ تو میں الحاوی کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔ وہ تو آپ کے پاس ہوگی، اس لئے کہ قاری سعید الرحمن صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے، اس کے بعد جب تدریس حدیث کا زمانہ آیا اور مولانا عبد الرحمن صاحب پاکستان تشریف لے گئے تو میں نے بہت چاہا کہ مدرسہ والے طحاوی کا سبق مجھے مستقل دے دیں، مگر بخاری، ابوداؤد کے بدلے میں دینے پر اہل مدرسہ راضی نہ ہوئے اور تیسرا سبق لینے کی میری ہمت نہ ہوئی، اس لئے صبح کا وقت میرا سارا تالیف میں مشغول رہتا تھا، اوجز، کوکب، لامع وغیرہ کا سلسلہ ہو رہا تھا، البتہ میں نے عزیزی مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر تبلیغ کو اصرار سے اس میں مشغول کیا، اور ان کی تالیف ساڑھے تین جلدیں طبع بھی ہو گئیں، آپ سے تو وہ بیکار رہے، اس لئے کہ آپ تو طحاوی کی جلد اول نمٹا چکے اور وہ غالباً ابواب الوتر تک پہنچی ہے، نیز میں نے حکیم ایوب صاحب مظاہری کو بھی اس کے متعلق کچھ لکھنے کو تجویز کیا تھا، انہوں نے کئی چیزیں اُس کے متعلق لکھی تھیں، ایک رسالہ انہوں نے تصحیح اغلاط الطحاوی لکھی تھی، وہ چھپ گئی، رجال پر بھی انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کی ایک جلد چھپی ہے، ان چیزوں کے متعلق معلومات کرنا چاہیں تو عزیز مولوی شاہد کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارنپور سے معلوم کر لیں کہ طحاوی کے متعلق حکیم ایوب کی کیا کیا چیزیں ہیں، ان میں سے کوئی چیز آپ کو کارآمد ہو تو ضرور منگائیں۔ عزیز شاہد کے نام اس کاغذ کے چوتھائی حصہ پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں، وہ اپنے گرامی نامہ کے ساتھ شاہد کے نام بھیج دیں۔ بینات کے اس نمبر پر نہ تو قیمت کہیں ملی، نہ یہ پتہ چلا کہ ہندوستان میں خریدوانی چاہوں تو کس پتہ سے مل سکے گی، یا آپ ہی کے ہاں سے خرید کر بھیجنی پڑے گی

؟اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ کو جلد از جلد تکمیل کو پہنچائے اور دونوں جہانوں میں اس کا بہترین اجر عطا فرمائیں۔

فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب بقلم حبیب اللہ۔ مدینہ طیبہ

۱۹/۱/اپریل ۷۸ء

ملحوظہ: حضرت شیخ الحدیث صاحب نے مولانا شاہد سہارنپوری مدظلہم کے نام جس خط کا ذکر کیا وہ درج ذیل ہے:

باسمہ تعالیٰ

عزیز شاہد سہارنپوری سلمہ! بعد سلام مسنون، اس وقت معلوم ہوا کہ مولانا محمد امین صاحب حضرت مولانا بنوری صاحبؒ کی تعمیل ارشاد میں طحاوی پر کچھ کام کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو ابھی خط لکھا ہے کہ مولانا یوسف نور اللہ مرقدہ کی امانی الاحبار ساڑھے تین حصے چھپ گئے ہیں اور حکیم ایوب صاحب کے تصحیح اور رجال کے بھی کچھ حصے چھپ گئے ہیں، ان کتابوں میں سے یا اور کوئی کتاب طحاوی کے متعلق تمہارے یا نصیر کے کتب خانہ میں ہو تو مولانا جو جو کتابیں منگانا چاہیں، میرے حساب میں کسی آنے والے کے ہاتھ کراچی بھیج دو، کراچی آنے والے نظام الدین آتے رہتے ہیں، مولوی اظہار کی معرفت آسکتی ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب، بقلم حبیب اللہ

مدینہ طیبہ ۱۹/۱/اپریل ۷۸ء

مکاتیب حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمہ اللہ

(۱)

باسمہ تعالیٰ

۱۱ ذیقعدہ ۸۹ ۱۳ھ

عزیز القدر مولوی محمد امین سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کا براءت نامہ موصول ہوا۔

میرے عزیز! آپ اور مولوی عبدالحمید دونوں مدرسہ سے چھٹی لے کر وطن گئے ہیں، درجہ تخصص سے رخصت ہو کر نہیں گئے مجھے ایسا ہی خیال ہے ممکن ہے میں غلط فہمی میں مبتلا ہوں، اسی لیے میں نے وسط شوال میں واپسی کی تاکید کی تھی کہ میں خود بھی اسی زمانہ میں واپسی کا ارادہ رکھتا تھا۔

آپ کا پہلا ملفوف خط مجھے ۲۱ شوال کو واپسی پر ملا، اس میں تخصص کے ناتمام کام کی تکمیل کا مطلق ذکر نہ تھا بلکہ رمضان المبارک اور مسلسل علالت کی وجہ سے کچھ نہ کر سکنے کا ذکر تھا اور دوسرے خط (کارڈ) میں ارباب مدارس کی یورش کا ذکر تھا اور انداز تحریر سے مترشح تھا کہ آپ مجھ سے واپس نہ آنے کی اجازت چاہتے ہیں یہ کہ آپ تخصص کا کام پورا کر کے بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کا مطلق ذکر نہ تھا۔

یہ تو بتلانے کی ضرورت نہیں کہ تخصص کا اصل کام 'مقالہ' ہوتا ہے، امتحانات وغیرہ تو محض تمرین کے لئے ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں آپ مجھے واپسی کے 'انتظار' اور اس کے بعد 'تقاضہ' کے بارے میں امید ہے کہ معذور سمجھیں گے، 'تقاضہ' میں 'درشتی' 'میرے مزاج' کا تقاضہ ہے اس میں معذور سمجھئے، خلاف توقع واقعات انسان کو ویسے بھی آتش زیر پا بنا دیتے ہیں، خاص کر جب قلبی تعلق نہ صرف زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہو۔

بہر حال تخصص کے کام یعنی مقالے کی تکمیل 'میری توقعات کے مطابق' سے فارغ ہونے کے بعد یہاں ہو یا وہاں۔ آپ کے مستقبل سے متعلق دو صورتیں ہیں: ایک میں مختلف اور متنوع فوائد مضمر ہیں:

(۱)..... آپ علمی تحقیق اور توسیع معلومات کا سلسلہ خصوصاً علوم نبوت اور اس کے ذریعہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کی ذات اقدس سے جو علاقہ اور قرب دو سال میں حاصل ہوا ہے اس کو تصنیف وتالیف کی شکل میں مزید جاری رکھیں اس کے فوائد بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔

(۲)..... آپ کسی مدرسہ میں تدریس کا مشغلہ اختیار کریں، اس کا عظیم فائدہ یہ ہے کہ جتنے علوم وفنون اس تعلیمی

زندگی میں آپ نے حاصل کیے ہیں ان میں استحکام، پختگی اور بصیرت تامہ حاصل ہو جائے گی، مشہور ہے کہ مولوی فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب تک کافی عرصہ مدرسی نہ کرے اس وقت تک نہ عالم بنتا ہے نہ محقق، نہ خطیب بنتا ہے، نہ مصنف۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم درسی کتب تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اب استفت قلبک ولو افتاک المفتیون پر عمل کیجئے، نیز شب دوشنبہ سے شب جمعہ تک استخارہ مسنونہ کیجئے اور جس چیز پر قلب مطمئن ہو اس پر عمل کیجئے۔ میں تو صرف یہ دعا ہی کر سکتا ہوں "اللھم الھمہ رشدہ واھد قلبہ" آمین

مولوی عبدالحمید کے لئے بھی یہی جواب ہے۔

میرے اس خط میں بھی وہی کیفیت پائیں گے جو اس سے پہلے دو خطوں میں پائی ہے، اس کی وجہ آپ ان توقعات کے آئینہ میں دیکھئے جو آپ سے وابستہ ہیں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول

والسلام

خادم محمد ادریس عفی عنہ

(۲)

باسمہ تعالیٰ

۲۱ ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ

عزیز القدر مولوی محمد امین سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کا لفافہ اس وقت پہنچا جب کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں اپنی بدحواسی میں خط کو ڈاک میں ڈلوانے کے بجائے کہیں رکھ کر بھول تو نہیں گیا۔ حالات یہ ہیں:

مولانا محمد اسحاق صاحب جن کی نگرانی میں شعبہ تصنیف و تالیف کا کام شروع ہوتا ہے، اب تک ہندوستان سے پاکستان نہیں پہنچ پائے، نہ ہی مستقبل قریب میں توقع ہے۔

اللہ جل جلالہ نے اس دیوانہ کی دعاؤں کو سن لیا اور ۴ فروری کو بحری جہاز کے ذریعہ ان شاء اللہ تعالیٰ حجاز بیت اللہ کے لئے جا رہا ہوں، کوشش یہ ہے کہ توفیق الٰہی مساعد ہو تو اواخر ذی الحجہ میں واپس کراچی پہنچ جاؤں تاکہ مدرسہ کا کم سے کم حرج ہو۔

ان حالات میں آپ صرف میری ہی رضا اور خوشنودی نہیں بلکہ اللہ جل مجدہ کی رضا کی طرف بھی مطمئن ہو کر اس

عزم کے ساتھ عقد مسنون کیجئے اور اس کے بعد تدریس کا مشغلہ شروع کر دیجئے کہ جب بھی حالات سازگار ہوں گے طحاوی کے کام کو پورا کیا جائے، نیز مقالہ کی دو کاپیاں مکمل کر کے بھیج دیجئے۔

دل و دماغ اہتمام سفر میں لگے ہوئے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ اوائل محرم میں خیریت واحوال طرفین معلوم ہوں گے۔ آخر میں بالرفاہ والبنین کہہ کر پیشگی مبارکباد دیتا ہوں آپ دعا کیجئے: رب ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ انک سمیع الدعا اور ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما۔ آمین

والسلام

خادم محمد ادریس عفی عنہ

(۳)

باسمہ تعالیٰ

۱۵ اپریل ۱۹۷۰ء

عزیز القدر مولوی محمد امین سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کا خط عین انتظار کی حالت میں پہنچا، آپ بسم اللہ توکلت علی اللہ کہہ کر کراچی آ جایئے، مقالہ اور تخریج احادیث طحاوی سے متعلق تمام ضروری یاداشتیں ساتھ لایئے، اس کے علاوہ بھی کارآمد سامان ہمراہ لایئے، وہاں یا آپ کے علاقہ میں کوئی حاذق طبیب ہوں تو ان سے دائمی قبض کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرا لایئے۔

اگر کسی وجہ سے روانگی میں کچھ تاخیر ہو تو اطلاع دے دیجئے۔

والسلام

خادم محمد ادریس عفی عنہ

(۴)

باسمہ تعالیٰ

عزیزم مولوی محمد امین سلمہ اللہ تعالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

میں اگر چہ بحمد اللہ واحسانہ ۵ مارچ کو ہی سفر حج سے واپس کراچی پہنچ گیا تھا، مگر اسی دن دوسرے عازمین حج اساتذہ کے اسباق پڑھانے اوران کی عدم موجودگی کے خلا کو پر کرنے میں اس قدر مصروف ہوا کہ مدرسہ کا پورا وقت اسباق پڑھانے میں اور باقی اوقات ان کا مطالعہ دیکھنے میں صرف ہورہا ہے کہ یہی میری اتنی عجلت کے ساتھ دیار حبیب کو چھوڑ کر واپس آنے کا مقصد تھا اور ہے۔

اس اثنا میں متعدد مرتبہ خط لکھنے کا ارادہ کرنے کے باوجود نہ لکھ پایا تھا کہ آپ کا خط پہنچ گیا، آج شب جمعہ ہے، مطالعہ دیکھنا نہیں ہے تو خط کا جواب دینے کا موقع مل گیا۔

عزیزم! یہ ابتلاء ہے اور آپ کی استقامت کا امتحان اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ" الآیۃ۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کو از راہ شفقت 'یا غلام' کے لفظ سے خطاب فرمایا اور چند نصیحتیں کی ہیں اس سلسلہ میں اسی حدیث کے دو فقرے آپ کو لکھتا ہوں:

واعلم أن ما اصابک لم یکن لیخطئک وما اخطاک لم یکن لیصیبک۔

لہٰذا آپ اس خیال کو اپنے دل سے بالکل نکال ڈالیں کہ اگر میں اس وقت بے اعتنائی یا استغنانہ برتتا تو وہ ملازمتیں مجھے مل جاتیں، وہ ہرگز آپ کو ملنے والی نہ تھیں، چاہے آپ ان کے حاصل کرنے کے لئے لاکھ کوشش کرتے، اس لئے کہ اگر وہ آپ کو ملنے والی ہوتیں تو لاکھ آپ ان کو ٹھکراتے مل کر رہتیں "جف القلم بما ھو کائن" بہر حال آپ نے کوئی غلط کام نہیں کیا بلکہ استقامت فی خدمۃ الدین کا ثبوت دیا ہے۔

اب کیا کرنا ہے؟ اس سلسلہ میں یہی اسی حدیث پاک کے دو فقرے نقل کرتا ہوں:

واذا سئلت فاسئل اللہ یعطک واذا استعنت فاستعن باللہ یعنک۔

آپ تو ہر وقت اللہ تعالی سے یہ دعا مانگتے رہے:

"اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک" اس دعا ماثور میں "وخدمۃ دینک" کا اضافہ کر لیجئے اور یاد رکھئے: وفی السماء رزقکم وما توعدون۔

انتہائی صبر واستقامت کے ساتھ کشائش غیبی کا انتظار کیجئے جو وقت پر آ کر رہے گی:

"وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا (۲) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

بالغ امرہ ط قد جعل اللہ لکل شیء قدرا"۔

ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی اس وعدہ کا ایفاء ہوگا اور کسی بھی ایسے کام میں نہ پھنسیے کہ خدمت دین کا موقعہ ملنے کے وقت آپ اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکیں جو بھی قدم اٹھائیں، استخارہ مسنونہ کے بعد اٹھائیے۔

حضرت مولانا بنوری مدظلہ کے والد ماجد مدظلہ نے اپنا آزمودہ معمول بتلایا ہے خادم نے بھی آزمایا ہے، بہت زود اثر پایا ہے، نماز مغرب اور نماز فجر کے بعد یہ دو آیتیں سات مرتبہ پابندی سے پڑھیے:

ان ولیی اللہ الذی نزل الکتب وھو یتولی الصلحین اور حسبی اللہ لآ الہ الا ھو ط علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم۔

میرے عزیز! میرے پاس تو یہی کچھ ہے جو میں نے پیش کیا، اسی سے سارے کام چل رہے ہیں، ہو سکے اور خدا آپ کو توفیق دے تو آپ بھی صدق دل سے اس پر عمل کیجئے، کامیابی ان شاء اللہ تعالیٰ یقینی ہے۔

کم از کم مجھے اپنے سے بے تعلق کبھی بھی نہ سمجھئے، چاہے خط لکھوں یا نہ لکھوں۔ آخر میں دعا کرتا ہوں اللہ جل شانہ آپ کو صبر و شکر و استقامت کی توفیق عطا فرمائیں۔ مالی حالت اجازت دے تو سفر کا قصد کیجئے ورنہ مقالہ بذریعہ ڈاک بھیج دیجئے۔

والسلام

خادم محمد ادریس عفی عنہ

مکاتیب مولانا فضل محمد سواتی صاحب رحمہ اللہ

(۱)

یکم ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ۔ ۴/ اپریل ۱۹۷۵ء

باسمہ تعالیٰ وتقدس

وما کل زھر ینبت الروض طیب

ولا کل کحل للنواظر اثمد

برادر محترم ذوالمجد والکرم مولانا محمد امین صاحب زادمجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

بے حد انتظار رہا، مگر طیب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حنیف صاحب بھی رحلت فرما چکے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون شاید وہ کراچی تشریف لے گئے ہوں، اس کے بعد انتظار ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ بخشے آمین۔

برخوردار نذیر احمد کے بھیجنے کا بالکل تصور بھی نہ تھا مگر وہ بے حد مصر ہوا حتیٰ کہ اسکول جانا بھی چھوڑ دیا، وہ ویسے بھی بڑا ضدی قسم کا ہے، میں نے سوچا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ڈال دیا ہے، اسی میں خیر ہے۔ کم سے کم اسکول کی منحوس فضا سے تو بچ جائے گا، اس لئے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ سردست دوسو کی رقم ارسال خدمت ہے، اکثر وبیشتر ہم نے دیکھا سنا اور خود بھی یہ چیز میرے عمل میں آئی ہے کہ دورانِ طالب علمی میں زندگی سادہ ہو، فقیرانہ ہو، اس لئے ان کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ نہ فرمائیں، البتہ کمرہ علیحدہ ہو تو مناسب ہوگا، نگرانی البتہ آپ خود فرمائیں کہ ان کا وقت ضائع نہ ہو اور اخلاق سے آراستہ ہوں اور عبادت سے مزین اور تلاوۃ قرآن سے ان کا قلب زندہ ہو۔ واجرکم علی اللہ رب العالمین۔ جناب چچا جان صاحب کو اور برادرم معین الدین صاحب اور جملہ اساتذہ کرام کو سلام عرض ہیں۔ نوٹ: تجوید کا انتظام ضرور فرمائیں۔

فضل محمد عفی عنہ

فقط والسلام ۷ ا ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ

(۲)

باسمہ الکریم

یزید التآی حبک فی فؤادی

اذا انسیت لذکراک القلوب

برادر محترم زید مجدہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

مدت سے خط لکھنے کی فکر میں ہوں، مگر اپنی پسند کی تحریر کے لئے موقع نہیں ملتا اور ویسے دفع الوقتی خط لکھنے کو جی نہیں چاہتا، صرف اس لئے یہ دیر ہوئی، واللہ کسی نسیان کی بنا پر نہیں، یہ ملک عجیب ہے علما کے لحاظ سے بھی اور طلبہ کے لحاظ سے بھی اور عوام کی حیثیت سے بھی، گونا گوں واقعات پیش آتے رہتے ہیں، خط لکھنے کے لئے فرصت چاہیے، دو تین مرتبہ بانی مدرسہ حاجی خونہ گل صاحب سے جھڑپ ہوئی، بے چارے نے چوں تک نہیں کیا، خوب چیخ چلا کر اس کو ڈانٹا، وہ بے چارہ بالکل مبہوت رہ گیا کہ یہ کیسا مولوی ہے جو ایک سیٹھ کو ایسا ڈانٹتا ہے جیسا بچہ، بہر حال خداوند تعالی اس کو جزائے خیر عنایت فرمائے، بڑے صبر وتحمل سے کام لیا، کسی سے شکایت تک نہیں کی۔

کچھ واقعات کابلیوں کے پیش آئے۔ کچھ حوادث پنج پیریوں کی شرارت سے مودودیوں کے پیش آئے، تین مودودی گھس آئے ہیں اور بے خبری سے داخل ہو چکے ہیں، بڑے ہوشیار اور ظاہراً با اخلاق۔ سبق میں سب جماعت والوں سے دانا عاقل، ان کی پشت پر بڑی سیاسی اور سرمایہ دار جماعت، ہمارے بعض ارکان مدرسہ کے متعلق بھی معلوم ہوا کہ وہ بھی مودودی ہیں، ایک پانچ ہزار دوسرا ۲۲ ہزار تیسرا پانچ ہزار کی امداد دیتے ہیں، اب آپ بتلایئے ایسے خطرناک مؤقف میں میری اکیلی جان کیا کر سکتی ہے؟ مگر محض اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اب تک اپنا مؤقف بھی صاف اور سب کو خوب دبایا اور الحمد للہ اب تک نظام میں کوئی خلل بھی نہیں آیا، میں ان فتنوں سے صرف دو تین روز ہوئے ذرا فارغ معلوم ہوتا ہوں، اس لئے مولانا مدظلہم کو بھی ایک ماہ میں ایک خط لکھا ہے، اس کا بھی انہوں نے اب تک جواب عنایت نہیں فرمایا، انتظار کر رہا ہوں لیکن صبر ختم ہو چکا ہے، مختصر سا خط لکھنا پڑے گا۔

محمد نعیم طالب علم نے مجھے بڑے اظہار افسوس کا خط لکھا ہے کہ مجھے اس سیلاب میں غرق ہونے کا انتہائی افسوس ہے، بدحواسی میں لکھا ہے، خط میں نام لکھنا بھی بھول گیا ہے، میں نے خط سے اس کو پہچانا ہے، وہ واقعی لیڈر قسم کا آزاد پنج پیری ہے، اچھا ہوا بقول آپ کے کہ مدرسہ شریروں سے پاک ہو گیا، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔

یہ کام بہت عقل اور دل چاہتا ہے، بزدلی سے انسان دب جاتا ہے اور کم عقلی سے تدبیر فوت ہو جاتی ہے، کام بگڑ جاتا ہے۔ خصوصاً ...... جیسی فضا میں جس کے اندر ہر قسم کے افراد موجود ہوتے ہیں، ادھر ...... مدظلہم بڑے لوگ ہیں، کبھی انسان اپنے اخلاص میں کوئی کام صواب سمجھ کر گزرتا ہے، الٹا انسان مجرم قرار دیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالی ضرور امداد فرماتا ہے، آخر کار حق غالب آ کر رہتا ہے، بارہا اس کا تجربہ خود مجھے ہوا ہے، بہر حال حسب توقع ان دینی

اداروں میں اس قسم کے واقعات کو برداشت کرنا عظیم اجر کا اور ترقی درجات کا باعث بنتا ہے۔ ایک عظیم دینی قلعہ کی چوکیداری ہے، فذالکم الرباط فذالکم الرباط یہ تو بہت آسان کام ہے، پڑھایا، طالب علموں کو خوش کیا اور تنخواہ حلال کردی، اصل کام تو تربیت ہے، حفاظت ہے۔

الحمدللہ کے بعد تمام صفات کمالیہ میں رب العالمین کی صفت کو حمد کے استحقاق کا مستوجب ظاہر کیا گیا ہے جو مسماۃ رحمن اور رحیم کی رحمت کا ہے، حقیقت میں یہ طلبہ پر شفقت ہے جس کا اثر تربیت ہے، اگرچہ بظاہر طلبہ ایسے استاذ کو بڑا ظالم قرار دینے کا فتوی لگاتے ہیں اور مداہنین کو اپنے بڑے مشفقین خیال کرتے ہیں، اس لئے یہ ایسی بے ریا عبادت ہے کہ دنیا میں اس کا معاوضہ بالخیر تو کیا بلکہ مقابلہ بالشر کیا جاتا ہے، اس لئے یہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی، اللہ تعالی رحم فرمائے اور دین کی خدمت مقبول میں جان کنی نصیب فرمائے اور ایسی حالت میں موت آئے کہ ہمہ تن اپنے رب کے پاس جانے کا اشتیاق ہی اشتیاق ہو، غفلت کی موت اور سوء خاتمہ سے اللہ جل وعلا شانہ پناہ میں رکھے، ہر وقت توفنی مسلما والحقنی بالصالحین کا ورد نصیب فرمائے، بہت کم دن رہ گئے، خبر نہیں کس حالت میں موت آئے گی، اللہ تعالی رحم فرمائے۔

یہ چند کلمات مسلسل عجلت میں لکھے، تمام کام ڈھیر جیسا پڑا ہوا ہے، کچھ بے لذت ساخط ہے، مگر قبول فرمائیں۔ اپنے سقم وعافیت کے متعلق کیا لکھوں؟ زندگی کے مختلف اطوار ہیں جو گزرتے ہیں ایک شاعر خوب کہتا ہے:

ثمانية عمت باسبابها الورى
فكل امرئ لابد يلقى الثمانية
سرور وحزن واجتماع وفرقة
وعسر ويسر ثم سقم وعافية

حاجی عبداللہ صاحب کو اور مخلص عبدالقیوم صاحب اور آپ کے رفیق حبیب کو ہدیۂ سلام پہنچائیں۔

فقط والسلام

فضل محمد عفی عنہ

۲۲ ربیع الاول م ۲۴ مارچ لیلۃ الاربعاء

(۳)

باسمہ تعالی

برادر محترم جناب مولانا محمد امین صاحب زادت مکارمہ العالیہ وفضائلہ السامیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

سہ ماہی امتحان کی مصروفیت کے علاوہ دیگر مصروفیات اور پھر گھٹنوں کا درد جو دو ماہ سے لاحق ہوا ہے ان عوارض کی وجہ سے میں بھی آپ کی طرح خط لکھنے اور جواب خط میں بہت ہی کمزور......... کہ علمی برادری کا حق ادا نہ ہوا۔ آپ نے چند سطور میں بہت وحشت ناک قسم حالت بیان فرمادی ہیں لیکن وہاں پر دینی خدمات کے جو مواقع فراہم ہیں اور جو نعمتیں میسر ہیں ان کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ تکلیفیں اور نعمتیں توأمین ہیں، کلفت کی وقت نعمتوں کا ذکر وفکر اور نعمتوں کے وقت کلفتوں کا دھیان ایک امر ناگزیر ہے۔ پہلی پر نظر جمانا تو انسان مایوسی یا مستی کے کھنڈوں میں لا ڈالتا ہے کہ جن سے نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، زندگی کا مزہ تو اس زیر وبم میں ہے۔ محبوب پیچھے سے دبائے تو کتنا مزہ آتا ہے۔ پیار میں ہی صرف مزہ کو طلب کرنا شاید مطلب علی والا معاملہ نہ ہو۔

لیلیٰ نے اونٹ ذبح کر کے قبیلے کی دعوت کی، ثرید اور گوشت جب زور وہنر دکھائے جارہا تھا، مجنون نے آواز لگا دی، لیلیٰ نے باہر نکل کر غصے میں اس کے ہاتھ سے کاسہ لے کر زمین پر دے مارا۔ لوگ سب ناراض ہو کر کھانا کھا لینے سے ہاتھ روک لیتے ہیں، لیلیٰ کہتی ہے کہ یہ گوشت جو اونٹ کا ہے، مجنون کیا اس کا مستحق ہے یا کہ اس کا مستحق ہے کہ میں اپنا دل نکال کر بھون کر اس کو کھلا دوں؟ لوگ یہ سن کر خوش ہو گئے اور مجنون مست ہو کر واپس ہو لیتا ہے، بھائی!......... کی راحتیں ان لوگوں کو لینے دو جو اس کے طلب گار ہیں، جن کے حصے میں خدمت دین کے بدلے ڈھیلے اور پتھر آئے، خدا کی قسم! وہ مجنون والے حصے کا مستحق ہو گیا۔ چند لمحات زندگی باقی ہیں، اپنے کام اور پہلوئے آخرت کو اور تیز کرنے کی ضرورت ہے، اس کو نہ دیکھیں کوئی کیا کر رہا ہے جس کے لئے کر رہے ہو صرف اس کی طرف دھیان کی ضرورت ہے۔ پریشانی غالب ہو تو یہ دعا پڑھا کیجئے، دھیان اور یقین کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ اکسیر ہے:

یا لطیفا بخلقہ یا علیما بخلقہ یا خبیرا بخلقہ الطف بی یا لطیف یا علیم یا خبیر [ثلاث مرات]

باقی حسب وعدہ جب آپ کا مکتوب گرامی آئے گا تو پھر عرض کروں گا۔ فقط

آپ کا پرانا نیوٹاؤن کا ساتھی

فضل محمد عفی عنہ

۵ جنوری محرم الجمعہ ۹۷ء

(۴)

باسمہ الکریم

اکل الفراق محاسنی

وحجبت عن نفسی وعن احبابی

برادر محترم ذوالمجد والکرم زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

ان ایام سرما میں جن اوجاع اور اسقام کا شکار ہوں بیان نہیں کرسکتا، ان کے باوجود جو مشاغل میرے ذمے ہیں نطاق بیان ان سے عاجز ہے۔ میں آپ کے محبت نامہ سے ایک روز پیشتر حیرت سے سوچ رہا تھا کہ حضرت مولانا کے علاوہ......... میں ویسے دوست احباب تو کثرت سے ہیں مگر ان میں کوئی صدیق مخلص مولانا محمد امین صاحب کے سوا کوئی نہیں، اگر وہ لوگ کوئی رقعہ نہ ارسال کریں تو قلبی روابط نہ ہونے کی بنا پر نہ انہیں کوئی فکر نہ مجھے کوئی صدمہ، لیکن یہ حضرت کیوں بالکل خاموش ہیں، حالانکہ گھر آکر خط لکھنے کا وعدہ بھی کر چکے ہیں، کل جو گرامی نامہ ملا تو معلوم ہوا کہ آپ اپنا وعدہ پورا کر چکے ہیں مگر واللہ مجھے کوئی خط آپ کا نہیں ملا، ورنہ میں خاموش نہ رہتا: ؎

ما زلت قد سکنوا قلبی اصون لهم

لحظی و سمعی و نطقی اذهم النمی

اس جہالت کی دنیا میں تو اسیر فراق کی رہائی کا سامان یا تو ذکر اللہ ہے یا مخلص احباب کی ملاقات یا کم از کم ان سے خط وکتابت۔ بہت روز ہوئے کہ حضرت مولانا مدظلہم کے گرامی نامہ سے محروم ہوں، وہ لکھتے ہیں مجھے نہیں ملتا۔ میں لکھتا ہوں انہیں نہیں ملتا، واللہ اعلم کیا راز ہے؟ ہر طرف دنیا کی عجیب کیفیت ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ شاعر خوب کہتا ہے: ؎

تفکرت فی الدنیا رخاء وشدة

ونادیت فی الاحیاء هم من مساعد

فلم أر فیما ساتنی غیر شامت

ولم أر فیما سرنی غیر حاسد

جب سنتے ہیں کہ مدرسہ ختم ہو گیا تو شامتین بغلیں بجاتے ہیں، مدرسہ صحیح نظام سے اللہ تعالیٰ کی غیرت واعانت سے چل پڑتا ہے تو حاسدین دانت چباتے ہیں:

[یاسبحان اللہ] اللهم احرسنا بعینک التی لاتنام واحفظنا برکنک الذی لایرام وارحمنا بقدرتک علینا فلا تهلک وانت ثقتنا ورجائنا۔

قلم غایت ارتیاح اور شدت شوق سے چل رہا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ مابعد کا ماقبل سے کوئی قوی ربط نہیں

رکھتا، بجز ایک قدر مشترک کے کہ وہ اپنے احباب مخلصین کا شوق واشتیاق ہے:

یرنحنی الیک الشوق حی

امیل من الیمین الی الشمال

ویأخذ نی لذکراک ارتیاح

کما نشط الاسیر من العقال

اب یہ بتائیں کہ مولانا مدظلہم تشریف لائے ہیں حجاز سے کہ نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اوائل شوال میں ان کی ملاقات کے لئے حاضر ہوں گا، مگر وہ لندن کے سفر پر سوار تھے۔ بعد میں مجھے آنے کی اطلاع بھی نہ ملی۔ اب دل میں بے حد قلق ہے ملنے کے لئے۔ مگر سلسلہ خط بند ہونے سے دل میں طرح طرح کے وساوس مانع وحاجب بنے ہوئے ہیں کہ کوئی کیا خیال دوڑائے گا کہ کیوں آیا؟ کوئی سوچے گا کہ چندہ مانگنے آیا ہے، کوئی محتاج خیال کرے گا اور مقامات حریری کا ''لارج الود ممن یری انک محتاج الی قدمیه'' سامنے آجاتا ہے حتی کہ یہ وسوسہ مولانا مدظلہم کے متعلق بھی دل میں دوڑنے لگتا ہے کہ کہیں معاذ اللہ وہ ایسا خیال نہ فرمائیں، ورنہ میرے لئے موت ہے۔ بہرحال ایسے وساوس اوروں کی ملاقات کے لئے حاجب تو ہو سکتے ہیں، مگر مولانا مدظلہم جیسے حضرات کچھ بھی خیال فرمائیں میرا ضمیر ان کی محبت سے معمور ہے۔ ایسے وساوس کے نباح سے محبوب کے کوچے کو کون بیوقوف چھوڑ سکتا ہے: ؎

اذاما کلب الحی فیها تناهحت

اناساومن لیلی قبول واقبال

برؤیا الجمال العال منها لنا المنی

و منها لنافی المنزل العال انزال

اگرچہ یہ دوری اور وسائل کی بے بسی مانع ضرور ہے مگر یہ اشعار مجھے ملاقات کے لئے پکارتے ہیں: ؎

زرین هویت وان شطت بک الدانر

وحال من دونه حجب واستار

لایمنعنک بعدعن زیارته

ان المحب لمن یهواه زوار

کاغذ کی خانہ پوری ہو رہی ہے اور بہت روز کے سلسلۂ کتابت کے انقطاع کا جبیرہ پیش نظر ہے۔ ایک بات بھول نہ جاؤں وہ یہ کہ غالباً شعبان کے پرچے میں مولانا کا مرثیہ اور میرا مرثیہ بینات میں چھپ گیا ہے، تلاش فرما کر

ارسال کر دیجئے۔ میرے پاس اس مرثیہ کی نقل موجود نہیں ہے اور مولانا کی آمد اور کوائف سے بھی مطلع کر دیجئے اور یہ مشورہ بھی ضرور دیجئے کہ ملاقات کے لئے آنا مناسب ہے یا نہیں۔ میرے خط کا تذکرہ مولانا کے سامنے کیجئے کہ آپ کی تشریف آوری کے متعلق دریافت کیا ہے۔ اس کا جواب جس طرح وہ فرمائیں اس سے آپ کو اندازہ لگ جائے گا کہ میرا آنا مناسب ہے یا نہیں۔ یہ تکلیف آپ کو دے رہا ہوں کوئی اور وہاں ہمراہ نہیں ہے، ورنہ آپ کا مشغلۂ تالیف میرے لئے حاجب ومانع قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس یادآوری کا اجر جزیل اور عظیم صلہ عنایت فرمائے۔ آمین فقط والسلام

فضل محمد عفی عنہ

مدرسہ مظہر العلوم مینگورہ سوات

(۵)

باسمہ تعالیٰ

ان کنت لست معی فالذکر منک معی

یراک قلبی وان غبت عن بصری

برادر محترم مزیدت معالیکم السامیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کا خط اور مولانا محمد نبی صاحب کے ساتھ قرآن شریف اور قبلۂ مرحوم کا خاص نمبر مجلد جس پر مولانا احمد الرحمن صاحب کے دستخط ثبت تھے ملے تھے، مگر بشیر احمد کی والدہ سخت بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے یہ دو چار روز بے حد پریشانی رہی، آج الحمد للہ ان کو شفا ملی اور مجھے فرصت ملی، اس لئے بعجلت یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، اولیا مخفی ہیں، برکات محجوب ہیں، تسلی کی کوئی جگہ نہیں، درس وتدریس میں جب تک مشغولی رہتی ہے وہ وقت غنیمت، یا اپنی حیثیت کے مطابق ذکر وعبادت کا وقت ہوتا ہے یہ نعمت خداوندی۔ اس کے علاوہ اوقات بس ضیاع کے مرادف ہیں، اللہ تعالیٰ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ اگر اس خاص نمبر میں مفتی جمیل کا یہ مختصر جامع مرثیہ نہ ہوتا تو خدا جانے اس عاجز کو کیا حال درپیش ہوتا، موت تو ہم نے چکھا نہیں مگر اس کے قریب قریب کیفیت ہوتی کیونکہ یہ حق ان کا میرے ذمہ تھا، مگر میں اب تک اپنے سوختہ دل سے مایوس ہوں، باقی باقی۔

کتابیں ختم ہوگئیں۔ شمائل، موطأین، نسائی، ابن ماجہ باقی ہیں، مشتے نمونہ خروار کے طور پر زیر درس ہیں، رجب

کی آخر میں امتحان اپنا ختم ہو جائے گا، آپ کا اور حاجی عبداللہ صاحب کا انتظار رہے گا، اگر چہ آپ کے آنے اور جانے کا سلام ایک ہی ہوتا ہے، تاہم موجب سکون ہوگا، اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ احمد الرحمن صاحب کو سلام پیش فرمائے، اگر خط لکھنا آپ ضروری خیال فرماتے ہوں تو مجھے لکھ دیں میں ان کو خط لکھ دوں گا جیسی رائے ہو۔

برادرم محمد صاحب بنوری کو سلام پیش فرمائیں۔ فقط والسلام

فضل محمد عفی عنہ

۱۸ جون یوم الاحد ۷۸ء

(۲)

باسمہ تعالیٰ

ماذا يكون مآل المرء بعد هنا
عيش و آخره موت سيعقبه
وحادثات لياليه تروعه
و الموت عن كل مايهواه يحجبه
يلهو ويحسب ايامايغربها
وللمنية قرب ليس يحسبه

عزیز از جان برادر محترم زیدت معالیہ السامیۃ وفضائلہ العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

تیرہ روز سے صاحب فراش ہوں، بخار اور انواع آلام میں خوب آزمائش ہو رہی تھی، بعض آفات ایسے بھی آئے کہ موت کے ذائقہ کی آمیزش سے منظر جان کنی دیکھنا نصیب ہوا جس کا آسان ہونا ہمارے ان اعمال سے جو موجود ہیں ناممکن معلوم ہوتا ہے، اس کے لئے ایسے اعمال کی ضرورت ہے کہ ہمہ تن انسان ہر حالت میں کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک تمام مشاہدہ یا مقام مراقبہ ہو اور یہ اراءۃ الناس والے اعمال اس وقت ہباءً منثوراً ہو جاتے ہیں۔ میں تو بالکل اپنے متعلق یاس کے قریب ہو چکا ہوں، آج صبح کی نماز مسجد میں تیرہ یوم کے بعد پڑھی بلکہ پڑھا دی، چائے پی کر آپ کی یاد نے بے قرار کر دیا، باوجود شاکی ہونے ٹیک لگا کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، مجھے اس پر بے حد تعجب ہے کہ جو تعلق ہمارا مایۂ ناز اور سرمایۂ آخرت ہے اس کو آپ حضرات نے صرف اور صرف کاغذ کے صفحات تک

ہی محدود و متصور کر رکھا ہے، اگر صفحات کاغذ سامنے آئے تو تعلق ہے، ورنہ نہیں۔ فیا سبحان اللہ و یا سبحان اللہ

این ہذا من ذاک، اگر میں ایسا بے مروت اور بے غیرت ہوں کہ اپنے دینی علمی برادری والوں کو ایسے سستے داموں میں چھوڑ دیتا ہوں، تو پھر تو میں اس قابل نہیں ہوں کہ ایمان و اسلام کا دعویٰ کر سکوں۔ مجھے آپ کے خط سے بڑا صدمہ پہنچا ہے، اس لئے جواب بھی نہیں دیا مگر اس بیماری سے اٹھنا ایک حیات ثانیہ کے مانند ہے، اس لئے یہ چند کلمات عرض کر دیئے، چونکہ میرا وقت بھی قریب ہے، اس لئے عرض کر دیا کہ دعاؤں میں فراموش نہ فرمائے۔ مولانا مرحوم کے مزار پر خود کو فضل محمد تصور کر کے فاتحہ پڑھ دینا، محمد صاحب اگر سلام قبول فرمائیں تو ان کا احسان ہوگا، حبیب اللہ صاحب اور احمد الرحمن صاحب تو مجھے طاق نسیان کا شگوفہ بنا چکے ہیں، ان سے کیا عرض کیا جائے۔ مدرسے کے مختصر حالات سے آگاہی دے کر تسلی فرمائیں۔ واجرکم علی اللہ فقط والسلام

فضل محمد عفی عنہ

۲۰ صفر یوم الاحد

(۷)

باسمہ الکریم

برادرم بجان برابرم مولانا محمد امین صاحب زید مجدہ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہ

خط لکھنے میں آج کل کرتے یہ حشر ہو گیا، ایک تو اسباق کا ہجوم، دوسری طرف افکار کا تلاطم، امراض کا ابتلا اور حوادثات (وہ بھی غیر معمولی) کا تعاقب اور تناوب، ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا کہ رات کو تقریباً ایک بجے گھر میں اسقاط حمل کا حادثہ پیش آیا، ہوش ربا قسم کا خون کا سیلاب اور اس کے بعد بے چینی نہ کوئی پاس، نہ کوئی معین، نہ کوئی ڈاکٹر کو لا سکتے ہیں، نہ حکیم ہے، نہ کوئی رشتہ دار حتی کہ ان کی آواز بند ہو گئی، میں اندھیرے میں دعا گریہ و زاری کے سوا کیا کر سکتا تھا، بس اپنی بے بسی کو پیش کرتا رہا اور کبھی یہ گستاخی بھی ہوتی رہی کہ یا الہ العالمین ہم نے اختیاری بے پردگی کبھی نہیں کی، اب ہمیں غیروں کے سامنے شرمندہ نہ کر۔ غرض اس کیفیت میں واللہ مجھے پتہ نہیں سو گیا ہوں۔ تین بجے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ گھر والے بیچارے خفیف سانس لے رہے ہیں، مجھے اطمینان ہوا کہ زندہ ہیں اور سو رہے ہیں، ان کو سونے دو۔ میں اپنے مشاغل سے فارغ ہوا اور اذان کا وقت قریب ہوا تو ان کی طرف ملتفت ہوا تو ایسا محسوس ہوا، محسوس ہونے لگا جیسے وہ فوت ہو چکی ہے، وہ سانس محسوس نہیں ہو رہی تھی، جلدی سے سنتیں پڑھیں، فرض

میں ذرا تامل ہوا کہ جماعت سے پڑھی جائیں یا منفرداً، پھر ذرا سنبھلا کہ دیکھو تو نبض، دیکھا تو ہاتھ رکھنے پر وہ چونک گئے اور آواز دی کہ میں سوگئی تھی۔ بے چینی بفضل اللہ ختم ہو چکی ہے مگر خون بدستور جاری ہے، الحمد للہ پڑھا۔ فوراً خیال آیا کہ ہمارے پاس خون بند ہونے کی تو دوائی آغا جی مرحوم کی بتلائی ہوئی موجود ہے۔ وہ فوراً ایک خوراک کھلا دی، نماز پڑھ کر واپس آیا اور خوراک دی، غرض پانچ چھ خوراک میں بفضل اللہ وہ خون بند ہو گیا۔ وہ بچ گئی، مگر تا حال صاحب فراش تھی، اب کچھ حرکت کی قابل ہو گئی ہے۔ یہ ایک واقعہ اس قسم کے اور ہوش ربا حوادثات جو اس سے کم حیثیت نہیں رکھتے پیش آئے، مگر بفضل اللہ تبارک وتعالیٰ وعونہ وتوفیقہ اطمینان رہا، بے حوصلہ نہیں ہوا۔ مگر صحت پر برا اثر ضرور پڑا ہے۔ خط ردی کے قابل نہیں رہا بس اضطرار کے درجے میں قلم سے کام لینا پڑتا ہے، اشتیاق کی کیفیت نہیں ہے اس لئے کوئی دل لگی یا تفریح کے لئے شعر وغیرہ سے قلم گریز کرتا ہے، سبحان من لایتغیر۔

ایک طرف یہ ضعف، دوسری جانب کراچی کی ضعیف آب وہوا کی فکر ایک عجیب کشمکش ہے، یا اللہ کدھر جائیں۔

اچھا! مولانا بنوری صاحب مدظلہم پنڈی ہی سے واپس آچکے ہیں، دو مرتبہ سخاکوٹ میں ملاقات ہوئی، ایک مرتبہ پنڈی میں زیارت ہوئی، کراچی جانے کے بعد کوئی خط نہیں ملا۔

یہ ضرور لکھئے کہ مولانا...... صاحب، مولانا...... صاحب جیسے خشک تو نہیں، نیک تو ضرور ہیں اور آگے پتہ نہیں، میں بھی اب برداشت کے قابل نہیں رہا، خدا کے لئے صاف صاف مشورہ دو، ایسے حالات میں تو قصہ بارش سے بھاگ کر پرنالے تلے ہونے کا تو نہیں پیش آئے گا، ورنہ ملک سے بھی گئے اور وہاں بھی نہ رہ سکے تو عظیم ابتلا کا شکار ہونا پڑے گا، اللہ تعالیٰ خیر کرے۔ (خط) ناتمام چھوڑتا ہوں بوجہ اعذار جو ابھی درپیش ہیں۔ فقط

فضل محمد عفی عنہ

(۸)

باسمہ الکریم

برادر محترم مولانا محمد امین صاحب زید مجدہ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

گزشتہ رات بعد المغرب آپ دونوں کا ملفوف ملا، اطمینان ہوا، مگر چونکہ مولانا کی طرف سے ابھی تک کوئی جواب خط نہیں ملا، شاید ان کی علالت کی بناء پر معاملہ میں تاخیر واقع ہوئی ہوگی جب مسجد والوں سے بات طے ہو جائے گی اطلاع کر دیں گے۔

اچھا! آپ گھر آنے کے لئے پارکاب ہے، آپ کی جگہ بہت دور ہے، میں نام مقام سب بھول چکا ہوں ورنہ

میں بھی تفریح کی غرض سے ملاقات کے لئے حاضر ہوجاتا، مگر بخدا میں آپ کے مقام کا نام بھی بھول چکا ہوں، مگر آپ کو نہیں بھولا۔ آپ کی موجودگی کے دوران میں اگر مزید کوئی بات لکھنے کی قابل ہوگئی تو بذریعہ چند کلمات کے خبر دے دیجئے، یہ بھی بتلا دیجئے کہ مسجد کی بات کا مسئلہ محض کسی کی رائے ہے یا کہ کوئی معتمد ذریعہ باعث بنا ہے کیونکہ جب پیش امام اس وقت موجود ہے تو پھر اس کو کیسے ہٹایا جاسکتا ہے، آج کل کے لئے تو یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے، میرے لئے اراکین مدرسہ کو جہالت میں رکھنا بھی خیانت معلوم ہوتی ہے اور قبل از وقت اطلاع دینا بھی حماقت معلوم ہوتی ہے اس لئے ششش و پنج میں ہوں جس میں دارین کا خیر ہو بس اللہ تعالیٰ وہی معاملہ فرمائے۔ ہم کچھ نہیں جانتے بس میرا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے حضرت شاہ انور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تعویذ کے لئے اصرار کیا تو تعویذ میں یہی لکھا: یا اللہ! میں کچھ نہیں جانتا اور تیرا بندہ مانتا نہیں۔ خدا کی قسم! یہی معاملہ میرا ہے کہ میں کچھ جانتا نہیں اور خدا کا بندہ حضرت بنوری مانتا نہیں۔ میں تو خدا کی قسم! کسی مصرف کا بھی نہیں ہوں مگر ان کا اصرار ہے، بس رضا بقضاء نصیب ہو اور حسب استطاعت خدمت دین میسر ہو اور صحت اور فراغت اور استقامت اور اتباع سنت و معرفت سے محرومی نہ ہو۔ خدا جانے کیا حال ہوگا جب کہ جان کنی کا وقت آئے گا، جب کہ اب غفلات ہیں تو اس وقت حسرات کے سوا کیا چیز ہوگی۔ بس اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہ رحم کا معاملہ فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

دوم جولائی کو اگر کوئی رقعہ لکھا تو سبحان اللہ ورنہ ملاقات کی توقع لئے دن گزاریں گے۔ حاجی عبداللہ صاحب اور مولوی عبدالقیوم صاحب کو سلام پہنچا دیجئے۔ حاجی صاحب کب جارہے ہیں؟ مولانا الحبیب کو سلام پہنچا دیجئے۔

فقط والسلام

فضل محمد عفی عنہ

مینگورہ سوات ۲۷ جولائی یوم الثلاثاء

(۹)

باسمہ الکریم

برادر محترم جناب مولانا محمد امین صاحب زیدت معالیکم السامیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

گھر والوں کی بیماری کے بعد دو بچوں پر خسرہ نکلا۔ چھوٹے کے بچنے کی بالکل امید نہ تھی۔ کئی راتیں اجاگرا کرنا پڑا، بڑا دو ہفتے میں ٹھیک ہو گیا، اگرچہ بدن اس کا بالکل جھلس گیا تھا۔ چھوٹے کا معاملہ نہایت خطرناک تھا، خسرے کے ساتھ ساتھ تشنج اور اس کے علاوہ زہریلی قسم کا پھوڑا ہونٹ کے بائیں طرف نکلا جس سے تمام منہ سوج گیا، نہ کچھ کھا سکتا نہ پی سکتا تھا، غرض پورے دو ہفتے ہر وقت ایسا منظر تھا کہ ابھی جان نکلی اب جان نکلی "یتقعقع نفسہ" ادھر اس کی ماں اس بیماری کی وجہ سے کمزور۔ میں دن میں اسباق پڑھاؤں اور رات کو یہ ڈیوٹی۔

غرض اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہ کے یہاں ہر چیز کے خزائن ہیں ایک بیماری کے، درجات کے بھی خزائن ہیں۔ اس لئے پورا ایک ماہ دونوں بچوں کی بیماری میں ابتلا کا گزرا حتی کہ مولانا کے خط کا جواب بھی نہ دے سکا۔ خیال تھا کہ فوت ہونے کی اطلاع کردوں گا مگر رب العالمین کے یہاں اس کی کچھ عمر باقی تھی تو تندرست ہو گیا ہے، مگر طاقت اس میں بالکل نہیں، کپڑے کا ایک پرانا چیتھڑا سا ہے، بہرحال بیماری سے اچھا ہو گیا ہے، کھاتا ہے، سوتا ہے، ہم فارغ البال ہیں، طاقت بھی مقدر ہوگی آجائے گی۔

ادھر ترمذی اور بخاری بھی باقی ہے، امتحان کا سلسلہ شروع ہے، شغل بے انتہا ہے، مگر اس وقفہ بس خیال آیا کہ شاید مولانا محمد امین صاحب فارغ ہو کر گھر واپس نہ آجائیں کہ سینے میں میری شکایت عدم مراسلت بھی لے کر گھر پہنچے، اس لئے بطور یاددہانی یہ چند سطریں عجلت میں لکھی۔

ایک ضروری بات میں نے عبدالحنان کو لکھ دی ہے آپ بھی اس میں ان کی امداد فرمائیں کہ جو مسجد لسبیلہ کے قریب مولانا نے بوجہ عدم تکمیل مکانِ مدرسہ تجویز کی ہے اس میں بیت الخلاء کا صحیح انتظام ہے کہ نہیں۔ یہ تحقیق ضروری ہے اگر اس میں یہ انتظام صحیح نہ ہو تو پھر مجھے یا براہ راست مولانا کو اطلاع مل جانی چاہیے کہ اس میں پھر گفتگو نہ فرمائیں۔ حاجی عبداللہ صاحب کہیں دنیا میں موجود ہیں تو سلام پہنچا دیجئے اور کب ارادہ جانے کا رکھتے ہیں، مولانا بھی عمرے کے لئے جارہے ہیں کہ نہیں۔ فقط والسلام مع الاحترام

فضل محمد عفی عنہ

یوم الثلاثاء ۲۱ رجب

(۱۰)

باسمہ الکریم

برادر محترم مولانا محمد امین صاحب زیدت فضائلہ العالیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

عنایت نامہ ملا تھا مگر کثرت مشاغل کی بنا پر آج جمعہ کی صبح کو فرصت ملی۔ برادر محترم! ایسے لوگ تو کبریت احمر سے بھی اعز ہیں، اگر آپ کا دل وہ جذب کر رہے ہیں اور طبعی انس ہیں اور کمال اتباع کوئی مانع نہیں استخارہ کر کے جلد ان سے فیض یاب ہونے کی کوشش میں لگ جائیں، باقی حج عمرہ کے لئے آپ بھی دعا کیجئے ہم بھی دعا کریں گے، دیکھو کیا ہوتا ہے، ہمارا معاملہ ہمیشہ کچھ بین الخوف والرجاء سا ہوتا ہے۔ باقی چہل کاف کا طریقہ یہ ہے کہ بین سنۃ العشاء البعدیۃ والوتر روزانہ ۴۱ مرتبہ تا ۴۱ روز مسلسل بلا ناغہ پڑھ لیا جائے تو یہ اس کا چلہ ہے۔ ناغہ ہو گیا تو پہلے پڑھے ہوئے کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے، از سر نو تعداد پوری کرنی ہوگی، جب یہ چلہ پورا ہو جائے تو روزانہ بین السنۃ والوتر صرف سات مرتبہ بلا ناغہ پڑھنا ضروری ہے جب چلہ پورا ہو جائے تو پھر مجھے مطلع فرمائیں، میں خواص لکھ کر بھیج دوں گا۔ آئندہ صفحہ پر دیکھ لیجئے۔ محمد ولی صاحب تھوڑی دیر کے لئے تشریف لائے تھے، ماحضر تناول فرما کر رخصت ہو گئے۔ مسجد کمیٹی کے مکائد کے اختتام سے بے حد خوشی ہوئی، اس خوشی کی خبر دینے کے مستحق تو آپ تھے مگر الخ...... محمد صاحب بنوری مدینہ منورہ سے واپس تشریف لائے ہوں تو مطلع فرمائیں، جناب الحاج موقر مجسم عبداللہ صاحب سے سلام عرض ہے، خدا کرے ان کی ملاقات ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ فقط

۲۲ جمادی الثانی ۹۹ھ یوم الجمعۃ

چہل کاف

کفاک ربک کم یکفیک واکفۃ
کفکافہا ککمین کان من کلک
تکر کرا ککرالکرفی کبدی
تحکی مشکشکۃ کلک لک کلک
کفاک مابی کفاک الکاف کربتہ
یاکوکبا کنت تحکی کوکب الفلک

فضل محمد عفی عنہ

(۱۱)

باسمہ العظیم

یزید الدأی حبک فی فؤادی
اذا نسیت لذکراک القلوب

برادر محترم برابر بجانم زید مجدکم وزادکم اللہ تعالیٰ فضلاً وامانۃ

سلام مسنون کے بعد گزارش ہے کہ آپ کا محبت نامہ مل کر باعث صد مسرت و باعث سکون واطمینان بنا کہ اپنے مخلصین اور خالص دینی محبین کے قلوب اس عاجز سے باوجود میری نالائقی اور علمی اور اخلاقی کمزوریوں کے جدا ہونے کے بعد بھی منسلک ہیں۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء۔

بحمد اللہ باوجودیکہ انتظامی اہلیتوں سے محرومی کا تو تقاضا تھا کہ سہ ماہی تک بھی مدرسہ نہ چلتا مگر اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد ہے کہ خاموشی سے اب تک کام چل رہا ہے، چاروں طرف خود اپنے علماء حضرات اور مبتدعین اور اہل اغراض بہت کوشش لگانے کی باوجود ناکام ہیں اور قلب پہ ذرا بھی قلق نہیں پاتا کہ اگر یہ مدرسہ دینی قلعہ ہے تو اللہ تعالیٰ ہی اس کا نگاہ بان ہے، میں کیا میری ہستی کیا؟ دعاؤں کی ضرورت ہے کہ یہ محنت اللہ تعالیٰ دین کی حفاظت اور تبلیغ کا ذریعہ بنائے اور ہماری یہ خدمت قبول ہو جائے اور رُخ صحیح ہو جائے اور اللہ پاک دنیا وآخرت میں آبرو رکھے، اپنی معرفت اور محبت اور اتباع سنت نصیب فرمائے۔ نیو ٹاؤن کا مدرسہ اور اساتذہ اور طلبہ کا نقشہ اب ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے:

منازل العلم فی قلبی معظمۃ
وان خلامن نعیم الوصل منزلھا

مولانا بنوری مدظلہم کا چہرۂ انور آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے تو دل دہلنے لگتا ہے:

مجھے جرم خیال نرگس مستانہ آتا ہے
بڑی مشکل سے قابو میں دل دیوانہ آتا ہے

بہرحال آخر جدائی پر دنیا کی یکجائی منتج ہوئی ہے، پشتو کا شاعر عبدالرحمان باباؒ فرماتے ہیں:

دا اچہ اوس پہ یو کور کے سرہ ناست دی
عاقبت بہ ئ جدا جدا منزل شی

آپ کے ہم نشین برادر محترم مولانا حبیب اللہ صاحب کو ہدیۂ سلام پیش فرمائیں۔ فقط آمین
کبھی کبھی یاد فرمانے میں کیا حرج ہے؟

فضل محمد عفی عنہ

۱۰ ربیع الاول یوم الخمیس

مدرسہ مظہر العلوم مینگورہ سوات

(۱۲)

باسمہ تعالی

برادر محترم مزادت معالیکم السامیۃ وفضائلکم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ

گرامی نامہ اپنی خصوصی شان تاخیر کے ساتھ رونق افروز ہوا، شدت اشتیاق سے عین درس بخاری کے ابتداء ہی میں جلدی جلدی پڑھا، فجزاکم اللہ تعالی کما یلیق بشانہ۔

ہمارے سلسلہ میں "کلک" خلاف القیاس ہی چلا آرہا ہے حتی کہ موافق القیاس کو ہی ہمارا مجاز پڑھ لے تو اس پر ذرا بھی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

(۲) "مُشکشکۃ" بکسر الشین ہے۔"کلک لک" ہی ہے اور اس کے بعد "کلک" ہے، "لکک" نہیں ہے۔ "کفاک الکاف" ہے، "کاالکاف" نہیں ہے۔

یہ تو ضروری بات تھی جس کے لئے آپ نے جوابی لفافہ بھیج کر فوری جواب کا مطالبہ کیا ہے جو پیش خدمت ہے۔

اچھا جناب حاجی صاحب سردمشروبات میں لگے ہوئے ہیں، تندرست ہیں، الحمد للہ کہ بقید حیات ہیں اور سوات کا ارادہ بھی ہے، ہم ختم ترمذی و بخاری میں لگے ہوئے ہیں، اس سال خدا جانے کیا بے برکتی ہے کہ کتابیں باوجود عدم ناغہ وعدم رخصت وعدم بیماری کے بہ نسبت گزشتہ سال کے کم مقدار میں ہوئیں ہیں، امید تو ہے کہ اس ماہ کے بیس پچیس کو ختم ہو جائیں، دعا فرمائیں، اچھا ہوگا کہ ہم بھی ان شاء اللہ فارغ ہوں گے اور آپ بھی وہاں سے فارغ ہو کر تشریف لائیں گے اور سبحان اللہ جب کہ الحاج محترم بھی شمس محبت بن کر طلوع فرمائیں گے۔ کب وہ وقت آئے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

برادرم سلیمان صاحب بالکل ہر وقت سامنے جیسا کھڑا نظر آرہا ہے۔ اچھا آپ داخلہ کر چکے ہیں، ہمیں تو آپ نے اطلاع نہیں دی کہ داخلہ کر چکا ہوں، اللہ تعالی حرمین شریفین کی زیارت سے محروم نہ فرمائے، معرفت ومحبت والا حج عمرہ نصیب فرمائے، قرعہ اندازی کے بعد اطلاع ضرور دے۔

جناب الحاج محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالی وبرکاتہ......خط نہ آپ لکھے نہ میں......عند اللقاء دیکھیں گے ان

شاء اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہ۔ فقط والسلام

یوم الاربعاء ۳۰ مئی ۹ے ء، ۳ رجب ۹۹ھ
فضل محمد عفی عنہ مظہر العلوم مینگورہ سوات

(۱۳)

(حضرت الاستاذ مولانا محمد امین رحمہ اللہ کا چند امور کے بارے استفسار اور مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ کا جواب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جن امور کے بارے میں تردد ہے اور جواب سے سرفراز فرمانے کی درخواست ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ دلائل الخیرات شریف کے روزمرہ وظیفہ سے پہلے اسماء حسنیٰ کے بعد دعائے نیت پڑھنا مناسب ہے یا حضرت والد کے طریقہ کے خلاف ہے؟

۲۔ دعائے حزب البحر میں ستر العرش مسبول علینا وعین للہ ناظرۃ الینا بحول اللہ لایقدر علینا کیا لا یقدر [ ] افعال سے معلوم کا صیغہ ہے؟ دریں صورت اس کا فاعل کیا ہوگا؟ معنی تو اللہ فاعل ہونا چاہیے، لیکن بحول للہ کا تعلق لایقدر کے ساتھ معلوم ہوتا ہے اس لئے ذوق پر اس کا فاعل بنانا بار معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ دعائے اختتام میں اللھم قھر اعدائی الخ... کا محل یا ارحم الراحمین کے بعد اور اللھم الی اسئلک باسمک المخزون المکنون الخ سے قبل ہے؟

۴۔ دعائے اعتصام اور اختتام اور دوسرے زوائد کے بغیر حزب البحر پڑھنے کی اجازت حضرت عنایت فرماتے ہیں، کسل اور شغل کی وجہ سے کبھی وقت نہیں ملا کرتا کبھی پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔

۵۔ قصیدۂ بردہ پڑھنے کی بھی خواہش ہے حضرت مولانا مرحوم سے اجازت لی تھی، آنجناب سے اجازت کی درخواست ہے، اگر غائبانہ ممکن ہو تو اجازت نوازیں۔

جواب

(۱) یہ بحول اللہ لایقدر علینا مجہول ہے معروف نہیں ہے اس کے کوئی معنی نہیں بنتے۔

(۲) اللھم قھر اعدائی الخ یہ اعتصام میں ہے اختتام میں نہیں ہے اور یارب سھل و یسر و لا تعسر علینا یارب کے بعد پڑھا جاتا ہے اور اللھم الی اعوذ بک باسمک المخزون الخ یہ اختتام میں یا ارحم الراحمین کے متصل پڑھا جاتا ہے۔

(۳) اسمائے حسنیٰ کے پڑھنے کے لئے ایک خاص طریقہ ہے اس کی اجازت لینا ضروری ہے، اس کے بعد دعاء ملنیہ نہیں، ہر دعاء ملنیہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ کے بعد ہے جو ہمارے طریقہ میں معمول ہے۔

(۴) بغیر اعتصام واختتام کے صرف چلہ میں ہمارے طریقے میں پڑھا جاتا ہے، کسل اور غیر ذکر اللہ کا شغل شغل ذکر کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہے، صرف شغل علم اس کا موازی ہے مگر مقصد اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے، علم من انہ علم کہ حیثیت ذکر اللہ سے خالی ہو وہ بھی شغلِ ذکر سے ادنیٰ ہے، اعلیٰ کو ادنیٰ پر قربان کرے بس بات یہ ہے کہ قلب اگر عظمت ومحبت سے معمور ہو تو کسل تو کیا کوئی بھی شغل اس پر غالب نہیں آ سکتا، اللہ تعالیٰ اتباع سنت کے ساتھ عظمت الہیہ اور محبت الہیہ نصیب فرمائے۔

(۵) قصیدۂ بردہ کو میں نے معمول نہیں بنایا آپ کو شوق ہے تو ایک صاحب مجاز وعامل اپنے استاذ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا جانشین ہے، اس سے اجازت دلوا دیں گے مگر آنا پڑے گا۔

(۱۴)

باسمہ تعالیٰ

وما کل زھر ینبت الارض طیب

ولا کل کحل للنواظر اثمد

برادر محترم بجان برابرم جناب مولانا محمد امین صاحب جعلہ للہ تعالی امینا فی الارض والسماء آمین یا رب العالمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

عشاء کی نماز کے بعد تقریباً پونے دو گھنٹے گزر چکے ہیں کہ سارا دن بارہ بجے سے لے کر نو بجے تک سب ایسے لایعنی کاموں میں گزر گیا کہ سوائے افسوس کے اور انا للہ کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا، دن رات گزرتے ہیں مرنے کے قریب ہوتے جارہے ہیں مگر دنیا کا شغل اور ترقی زن ہے۔

کراچی قاری محمد ابراہیم صاحب کی بین الموت والحیات کی خبر سے متاثر ہو کر گیا تھا، حالات معلوم ہونے پر خدا کی قسم یہ کیفیت ہوگئی کہ کسی سے ملنے کی جگہ بھاگ نکلنے پر بے قرار تھا، جیسا کوئی چور گیا ہوا ہوں اور اندیشہ ہو کہ پکڑا جاؤں گا، بس یہ کیفیت تھی۔ رات کو ائیر پورٹ پر اتر کر کے محمد علی سوسائٹی دھوراجی کالونی کے قریب مولانا عنایت اللہ صاحب کے یہاں اترا، صبح کو قاری صاحب کی عیادت کر کے نیوٹاؤن حضرت مولانا قدس سرہ کی زیارت قبر کے

لئے گیا۔ طلبہ سے دریافت کیا کہ حبیب اللہ صاحب کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ سرگودھا تشریف لے گئے۔

پندرہ یوم کے لئے زیارت کے اثناء میں کسی نے مولانا احمد الرحمن صاحب سے اطلاع کی ہوگی، وہ آپہونچے، زیارت سے فارغ ہوتے ہی مل گئے۔ محمد صاحب بنوری بھی آملے اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر مولانا عنایت اللہ صاحب کے یہاں پہونچادیا اور کل کے لئے دعوت کا اصرار کیا، دوپہر کا کھانا ہے، تمام اساتذہ کے (ساتھ) کھا کر چلا آیا، اس کے بعد پھر کسی سے ملاقات نہ ہوسکی اور حالات کمیٹی والوں کے ساتھ تو گھمسان نزاع کے ساتھ جاری رہنے کے ہیں۔

دو چار دن بعد کے آنے جانے کے سب مولانا شمس الرحمن صاحب نے اپنے ذمے لئے اور چوبیس گھنٹے کے لئے دونوں بھائی میرے لئے بمعہ گاڑی کے وقف تھے، بہت ہی خدمت کی، واپسی ٹکٹ بھی انتہائی اصرار سے انہوں نے ہی برداشت کیا، غرض جلد ہفتہ کے اندر ہی واپسی ہوئی۔ یہاں معلوم ہوا کہ آپ تشریف لائے تھے تو میں نے مفصل خط لکھا من عن کے ساتھ، حالات درج کیے، افسوس کہ وہ خط آپ کو نہیں ملا۔

ایک ہنسی کی بات آپ کو سناؤں!.........مولانا جن کا نام میں بھول گیا ہوں جو.........میں مدرس تھا، آپ ان کو مدرس رکھنا چاہتے تھے، وہ مدرسہ میں مجھے نہیں ملا، واللہ اعلم.....دل میں کیا چور تھا، اتفاقاً بازار میں کچھ کھانے کی چیز خرید رہا تھا، میری نظر میں آیا مگر میں نے تعامی کی کہ شرمندہ نہ ہو جائے اور اخفاء کر کے جلدی سے گزر گیا، یہ حالت دنیا کی اب ایسی دنیا میں انسان رہے۔

اب بچوں کی بات سنو چند روز سے ہم لوگ مشغول مکان تھے، شغل بحمد اللہ ختم ہوا تو ان کے والدہ کو بچوں کے دیکھنے کی تیاری لاحق ہوئی کہ ہر وقت بس ایک سبق بن گیا، اس لئے میں نے خط لکھا وہ اتفاق سے آپ کو نہ مل سکا، پھر میرا قصہ تو بشیر نے سنایا ہوگا، خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی، پھر بشیر احمد کو بھیجا خیال تھا کہ تین روز میں واپس کر دیں گے لیکن حالات نے بات لمبی کر دی، بدھ سے بارش کا اور برف کا تانتا لگ گیا، آج بسبب کیچڑ اور بےحد سردی کے پھر بھی کچھ نہ بنا کہ یہ وقت آپہونچا یعنی شب اتوار، خیال ہے کہ اخیر شب میں ان کو بشیر احمد کے ساتھ روانہ کر دوں، دیکھو کیا ہوتا ہے کیا نقشہ درپیش ہے، کیا معلوم کہیں رات میں موت مقدم نہ ہو جائے، اگر مقدر ہوا اور بچے خیریت سے پہونچ گئے تو مہربانی فرما کر مفصل خط سے ضرور نوازیں۔

جناب چچا جان صاحب کو اور برادرم معین الدین صاحب کو سلام کا ہدیہ پیش فرمائیں اور سب بچوں کو پیار اور تمام اساتذہ کو ہدیہ سلام عرض ہے۔ فقط

آپ کا پرانا شریک کار

فضل محمد عفی عنہ

مدرسہ مظہر العلوم مینگورہ سوات

مؤرخہ ۳ ربیع الثانی یوم الاحد ۸۲ھ

اذا كان هذا الدمع يجرى صبابة

على غير سلمى فهو دمع مضيع

مولانا (حضرت مولانا یوسف بنوری، از: مرتب) کے مزار پر:

توهمت قدما أن ليلى تبرقعت

وان حجابا دونها يمنع اللثما

فلاحت فلا والله مائم حاجب

سوى ان طرفى كاعن حسنها اعمى

(۱۵)

باسمہ الکریم

الا یا نسیم الصبح قل لأحبتی

بنیو تاؤن منی أسفا قد دنا الاجل

علیکم سلام اللہ ما ذر شارق

ولا تنسوا الفضلا فذا منکم الامل

برادر محترم جناب مولانا محمد امین صاحب زیدت معالیکم السامیۃ و فضائلکم العالیۃ

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ تعالی و برکاتہ

واقعی آپ نے خط لکھنے میں سستی سے کام لیا ہے مگر آپ کا اخلاص اور محبت اس کی تلافی حد سے زائد کر رہے ہیں

فجزاكم الله (بهذا الاخلاص والمحبة والمودة لله) خير الجزاء مايليق بشأنه العظيم و فضله العميم.

آنے کے بارے میں مولانا کا بھی والا نامہ موصول ہوا تھا مگر حالات اور کیفیات ساتھ نہیں دے رہے ہیں، حتیٰ کہ استخارہ میں بھی کوئی خاطر خواہ ثابت نہیں ہوا، نہ صحت ہے نہ میرے خیال میں اتنا وقت باقی رہ گیا ہے جس میں نقل و حرکت کی جائے، مدرسے کی امانت بجائے خود ایک عظیم حاجب ہے، نہ کوئی منتظم ہے نہ کوئی پرسان حال، اگرچہ کام

اندرونی طور پر ان شاء اللہ خاطر خواہ تسلی بخش ہے اور مجھے اس پر سکون اور اطمینان ہے مگر ظاہری حالات بیحد کمزور ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، اس کا مدرسہ اور اس کا کام ہے، ہمارا اس میں کیا دخل ہے، بس ایک چوکیدار کی حیثیت سے کام کرنا ہے اور بس۔ مولانا مدظلہم کو میں نے بھی ایسا ہی خشک سا جواب دیا ہے۔ قلق محسوس کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کے لئے ان سے حالات معلوم کر کے ضرور بتائیں کہ میرے خط کے تأثرات کیا ہیں؟

میں نے آج ایک خط محمد صاحب بنوری کو بھی لکھا ہے، اس میں چند اشعار بھی ہیں، اس کے بھائی سلیمان اور خود اس کے متعلق، کیونکہ بہت قبل اس کا خط آیا تھا میں بیماری اور دیگر عوائق کی وجہ سے جواب نہ دے سکا تھا، اس کی تلافی کے لئے قصیدہ لکھا ہے، اس میں اولا چھوٹے کی تعریف ہے اور اس پر اس (محمد) کو کچھ فضیلت دی گئی ہے، اپنی طبیعت کو بہلانے اور اس کو خوش کرنے کے لئے بچوں کی شاباش ہے۔ چند اشعار مولانا کو بھی اس سے قبل ارسال کر چکا ہوں مبارکباد کے طور پر، تاکہ ان سے قلبی ربط قائم رہے اور یہ خیال نہ فرمائیں کہ بس اب چونکہ اس کو واپس آنا نہیں تو تعلق بھی ایسا نہ رہا۔ ایسے بڑے لوگوں سے غرض تو حیات میں کیا ختم ہوتی، ان سے تو یوم القیامۃ بھی غرض متعلق رہے گی، یہ تو اہل بیت ہیں اور پھر ان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب گھرانہ...... ان سے تعلق میں کمی کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ بے تعلقی...... مگر جہاں تک کراچی دوبارہ آنے کا تعلق ہے تو ان حالات میں بالکل مشکل ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے دن بہت کم رہ گئے، لوگ بھی متعدد رؤیا ایسے ہی دیکھ چکے ہیں کہ بس اب موت عنقریب ہے، اللہ تعالیٰ حسن عاقبت سے محروم نہ فرمائے اور غفلت کی موت سے پناہ میں رکھے اور ایمان پر خاتمہ سے نوازے [توفنی مسلما والحقنی بالصالحین] برادرم حافظ محمد قاسم کو سلام پہونچادیں۔

حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قافیہ پر آگے لکھنے کو جی چاہا مگر عرفہ کی رات ہے، اس لئے قلم کو زبردستی روک لیا۔ مؤرخہ شب عرفہ عید الاضحیٰ

عالم بہ من عید من بعید زیار

چوں من بعید زیادم مرا بہ عید چہ کار

فضل محمد عفی عنہ

مینگورہ سوات

مکتوب حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

منجانب ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا محمد امین صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا یاد آوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا تہ دل سے شکریہ۔

محترم! آپ نے جو رفعت راقم حقیر کو بخشنے کی سعی فرمائی ہے وہ آپ کا علو ظرف ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم

محترم! راقم بے حد معروف رہتا ہے، علالت اس پر مستزاد ہے، آپ سے پہلے بھی کسی صاحب نے زلزلہ کے بارے میں کہا تھا، مگر عدیم الفرصتی مانع رہی، اب بھی یہی معذوری ہے، ہاں! اپنے پروگرام میں آپ کی کرم فرمائی سے قبل ہی اس کے رد کا ارادہ تھا اور ہے ان شاء اللہ العزیز۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائے۔ یہ فتنہ (رضا خانیت کا) اب سیاست، مدارس، تقریر وتحریر وغیرہ ہر طرف سے پوری ہمت کے ساتھ حملہ آور ہے مگر صد افسوس کہ ہماری جماعت مصلحت کوشی کے پروان چڑھ گئی ہے۔ بلاشبہ جارحانہ طریق تو مذموم ہے لیکن متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھ کر احسن طریقہ پر اکابر کے مسلک کی حفاظت اور دفاع تو سب پر لازم ہے۔ حضرت مخدوم العلماء مولانا بنوری صاحب دامت برکاتہم جب یہاں تشریف لائے تھے تو ادارہ کی کتب بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کا حکم صادر فرمایا تھا مگر بعض کتابیں پریس سے نہیں آئیں اس لئے ناظم صاحب شاید کتابیں نہ بھیج سکے ہوں، ان شاء اللہ العزیز حکم کی تعمیل ہوگی۔ حضرت دامت برکاتہم اور دیگر حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور دعوات صالحات میں یاد رکھیں۔ راقم اثیم بھی بفضلہ تعالیٰ دعا گو ہے۔ والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

مکتوب حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہم

از سلیم اللہ خان

جامعہ فاروقیہ کراچی

باسمہ تعالیٰ

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا محمد امین صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ وعافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

جناب کو احقر کے مرض کی جو کیفیت بتائی گئی تھی ابتداء میں تو واقعۃ تشویش ناک تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بعد میں افاقے کے اثرات نمایاں ہوئے اور اب الحمدللہ پہلے کی نسبت بہت بہتر حالت ہے۔ احقر کو فی زمانہ جو بیماریاں عام ہیں شوگر، بلڈ پریشر اور ہارٹ کی تکلیف ان میں سے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بار بار کے ٹیسٹ سے یہی واضح ہوتا ہے۔ گردے کی تکلیف تھی جو بالکل غیر محسوس تھی تو ۱۹۹۲ء میں دائیں جانب کا گردہ نکال دیا گیا تھا اس کے بعد پھر دوسرے گردے میں کوئی تکلیف نہیں۔ اور ایک گردہ کفایت کر رہا ہے۔ میری بیماری یہ ہے کہ دیر تک غیر معمولی ارتکاز ذہنی کی نوبت آجائے تو ضعف لاحق ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کی تلافی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے واقعات بے احتیاطی کی وجہ سے ہوتے رہتے ہیں (حالانکہ احقر بزعم خود احتیاط کرتا ہے لیکن اندازہ لگانے میں غلطی ہو جاتی ہے) اس مرتبہ یہ غلطی کچھ ایسی ہوئی کہ مجھے بالکل اندازہ نہ ہوا اور ایک دم بدن کے ہر ہر عضو کی جان نکل گئی بہرکیف اب حالت پہلے سے بہتر ہے دعا کا محتاج ہوں خاص طور پر ایمان کی سلامتی کی دعا کا تو خاص طور پر بہت ہی محتاج ہوں۔

معلوم ہوا کہ جناب والا کی طبیعت بھی ناساز ہے سن کر تشویش ہوئی اور دعا کی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزانہ خصوصی دعا کا اہتمام کرونگا اللہ بزرگ اور برتر قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

سلیم اللہ خان

جامعہ فاروقیہ کراچی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ، ۲۰ جون ۲۰۰۳ء

مکتوب حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہم

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، مولانا عبید اللہ سندھی صاحب مرحوم کے بارے میں احقر کو اس وقت یہی معلوم تھا کہ وہ دار العلوم سے فارغ نہیں تھے، بلکہ انہوں نے کہیں اور پڑھا تھا لیکن احقر کو اس بات پر اصرار نہیں ہے، اگر معتبر ذرائع سے ثابت ہو جائے کہ انہوں نے دار العلوم دیوبند میں پڑھا تھا تو احقر کتاب میں ان شاء اللہ ترمیم کر دے گا۔

فکر ولی اللہی محض ایک دھوکہ ہے، عام طور پر یہ لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کی آڑ میں اشتراکی نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

والسلام

محمد تقی

مکتوب شیخ محمد امین قاسم افریقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الی الشیخ العلامۃ محمد امین نفعنا اللہ بعلومہ

من العبد الضعیف محمد امین قاسم، جنوب افریقہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

و انی احمد الیکم اللہ الذی لا الہ الا ھو واصلی واسلم علی سیدنا محمد وعلی الہ وصحبہ اجمعین، اما بعد فارجو اللہ تعالی ان یکون کتابی ھذا قد الفاکم فی صحۃ وافیۃ وعافیۃ ضافیۃ وارجو ان تکون کتبکم القیمۃ قد وصلت الیکم اعنی اشارات المرام والفتاوی الحمادیۃ وکوثر النبی۔ جزاکم اللہ تعالی خیر الجزاء

ولما رجعت الی جنوب افریقیا التقیت ببعض اصدقائنا ممن استفاد علما من الشیخ محمد عوامۃ وقد قرر مدرسا فی المدرسۃ العربیۃ الاسلامیۃ۔ ازادول فاخبرلی انہ سافر الی مصر فی السنۃ الماضیۃ لاقتناء الکتب لمکتبۃ المدرسۃ فعثر ھو علی نسخۃ من اشارات المرام۔ وھی النفس الطبعۃ التی صورتھا عنکم و

كانت عند (ذكي مجاهد) و ذكي مجاهد من تلامذة للامام الكوثري ﷫۔ فاشترى تلك النسخة و اعطاها صاحب (زمزم) بكراتشي ليصورها و يطبعها۔

اما كوثر النبي فصورة أخي عني قبل رحلته الى الامارات المتحدة (UAE) و هناك صورة عنه كثير من الافاضل مثل شيخ محمود سعيد الممدوح صاحب (التعريف باوهام من قسم السنن الى صحيح و ضعيف) و الآخرين۔

و لسان الميزان بتحقيق الشيخ عبد الفتاح ابو غدة قد طبع و كذالك تجريد القدوري (۱۱ مجلدا) و كذلك تصحيح القدوري للعلامة قاسم بن قطلوبغا و قد صدر كتاب بعنوان موسوعة احكام الحافظ ابن حجر على الاحاديث الشريفه جمعها بعض الفضلاء ببريطانية اما شرح الامام محمد عابد السندي للمسند امام اعظم المرتب المسمى ب (المواهب المكية) فتحت التحقيق بعناية الاخ سائد بكداش (زوج بنت الشيخ عوامة) و الشيخ حسام الدين الفرفور من فضلاء دمشق الشام بصدد اصدار طبعة محققة جيدة لرد المختار و قد قارب الانتهاء و سيصدر في ۴۵ مجلدا كان عنده نسخة ابن عابدين الخطية و نسخ خطية اخر ثم كان يحقق كل نص اورده ابن عابدين من مراجعه المطبوعة منها و المخطوطة و ألحق تقريرات الرافعي في اسفل كل صفحة من مواضعها اما محيط البرهاني (النص الكامل) ففي مرحلة التجليد في بيروت۔ و اما بقية نشر الاظهار فلانزال ننتظرها۔ و الانتظار اشد من الموت

و اني قد عقدت العزم على الرحلة الى دمشق الشام لنحو سنة او سنة و نصف و انا انتظر التأشيرة نسأل الله السيري و العافية و سأغادر جنوب افريقيا انشاء الله تعالى يوم السبت (۳ ذو الحجة ۱۴۲۴ھ) الى دمشق من طريق القاهرة۔ وقد نقلت ما ذكرتم حول مدفن الامام الطحاوي في مذكرتي و سأحاول الحضور عند ضريحه ان شاء الله تعالى و الله الموفق۔ و ارجو منكم ان لا تنسوا هذا العبد الضعيف من صالح دعواتكم۔ و قد حفظت بمحض فضل الله تعالى۔ جوهرة التوحيد للقاني ﷫ و بدأت بحفظ بدء الامالي و الله الموفق و هو المسؤل للاتمام۔ و السلام عليكم و رحمة الله و بركاته

و انا طوع بنانكم، محمد امين قاسم

پوتچفسترو م، جنوب افريقيا، ۱۹/۱۲/۱۴۲۴ھ

مکاتیب مولانا محمد امینؒ اورکزئی بنام مشاہیر

(۱)

حضرت بنوری قدس سرہ کے نام مدرسہ میں تعلیم وتربیت کی کمتری کے لیے تجاویز پر مشتمل خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت اقدس سیدی ومولای وملجأی ومأوی دامت برکاتہم علینا ناظرۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

وبعد! حضرت اقدس کی خداداد بصیرت اور مؤمنانہ فراست پھر بے مثال علم وفہم اور مثالی خلوص وتقوی کو سامنے رکھتے ہوئے مجھ جیسے احمق اور جاہل، بدعمل اور سیاہ کار کا بطور مشورہ کچھ لب کشائی کرنا یقیناً سوء ادب ہے لیکن اپنی فطرت اور اندرونی جذبہ سے مغلوب ہو کر چند گزارشات پیش خدمت کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ حضرت کے کریمانہ طبع اور پدرانہ شفقت سے امید ہے کہ معذور تصور فرما کر بارگاہ سلیمانی میں ہدہد کی نالہ کی شنوائی ہوگی۔

سالہا سال سے حضرت والا کے سایۂ رحمت میں رہ کر حضرت والا کی فرمودات اور طرز عمل کے روشنی میں احقر کو یہ یقین حاصل ہوا ہے کہ ہمارا مدرسہ صرف تعلیم گاہ نہیں تربیت گاہ بھی ہے بلکہ تربیت تعلیم سے زیادہ اہم ہے۔ حضرت کا ارشاد گرامی "مدرستنا هذه دار دين قبل ان تكون دار علم" پورے نظام کا نصب العین اور مدرسہ کا روح سمجھتا ہوں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اولاً میں اور پھر دوسرے شرکاء کار اس نظریہ کو کما حقہ جامۂ عمل نہیں پہنائے بے شک دوسرے مدارس کے بہ نسبت یہاں تربیت اور اصلاح کا اہتمام زیادہ ہے لیکن فی نفسہٖ اطمینان بخش نہیں، اس سلسلہ میں فقیر کے ذہن میں چند تجاویز ہیں:

۱: اساتذہ کرام کے ذہن میں مذکورہ بالا نظریہ ہر ممکن طریقہ پر راسخ کیا جائے حضرت والا کے موقع بموقع خصوصی مجالس تذکیر اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲: تجربہ ہے کہ بداخلاقی عموماً مہملین میں پائی جاتی ہے،" خانۂ خالی را دیو میگیرد" ، اس لئے اہمال کا ازالہ بے حد ضروری ہے اس سلسلہ میں فقیر کی رائی یہ ہے کہ اساتذۂ کرام کا کردار فیصلہ کن ثابت ہوگا۔

(الف) اگر نصابی کتب کے تین حصے بنائے جائیں، ایک سہ ماہی تک، دوسرا ششماہی تک، تیسرا سالانہ تک اور باضابطہ طور پر مقررہ مدت میں مقررہ حصہ پڑھایا جائے۔

(ب) اور پڑھانے میں لمبی چوڑی تقریر کے بجائے حل کتاب پر اکتفا ہو۔

(ج) متعلمین کو سمجھانا نصب العین ہو صرف ڈیوٹی پوری کرنے کا معاملہ نہ ہو۔

(د) روزانہ کل کے سبق کا محاسبہ ہو۔

(ھ) ہر مہینہ کے آخر میں جمعرات یا ہفتہ ہر استاذ اپنی کتاب کا مختصر سا تحریری یا تقریری امتحان لے لیں۔

(و) تساہل برتنے والے لڑکوں پر سختی کرے۔

(ز) غیر حاضری یا دیر سے درس میں آجانے پر باز پرس ہو۔

تو امید ہے کہ حوصلہ افزا انقلاب آئے گا، اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے مدرسہ کا تعلیمی معیار منفرد ہوگا بلکہ بداخلاقی، اہمال اور سیاسیات میں عملی شرکت وغیرہ مفاسد از خود ختم ہوں گے اس لئے کہ یہ چیزیں فارغ لوگوں کے وظائف میں سے ہیں، مصروف شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

۳: مذکورہ بالا گزارش کے تتمہ کے طور پر عرض ہے کہ جو لڑکے سبق سمجھ لیتے ہیں وہ محنت پر آمادہ ہوتے ہیں اور کام شوق سے کرتے ہیں، اساتذہ کرام اگر لڑکوں کے سمجھانے پر خاص توجہ دیں تو کامیابی یقینی ہے، طولانی تقریریں اور مبتدی کے سامنے منتہیانہ مباحث تنفر کا باعث بنتے ہیں، مثلاً فقہ میں مختصر القدوری میں صرف متن کا مسئلہ یاد کرایا جائے اور کتاب پوری ختم ہو اور کنز میں مفتی بہ قول کے ساتھ اپنے ائمہ کے اختلافات کے ذکر پر اکتفا ہو اور کتاب ضبط کرائی جائے اور الاختیار میں جن مذاہب کے رموز ہیں ان کی تشریح ہو اور مختصر طور پر ہر قول کی دلیل بھی اور ہدایہ میں تحقیق کا حق ادا کیا جائے تو غالباً مثمر ثمرات ہوگا۔ قدوری اور کنز میں اگر تفصیلات ذکر کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ لڑکے یاد نہیں کر سکتے بلکہ یاد کرنے کی بے جا کوشش میں لگ کر فنون کی دوسری ابتدائی کتابوں کے فہم اور ضبط سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۴: ہماری نصابی کتابیں بے شک اخلاقیات پر حاوی ہیں لیکن ایک تو اخلاقیات کا حصہ متشخص نہیں، پھر پڑھانے کا انداز وہی علمی ہوتا ہے اصلاحی نہیں، اس لئے فقیر کی رائی ہے کہ حسب امکان تعلیم المتعلم، تنبیہ الغافلین، کتاب الزہد، الادب المفرد، ریاض الصالحین، احیاء العلوم وغیرہ کتابیں صرف اور صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے پڑھائی جائیں تو یہ خلا پر ہو سکے گا۔ حضرت والا کو بخوبی معلوم ہے کہ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ فقہ وحدیث کی کتابیں مناظرانہ انداز میں پڑھائی جاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ محققانہ انداز میں، تفسیر میں فقہی مباحث کے ساتھ

لغوی اور کلامی مباحث کا اضافہ ہوتا ہے اور حد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ترجمہ تک میں لغوی، ادبی، فقہی وکلامی وغیرہ مسائل پر زور دیا جاتا ہے، امتحانی سوالات سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ الغرض اخلاقی نقطۂ نظر سے پڑھنے پڑھانے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں، کچھ بات اگر کہی بھی جاتی ہے تو واعظ کی حیثیت سے نہ کہ مصلح، مربی کی حیثیت سے۔

۵: الحمدللہ ہمارے اساتذہ کرام علم کے ساتھ زیور صلاح سے بھی آراستہ ہیں اگر ایک درجہ کے طلبہ کی تربیت اور اصلاح کی ذمہ داری ایک ایک استاذ کے ذمہ لگائی جائے اور وہ استاذ اس درجہ کے طلبہ کا باقاعدہ مسئول نگران ہو تو ان شاء اللہ تعالی تعلیم وتربیت کا کام مؤثر طریقہ پر ہوتا رہے گا اور یہ حضرات بھی 'تدریس' کے دائرہ سے نکل آنے پر مجبور ہوں گے۔

۶: طلبہ کے ساتھ سب کا رویہ بلاشبہ برادرانہ ہونا چاہیے، ان کی جائز شکایات کا ازالہ اور ضروریات پوری کرنے کا پورا پورا خیال ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرعی حدود اور مدرسہ کے ضوابط کی پابندی کے سلسلہ میں قطعاً کوئی نرمی اور تساہل نہ ہو اس تساہل کے سنگین نتائج کئی ارباب مدارس بھگت چکے ہیں، حضرت اقدس کی ذات بابرکات اور بے انتہا خلوص کا صدقہ ہے کہ یہاں اب تک ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی، تاہم طبعی نتائج سے غفلت تباہی کا باعث بن سکتا ہے، ولا فعل اللہ تعالی ذلک۔

۷: رات کو دارالاقامہ کی نگرانی بہت ضروری ہے، مدرسہ کا محل وقوع شہر ہے، دن سے زیادہ رات کو نگرانی کی ضرورت ہے اور مجھے افسوس ہے کہ فی الوقت یہ نگرانی صفر کے درجہ میں ہے۔ شاید پورے سال میں پانچ / ۵ مرتبہ باقاعدہ حاضری لی گئی ہو، طلبہ امتحانی ایام کے علاوہ آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، میری معلومات کے حد تک اس سال کافی لڑکے فلم بینی جیسے مخرب اخلاق لعنت میں ملوث ہوئے ہیں، افریقی وغیر افریقی دونوں فریق، اس سال اس کا تدارک ازبس ضروری ہے۔

۸۔ تخصص کا درجہ ہمارے ہاں انتہائی درجہ ہے مگر افسوس ہے کہ غالباً سب سے زیادہ اہمال اسی درجہ میں ہے اور فقیر کے نزدیک اس کے تین سبب ہیں:

اول یہ ہے کہ انتخاب میں قیود کو نظر انداز کر کے تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔

دوم یہ کہ حضرت مفتی صاحب پر بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں اور حضرت مولانا اسحاق صاحب پورا وقت نہیں

دے سکتے اس لئے نگرانی کما حقہ نہیں ہو رہی ہے۔

سوم: تخصص کے امیدواروں کو پوری آزادی ہے چاہیں جو مشغلہ اختیار کریں، مجھے معلوم ہوا کہ کم از کم تین حضرات امامت کرتے ہیں اور مدرس تو ہر ایک بنا بیٹھا ہے۔ جب تک معیار کے مطابق انتخاب نہ ہو اور ہمہ وقتی سخت نگرانی نہ ہو اور صرف تخصص کے کام تک محدود نہ بنایا جائے یہ درجہ مفید ثابت نہیں ہوگا، بعض کا تیسرا سال ہے لیکن مقالہ کی تکمیل نہیں ہوئی، اس کا بنیادی سبب ان حضرات کا دوسرے مشاغل میں منہمک ہونا ہے، خصوصاً بچوں کو پڑھانے میں بہت سارے مفاسد ہیں، عیاں راچہ بیان۔

۹: حضرت الاستاذ نفعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہم نے اس سال تعلیمی اور تنظیمی کمیٹی بنا کر انتہائی حکیمانہ فیصلہ فرمایا ہے۔ شورائیت دینی تقاضا اور ہر نظام کا لازمہ ہے، اس سلسلہ میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کمیٹیوں کا وجود صرف رجسٹر میں نہ ہو بلکہ انہیں فعال بنایا جائے اور وہ بھی متحرک ہونے کا ثبوت دیں، حضرت مفتی صاحب کی ذات کے ساتھ بے شک طلبہ کی عقیدت ہے اور ان پر اعتماد کے بارے میں یقیناً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

۱۰: آخر میں پھر فقیر حضرت سے معافی چاہتا ہے اور التجاء کرتا ہے کہ ان جذبات کے اظہار کے لئے فقیر کو معذور تصور فرمائیں، اپنی نا اہلی اور حمق کی وجہ سے آداب کے حدود یقیناً ملحوظ نہیں رکھ سکا لیکن رحمت مجسم اور جبل صبر و استقامت، پیکر خلوص و مروت شیخ سے عفو و صفح کی امید ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

خاکپائے حضرت، وخاکبوس آستانہ بنوریہ

محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

(۲)

منکو تبلیغی مرکز کے امیر کے نام ایک بیان کے حوالے سے اہم ناصحانہ مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخدومی المکرم حضرت مولانا محمد رفیق صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

بعدہ! معروض خدمت آنکہ رات کو مرکز میں جو منظر دیکھا الحمد للہ ٹوٹی ہوئی امیدیں پھر بندھ گئیں۔ حق تعالیٰ اس جماعت کو زیادہ سے زیادہ ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے شرور اور اسباب زوال سے محفوظ رکھے۔

مغرب کے بعد جس صاحب نے تقریر فرمائی، ان کا جذبہ قابل قدر، قابل غبطہ تھا۔ جزوی طور پر چند معروضات آپ کی وساطت سے ان کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔ فقیر کا حافظہ اب صحیح کام بھی نہیں کر رہا، جو کچھ محفوظ رہا اس کی روشنی میں اولاً یہ عرض ہے کہ آپ نے "ویمشی فی الاسواق" کی جو تفسیر فرمائی وہ محل نظر ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کثرت "مشی فی الاسواق" کفار کی بیہودہ گوئی کا منشا تھا تو "یاکل الطعام" کے بارے میں معاذ اللہ یہ تصور کریں گے کہ یہ بھی بکثرت ہو رہا تھا، اس لئے کفار نے اس کا تذکرہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کفار کا عندیہ تھا کہ ایک عام بشر کا انتخاب رسالت کیلئے نہیں ہوسکتا، اس کے لئے کبھی وہ "ابشر یھدوننا" کبھی "ان انتم الا بشر مثلنا" کبھی "لئن اطعتم بشرا مثلکم" کبھی "ما لھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق" کبھی "ابعث اللہ بشرا رسولا" کبھی کیا اور کبھی کیا پیرایہ اختیار کرتے رہے۔ "مشی فی الاسواق" اپنی ضروریات زندگی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور صلحاء امت اس سنت پر عمل پیرا رہے ہیں۔ دعوت کے سلسلہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں تشریف لے جانا ثابت ہے لیکن اس میں حصر یا اسی آیت کریمہ کا مصداق بنانا خلاف واقعہ ہے۔

ثانیاً: فرمایا کہ امت کی زبوں حالی کا سبب یہ نہیں کہ نماز چھوٹ گئی ہے یا تہجد رہ گیا ہے وغیرہ ذلک، بلکہ امت کا المیہ یہ کہ دعوت کا کام چھوٹ گیا ہے، یہ انداز تعبیر نامناسب ہے۔ اس کا بظاہر یہ مطلب لوگ لیں گے کہ دوسرے دینی اعمال یہاں تک کہ نماز بھی اگر رہ جائے لیکن دعوت کا کام جاری ہو تو امت کی بگڑی بن گی، حالانکہ بالفرض ساری امت بھی اگر داعی بن جائے اور خدانخواستہ امت صرف ایک نماز کی تارک ہو تو وہ امت مرحومہ نہیں بلکہ امت ملعونہ بن جائے گی اور امت مسلمہ کہلانے کی مستحق نہ ہوگی۔ دعوت کے کام کی فضیلت کا بیان اور اس کی ترغیب اس طرح نہیں دینی چاہیے کہ اس سے دین کے دوسرے ارکان تو درکنار کسی دینی ادب اور مستحب کے بے وقعتی ظاہر ہو۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ صرف سنت مسواک کے چھوٹ جانے سے بھی امت ناکام اور تباہ ہوسکتی ہے۔ دعوت بذات خود مقصود نہیں بلکہ الیٰ اللہ والیٰ دین اللہ بن کر مطلوب ہے۔ دعوۃ الی الدعوۃ دعوۃ الی اللہ والی دین اللہ کی ہزاروں

صورتوں میں سے ایک جزوی صورت ہے وہ بھی اس صورت میں کہ "الی الدعوۃ" میں "ال" عہدی ہو۔

ثالثاً: نبوت کے بارے میں امم سابقہ اور اس وقت کے عقیدوں میں جو فرق بیان ہوا کہ "ان کا عقیدہ رہا کہ ان کی طرف مبعوث نبی نبی ہے اور ہمارے لئے دو عقیدے ہیں: ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور دوسرا یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں"۔ اس سلسلہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں حقیقت حال یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان دو عقیدوں کے مکلف ہیں اسی طرح سابقہ تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں پر ایمان لانے کے مکلف تھے، اسی طرح وہ مع سارے انبیاء علیہم السلام کے حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور ختم نبوت پر ایمان لانے کی مکلف رہے۔ اس لئے یا تو اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے یا پھر ایمان بالرسل کے عقیدہ کی پوری تفصیل بیان کرنی چاہیے تاکہ ابہام واجمال کسی غلط فہمی کا موجب نہ بن سکے۔

رابعاً: انبیاء علیہم السلام کی شفقت علی الخلق کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اور اسی طرح صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کے بارے میں جو تفصیل سنائی گئی وہ ان حضرات کی سیرۃ طیبہ کے آئینہ کا صرف ایک رخ ہے جو ان کے حب فی اللہ کے جذبہ کا مظہر ہے۔ ان کی پاکیزہ زندگی کا دوسرا پہلو جو بغض فی اللہ کا رنگ لئے ہوئے ہے پہلے سے کچھ کم اہم نہیں۔ روسیوں کے لئے بددعا ایسے انداز میں ہوئی کہ وہ بہت سارے عوام کی غلط فہمی کا سبب بن سکتی ہے۔ قرآن حکیم نے ظالمین، کافرین، فاسقین، کاذبین وغیرہم کے لئے بددعا کے کلمات جا بجا استعمال فرمائے اور انبیاء علیہم السلام کی قوموں کیلئے ہلاکت کی دعائیں نقل فرمائیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رعل وذکوان وعصیہ وغیرہ قبائل کے بارے میں اور غزوۂ خندق کے موقعہ پر نماز مؤخر ہونے پر دل گرفتہ ہو کر تمام احزاب کفار کے بارے میں قنوت کی صورت میں اُدعیہ سیرت کے کسی بھی طالبعلم سے مخفی نہیں۔ اس لئے اس مضمون کو بھی اعتدال کے ساتھ بیان فرمانا بہتر ہوگا۔

خامساً: سورۃ المدثر کے حوالے سے فرمایا گیا کہ ابتداءً صرف دعوت سے ہوئی، احکام بعد میں آئے، حالانکہ دعوت کے حکم کے ساتھ ہی "قم فانذر (۲) وربک فکبر (۳) وثیابک فطھر (۴) والرجز فاھجر (۵) ولا تمنن تستکثر (۶) ولربک فاصبر" جیسے احکام کا ایک لمبا سلسلہ جڑا ہوا ہے اور کون نہیں جانتا کہ قرآنی وحدیثی نصوص کے مطابق باجماع امت سب سے اولین اور اہم ترین حکم دینی احکام میں عقیدۂ توحید کا ہے پھر دوسرے ایمانیات کے احکام ہیں، اس کے بعد اخلاقیات وعملیات سے وابستہ احکام کا درجہ ہے۔ دعوت کا کام کتنا ہی مہتم بالشان ہو مگر ہے تو عمل ہی کا ایک حصہ۔ سورۃ العصر نے اس کو جو درجہ دیا اسی پر اس کو رکھنا ضروری ہے۔

"قوا انفسکم" کے تقاضے پورے ہونے کے بعد "واھلیکم" کا اہتمام اور پھر درجہ بدرجہ دعوت کا دائرہ وسیع

ہو جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کی ذواتِ قدسیہ (فدینا ہم بانفسنا وابائنا وامہاتنا) پر قیاس کرنا انتہائی بھیانک غلطی ہے، ان حضرات کا دینی علم وہبی تھا بغیر کسب کے ان کو ملا، جبکہ امت کے دینی علم کا کسبی ہونا ضروری ہے، ورنہ قابل استفادہ نہ ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام فطرۃً مؤمن، صالح معصوم عن الصغائر والکبائر قبل النبوۃ وبعدھا تھے۔ ان کی فطرت ماحول کی گندگی وآلودگی سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی، جبکہ امت کو کسبا بڑی محنت سے اصلاح عقیدہ، اصلاح خُلق، اصلاحِ عمل اور معاصی سے دامن بچانے کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ انفرادی حیثیت میں ایک امتی کے کام کی جہاں انتہا ہے، وہیں سے نبی کے کام کا آغاز ہو رہا ہے۔ ''چہ نسبت خاک را بہ علم پاک'' اور'' بین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا''۔ منہاجِ نبوت پر ایک امتی کا داعی بننا کوئی کھیل نہیں اس مقام کا تصور کر کے بھی انسان لرز اٹھتا ہے۔

بہرحال میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور دامن اعتدال ہر باب میں مضبوطی کے ساتھ تھامنا ضروری ہے۔

آخر میں آپ سے اور اپنے مہمان دوست سے معافی چاہتا ہوں، اتنی طویل کا ارادہ نہ تھا جبکہ شعوری طور پر اس کو بھی ناکافی اجمال سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ اس فقیر کے ان مجنونانہ اور پراگندہ معروضات کو ہمدردی کے جذبہ پر محمول فرمائیں گے، اپنی کوتاہیوں کا تصور کر کے آپ جیسے حضرات کی خدمت میں اس قسم کی باتیں عرض کرنا گستاخانہ جسارت سمجھتا ہوں۔ چونکہ مجمع بڑا تھا اور ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑھنے والا ہے، اس لئے احتیاط کی خاطر ان سطور کے لکھنے پر مجبور ہوا، دعواتِ صالحہ کی درخواست پر ختم کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

خویدکم الفقیر محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

(۳)

دیوبندی جماعتوں کے مابین اتحاد اور بعض اہم سیاسی امور سے متعلق ایک تحقیقی مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۶ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ، ۲۴/ ۲/ ۸۸ء

بخدمت گرامی مخدومی المکرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مکارمہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

۱۴ فروری کا تحریر فرمودہ مکتوب گرامی پرسوں باصرہ نواز ہوا، زاویہ خمول کے اس باسی کے یادفرمائی کا بہت بہت شکریہ! غالباً جناب کی علم میں یہ نہیں آیا ہوگا کہ یہ فقیر ۷۵ء سے ذہنی اور فکری طور پر جمعیت سے وابستہ ہوا جب کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا اور وابستگی الحمدللہ تعالیٰ اب تک قائم ہے، اس طویل عرصہ میں کم از کم ذاتی طور پر میرا اعتقاد یہ رہا کہ جمعیت ایک مذہبی سیاسی تنظیم ہے اور اس کی پالیسی میں مذہب کو اولیت حاصل ہے، سیاست ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ کسی موڑ پر اگر اس کے خلاف کوئی فیصلہ سامنے آیا تو ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال فرمانے کے بعد جمعیت میں جب انتشار پیدا ہوا، تو بلاتردد ایم. آر. ڈی کے ساتھ وابستگی کو جمعیت کے مسلک کے خلاف سمجھا، اس لئے کہ ایم. آر. ڈی کے منشور میں اسلام کو اولیت تو کیا حاصل ہوتی سرے سے اس کے لئے جگہ ہی نہیں تھی، میرے نزدیک آج بھی ایم. آر. ڈی کی ساتھ تعاون شعوری یا غیر شعوری طور پر الحاد ولا دینیت کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی سعی کے مترادف ہے، جبکہ برسر اقتدار منافق ٹولہ کے ساتھ تعاون سنگین جرم ہونے کی باوجود عواقب کے اعتبار سے اس سے اہون ہے۔ بہر حال اس ذاتی رائے کے باجود ہماری مقدور بھر کوشش یہ رہی کہ جمعیت متحد ہو، آپ نے نفاذ شریعت کی جب کوشش شروع کی تو ہمیں از خد خوشی ہوئی لیکن جب آپ نے 'شریعت محاذ' بنایا تو محسوس ہوا، جیسے کہ گاڑی لائن سے اتر گئی ہو، بینروں اور دیواروں پر نعرہ بازی کے عادی حضرات عملی جد وجہد کرہی نہیں سکتے، بے شک مشترکہ مقاصد کے لئے ہم خیال افراد یا جماعتوں کا آپس میں تعاون بے حد ضروری ہے، لیکن مختلف مزاج رکھنے والے عناصر کا تنظیمی اتحاد کبھی پائیدار ثابت نہیں ہوا، اس لئے فقیر نے ساتھیوں سے عرض کیا کہ نفاذ شریعت کی عملی کوششوں میں اس ناکارہ کی ناچیز خدمات حاضر ہیں، مگر شریعت محاذ کے پروگراموں سے اس کو الگ سمجھیں، پھر جب اخباری رپورٹوں کے مطابق جناب کی طرف منسوب وہ بیانات سامنے آئے جس میں ایک گمراہ جماعت کے قائدین کو خراج تحسین پیش کیا گیا تو مزید تکدر ہوا اور پھر آپ جیسے محترم اور ذمہ دار شخصیت کا محولہ انٹرویو پڑھا تو اتنی تکلیف ہوئی جتنی مولانا سراج دینپوری کے اس بیان سے ہوئی تھی، جس میں انہوں نے قادیانی مسئلہ کے حل کا سہرا بھٹو کے سر پر باندھنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ حیرت ہوئی کہ دارالعلوم حقانیہ جو کہ 'مدنیت' کا مظہر ہے سے یہ آواز کیسے سننے میں آئی اور جمعیت کے ناظم اعلیٰ صاحب نے یہ کیا فرمایا؟ مودودی صاحب اور اس کی

جماعت کے ساتھ ہمارے اکابر کے اختلاف کوفرعی قرار دینا میرے نزدیک بہت بڑی بے انصافی تھی اور معاف فرمایئے! اپنے اکابر کے تقویٰ، ورع، احتیاط اور تدین کا مزاق اُڑانا تھا، اس لئے بہت شدت سے اس کو محسوس کیا ،کافی دن تردید کے انتظار میں رہے لیکن ''جنگ'' میں تو درکنار ماہنامہ ''الحق'' میں بھی کوئی تردیدی یا وضاحتی بیان نظر سے نہیں گزرا، حضرت اقدس سیدی علامہ بنوریؒ کے کفش برداری کا ویسے پہلے سے بھی اثر تھا کہ سیاست سے دلچسپی کم ہوگئی تھی اور موجودہ صورت حال بے اعتدالی نے گوشہ نشینی پر مجبور کردیا۔

میرے واجب الاحترام بزرگوار صاحب! جن بنیادوں پر جمعیت قائم ہوئی تھی اور اس کا جو مخصوص مزاج تھا، جب تک ہم اس کی طرف رجوع نہ کریں سنبھلنا مشکل ہوگا۔'اغیار' کے ساتھ اتحاد کے نتیجہ میں ہم نے ہمیشہ 'اپنوں' کو کھویا ہے کمایا کچھ نہیں، اپنا نصب العین متعین کرکے اس کے حصول کیلئے صحیح لائحہ عمل اپنا کر کام کرنا ہمارا فریضہ ہے، نتیجہ کائنات کی مالک کی مشیت کے سپرد ہے، الحمدللہ تعالیٰ یہ ناچیز اپنے مشائخ واکابر کا عقیدت مند ہے، ان کے ادب واحترام کو کلید فلاح سمجھتا ہے، مگر بعض معاملات میں ان سے لغزش کو خارج از امکان نہیں سمجھتا اور نہ لغزش میں تقلید کو مناسب تصور کرتا ہے۔

کیا آنجناب کی نزدیک یہ ممکن نہیں کہ حضرت مولانا درخواستی صاحب، حضرت مولانا محمد اجمل صاحب، حضرت مولانا محمد خان صاحب، حضرت مولانا صفدر صاحب، حضرت مولانا عبدالحق صاحب، حضرت مولانا فقیر محمد صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب، حضرت مولانا حامد میاں صاحب، حضرت مولانا محمد ایوب جان صاحب، حضرت مولانا عبدالکریم صاحب اور ان جیسے دیگر اکابر سے درخواست کی جائے کہ للہ ہم چھوٹوں پر رحم فرمائیں، آپ حضرات ایک جگہ جمع ہوکر دیوبند مسلک سے تعلق رکھنے والی تمام تنظیموں اور اداروں کے سربراہوں اور سرکردہ ارکان کو ایک منظم منصوبہ کے تحت تقسیم کار کے اُصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک قیادت کے تحت لے آئیں، تاکہ مستقبل میں کسی دوسرے کے ساتھ اتحاد کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ تبلیغی جماعت سے لے کر اشاعۃ التوحید والسنۃ تک مذہبی جماعتیں اور جمعیت سے لے کر احرار تک سیاسی تنظیمیں مل کر نیز دینی تعلیمی اداروں کے ذمہ دار حضرات کو بھی ساتھ ملاکر اگر ہم کسی بھی مقصد کے لئے تحریک چلانا چاہیں، تو کیا کوئی سیاسی جماعت یا گمراہ نام نہاد مذہبی جماعت، بشمول برسر اقتدار ٹولہ کے ہمارا راستہ روک سکی گی؟ عام حالات میں ہر تنظیم اپنا اپنا کام کیا کرے، ہنگامی ضرورت پر سب ایک ہوں، ختم نبوت کا مسئلہ ہوتو تحفظ کے پلیٹ فارم پر سب اکٹھے ہوں، رفض وتشیع کی یلغار ہوتو تنظیم اہل سنت کے مورچہ سے دفاعی کارروائی کریں، شرک بدعت کے بچاریوں کا فتنہ ہوتو اشاعت والوں کا ساتھ دیا جائے، تبلیغی جماعت کا کام ہوتو ان کا بھرپور ساتھ دیا جائے، انتخابات کا مسئلہ ہوتو جمعیت کے امیدواروں کے لئے کام کیا جائے

، مدارس کو خطرہ تو سب ان کے تحفظ کے لیے سینہ سپر ہوں، وقس علی ہذا، میں نے بعجلت اور ایک حادثہ کی وجہ سے انتہائی انقباض میں یہ چند بے ربط سطور تحریر کیے جس کی حیثیت شاید مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہ ہو اور جناب کے قیمتی وقت کے ضیاع کا موجب ہوں گے، معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

آپ کا خادم محمد امین عفا اللہ عنہ شاہو وام

شیخ الحدیث حضرت اقدس قبلہ والد ماجد دامت برکاتہم سے سلام نیاز اور دعا کی درخواست عرض ہے۔

(۴)

ایک سائل کے استفسار پر علامہ شبلی کے سیرت النبی کے بعض مقامات کا تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیادۃ الشیخ المکرم اطال اللہ بقاء کم للخیر و الطاعۃ و نفع العباد بکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالی و برکاتہ

و بعد فقد تشرفت بکتابکم المیمون و سررت جدا بذکرکم و لکن من المؤسف اجدنی معذورا عن اجابۃ المسؤل و اسعاف المأمول علما منی بان السائل الکریم اعلم و افضل من المسؤل عنہ فمن تلمذ علی مشائخ دیوبند الکرام و تضلع من علوم ھؤلاء البحور و اقتبس من بدور عرفانھم و شموس ھدنھم ثم اشتغل برھۃ من الدھر بالافادۃ و الافاضۃ و یکون مشار الیہ بالبنان فی العظمۃ و الذکاوۃ یستحق ان یستفید منہ امثالی القاصرون المقصرون فاجابتکم ترادف عکس الموضوع و لست بحمد اللہ تعالی ممن یغتر بکلماتکم الطیبۃ المشعرۃ عن خصاء لکم محمودۃ من خفض الجناح و التواضع و معاذ اللہ ان اظن بکم الجھل و التجاھل و غایتھما یمکن الاختبار و الاستکشاف اذ من البین ان اثبات نبوتہ ﷺ لم یکن بقول ورقۃ المؤمن بالانجیل و التوراۃ و العالم بھما لانہ سبحانہ و تعالی یخلق علما ضروریا فی قلب کل نبی عندما یکرمہ بالنبوۃ و یبعثہ رسولا بنبوتہ و رسالتہ کما صرح بہ غیر واحد من المحققین علی انہ قدر و فی عدۃ من الاثار ان جبریل علیہ السلام اخبرہ بانک رسول اللہ و ایصال الوحی الیہ من اللہ سبحانہ یرادف الایقان بالنبوۃ ثم قد خاطبہ الشجر و الحجر بقول السلام علیک یا رسول اللہ و یشق جبریل ﷺ قلبہ الاطھر کما ورد فی بعض الاثار فبعد ذلک کلہ لا یمکن ان یتردد ﷺ فی نبوتہ لحظۃ و انما کان رجوعہ الی السیدۃ خدیجۃ ﷺ و ورقۃ ﷺ لمصلحۃ ھامۃ و حکمۃ بالغۃ نبہ علیھا الشیخ الاکبر ﷺ و غیرہ من العرفاء و المحققین و کلام الشبلی فی سیرتہ و من ضاھاہ من زلاتھم المعروفۃ لا ینبغی ان یقول علیہ بل لا یستحق ان یصغی الیہ و اشتراط دخول الجنۃ بالموت مما لم یثبت ببرھان غایۃ ما یقال ان الدخول فیھا للتنعم جزاء بما عمل من الصالحات یکون بعد الموت حسب سنۃ اللہ تعالی فی عبادہ و دخولہ ﷺ کان علی

سبیل المعجزة وهي قد تكون الاخارقة للعادة وقد قالوا ان خلق ادم ﷺ كان في الارض ثم ادخل الجنة وبالجملة نعتقد ان معراجه ﷺ مع احتوى عليه من الايات الكبرى من معجزاته صلوات الله تعالى عليه والله تعالى على كل شيء قدير يفعل ما يشاء لا يحول دون قدرته شيء وكذا لا استحالة في تعداد الصور لشخص واحد كما حققت الشعراني ؒ في اليواقيت نعم لفظة صورة حقيقة موهمة ينبغي الاحتراز عنها ومعنى قوله ﷺ فقد راى الحق في المنام فقد راني وابعد من قال ان المراد بالحق هو الله سبحانه وتأول متعسفا كما نبه عليه المناوي ؒ في الفيض وغيره في غيره وأثر لي مع الله ساعة يذكره المتصوفة بلا سند ولا يسوغ لنا الحكم عليه ما دام اسناده مستورا ولم نعثر حتى الان على تصريح احد من ائمة هذا الشان بصحته وقوله ﷺ كان الله ولم يكن معه شيء لا اشكال فيما علا على ما ذهب اليه الصوفية والحكماء من القول بعينه الصفات وكذا لا يشكل على معتقد المتكلمين فان المراد بالشيء هو الممكن والمغائر لذاته تعالى وصفاته واجبة ليست غيره كما انها ليست عينه عندهم وليس الاستغراق حقيقيا بقضية العقل كما في قوله تعالى ان الله على كل شيء قدير ولفظ الله المذكور في صدر الكلام مفسر بالذات الواجبة الوجود المستجمعة لجميع الصفات الكمال المنزهة عن جميع الزوال فعلى هذا تكون الصفات داخلة في صدر الكلام اعني كان لله خارجة عن عجزه اعني ولم يكن معه شيء ولو حملنا الشيء على الاستغراق الحقيقي لزم التهافت لمنافاة صدر الكلام مع عجزه ويستلزم بنفي الشيء على العموم الحقيقي نفي ذاته ايضا لان ذاته تقدس وتعالى ايضا شيء ولا يظن بعاقل فضلا عن فاضل ان يفهم من لفظ الحديث الشريف هذا، وأخيرا ارجوكم العفو والمسامحة لاساءة الادب بتقديم هذه الكلمات الى جنابكم ولا احب الخوض في مغامر الحقائق والولوج في مضائق الكلام لعدم التأهل فان لكل فن رجال۔

والسلام عليكم ورحمة الله تعالى وبركاته

مراجي الدعوات من سماحتكم

محمد امين عفا عنه الله تعالى

(۵)

حضرت صندل بابا جیؒ کی شخصیت کے حوالے سے پنجاب میں ایک بدعتی گروہ کے انسداد کے لیے حضرت نفیس الحسینی شاہ کے نام اہم مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت اقدس مجمع الحسنات وزین السادات حضرت شاہ صاحب زیدت معالیہم ودامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہو، چند روز پہلے اجمالاً علم ہوا کہ پنجاب کے بعض احباب نے حضرت الشیخ سید محمود صندلی صاحب دامت برکاتہم کے بارے میں تنقیدی رسائل شائع کیے ہیں، افسوس تو ہوا لیکن اس مشغلۂ بے سود کی طرف زیادہ التفات نہ ہوا، اس کے بعد سوات کے ہمارے مخلص احباب نے مطبوعہ پمفلٹ پہنچائی اور شفاہاً کچھ معلومات فراہم کیں اور اس طرف توجہ کرنے پر اصرار فرمایا تو کافی غور وتامل کے بعد مناسب سمجھا کہ اس فتنہ کے سد باب کے لئے حضرت اقدس کی خدمت میں عریضہ لکھوں، اس لئے کہ اس علاقہ میں ہمارے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد قادریہ سلسلہ سے منسلک احباب کے لیے مرجع آنجناب ہی ہیں۔

حضرت اقدس اس ناکارہ سے بہتر اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ اہل حق کو ہمیشہ آپس کے انتشار اور محاذ آرائی نے نقصان پہنچایا۔ دیوبندی طبقہ پہلے سے ان ہی باہمی اختلافات کی وجہ سے زبوں حال ہے، مزید انتشار ظاہر ہے مزید نقصان کا سبب بنے گا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ حضرت صندل باباجی صاحب کے بارے میں سیاسی مزاج لوگوں کے طریقہ کی بجائے اپنے اسلاف عظام کا شیوہ اپنانا چاہیے تھا، تحقیق حال کے لئے معتدل مزاج مخلص احباب کا ایک مختصر سا وفد صندل جاتا اور حضرت کے احوال وکوائف کا مشاہدہ کرتا اور حضرت کے اغراض ومقاصد اور مزاج وطریقہ کا علم حاصل کرتا، اور وضاحت طلب امور کی تحقیق اور وضاحت ہوتی، اگر کچھ لغزش وغلطی نظر آتی تو اصلاح کا مشورہ دیتا، یقیناً یہ طریقہ کار بہتر نتائج کا ذریعہ ثابت ہوتا۔

حضرت موصوف سے تقریباً ڈیڑھ سالہ تعلق میں ہمیں تو وہاں تواضع وانکسار اور قبول حق وصواب کا مشاہدہ ہوا، خودنمائی اور شہرت سے طبعی انقباض محسوس ہوا، مسترشدین کو بھی سب سے زیادہ عبدیت اور اخلاص کی تلقین ہوئی، خود فرمایا کہ کچھ احباب نے اپنے اور مرشدِ عظیم حضرت سنڈاکئی باباصاحبؒ کے حالات املا کرنے پر اصرار فرمایا تو حضرت سنڈاکئی باباصاحبؒ کی زیارت خواب میں نصیب ہوئی اور تنبیہ فرمائی: "لاتزنی ولاتزن نفسک"۔

''راہ وفا'' یا دوسرے اخبارات میں جو کچھ شائع ہوا اس کا بیشتر حصہ یقیناً ایسا تھا کہ شائع نہ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ذاتی طور پر یہ فقیر خود اس قسم کی تشہیری مساعی کو ناپسند کرتا ہے۔ بعض امور حقائق ہوتے ہیں لیکن قابل اشاعت نہیں ہوتے، زرین نصیحت موجود ہے "کلم الناس علی قدر عقولهم" اور ساتھ ساتھ حکیمانہ مصلحت بھی "اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ" تعلیمات نبویہ کا ایک حصہ اگر ایسا ہوسکتا ہے کہ ہر کسی کے فہم کا نہیں ہوتا تو مابعد کے مشائخ کرام کی تعلیمات وارشادات کیسے اس سے مستثنیٰ ہوسکتے ہیں۔ ماضی میں منصور، حضرت شیخ اکبر، حجۃ الاسلام غزالی سے لے کر حضرت نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ تک اکابر کے بعض ارشادات کی اشاعت کافی لوگوں کے حق میں

فتنہ ثابت ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک تقلیل وسائط کی صوفیانہ ذوق کے مطابق توجیہ ممکن ہے لیکن اذہان عامہ اس کی متحمل نہیں ہیں، اسی طرح حضرت گنگوہیؒ سے ملاقات بعید از امکان نہیں کہ حضرت قطب الارشادؒ کی رحلت کے وقت صندل باباجی صاحب کی عمر کم از کم سترہ، اٹھارہ سال تھی اور اس عمر کے سینکڑوں پٹھان کلکتہ، بمبئی، دہلی، سہارنپور، امروہہ، اجمیر شریف اور مرادآباد وغیرہ بلاد ہند میں اخروی یا دنیوی فوائد کے حصول کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ امکان لقاء کو امام بخاریؒ کے علاوہ جمہور محدثین نے کافی تصور فرمایا لیکن اس کے باوجود عصرِ حاضر میں اس کی اشاعت غیر ضروری بلکہ غیر مفید تھی، اس لئے کہ حضرت نے تلمذ یا علمی استفادہ کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ آج کل مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی کا فتنہ کس قدر عام ہے اور کتنا بڑا ہے، لیکن روافض وغیرہ ملحدین کی مبالغہ آمیزی اور غلو کی وجہ سے سیدنا حضرت علیؓ، حضرات حسنینؓ، زین العابدینؒ، امام باقرؒ، جعفر صادقؒ و دیگر اہل بیت کا پاکیزہ دامن تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور نہ روافض کی تردید میں ان حضرات کے خلاف لب کشائی کی اجازت دی جاسکتی ہیں، ان کی اہانت یا تحقیر کا تصور بھی ناجائز ہے۔ اس لئے بعض غالی معتقدین اگر غلو سے کام لیں اور کسی صاحب دل وصاحب نسبت بزرگ کے بارہ میں خلاف واقعہ یا نامناسب باتیں پھیلائیں تو اس کو بنیاد بناکر کسی بزرگ کی ہجو وتحقیر کرنا اور وہ بھی مطبوعہ تحریرات اور رسالہ کی صورت میں یقیناً کسی صحیح مسلک اور مبارک سلسلہ کے متعلقین کے لئے نہایت ناشائستہ حرکت ہے۔ حق تعالیٰ مجھے اور ہمارے احباب کو بصیرت کی دولت سے نوازے۔ بصیرت نصیب ہو تو انسان دوسروں کی بجائے اپنے معائب کی تلاش میں رہتا ہے اور اصلاح میں کوشاں ہوتا ہے۔ بے اختیار عریضہ میں تطویل ہوئی، تضییع وقت اور تصدیع کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ عریضہ کا مقصد یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے آنجناب کو روحانی امراض کا معالج بنایا ہے اور مقبولیت کی خلعت سے نوازا ہے، اکابر اور صلحاء امت کا نمونہ بنایا ہے، فقیر کی درخواست ہے کہ حضرت والا کے لئے جس قدر ممکن ہو اس فتنہ کے تدارک میں حصہ لیں اور کم از کم حضرت والا سے ارادت کا تعلق رکھنے والے احباب کو اس مشغلہ سے بچنے کی تلقین فرمائیں، خدانخواستہ دوسری طرف سے بھی اگر اسی اشتہاری اور تحقیری انداز میں جوابی کارروائی شروع ہوئی تو بڑی بھیانک صورت حال بن جائے گی۔ آج کل ہر کوئی خطیب ہے، لکھاری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خداوند متعالی کے خوف سے عاری لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوست کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے اکابر اور اسلاف کے خلاف سوانح اور تاریخی تذکرہ جات کے حوالوں کی بنیاد پر بیہودگی پھیلانے پر اتر آئیں۔

آپ کا محتاجِ دعا خادم

محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

(۶)

مولانا اسلم شیخو پوری رحمہ اللہ کو اصلاحی خطوط، جن سے استاذ وشاگرد کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ از: مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از فقیر محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

الخمیس ۱۴ رمضان ۹۶ھ

برادرم عزیز جناب حافظ محمد اسلم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ عن الفتن واکرمہ بالتقوی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

محبت نامہ نظر افروز ہوا، خیر وعافیت کی اطلاع پاکر خوشی ہوئی، حق تعالیٰ جانبین کے خیر وعافیت کو دوام بخشے، فقیر نے سابقہ مکتوب میں اپنی ذات سے متعلق اور آں عزیز کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ حقائق کا اظہار تھا، اپنی ذات اور اپنے صفات کا علم تو حضوری ہے، آنجناب کے بارے میں مشاہدہ اور خبر کی بنیاد پر قائم کردہ رائے عرض کی تھی اس میں نہ تو تصنع تھا اور نہ اس کو تواضع کہہ سکتے ہیں۔

؎ گدا اگر تواضع کند خوئی اوست

تواضع تو یہ ہے کہ کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھے۔ والد گرامی کا تاثر "شنید" پر مبنی ہے۔ خدا کرے ان کا ظن فی الحال اگر چہ حسب واقع نہیں مستقبل میں صادق ہو۔ "تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ" کلیہ اگر چہ نہیں اکثر یہ ضرور ہے۔ آپ کے خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

قیام مدرسہ کے دوران فقیر کے چہرہ اور صورت کو دیکھ کر آپ نے نتیجہ اخذ کیا وہ جزوی طور پر صحیح تھا البتہ بنیاد کسی قسم کی بدگمانی نہیں تھی جیسا کہ آپ کے ادیبانہ تحریر سے مترشح ہو رہا ہے ورنہ میں تو اغیار کو لگام دیتا رہتا ہوں۔ آپ حضرات تو سب اپنے تھے ایسی کوئی بات ہوتی صرف احتمال کے درجے میں بھی تو یہ بداخلاق ایک دن کے لئے بھی آپ حضرات کو آپس میں بیٹھنے نہ دیتا، بات بس اس قدر تھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اختلاط کی مضرات کا اندیشہ لاحق تھا اور زیادہ فکر پھر اس لئے بھی رہی کہ باعث میں خود ہی بن گیا تھا۔ دودھ کا جلا ہوا طبعاً چاچھ سے ڈرتا ہے، آپ جیسے طباع اور ذہین شخص کے لئے اتنے اشارات کافی ہوں گے۔ اپنی اصلاح کے لئے تجنب عن الخلق کا جو عزم ظاہر کیا انتہائی مبارک ہے۔ مقلب القلوب والاحوال سے صبر وثبات استقامت کی دعا ہے۔ اس جہول اور ظلوم کے نزدیک مقصد تک پہنچنے کی راہ صرف دو ہی گام کا ہے۔ پہلا قدم اپنے گردن پر ہو تو دوسرا رب عظیم کے عرش پر ہوگا

ادھر غیر سے منہ موڑا ادھر جمالِ یار کا نظارہ کرنے لگا خلق سے توڑا اور حق سے جوڑا، اور ان میں بس یہی پہلا قدم ہے آپ کو خود اللہ تعالیٰ نے علم وبصیرت سے نوازا ہے، آپ جانتے ہیں کہ حق و باطل کی تاریخی آویزش میں سب سے بڑا دخل ''لا الہ'' کا رہا ہے ''الا اللہ'' میں اختلاف کی نوبت بہت کم پیش آئی ضرورت اس کی ہے کہ آئینۂ قلب کو ماسوی اللہ کی کدورات سے مصفّٰی بنایا جائے، لا الہ کی جاروب سے خانۂ دل کو غیر اللہ کی خاشاک سے پاک کیا جائے پھر اس صاف وشفاف آئینہ میں محبوب کی صورت از خود ہی آئیگی اور اس پاکیزہ خانہ میں معزز مہمان بخوشی ورود فرمائے گا۔

؎ پردہ ہستی اگر سوزی بنار لا الہ

ان زمان بے پردہ بینی نور الا اللہ ما

صرف تخلیہ کی ضرورت ہے میرا خیال ہے تخلیہ کے بعد پھر ''اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی'' کی صدا صرف مجذوبانہ صدا ہو سکتی ہے جس کی ضرورت نہیں۔ اس آفتاب عالم تاب کا عکس از خود پڑے گا بشرطیکہ آئینہ پر ظلمانی پردہ نہ ہو۔

؎ ہر چہ ہست از قامت کوتاہ بداندام ما

ست

ورنہ تشریف تو بر بلائے کس کوتاہ نیست

اگر قابل میں نقصان ہو تو فاعل تو کامل ہے، بہرحال ایمان باللہ کا نور تب جلوہ گر ہوگا جب پہلے کفر بالطاغوت کا نعرہ مستانہ لگایا جائے، یہی توحید کی حقیقت ہے جو کہ اساس ہے تمام ایمانیات وعملیات کا۔

یہاں ایک بات پر تنبیہ ضروری سمجھتا ہوں اور شاید پہلے بھی کرچکا کہ تعلق مع الخلق علی الاطلاق ممنوع نہیں بلکہ اہلیت ہو تو مطلوب ہے صرف مرغوب ہی نہیں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہمیشہ خلق سے ربط وتعلق رہا اور اس طرح دوسرے صلحاء وکاملین کا یہ اس لئے کہ وصول الی اللہ کے بعد خلق، حق کے مشاہدہ سے مانع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لئے بمنزلہ آئینہ ہوتی ہے، وہاں تو "اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ" کا سماں ہوتا ہے۔ اور "انَّ صلوتی ومحیای ومماتی للّٰہ" کی شان...... اپنے آپ کو ان حضرات پر قیاس کرنا ہماری حماقت ہوگی۔

بہرحال عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا عزم انتہائی مبارک ہے جنت جو کہ تجلی گاہِ حق ہے تک رسائی خوف وخشیت کی ہتھیار سے مسلح ہو کر ''ہوائے نفس'' کا مقابلہ کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ "قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا" "واما من طغی واٰثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماْوی واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی فانَّ الجنۃ ھی الماْوی" وغیرہ نصوص میں قرآن حکیم نے اپنے لاجواب حکیمانہ اسلوب کے ساتھ اسی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔

قیلولہ کا وقت ہے، طبیعت میں انشراح بھی نہیں، اسباب انقباض کی شرح سر دست نہیں کر سکتا۔ سلام محبت کے ساتھ سلسلہ گفتگو ختم کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔ ہاں آپ کا اصل سوال اب یاد آ گیا۔

اولاً: دجال کے بارے میں آپ نے جو تصور پیش کیا ہے وہ خطرناک ہے، قادیانی دجال اور اس کے دوسرے اذنیاب یہی تصور پیش کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے ملاحدہ نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ 'دجال' بے شک اسم لقبی ہے مگر مسمی اس کا شخص معین ہے، یہ تاویلات کا راستہ اندوہناک ہے، تاویل برائے تاویل تو باطنیہ کی طرح ہر نص میں ممکن ہے لیکن روایات کے پورے ذخیرے کو سامنے رکھا جائے تو اس قسم کی تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ مفصل گفتگو بوقت ملاقات ہی ممکن ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ثانیاً: معتکف کو ہر وقت اپنے رب کو راضی کرنے اور رکھنے کا خیال کرنا چاہئے، یہ انقطاع الخلق و توجہ الی الحق کی محدودسی عملی مشق ہے۔ ذکر وفکر میں مصروف رہنا چاہئے جتنی زیادہ ہو سکے تدبر کے ساتھ تلاوت ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ فقہ وتفسیر وحدیث وغیرہ دینی کتب دیکھنی چاہئیں۔ میرا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ تلاوت واستغفار کے بعد حیاۃ صحابہؓ اور اولیاء اللہ کے حالات زندگی پڑھے۔

ثالثاً: قاعد کے اقتداء میں قائم تراویح ادا کر سکتے ہیں، باتفاق اصحابنا علی الاصح کما صرح بہ قاضی خان وغیرہ۔ فرائض میں امام محمدؒ نے اختلاف کیا ہے، شیخینؒ کے نزدیک جائز ہے اور غالباً امام مالکؒ وشافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ شرط یہ ہے کہ قاعد قادر علی الرکوع والسجود ہو، مؤمی نہ ہو اور مقعد بھی قاعد کے حکم میں ہے، اب تک یاد نہیں کہ کسی نے فرق کیا ہو، اچھا ہوگا کہ مسائل کی تحقیق کسی محقق مفتی سے فرما لیا کرے۔ حضرت والد صاحب اور جملہ اعزہ سے سلام عرض کیجیے۔ رمضان شریف میں خصوصیت کے ساتھ دعوات خیر میں یاد رکھیے۔

والسلام مع الاکرام

آپ کا مخلص محمد امین کان اللہ لہ

نوٹ: اپنے طویل مکتوب گرامی کے پشت پر آپ نے الفاظ وتراکیب کے لئے معذرت کا اظہار کیا تھا، اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ معذرت تو مجھے کرنی چاہیے کہ میرے خطوط کی خشک تعبیرات، ٹوٹے پھوٹے الفاظ آپ کے لطیف ادیبانہ ذوق پر بار ہوں گے۔

(۷)

برادر عزیز حافظ محمد اسلم سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کے حسب تحریر آں محترم ۱۲؍۸؍۹۵ھ کا لکھا ہوا مکتوب گرامی کل بروز جمعہ ۲۳ رشعبان ۹۶ھ باصرہ نواز ہوا، بخیر وعافیت گھر پہنچنے پر مسرت ہوئی۔ بارش کی لائی ہوئی بربادی کی اطلاعات مختلف ذرائع سے ملتی رہتی ہے، اور کچھ نظارے تو خود مشاہدہ میں آئے۔ ہمارے ہاں بھی بارشوں کی کثرت ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہمارے تحصیل ہنگو اور قریب کے قبائلی علاقہ میں بجائے بربادی کے آبادی کا سامان بنی ہے۔ آپ کا کہنا بجا ہے کہ مخلوقِ خدا اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے' مگر کیا کیا جائے مریض کو مرض کا احساس ہی نہیں وہ معالج کی دوا کی قدر کیا جانے۔ پوری قوم تقریباً مبتلائے عذاب ہے مگر طغیان وعصیان کے سیلاب میں کچھ کمی آئی ہے؟ اس پُرفتن دور میں امت کے مصائب اور امراض میں سے عظیم مصیبت مرض کے احساس کا فقدان ہے۔ یہ مرض جتنا خطرناک ہے اتنا ہی عام ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

احساس سے محروم انسان کی حیثیت چلتے پھرتے لاش سے کچھ بھی زیادہ نہیں، قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس بزعم خویش زندہ اور درحقیقت مردہ لاش کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

میرے عزیز! آپ جیسے دیدہ ودانش اصحاب پر مخفی نہیں مطلِ زیطار کے سقوط پر عالم اسلام کی دردناک خاموشی اس کی بے حسی اور اس بے مردنی کی بڑی واضح دلیل ہے۔ میرے لئے تو اس واقعہ فاجعہ نے سیلاب کی تباہ کاریوں اور گھر کی بربادی کا وزنی بوجھ کافی ہلکا کر دیا۔ "فاصابکم غماً بغم لکیلا تاْ [ ] سوا علی مافاتکم" کی صورت بظاہر بن گئی ہے۔ کاش کہ حقیقت میں بھی ایسا ہوتا، تعجب ہے کہ پاکستانی جیسی جذباتی قوم بھی ٹس سے مس نہ ہوئی اور شاید چشم فلک ہماری اس بے غیرتی، بے حمیتی کا رونا روزانہ رو رہی ہے اور مظلوم فلسطینیوں کی درد وآہ سقف نیلگوں سے ٹکرا کر نہ چھٹنے والے بادل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

میرے عزیز! آپ نے اپنے کچھ حالات لکھ کر اس سیاہ رو وسیاہ کار سے جس بات کی فرمائش کی ہے، آہ! میں کیا عرض کروں؟ بس اتنا ہی کہ کاش! آپ کے ارشاد کی تعمیل کی صلاحیت اپنے اندر پاتا۔ صلاح سے محروم شخص دوسروں کے صلاح کا کیا فکر کرے گا۔

صلاحِ کار کجا من خانہ خراب کجا
بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

میں صرف بے عمل ہی نہیں بلکہ بدعمل بھی ہوں، حق تعالیٰ سے خود بھی صلاح وفلاح کا طالب ہوں اور آپ جیسے احباب سے بھی دعا کا سوالی، کچھ حضرات کے صلاح کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ آپ جیسے دوستوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حالانکہ ان کی طرف میری توجہ ایک ایسی کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنجناب کے علم میں شاید نہیں ہوگا کہ اس قسم کے حضرات جان بلب مریض کی طرح تھے، جنہیں مرض کا ازالہ نہیں، زندگی کی بقا کے لئے ایک جرعۂ آب کی ضرورت تھی اور بدقسمتی سے صرف ایک گھونٹ پانی پلانے پر کوئی فرد بھی آمادہ نہ تھا۔ ناچار مجھے اٹھنا پڑا اور ماشاء اللہ آپ کی حالت تو کم از کم میرے لئے قابل رشک ہے۔ آپ نے چند معدود و محدود کوتاہیوں کا تذکرہ کیا ہے، واللہ العظیم وہ میری کوتاہیوں، سیاہ کاریوں اور کمزوریوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ کوزہ و غربال کی نسبت ہے۔ ایسی صورت میں آپ کے سوال کے جواب میں کچھ لکھنا بحیثیت مصلح کے بڑی جسارت بلکہ سچ پوچھئے تو بے شرمی ہے۔ آپ جیسے قابل اور عزیز فرزند کے لئے تو جان کا نذرانہ بھی ہیچ ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ چشم نابینا کی پوری پونجی چند قطرات دموع ہی تک محدود ہے۔ کئی احباب اس قسم کی خواہش کا اظہار مشافہۃً وتحریراً فرما چکے ہیں، ہر ایک کے جواب میں خونِ جگر اور آبِ چشم کے چند قطرے بہاتا ہوں۔ وللہ یتولانا وایاکم فانہ نعم المولی ونعم الوکیل۔ البتہ ایک مریض شخص'' خصوصاً جبکہ امراض بھی اس کے متنوع ہوں'' کے یقیناً کچھ تجربات ہوتے ہیں، اس کلیہ سے یہ فقیر بھی مستثنیٰ نہیں، پھر حق تعالیٰ کی توفیق اور اپنے مہربان اساتذہ کے التفات سے مطالعہ کا کافی موقع ملا ہے، تو بحیثیت چشیدہ نہیں بلکہ دیدہ یا صرف شنیدہ کچھ عرض کرنے میں شاید حرج نہ ہو۔

میرے محترم! آپ نے اپنی تحریر سے دینی خدمت کا جو عزم ظاہر کیا ہے وہ انتہائی مبارک ہے، مگر اس سلسلہ میں اس فقیر کی اتنی گزارش ضرور ملحوظ خاطر رکھئے کہ مضبوط اور ٹھوس علمی بنیاد کے بغیر اس راستہ سے مذہب کی خاطر خواہ اور نتیجہ خیز خدمت ممکن نہیں، اس لئے ایام طلب میں تا فراغت آپ اپنی تمام تر توجہ علمی استعداد پیدا کرنے پر مرکوز رکھیں۔ میرے نزدیک طالب علم جب تک طالب علم صرف طالبعلم نہیں بنتا، محقق عالم نہیں بن سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ مذہب کا تحفظ وارتقا قلم کاراد یبوں کے ذریعہ سے نہیں ہوئی۔ محقق ارباب قلوب علما ہی نے یہ خدمت ہمیشہ سے سرانجام دی ہے، بلکہ یہ تاریخی حقیقت ہے اور حال بھی اس کا گواہ ہے کہ قلم کاروں نے فائدہ سے زیادہ دین کو نقصان پہنچایا۔ مجھے قوت تحریر کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں یہ بھی 'بیان' جو کہ حق تعالیٰ شانہ کے انعامات جلیلہ میں سے ایک جلیل نعمت کی ایک صورت ہے۔ مگر ٹھوس علمی استعداد کے بغیر قلم دین کا خادم نہیں بن سکتا، جیسا کہ نری علمی استعداد صلاح قلب کے بغیر بے معنی ہے۔

تحریر کا جتنا ملکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے وہ کافی ہے، اب آپ تحصیل علم ہی میں مشغول رہیے اور بچوں کو قلم

کاری کی تبلیغ انتہائی مضرت رساں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ تبلیغ جیسے شغل کو بھی میں طالب علم کے لئے مضر تصور کرتا ہوں، ہمارے دیوبند کے مشائخ واکابر کا یہی مذاق رہا ہے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی قلم کاری کی تبلیغ کے بجائے طلب علم میں انہماک کی تلقین کیجیے۔ بعض امور فی نفسہ حسن ہوتے ہیں لیکن ظروف واحوال کی وجہ سے مستحسن نہیں رہتے۔ الحاصل ایامِ طلب میں یہ ناچیز آپ اور دوسرے طلبہ کے لئے طلب علم کے ساتھ کوئی دوسرا مشغلہ اختیار کرنا مضر سمجھتا ہے انتہائی مضر۔ "ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه" ابدی صداقت ہے۔ عقل پرستوں کے ایک بڑے گروہ نے اس پر تصدیق ثبت کی ہے۔ والعاقل تكفيه الاشارة

اپنی بعض خامیوں اور کمزوریوں کا احساس کرتے ہوئے آپ نے ازالہ کی طرف جو توجہ دی ہے اور مقدور بھر کوششیں کی ہیں، وہ قابل صد تحسین وتبریک ہیں۔ اس سلسلہ میں اس حقیر کی رائے یہ ہے کہ طب یونانی ''جو اسلامی طب سے بہت ہی قریب ہے'' کا مسلمہ اصول ہے کہ پرہیز دوا سے زیادہ اہم ہے، دوا کا استعمال بغیر پرہیز کے بے سود ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم کی روح بھی یہی بتلا رہی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ معمولی سی بد پرہیزی سے حسنات کے انبار جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک سب سے بڑی اور بری بلا غلط صحبت ہے، اور صحبت میں غلط اور صحیح کی پہچان اتنی دشوار ہے کہ ماسوائے عرفانِ منور قلوب کے اوروں کے لئے اس کا امتیاز بہت ہی دشوار ہے۔ اس لئے شیخ بنوری متعنا اللہ بفیوضہم جیسی مسلم، مقدس شخصیات کی صحبت کے علاوہ دوسروں سے مجتنب رہنے ہی میں سلامتی ہے۔

ایامِ طلب میں بس صرف دو کام کرنے کے ہیں: ادائیگی فرائض وواجبات وغیرہ کے بعد اشتغال بالکتاب ورنہ آرام (نیند)، اصال وفراغت شیطان کے اغوا کا بڑا کامیاب راستہ ہے۔ "خانہ خالی را دیو میگرد" واقعی عارفانہ مقولہ ہے۔ میں نے اس سال انتہائی مجبوری کے تحت دو بچوں کو آپ کے حوالہ کیا تھا، آپ پر مکمل اعتماد کے باوجود اختلاط کی وجہ سے جو فکری انتشار پیدا ہوتا ہے اور اپنے مقصد سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے، اس کا ہمہ وقت اندیشہ رہا۔ بہرحال آپ زندگی کے انتہائی خطرناک موڑ سے گزر رہے ہیں، اس لئے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہ مرحلہ طے ہوا تو اگرچہ "حتى يأتيك اليقين" شیطان کے اغواء سے انسان مامون نہیں ہو سکتا پھر بھی خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

احباب کے لئے میری نصیحت اور وصیت یہ ہے کہ وحدت وعزلت اختیار کریں، اختلاط سے محتاط رہیں، خصوصاً معاصرین کو بڑے حضرات سے احتراز کرنی چاہیے۔ اکابرین امت خصوصاً تصوف کے مشائخ کے تاکیدی ارشادات اس سلسلہ میں اتنے ہیں کہ استقصا ممکن نہیں۔

زا بنائے روزگار وفائے ندید کس
رحت برآن کسے بایشاں نہ ہمدم است
(خسروؒ)

اس موضوع پر وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ میرے رحیم وکریم پروردگار نے شرح صدر کے نعمت سے نوازا ہے، زندگی نے وفا کی باہم مل کر بیٹھنے کا موقع ملا ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل سے اپنے خام خیالات عرض کروں گا۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کی طبیعت میں استقلال نہیں، محترما! اسی استقلال کا نام استقامت ہے شرعی زبان میں، اور مخفی نہ ہوگا کہ استقامت ولایت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ "شیبتنی ھود" کی سر "فاستقم کما امرت" کے مختصر سے جملہ میں مضمر ہے۔ "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافوا و لا تحزنوا" کے ساتھ "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون" ملا کر پڑھیے، حقیقت حال واضح ہو جائے گی۔ بزرگان امت کا متفقہ فیصلہ ہے: "الاستقامۃ فوق الکرامۃ"۔ اسی استقامت سے قرآن حکیم کبھی تقوی سے تعبیر کرتا ہے، کبھی صبر سے۔

اس مختصر سے مکتوب میں تفصیلات عرض کرنے سے قاصر ہوں، یہاں صرف اس قدر بتلانا چاہتا ہوں کہ جس گوہر آبدار کے آپ طالب ہیں، اس کے حصول کے لئے کتنی کمریں ہیں جو سالہا سال تک جھکی رہی ہیں، کتنے ماتھے ہیں جو رات کی تاریکیوں میں درگاہ کبریائی میں زمین پر رگڑے جاتے رہے ہیں، کتنی آنکھیں ہیں جن کے سیلاب اشک سے قلوب کے ویرانے شاداب ہوتے رہے ہیں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جہد کی ضرورت ہے۔ رات کو جاگنا پڑتا ہے، دن کو چلنا اور ساتھ ساتھ انتہائی اضطراب اور تضرع کے ساتھ مولیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ "غنی عن العالمین" کی شان ہے، ہزار ہا سالہ طاعات کو آن واحد میں "ھباءً منثورا" بنانا اس کے لئے صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایسا واقعۃً ہو بھی چکا ہے۔

اس لئے میرے عزیز! مرشد سعدیؒ کے ارشاد کو مشعلِ ہدایت بنانا چاہیے: ؎

رفت باید، تا بکامِ دل رسید
شب نخفتن، تا برآید آفتاب
ہر کہ حلقہ دائم بہ سندان زند
ناگہش روزے بباشد فتح باب

عمل کوئی بھی ہو صیام کا یا قیام کا، ذکر کا یا فکر اس پر مداومت چاہیے، مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو: "خیر العمل

مادیہم علیہ و ان قل" اور اخلاص کی روح سے بھرپور ہونا چاہیے: "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین، الا للہ الدین الخالص، انما الاعمال بالنیات" آگے حق تعالیٰ کے فضل و رحمت پر غیر متزلزل عقیدہ ہو، اور "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین" کی نوید جاں فزا سے ہمہ وقت مشام جان معطر رکھا جائے۔ "انا عند ظن عبدی بی" اور "انا جلیس من ذکرنی" کے مسرت بخش اور روح پرور پیغامات جو وہاں سے صادق و مصدوق مدنی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی) کے ذریعہ مل رہی ہیں، پھر فرط محبت و مسرت سے اس کے دراقدس پر سجدہ ریز ہو کر قدم بوس ہونا چاہیے۔

میرے عزیز القدر بھائی! بات لمبی ہوتی جارہی ہے، عدیم الفرصت بھی ہوں اور قلیل الصحۃ بھی اور بوجوہ طبیعت میں انشراح نہیں۔ یہ چند غیر مربوط قسم کی باتیں دام تحریر میں بعجلت آگئیں۔ آپ کے خلوص و محبت نے قلم کو اتنی حرکت کی ہمت دی۔ حق تعالیٰ مجھے بھی توفیق دے اور آپ جیسے احباب کو بھی کہ اس کے صراط مستقیم پر چل سکیں۔ آخر میں کچھ مختصر سے معمولات لکھتا ہوں، ہو سکے تو پابندی کے ساتھ ان کو پڑھا کریں۔

ا۔ ہر نماز کے بعد مسنون تسبیحات سے فارغ ہو کر آیۃ الکرسی، معوذتین اور اللھم اھدنی وثبتنی و سددنی ''تین / ۳ مرتبہ'' اور یا مثبت القلوب ثبت قلبی علی دینک ''تین / ۳ مرتبہ'' اور اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک ''تین / ۳ مرتبہ یا اس سے زیادہ''۔ ادعیہ کے مسنون طریقہ کے مطابق اول اور آخر درود شریف پڑھیں۔

۲۔ ہر نماز کے بعد کم از کم ایک مرتبہ یہ درود پڑھ لیا کریں: "اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی ال سیدنا محمد صلوۃ تنجینا بھا من جمیع الاھوال والافات وتقضی لنا بھا جمیع الحاجات وتطھرنا بھا من جمیع السیئات وترفعنا بھا عندک اعلی الدرجات وتبلغنا بھا اقصی الغایات من جمیع الخیرات فی الحیاۃ وبعد الممات برحمتک یا ارحم الراحمین"۔

(۳) فجر کی سنتیں پڑھ کر قبلہ رو بیٹھ کر ۴۱ مرتبہ "یا حی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی ولا الی احد من خلقک طرفۃ عین۔

(۴) تہجد کی اگر توفیق ملتی ہے تو نماز میں جتنا ہو سکے تلاوت کیجیے۔ نماز سے فراغت کے بعد استغفار پڑھئے۔ اگر "استغفر اللہ العظیم لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ" کے صیغے کے ساتھ ہو تو بہتر ہوگا۔

(۵) نیوٹاؤن پہنچنے تک روزمرہ کم از کم ایک سو مرتبہ درود شریف پورے حضور قلب اور ادب و احترام کے ساتھ پڑھ لیا کریں، پڑھتے وقت یہ استحضار او رتصور ہو کہ گویا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس سماعت فرما کر

جواب سے نوازتے ہیں۔ جمعرات اور جمعہ کو جتنا زیادہ پڑھ سکیں بہتر ہوگا، صیغہ کوئی بھی ہو فقیر کے نزدیک طبعاً یہ پسندیدہ صیغہ ہے۔ "اللّٰھم صلّ علی سیدنا محمدٍ و علی آلہ و صحبہ افضل صلوٰتک بعدد معلوماتک وبارک وسلّم"۔

(۶) ایک سو مرتبہ "لا حول و لا قوۃ الا باللہ" روزانہ پڑھا کریں۔ طہارتِ باطن میں طہارتِ ظاہر کا بڑا اثر اور دخل ہے۔ عذر نہ ہو تو جہاں تک ہو سکے، باوضو رہنے کی کوشش کریں "ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین، والطھارۃ شطر الایمان"۔

آپ جیسے ہونہار فرزند سے مکرر بات کرنا لغو معلوم ہوتا ہے، مگر کیا کروں اہمیت تکرار پر مجبور کرتی ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کوئی عمل اور کوئی ورد اس وقت تک اپنی تاثیر ظاہر نہیں کر سکتی جب تک موانع رفع نہ ہو۔ طاعات واذکار کی حلاوت ارتکاب معاصی کے ساتھ ناممکن الحصول ہے۔ اس لئے پرہیز کی اشد ضرورت ہے۔ اہل معرفت نے بتلایا ہے: "ترک ذرۃ مما نھی اللہ تعالی عنه خیر من الف طاعات"۔ اور معاصی میں ملوث ہونے کا بہت بڑا سبب اختلاط ہے۔ مبتدی کے لئے گوشہ نشینی، عزلت ضروری ہے، اور منتہی کے لئے معاشرۃ واختلاط مع الناس، ہر شخص کے مقام کے مناسب اس کا حال ہونا چاہیے۔ یہ ایک دقیق موضوع ہے محتاج تفصیل، فرقِ مراتب نہ کنی زندیقے۔ "انزلوا الناس علی قدر منازلھم" ارشادِ نبوت ہے۔ ہم اور آپ جیسے ضعفا کے لئے ترکِ تعلقات شرطِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب خلق خالق کے مشاہدہ کا آئینہ بن جائے پھر اختلاط میں حرج نہیں پھر تو "وھو معکم أینما کنتم" حال بنتا ہے۔ عارف رومیؒ نے اپنی خداداد علم وحکمت اور ذاتی تجربہ کی روشنی میں جو دعویٰ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ ؎

چشم بند و گوش بند و لب بند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

آج تک اس کو کوئی چیلنج نہیں کر سکا۔ رومیؒ کے آواز میں میں اپنے عزیز بھائی محمد اسلم صاحب سے مخاطب ہوں۔

؎

چشم بند و گوش بند و لب بند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

حرام بینی، حرام شنیدی، حرام خوری و حرام گوئی سے اجتناب فرمائیے۔ چشم دل نے اگر نورِ حق کا معائنہ نہ کیا تو مجھ پر صرف ہنسئے ہی نہیں بلکہ تھوکیے، اور مذکورہ بالا امور سے بچنا تب ہی ممکن ہے جب تمام علائق "جو کہ حق تک پہنچنے

میں معاون نہیں بلکہ عاتق ہوں'' یکسر منقطع کر دیئے جائیں۔

حکیم الامت، فیلسوف الہند سیدنا حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے ایک کشمیری مسکناً و بدخشانی مولداً ارادتمند خواجہ محمد امینؒ کو مخاطب کرتے ہوئے نغمہ سرا ہیں:

حجاب وصل مطلوب ہست دل بستن بمطلبہا
امین گر ترکِ مطلبہا نمی کردم چہ میکردم

اور حضرت ممدوحؒ ہی کا ارشاد ہے:

بمذہب ما شرک جلی است وصریح
گر سوئے دیگر خطرہ خاطر باشد

سلسلہ کلام ختم کرتے ہوئے سلام نیاز و محبت عرض کرتا ہوں اور بالحاح یہ درخواست بھی کہ ہمہ وقتی دعوات میں خصوصاً رمضان شریف کے پاکیزہ ایام ولیالی اور بالاخص قبیل المغرب وآخر اللیل کے دعاؤں میں اس ناچیز کو یاد فرماتے رہیے۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کے طفیل سعادت دارین سے نوازے۔

کوئی خدمت ہو یا کسی قسم کی ضرورت خط میں ضرور لکھنے، مجھے اس سے خوشی ہوگی۔ والد محترم اور دیگر اعزہ کی خدمت میں بھی سلام عرض کیجئے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ صفوۃ البریۃ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

آپ کا مخلص

فقیر محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

۲۴ر شعبان ۹۶ھ

(۸)

اذان جمعہ اور الیکشن سے دوشرہ ٹوٹ کے متعلق حضرت مفتی مختار الدین مدظلہ کے نام دو فقہی خطوط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت اُقدس مخدومنا المکرم حضرت مولانا مفتی مختار الدین صاحب دامت برکاتہم وزیدت عنایاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آن مکرم کی تشریف آوری پر خوشی ہوئی، اپنی غیر حاضری پر شدید افسوس ہوا، حضرت والا نے از راہِ ذرہ نوازی اپنی تحریر شریف ساتھیوں کے حوالہ فرمائی تھی، حسب الحکم مطالعہ کیا، آپ نے ارتجالاً جو کچھ تحریر فرمایا ہے قابلِ غبطہ ہے، اللہم زد فزد۔ آنجناب کے فتاویٰ کی حیثیت واہمیت چونکہ دوسرے اکثر اہل علم کے فتاویٰ سے مختلف ہے کہ فی الحال بھی وہ ان شاء اللہ تعالیٰ معمول بہا بن جاتے ہیں اور مستقبل میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ نہ صرف ان پر عمل ہوگا بلکہ ان سے استشہاد کیا جائے گا، بنا بریں فقیر کا مشورہ یہ ہے کہ چونکہ اکثر کتب مذہب میں اذان اُولیٰ کو معتبر قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اذانِ ثانی کے اعتبار کے قائلین میں بھی امام طحاویؒ، علامہ کاسانیؒ جیسے اکابر موجود ہیں اور علامہ عینیؒ بنایہ میں فرماتے ہیں:

" وفی فتاوی العتابی:وهو المختار وبه قال الشافعیؒ واحد واکثر فقهاء الامصار ونص فی المرغینانی وجوامع الفقه أنه هو الصحیح وفی أحکام القرآن وجامع الرموز:ان اصحابنا لم یقولوا الا بهذا الاذان فانه فی زمانهﷺ وزمان الشیخینؓ لأنهم یبکرون للجمعة الخ" جبکہ امام ابو یسرؒ فرماتے ہیں: ان کلا الاذالین معتبر کمافی جامع الرموز نقلاعن التمرتاشی۔

اور ہندیہ کی یہ عبارت بحوالہ کافی شاید اسی کی شرح ہے:

والاصح ان کل آذان یکون قبل الزوال فهو غیر معتبر والمعتبر أول الاذان بعد الزاول سواء کان علی المنبر أو علی الزوراء۔

اور شاید یہی مراد ہے، یہ حضرات جو فرماتے ہیں کہ سعی الی الجمعۃ زوال کے ساتھ واجب ہوجاتا ہے، چاہے اذان ہو یا نہ ہو (کماذکرہ الجصاصؒ فی احکامه) غالباً تعبیرات کے تنوع نے اختلاف کی صورت اختیار کرلی، ظاہر ہے کہ جن پر جمعہ واجب ہے، ان کے حق میں سعی تحصیل واجب کا وسیلہ ہے اور وسائل مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں، اور مقصد کے وجوب کا سبب تو زوال ہے تو وسیلۂ مقصد کے وجوب کا بھی وہی سبب ٹھہرا۔ ندا، زوال کی دلیل ہے اور اس کا اعلان واظہار ہے اس لئے نص میں اس کا ذکر فرمایا گیا، اس سے یہ بحث بھی کافی حد تک غیر ضروری بن جائے گی کہ عہد نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام میں کون سی اذان تھی کون سی نہیں تھی۔ آیت کریمہ کے عموم اور اس کے منشا کا اعتبار ہونا چاہیے نہ کہ خصوصِ مورد وخصوصِ مادہ کا۔

حضرت مفتی زید مجدہم نے جس مشکل کی طرف متوجہ فرمایا ہے، اس الجھن واشکال کا سبب شریعتِ مطہرہ کا حکم

اور ہمارے فقہاء کرام کی تشریح نہیں، بلکہ ہمارے ائمہ اور خطیب حضرات کا خلاف سنت وخلاف شرع اور فقہاء کرام کی تصریح فرمودہ مسلک کے خلاف عمل کرنا ہے، بجائے اس کے کہ ہم فقہاء کرام کے اقوال کو موضوع بحث بنائیں ضروری یہ ہے کہ ہم اپنے خطباء، ائمہ اور مساجد کے متولیین و منتظمین کو مجبور کریں کہ وہ اپنا عمل درست فرمالیں۔ آہ ثم آہ انتہائی درد وکرب کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ امت کی بگاڑ کی ذمہ داری بڑی حد تک اس کی مذہبی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔ مدارس ومساجد میں دینی تعلیمات کی یہ پامالی دفتر وبازار میں دینی تعلیمات کی پامالی کا ایک بہت بڑا سبب ہے، والی اللہ المشتکی رب البیت۔

جب والدین طبلہ زن ہوں تو اولاد رقص نہیں کرے گی اور کیا کرے گی حق تعالیٰ ہی اصلاح حال فرمائے۔ مجذوبانہ جسارت کے لئے معذرت خواہ ہوں، حضرت والد کے کریمانہ رویہ نے اس جسارت کی جرأت بخشی ہے، اس لئے عفو وصفح کی امید ہی نہیں یقین ہے۔ والسلام

آپ کا محتاج دعا خادم

محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ

(۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واجب الاکرام ولائق صد احترام حضرت مفتی صاحب زیدت محاسنہم ومکارہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ تصنیفی ہدیہ کل موصول ہوا اور بار بار پڑھا۔ خلاف توقع جناب کی دوسری تصنیفات کے معیار پر نہ پایا اور آپ کی فطری ذہانت کا مظہر ہونے کے باوجود اثبات مدعا سے قاصر رہا۔ عالم اسلام کے مشاہیر اہل علم خصوصاً ہمارے دیوبندی مشائخ کے مدلل فتویٰ، کہ انجکشن مفطر نہیں، کے خلاف اولاً تو تحریر مناسب نہ تھی۔ حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا اعزاز علیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین کیرانویؒ، حضرت مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ، حضرت مولانا عبدالستارؒ، حضرت مولانا ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی اور دار العلوم حقانیہ سے لے کر دار العلوم کراچی بلکہ دار العلوم دیوبند ومظاہر العلوم، بلکہ جامعہ ازہر تک اصحاب افتا اسلاف واخلاف کا مسلک ظاہر ہے کہ سطحی اور سرسری تو نہیں بلکہ علم وتحقیق پر مبنی ہے۔ اسے رد کرنے کے

لئے بار بار سوچنے کی ضرورت ہے اور ٹھوس علمی دلائل کی بنیاد پر اس کے خلاف لکھنے کی جرأت کی جاسکتی ہے۔ نصوص قطعیہ مفطرات ثلثہ سے "معہود امساک کو صوم قرار دے رہی ہیں، تو اسے فاسد قرار دینے کے لئے خطیبانہ توجیہات، تعلیلات کافی نہیں، بلکہ ٹھوس قوی دلیل کی ضرورت ہے جو ایک ثابت و متیقن کا ازالہ کر سکے۔

حکم الگ چیز ہے اور حکم کی حکمت الگ چیز ہے، حکمت کی نفی حکم کے نفی کو مستلزم نہیں۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ "اللہ الصمد" کا ورد کھانے پینے سے ہفتوں تک مستغنی کر دیتا ہے، اسی طرح بعض اور اعمال و اشغال ہیں جو کہ کھانے پینے کا کام دیتی ہیں۔ انی ابیت یطعمنی ربی کا اشارہ کافی ہے، تو معنوی کھانا پینا منافی صوم نہیں ہے۔ عامۃ الناس کا مقصد انجکشن لگانے سے تداوی ہوتا ہے، تغذی نہیں ہوتا۔ پھر ایک مقصد کے حصول کے اگر متعدد اسباب ہوں تو ضروری نہیں کہ سب کا حکم بھی ایک جیسا ہو۔ جیسے تمر حاصل کرنے کے ایک طریقہ کو مباح قرار دیا گیا اور دوسرے کو حرام ٹھہرایا گیا۔

"اور بدن کے اندر غذا یا دوا کسی بھی طریقے سے پہنچ جائے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے"۔

"اور روزہ ٹوٹنے کے لئے ضروری نہیں کہ دوا معدہ یا دماغ میں پہنچے"۔

کی بات اپنے اطلاق کے ساتھ تو خرق اجماع ہے۔ بدن تو کجا معدہ اور دماغ میں بعض ذرائع سے دوا یا غذا کا پہنچنا بھی مفطر نہیں۔ کما ہو مصرح فی معتمدات المذہب۔

غیر خلقی سوراخ سے کھانے پینے کے دخول کا مفطر ہونا تب فقہاء نے لکھا جب یہ سوراخ براہ راست معدہ یا دماغ تک پہنچتا ہو، نہ کہ مطلقاً۔ فرج داخل یعنی رحم سے معدہ تک منفذ موجود ہونے کی تصریح فقہاء حضرات نے کی ہے، اور محل استنجاء و معدہ کے درمیان منفذ کا ہونا تو محتاج بیان ہی نہیں۔ پھر جو نظائر و جزئیات پیش کیے جاتے ہیں، اکثر غیر منصوص وغیر متفق علیہا ہیں تو ان پر قیاس سے قطعی ثابت چیز "صوم" کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الحاق بالاکل والشرب والجماع کے لئے صرف تخمین کافی نہیں۔

انجکشن کو مفطر قرار دینے کا فتویٰ دینے کے بجائے اسے غیر مفطر قرار دے کر بھی اس سے احتیاطاً بچنے کی بات زیادہ مناسب واقرب الی التقویٰ ہے اور احوط ہے۔ کاش امداد الاحکام و امداد الفتاویٰ کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر کیا جاتا تو اکثر اوہام خود ہی ختم ہو جاتے۔ انجکشن (وریدی ہو یا لحمی) کے ذریعہ عین دوا جوفین تک اولاً تو پہنچتا نہیں اثر پہنچتا ہے۔ یا اگر پہنچتا ہے تو بذریعہ ترشح ہوتا ہے جو کہ بالاتفاق معتبر نہیں۔ بعض صورتوں میں شریعت اسباب کو مسببات کا درجہ دیتی ہے لیکن یہ وہ بھی نہیں۔

جلدی میں یہ چند سطور تحریر کیے۔ جناب کے اخلاص و مکارم اخلاق سے توقع ہے کہ محسوس نہیں فرمائیں

گے۔اور مطبوعہ تحریر کی اشاعت کو موقوف فرمادیں گے۔آنجناب کی دیگر مفید تالیفات کی طباعت واشاعت سے دلی مسرت حاصل ہوتی رہی۔جبکہ تازہ تالیف کی اشاعت سے بہت پریشانی ہوئی۔

کتب فقہ کی بعض جزئیات سے شبہ ہوتا ہے کہ جو فین تک رسائی فطر کے لئے ضروری نہیں ،اس قسم کی جزئیات یا تو ایسے متاخرین فقہاء کے آرا ہیں جو کہ خود طبقہ مقلدین سے تعلق رکھتے ہیں ،یا ائمہ اجتہاد کی طرف تخریجاً منسوب ہوئی ہیں اور اگر اصحاب مذہب سے منقول ہیں تو از قبیل مسائل فقہ نہیں کہ اصول ثلثہ سے مستنبط ہوں بلکہ طبی معلومات وغیرہ پر مبنی ہیں جو کہ مقیس علیہا نہیں بن سکتے۔

رمضان شریف کی مبارک ایام ولیالی میں دعوات صالحہ سے نوازنے کی درخواست ہے،حضرت والد صاحب دامت برکاتہم اور برادران کرام،ودیگر متعلقین کی خدمت میں دعوات خیر کی درخواست ہے اور سلام نیاز عرض ہے۔

آخر میں پھر اس اضطراری ناگوار تحریر پر معافی چاہتا ہوں۔والسلام

خویدمکم ،محمد امین عفااللہ عنہ،شاہو وام

(۱۰)

ہنگو قیام امن میں حائل ایک اہم مسئلہ کے بارے سابق وزیر اعلیٰ اکرم درانی کو لکھا گیا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر محترم المقام جناب محمد اکرم خان صاحب درانی وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اتوار کے دن ۲۲ فروری ۲۰۰۳ء کے اخبارات میں ہنگو میں میلہ نوروز کے لیے جگہ کے سلسلے میں ایک ناقابل فہم فیصلہ پڑھا،سنی قوم کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ آپ جیسے متدین ،معاملہ فہم،ذمہ دار شخص کا فیصلہ ہوگا۔متعدد ذرائع سے تصدیق کی کوششیں ہوئیں اور آنجناب کی طرف سے تردید کا انتظار رہا مگر آج جمعرات ۲۶ فروری کے اخبارات میں جناب کے حوالے سے بجائے تردید کے توثیق اور تائید کی خبر آئی۔لہٰذا اس سلسلے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں،امید ہے کہ آپ سنجیدگی اور ٹھنڈے دل ودماغ سے اس پر غور فرمائیں گے۔

جناب والا ہنگو میں شیعہ سنی اقوام کے درمیان امن کے قیام اور بقا کے لیے ۱۹۹۸ء کا معاہدۂ امن ایک بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے،ان معاہدات کی وجہ سے فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھی ،مستقبل میں علاقائی امن ورواداری کی فضا کے لیے راستہ ہموار ہوا،فریقین کے درمیان درجنوں قتل واقدام قتل وغیرہ کے مقدمات ختم ہوئے ،

فریقین کے جانی اور مالی نقصانات کے ازالہ کے لیے قومی خزانہ سے لاکھوں روپیہ کی خطیر رقم صرف ہوئی، اس وقت صوبائی وعلاقائی حکومت نے نہ صرف اسے منظور کیا بلکہ اس پر عمل درآمد کیا اور پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے خاتمہ کے لئے اسے ایک روشن مثالی نمونہ قرار دیا۔ جب کہ ۱۰۰۲ء کے قومی جرگہ نے متفقہ طور پر اسے صحیح قرار دے کر برقرار رکھا، سرکار اور فریقین کی منظوری کے بعد وہ ایک قانونی دستاویز کی صورت اختیار کر گیا۔ آج بھی جلوس محرم وغیرہ جیسے اہم حساس معاملات ہنگو میں اسی معاہدے پر پرامن طور پر انجام پذیر ہو رہے ہیں۔ ان مختصر اشارات سے ۹۸ء کے معاہدہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضور والا اسی معاہدے کے عین مطابق ضلع ہنگو کے ڈی۔ سی جناب محمود کھرل صاحب نے میلہ نوروز کے لئے جگہ کی تعیین کا فیصلہ کیا جو از روئے معاہدہ حتمی اور فریقین کے لئے واجب القبول تھا۔ سنی قوم نے اپنی چند شکایات کے باوجود معاہدے سے مجبور ہو کر اس فیصلہ کو قبول کیا، جبکہ دوسرے فریق نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے اسے مسترد کر دیا۔ معاہدے میں خلاف ورزی کے مرتکب کے لئے سزا متعین ہے۔ افسوس ہے کہ ذمہ دار حکام نے سزا دینے کی بجائے عملاً اس کی حوصلہ افزائی کی روش اپنائی اور آنجناب کا زیر بحث فیصلہ تو معاہدہ کی پابندی کرنے والے فریق کو سزا دینے اور خلاف ورزی کے مرتکب مجرم کو بھاری انعام سے نوازنے کے مترادف ہے۔

محترم المقام! آپ کا موضوع بحث فیصلہ بوجوہ نا قابل قبول ہے:

اولاً: یہ شرعی لحاظ سے نادرست ہے۔ اس لئے کہ اس سے مجوسیوں کے مذہبی تہوار منانے والوں کو خوش کرنا مقصود ہے اور ایک کافرانہ نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو کہ ہمارے عقائد وفقہ کی کتابوں کی تصریحات کی روشنی میں ایمان سوز حد تک خطرناک اقدام ہے۔

ثانیاً: یہ اخلاقاً بھی نادرست ہے۔ اس لئے کہ معاہدے کی پاسداری اخلاقی فریضہ ہے اور عہد شکنی کا کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے، جبکہ آپ کا یہ فیصلہ نہ صرف یہ کہ عہد شکنی کو جواز فراہم کر رہا ہے بلکہ عہد شکنی پر انعام دینے کا اعلان ہے۔

ثالثاً: اقتصادی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ غیر صحیح ہے۔ ہنگو جیسے پسماندہ علاقہ میں جہاں زرعی زمین کی قلت ہے، ایک بڑا قطعۂ زمین خطیر قومی رقم کے صرف کے ساتھ محض ایک چھوٹے سے فریق کی من مانی اور سال میں صرف ایک دن کی خرمستی کی خاطر ضائع کرنا اقتصادی لحاظ سے بہت افسوسناک ہے، تعجب ہے کہ یہاں کے بہت سے دیہاتوں میں پینے کو پانی مہیا کرنے کے لئے قومی خزانہ میں رقم نہیں اور اس قسم کی فضول عیاشی پر اتنی خطیر رقم فیاضی کے ساتھ خرچ ہو رہی ہے۔

رابعاً: یہ فیصلہ قانونی لحاظ سے بھی سقیم ہے، اس لئے کہ ایک حتمی سرکاری فیصلہ کے بعد دوسرا فیصلہ کوئی معنی اور جواز

نہیں رکھتا جو کہ ایک بہت بڑے طبقہ کی بے چینی کا باعث بن رہا ہو۔ طے شدہ مسائل کو دوبارہ چھیڑنا فتنوں کا دروازہ کھولتا ہے ہر ایسا اقدام جو امن عامہ کو خطرہ میں ڈالے یقیناً غیر قانونی متصور ہوگا۔

خامسا: سیاسی طور پر بھی یہ فیصلہ دانشمندانہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسے حکومت کی اپنے مقامی سیاسی حلیفوں کی حمایت حاصل نہیں، اس فیصلہ سے کم از کم ہنگو کے ایم، این، اے اور ایم، پی، اے حضرات کو اعتماد میں لینا اور یہاں کی مذہبی قیادت کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔

سادسا: یہ فیصلہ عدل وانصاف کے مسلمہ اصولوں کے بھی خلاف ہے۔ کوئی شخص ہو یا فریق اگر خوشی یا غمی کی کوئی تقریب منانا چاہے تو زیادہ سے زیادہ وہ اپنے حدود میں ایسا کرنے کا مجاز ہے کسی دوسرے کے حدود میں یا سرکاری قومی املاک میں جس میں غالب حصہ دوسرے فریق کا ہو ایسا کرنا سراسر ظلم اور بے انصافی ہے۔ نیز سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قاضی بناتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اہم ہدایت فرمائی تھی کہ فریقین کی باتیں پوری طرح سن کر فیصلہ دیا کرو تو غلطی نہیں ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد آج بین الاقوامی مسلمہ ضابطۂ عدل وانصاف بھی ہے، اس یک طرفہ فیصلہ میں اس زرین عالمی ضابطۂ انصاف کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

سابعا: اس فیصلہ سے ۹۸ء کا معاہدۂ امن مجروح ہوتا ہے جس کے خطرناک عواقب کسی پر مخفی نہیں۔

لہٰذا آپ کی خدمت میں عرض کناں ہیں کہ سنی قوم آپ کے اس فیصلہ کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی اور اگر اس یک طرفہ فیصلہ پر اصرار کیا گیا تو سنی قوم محسوس کرے گی کہ حکومت ۹۸ء کا معاہدۂ امن ختم کرنا چاہتی ہے، خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو سنی قوم ۹۸ء کے اپنے مطالبات میں یہ اہم ترین منصفانہ مطالبہ دوبارہ اٹھائے گی کہ ہر فرقہ اپنی مذہبی رسومات کو بشمول جلوس محرم اپنی اکثریت کے علاقوں تک محدود رکھے، ہم ہر ایسی مفاہمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں جو ۹۸ء کے معاہدے کے تحت ہو اور معاہدہ کا کوئی حصہ اس سے متاثر نہ ہو۔

ملحوظہ: یہ خط حضرت الاستاذؒ نے تحریر فرمایا، آپ کے علاوہ اس پر سنی قوم کے ۱۳ زعما کے دستخط ہیں۔

(۱۱)

حیلۂ اسقاط پر اپنے ایک استاذ کو لکھا گیا مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۴/ ۱۲/ ۱۴۱۰ھ

بخدمت اُقدس سیدی واستاذی العلام اُدام اللہ تعالیٰ حیاتہم ونفعنا ببرکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

بعد از آداب فرزندانہ عرض اینکہ حضرتِ والا کا مکتوب گرامی نظر نواز ہوا، ذرہ نوازی پر مسرت اور تشکر کے جذبات دل میں ابھر آئے لیکن ساتھ ساتھ آں مکرم کے ایک دینی مسئلہ میں اس تہی دامن، جہول سے استفسار پر شرمندگی ہوئی، حضرتِ والا کی شفقت کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں مگر افسوس ہے کہ جناب کے حسن ظن کا مصداق نہ پہلے تھا اور نہ اب ہوں، بارہا عرض کر چکا ہوں اور اب بھی بالحاح درخواست ہے کہ اپنے اس روحانی نااہل فرزند کے لئے خصوصی دعائیں فرماتے رہیں، ولکم مثل ذلک علی لسان الملک، ابقاکم اللہ تعالی ذخرا للاسلام و المسلمین و أفاض علینا من فیوضکم و برکاتکم امین ثم آمین۔

تعمیل ارشاد کے لئے بغرض استصواب چند سطور لکھنے کی جسارت کرتا ہوں حق تعالیٰ سے عفو ومغفرت کی دعا ہے اور آنجناب سے تسامح کی درخواست ہے، فقیر نے تفسیر وحدیث، سیرت وتاریخ اور فقہ کی کتابوں کا جتنا مطالعہ بتوفیق الٰہی کیا ہے کہیں اس کا ثبوت نظر سے نہیں گزرا کہ قرون مشہود لہا بالخیر میں اسقاط یا خیرات کا اہتمام جنازہ گاہ میں کسی نے کیا ہو، ہمارے علاقہ میں دونوں چیزوں کا رواج ہے چونکہ اسقاط کا تعلق فرائض وواجبات کے ساتھ تھا اور طریق ادائیگی کے محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں عام طور پر اس میں بہت سی بے قاعدگیاں تھیں اس لئے ہم نے نسبتاً اس پر زیادہ نکیر کی اور صحیح طریقہ پر اسقاط کی حتی المقدور تلقین کی، خیرات کے بارے میں بھی بارہا سمجھایا کہ یہ صرف نام کی خیرات ہے، بجائے اس کے صدقہ جاریہ کے کسی شکل کو اختیار کر کے میت کے لئے ایصال ثواب کریں، کوئی مان جاتا ہے اور کوئی نہیں، ہمارے اکابر مشائخ میں سے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جنازہ کے ساتھ غلہ کے ساتھ نقود کے لے جانے اور تقسیم کرنے کو بھی مکروہ قرار دیا ہے اور حنابلہ حضرات کی کتاب الانصاف [ج ۲ ص ۵۷۰] پر ہے:

قال المجد: وفي معنى ذلک مایفعله کثیر من أهل زماننا من التصدق عند القبر بخبز او نحوه فانه بدعة وفیه ریاء وسمعة واشتهار لصدقة التطوع المندوب الی اخفائها اھ، وتبعه جماعة قال فی الفروع قال جماعة: وفي معنى الذبح علی القبر الصدقة عنده فانه محدث وفیه ریاء وسمعة، قال الشیخ تقی الدین: اخراج الصدقة مع الجنازة بدعة مکروهة وهو یشبه الذبح عند القبر، ونقل ابو طالب لم اسمع فیه بشیء واکره أن أنهی عن الصدقة انتهی۔

الانصاف کی عبارت میں کراہت کے وجوہ اربعہ ہمارے ہاں رسم میں موجود ہیں، ریا وسمعہ قلبی امراض میں ہیں اور اخلاص وعدم اخلاص کا قطعی علم حق تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تاہم قرائن اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ عمل ریا سے خالی نہیں ہوتا اور محدث ہونا اور اشتہار صدقہ کے مفسدہ سے تو یقینا خالی نہیں اور تشبہ بفعل اھل الجاهلية بھی ظاہر ہے جبکہ الاتباع خير من الابتداع اور اخفاء الصدقة افضل من اظهارها و التجنب عن التشبه بالغير دینی مسلمات میں سے ہیں۔ ابو طالب نے یہ جو فرمایا ہے کہ: "اکره ان انهى الصدقة" ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہاں منع عن التصدق نہیں بلکہ تصدق کی ایک مخصوص صورت سے منع ہے لاشتمالہا علی المفاسد، درحقیقت منع اور نہی انہی مفاسد سے ہے كالنهي عن الصلوة في الارض المغصوبة وغيرها من النظائر التى لاتحصى، محدث الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا حیدر علی ٹونکیؒ فرماتے ہیں:

''باید دانست کہ صدقات برائے اموات بسیار مفید ہست در مذہب حق اہل سنت و جماعت لیکن مفید بشرطے است کہ این صدقات موافق حکم شرع باشند چنانکہ بناء چاہ ومسجد ونقد ولباس وغیرہ از مال حلال بفقراء دادن کہ این امور بالاتفاق جائز است ومفید بموتی الخ۔

جنازہ گاہ کی تخصیص اور وقت جنازہ کی تخصیص بے اصل ہے، قرون ثلاثہ میں اس زمان ومکان کی تخصیص کے لئے کوئی اثر نہیں ملتا۔ ہدایہ، شرح نقایہ، بدائع، مبسوط وغیرہ کتب معتمدہ مذہب میں عدم روایت کوئی مسائل میں کراہت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے ولیراجع لبعض البسط الی "الجنة لآهل السنة"، اور اشتہار صدقہ تو مشاہدہ کی بات ہے اور قرائن کے پیش نظر ریا وسمعہ کا وجود اغلب ہے، بنا بریں فقیر کا رجحان تو منع ہی کی طرف ہے البتہ اس بارے میں زیادہ سختی کو مناسب نہیں سمجھا، ان شاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ اس رسم کے استیصال کی کوشش بھی جاری رہے گی، ومن الله سبحانه التوفيق و السداد۔

حضرت والا سے آخر میں پھر اس گستاخانہ جسارت کی معافی چاہتا ہوں میری یہ حرکت یقینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، حضرت کی شفقت نے یہ جرأت بخشی ورنہ: من آنم کہ من دانم، اور کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ غلطی اور خامی پر تنبیہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

(۱۲)

غیر مقلدین حضرات کے بعض اعتراضات کے علمی جوابات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم محمد زاہد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

جناب کا الطاف نامہ ملا۔غیر مقلدین کے جاہلانہ سوالات کا جواب اکثر اہل علم اس لئے نہیں دیتے کہ وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔ارشاد ہے:"وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا"

دانشمندوں کا مقولہ ہے: جواب جاہلان بود خاموشی۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:" ان الذی یفتی الناس فی کل مایستفتونہ لمجنون"(جامع بیان العلم ۱۷۷/۱)ان حضرات میں جہل بمعنیٰ نادانی اور جہل بمعنیٰ ضد بطریق اتم پائے جاتے ہیں۔آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ ان میں سے بکثرت ایسے ہیں کہ ایک سطر عربی عبارت کا صحیح ترجمہ نہیں پڑھ سکتے اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر عالم ہیں۔یہ مرتبہ جہلِ مرکب ہے جو ناقابل علاج مرض ہے۔پھر جب اس پر ضد کا بھی اضافہ ہو تو کیسے یقین آئے گا کہ وہ حق جان کر مان لیں گے۔ایسی صورت میں ان کے ساتھ بحث میں الجھنا بے فائدہ ہے۔ ادھر ہدایت ہے:"وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ"اور"وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا"۔

آپ حضرات کو غیر مقلدین کے وساوس ودسائس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔اشتہار بازی ان کا سوقیانہ مشغلہ ہے۔اشتہار میں مندرجہ چار مسائل تو کیا اگر چار ہزار مسائل بھی آپ قرآن مجید اور حدیث شریف سے ثابت کریں یہ تب بھی باز نہیں آئیں گے،اور ان کا سب سے بڑا دجل وفریب یہ ہے کہ ہر ایک مسئلہ کے لئے قرآن وحدیث کے نص کا مطالبہ کرتے ہیں۔بظاہر اس خوشنما بات سے ہمارے ناتجربہ کار بھائی متأثر ہوجاتے ہیں،حالانکہ یہ خالص رافضیانہ نظریہ ہے کہ حکمِ شرعی کے لئے نص ضروری ہے،اجماع وقیاس احکام شرعیہ میں حجۃ نہیں۔نصوص قرآنیہ وحدیثیہ چونکہ محدود ہیں اور انسان کو درپیش اعتقادی،اخلاقی،معاشی،معاشرتی،سیاسی اور عبادات سے متعلقہ مسائل لامحدود ہیں،لامحدود پر محدود کا انطباق چونکہ عقلاً محال تھا تو روافض ان سے ذرا زیادہ عقلمند ثابت ہوئے کہ اس محال سے بچنے کی انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ امام یا نائب امام کے ہر زمانہ میں ضروری ہونے کا عقیدہ گڑھ لیا اور امام کا پیغمبر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رتبہ مان کر اس کی ہر بات کو حجۃ اور ہر حکم کو نص مفترض الطاعۃ کا درجہ دیا،اور یہ غیر مقلد بیچارے یا تو"وفورِ عقل" کی وجہ سے اس محال کا ادراک نہیں رکھتے یا پھر مقلد کے مقلد بنتے ہیں اور بعض تو مذہب کے ساتھ بالآخر دین کو بھی خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

متنبی قادیان اور ان کے خلف،چکڑالوی اور ان کی ذریت"لامذہبیت" کو پل بنا کر"زندقیت" میں جا پہنچے،اسی مفروضہ کو بنیاد بنا کر اسلام کے کھلے اور چھپے دشمن یہ تأثر پھیلا رہے ہیں کہ اسلام تا قیامت پیش آمدہ تمدنی ومعاشرتی

وغیرہا انسانی مسائل کا حل نہیں ہے۔قیاس واجتہاد وغیرہ ادلۂ شرعیہ سے انکار کرکے ہمارے یہ غیر مقلد دوست نادانستہ ہی ان کے آلہ کار بن رہے ہیں۔اہل سنت کے ائمۂ اجتہاد وفقہاء پر حق تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں ہوں خصوصاً ائمۂ حنفیہ پر کہ انہوں نے امت کی صحیح راہنمائی فرمائی اور واضح کیا کہ صرف ظواہرِ نصوص مدارِ دین نہیں بلکہ خفی ومشکل ومجمل سے بھی دین ثابت ہے اور نص کی صرف عبارت ہی سے حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی دلالت، اشارت اور اقتضاء بھی مثبتِ احکام ہیں، اور دلیل شرعی صرف قرآن وحدیث ہی نہیں بلکہ قرآن وحدیث ہی کی روشنی میں اجماع، آثار صحابہؓ وتابعینؒ ومن تبعہم اور قیاس واجتہاد بھی درجہ بدرجہ ادلۂ شرعیہ ہیں، اور کسی مخصوص طبقہ کی اصطلاح میں صحیح حدیث ہی سے نہیں بلکہ ساقط وموضوع کو چھوڑ کر دوسرے درجہ کی احادیث۔حسان ہوں یا ضعاف، مراسیل ہوں یا تعالیق وغیرہا سے بھی حسب مرتبہ احکام شرعیہ کا ثبوت ملتا ہے۔ہمارے یہ نادان غیر مقلد دوست عمل بالحدیث کے زعم میں بے شمار نصوصِ قرآنیہ وحدیثیہ اور دوسرے ادلۂ شرعیہ سے ثابت شدہ احکام شرعیہ پر عمل سے محروم ہیں۔گویا عمل بالحدیث کے نعرہ کے آڑ میں انکار حدیث یا کم از کم ترک العمل بالحدیث کی سازش میں مصروف ہیں یا اس کا شکار ہیں، اور پھر طرفہ یہ کہ اس چوری کے ساتھ سینہ زوری ہے کہ کامل دین کے ماننے والوں کے دین ودیانت پر طعنہ زن ہیں۔فقہاء کرام نے نہ صرف احادیث وآیات کے منصوص معانی ومفاہیم کو معمول بنایا بلکہ ان میں پوشیدہ علل وحِکَم کو غیر منصوص مواقع میں اپنی خداداد دوربین نگاہوں سے دریافت کرکے جامہ عمل پہنایا اور اس طرح کتاب وسنت کے ظاہر کے ساتھ ان کے باطن پر بھی عمل کرنے کرانے کی سعادت حاصل کی۔یہ تفقہ واجتہاد کی حقیقت ہے اور اسی کے اتباع کا نام تقلید رکھا گیا ہے۔یہ بھی یاد رہے کہ ترک تقلید کے یہ مدعی حضرات خود بھی جامد مقلد ہیں، یہ جو کسی حدیث کو مرفوع، کسی کو موقوف، کسی کو متصل، کسی کو منقطع، کسی کو صحیح، کسی کو غیر صحیح وغیرہ اور رواۃ حدیث میں سے کسی کو ثقہ، کسی کو غیر ثقہ، کسی کو معاصر، کسی کو غیر معاصر وغیر ذلک باور کیا جارہا ہے، تو یہ تقلید محض تقلید کی بنیاد پر، ان احکام میں ان کے پاس نصوص نہیں صرف ائمۂ فن کے آراء ہیں، وہ بھی ان کی اپنی معلومات اور صوابدید پر مبنی آراء، نہ کہ منصوصات شرعیہ سے مستنبط وماخوذ، پھر آیت وحدیث کا لفظی ترجمہ بھی ان میں سے بہت سارے براہ راست نہیں سمجھتے، اس لئے کہ عربی دانی سے کورے ہیں، نہ مفرداتِ لغت کا علم ہے، نہ اوزان وصیغوں کا، نہ اعراب وترکیب جانتے ہیں، نہ کلام اور جملوں کے متنوع اقسام، بلاغت کے اسالیب واسرار کا تو ذکر ہی کیا، نہ علمی ذوق نہ نورِ تقویٰ، بیچارے اردو ترجموں وتشریحات سے یا اعور فی العمیان قسم کے اپنے مولوی صاحبان سے کچھ سیکھ سن کر تحقیق کے مدعی بن بیٹھے ہیں اور معدودے چند اگر اہل علم ہیں بھی تو وہ بھی امام داؤد ظاہریؒ، علامہ ابن حزمؒ، محمد بن عبدالوہابؒ، اور علامہ شوکانیؒ وغیرہم کے دریوزہ گر ہیں۔ان کے مسائل اکثر انہی حضرات سے منقول

ہوتے ہیں۔اور ان کے متبوعین حضرات کی حدیث فہمی کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے ایک نامور صاحب جو کہ امام بخاریؒ کے معاصر ہیں، فرماتے ہیں کہ کھڑے پانی میں پاخانہ کرنے کی ممانعت نہیں ہے، اس لئے حدیث میں کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے ممانعت آئی ہے نہ کہ پاخانہ کرنے سے، مقصد عیاذاباللہ طعن نہیں صرف جمود علی الظاہر جو ان حضرات کا مذہب ہے اور ان کے متبوع علماء کا وطیرہ ہے، کا ایک نمونہ بتلانا ہے، غیر ارادی طور پر تمہید میں تطویل ہوگئی۔ اب غیر مقلدین حضرات کی یوتھ لیگ کے اشتہار میں مندرجہ ذیل مسائل کی طرف آتے ہیں، مسائل کے جوابات سے پہلے ایک تمہیدی بات ذہن نشین فرمالیں:

صحیحین اور مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ واشمات مستوشمات وغیرھن پر لعن فرمایا۔ بنی اسد کی ایک خاتون ام یعقوب کو اطلاع ہوئی، اس نے آ کر عرض کیا کہ سنا ہے آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعن کیا ہے؟ فرمایا: میں کیوں ایسوں پر لعن نہ کروں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان پر لعن ہو۔ وہ خاتون کہنے لگی کہ میں نے اول تا آخر قرآن پڑھا ہے، اس میں یہ بات کہیں نہیں پائی۔ فرمایا: آپ نے (کما حقہ) پڑھا نہیں، اگر پڑھتی تو یہ بات اس میں پاتی، کیا قرآن مجید میں آپ نے نہیں پڑھا: "ما آتاکم الرّسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں لعنت ایسی ہی ہے جیسا کہ کتاب اللہ میں ہو۔ تو قرآن وحدیث کے نصوص میں اگر ایک حکم منصوص ومصرح نہ بھی ہو لیکن ان کے عموم میں آتا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

بنابریں ہم ان سے کہتے ہیں کہ

اولاً۔۔۔۔ تو مذبوح کتے یا گدھے کا گوشت فروخت کرنے کی حرمت پر آپ پہلے دلیل پیش کیجیے جو آپ کے مسلک کے مطابق صریح آیت ہو یا صریح صحیح حدیث، تو اباحت وجواز پر دلیل لانا ہمارے ذمہ ہوگا، اگر قرآن وحدیث کے رو سے آپ اسے حرام ثابت نہیں کر سکے اور تا قیامت ثابت نہیں کرسکیں گے تو پھر کس منہ سے ہم سے جواز کی دلیل مانگتے ہو جب قرآن وسنت سے اس کے فروخت کرنے کی حرمت ثابت نہیں تو "احل اللہ البیع" کے عموم سے اس کی اباحت ثابت ہوگی۔

ثانیاً۔۔۔ طے شدہ مسئلہ ہے کہ "ما آتاکم الرّسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" اور جن امور سے کلیۃً سکوت اختیار فرمایا، ارادۃً اختیار فرمایا "والسکوت فی معرض البیان بیان" تو ایسے امور اپنی اباحت اصلیہ پر باقی رہیں گے۔

ثالثاً۔۔۔ ارشاد گرامی نبوت ہے: "ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا، وحرم حرمات فلا تنتھکوھا،

وحد حدوداً فلا تعتدوها، وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها۔" (سنن الدار قطنی ۱۸۳/۴۔۱۸۴، والطبرانی فی الکبیر ۲۲/۲۲۰ وغیرھا)

پوچھ والے دوست بتلائیں کہ مذکورہ گوشت فروخت کرنا مسکوت عنہ ہے یا نہیں، اگر نہیں تو صریح آیت یا حدیث کا حوالہ دیں، اگر ہے تو آپ بذریعہ اشتہار جواز کی دلیل طلب کر کے صریحاً "فلا تبحثوا عنھا" کی خلاف ورزی کیا نہیں کر رہے ہیں؟ شرم باید کرد۔

رابعاً۔۔۔ صحیحین وغیرہا میں ہے: "ان اعظم المسلمین جرماً من سئل عن شیء لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسئلته" اس حدیث شریف سے ثابت ہوا جس چیز کی حرمت ثابت نہ ہو اس کو حرام قرار دینا ہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں پوچھنا تک جرم ہے، پھر یہ پوچھنا اگر اس کے حرام ہونے کا سبب بنے تو یہ تو سب سے بڑا جرم ہوگا، مذکورہ گوشت کے فروخت کرنے کی حرمت یقیناً ثابت نہیں، چونکہ وحی کا دروازہ اب مسدود ہے، ورنہ آپ کے اس استفسار کے نتیجہ میں اگر حرمت کا حکم آتا تو کیا بنص حدیث امت مسلمہ میں سب سے بڑھ کر مجرم آپ نہ ٹھہرتے، آپ کا یہ استفسار اب اگر جرم اعظم نہیں بن سکتا تو کیا اس کے جرم ہونے میں بھی کوئی شک ہے؟

خامساً۔۔۔۔۔ارشاد نبوی ہے: "ان اللہ عز وجل احل حلالا وحرم حراماً، فما احل فھو حلال، وما حرم فھو حرام وما سکت عنہ فھو عفو۔ وفی روایة: فھو عافیة فاقبلوا من اللہ عافیته فان اللہ لم یکن نسیا ثم تلا ھذہ الایة" وما کان ربک نسیاً"۔ (سنن بیھقی ۱۲/۱۰ واخرج نحوہ البزار والطبرانی والحاکم وصححه وابن مردویه وابن المنذر وابن ابی حاتم کما فی الدر المنثور ۲۷۹/۴)۔ مذکورہ گوشت کے فروخت کرنے کی حلت اگر مصرح نہیں تو اس کی حرمت تو یقیناً مصرح نہیں پس ما سکت عنہ میں داخل ہو کر بنص حدیث اس کا حکم عفو وعافیت ہے یعنی اس پر مؤاخذۂ اخروی نہ ہوگا، اسی کو جواز اور اباحت کہتے ہیں۔ آپ اس کو حرام سمجھ کر اس کے جواز میں تردد کر کے کیا "فاقبلوا من اللہ عافیته" کے صریح حکم نبوی کو ٹھکرا نہیں رہے ہیں؟

سادساً۔۔۔ارشاد ربانی ہے: " لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ" اور ارشاد ہے: "لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبدلکم "اور "عفا اللہ عنھا" ان آیات قرآنیہ نے سابقہ احادیث نبویہ کے مضمون پر مہر تصدیق وتصویب ثبت فرمائی بلکہ درحقیقت احادیث ماثورہ اسی متن حکیم کی شرح ہیں "فھو عفو، فھو عافیة" اور "عفا اللہ عنھا" کے شذرات ملاحظہ ہوں کس طرح آپس میں مربوط اور جڑے ہوئے ہیں۔

زیر بحث مسئلہ میں آپ کا جاہلانہ انداز میں قیل وقال اور تمسخر کے رنگ میں استفسار احادیث مذکورہ کے ساتھ

ساتھ نصوصِ قرآنیہ سے عملاً روگردانی نہیں ہے، اور استہزاء بالدین کی ناپاک جسارت نہیں ہے؟ تحریم وتحلیل حق تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اس کے ترجمان ومبلغ ہیں اور ائمۂ دین اس کے شارح ہیں جس طرح ''وشم'' وغیرہ کی حرمت اور اس کا موجب لعن ہونا ام یعقوب اسدیہ باوجود اہل زبان ہونے کی کتاب اللہ سے معلوم نہ کر سکی جب تک کہ ابن مسعودؓ نے متنبہ نہ کیا تو اسی طرح کتاب وسنت سے احکام کا استنباط یقیناً ہر کہ ومہ کے بس کی بات نہیں اور جو انسان خود بھی نہ سمجھے اور سمجھانے والے کی بات پر بھی کان نہ دھرے تو وہ انتہائی شقی ہوگا: ''وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر، لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا طاولئک کالانعام بل ھم اضل طاولئک ھم الغفلون''۔

سابعاً۔۔۔علامہ کاسانیؒ وغیرہ محققین نے اس مسئلہ پر ''دباغھا ذکاتھا'' یا ''ذکاتھا دباغھا'' سے بھی استدلال فرمایا جس کی تشریح کی نہ فرصت ہے اور نہ فی الحال ضرورت، جسے شوق ہو مبسوطات فقہ وحدیث میں ملاحظہ فرمائیں، یاد رہے کہ یہ تمام بحث بصورتِ تسلیم کی گئی، حالانکہ غیر ماٗکول اللحم حیوان کے شرعی طریقہ پر ذبح کرنے سے اس کے گوشت کے حرام ہونے کے باوجود پاک ہوجانے میں خود ائمۂ حنفیہ کا اختلاف ہے۔ امام قاضی خانؒ، امام سرخسیؒ، علامہ زیلعیؒ، علامہ اتقانیؒ، صدر الشریعۃؒ، شرنبلالیؒ اور ان جیسے دوسرے اہل تحقیق اکابر حنفیہ اس کے ناپاک ہونے کے قائل ہیں، جس پر عدم جواز بیع متفرع ہوگا، پاک ہوجانے کی صورت میں جب پالتو کتوں، بلیوں پرندوں کو کھلانے وغیرہ کی صورت میں قابل انتفاع ہو تو جواز بیع کا قول ہے تاکہ ماٗکول اللحم حیوانات کا گوشت انسان ہی کے لئے رہے، ان دقیق مدارک اجتہاد کو یہ عقل وفہم کے یتیم اور علم وتحقیق کے مسکین کیا جانیں۔

پوچھنے والوں کا دوسرا سوال یہ ہے کہ نماز میں ہاتھ رکھنے میں مرد وعورت کے درمیان تفریق کون سی حدیث سے ثابت ہے؟ جواباً عرض ہے کہ حنفیہ کے نزدیک نماز میں بحالت قیام ہاتھوں کو زیر ناف رکھنا بھی جائز ہے اور سینہ پر بھی، مرد وعورت سب کے لئے۔ ہاں! افضل یہ ہے کہ مرد زیرِ ناف رکھے اور عورت بر سینہ۔ نفسِ جواز تو اس لئے ہے کہ دونوں کیفیات سنت سے ثابت ہیں اور فی الجملہ دونوں میں تعظیم کا معنی پایا جاتا ہے۔ رہی مرد کے لئے زیر ناف اور عورت کے لئے سینہ پر ہاتھ رکھنے کی افضلیت کی بات تو اس کی بنیاد کتاب وسنت کی ان نصوص پر ہے جن میں عورت کے لئے ستر کے شدید اہتمام کی تلقین ہے اور مرد کو مردانہ اوضاع کے اختیار کرنے اور زنانہ پن سے اجتناب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ زیرِ ناف ہاتھ رکھنے پر دال حدیث چونکہ نسبتاً اقرب الی الصحۃ تھی اور یہ کیفیت مرد کے لئے ابلغ فی التعظیم تھی، مرد ہونے کی وجہ سے ناظرین کے لئے گندے قسم کے تصورات کا مسأ بھی نہیں بن رہی تھی، اس لئے اسے مرد کے لئے بہتر قرار دیا، اور اس خیال سے کہ دوسری کیفیت بھی مسنون ہے اور اس میں ستر کا

اہتمام زیادہ ہے اور شریعت اسلامیہ کا مجموعی مزاج بشدت متقاضی ہے کہ مستورات تاحد امکان زیادہ سے زیادہ مستور رہیں، اس لئے اس کیفیت کو عورت کے لیے پسند کیا گیا اور مرد وعورت کے درمیان صرف اسی مسئلہ میں فرق نہیں بلکہ عبادات کی دوسری صورتوں میں بھی بکثرت یہ فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً: نماز ہی کو لیجئے! مرد کے لئے مسجد میں فریضہ نماز ادا کرنا افضل ہے، عورت کے لئے قعر بیت میں، مرد کے لئے باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم ہے جبکہ عورت اس کی مکلف نہیں، بشرط گنجائش مرد کے لئے مرد کے ساتھ مل کر صف میں کھڑا ہونا لازم ہے، عورت کے لئے ناجائز، مرد کا صف اول میں کھڑا ہونا افضل ہے، عورت کا سب سے پچھلے صف میں، مرد نماز جمعہ کا مکلف ہے عورت نہیں، مرد پر عیدین کی نماز ہے عورت پر نہیں، مرد خطبہ دے سکتا ہے عورت نہیں، مرد امام بن سکتا ہے عورت نہیں، مرد اذان کا اہل ہے عورت نہیں، مرد اقامت کرسکتا ہے عورت نہیں، مرد کے لئے رکوع وسجود میں تجافی کا حکم ہے عورت کو تضام کا، اسی طرح سجود میں مرد تجافی اور رفع کا اہتمام کرے گا، عورت التصاق والتزاق وخفض کا اہتمام کرے گی، مرد کے قدمین عند السجو دمنصوب ہوں گے، عورت کے غیر منصوب، مرد کے لئے قعود میں افتراش ہے، عورت کے لئے تورک، مرد کے لئے فتح دینے کے لئے تسبیح، عورت کے لئے تصفیق، مرد کے لئے رفع الیدین الی الاذنین ہے عورت کے لئے الی المنکبین، مرد کے لئے رفع یدین کی وقت کپڑے سے ہاتھ باہر نکالنا بہتر ہے عورت کے لئے نہ نکالنا۔ ان تمام فروق میں مؤثر عنصر مستورات کے لیے ستر کا اہتمام ہی ہے، تو ہر صاحب بصیرت بطور ضابطہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جب ایک عمل کی دو کیفیتیں شارع سے ثابت ہوں تو عورت کے لئے ان میں سے استر کیفیت کا اختیار کرنا افضل ہوگا۔

امام بیہقیؒ ’جو علم حدیث کے مشاہیر ائمہ میں سے ہیں‘ نے ’’سنن کبریٰ: ۲ر ۲۲۲۔ ۲۲۳‘‘ میں حضرت ابو سعید خدریؓ وحضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے دو حدیثیں روایت کی ہیں جن میں فروق بالا میں سے کئی ایک کا ذکر آیا ہے، یہ حدیثیں بقول امام بیہقیؒ قابل احتجاج نہ بھی ہوں قابل استشہاد تو ضرور ہیں، خود امام موصوفؒ اسی غرض سے انہیں لے آئے ہیں، ان میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں "**واذا سجدت الصقت بطنها فی فخذیها کاستر مایکون لها**" کے الفاظ خاص طور پر ہمارے دعویٰ کے شاہد ہیں کہ نماز میں عورت اپنے افعال وحرکات میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک ستر کا اہتمام کرے گی۔

امام موصوفؒ اس کے بعد ایک اور حدیث مرسل ذکر فرما چکے ہیں جو کہ یزید بن ابی حبیب کی روایت سے ہے اور پہلی حدیثوں کی بہ نسبت احسن ہے اس کے الفاظ ہیں: "**فان المرأة لیست فی ذلک کالرجل**" بہرحال احادیث میں مرد وعورت کے درمیان کئی امور میں فرق ثابت ہے اور فرق کی بنیاد ستر کا اہتمام ہے، اس لئے علۃ الحکم کا ذکر واضح طور پر ابن عمرؓ کی حدیث میں موجود ہے، تو اسی علت کے لئے سینہ پر ہاتھ رکھنے کی افضلیت حدیث ہی

سے ثابت متصور ہوگی۔

مختصر الفاظ میں آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مرد کے لئے زیر ناف ہاتھ رکھنے میں ایک تو اس باب میں وارد حدیث پر عمل کرنے کا اجر ہے، دوسرا مردانہ وضع اختیار کر کے تشبہ بالنساء سے بچنے کا، تو اجر مرتین کا باعث ہونے کی وجہ سے اس کے لئے یہ وضع بہتر ہوئی اور عورت سینہ پر ہاتھ رکھ کر ایک اجر عمل بالحدیث المذکور کما لیتی ہے، دوسرا اجر ان نصوص کتاب وسنت پر عمل کرنے کا جن میں عورت کو ہر حالت میں ستر کا اہتمام کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے۔ عورت کا لہجہ مظنۃ الفساد ہے اور مرد کا نہیں، اس لئے دونوں میں فرق رکھا گیا جیسا کہ "واغضض من صوتک" اور " فلاتخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض " سے واضح ہے۔ اسی طرح وضع الید عند السرۃ میں خوف فتنہ مرد کی بہ نسبت نہیں اور عورت کی بہ نسبت اس کا غالب امکان ہے تو شریعت کے مزاج شناس ائمہ نے اگر دونوں کے درمیان فرق کیا تو یہ فرق اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ قرآنی ہدایات واشارات کی بنیاد پر کیا، یہاں بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ " من لم یدر لم یذق ومن لم یذق لم یدر " اور سخن شناس نہ ٔ دلبرا خطا اینجاست، مدارک اجتہاد سے بے بہرہ لوگوں کا ان معارک میں حصہ لینا ہی غلط ہے۔

غیر مقلد پوتھیوں کا تیسرا شبہ تو خالص ان کا ذہنی اختراع ہے اور فقہ حنفی پر بہتان وافتراء اور سفید جھوٹ ہے۔ حنفیہ کے نزدیک امام کی بیوی کا خوبصورت ہونا قطعاً شرائط امامت میں سے نہیں، ہاں بعض متاخرین نے جو عموماً تفصیلات اور ممکنہ صورت ہائے مسئلہ کو ذکر کرنے کا دلدادہ ہیں۔ اس کو صرف ایک مرجح قرار دیا ہے وہ بھی اس لئے کہ احادیث میں استحقاق امامت کے لئے جو صفات مذکور ہیں ان میں ایک اہم حکمت نماز میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ امام کو قوم میں مقبول وہر دلعزیز بنانا ہے تاکہ جماعت زیادہ سے زیادہ بڑی ہو جس میں نماز کی فضیلت میں اضافہ کے علاوہ اور بھی بہت ساری انفرادی واجتماعی مصالح ہیں، اور یہ فطری بات ہے کہ اپنی رفیقہ حیات کے حسن کا خاوند کی نگاہ کی پاکیزگی اور عفت پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے، حوروں کے قاصرات ومقصورات ہونے کی ایک توجیہ یہی کی گئی ہے، اور جمعہ کی نماز کے لئے جانے سے قبل "من غسل " کی فضیلت میں یہ راز کارفرما ہے، بنابریں فقہاء حنفیہ نے اس قسم کی صفات امام کے لئے ذکر کر کے اس سلسلہ میں منقول احادیث مقدسہ کی روح کی اتباع کی ہے۔

درمختار میں سر کے بڑے ہونے کا جو ذکر آیا ہے، دوسری کتابوں کے علاوہ خود درمختار کی اردو شرح غایۃ الاوطار میں اس کی تشریح کی گئی ہے:

" پھر جس کا سر بڑا ہو اور دوسرے عضو چھوٹے ہوں کیونکہ سر کا بڑا ہونا اور دوسرے اعضاء کا متناسب ہونا دلیل ہے زیادتی عقل کی (جو کہ امام کے مقبول ومحترم ہونے کا باعث ہے) مگر کلانی سر موقع سے ہو بے موقع نہ ہو کذا فی

الطحطاوی" (غایۃ الاوطار ۱/۲۹۰)

ایک طرف فقہاء کی یہ عقل وتجربہ کی معقول بات دوسری طرف عقل کے ان اندھوں، تہذیب کے دشمنوں کی وہ مکروہ تعبیر وتحقیر جو اس اشتہار میں پائی جاتی ہے۔

رہی یوتھ فورسیوں کی آخری اشتہاری بات، تو اس کا جواب یہ ہے کہ زبان سے نماز کی نیت جب کہ دل کی نیت کی تمکین وتقویت کے لیے ہو تو مستحسن ہے نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ سنت، عبادت حج وعمرہ کی نیت زبان سے ذکر کرنا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تلقین پر خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح بخاری وغیرہ اُمہات کتب میں ثابت ہے تو قلبی نیت کے استحکام کی نیت سے اگر نماز کی نیت زبان سے بھی ذکر کی جائے تو اس کے استحسان میں کیا شبہ ہے۔ تاہم محقق ابن الہمامؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے اکابر حنفیہ نے قلبی نیت پر اکتفاء کرنے کو ترجیح دی ہے اور اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے، عدیم الفرصتی مزید تفصیل وتطویل کی اجازت نہیں دیتی اور نہ اہل انصاف اصحاب بصیرت کے لئے اس کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم غیر مقلد یوتھ فورس کے نونہالوں اور ان کے بزرگوں سے گزارش کرتے ہیں کہ بات بات پر دوسروں سے قرآن وحدیث سے صریح دلیل پیش کرنے کا مطالبہ تو آپ کرتے ہیں، کیا آپ دیگر مسائل کو تو رہنے دو انہی چار مسائل میں اپنے موقف پر قرآن حکیم اور حدیث صحیح سے صریح دلیل پیش کر سکتے ہیں، جس میں مذبوح کتے وگدھے کے گوشت کے فروخت کرنے کی حرمت مصرح ہو۔ مرد وعورت کے درمیان ہاتھ رکھنے میں فرق کی صراحتاً نفی ہو، امام کے لئے منصوص صفات کے علاوہ دوسری صفات کے معتبر نہ ہونے کی تصریح ہو، نماز کے لیے زبانی نیت کو مستقبح قرار دیا ہو۔

نیز یہ بھی گزارش ہے کہ غیر مقلد حضرات کی تالیفات میں لاتعداد ناگفتی باتوں کا ہمیں بخوبی علم ہے لیکن انسانی شرافت اور اسلامی تہذیب ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ کسی کی لغزشوں کو بلا ضرورت ومجبوری محافل ومجالس میں اچھال اچھال کر رسوا کیا جائے اگرچہ "البادی أظلم" کے بناء پر ہمیں دفاعاً ایسا کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، خدا کرے کہ ہمیں اس کے استعمال کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ وھو العلی العظیم وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ صفوۃ الخلق سیدنا محمد وعلی الہ وصحبہ وبارک وسلم۔

اپنے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ غیر مقلد جیسے بھی ہیں ان کے خلاف اپنی صلاحیتیں صرف کرنے کی بجائے دین کے اصل دشمنوں روافض کے خلاف صف آراء ہوں، ان کے تخریبی منصوبوں کی فکر کیجئے، اپنے صفوں میں

چھوٹے موٹے مسائل کی وجہ سے انتشار کی بجائے عفو وصفح سے کام لے کر اتحاد پیدا کریں۔ آپ کے تمام مسائل کا حل سنی اتحاد میں ہے جو ملی اتحاد اور مسلم اتحاد کی تفسیر ہے۔ دشمن کا منصوبہ ہے کہ اہل سنت کے درمیان جزوی اختلافات کو ہوا دیں اور انتشار پھیلائیں اور خود کو محفوظ بنائیں جو عناصر اہل سنت میں سے اس میں منہمک ہیں وہ نادانستہ دشمن کے مقصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ والسلام

(آخر میں شبہات کے جوابات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جواب شبہ ۱:۔ اولاً۔۔۔ مذکورہ گوشت کے فروخت کرنے کی حرمت چونکہ کسی آیت اور حدیث سے صراحۃً ثابت نہیں اس لئے "احلَّ اللهُ البیع" کے عموم سے اس کا جواز ثابت ہے۔

ثانیاً۔۔۔ "ما اٰتاکم الرّسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" کی روشنی میں جن امور سے سکوت اختیار فرمایا ہے وہ اپنی اباحت اصلیہ پر باقی ہیں۔

ثالثاً۔۔۔ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی حدیث ہے: "ان اعظم المسلمین جرماً من سئل عن شیء لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسئلته" اس حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کی حرمت ثابت نہ ہو اس کو حرام قرار دینا تو درکنار سوال کر کے حرام ہو جانے کا سبب بننا بھی سب سے بڑا جرم ہے۔

رابعاً۔۔۔ ارشاد گرامی نبوت ہے: "ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا، وحرم حرمات فلا تنتھکوھا، وحدحدوداً فلا تعتدوھا، وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا" (سنن الدار قطنی ۴/۱۸۳۔۱۸۴، والطبرانی فی الکبیر ۲۲/۲۲۰ وغیرھا) معلوم ہوا کہ مذکورہ بیع کی اباحت اصلیہ پر اکتفاء نہ کرنا اور اسے حرام ثابت کرنے کی کوشش کرنا ممنوع ہے۔

خامساً۔۔۔ ارشاد نبوی ہے: "ان اللہ عز وجل احل حلالا وحرم حراماً، فما احل فھو حلال، وما حرم فھو حرام وما سکت عنہ فھو عفو۔ وفی روایة: فھو عافیة فاقبلوا من اللہ عافیته فان اللہ لم یکن نسیا ثم تلا ھذہ الایة" وما کان ربک نسیاً"۔ (سنن بیھقی ۱۰/۱۲ واخرج نحوہ البزار والطبرانی والحاکم وصححه وابن مردویه وابن المنذر وابن ابی حاتم کما فی الدر المنثور ۴/۲۷۹) ظاہر ہے کہ گوشت مذکور کے فروخت کرنے کی حرمت منصوص نہیں تو کم از کم اس کا فروخت کرنا مسکوت عنہ ہے جسے اس حدیث شریف میں عفو وعافیہ فرمایا گیا یعنی قابل گرفت نہیں جو مباح وجائز کا معنی ہے۔

سادساً۔۔۔ فرمان ہے: "وان تسئلوا عنھا حین ینزل القراٰن تبد لکم" اور "عفا اللہ عنھا" آیت کے آخری

حصہ کی تفسیر سابقہ حدیث نے کی تو اس حصہ سے بھی اس کی اباحت ثابت ہوئی۔

سابعاً۔۔۔"دباغہا ذکاتہا" یا "ذکاتہا دباغہا" کے ارشادِ گرامی سے بھی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

یہ جوابات بنا بر تسلیم تھے جبکہ اکابر محققین حنفیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے جس کی بیان کی ضرورت نہیں۔

جوابِ شبہ ۲: اس فرق کی بنیاد ان نصوص پر ہے جن میں عورت کو ستر کا زیادہ اہتمام کرنے پر مکلف بنایا گیا اور وہ احادیث بھی جن میں کئی امور میں عورت کو مرد سے جدا کر دیا گیا ہے، نماز ہی میں ستر کی وجہ سے تو یہ فرق بھی معنی انہی احادیث سے ثابت ہے سنن کبریٰ، بیہقی ۲/ ۲۲۳ کی ایک حدیث "واذا سجدت الصقت بطنها في فخذيها كاستر مايكون لها" اور ایک اور حدیث میں: "فان المرأة ليست في ذلك كالرجل" آئے ہوئے الفاظ میں اسی کی طرف راہنمائی ہے۔

جوابِ شبہ ۳: یہ محض بہتان ہے، سفید جھوٹ ہے، متاخرین فقہاء نے اس کو صرف ایک مرجح قرار دیا ہے نہ کہ امامت کے لئے شرط، صفات منصوصہ للامام کی جو علت وحکمت ہے وہ ان صفات میں بھی موجود ہے تو یہ بھی ان کے حکم میں ہیں۔

جوابِ شبہ ۴: زبان سے نیت کرنا اگر دل کی نیت کے استحکام کے لئے ہو تو مستحسن ہے، تاہم بعض اکابر حنفیہ نے دلی نیت پر اکتفاء کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

(۱۳)

مسئلہ جہاد افغانی سے متعلق اہم فقہی مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادرم مکرم حضرت مولانا رشید احمد صاحب زیدت مکارمہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

مکتوب گرامی نظر نواز ہوا، یادفرمائی اور خیر وعافیت کی اطلاع موجب تشکر ہوئی۔ ہنگو تک جناب کی تشریف آوری کا علم ہوا تھا، زحمت کشی اور ملاقات نہ ہونے پر افسوس ہوا تھا۔ خود یہ ناچیز بھی اپنی نااہلی اور پھر ہمہ جہت ضعف کی وجہ سے حاضر ہونے سے قاصر رہا ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے کہ آپ یک طرفہ طور پر اپنا مخلصانہ تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ آن محترم نے اپنے مکتوب کے ساتھ ایک استفتاء بھی بھیجا ہے۔ اس ناچیز کی جہالت کے تو آپ خود بھی شاہد ہیں یہ کیا جواب دے گا۔ پھر حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ صاحب جیسی علمی شخصیت کو، اگر آپ کے دل میں اس وسوسہ وخطور کا اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ کام چور جان چھڑا رہا ہے تو جواب لکھنے کی ہمت وجرأت نہ کرتا۔ آپ اور مولانا ممدوح کی خاطر الٹے سیدھے چند سطور تعمیلاً للارشاد لکھ رہا ہوں۔ اغلاط کی اصلاح کی درخواست ہے۔

مسئلہ کے بار[illegible]

(۱) کیا یہ ہبہ مشاع کی ممنوعہ صورت ہے؟

(۲) پٹوار کاغذات میں انتقال سے [illegible] ثابت ہوسکتا ہے؟

(۳) بعض اولاد کو محروم کرکے بعض کو جائداد وغیرہ ہبہ کرنا درست ہے؟

جہاں تک ان میں امر اول کا تعلق ہے، تو دونوں تحریروں میں تینوں لڑکوں کو ہبہ مشترکہ کی تصریح سے واضح ہے کہ یہ ھبة واحدة للجماعة فيما يقسم کی صورت [illegible] امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہبہ مشاع کی ممنوعہ صورت ہے، چاہے لڑکے سب بالغ ہوں یا نابالغ، یا کچھ بالغ اور کچھ نابالغ۔ اور عمل بھی حضرت الامامؒ کے قول پر ہوگا۔ ایک تو اس لئے کہ اصول افتاء کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کے قول کی موجودگی بلاموجب وبلاضرورت دوسروں کے اقوال پر عمل نہیں ہوسکتا۔ دوم اس لئے کہ فقہاء حنفیہؒ نے اسی قول کو مختار قرار دیا ہے:

في تصحيح القدوري لقطلوبغا رحمه الله۔ اختار قولهما ابو الفضل الموصلي، وبرهان الائمة المحبوبي، ابو البركات النسفي كمافي الانقرويه: ج: ۲ ص: ۲۸۴ والكاملية: ص: ۱۸۵ وغيرهما۔

اور مذہب کی عام کتابوں (متون وشروح وفتاوی جات) سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

وليراجع لمزيد النقول لترجيح قول الامام رحمه الله الى رد المحتار: ج: ۴، ص: ۵۷۰، فقد افاد واجاد

اور سب سے بڑھ کر اس لئے بھی حضرت الامامؒ کی دلیل زیادہ وزنی ہے کہ انقرویہ اور کاملیہ میں ہے: وقد اتفقوا على ترجيح دليل الامام ☐ رحمہ اللہ۔ تفصیل کے لئے مبسوطات، خصوصاً مبسوط، بدائع، بنایہ، تبیین اور اعلاء السنن وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

اور امر دوم کے بارے میں عرض ہے کہ پٹوار کے کاغذات سے قبول تو ثابت ہوسکتا ہے، شرعاً قبضہ تام نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ ہر ایک کا حصہ مقسوم اور مفرز نہیں ہوا ہے۔ بدائع، ج:۶، ص:۱۲۰ میں ہے:

الشیوع یمنع من القبض لان معنی القبض وهو التمکن من التصرف فی المقبوض۔

اور تکملہ ردمحتار، ج:۲، ص:۲۳۶ میں ہے:

عن ابن کمال: وقبض مایحتمل القسمة بها۔

اور اسی تکملہ، ج:۲، ص:۳۳۷ اور سکب الانہر، ج:۲، ص:۳۵۳ میں بحوالہ درر مرقوم ہے:

هو الممکن فی الموهوب وانه فی کل بمایناسبه فمفتاح الدار قبض لها، وفیما یحتمل القسمة بالقسمة وفیما لا یحتملها بتبعیة الکل۔

اور اسی طرح علامہ ابن الشحنۃؒ لسان الحکام ص:۳۶۹ میں لکھتے ہیں:

والقبض الکامل فیما یحتمل القسمة یکون بالقسمة حتی یقع القبض علی الموهوب بطریق الاصالة من غیر ان یکون القبض بتبعیة قبض الکل۔ اھ

اور شرح المجلہ ج:۳، ص:۳۴۵ میں ہے:

واعلم ان المراد بالقبض الذی تتم به الهبة هو القبض الکامل ــــــ والقبض الکامل فیمایحتمل القسمة بالقسمة۔ الخ

اور المعاملات الشرعیۃ المالیۃ ص:۲۶۰ میں ہے:

واما هبة المشاع فیما یقبل القسمة فانها تکون صحیحة وقت العقد فلا یضر الشیوع وقتئذ ولکن یشترط لتمام الملک فیها ان تقسم العین ویفرز الموهوب علی حدة ویسلم الی الموهوب له مقسوما مفرزا فان سلم الیه شائعا فلا یتم ملکه فیه ولا یترتب علی الهبة حکمها بل تبقی الحصة الموهوبة علی ملک الواهب بعد ذلک القبض الناقص کما کان علیه الحال من قبل القبض۔

اور یاد رہے کہ ھبۃ المشاع کے صحیح ہونے کی بات علی التنزل کہی گئی ہے، نیز ہبہ فاسدہ میں تخلیہ قبض کے حکم میں نہیں ہے بالاتفاق۔ کما صرح بہ غیر واحد اور تمام ھبہ کے لئے قبض کے شرط ہونے میں بالغ ولد اور اجنبی برابر ہیں۔

ہندیہ، ج:۴، ص:۳۷۷ میں بحوالہ محیط مذکور ہے:

ولا یتم حکم الهبة الا مقبوضة ویستوی فیه الاجنبی والولد اذا کان بالغا۔۔۔ اھ

رہا امر سوم تو قضاءً اگرچہ والد ایسا کرسکتا ہے لیکن دیانۃً یہ ناجائز اور ظلم ہے:

کما نطق به الحدیث الصحیح وصرح به الفقهاء۔

ایک ایسا شخص جس کا ایک لڑکا ہو اور ایک لڑکی کے بارے میں، لکھتے ہیں:

ولو وھب جمیع مالہ من ابنہ جاز قضاءً وھو آثم۔ نص علیہ محمد [بزازیہ علی الہندیہ ص ۲۳۷ جلد نمبر ۶]

الا یہ کہ محروم رکھنے والا لڑکا فاسق نافرمان ہو اور دوسرا صالح فرمانبردار ہو، تو تفضل فی العطاء جائز ہے اور فاسق لڑکے کو بقدر قوت دے گا۔ (کمافی البزازیہ) **تا ابد جو نہ مٹے گی**

اس سلسلہ میں تمام روایات پر نظر رکھتے ہوئے ناچیز الی الصواب یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ اولاد اگر ایک جیسی ہے تو والد عطیہ میں سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے۔ اگر ان میں کوئی معذور ہو یا زیادہ محتاج ہو۔ یا دینی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہو، تو اس کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ دینا جائز ہے اور اگر کوئی ان میں سے فاسق مبتدع ہے تو اسے بقدر قوت دینے پر اکتفاء کرنا چاہیے۔ تفصیلات کے لئے قاضی خان، فتاویٰ النوازل، بزازیہ، بحر، اعلاء السنن، کفایت المفتی وغیرہ ملاحظہ فرمائی جائیں۔ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم

حضرت شیخ الاسلام کی تنویر تھے
بالیقیں اس دور میں اسلاف کی تصویر تھے
وہ محقق وہ مدبر وہ مجاہد وہ ولی
دین احمد کی حقیقی خوبرو تصویر تھے
ان کی عظمت، ان کی ہمت، استقامت بے مثال
عہد نو میں جرأت (ایمان) کی تعبیر تھے
خون دے کے [illegible] راہ حق [illegible]
تا ابد جو نہ مٹے گی ایسی وہ تصویر تھے
دولت صدق وصفا سے شیخ مالا مال تھے

بخدمت گرامی برادرم محترم جناب مولانا محمد فاروق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

گرامی نامہ مل کر کاشف احوال ہوا، شکر ہے کہ آپ حضرات بخیر وعافیت سے ہیں، الحمد للہ تعالیٰ کہ یہ ناکارہ بھی تادم تحریر بخیریت ہے۔ آپ نے فکری تنظیم کے بارے میں استفسار فرمایا تھا۔ میری رائے اس تنظیم کے بارے میں یہ ہے کہ قلوب کا حال تو علام الغیوب ہی جانتا ہے۔ بظاہر یہ حضرات غلو اور افراط کا شکار ہیں۔ معاملات کو بھی بتادیتے ہیں صرف معاشیات کی حد تک [illegible] اور دنیوی فلاح وبہبود کو اعلیٰ ترین مقصد کا مقام دیتے ہیں، اس انداز میں کہ آخرت اور اخروی نعمتوں کی وقعت بہت کم رہ جاتی ہے، عبادات یہاں تک کہ نماز کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو اسلام نے دی ہے۔ دیوبندیت راہ اعتدال کا نام ہے، جسے لسان شریعت نے صراط مستقیم کا نام دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام، اور ائمہ دین واولیاء کرام میں کچھ حضرات اگر مالدار بھی تھے، وہ بھی طبعاً زاہد، راغب فی الدین، اور قائم اللیل اور صائم النہار رہے ہیں، انہی کے

اتباع واقتفاء میں کامیابی ہے مزین للناس حب الشہوات (الآیۃ) پر غور ہی راہنمائی کے لئے کافی ہے، سرمایہ داری کی مذمت کرنے کے باجود لوگوں کو فقر سے ڈرانا اور دنیاوی خوشحالی کو مقصد قرار دینا فریب ہی کہا جا سکتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کی مذمت اور روس وچین وہند وغیرہ اعداء اللہ کی مدح سرائی حب فی اللہ اور بغض للہ کے جذبہ کی عکاسی نہیں۔ معاشیات کے دلدادہ اور سامراج دشمن جماعتوں سے لگاؤ اور دینی ومذہبی جماعتوں سے نفرت کس بیج کے برگ وبار ہیں؟ میں اس جماعت پر بلا تحقیق کفر والحاد کے فتوؤں کے حق میں نہیں ہوں لیکن یہ نہیں کہ ان کا حامی ہوں، جس طرح افراد میں معیاری مؤمن کبریت احمر ہے اسی طرح جماعتوں کا حال ہے۔ دینی جماعتوں کے بارے میں بس یہ رویہ شاید اسلم ہو کہ نیکی کی حد تک حمایت اور برائی سے لاتعلقی اور نفرت ہونی چاہیے، اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یہ چند اشارات امید ہے آپ جیسے ذہین اور ذی علم فرزند کے لئے کافی ہوں، حق تعالیٰ ہم سب کو ہدایت واستقامت کی نعمتوں سے نوازے، نفس وشیطان کے مکائد سے محفوظ رکھے۔ جناب والد ماجد صاحب، اور دیگر اعزہ واحباب کی خدمت میں سلام عرض ہے، مدرسہ کی چھٹی ہے، اساتذہ اور طلبہ جا چکے ہیں، ہنگو کے حالات اضطرابی ہیں، ملاقات نصیب ہوئی تو تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ ہو جائے گی۔

والسلام

خویدم ملکم محمد امین عفا اللہ عنہ

باب ششم

یاد امین

منظوم تاثرات اور تصاویری یادگار

رثاء الشيخ العلامة المحدث محمد أمين الأوركزي الشهيد رحمه الله

بقلم الشیخ رضاء الحق / المفتي بدار العلوم زكريا، افريقه

توفي مِصقعٌ عَلَمٌ رشيد آمين العلم مظلوم شهيد
وكان محققًا في كل فنٍّ خصوصًا في الحديث هو الفريد

فدمع العين دومًا في ازدياد و نار الحزن ليس لها خمود
و يبكيه التلامذ و الأهالي فدمع العين منهمر يزيد

فقولوا موته فينا حياة و قولوا عيشه عيش رغيد
له جم المناقب لا تعدّ شجاع لم ذو مجد مجيد

فأسس مركزًا في شاهورامٍ لنشر العلم ليس له نديد
و شرح معالي الآثار ذُقه لذيذ الطعم ذاك هو الثريد

و كان الشيخ جوادًا كريمًا و غيث سخائه غيث مفيد
فعند الشيخ لا يبقى طريف فانفق حين لم يبق التليد

شهيد روحه في طير خضرٍ و قاتله شقيٌ بل عنيد
و قاتله يصير إلى هوانٍ و مغضوب عن الحق طريد

هدى المتقلّبين في هواهم و سدّد هائمين و هم عديد
عبيد النفس يأتون إليه تراهم بعد لله عبيد

فيوسف(١) دهرنا شجر ظليل و إن أميننا ظل مديد

له فهم دقيق بل عجيب و حامل راية العلم سعيد

له البرهان كالحصن منيعا يفز منه شيطان مريد
يحب كتاب علم كل حين و يفرح إذ أتى سفر جديد

أديب مصلح حكم كبير يدرس درسه درس سديد
رفيع القدر بسام الثنايا بليغ نطقه دز نضيد

تلألأ وجهه بدر تمام و شمس ضوء ها ضوء مزيد
همام الناس ليس له مثيل عريق الأصل محمود حميد

شديد العزم محمود السجايا دلائل علمه قصر مشيد
فذا ريحانة الكوهات فافهم و نضرة أرضنا حبر عميد

إلى الجنات راح الشيخ عنا إلى الآباد يرحمه الودود
و ندعو الله يرزقه جنانا إلى مادام للطير غريد

و إهداء لكم ممن قريب إليكم روحه جسمي بعيد

(۱) أعني به الشيخ العلامة محمد يوسف البنوري رحمه الله تعالى۔

رثاء الشيخ العلامة محمد امين قدس الله سره

بقلم الشيخ الجليل اسمعيل بن يوسف، جنوب افريقه

كرست مرثيتى لله تعالى خالصة عند وفاة امين مثله ندرا
يبقى القديم القدير الدائم الازلى والمرء دان تجاه اللحد منحدرا
ذو الطول يفنى فماتحت العنان ولا فوق الثرى مرتش للموت منتصرا
لكـ البقاء الهى غير منقطع كان الورى كلهم للموت محتضرا
فائذن الهى الكريم للصلوة على خير الورى همه أن يهدى البشرا
و الآل و الاتقياء المهتدين فهم ساداتنا جاهدوا للدين فازدهرا
قد راعنى سيدى حين أزآف الشجب استأسدت نفسه و استشرفت زمرا
وا كربنا بانفصال غير مبتهج شجو القلوب تبدّى كل ما ذكرا
واطربه جنة الفردوس نعم قرى طوبى لمن نالها ، نال العلى العطرا
لكنه غاص غير ان العلوم فما اشتق منها ترقى فيه و ازدهرا
كنه المعانى تجلى كلما نثرا ان امينا زهاما عنكـ مستترا
جزب مساعيه قد تجلى حقيقته فالمسكـ ما ينجلى يستفحل العطرا
أشهدت لما رأيت الشيخ مضطربا ما كان الا لطغيان فشى الضررا
من كثرة النشج ليلا عند دعوته قام الأهالى طوال الليل و السحرا
أقلعت عن سمعة بل احتسبت لدى ربّ جليل البها وضاع من فخرا
اعرضت عما جناه التانقون وقد فقت سخاءً غيوث السيل و القمرا

سلوانا انسجام الموت بالعجل هذام موت يزيل الشيعة الكفرا
من يقرض السمع صاغ فاكتشف نصحا و اندم على ما عصوت لله وانكسرا
ما زال يجذو صحابا كى يواصلهم حتى تأسّى بهم فى الموت منبهرا
حب لشيخ تقى بهجة النظر رباه علّامة فاحتلّ و اقتقرا

موروث ما وزث الاستاذ من خلق | لاسيما ذلة السامی به شهرا
فكّ الأناشيط بالتقريرة الوجز | فيها يلخص بحر العلم و الدررا
لن تنشدن العبارات المكثفة | الا ترى جلها مملونة عبرا
لن تنشدن العبارات المكثفة | الا ترى جلها مضبوطة صدرا
لو كان علم الأحاديث الشريف سرى | منه فحسب ليدعى حافظا ذكرا
يا سائلي صف لنا سيماء وجه تقي | سل عن رضا يأبا بكم خترا
حقًا انادى بكم يا فاقدى قمر | ما دام فيكم رضا يعطيكم العبرا
ما دام فيكم رضا يؤتيكم الغررا | ما دام فيكم رضا يأبا بكم خترا
يا رب بطْش خشارى الناس فی بلد | أفنوا من الناس من بالخير قد ظهرا
يعتى شرار الورى فيه فكم وقحوا | اذوا مقيمی نظام الله و النذرا
وارؤف على السابقين الأولين وتد | فينا خصالا تنقينا فنعتبرا
سبحان ربی العليم و السلام على | من قثم العلم ترويقا لمن نكرا

تذکار الشیخ

بقلم: الشیخ سید رزین شاہ، کراتشی

ففا نبک من ذکری حبیب ومرشد امام همام عالم متفرد

وحیدفرید لا نظیر لعلمه جلیل امین کاسمه ثم امجد

خبیر بأسرار الشریعة بارع شریف کریم فی البریة اجود

وقد نال حظا وافرا متوافرا من العلم من علم النبی الممجد

واخلاقه خیر الخلق قد کان یقتدی باخلاق خیر الخلق قد کان یقتدی

وفی لیلة قد کان یذکر ربه ویبکی امام الخالق المتوحد

یعلم علم الدین لله مخلصا مضی عمره فی نشر دین محمد

ورباه شیخ الکل یوسف دهره فاصبح نبراسا به الناس یهتدی

واروی البرایا من فیوض علومه لطلاب علم کان اعذب مورد

وشرح الطحاوی من جواهر علمه کتابته احری بتبر وعسجد

وقد کان فی کل العلوم محققا تصانیفه کالدر او کزبرجد

وصار شهیدا حینما کا ن صائما وذالک للدین المتین المؤید

فان فات عنا الشیخ ما فات فیضه فان حیوة المرء لیس بسر مد

وان کان اهل الشر یوما تهجموا فکان لکل کالحسام المجرد

وکان لاهل الحق حصنا وجنة وکان لاهل الکفر مثل مهند

محی بدعة کانت کلیل وظلمة ونور امر الدین فی کل مشهد

وما خاف فی دین الاله ملامة وذب عن الاسلام صولة مفسد

وما رام بالاعمال الا ثوابها فادخله دار الخلد ربی وخلد

وامطر بقبر الشیخ یارب رحمة وبارک له فی ذالمزار ومرقد

یراع رزین عاجز عن مدیحه لذالک دمع سال من عین أرمد

رثاء المفتي محمد أمين الأوركزني الشهيد رحمه الله

بقلم: الشيخ فضل الهادي استاذ الحديث بالجامعة اشاعة الاسلام مانسهره

لَقد كسفت هنا شمس المفاخر ... لقد نابنا رزء ناجت الأكابر

هو الشيخ المبجل عبقري ... موقر أهل دين ذو المآثر

معاهد بالمكرم مستنيرة ... بعلم القرم قد زهت المنابر

مضى بحرا العلوم اليلمعي ... وشمس هدى بكى أهل البصائر

وكان الندب بحرا في السماحة ... وليس لشيخنا أحد مناظر

إمام قد تزيا بالعبادة ... وتأليفاته عقد الجواهر

لقد أضحى مثال الأئمة قدوة ... لأهل الحق فيهم المصادر

وبالسلف الذين مضوا يماثل ... وليس له شبيه في الأواخر

بشاهو وزام هنكو مع كراشي ... أمين الدين في التحقيق ماهر

وكان فقيه قرن والمحدث ... بأسماء الرجال الشيخ ماه[ر]

ألا قل للذي قتل الكريما ... لقد أخنيت شيخي وهو ناصر

لقد أخطأت رشدك يا مفند ... بقتلك مقتدانا خير آمر

سلكت طريق بغي بل هوان ... لقد أصبحت فيه من الأخاسر

قرمت من السفاهة أن ظلمتا ... تضعضع عند ظلمك كل عامر

جهلت مقام أهل العلم سفها ... هدمت جبال علم والمنابر

دجى ليل الضلالة صرت شرا ... ظلمت مشايخا ثم الأصاغر

وما الدنيا بدار للخلود ... ترى كلا إلى العقبى يسافر

ألا رحم الرحيم لبيب دهره ... ويرحمنا المهيمن وهو غافر

ويطلع ذكريات من أمين ... همام الفهد والبطل المغامر

فيجزي الله مولانا طفيلا ... مع الأحباب خيرا وهو قادر

هنیئاًمن مُحِبِّک فضل هادٍ یری تاریخها "سار المظاهر"

{۲۶۱+۱۱۷۷=۱۴۳۸ھ}

سلامُ الرّبِّ دوماً في صلاته لأحمدَ ثمَّ أصحابٍ أطاهر

بیاد

عارف باللہ مولانا محمد امین شہیدؒ

نتیجہ فکر: مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی بھکر

عارفِ حق شیخ مولانا امینؒ نورِ چشم اولیاء کاملین
چل دیے خود جانب خلدِ برین اور ہم کو کر گئے اندوہ گیں

حضرتِ اقدسؒ کا تو مسکن رہی ناز کر شاہو کی تو اے سر زمین
تو کہ تھا اسلاف کا نورِ نظر تو کہ تھا اخلاف میں دُرِ ثمین

مسلک حقہ پہ دل سے گامزن سلسلہ عشق کے سارے سالکین
اللہ، اللہ دولت حُسنِ یقیں تھا فقط یہ فضل رب العلمین

اے شہیدِ باصفا! صد مرحبا تھی تیری مشتاق جنت کی زمین
جان کنی کے وقت سب حور وملک کہہ رہے تھے آفرین صد آفریں

قلب مضطر کا بتاؤں حال کیا شق ہوئی جاتی ہے یہ دل کی زمین
سیدی یوسف ہیں محبوب خلق عالم وفاضل ہیں اور مسند نشین

دوجہانوں کی سعادت ہونصیب حضرت اُقدس کے پیارے جانشین
ترک کرے محفلِ عیش ونشاط ہوگئے قاسمی گوشہ نشین

جامعہ یوسفیہ اور اس کے بانی

ازقلم: مولانا غلام مصطفی قاسمی

مضافات ہنگو میں ہے ایک ادارہ
خدا بن نہیں جس کا کوئی سہارا

علوم نبوت کے چشمے ہیں جاری
تفقہ کی چلتی ہے باد بہاری

محبت ،اخوت کے طلاب دیکھے
چمکتے یہاں دین کے مہتاب دیکھے

تفقہ ہیں دن رات تکرار دیکھا
محدث ، مفسر میں ایک پیار دیکھا

نظارے کہ بہت ہم نے دیکھے جہاں میں
نہیں ایسا الفت کا بازار دیکھا

یہ حضرت امینؒ کا ہے فیضان سارا
یہ طلاب سارے ، گلستان سارا

خدا اس ادارے کو آباد رکھے
ہر ایک شر وفتنہ سے آزاد رکھے

تواضع ،مروت ، سخاوت کا پیکر
تھے ہم عصر زہاد سے واللہ بڑھ کر

کہیں ایسا بے نفس انسان دیکھا
وہ راسخ یقین وایمان دیکھا

خلوص ومحبت کا پیکر سراپا
ملے گا کہاں ڈھونڈنے سے کف پا

وہ تقوی ، طہارت میں پاکیزہ ہستی
منور تھی نیکی میں شاہو کی بستی

محدث، مفسر، فقیہ زمانہ
وہ راسخ عقیدہ ، وہ عالم یگانہ

تری جان نشینی. یا قائم مقامی
ہے یوسفؒ سے تیرے مری ہم کلامی

خدایا تو اس قاسمی پر کرم کر
میسر شفاعت تو خیر الامم صلی اللہ علیہ وسلم کر